یہ جو ریگِ دشتِ فراق ہے

نازیہ کنول نازی

زندگی کے مختلف اور منفرد رنگوں سے سجا سنورا..... نازیہ کنول نازی کا طویل مگر بہت خوبصورت ناول

جو ریگِ دشتِ فراق ہے

(پہلا حصہ)

مصنفہ : نازیہ کنول نازی

انتساب!

''بے حد عزیز مدیرہ، پیاری فرحت آراء،

شمع زیدی، نزہت اصغر

اور

ریحانہ علی احمد''

کے نام

جن کی اپنائیت اور بے لوث محبتوں نے

میری کامیابیوں میں

ہمیشہ بڑا کردار ادا کیا۔

جو ریگِ دشتِ فراق ہے

بہت پیاری نازیہ کنول نازی کے لیے:

تم نہ مانو مگر حقیقت ہے
عشق انسان کی ضرورت ہے

نازیہ کنول نازی نے اس موضوع پر جب بھی لکھا دل کی گہرائیوں سے لکھا اور جم کر لکھا۔ نازیہ کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس موضوع پر لکھتے ہوئے وہ خود کو اس ماحول کا حصہ بنا لیتی ہیں پھر کرداروں کے ذریعے وہ ڈائیلاگ کہلواتی ہیں جو پڑھنے والے کو براہِ راست متاثر کرتے ہیں، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ انھوں نے کبھی اپنے افسانوں یا ناولٹ کی ہیروئن کو کردار کی سطح سے نیچے نہیں گرنے دیا، اور اگر کبھی کسی منفی رویے کی بنا پر ایسا ہو بھی گیا تو اگلے ہی سین میں اُسے سیدھے راستے پر لے آئیں اور مثبت انداز میں کہانی کا اختتام کیا۔ میری نازیہ سے صرف ٹیلی فون پر گفتگو ہوئی ہے میں ان سے کبھی ملی نہیں، مگر ٹیلی فون پر وہ جیسی ہنستی کھلکھلاتی اور دعائیں دیتی ہیں اس لہجے کی کھنک اور نرماہٹ گھنٹوں کانوں میں رس گھولتی ہے۔ اللہ کرے وہ یوں ہی ہنستی مسکراتی رہیں اور قارئین کو شوخ چلبلی تحریریں پڑھنے کو ملتی رہیں۔ جیسا کہ اس ماہ ان کی کتابیں مارکیٹ میں آ رہی ہیں۔ ویری ویل ڈن نازیہ اینڈ کیپ اٹ اَپ۔

شمع زیدی

(مدیرہ ماہنامہ نازنین)

''ریگِ دشت میں کھلتا کنول''

ریگِ دشت میں پھول کھلانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہاں پانی نہیں اشکوں کی روانی، جذبوں میں جولانی، لہو میں جوشِ جوانی درکار ہوتا ہے۔ دل میں وَر رونہ ہو تو لفظ سرد پڑ جاتے ہیں مرجاتے ہیں۔ لفظ وہ نہیں جو زبان سے نکلے لفظ تو وہ ہے جو دل سے نکلے اور سیدھا دل پر جا اُترے۔ دل میں اُترنے والے لفظ اپنے دل کا لہو کیے بغیر سفر نہیں کر سکتے۔ نازیہ کنول نازی ایسی ہی درد آشنا لکھاری ہے وہ قلم سے نہیں دل سے لکھتی ہے جبھی تو اس کی تحریر دل پر اثر کرتی ہے، اور وہ اپنے قارئین کے دلوں میں گھر کرتی جاتی ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ کسی دوسرے کی تعریف کرنا اپنے بھاؤ گرانے کے مترادف ہے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ جو دوسروں کی محنت اور صلاحیت کو ان کی کسی خوبی اور کام کی ادائیگی، خوش اسلوبی کو سراہنے کا ظرف رکھتے ہوں وہ اپنی ہی نظروں میں معتبر ہو جاتے ہیں فنونِ اُدب وہ میدان ہے جہاں حسد کے بُول بھی اُگتے ہیں اور رشک وستائش کے پھول بھی کھلتے ہیں۔ کسی کی مدح بیان کرنا گو کہ مشکل کام ہے لیکن کچھ لوگوں کا کام خود بخود اپنی مدح پر اُکساتا ہے۔ نازیہ کنول نازی ایک ایسی ہی قلمکارہ ہیں جو خود بخود اپنی محبت کی تعریف وتوصیف وصول کر لیتی ہیں۔ ''جو ریگِ دشتِ فراق ہے'' نازیہ کنول نازی کا ایسا ہی خوبصورت یادگار شاہکار ہے جو'' آنچل ڈائجسٹ'' کے قارئین کی پسندیدگی کی سند حاصل کر چکا ہے اور مجھے یقین ہے کہ کتاب کے قارئین بھی نازیہ کی اس خوبصورت تخلیق کو سراہے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ اس ناول میں چار سہیلیوں کی زندگیوں کے مختلف ادوار کا احاطہ کیا گیا ہے، اور یہ پیغام دیا گیا ہے کے اگر جذبوں میں صداقت ہو، نیت نیک ہو، دل کی لگن سچی ہو، دعاؤں پر یقین اور دعائیں قبول کرنے والے پر ایمان پختہ ہو تو ''ریگِ دشتِ فراق'' وصل کے پھولوں سے بھر جاتا ہے۔ قلمکارہ نے بڑی عمدگی سے دشتِ فراق میں وصل ووفا اور مہر ورجاء کے کنول کھلائے ہیں۔

یہ کہانی اریشہ، انجشاء، تمکین اور شیزا، کی کہانی ہے۔ وقت اور حالات نے اُن کے ساتھ کیسی آنکھ مچولی کھیلی، دکھوں اور سکھوں کے کیسے کیسے موسم اُن پر اُترے۔ ہجر وفراق کی کیسی کیسی جاں گسل گھڑیاں دلوں پہ بار بنیں، آنکھوں نے کب کب اشکوں کے دریا چڑھتے اور پھر مسکراہٹوں کے بادباں کھلتے دیکھے۔ رت جگوں اور بے قراریوں نے کس کس کی زندگی میں درد وآزمائش کی صلیب گاڑی۔ سچے جذبوں اور دلوں سے نکلی دعاؤں نے کیسے ریگِ دشتِ فراق میں ہر ذرّے کو آفتاب اور ہر بُول کو پھول کر ڈالا۔ کڑی آزمائشوں کے بعد اپنے اپنے حصے کے دکھ سہنے غم جھیلنے اور جدائی کا زہر پینے کے بعد سب کو کیسے محبت کے ملن رُت کے جام میسر آئے ہیں یہ جاننے کے لیے یقیناً آپ بھی بے تاب ہوں گے۔ نازیہ نے اپنے ہر کردار کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ اریشہ، ازمیر، اریج احمر، انجشاء کا ہر دم دل کو بھاتا انداز انگوٹھی میں نگینے کی طرح جڑا لگتا ہے ہر کردار۔ کبھی عدنان تمام تر ہمدردیاں سمیٹنے لگتا ہے تو کبھی اریج احمر بے بس و بے قرار نظر آنے لگتا ہے، کبھی تمکین ستم گزیدہ اور مظلوم لگتی ہے تو کبھی شیزا ظالم اور خود غرض دکھائی دیتی

ہے۔ ناول میں اور بھی بہت سے کردار بہت عمدہ ہیں اریشہ کے باپ کا کردار بھائی فرحان کا کردار، اشعر کا خود غرضانہ اور شکی انداز اور بہت کچھ قارئین کو اس ناول میں پڑھنے کو ملے گا۔ ناول شروع سے آخری حصے تک دلچسپی کا عنصر لیے ہوئے ہے۔ میری دعا ہے کہ نازیہ کنول نازی کی کتابی شکل میں پیش کی جانے والی یہ دوسری نثری کاوش بھی قارئین کے ذوقِ مطالعہ کا حصہ بنے۔ اُن کے شوق کو جلا بخشے اور نازیہ کی کامیابیوں کا سفر اپنے مداحوں کی، قارئین کی پسندیدگی محبتوں اور دعاؤں کے ساتھ ساتھ جاری وساری رہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔'' آمین!

سُباس گُل

رحیم یار خان

بہادر لڑکی حساس قلمکار

محبت میں کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ زندگی بھر ساتھ نبھانے والے رشتے اچانک کسی موڑ پر، کسی خاص مقام پر اپنی راہ الگ کر لیتے ہیں تو پھر کچھ خدشات انسان کو اندر ہی اندر سے کچو کے لگانے لگتے ہیں تو پھر کچھ لوگ خدائے بزرگ و برتر کے خاص کرم سے قلمکار بن جاتے ہیں۔

نازیہ کنول نازی بھی اردو ادب کی ایک بہادر قلمکار ہے جس نے زندگی کے دکھوں کے سامنے سر جھکانا نہیں سیکھا بلکہ جرأت و بہادری سے ان دکھوں کا مداوا کرنے کی ہمت اپنے اندر پیدا کی ہے، ورنہ چھوٹی سی عمر میں اپنے جذبوں کے ساتھ ساتھ دوسرے لوگوں کے جذبات کی عکاسی کرنا کوئی آسان کام نہیں۔

''جو ریگ دشتِ فراق ہے'' نازیہ کنول نازی کی ذہنی پختگی کا نہ صرف عکاس ناول ہے بلکہ فنی گرفت بھی پوری طرح نظر آتی ہے۔

نازیہ کنول نازی نے اپنے ناول ''جو ریگ دشتِ فراق ہے'' کے موضوع کو جس طرح پڑھا ہے اور کردار کشی کے ساتھ ساتھ نظر نگاری کی ہے وہ اسی تخلیق کار کا خاصہ ہے۔

ہمارے معاشرے کی ان زبانوں کو نازیہ کنول نازی کا لہجہ عطا کیا ہے جو مدتوں سے گنگ تھیں۔ خواتین کے معاشرتی اتار چڑھاؤ، محبت کے عروج و زوال زندگی کی تہہ در تہہ چھپی ہوئی رعنائیوں اور ذہنی حقیقتوں کو نازیہ کنول نے جس طرح صفحہ قرطاس پر بکھیرا ہے عقل دنگ اور بصارت حیران رہ جاتی ہے۔

میری دعا ہے کہ نازیہ کنول نازی بصارت سے بصیرت تک کے اس سفر میں ہمیشہ اپنی منزل پائے آمین۔

دعا گو

منان قدیر منان

نازیہ کنول نازی، اَدبی دنیا کا روشن ستارہ

یہ ہمارا معاشرہ ہے جس میں لوگ صنف نازک کو کسی بھی میدان میں آگے بڑھتے ہوئے دیکھنا گوارہ نہیں کرتا۔ المیہ یہ ہے کہ ہم سے کچھ لوگ عورت کو صرف باندی او(Show Piece) کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں ایسے لوگ عورت کو آگے بڑھتے ہوئے دیکھنا گوارہ نہیں کرتے اور نہ ہی وہ چاہتے ہیں کہ عورت کسی میدان میں اپنا نام کما سکے، وہ اگر عورت کو دیکھنا چاہتے ہیں تو صرف ان کے چرنوں کی داسی کے روپ میں، لیکن ہمارے معاشرے میں کچھ ایسی باہمت لڑکیاں بھی موجود ہیں جو ایسے حالات میں آگے بڑھ رہی ہیں اور مشکلات کی فلک بوس فصیلیں ان کی ہمت کے سامنے ریت کی چھوٹی چھوٹی دیواریں ثابت ہوتی ہیں ایسی چند باہمت لڑکیوں میں ایک ذات نازیہ کنول نازی کی بھی ہے۔

نازیہ کا پہلا شعری مجموعہ ''بچھڑ جانا ضروری تھا'' شائع ہوا تو بعض لوگوں کے ذہنوں میں موجود نفرتوں کے آتش فشاں پھٹ پڑے اور انہوں نے نفرتوں کا دہکتا ہوا مدفن لاوہ اُگلنا شروع کر دیا، عجیب وغریب سوالات اُٹھائے گئے لیکن نازیہ کے پاؤں میں ذرہ سی بھی لرزش پیدا نہ ہوئی، تمام مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے انہوں نے اپنا ناول ''اے مژگان محبت''، ''خواب نگر کی مسافتیں'' اور شائع کروایا اس پر بھی تنگ ذہنیت کے لوگوں نے اعتراضات اُٹھائے لیکن نازیہ کنول نازی اسی طرح باہمت ہو کر لکھتی رہیں اور اُنہوں نے ادبی خدمت کو عبادت سمجھ کر جاری رکھا اور اب ان کا ناول ''جو ریگ دشت فراق ہے'' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

نازیہ کنول نازی کی تخلیقات میں شعری مجموعہ ''بچھڑ جانا ضروری تھا'' تنہا چاند اور ناول میں ''اے مژگان محبت''، ''خواب نگر کی مسافتیں'' کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا ان کی شاعری محبت کا ایسا سمندر ہے جس میں لازوال سیپیاں اور ہیرے موتی موجود ہیں۔ ان کا انداز تحریر منفرد اسلوب کا حامل ہے ان کے خیالا کی اُڑان بہت اونچی اور ان کے لفظوں کا سنگھار اپنی مثال آپ ہے، دنیا کی بے ثباتی، تصوف، ہجر فراق کے مضامین میں سادگی ان کے ناول کے خاص موضوعات ہیں ان کی شاعری ہو یا ناول ان کے خوبصورت موضوعات ان کی تحریروں کو روایت اور جدت سے سجاتے ہیں۔ ''جو ریگ دشت فراق ہے'' میں معاشرے کے حقیقی رنگوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ''محبت کی دیوی'' نازیہ کنول نازی کے قلم کی روانی میں اور اضافہ کرے۔

خضر حیات مون

چیف ایڈیٹر

ماہنامہ ''نوائے سنگت'' ملتان

جو ریگِ دشتِ فراق ہے

شاخ سے ٹوٹ کے غنچے بھی کبھی کھلتے ہیں
رات اور دن بھی زمانے میں کبھی ملتے ہیں
بھول جا' جانے دے' تقدیر سے تکرار نہ کر
میں تو اک خواب ہوں' اس خواب سے تو پیار نہ کر

چھاجوں مینہ برس رہا تھا۔ بارش کے منہ زور قطرے دور دور تک زمین کو سیراب کر رہے تھے، اور اس کے خوب صورت سے لان میں لگے گلاب، موتیا اور نرگس کے دل کش پھولوں کے علاوہ تمام پودے دھل دھلا کر نکھر گئے تھے۔ ہری ہری گھاس پر ٹھنڈک کا احساس مزید بڑھ گیا تھا، اور وہ یوں ہی گھٹنوں پر سر ٹکائے، آسمان سے کسی نعمت کی مانند برستی ہوئی بارش کو دیکھتی رہی۔

کالج اور یونیورسٹی پیریڈ میں چھما چھم برستی بارش ان چاروں دوستوں کو کیسے سرشار کر دیتی تھی۔ تمام پیریڈ مس کر کے یونیورسٹی کے سر سبز لان میں درختوں کے نیچے بیٹھ کر اس موسم کو نمکو، چپس اور پیپسی کے ساتھ انجوائے کرنا کتنا اچھا لگتا تھا۔ وہ تو خیر بچپن سے بارش کی رسیا تھی۔ ٹھہرے ہوئے پانی میں کاغذ کی کشتیاں بنا کر، انہیں اپنے ہاتھوں سے بہا دینا اس کا محبوب مشغلہ تھا، مگر اس کے ساتھ ساتھ انجشاء اریشہ اور ثیزا بھی کس قدر دیوانی تھیں ساون کی بارش کی۔ جب بھی آسمان پر کالی گھٹا کو اٹھتے ہوئے دیکھتیں مارے مسرت کے جھومنے لگتی تھیں۔ شاید تمام لڑکیاں ہی ایسی ہوتی ہیں، بارش، پھولوں اور تتلیوں سے پیار کرنے والی، کالج اور یونیورسٹی کی کچھ حسین یادیں، آج اس برستی بارش کو دیکھ کر، بالکل اچانک ہی اس کے ذہن میں تازہ ہو گئیں۔ اسپیشلی یونیورسٹی کا وہ الوداعی دن جب وہ چاروں ایک دوسرے سے جدا ہو رہی تھیں تو اریشہ نے سب کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا تھا کہ وہ چاروں زندگی میں کہیں بھی جائیں، کیسے بھی رہیں مگر ایک دوسرے کو کبھی فراموش نہیں کریں گی۔ ہر حال میں ایک دوسرے سے رابطہ رکھیں گی، اور اپنے اپنے حالات سے ایک دوسرے کو باخبر رکھیں گی، مگر وہ چاروں ہی یہ وعدہ ایفاء نہیں کر پائی تھیں کیوں کہ یونیورسٹی پیریڈ کے بعد انجشاء اپنے گاؤں واپس لوٹ گئی جہاں اس کی شان دار سی حویلی میں فون تو تھا مگر مسلسل کوشش کے بعد بھی رابطہ ممکن نہ ہو سکا تھا۔ اول تو بیل ہی نہیں جاتی تھی۔ لائن مسلسل انگیج ملتی پھر خوش قسمتی سے لائن مل بھی جاتی تو بیل جاتی رہتی مگر کوئی فون ریسیو نہ کرتا۔ تنگ آ کر تمکین نے یہ سلسلہ ترک کر دیا اور گاؤں کے پتے پر انجشاء کے نام اک تفصیلی خط لکھ کر پوسٹ کر دیا۔ مگر دو ماہ گزرنے کے باوجود بھی اس کے خط کا جواب نہ آیا تو اس نے

اریشہ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی اور فون کرنے پر اسے پتا چلا کہ وہ ''شاہ ولاج'' میں نہیں ہے بلکہ نامعلوم مدت تک کے لئے اپنے پاپا سے ملنے دوبئ چلی گئی ہے، تب مایوس ہو کر اس نے اریشہ سے بھی رابطہ ترک کر دیا، اور بعد میں اس کا اپنا نمبر تبدیل ہو گیا۔ شیزا چوں کہ اس کی پھوپھو زاد تھی لہٰذا ان دونوں کا ملاپ پہلے کی طرح ہی جاری تھا۔ کبھی شیزا اس کے پاس آ جاتی تو کبھی وہ ان کے گھر چلی جاتی۔

ان دنوں چوں کہ اس کے گھر میں، اس کے تایا زاد کزن عاشر آفندی کی شادی کے ہنگامے چل رہے تھے تو شیزا کافی دنوں کے لئے ادھر ہی آئی ہوئی تھی اور وہ اس کی آمد پر انتہا سے زیادہ مسرور تھی۔ مگر کبھی کبھی اریشہ اور انجشاء کی یاد اسے اداس کر دیتی تھی۔ وہ پہروں ان لوگوں کو یاد کرتی رہتی اور اپنا دل جلاتی۔

اس وقت بھی وہ لان سے جڑے برآمدے کی سیڑھیوں پر اداس سی بیٹھی انہی کے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ شیزا اسے پورے گھر میں ڈھونڈ کر بالآخر ادھر ہی چلی آئی پھر اسے برآمدے کی سیڑھیوں میں گم سم سا بیٹھا دیکھا تو دھیمے سے مسکرا کر اس کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے وہیں اس کے پہلو میں بیٹھ گئی اور خوب چہک کر بولی۔

''خیریت! ایسا اکیلے اکیلے کسے یاد کیا جا رہا ہے بھئی؟''

اس کے کھنک مار لہجے پر تمکین نے چونک کر سر اوپر اٹھایا تھا پر اس کے لبوں پر پھیلی دل کش مسکراہٹ کو دیکھتے ہوئے قدرے کھوئے کھوئے سے انداز میں بولی۔

''شیزا آج مجھے اریشہ اور انجشاء کی بہت یاد آ رہی ہے۔ کتنے دن ہو گئے ہیں ناں ان سے جدا ہوئے۔''

''اوسوری بھئی۔ میں تو سمجھی تھی کہ تم یہاں، چھما چھم برستی بارش کو انجوائے کرتے ہوئے اشعر بھائی کو یاد کر رہی ہو۔ ویسے ایک گڈ نیوز ہے تمہارے لیے۔ محترم کل شام کی فلائٹ سے واپس پاکستان آ رہے ہیں۔''

اس کی بات کو قطعی نظر انداز کرتے ہوئے وہ اپنے مخصوص انداز میں چہکی تھی، اور اس کے یوں بات بدل کر اشعر کے متعلق معلومات دینے پر وہ پل کے پل میں سرخ گلاب کی مانند کھل گئی۔

''لو میں تو تمہیں بتانا ہی بھول گئی۔ بڑی ماں کب سے تمہیں یاد کر رہی ہیں۔ چلو اٹھو جلدی سے۔''

اس کی لانبی پلکیں لرزتی دیکھ کر وہ پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے افسوس کے انداز میں بولی۔ ساتھ ہی اسے بازو سے پکڑ کر اٹھا دیا۔

''ایک منٹ' ایک منٹ۔ دیکھو یہ اشعر بھائی کے سامنے ہمہ وقت اریشہ اور انجشاء کی تسبیح نہ پڑھتی رہنا۔ چڑ جائیں گے بھئی؟''

وہ جانے کے لیے مڑی تھی جب شیزا نے ایک دم سے اس کے سامنے آ کر بڑے بوڑھوں کے انداز میں نصیحت کی۔ جواب میں تمکین نے منہ چڑانے والے انداز میں لب پھیلا کر تابعداری سے ''جی اچھا'' کہا پھر اسے مصنوعی خفگی سے گھورتے ہوئے اندر ٹی وی لاؤنج میں چلی آئی جہاں عائشہ بیگم اسی کی منتظر بیٹھی تھیں۔

''آؤ تمی بیٹا! میں کب سے تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔''

اسے قریب آتے دیکھ کر انہوں نے اپنائیت سے کہا۔ پھر اپنے قریب ہی صوفے پر اس کے لئے جگہ بنائی۔

''نمی بیٹے! اشعر کل پاکستان آ رہا ہے۔ تم تو جانتی ہو کیسے نخریلے مزاج کا لڑکا ہے وہ۔ پھر شادی والا گھر ہے۔ کہیں امن سکون کا راج نہیں۔ تم ایسے کروشیزا کے کمرے میں شفٹ ہو جاؤ اور اپنا کمرہ اشعر کے لئے ڈیکوریٹ کر دو۔ تھوڑے سے دنوں کی تو بات ہے۔ کوئی شکایت کرنے کا موقع نہ دینا اسے۔''

عائشہ بیگم یوں حلیمی سے التجا کر رہی تھیں گویا انہیں تمکین کا کسی بھی صورت میں اپنا کمرہ چھوڑنے کا گمان نہ ہو جبکہ اشعر کے لئے تو وہ اپنی جان بھی تج سکتی تھی پھر کمرے کی کیا حیثیت تھی۔ الٹا اس کے دل میں تو یہ بات سن کر خوشی کے جلترنگ سے بج اٹھے تھے کہ اشعر اس کے کمرے میں قیام کرے گا۔ اس کی مانوس خوشبو اس کے کمرے کے در و دیوار میں رچ بسے گی تب ہی تابعداری سے سر جھکا کر اس نے دھیمے سے ''جی'' کہا تو عائشہ بیگم نے اسے ڈھیروں دعاؤں سے نواز ڈالا۔ شاید انہیں یقین نہیں تھا کہ بے انتہا ضدی، ان کی لاڈلی پوتی اتنی جلدی مان جائے گی کیونکہ وہ شروع سے اس کی ضدی فطرت سے مکمل آگاہ تھیں۔

کمرہ تو دور کی بات وہ تو اپنی معمولی سے معمولی چیز بھی کسی کو دان نہیں کرتی تھی۔ بچپن میں اگر کوئی اس کے کھلونوں کو چھو بھی لیتا تو وہ رو رو کر سارا گھر سر پر اٹھا لیتی تھی، اور پھر شدید غصے میں وہ سارے کھلونے توڑ دیتی کہ جن پر کسی اور کے ہاتھوں کے چھو جانے کا ذرا سا بھی شک ہوتا اسے، اور صرف کھلونے ہی کیا اپنے کپڑے، اپنی کتابیں، اپنے استعمال کی ایک ایک چیز وہ صرف خود تک ہی محدود رکھتی تھی۔ گھر کے کسی فرد کو اس کی کسی چیز کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہ تھی۔

جوانی میں آ کر بھی اس کی یہی عادات رہی تھیں۔ ہاں اتنا فرق ضرور آیا تھا کہ اب وہ خود سے، کسی چیز کے مانگنے پر وہ چیز اپنے من پسند افراد کو ضرور دیتی تھی اور بعد میں مقررہ وقت پر واپس بھی لے لیتی تھی۔ صرف ایک اس خامی کے علاوہ اس میں باقی تمام خوبیاں ہی خوبیاں تھیں۔ فرماں بردار، ملنسار، سب کے کام آنے والی وہ ایک بہت اچھی لڑکی تھی۔

اور اب اشعر آ رہا تھا پورے بارہ سالوں کے بعد، وہ اشعر کہ جس میں اس کی جان تھی جس کی جدائی کا ایک ایک پل اس نے بڑی مشکل سے رو رو کر کاٹا تھا۔ اب اس کے تمام دکھ تمام اداسیوں کو سمیٹنے کے لئے آ رہا تھا اور وہ اس پر بے انتہا سرشار تھی۔

☆☆☆

''ارے گرلز سنو سنو...... محترم ازمیر شاہ نے فرسٹ ڈویژن سے ایم اے انگلش کلیئر کر لیا، تالیاں......''

ماہم شاہ بھاگتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ پھر بلند آواز میں وہاں موجود لڑکیوں کے جمع شدہ گروپ کو تازہ خبر سنائی تو جواب میں سبھی لڑکیاں ماسوائے اریشہ کے کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

''واہ واہ کیا زبردست نیوز سنائی ہے یار...... مزا آ گیا۔ ویسے تم نے اس شاندار کامیابی پر کوئی ہار وار نہیں پہنایا اسے؟''

رانیہ فوراً چہکی تھی۔ جواب میں ایک مرتبہ پھر قہقہوں کا سیلاب امڈ پڑا۔

''لو! میں کیسے ہار پہناتی انہیں۔ محترم گردن ہی تفاخر سے یوں اکڑائے پھر رہے ہیں جیسے پتہ نہیں کتنا بڑا تیر مار لیا ہو۔''

ماہم کا لہجہ ایک مرتبہ پھر طنز سے بھرپور تھا۔ لڑکیوں کی کھلکھلاہٹ مزید دوبالا ہوگئی۔

''بھئی وہ ایم اے انگلش کرلے یا ایم اے فارسی کم از کم اس جنم میں تو کوئی اچھی لڑکی اسے گھاس ڈالنے والی نہیں۔ کیوں درست کہہ رہی ہوں ناں میں''

شریر عدیلہ نے کن انکھیوں سے اریشہ پر اک سرسری نظر ڈال کر قدرے تفاخر سے کہا تو لڑکیوں نے ہنستے ہوئے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔

''لو اور سنو! پچھلے دنوں محترم کو اپنی اک کلاس فیلو حسینہ سے عشق ہوگیا اور جناب نے نہایت دیدہ دلیری سے اظہارِ عشق فرما بھی دیا۔ بس پھر تو کچھ مت پوچھو کہ کیا ہوا؟ اس حسینہ نے خوب جما کر وہ زبردست تھپڑ لگایا کہ جناب کی آنے والی سات نسلیں بھی یاد رکھیں گی۔''

طنز و مزاح کی اس محفل میں فائقہ کیوں پیچھے رہتی۔ تب ہی خوب اٹھلا کر نخوت سے بولی تو سبھی لڑکیاں افسوس سے سر ہلاتے ہوئے ایک مرتبہ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

''ویسے سوچنے کی بات ہے۔ یہ سات نسلیں آئیں گی کہاں سے......؟''

نشہ نے کچھ اس انداز میں منہ بنا کر رازداری سے کہا کہ لڑکیوں سے اپنی ہنسی پر قابو پانا دشوار ہوگیا۔ تب اریشہ سے مزید برداشت نہ ہوسکا تو چلا اٹھی۔

''بند کرو تم لوگ یہ اپنی گندی بکواس۔ ازمیر نے اگر کسی لڑکی کو چاہا ہے تو دنیا کا کوئی انوکھا کام نہیں کیا۔ وہ بھی ایک انسان ہے تم لوگوں کی طرح اس کے سینے میں بھی، محبت بھرا اک خوب صورت دل ہے۔ جسے کوئی اچھا لگ سکتا ہے پھر اس میں یوں گدھوں کی طرح ہنسنے والی کونسی بات ہے۔''

اسے ازمیر کا مذاق بننا برا لگتا تھا لہٰذا اس وقت بھی وہ خود پر کنٹرول نہ رکھ پائی تھی اور ان پر چلا اٹھی

''لو بی بی نیک بخت بھی یہاں بیٹھی ہیں۔ ہمیں تو پتا نہیں تھا۔''

ماہم کو اس کا یوں ازمیر کے لئے چلانا سخت برا لگا تھا، تب ہی اس نے منہ بنا کر اسے نشانے پر لینے کی کوشش کی مگر اریشہ نے ایک مرتبہ پھر اسے بری طرح ڈپٹ کر رکھ دیا۔

''شٹ اپ! شرم آنی چاہیے تم لوگوں کو۔ اپنے ہی کزن کے خلاف اتنی گھٹیا زبان استعمال کرتے ہوئے۔ تم لوگوں کو ذرا سا بھی احساس نہیں کہ اگر تمہاری یہ باتیں اس کے کانوں تک پہنچ جائیں تو اسے کتنا دکھ ہوگا۔ پتہ نہیں کہاں مرگئی ہے تمہارے اندر کی انسانیت؟''

اس کے قدرے جذباتی ہوکر چلانے پر قہقہوں کی بازگشت کچھ لمحوں کے لئے تھم گئی۔

''تمہیں بڑی ہمدردی ہو رہی ہے اس سٹریل کریلے سے۔ کیا بات ہے؟ کہیں تعویذ وغیرہ تو نہیں کروا دیئے تم پر۔'' فائقہ کو بھی رنگ میں بھنگ ڈالنا سخت ناگوار گزرا تھا۔ تب ہی اریشہ کی سمت مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کروفر بھرے انداز میں بولی تو اریشہ نے مارے ضبط کے اپنی

مٹھیاں بھینچ لیں۔

''میں کہتی ہوں بکواس بند کرو اپنی۔تم لوگوں کا گھٹیا پن، تمہاری اس گندی سوچ اور پست گفتگو سے بخوبی عیاں ہے مجھ پر۔تم لوگ کسی ریاست کی شہزادیاں ہو ناں تو ٹھیک ہے۔دن رات سجدے کرو اپنے حسن کو مگر پلیز بہت مہربانی ہوگی اگر تم لوگ اپنی زبان سے ازمیر کا ذکر کرنا بھول جاؤ۔''

مارے اشتعال کے اس کی چھوٹی سی ناک پھنگیں پھول گئی تھیں۔تب وہاں موجود اپنی تمام کزنز پر افسوس بھری اک الوداعی نظر ڈال کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

''ہونہہ! پتا نہیں سمجھتی کیا ہے خود کو۔وہ سڑیل کریلا اسے ہم سے زیادہ عزیز ہو گیا اور بھئی ہو کیوں ناں؟ ہمہ وقت ملازموں کی طرح آگے پیچھے جو پھرتا رہتا ہے کہ شاید اریشہ جیسی حور اس وسیلے سے اس پر توجہ کر سکے۔ہونہہ! پتہ نہیں دن میں ایک بار آئینہ بھی دیکھنے کی زحمت گوارہ کرتا ہے یا نہیں؟''

ماہم کے لہجے میں جلن کی چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں تب ہی وہاں موجود دیگر لڑکیوں نے سر جھٹک کر اسے ریلکس ہونے کی نصیحت کی پھر دوبارہ اپنے من پسند موضوعات پر تبصرے کرنے لگیں۔

اریشہ نے کمرے سے نکل کر سیدھا ازمیر کے کمرے کا رخ کیا جو نہایت خوشی کے عالم میں فون پر کسی سے محوِ گفتگو تھا، پھر نظر جوں ہی اس کے سادہ سے سراپے پر پڑی۔وہ فون بند کر کے اس کی طرف چلا آیا۔

''بہت بہت مبارک ہو ازمیر! آج تم نے ایک اور بہت بڑی کامیابی کو حاصل کر لیا۔بولو ٹریٹ کب دے رہے ہو اس خوشی میں۔''

تھوڑی دیر پہلے والی کیفیت سے نکل کر وہ خاصے بشاشت بھرے انداز میں بولی تھی۔ازمیر نے دھیمے سے مسکرا کر بھرپور نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا پھر اسی طرح مسکراتے ہوئے پُرسکون لہجے میں بولا۔

''جب تم کہو۔اور جہاں کہو۔میں ٹریٹ دینے کے لئے تیار ہوں۔ہاں اتنا ضرور کہنا چاہوں گا کہ تمہارے الفاظ نے مجھے جس قدر خوشی دی ہے وہ میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔''

اس کی غلافی سیاہ آنکھوں میں خوشی کے ہزاروں دیپ روشن تھے۔اریشہ نے بھرپور محبت سے اسے مسکراتے ہوئے دیکھا پھر قدرے کھوئے کھوئے سے انداز میں بولی۔

''تم مسکراتے ہوئے کتنے خوب صورت لگتے ہو ازمیر۔یہ تو مجھے آج ہی پتہ چلا ہے۔''

''اس عنایت کے لئے بے حد شکریہ۔''

بھرپور مسرت سے جوابی رسپانس میں اس نے کہا تھا۔پھر بے ساختہ ہی کھلکھلا کر ہنس پڑا۔اریشہ تو بس اسے دیکھتی ہی گئی۔

گندمی رنگ، ذہانت سے چمکتی سیاہ غلافی آنکھیں، چوڑی پیشانی، متناسب ناک اور کشادہ پیشانی پر بکھرے بھورے گھنگریالے بال۔وہ

کہاں سے اتنا بدصورت تھا کہ یوں محفلوں میں مذاق بنتا؟ اور پھر حسن کیا صرف وہی ہوتا ہے جو چہرے پر نظر آئے۔ اگر ایسا ہوتا تو خدا ارمانوں بھرا خوب صورت دل کیوں دیتا ہے؟ کیوں نہیں چھین لیتا بدصورت لوگوں کی دیکھنے والی آنکھیں؟ کیوں محبت کی تڑپ ڈال دیتا ہے ان کے دل میں؟''

کتنی ہی دیر گم سم سی وہ اس کے چہرے میں کھوئی رہی جہاں ڈھونڈے سے بھی اسے کوئی بدصورتی نظر نہیں آ رہی تھی۔

''ارے تم کہاں کھو گئیں؟''

وہ جو پتا نہیں کیا کیا کہے جا رہا تھا۔ اسے یوں گم سم سا اپنی طرف ایک ٹک دیکھتے ہوئے پایا تو چونک کر استفسار کر بیٹھا۔ جواب میں اریشہ نے دھیرے سے نفی میں سر ہلا کر مسکراتی ہوئی اک نظر اس پر ڈالی پھر اسے دوبارہ اس کی کامیابیوں پر مبارک باد دیتی ہوئی چھپاک سے اس کے کمرے سے باہر نکل آئی تو اس کے اس انداز پر از میر سر جھٹک کر دھیمے سے مسکرا دیا۔

☆☆☆

''ایکسکیوزمی مس! پلیز میری بات سنیں۔''

قطعی غیر مانوس پکار پر انجشاء نے گردن گھما کر پیچھے نظر کی تو نگاہوں کے حلقوں میں وہی دلکش سا چہرہ آ گیا جو وہ روز آفس سے باہر نکلنے پر قدرے ناگواری سے دیکھتی رہی تھی۔ پچھلے دو ماہ سے وہ لڑکا اس کے آفس کے باہر اپنی شان دار سی گاڑی سے ٹیک لگائے ہوئے اسی کا منتظر کھڑا ہوتا اور وہ ہر روز اس پر اک سرسری ناگوار نظر ڈال کر آگے بڑھ جاتی۔

پچھلے دو ماہ سے اس لڑکے نے کبھی اس کا راستہ روکنے یا اس سے مخاطب ہونے کی ہمت نہیں کی تھی۔ مگر آج دو ماہ کے بعد وہ اسے پکارنے کی جسارت کر بیٹھا تھا۔ جواب میں انجشاء نے خاصی حیرت سے اس کی سمت نگاہ کی۔

''دیکھئے میں پچھلے دو ماہ سے ہر روز آندھی طوفان بارش میں بھی صرف اور صرف آپ کے لئے یہاں اس آفس کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہوں۔ یہاں تک کہ شدید دھوپ اور گرمی کی بھی پروا نہیں کرتا۔ جانتی ہیں کیوں؟ کیوں کہ میں آپ کو پسند کرتا ہوں اور آپ سے اپنے دل کی تمام باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

کمال جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے فقط دو ہی پل میں اپنا مدعا بیان کر دیا تو اک دھیمی سی دل آویز مسکراہٹ انجشاء کے لبوں پر بکھر گئی۔ تب ہی وہ قدرے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔

''تو پھر اب میں کیا کروں؟''

بے حد پر سکون انداز میں اس نے کہا۔ جواب میں اس کے سامنے کھڑے اس خوب رو سے لڑکے کی گویا ہمت بندھی تھی تب ہی وہ بولا تو اس کے لہجے میں پہلی سی گھبراہٹ نہیں تھی۔

''وہ...... میں آپ سے تنہائی میں ملنا چاہتا ہوں''

فوراً ہی اس نے اپنا مدعا بیان کر دیا تو انجشاء نے بے حد دلچسپی سے اس کی سمت دیکھا پھر مسکراتے ہوئے بولی۔

''سوری مگر میں آپ سے ملنا نہیں چاہتی۔''

''کیوں؟ آئی مین آپ مجھ پر مکمل اعتماد کر سکتی ہیں۔''

نوجوان کے چہرے پر پل کے پل میں جھنجھلاہٹ کے تاثرات ابھرے تھے جسے اس نے کمال مہارت سے چھپانے کی کوشش کی، اور اس کے اس انداز پر انجشاء اپنی گہری ہوتی مسکراہٹ کو روک نہ پائی۔

''دیکھیے میں تو آپ پر اعتماد کر سکتی ہوں کیونکہ آپ کے چہرے پر صاف لکھا ہوا ہے کہ آپ کسی شریف خاندان کی پیداوار ہیں، لیکن وہ کیا ہے کہ میرے شوہر کو آپ پر اعتماد نہیں ہو سکتا اور پھر وہ ہے بھی بہت سخت۔

ایسے ہی مجھے آپ کے ساتھ دیکھ لیا تو مجھے تو کچھ نہیں کہے گا مگر معذرت کہ آپ کا حشر نشر کر دے گا۔''

وہ جانتی تھی کہ اسے اپنی حفاظت کیسے کرنی ہے تب ہی قطعی کنفیوز ہوئے بغیر خاصے آرام سے بولی تو اس کے سامنے کھڑے اس خوب رو نوجوان کی آنکھوں میں پل کے پل جیسے کچھ ٹوٹ کر بکھر گیا۔ تب ہی وہ اپنے لہجے کی کپکپاہٹ پر قابو نہ پا سکا اور ہچکچاتے ہوئے بولا۔

''آ......آپ شادی شدہ ہیں؟''

کس قدر بے یقینی تھی اس کے لہجے میں۔ انجشاء نے بنا اس پر توجہ کئے چپ چاپ اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ایکسکیوز می مجھے دیر ہو رہی ہے میرے خیال میں مجھے چلنا چاہیے......خدا حافظ''

اگلے ہی پل اپنے مخصوص انداز میں نہایت سکون کے ساتھ اس نے کہا، اور اپنے تلے قدم اٹھاتی وہاں سے دور ہوتی گئی۔

نوجوان نے شدید بے بسی کے عالم میں اپنا ہاتھ گاڑی کے بونٹ پر مارا تو اس کے اردگرد چھپے ہوئے تمام دوست نکل کر اس کے قریب چلے آئے۔

''کیا ہوا۔ لڑکی پٹ گئی کہ نہیں؟''

اس کے سب سے عزیز دوست شاہد نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اپنے مخصوص لوفرانہ انداز میں کہا تو نوجوان نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا پھر اسی طرح قدرے شکستہ انداز میں بولا۔

''شادی شدہ ہے یار۔ میری عقل گھاس چرنے گئی تھی جو میں پچھلے دو ماہ سے اس کے لئے خوار ہوتا رہا۔''

جھنجھلاہٹ اور غصہ اس کے چہرے پر واضح دکھائی دے رہا تھا۔ تب ہی صغیر آگے بڑھا اور اسے حوصلہ دیتے ہوئے بولا۔ ''شادی شدہ ہے تو کیا ہوا۔ تمہیں کون سا نکاح پڑھوانا ہے اس سے؟ بس اپنا مطلب نکال اور بھول جا۔''

صغیر کے تیز لہجے نے اسے چونکا دیا۔ قدرے توجہ سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو صغیر اسے آنکھ مارتے ہوئے ہنس پڑا۔ جواب میں اس کے لبوں پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی۔

''اچھا مشورہ ہے یار۔ میں بھی کتنا ڈفر ہوں۔ خوامخواہ اس کے ہاتھ سے نکل جانے پر ہرٹ ہو رہا تھا۔''

دائیں ہاتھ سے اپنی پیشانی پر بکھرے بال سمیٹتے ہوئے وہ قدرے متبسم انداز میں بولا تو اس کے دوستوں نے گویا سکون کا سانس لیا کیونکہ وہ جب بھی ڈیپریس ہوتا تھا اپنے ساتھ ساتھ اپنے تینوں دوستوں کو بھی پریشان کر کے رکھ دیتا تھا۔

''چل اب جلدی سے گھر پہنچ۔ وہ تمہاری مس قلوپطرہ ثانیہ میڈم پچھلے کئی گھنٹوں سے تمہارے انتظار میں بیٹھی ہے۔تم بھی ناں یار۔کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کرتے۔ پورے تین ماہ سے لٹکا رکھا ہے اسے۔ دفع کرو۔ جان چھڑاؤ اس سے۔''

اب کے مومن بولا تھا اور اس کے اس ڈپٹنے والے انداز پر اس نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ پھر آہستہ سے سر اثبات میں ہلا کر گاڑی میں آ بیٹھا اور تینوں دوستوں کو قریبی ریستوران کے پاس ڈراپ کر کے سیدھا گھر چلا آیا۔ جہاں واقعی اس کی نمبر ون محبوبہ ثانیہ خان اس کے انتظار میں بے قراری سے پہلو بدل رہی تھی۔ پھر جونہی اسے وسیع ہال میں داخل ہوتے دیکھا' دوڑ کر اس کے قریب آئی اور قدرے روہانسے لہجے میں بولی۔

''عدی! تھینک گاڈ کہ تم آ گئے۔ میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ مومن کو بھی تمہارے لئے میسج دیا۔ عدی میں بہت ڈسٹرب ہوں۔ ڈیڈی میری شادی اپنی پسند سے کرنا چاہ رہے ہیں مگر میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ پلیز تم کچھ کرو ناں عدی پلیز۔''

وہ انتہائی دل برداشتہ ہو رہی تھی۔ عدنان رؤف نے کمال ہوشیاری سے اس کے مومی ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں لئے پھر اسے قریبی صوفے پر نرمی سے بٹھاتے ہوئے پر محبت لہجے میں بولا۔

''میں بھی تم سے بہت پیار کرتا ہوں ثانی! تمہارے بغیر جینے کا تصور تک نہیں ہے لیکن پلیز مجھے معاف کر دو کیوں کہ میں چاہ کر بھی تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتا پھر تم تو جانتی ہو بابا نے میرے پیروں میں آل ریڈی ایک عدد لڑکی سے نکاح کی بیڑیاں ڈال رکھی ہیں جسے قطعی پسند نہیں کرتا مگر میں بہت مجبور ہوں۔ میرے پاس تمہیں قبول کرنے کے لئے کچھ بھی نہیں۔ یہاں تک کہ اپنا گھر تک نہیں اس لئے میں نہیں چاہتا کہ فقط محبت کیلئے میں تمہیں دنیا کی ہر خوشی سے ترسا دوں۔ سو پلیز سب کچھ بھول جاؤ ثانی اور خوش خوش اپنی نئی زندگی شروع کرو کیونکہ تمہاری خوشی میں ہی میری خوشی ہے۔''

''ڈرامے میں وہ تو ماسٹر تھا۔ لہٰذا اس وقت بھی آنکھوں میں آنسو بھر لایا تو ثانیہ تڑپ کر رہ گئی۔ نن نہیں عدی! میں روکھی سوکھی کھا لوں گی مگر تمہارے علاوہ کسی سے شادی نہیں کروں گی''

''پلیز ثانیہ! یہ وقت جذباتی ہونے کا نہیں ہے اگر تم واقعی مجھ سے پیار کرتی ہو تمہیں میری خوشی کی پرواہ ہے تو پلیز وہی کرو جو میں چاہتا ہوں۔ ورنہ میں کبھی تم سے بات نہیں کروں گا۔''

اس کے جذباتی انداز پر وہ قدرے خفگی سے بولا تو ثانیہ کچھ پل ڈبڈبائی آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھتی رہی پھر ایک جھٹکے سے وہاں سے اٹھی اور روتے ہوئے گھر سے باہر نکل گئی۔ تب عدنان رؤف نے اپنا مصنوعی آنسو انگلی پر اُتار کر جھٹکا اور کچھ سوچ کر دھیرے سے مسکرا دیا۔

☆☆☆

مہندی کا فنکشن اپنے عروج پر تھا۔ رنگ برنگ کے آنچل لہراتیں، خوبصورت لڑکیاں رنگین تتلیوں کی مانند ادھر ادھر اُڑی پھر رہی تھیں جب

کہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں دونوں ہاتھوں پر چہرہ ٹکائے کھڑی تمکین رضا نہایت محویت سے اپنے کزن اشعر احمد آفندی کو دیکھ رہی تھی۔ جو ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی پاکستان پہنچا تھا اور اس وقت بزرگوں کے جھرمٹ میں بیٹھا ان کے پیار کو سمیٹتے ہوئے زندگی سے بھرپور قہقہے لگا رہا تھا۔

کتنا پیارا لگ رہا تھا وہ اس وقت؟ بچپن میں جس قدر خوب صورت تھا۔ اب جوانی میں اس سے بھی کہیں بڑھ کر خوب صورتی سمیٹ لایا تھا۔ تب ہی تو اس کی بے قرار نگاہیں بار بار اس دل کش سے چہرے کا بڑی بے خوفی سے طواف کر رہی تھیں۔ یہ اس کا وہ کزن تھا جسے وہ پچھلے پندرہ سالوں سے ٹوٹ کر چاہتی آ رہی تھی۔ جس کی ایک پل کی بے رخی اس کا سارا خون نچوڑ لیتی تھی۔ پچھلے پندرہ سالوں سے وہ دونوں ہی ایک دوسرے کی محبت میں جکڑے ہوئے تھے۔ اشعر آفندی گزشتہ بارہ سالوں سے پردیس میں مقیم تھا اور گزرے ان بارہ سالوں میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ ایک دن کے لئے بھی اسے بھول گیا ہو۔ ہر روز رات کو دیر تک کمپیوٹر پر وائس چیٹنگ کرنا، ایک دوسرے کو محبت بھری نظموں، غزلوں میں دل کا حال سمو کر، پیار بھرے تفصیلی خط لکھنا اور اپنے ایک ایک پل کے حالات سے باخبر رکھنا ان دونوں کی روٹین بن چکی تھی۔

دونوں ہی ایک دوسرے کو بے انتہا چاہتے تھے اور کیوں نہ چاہتے؟ ان کے بیچ بندھن ہی ایسا جڑا ہوا تھا کہ وہ چاہ کر بھی ایک دوسرے سے بے خبر نہیں رہ سکتے تھے۔ آج سے اٹھارہ سال قبل جب وہ محض چھ سال کی تھی تو اس کے تایا ابو مسٹر فاروق احمد صاحب نے اپنے والد یعنی تمکین کے دادا جناب حسن احمد صاحب اور دیگر گھر والوں کی خوشی کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے اکلوتے اور لاڈلے بیٹے اشعر آفندی کے نام کی انگوٹھی اس کی ننھی منی سی انگلی میں ڈال دی اور تب سے ہی گیارہ سالہ اشعر آفندی مکمل طور پر تمکین رضا، پر قابض ہو گیا۔ ایک پل بھی تمکین کے بغیر اس کا گزارہ نہیں تھا۔ تمکین کی ممی عالیہ بیگم کی گود سے مچل مچل کر تمکین کو لیتا اور اسے اپنے پاس بٹھا کر اس کے ساتھ اپنے قیمتی کھلونوں سے کھیلتا۔ اپنی ہر قیمتی سے قیمتی من پسند چیز بڑی خوشی سے اس کے ساتھ شیئر کرتا۔ پھر جوں جوں وہ بڑی ہوتی گئی۔ اشعر اس کے معاملے میں مزید حساس ہوتا گیا۔ اب تمکین کو صرف اس کے ساتھ ہی کھیلنے کی اجازت تھی۔ وہ اگر کبھی بھولے سے بھی اس کی غیر موجودگی میں کسی اور کزن کے ساتھ کھیلنے کی کوشش کرتی تو اشعر فوراً منہ پھلا لیتا۔ کئی کئی دن اس سے بات نہ کرتا یا پھر اس بچے سے ہی لڑ پڑتا کہ جس کے ساتھ وہ کھیلنے کا جرم کرتی تھی، اور غصے میں اس کے سارے کھلونے بھی توڑ دیتا۔ کبھی کبھی تو خود کو بھی نقصان پہنچا لیتا۔

اور اس کی یہی شدت معصوم سی تمکین کو سہما دیتی۔ اسے اس کے جنون سے خوف آنے لگتا اور پھر انہی دنوں تایا ابو اپنے بزنس کے سلسلے میں ہمیشہ کے لئے لندن میں شفٹ ہو گئے۔ تب حقیقی معنوں میں تمکین اور اشعر دونوں کو دن میں تارے نظر آ گئے۔ معصوم سی تمکین، نٹ کھٹ سے اشعر کے وجود کی اتنی عادی ہو گئی تھی کہ اب اس کے لئے ایک لمحہ بھی اس کے بغیر گزارنا بہت دشوار تھا لہٰذا کتنے ہی دنوں تک وہ روتی تڑپتی، بخار میں جلتی رہی، بار بار اشعر کے پاس جانے کی ضد کرتی رہی مگر وقت کے ساتھ ساتھ اسے صبر آ گیا۔

اشعر لندن جا کر بھی اسے فراموش نہ کر سکا۔ تب ہی روز فون پر اس سے بات کرتا۔ اس کی ہر ہر کامیابی پر اسے وش کرتا۔ گفٹ بھیجتا اور گھنٹوں انٹرنیٹ پر گپ شپ لگاتا۔ اپنے شب و روز کے احوال بڑی دلچسپی سے اسے سناتا اور وقتاً فوقتاً اپنی تصویریں بھی بھجواتا رہتا مگر وہ اس کے بار بار اصرار کے باوجود بھی نہ تو کوئی تصویر کھنچواتی اور نہ اسے بھیجتی بلکہ ہر بار صاف کہہ دیتی تھی کہ جب آؤ گے تو دیکھ لینا، اور آج بارہ سال کے بعد جب وہ

اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا تو واپس لوٹ آیا جو تمکین کی مانند اس کی صرف ایک جھلک دیکھنے کے لئے بہت بے قرار نظر آ رہا تھا۔ تمکین اپنے کمرے کی کھڑکی سے، اس کی متلاشی اور بے قرار نگاہوں میں چھپی محبت بخوبی دیکھ سکتی تھی۔ تب ہی تو گلاب کی پنکھڑیوں جیسے احمریں لبوں پر، جاندار مسکراہٹ آپ ہی آپ پھیلتے جا رہی تھی۔

خوشی کا یہ عالم تھا کہ پاؤں دھرتی کہاں تھی اور پڑتا کہاں تھا۔ اشعر کو ستانے اور اس کی بے قراری دیکھنے کیلئے ہی تو وہ اپنے کمرے میں آ چھپی تھی، اور اب اس کی بے قراریوں سے خوب لطف اٹھا رہی تھی اور جانے کب تک یہ آنکھ مچولی جاری رہتی، کہ دادا جی نے اسے آواز دے ڈالی تب ان کے حکم پر بھاگتے ہوئے وہ سیڑھیاں اترنے لگی تو اچانک اس کا پاؤں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور وہ سیڑھیوں کے درمیان سے لڑھکتی ہوئی نیچے آئی۔ بازو تو پورا اچھل گیا جبکہ پاؤں پر بھی شدید چوٹ آئی اور یوں گیند کی مانند سیڑھیوں سے لڑھکتے ہوئے دیکھ کر سب کے ساتھ ساتھ نٹ کھٹ سا اشعر بھی چونکا تھا اور پھر بے ساختہ ہی کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

تمکین نے جو سنبھل کر اسے کھلکھلاتے دیکھا تو اس کی گلاب سی سرخ رنگت مزید متغیر ہوگئی۔ تب ہی وہ پھولے پھولے سے خفا چہرے کے ساتھ حسن احمد صاحب کے پہلو میں چپ چاپ آ کھڑی ہوئی تو اس کی خفگی دیکھتے ہوئے ان کی ہنسی کو فوراً بریک لگ گئے جبکہ اشعر اب بھی ہنس رہا تھا۔

''یہ تمکین بیٹی ہے اشعر۔ تمہارے رضا انکل کی بیٹی اور تمہارے بچپن کی دوست۔''

''کیا یہ نمی ہے دادا جی؟'' وہ بہتی ناک والی بے سری سی نمی۔ کمال ہے اتنی بڑی ہوگئی ہے؟''

دادا جی کے انکشاف پر اس نے بمشکل اپنی ہنسی کو بریک لگائے اور قدرے ٹھٹھک کر بولا تو اس کے اس جملے انداز پر پہلے سے ہی خفا تمکین رضا مزید سٹپٹا کر رہ گئی۔

''میں تو اتنی بڑی ہوگئی اور تم ابھی تک فیڈر پی رہے ہو۔ ہے ناں؟''

جوں ہی وہ تپ کر بولی۔ اشعر کے ساتھ ساتھ وہاں موجود بھی لوگوں کے بے ساختہ قہقہے فضا میں بلند ہوگئے۔

''دادا ابو! یہ نہ صرف اتنی بڑی ہوگئی ہے بلکہ بہت شارپ بھی ہوگئی ہے۔ سچ سچ بتایئے۔ آپ لوگ کیا کھلاتے ہیں اسے؟''

نگاہوں میں جہاں الوہی جذبوں کی چمک تھی۔ وہیں لفظوں میں شوخی کا نمایاں عکس۔ اشعر کے برجستہ جملے پر ایک مرتبہ سب لوگ کھلکھلا کر ہنس پڑے جبکہ تمکین خفگی سے اسے گھورتی ہوئی شیزا کے بلانے پر تیار ہونے چل دی۔

مہندی کی یہ پر رونق سی تقریب فقط اک اشعر کے آجانے سے کتنی دل کش لگ رہی تھی۔ وگرنہ تو اس کے لئے عاشر بھیا کی اس قدر دھوم دھام والی شادی میں بھی کوئی چارم نہیں تھا۔

اشعر دیگر لوگوں سے فارغ ہو کر جب اس کی طرف آیا تو وہ سیڑھیوں پر بیٹھی اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا سیڑھیوں پر ہی اس کے پاس آ بیٹھا پھر منہ اس کے کان کے پاس لا کر سرگوشانہ انداز میں بولا۔

''کیسی ہوں؟''

اس کے سرشار سے لہجے پر تمکین نے رخ پھیر کر ایک نظر دیکھا پھر اگلے ہی پل نظر جھکا کر خفگی سے بولی۔

''کیوں تمہیں کیسی لگ رہی ہوں؟''

''بہت پیاری، بہت خوب صورت۔''

اس کے خفا انداز پر دھیمے سے مسکراتے ہوئے وہ نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر ذرا سا اس کی طرف جھکتے ہوئے شریر انداز میں بولا تمکین بلش ہو کر رہ گئی۔ تب ہی قدرے بوکھلا کر بولی۔

''بس بس رہنے دو۔ باتیں بنانا تو کوئی تم سے سیکھے۔''

''اور پاگل بنانا تم سے۔ ہے ناں؟'' وہ اسی انداز میں مسکراتے ہوئے بولا تو تمکین چڑ کر رہ گئی۔ ''تم کبھی نہیں سدھرو گے۔ ہمیشہ بندر کے بندر ہی رہو گے۔''

''تو تم کون سا سدھر گئی ہو۔ وہی جھینگروں کی مہارانی ہو۔''

قرض رکھنا تو اس نے کبھی سیکھا ہی نہیں تھا لہٰذا فوراً پٹ سے جواب دیا تو تمکین مزید تپ کر اسے دیکھنے لگی جو پچھلے کئی گھنٹوں سے مسلسل اسے زچ کر رہا تھا۔

''اشعر تم انسانوں والی گفتگو نہیں کر سکتے؟''

مٹھیاں بھینچ کر وہ بھرپور ضبط کا مظاہرہ کر رہی تھی جبکہ اشعر اسے ستا کر لطف سمیٹ رہا تھا۔ تبھی مسکراتے ہوئے سکون سے بولا۔

''میڈم! میرے خیال میں تو میں انسانوں والی گفتگو ہی فرما رہا ہوں۔ وہ کیا ہے کہ جانوروں کی لینگویج ابھی میں نے سیکھی نہیں ہے۔ وگرنہ آپ کی زبان میں آپ سے کلام کرتا۔''

وہ بھی اپنے نام کا ایک ہی تھا۔ تمکین سے مزید برداشت کرنا دشوار ہو گیا تو وہ منہ پھلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''جب بھی ہانکنا الٹی ہی ہانکنا۔ مجھے ستائے بغیر تو تمہیں چین آتا ہی نہیں ناں؟''

اس کے خفگی سے بھرپور انداز پر۔ اشعر نے ہنستے ہوئے اس کی کلائی تھام لی۔ پھر سوری کہہ کر ایک جھٹکے سے اپنے پہلو میں ہی بٹھا لیا تو اس کے غصے کا گریڈ بھی قدرے نیچے آ گیا۔

''تایا ابو اور تائی ماں کیسی ہیں اشعر، اور وہ لوگ کیوں نہیں آئے تمہارے ساتھ؟''

''فار گاڈ سیک یار! ایک تو تم سوال بہت کرتی ہو۔ بہر حال مما کے پاؤں میں فریکچر تھا اور وہ چل پھر نہیں سکتی ہیں بس اس لئے نہ مما آ سکیں اور نہ پاپا۔ البتہ اگلے مہینے ہو سکتا ہے کہ وہ آ جائیں۔ ویسے پاپا کہہ رہے تھے کہ اشعر بیٹا اب پاکستان جا ہی رہے ہو تو ہماری بہو بیگم کو بھی ساتھ ہی لے آنا۔ گھر بہت سونا سونا ہے ہمارا۔ دو چار بچے وچے ہوں گے تو من بہل جائے گا۔''

اس کے سوال پر وہ قدرے شوخی سے بولا تو تمکین ایک بار پھر بلش ہو کر رہ گئی۔ ''اشعر باز آ جاؤ ورنہ میں دادا جی سے تمہاری شکایت کر دوں گی۔''

''چلو یہ کارنامہ بھی کر کے دیکھو۔ اسی کی کسر رہ گئی تھی باقی۔''

اس کے دھمکی آمیز انداز پر وہ قدرے جل کر بولا تو تمکین کھلکھلا کر ہنستے ہوئے وہاں سے اٹھ آئی۔

''سنو میں دادا جی سے کہہ آیا ہوں کہ عاشر بھائی کے فوراً بعد اب میرے بیاہ کے بھی باجے گاجے کھڑکا ئیں۔ دگرنہ ایسا نہ ہو کہ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جائے اور میں خفا ہو کر واپس لندن بھاگ جاؤں۔''

قدرے تیز آواز میں اس نے پیچھے سے ہانک اٹھائی تھی۔ تمکین کے تیز قدموں کو فوراً بریک لگ گئی۔

''تم جا کر تو دکھاؤ۔ میں تمہارا سر توڑ دوں گی۔''

قدرے جذباتی ہو کر وہ بولی تو اس کی حالت زار سے بھرپور لطف اٹھاتے ہوئے اشعر کھلکھلا کر ہنس پڑا اور تمکین اسے یوں ہنستے دیکھ کر فوراً رخ پھیر گئی کہ وہ اس وقت نظر لگ جانے کی حد تک پیارا لگ رہا تھا۔

☆☆☆

موسم خاصی حد تک ابر آلود ہو رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی، معطر ہوائیں، کھڑکی سے ٹکراتے ہوئے خاصے شریر انداز میں اس کے نفاست سے بنے بال بکھیر رہی تھیں، اور وہ گم سم سا کھڑا ڈوبتے ہوئے سورج کا اداس منظر دیکھتا رہا۔

''شاہ ولاج'' اس کی پہچان، حسن کا مرکز تھا اور اس کے دادا ''شاہ محمد'' اور دادی ''فاطمہ بیگم'' دونوں ہی اپنے حسن میں بے مثال تھے پھر آگے ان کی اولادیں۔ جن میں ان کے سب سے بڑے بیٹے ''آفاق شاہ'' پھر منجھلے بیٹے ''بلال شاہ'' بیٹی ''نورینہ'' اور پھر سب سے چھوٹے بیٹے ''احسن شاہ'' اپنے حسن میں بے مثال تھے۔ پھر شاہ محمد اور فاطمہ بیگم نے اپنے بچوں کے لئے ان کی زندگی کے ہمسفر بھی اتنے ہی خوب صورت ڈھونڈے اور آگے ان کی اولادیں بھی اتنی ہی خوب صورت پیدا ہوئیں۔ سب سے بڑے آفاق شاہ کے دو بیٹے ''ارسلان احمد شاہ'' اور ''ازہان احمد شاہ'' پھر دو ہی بیٹیاں ''ماہم شاہ اور میمونہ شاہ'' قدرتی حسن کی زندہ مثالیں تھیں۔ کھڑے کھڑے تیکھے نقوش اور گورے چٹے، سیب جیسے گلابی رنگ انہیں سب سے ممتاز بناتے تھے پھر ''بلال شاہ'' کے تین بچے تھے جن میں سب سے بڑی ان کی بیٹی دانیہ، پھر فائقہ اور سب سے چھوٹا بیٹا کاشف حسن کی دولت سے مالا مال تھے۔ بلال شاہ کے بعد نورینہ شاہ کی اولاد جس میں ان کی تین بیٹیاں ''نشہ، عدیلہ اور اریشا اپنے بے مثال حسن میں سب سے بڑھ کر تھیں۔ احسن شاہ کے دو ہی بچے تھے سب سے بڑا ازمیر شاہ اور اس سے چھوٹی نہایت خوب صورت بیٹی ''سمعیہ شاہ'' جو ان دنوں اسلام آباد ہوسٹل میں رہائش پزیر ایم اے اکنامکس کی تیاری کر رہی تھی۔

سبھی کزنز ایک دوسرے سے بے حد کلوز تھے مگر ازمیر شاہ کو خوبصورتی کی دولت کے ساتھ ساتھ اپنے پیاروں کی دولت کے لئے بھی ہمیشہ ترسنا پڑا۔ تب ہی تو شعور سنبھالتے ہی وہ گھر سے دور چلا گیا اور پورے دس سال کے بعد انگلینڈ سے اپنی تعلیم مکمل کر کے وطن واپس لوٹا۔ گھر بھر میں

اس کے حوالے سے اگر کوئی بات ہوتی تھی تو لازمی طور پر ہی پہلا موضوع، اس کا رنگ روپ بنتا۔ ''شاہ ولاج'' کے ہر فرد کے لئے اس کی خوبصورتی ہر گز کسی اچھنبے سے کم نہیں تھی۔ بچے تو بچے گھر کے بڑے بھی اس کی یہ انفرادیت قبول کرنے سے ہچکچاتے تھے اور شاید ان کا یہی رویہ تھا کہ جس نے ازمیر شاہ کو اس کی اپنی ذات میں بالکل اکیلا کر دیا۔ وہ عمر جو اس کے کھیلنے کودنے، ہنسنے بولنے کی تھی اس عمر میں اس نے خود پر سنجیدگی کو طاری کر لیا۔

ہمہ وقت کتابوں کی دنیا میں کھوئے رہنا اور اپنے کام سے کام رکھنا اس نے اپنا شیوہ بنا لیا تھا۔ بھرے پرے گھر میں وہ اگر کسی کو مخاطب کرتا تو صرف اس وقت کہ جب بہت مجبوری ہوتی۔ بصورت دیگر وہ اپنا ہر کام خود کر لیتا۔ ہاں مگر جیسے اس حسین شاہ ولاج میں اریشہ وہ واحد ہستی تھی کہ جس کے ساتھ وہ بچپن سے بے حد اٹیچ تھا۔ جس نے ہمیشہ ہر قدم پر خلوص دل سے اس کا ساتھ دیا تھا۔ شاہ ولاج میں دس سال کے طویل عرصے کے بعد اس کی واپسی کو دل کی گہرائیوں سے خوش آمدید کہا تھا، اور ہمیشہ اپنے نرم اور محبت بھرے سلوک سے، اس کی شخصیت کا غرور، اس کی اپنی ذات پر اس کا مکمل اعتماد، زیادہ سے زیادہ بحال کرنے کی ہمیشہ کوشش کی تھی۔

اور شاید یہی وجہ تھی کہ اسے کوئی بھی مسئلہ، کوئی بھی پریشانی ہوتی۔ وہ صرف اسی کے ساتھ شیئر کرتا اور بلا جھجک اپنا کام اسے کہہ دیتا۔ ازمیر کے لئے چائے بنانا اس کے کپڑے پریس کرنا، کسی بھی بزنس ڈیلنگ یا پارٹی کے لئے ڈریس چوز کرنا۔ اس کے جوتوں، ضروری فائلز اور موزوں کو سنبھال کر رکھنے کی ذمہ داری بھی اسی پر تھی۔ بدلے میں وہ اسے اس کی اسٹڈی میں مدد دیتا۔ خواہ کتنا بھی تھکا ہوتا۔ گھنٹوں اس کے پاس بیٹھا اسے کیمسٹری کے فارمولے سمجھاتا رہتا یا اسے اگر اپنی کسی فرینڈ کے ہاں جانا ہوتا تو وہ اپنی ضروری مصروفیت ترک کر کے اپنی ذمہ داری نبھاتا کہ ایسے کرنا اسے بے حد اچھا لگا کرتا تھا۔

لندن میں یونیورسٹی پیریڈ کے دوران، اریشہ کی مانند ہی ایک انتہائی حسین لڑکی، شہرین خان، اس کی مسحور کن پرسنیلٹی سے مرعوب ہو کر اس کی طرف کھنچی چلی آئی۔ دونوں میں دو چار ماہ تک خوب دوستی چلی تب ازمیر کو لگا کہ وہ جیسے شہرین خان کے بارے میں ایک دوست سے ہٹ کر بھی کچھ سوچنے لگا ہے۔ اس کا محرومیوں کا مارا دل، کسی اور ہی لے پر دھڑکنے لگا ہے، اور اس سے پہلے کہ دل نافرمان کی یہ بے قابو دھڑکنیں اس کا جینا دشوار کر دیتیں۔ اس نے ایک روز موقع دیکھ کر بالآخر شہرین خان سے اپنے پیار کا اظہار کر دیا۔ مگر اس کا ردعمل، ازمیر کے تصور سے یکسر مختلف تھا۔ شہرین خان نے ازمیر کے اظہار محبت پر کس قدر حیرت آمیز انداز سے اسے دیکھا تھا پھر بے ساختہ ہی کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اپنی ایک ایک دوست کو روک روک کر ہنستے ہوئے اس نے ازمیر کے اعتراف محبت کے بارے میں بتایا اور پھر سب کے درمیان خوب جما کر ایک جاندار تھپڑ اس کے گال پر جڑ دیا۔

تب نہایت ترشی کے ساتھ سخت الفاظ استعمال کرتے ہوئے اسے اس کی اوقات میں رہنے کی وارننگ دیتی وہ وہاں سے چلی گئی، اور اس روز ازمیر کا اپنی ذات پر رہا سہا اعتماد بھی ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو گیا۔ اسے اپنا آپ اپنی قابلیت، ذہانت اس کھوٹے سکے کی مانند لگی کہ جسے اک اندھا فقیر بے خبری میں تو لے لیتا ہے مگر وہ اس کے کسی کام کا نہیں ہوتا کیوں کہ وہ اسے خرچ نہیں کر سکتا۔ اس نے سمجھا تھا کہ کم صورت لوگوں کو محبت کرنے یا حسین خواب دیکھنے کا کوئی حق نہیں ہوتا۔

تب ہی وہ ایگزام سے فارغ ہوتے ہی پاکستان واپس چلا آیا، اور اب اس پر رونق لندن کی دل کش فضاؤں میں اس کا دم گھٹنے لگا تھا، جب کہ یہاں پاکستان آمد کے بعد گھر کے سبھی لوگوں نے اس سے محبت کا اظہار کیا تھا۔ خصوصی طور پر اس کی مما حائقہ بیگم اور اریشہ کی خوشی تو دیدنی تھی۔ پھر فاروق انکل، بلال انکل اور خود اس کے پاپا احسن شاہ کی آنکھوں میں، اس کی قابلیت دیکھ کر خوشی کے جو دیپ روشن ہوئے تھے وہ لائق ستائش تھے۔ تب ہی ان کی خواہش پر اس نے چند دن ریسٹ کے بعد ان کا بزنس مکمل طور پر سنبھال لیا تھا۔

اور اب جبکہ اس کا ایم اے انگلش فائنل ایئر کا رزلٹ بھی اے گریڈ آیا تو پورے شاہ ولاج میں خوشی کی اک لہر دوڑ گئی۔ حائقہ بیگم اور احسن شاہ اپنے ہونہار سپوت پر جتنا فخر کرتے کم تھا مگر ان کے ساتھ ساتھ گھر کے سبھی لوگوں نے بہت خوشی کے ساتھ اس شاندار کامیابی پر، اسے اچھے الفاظ میں وش کیا تو وہ خوشی سے پھولے نہ سمایا مگر شاید وہ نہیں جانتا تھا کہ شاہ ولاج کی ینگ پارٹی میں شامل اس کی کزنز کے دلوں میں آج بھی اس کا وہی مقام ہے کہ جو کبھی پہلے ہوا کرتا تھا۔

اس روز وہ اتنا خوش تھا کہ اسے ماضی میں لگے سارے زخم بھول گئے۔ پھر اریشہ کے ہمراہ پُرسکون سے ریستوران میں بیٹھ کر اس سے اپنے دل کی باتیں کرنا تو اور بھی اچھا لگ رہا تھا اور وہ حسن میں بے مثال لڑکی، بنا اس کی کم صورتی کو کسی خاطر میں لائے قدم قدم پر اس کے سنگ سنگ خوشی سے یوں جھوم رہی تھی گویا قارون کا خزانہ مل گیا ہوا ہے۔

اس روز اک طویل مدت کے بعد اسے لگا تھا کہ وہ ایک بھرے پُرے گھر کا بیٹا ہے۔ اس کی صورت کے علاوہ اور کوئی چیز بھی ہے جو شاہ ولاج کے مکینوں کے لئے باعث فخر ہے۔

اور اس رات وہ زندگی میں پہلی مرتبہ پُرسکون نیند سو رہا تھا مکمل آرام کے ساتھ مگر شاید وہ آنے والے دنوں کی تلخیوں سے آگاہ نہیں تھا جو اسے درد کا کبھی نہ ختم ہونے والا کوہ سونپنا چاہتے تھے۔ اسے درد کی گہری دلدل میں اتار کر اس کی مسکراہٹوں پر بین لگانا چاہتے تھے۔

اسے یہ باور کروانا چاہتے تھے کہ اپنی قابلیت اور ذہانت سے وہ صرف اہمیت سمیٹ سکتا ہے دائمی پیار اور محبت نہیں کسی کا ارمانوں بھرا دل نہیں اور تکلیفوں بھرے یہ دن اب بہت زیادہ دور نہیں تھے۔

☆☆☆

رات کا نجانے کون سا پہر تھا جب اس کی آنکھ کھلی تھی۔ پورے کمرے میں تاریکی کا راج تھا شاید لائٹ چلی گئی تھی۔ باہر بارش کا شور اپنے عروج پر تھا اور بجلی کی کڑک ماحول میں عجیب سا ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ اس کا پورا وجود پسینے سے بھیگا ہوا تھا اور دل کی دھڑکن تھی کہ پسلیوں کا بند توڑنے پر تلی ہوئی تھی بمشکل ہمت کر کے وہ اٹھی اور لیمپ روشن کر دیا۔ کمرے کی خاموش فضاء میں لیمپ کی مدھم مدھم سی روشنی اک عجیب سا تاثر پیدا کر رہی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے چلتی کمرے کی واحد کھلی ہوئی کھڑکی کے قریب چلی آئی تب یادوں کا اک کبھی نہ ختم ہونے والا طوفان اس کی سوچوں میں در آیا۔

آج سے سات سال پہلے زندگی کتنی خوب صورت، کتنی سہل تھی مگر آج گزرے ان سات سالوں کے بعد ہر خوشی سے بچھڑ کر اپنی ہی ذات کا بار اٹھاتے ہوئے وہ اپنے آپ میں کس قدر تنہا، بکھری ہوئی تھی کوئی نہیں تھا جو اس کے بہتے ہوئے آنسوؤں کی وجہ دریافت کرتا۔ اس کا دکھ بٹاتا۔ اسے سہارا دیتا۔ زندگی کے کٹھن شب و روز اس سے جڑے ہر سہارے کو تو آج سے سات سال پہلے ہی چھین چکے تھے۔

کتنی خوشی بکھری ہوئی تھی اس کی زندگی میں۔ آج سے فقط کچھ ہی سال پہلے جب وہ لاہور سے اپنی تعلیم مکمل کر کے اپنے گاؤں واپس لوٹی تھی۔ من میں خوشیوں کے ڈھیروں سے پھول کھلے تھے۔ اپنے مہربان والدین کا تصور اسے مسرور کر رہا تھا۔ آج اس نے اپنے بابا کی سب سے بڑی خواہش کو پورا کر دیا تھا اور کہیں نہ کہیں خوشی کا چھوٹا سا دیا اس کے دل میں اپنی محبت کو پا لینے کی خوشی کا بھی تو جل رہا تھا۔ یہ تو منزل تھی اس کی۔ اپنی محبت کو پا لینے کی یہی تو شرط تھی جس میں آج اس نے کامیابی کو حاصل کر لیا تھا۔

وہ ایک شخص کی جس کے نام کے ساتھ وہ ہوش سنبھالتے ہی اپنا نام جڑا ہوا سنتی آئی تھی۔ وہ جو بے حد امیر کبیر اور وجیہہ ہونے کے ساتھ ساتھ، اعلیٰ ڈگری ہولڈر بھی تھا۔ جس کی زندگی کے نجانے کتنے سال دیارِ غیر میں فقط تعلیم کے حصول کے لئے گزرے تھے جو اس کے ہر ہر خواب، ہر ہر یاد میں سمایا ہوا تھا۔ اسے پانے کے لئے تو اگر اسے پل صراط سے بھی گزرنا پڑتا تو وہ گزر جاتی پھر یہ اعلیٰ تعلیم کا حصول کیا مشکل تھا اس کے لئے۔ سو اس نے بڑی خوشی سے اپنے والدین سے الگ رہ کر، شہر میں کالج میں ایڈمیشن لیا اور خوب محنت کے بعد بالآخر ایم اے اکنامکس کر کے ہی گھر لوٹی مگر شاید وہ نہیں جانتی تھی کہ زندگی ہمیشہ ہی۔ محض وہی کچھ دان نہیں کرتی جو ہم چاہتے ہیں، سوچتے ہیں بلکہ بعض اوقات کچھ ایسے لمحے، کچھ ایسے حادثات ہماری تقدیر کی جھولی میں پھینک دیتی ہے جو ہم قطعی نہیں چاہتے مگر ہمارے چاہنے نہ چاہنے پر، وہ اپنی دی ہوئی سوغات واپس نہیں لیتی بلکہ کسی سوتیلی ماں کی طرح چپ چاپ ہمارے آنسوؤں کا تماشا دیکھتی ہے۔

اس نے جس وقت اپنے گھر کی دہلیز پر قدم رکھا تھا۔ اس کے وہم و گماں میں بھی نہیں تھا کہ اس کے پیچھے اس کی محل جیسی شان دار حویلی میں زندگی کیا روپ بدل کر آ چکی ہوگی۔

وہ تو خوش تھی کہ اس نے کڑا وقت بمشکل ہی سہی مگر کاٹ لیا تھا۔ اپنے ہونے والے، مجازی خدا کی شرط پوری کر کے کتنا ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی وہ خود کو، مگر شان دار حویلی کے گھمبیر سناٹے نے اسے پہلے ہی قدم پر سہا کر رکھ دیا۔ دور دور تک کوئی بھی تو نظر نہیں آ رہا تھا تب سے بے حد شکستہ قدموں سے چلتی ہوئی وہ اپنے داداجی کے کمرے کی طرف بڑھی تو اچانک نسوانی سسکیوں کی آواز نے اس کے قدم وہیں روک لئے۔ رونے

والی یقیناً اس کی ماں ہی تھی کیونکہ ان کے علاوہ اس وسیع حویلی میں اور کسی نسوانی وجود کا تصور تک نہ تھا۔کل چار ہی تو افراد تھے وہ۔دادا جی، بابا پھر اس کی ممی اور سب سے آخر میں خود وہ یعنی انجشاء۔

ماں کی سسکیاں سن کر اس کے شکستہ قدموں میں مزید سستی آ گئی۔ذہن جیسے کسی ویران گھر کی مانند پل کے پل میں خالی ہو گیا۔تب کسی کی پاٹ دار آواز اس کے کانوں میں گونجی تھی۔

''پلیز آپ مجھے سمجھنے کی کوشش کیجیے بابا! میں نہیں خوش رہ سکتا انجشاء کے ساتھ۔نہیں ہے وہ میرے مزاج کی۔آخر کیوں آپ لوگ میری زندگی برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں''

وہ ہوش میں نہ بھی ہوتی تب بھی یہ آواز وہ لاکھوں میں پہچان سکتی تھی۔اندر دادا جی کے کمرے میں، اس کے بابا نے شاید اپنی برسوں سے طے کی ہوئی نسبت کا بھرم رکھنے کے لئے دھیمے سے کہا تھا۔

''انجشاء شہر میں پڑھ رہی ہے بیٹے ابھی پچھلے دنوں اس کا بی اے کا شاندار رزلٹ آیا ہے۔بہت محنت کر رہی ہے وہ۔تمہیں اس سے کوئی شکایت نہیں ہو گی بیٹے''

بہت عاجزانہ سا لہجہ تھا ان کا مگر اس سنگ دل نے مطلق پروا نہیں کی تھی اور بگڑ کر بولا۔

''مجھے شکایت ہے بابا اور ہمیشہ ہو گی۔جب میں دل سے اس مجبوری کے بندھن کو مانتا ہی نہیں تو آپ لوگ زبردستی کیسے قائل کر سکتے ہیں مجھے۔انجشاء خواہ بی اے کرے یا ایم اے اسے یا اس کی تعلیم سے قطعی کوئی غرض نہیں کیونکہ تعلیم ذہن بدل سکتی ہے مگر ماحول اور انسان کی فطرت نہیں۔ وہ ہمیشہ یہیں رہی ہے۔پل بڑھ کر جوان ہوئی ہے تو آپ کیا سمجھتے ہیں۔دیہات کے اس بیک ورڈ ماحول نے کوئی اثر نہیں ڈالا ہو گا اس پر۔کیا وہ میرے ساتھ شہر میں میری مرضی کی زندگی بتا سکے گی۔نیور بابا! کبھی نہیں کر سکے گی وہ ایسا کیونکہ اس کی سوچ میں، اس کے ہر عمل میں وہی کچھ ہمیشہ جھلکے گا جو اس نے یہاں آپ لوگوں کے بیچ رہ کر سیکھا ہے۔میں اسے اگر اپنے اسٹینڈرڈ کے لوگوں سے ملواؤں گا تو اسے لاج آئے گی۔پارٹیز میں دوپٹے کو سر پر لینے سے منع کر دوں گا تو اسے معیوب لگے گا کیونکہ اس کے اور میرے ماحول میں بہت فرق ہے بابا۔ہم دونوں کبھی ایک دوسرے کے ساتھ کبھی خوش نہیں رہ سکتے۔اس لئے پلیز آپ دانش مندی سے کام لیں اور اس زبردستی کے بندھن کو آج یہیں ختم کریں۔''

وہ جس کا تصور اس کی سوچوں کو مہکا دیتا تھا۔آج سنگ دلی کی انتہا پر کھڑا مسلسل اپنے زہریلے لفظوں کی سنگ باری کر رہا تھا، اور وہ سن سے دماغ کے ساتھ لڑکھڑاتے ہوئے قریبی دیوار کو تھام کر وہیں نیچے زمین پر بیٹھتی چلی گئی تھی۔حالات نے کیسا زبردست طمانچہ لگایا تھا اس کے منہ پر کہ وہ بلبلا کر رہ گئی مگر لب سے آہ تک نہ نکل سکی۔

اس روز اسے لگا تھا کہ بس اس کا زندگی سے ناتا شاید یہیں تک تھا۔وہ جس کے لئے اس نے اپنی ہر خوشی، اپنی مرضی سب کچھ تج دیا تھا آج وہی اسے اپنی زندگی سے نکال باہر کر رہا تھا۔برسوں سے جڑا ہوا اپنے نام کے ساتھ اس کا نام الگ کر رہا تھا۔وہ جس نے اس کے حوالے سے ڈھیروں رو پہلے خواب اپنی آنکھوں میں سجا لئے تھے اس روز انہی ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں سمیٹتے سمیٹتے وہ زخم زخم ہو گئی تھی۔پھول سے خوشبو چھن جائے

تو جینے کا کیا مقصد باقی رہ جاتا ہے؟ اس کا دل بھی تو اک پھول ہی تھا جو مون کے پیار کی خوش بو سے تروتازہ تھا، اور اب جب کہ وہ خوش بو ہی چھن گئی تھی تو دل کا یہ پھول کیسے نہ مرجھاتا؟''

آنکھیں تھیں کہ لبالب آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں اور وہ اپنے آپ سے بے نیاز، رات ختم ہونے تک وہیں کھڑکی میں کھڑی ماضی کی تلخ یادوں میں کھوئی رہی۔ یہاں تک کہ صبح کا اجالا ہر طرف اچھی طرح سے پھیل گیا۔ تب قدرے چونک کر وہ کھڑکی سے ہٹتے ہوئے اپنے بستر پر آبیٹھی تھی۔ ٹانگیں سن ہو رہی تھیں اور دل کے زخم تھے کہ سات سال کا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود مندمل ہونے کا نام تک نہیں لے رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ ہر روز خود کو بکھرنے سے بچانے کی کوشش میں نڈھال ہوئے جا رہی تھی۔

کبھی کبھی تو اسے خود پر حیرت ہوتی کہ وہ بھلا کیوں جی رہی ہے؟ اور کس لئے؟ زندگی میں اب جینے کے لئے بھلا باقی رہ ہی کیا گیا تھا؟ مگر پھر اپنے داداجی کے بوڑھے وجود کی طرف دیکھتی۔ اس کی آنکھوں میں اپنے محبوب والدین کے مردہ چہرے گھومتے تو وہ نئے سرے سے سلگ اٹھتی تھی۔ رگوں میں خون یوں جوش مارنے لگتا گویا وہ پل میں پوری دنیا کو فنا کر کے رکھ دے گی۔

عرصہ ہوا اس نے اپنی آنکھوں کو پتھر کر لیا تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ وہ آخری بار کب ٹوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔ ہاں آج سے ٹھیک سات سال پہلے جب اس کی بدنصیب آنکھوں نے فقط تین ماہ کے قلیل عرصے میں اپنے اچھے بھلے ہنستے مسکراتے والدین کو باری باری لحد کی تاریکیوں میں گم ہوتے دیکھا تھا تب وہ بلک بلک کر روئی تھی۔ مگر اس روز اس کے بعد اس نے ہمیشہ کے لئے اپنی آنکھوں کو پتھر کر لیا تھا کہ اب اسے ایک پتھر بن کر ہی زندہ رہنا تھا۔ تاہم اس روز معمول کی مانند ٹھیک پانچ بجے وہ جوں ہی آفس سے باہر نکلی، نظر بالکل غیر اختیاری طور پر سامنے کی طرف اٹھ گئی جہاں ہر روز کی طرح وہ ہینڈسم سا خوب رو لڑکا، اپنی قیمتی گاڑی سے ٹیک لگائے اس کی راہ دیکھ رہا تھا۔ انجشاء کا خیال تھا کہ کل کی دو ٹوک گفتگو کے بعد وہ شاید دوبارہ اسے نظر نہ آئے مگر اس کا خیال درست ثابت نہ ہو سکا تھا اور وہ اپنے معمول کی مانند نگاہیں اس کے رستے پر بچھائے خاصی بے قراری سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

تب وہ نہایت سست قدموں سے چلتی اس کے قریب پہنچی تو وہ نوجوان لیک کر اس کے راستے میں آ کھڑا ہوا۔

''جی فرمائیے! اب کیا مسئلہ درپیش ہے آپ کو؟''

آج اس کا لہجہ کسی قسم کے لطف سے عاری تھا، تب ہی وہ اسے اپنے سامنے پا کر قدرے چیخ پڑی تھی۔

''وہ دیکھیے پلیز، آپ مجھے سمجھنے کی کوشش کریں، میں......''

''بس کوئی بات نہیں سننی ہے مجھے آپ کی''

نوجوان قدرے منمنا کر اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اس نے نہایت سختی سے ہاتھ اٹھا کر اس کی بات فوراً کاٹ دی اور بے حد ترشی سے بولی۔

''مسٹر عدنان صاحب! میں آپ کو قطعی سمجھنا نہیں چاہتی۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں آپ، اور آج کے بعد اگر آپ مجھے اپنے رستے میں

دکھائی دیے تو پھر میں آپ کا جو بھی حال کروں گی اس کے ذمے دار آپ خود ہوں گے انڈراسٹینڈ!'' شہادت کی انگلی قدرے چبا چبا کر اس نے وارن انداز میں کہا تو سامنے کھڑا وہ شہزادوں سی آن بان رکھنے والا لڑکا یوں ٹھٹھک کر اس کے خوب صورت چہرے پر پھیلی سختی کو دیکھنے لگا۔ گویا عورت کا یہ روپ پہلی بار دیکھنے کو مل رہا ہو اسے۔

''اور ہاں ایک بات اور اچھی طرح سمجھ لیں آپ کہ یہ جو دو چار آوارہ لڑکوں کو اپنے ساتھ لے کر رنگ رنگ کی لڑکیوں پر ڈورے ڈالتے ہیں نا آپ تو میں آپ کے ان کرتوتوں سے بہت اچھی طرح واقف ہوں اس لیے بہتر ہوگا کہ آپ مجھے جذبات سے مغلوب دوسری لڑکیوں سے ذرا الگ ہی سمجھیں وگرنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں آپ کے شریف والدین کے سامنے آپ کی قابلیت اور پارسائی کی اصلیت کھول کر رکھ دوں اوکے؟''

جاتے جاتے وہ اچانک پلٹی تھی اور نہایت سپاٹ انداز میں ایک مرتبہ پھر قدرے درشتی کے ساتھ اس کے چودہ طبق روشن کرتے ہوئے وہ اپنے مخصوص انداز میں اعتماد کے ساتھ چلتی ہوئی اس کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

اور وہ ہزاروں حسیناؤں کے دلوں پر راج کرنے والا اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ گم سم سا وہیں کھڑا دور تک اسے جاتے دیکھتا رہا۔

☆☆☆

عاشر بھائی کی شادی کے ہنگامے خاصی حد تک سرد پڑ چکے تھے۔ گھر میں نورینہ بھابی کی صورت میں ایک پیاری سی ہستی کا اضافہ ہو چکا تھا اور تمکین کا تمام وقت اب ان کے ساتھ گپ شپ لگاتے ہوئے گزرتا تھا۔ کبھی وہ نورینہ بھابھی کے ساتھ گفتگو میں مصروف ہوتی تو اشعر چپکے سے دبے پاؤں پیچھے سے آکر اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیتا اور وہ پہچان بھی لیتی تب بھی ہاتھ پیچھے نہیں ہٹتا نتیجتاً وہ زچ ہو جایا کرتی، تب وہ نورینہ بھابی کو آنکھ مارتے ہوئے کھلکھلا کر ہنس پڑتا اور پھر جو تمکین اس کے پیچھے بھاگتی تو وہ اسے پورے گھر کا چکر لگوا دیتا مگر ہاتھ نہ آتا تھک ہار کر اسے کوستے ہوئے چپ چاپ بیٹھ جاتی۔

اس روز وہ رات گئے تک اپنے کسی ضروری کام کے سلسلے میں شہر سے باہر گیا ہوا تھا اور اس کی شرارتوں کے بغیر تمکین کا وہ پورا دن بے حد بور گزر رہا تھا۔ رات کے کسی پہر وہ گھر واپس آیا تھا اور شاید یہی وجہ تھی کہ صبح دیر تلک سوتا رہا تب ناشتے کے لئے آمنہ بیگم نے اسے ہی اشعر کو جگانے کے لئے اوپر بھیج دیا کیونکہ حسن ولاج کے مکین ناشتہ مل جل کر کرنا ہی پسند کرتے تھے۔

تمکین اوپر اشعر کے کمرے میں آئی تو وہ بیڈ پر خاصی بے ترتیبی کے ساتھ آڑھا ترچھا لیٹا ہوا تھا۔ ایک پل کیلئے تو اس کے سونے کا انداز دیکھ کر وہ مسکرا اٹھی۔ پھر اگلے ہی پل اسے آواز دے ڈالی مگر وہ اس کی آواز سن کر بھی ٹس سے مس نہ ہوا۔ تب تمکین نے تین چار بار آوازیں لگائیں مگر اشعر نے سنی ان سنی کردیں تو مجبوراً کوفت کے مارے، قدرے اکتا کر وہ فریج کی جانب بڑھی، اور اس میں ٹھنڈے یخ پانی کی بوتل نکال کر پوری کی پوری بے خبر سوئے ہوئے اشعر احمد پر الٹ دی۔ نتیجتاً وہ ہڑبڑا کر گویا گہری نیند سے جاگا اور سرخ سرخ آنکھیں ملتے ہوئے اپنے سے کچھ ہی فاصلے پر تمکین کو ہنستے ہوئے دیکھا تو سرد آہ بھر کر رہ گیا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے نمی اور کسی کو نیند سے جگانے کا یہ کون سا باتہذیب طریقہ ہے۔''

اپنے گیلے کپڑوں سے پانی جھاڑتے ہوئے وہ قدرے روٹھے لہجے میں بولا تو تمکین نے اس کی حالت زار دیکھتے ہوئے خوب لطف لیا۔

''جناب! سونے والا اگر بندر ہو اور اسے انسانوں کے طریقے سے جاگنے کی عادت نہ ہو تو مجبوراً ہم جیسوں کو ایسے ہی طریقے اپنانا پڑتے ہیں۔''

آنکھیں نچا کر وہ مزید اسے جلانے والے انداز میں بولی تو اشعر نے آناً فاناً بیڈ سے چھلانگ لگائی اور ایک ہی جست میں اس کے دونوں بازوؤں کو قابو کر کے قدرے، جلے ہوئے انداز میں کہا۔

''میں بندر ہوں ناں.....؟ ٹھیک ہے اب تمہارے ساتھ بندروں والا سلوک ہی کروں گا۔''

کہنے کے ساتھ ہی اس نے اس کے دونوں بازو مروڑ کر خفیف سا جھٹکا دیا تو تمکین کی چیخیں نکل گئیں تب اشعر نے مسکرا کر اسے پرے دھکیلا پھر وارڈروب کی طرف بڑھتے ہوئے متبسم لہجے میں بولا۔

''آئندہ میرے ساتھ الجھنے میں احتیاط کرنا اوکے۔''

کسی قدر طنزیہ انداز تھا اس کا۔ تمکین نے بازو سہلاتے ہوئے غصے سے گھور کر اسے دیکھا پھر اسی طرح کٹیلے لہجے میں ''مروتم'' کہتے ہوئے کمرے سے باہر بھاگ گئی۔

ناشتے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آئی اور اپنے کورس کی کتابیں بیڈ پر پھیلا کر بیٹھ گئی۔ عاشر بھائی کی شادی کی مصروفیات اور پھر اشعر کی کمپنی دینے کی وجہ سے وہ پچھلے کئی دنوں سے اپنی پڑھائی مس کر رہی تھی۔ اسی لئے رات میں جب بستر پر لیٹی تو پہلا تہیہ یہی کیا کہ صبح ہر صورت میں اپنی اسٹڈی کو ٹائم دے گی۔ سو اس وقت کتابوں کو لے کر بیٹھ گئی کہ تھوڑی ہی دیر میں اشعر گنگناتے ہوئے اس کے کمرے میں داخل ہوا۔

''ہیر یوتے تکھنو، بتے سارے سونیو

دل وچ وسو میرے، پیار دے کھڈونیو.....''

''بس بس شعری پلیز مت گایا کرو ایسے۔ تمہاری یہ پھٹے ڈھول جیسی آواز سن کر میرے تو کان کے کیڑے جھڑنے لگتے ہیں''

کتابوں میں منہمک تمکین نے نظر اٹھا کر خاصے بھرپور انداز میں اسے دیکھتے ہوئے قدرے چڑانے والے انداز میں کہا تو اشعر برا، مائنڈ کیے مزے سے بولا۔

''شکر ہے خدا کا۔ تمہارے گناہ گار کانوں کے کیڑے کسی بہانے سے جھڑے تو سہی۔ بائی داوے۔ یہ ڈھیر ساری کتابیں اپنے اردگرد پھیلا کر کیا کر رہی ہیں آپ؟ کہیں دوبارہ سے کے جی میں ایڈمیشن کا ارادہ تو نہیں۔'' دونوں ہاتھوں کا تکیہ بنا کر بڑے پرسکون انداز میں وہ اس سے قدرے فاصلے پر بیڈ پر ٹک گیا تو تمکین نے جھنجھلا کر کتابیں سمیٹتے ہوئے اک نظر دیکھا پھر مصروف انداز میں بولی۔

''مجھے تمہارے جیسے اُلٹے کارنامے کرنے کا شوق نہیں ہے لہٰذا بی ایڈ کر رہی ہوں۔ سوچا سمپل ایم اے کو کون پوچھتا ہے لہٰذا ساتھ میں کوئی کورس وغیرہ کرلوں۔ کیا پتہ کل کو تم مجھے اپنے گھر اور دل سے نکال دو تو آرام سے کہیں جاب تو کرلوں گی۔ ویسے پتا ہے شعری، پاپا نے اسٹڈی میں

میری ہیلپ کے لئے ایک نہایت ہینڈسم لڑکے کو ٹیوٹر رکھا ہے۔ سچ تم اسے دیکھو نا تو دیکھتے ہی رہ جاؤ گے۔''

اشعر کو جلانے کا کوئی موقع اسے ملتا اور وہ گنوا دیتی ایسا تو ممکن ہی نہ تھا، اور اس کی توقع کے عین مطابق اشعر ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ پھر قدرے برہمی سے بولا۔

''تمہیں کیا ضرورت ہے اس سے مدد لینے کی۔ جو بھی مسئلہ ہو مجھ سے کہو۔ میں مر تو نہیں گیا۔''

محبت کے معاملے میں وہ یوں ہی ایموشنل ہو جاتا تھا۔ تمکین نے خاصی گہری نگاہوں سے اس کا تپا تپا سا سرخ چہرہ دیکھا پھر بے ساختہ ہنستے ہوئے بولی۔

''بس ہو گئے ہو ناں ایموشنل حالانکہ میں صرف تمہیں جلا رہی تھی مگر تم تو ایک دم بدھو ہو بدھو۔'' اس نے نظریں ہٹا کر کتابیں سمیٹتے ہوئے قدرے شوخی بھرے انداز میں کہا تو اشعر اسے گھور کر رہ گیا۔ پھر قدرے خفا خفا سے انداز میں بولا۔

''تم بخوبی جانتی ہونی کہ تم میری جان ہو۔ تم صرف میری ہو۔ کوئی تمہیں دیکھے۔ تم سے بات کرے یا تم کسی کو ایسی نظر سے دیکھو اور سراہو۔ میں قطعی برداشت نہیں کر سکتا۔ میری جان جاتی ہے جب تم یہ کہتی ہو کہ کسی نے تمہیں نظر بھر کر دیکھا یا تم کسی کے قریب ہوئیں مگر تم بھلا میری محبت کی شدت کو کیا جانو؟ کبھی میرے دل کو چیر کر تو دیکھو میرے پیار کی گہرائی کو سمجھو ناں۔''

اس کی دیوانگی تمکین سے کبھی مخفی نہیں رہ سکی تھی مگر پھر بھی کبھی کبھی اس کا یہ دیوانہ پن اسے خوف زدہ کر دیتا تھا اور وہ اندر ہی اندر کانپ کر رہ جاتی تھی کہ خدا کبھی ان دونوں کی محبت کا امتحان نہ لے۔ ورنہ اشعر سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ جان پر کھیل جاتا۔

☆☆☆

اپریل کے آخری دن تھے اور تمکین دن رات خوب محنت کے ساتھ اپنے کمرے میں مقید اسائنمنٹ کی تکمیل کر رہی تھی کیونکہ اسے مقررہ ڈیٹ شیٹ سے قبل اسائنمنٹ جمع کروانی تھی۔ سو ہر وقت انہی کی تکمیل میں مصروف عمل دکھائی دیتی اور اس کی یہ مصروفیات نت کھٹ سے اشعر کو چڑا کر رکھ دیتی۔ کبھی وہ اس کے ساتھ لڈو کھیلنا چاہ رہا ہوتا تو کبھی بیڈمینٹن کبھی اس کا لانگ ڈرائیو پر جانے کا موڈ ہوتا تو کبھی ڈھیر ساری باتیں کرنے کا، مگر وہ تھی کہ اس کی بوریت کا احساس ہی نہیں کر رہی تھی اور جواب میں وہ اس سے شدید خفا تھا۔

اس روز خدا خدا کر کے اس کی اسائنمنٹ مکمل ہوئی تو وہ اسے چیک کروانے سر شاہد اقبال کے گھر کی طرف نکل پڑی۔ اشعر چونکہ ناراض تھا اور عاشر بھائی اس وقت آفس میں تھے لہٰذا وہ شیزا کو ساتھ لے کر اکیلی ہی گھر سے نکل پڑی۔

''ایک تو میں بھی بالکل ڈفر ہوں۔ کوئی بھی کام ٹھیک سے وقت پر نہیں کر سکتی اور ایک یہ اشعر۔ اسے سوائے اپنی خوشنودی کے اور کسی بات سے کوئی مطلب ہی نہیں۔ سارے دن لارڈ صاحب کے آگے پیچھے گھومتے رہو تب خوش رہیں گے۔ ہونہہ اپنا نہیں سمجھتا کیا ہے خود......''

شیزا کے ساتھ تیز تیز چلتے ہوئے وہ بلند آواز میں بڑبڑا رہی تھی جب ایک دم سے ایک تیز رفتار گاڑی کے ٹائر عین اس کی ٹانگوں کے پاس چرچرائے اور وہ اچھل کر دھڑام سے نیچے جا گری تب اس کے گرنے سے ہاتھ میں تھامی خوب محنت سے تیار کی ہوئی اسائنمنٹ بھی زمین بوس ہو گئی اور مزید ستم کہ دو روز قبل ہونے والی بارش کے ٹھہرے ہوئے گدلے پانی کے دھبے۔ اس کی ساری خوبصورتی ہڑپ کر گئے۔

تمکین بمشکل اپنی ٹانگ کو سہلاتی سخت طیش کے عالم میں کھڑی ہوئی اور جوں ہی گاڑی سے ایک نہایت ڈیشنگ سا شخص باہر نکلا وہ آپے سے باہر ہو کر اس پر چلانے لگی۔

''مسٹر ایکس۔ وائی۔ زیڈ آپ کیا نشہ کر کے گاڑی چلا رہے ہیں جو سڑکوں پر چلتے پھرتے دراز قد انسان آپ کو کیڑے مکوڑے نظر آنے لگے۔''

غصے کی شدت سے اس کا گلاب چہرہ مزید سرخ ہو گیا تھا۔ شیزا نے اس کا بازو تھام کر اسے ریلیکس رہنے کا اشارہ کیا مگر وہ کہاں سمجھنے والی تھی۔ تب ہی ایک جھٹکے سے۔ اپنا بازو اس کی گرفت سے چھڑا لیا اور کچا چبا لینے والی نگاہوں سے اس ہینڈسم سے نوجوان کو دیکھنے لگی جو خاصی دلچسپی سے اس کا یہ پھولا پھولا سا سرخ چہرہ دیکھ رہا تھا۔ قدرے گلابی لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ اس وقت تمکین کو سخت زہر لگ رہی تھی۔ جب وہ پرسکون سے انداز سے گویا ہوا۔

''دیکھیے محترمہ! خودکشی کی دانستہ طور کوشش آپ کر رہی تھیں اور الزام مجھے دے رہی ہیں۔ یہ تو وہی بات ہو گئی کہ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔''

تمکین کے چہرے پر جتنا غصہ چھلک رہا تھا۔ مقابل کی آنکھوں میں اتنی ہی بے نیازی اور ٹھہراؤ تھا۔

''شٹ اپ! خوب جانتی ہوں میں آپ جیسے مردوں کو۔ لڑکیوں کے منہ لگنے کا تو بہانہ چاہیے آپ کو۔''

اپنی غلطی کا سارا غصہ وہ اس پر نکال رہی تھی۔ نوجوان نے قدرے حیرانگی سے آنکھیں سکیڑ کر اسے بغور دیکھا پھر یوں ہی طنزیہ سی مسکراہٹ پھیلا کر بولا۔

''اللہ رے خوش فہمی! امائنڈ یو میڈم! میں آپ جیسی لڑکیوں کو جوتے کی ٹوک پر رکھتا ہوں۔'' وہ بھی اپنے نام کا شاید ایک ہی تھا۔ ذرا جو اس کے ''جلال'' سے مرعوب ہوا ہو۔

''بس بس دیکھے ہیں بہت تم جیسے۔ ہونہہ! کچھ ہوں تو پتہ نہیں کیا کریں''

خاصی نخوت سے کہہ کر وہ آگے بڑھنا ہی چاہتی تھی کہ نوجوان نے کمال جرأت کا زبردست مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی کلائی تھام لی پھر کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے خاصے ریلیکس موڈ میں بولا۔

''ایکسکیوزمی! خاکسار کو اریج احمر کہتے ہیں۔ کروڑوں کی جائیداد کا تنہا وارث ہوں۔ آپ نے یقیناً مجھ جیسے بہت سے ڈیشنگ مرد دیکھے ہوں گے مگر مائینڈ یو۔ کوئی اریج احمر نہیں ہوگا کیونکہ میں آپ جیسی نک چڑھی لڑکیوں کو سیدھا کرنا بخوبی جانتا ہوں۔''

''شٹ اپ! تمہیں عورتوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں۔''

انتہائی تپ کر وہ ایک مرتبہ پھر آپے سے باہر ہوگئی تو مقابل کے لبوں پر دھیمی مسکراہٹ مزید گہری ہوگئی، جبکہ شیزا اس کے پہلو میں کھڑی مسلسل معاملہ رفع دفع کرنے پر مجبور کر رہی تھی مگر اس کا تو غصہ ساتویں آسمان پر پہنچا ہوا تھا تب ہی اسے گھرک کر چپ کروا دیا۔

''دیکھیں محترمہ! میں عورت کا احترام کرنا اچھی طرح جانتا ہوں مگر معذرت کے ساتھ کہ آپ جیسی عورتوں کا نہیں۔''

''وہاٹ مجھ جیسی کیا......؟ میں آپ کو کوئی آوارہ لڑکی نظر آتی ہوں کیا۔ آپ کی جرأت کیسے ہوئی یہ بات کہنے کی۔'' اس کے تو گویا تلوؤں پر لگی سر پر بجھی۔

''دیکھئے محترمہ زیادہ طیش میں آنے کی ضرورت نہیں۔ غلطی کہیں نہ کہیں آپ کی بھی ہے۔ وگرنہ مجھے کوئی شوق نہیں ہے کہ راہ چلتی لڑکیوں سے ٹکراتا پھروں۔ لہٰذا بہتر ہوگا کہ آپ اپنی فضول کی بک بک بند کریں اور گھر کا راستہ ناپیں۔ بصورت دیگر آپ جیسی لڑکی سے نپٹنا میں اچھی طرح جانتا ہوں۔''

بہت معمولی سا تناؤ آیا تھا اس کے چہرے پر۔ شاید وہ فضول کی اس بک بک سے اکتا گیا تھا مگر سدا کی ایموشنل تمکین کی آنکھوں میں تو جیسے خون اتر آیا تھا۔ تب ہی وہ آگے بڑھی اور اس کا گریبان جھنجھوڑ کر بولی۔

''کیا آپ جیسی، آپ جیسی کی رٹ لگا رکھی ہے تم نے۔ تم لوگ کیا سمجھتے ہو؟ جن عورتوں پر صرف تمہارے ناموں کی مہر لگی ہے وہی پاک دامن ہیں، باقی ہر عورت تمہارے لئے کوئی چلتا پھرتا ایڈ ہے۔ جس کے ساتھ تم کسی بھی طریقے سے پیش آؤ۔ کچھ بھی سوچو۔ تمہیں کوئی روکنے والا نہیں۔ یاد رکھئے مسٹر اریج احمر صاحب! تم مردوں کی غیرت کی کہانی صرف اتنی سی ہے کہ تم لوگ محض اس عورت کے لئے مرنے مارنے پر تل جاتے ہو۔ جس کی ذات پر کسی نہ کسی حوالے سے تمہارے تعلق کا لیبل لگا ہوتا ہے مگر ایسی ہی دوسری کوئی بھی عورت جس سے تمہارا کسی قسم کا کوئی رشتہ نہیں ہوتا اس کے لئے انتہائی پست انداز میں سوچتے ہوئے بہت لطف آتا ہے تمہیں، اور اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ تمہارے اندر انسانیت، بے موت مر گئی ہے سمجھے تم......''

خاصی ترشی کے ساتھ اپنی بات مکمل کر کے اس نے اریج احمر کو ایک جھٹکے سے پرے دھکیلا پھر شیزا کے ساتھ اپنی کیچڑ میں لت پت فائل اٹھا کر آگے بڑھ گئی تو اریج احمر روشن آنکھوں میں ڈھیروں تبسم لئے دور تک اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ یقیناً ایسی کڑک دار لڑکی سے آج پہلی بار اس کا واسطہ پڑا تھا اور اسے یہ ٹکراؤ بہت اچھا بھی لگا تھا۔

تمکین تھوڑا آگے آئی تو شیزا نے اسے اچھی خاصی ڈانٹ پلا دی۔

''کیا ضرورت تھی تمہیں اس ایرے غیرے کو اس قدر سخت سست بنانے کی۔ ایک تو قصور تمہارا اپنا تھا اوپر سے بات کو بھی تم نے ہی بگاڑ دیا۔''

شیزا کے ڈانٹنے پر وہ تو جیسے کرنٹ کھا کر پلٹی۔

''میں نے بات کو بگاڑ دیا؟ اور وہ تو جیسے انگلی رکھ کر بیٹھا تھا ناں ہونٹ پر، اور تم کیوں منہ میں گڑ لے کر بیٹھ گئی تھیں؟ دو سنا نہیں سکتی تھیں اسے؟ تمہاری خاموشی کی وجہ سے ہی اس کی اتنی ہمت بڑھی کہ وہ ہم سے بدتمیزی کر سکے۔''

وہ کہاں کچھ سننے والی تھی۔ الٹا اسے لتاڑ کر رکھ دیا۔

''اچھا بابا معاف کرو۔ غلطی ہو گئی آج تمہارے ساتھ پیدل گھر سے نکلنے کی۔ پتہ نہیں کب سدھرو گی تم۔'' اس کے ڈانٹنے پر شیزا خاصے دل جلے انداز میں بولی پھر اچانک نظر کیچڑ میں لت پت اسائنمنٹ والی فائل پر پڑی تو افسردہ لہجے میں بولی۔

''یہ اسائنمنٹ تو خراب ہو گئی تمی۔ اب تم کیا کرو گی۔''

''خودکشی۔''

بھرائے ہوئے لہجے میں قدرے جذباتی ہو کر اس نے کہا تو یک دم آنکھیں لبالب پانیوں سے بھر آئیں۔ کتنی محنت سے اس نے دن رات ایک کر کے یہ اسائنمنٹ مکمل کی تھی۔ یہاں تک کہ اس اسائنمنٹ کو وقت پر جمع کروانے کی کوشش میں وہ اشعر کو بھی خفا کر بیٹھی تھی، مگر اسے محنت کا پھل نہ مل سکا اور اس کی ساری محنت مٹی میں مل گئی۔ وہ روتی نہ تو کیا کرتی؟ اب کیسے فقط دو ہی دن میں دوبارہ سے تیار کرتی اسے؟ اسی پریشانی میں بے حال وہ رو رہی تھی جب اچانک سامنے سے اریج احمر کی گاڑی آتی دکھائی دی اور تھوڑی ہی دیر میں وہ اپنی شاندار گاڑی سے نکل کر اس کے مقابل تھا۔

☆☆☆

مہدی حسن کی مدھر آواز پورے کمرے میں عجیب سا سرور پھیلا رہی تھی۔ جب اریشہ نہایت آف موڈ میں اس کے کمرے میں داخل ہوئی اور ٹھک سے ٹیپ ریکارڈر کا پہلے بٹن آف کر ڈالا تب آنکھیں موندے کرسی پر ریلیکس انداز میں جھولتے ہوئے ازمیر شاہ نے پٹ سے آنکھیں کھولیں اور نظر جوں ہی اریشہ کے پریشان سے چہرے پر پڑی۔ وہ پھر سے پلکیں موند کر دھیمے سے مسکرا دیا۔

''ازمیر! میں اتنی پریشان ہوں اور تم یہاں مزے سے میوزک سن رہے ہو۔''

اس سے رہا نہ گیا تو خود ہی آگے بڑھ کر اس کے بیڈ کے کونے پر ٹک گئی۔ جواب میں ازمیر آنکھیں کھول کر مسکراتے ہوئے بغور اس کی

پریشانی کا جائزہ لینے لگا۔

''کیا بات ہے؟ کیا پھر سے کوئی مسئلہ درپیش آ گیا ہے تمہیں؟''

''ہاں دیکھو نا میں ہائیر اسٹڈیز کے لئے باہر جانا چاہتی ہوں مگر پاپا نہیں مان رہے۔ کل ہی میری ان سے فون پر بات ہوئی ہے۔ مجھے تو امید تھی کہ شاید پاپا میری حمایت میں میری اسٹڈی کے لئے اسٹینڈ لیں گے مگر انہوں نے تو مما سے بھی بڑھ کر مایوس کر دیا ہے مجھے۔ اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟''

دوپٹے کا پلو انگلی پر لپیٹتے اور کھولتے ہوئے وہ قدرے پریشانی سے بولی تو ازمیر بھی پلنگ سے ٹیک لگا کر سیدھا ہو بیٹھا اور خاصے مدبرانہ انداز میں بولا۔

''تو اس میں یوں پریشان ہونے والی بات کون سی ہے، پہلے تو تم اپنا ایم اے کلیئر کرلو۔ جو سبجیکٹ رہ گئے ہیں ان میں خوب محنت کرو۔ پھر اس کے بعد میں پاپا سے بات کروں گا اور وہ پھوپھو کو سمجھائیں گے۔ بس پھر تم آرام سے باہر چلی جانا اور خوب پڑھنا......''

وہ جس مسئلے کے لئے رات بھر سے سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی۔ وہی مسئلہ ازمیر نے ہمیشہ کی طرح چٹکی بجاتے حل کر ڈالا تھا۔ جواب میں اریشہ نے مشکور نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''ازمیر! ایک بات پوچھوں تم سے۔ تم مائنڈ نہیں کرو گے ناں؟''

جوں ہی من کا بوجھ ہلکا ہوا۔ وہ جیسے ایک دم سے تازہ دم ہوگئی۔ تاہم ازمیر نے دونوں بازو سینے پر لپیٹے خاصی دلچسپی سے ضرور اس کی لرزتی پلکوں کو دیکھا تھا پھر مسکراتے ہوئے آہستگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ازمیر! تمہیں لندن سے آئے ہوئے کتنے ماہ بیت گئے۔ اتنے طویل عرصے میں تمہیں کبھی شہرزین کی یاد نہیں آئی۔''

کس قدر غیر متوقع سوال کر ڈالا تھا اس نے؟ ازمیر کے لبوں پر پھیلی مسکراہٹ پل کے پل میں معدوم ہوگئی۔ دل کے پرانے زخم جیسے پھر سے رسنے لگے۔ حلق میں غم کا پھندا سا پھنس گیا تب ہی کچھ دیر کیلئے وہ کچھ بول ہی نہ سکا۔ پھر کچھ لمحوں میں خود کو سنبھال کر قدرے نم لہجے میں بولا۔

''میں گزرے ہوئے دنوں کا سوگ نہیں منایا کرتا اریشہ، اور نہ ہی لاحاصل محبتوں کے لئے سلگنا اچھا لگتا ہے۔ پھر اب مجھے عادت سی ہوگئی ہے تلخ لہجے برداشت کرنے کی لہٰذا کسی کو یاد کرنے یا نہ کرنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ بہرحال تم چھوڑو فضول کی باتیں اور جلدی سے میرا کوئی اچھا سا سوٹ پریس کر دو کیونکہ آج شام بہت اہم میٹنگ اٹینڈ کرنی ہے مجھے۔''

بہت ہی ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولتے بولتے وہ یکسر بات بدل گیا تو اریشہ نے بھی اسے مزید کریدنا مناسب نہیں سمجھا تب ہی اپنائیت بھرے انداز میں بولی۔

''واپسی کب تک ہوگی؟''

''واپسی کے بارے میں ٹھیک سے کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ویسے تم کیوں پوچھ رہی ہو؟''

وہ بھی تھوڑی دیر پہلے والی اداسی سے باہر نکل آیا تو اریشہ نے گویا سکون کا سانس لیا۔ تب ہی قدرے متانت سے بولی۔

''وہ میں اس لئے پوچھ رہی تھی تاکہ تمہارے آتے ہی کھانا گرم کر کے رکھ سکوں۔''

کتنی فکر رہتی تھی اسے ازمیر کی۔ کبھی کبھی تو وہ سوچتا تھا کہ اگر اریشہ اس کی زندگی میں نہ ہوتی تو وہ کیا کرتا؟ کیسے اپنے آپ کو سیٹ کر رکھتا؟

''اریشہ! پلیز اتنا عادی مت بناؤ مجھے اپنا کہ کل کو میں تمہارے بغیر زندہ نہ رہ پاؤں۔ بہت خیال رکھتی ہو تم میرا اور بہت زیادہ امیدیں رکھنے لگا ہوں تم سے میں۔ کل کو کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بھی مجھ سے اکتا جاؤ اور میں پاگلوں کی مانند تمہیں پکارتا پھروں۔ بہر حال تم میرے کھانے کی فکر مت کرو۔ میں کوشش کروں گا کہ جلد گھر لوٹ آؤں۔ تب ہم مل کر باہر ہی ڈنر کریں گے اور لانگ ڈرائیو پر بھی چلیں گے۔ کیا خیال ہے تمہارا......''

اس کا ہاتھ تھام کر وہ خاصے گھمبیر لہجے میں بولا تو اریشہ کے دل کی دھڑکنیں لمحوں میں ہی اتھل پتھل ہو گئیں۔ بمشکل اس نے ''اوکے'' کہا اور جلدی سے اس کے کمرے سے باہر نکل آئی کہ چہرے پر اس وقت رنگ رنگ کے گلاب کھل رہے تھے۔

وہ بھلا کہاں جانتا تھا کہ اریشہ کے دل میں اس کا کیا مقام ہے؟ کیسے وہ پہروں صرف اسی کے بارے میں سوچتی رہتی ہے۔ ہر شب نجانے کتنے ہی خواب اس کے حوالے سے آنکھوں میں بھر لیتی ہے۔ کہاں جانتا تھا وہ کہ اس سے بچھڑنے کا تو وہ کبھی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔ اس کی تو سانسیں رکنے لگی تھیں یہ سوچ کر کہ ازمیر کبھی اس سے جدا نہ ہو جائے۔ کہیں اس کی کم صورتی کو ایشو بنا کر۔ اس کی مما اسے ازمیر سے دور ہی نہ کر دیں مگر جب سے اس کا شاندار رزلٹ آیا تھا اور اس نے اکیلے نہایت عمدہ اور قابل تعریف انداز میں اپنے وسیع و عریض بزنس کو ڈیل کیا تھا تب سے وہ گھر کے تمام بزرگوں کی نظر میں بہت اہم ہو گیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اب وہ اسے لے کر کسی طرح ٹینس ونیس نہیں ہوتی تھی۔

اس روز رات کے تقریباً گیارہ سوا گیارہ بجے ازمیر کی جوں ہی گھر واپسی ہوئی۔ وہ بہت مسرور انداز میں اریشہ کے کمرے کی طرف بڑھا مگر وائے نصیب کہ اس کے کمرے تک پہنچنے سے قبل ہی اس کے قدم ماہم کے کمرے میں گونجتے قہقہے نے روک لئے۔

''ارے مزے کی بات تو سنو! محترم آج اریشہ کو ڈنر پر لے جا رہے ہیں۔ یہ تو وہی بات نہیں ہوگئی کہ حور کے پہلو میں لنگور۔''

ماہم کا بہت کٹیلا لہجہ بلند آواز میں ابھرا تھا۔ جواب میں کسی کے قہقہوں کی بازگشت اسے دور تک سنائی دی۔

''لگتا ہے محترم نے اپنی سابقہ غلطیوں سے سبق نہیں سیکھا۔ تب ہی تو شہرین خان سے پٹائی کروانے کے بعد اب اریشہ کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ پتہ نہیں کیا ہوگا ایسے نوجوانوں کا جن کی کوئی عزت نفس ہی نہیں۔''

عدیلہ کی تیز آواز گونجی اور ازمیر کو لگا وہ وہیں پتھر کا ہو گیا ہو۔ گھر والے اس کے بارے میں اس انداز سے سوچتے ہوں گے۔ اس نے تو تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس نے کتنا بڑا دھوکا دیا اسے۔ وہ بات جو اس نے صرف اس سے شیئر کی تھی۔ آج دیگر لوگوں کی زبان پر تھی۔ جس نے اسے فقط ایک لمحے میں ہی بہت زیادہ تھکا ڈالا۔

☆☆☆

عدنان رؤف اور اس کا پورا گروپ آج پھر اس کا راستہ روکے کھڑا تھا۔ انجشاء نے سرسری سی فقط اک نظر ان آوارہ نوجوانوں پر ڈالی پھر قدم تیزی سے آگے بڑھا دیئے مگر اس کی یہ حرکت بھی عدنان رؤف کو سخت ناگوار گزری تھی۔ تب ہی وہ ایک لانگ جست لگا کر بالکل اس کے سامنے آ کھڑا ہوا پھر کمال جرأت سے اس کی کلائی پکڑتے ہوئے بولا۔

''آپ خود کو سمجھتی کیا ہیں۔ کوئی مس ورلڈ ہیں آپ۔ آسمان سے اتری ہیں۔ یہ اتنا غرور کس چیز کا ہے آپ کو؟ خوب سمجھتا ہوں میں آپ جیسی لڑکیوں کو۔ اپنی قیمت بڑھانے کے چکر میں پہلے پہل ناز نخرے دکھاتی ہیں بعد میں آہستہ آہستہ خود ہی لائن پر آ جاتی ہیں۔ بولیے پلیز کتنے پیسے لیں گی آپ میرے ساتھ فقط ایک ڈنر کرنے کے......؟''

وہ جو الفاظ بھی ادا کر رہا تھا انجشاء سمجھ سکتی تھی کہ یہ الفاظ اس کے دوستوں نے اسے دان کیے ہیں۔ وگرنہ وہ اتنے گھٹیا انداز میں بولنے کی جرأت قطعی نہیں رکھتا تھا۔ تب ہی اس نے نہایت سہولت سے اپنی کلائی اس کی گرفت سے آزاد کروائی اور پھر ایک بھرپور نظر اس کے دل کش سراپے پر ڈالتے ہوئے سکون سے بولی۔

''آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ آپ میرے ساتھ ڈنر کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ میں آپ کو اتنی مشکل میں پڑنے ہی نہ دیتی، اور آپ لڑکیوں کے بارے میں بہت جانتے ہیں۔ لگتا ہے کافی وقت گزرا ہے اس پریکٹس میں۔ بہر حال آپ مجھے بتا دیجئے کہ مجھے آپ کے ساتھ کس وقت اور کس دن ڈنر کرنا ہے۔ میں چل پڑوں گی بغیر کوئی پیسے لیے۔ اوکے بیسٹ آف لک۔''

ہر روز کی طرح وہ آج بھی قطعی ایموشنل نہیں ہوئی تو عدنان رؤف بری طرح جھنجھلا گیا۔

''کیا ہے یہ لڑکی؟ آخر سمجھتی کیا ہے خود کو؟ میں اتنا امیر کبیر، ہینڈسم لڑکا اور یہ ایک عام سی لڑکی۔ ایک معمولی دفتر میں فقط چند ہزار کی جاب کرنے والی پھر یہ مجھ سے مرعوب کیوں نہیں ہوتی۔ کیوں دوسری تمام لڑکیوں کی طرح نروس ہو کر مجھ سے خوف زدہ نہیں ہوتی؟ کیوں نہیں اسے اپنی بدنامی کا خوف میرے سامنے سر جھکانے پر مجبور کر دیتا؟ کیوں اتنی پرسکون رہتی ہے یہ؟ کیوں ہر بار مجھے ہی لاجواب کر کے چلی جاتی ہے یہ......''

مارے کوفت اور جھنجلاہٹ کے اس نے بڑی بے دردی سے اپنا ہاتھ گاڑی کے بونٹ پر مارا تو اگلے ہی پل، وہاں کسی نوکیلی چیز کی وجہ سے خون کا فوارہ سا ابل پڑا اس کے ہاتھ سے، تب اس کے تمام دوست لپک کر اس کی سمت بڑھے اور شاہد نے تیزی سے اپنا رومال اس کے زخمی ہاتھ پر باندھ دیا۔

''استاد! لڑکی تو لائن پر آ گئی۔ پھر یہ غصہ کس بات پر؟''

اسلم نے سب سے پہلے بولنے کی ہمت کی۔ جواب میں عدنان نے خاصی خشمگیں نگاہوں سے اسے دیکھا اور اگلے ہی پل گاڑی میں جا بیٹھا کہ اس وقت اس کا دماغ بری طرح اپ سیٹ تھا۔

آج سے تین ماہ قبل جب وہ اپنے دوست شہریار کو ملنے اس آفس میں آیا تھا اور بالکل غیر ارادی طور پر ہی اس منفرد سی لڑکی سے ٹکراؤ ہو گیا تھا تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ آنے والے دنوں میں یہ اک عام سی لڑکی اسے ہر روز ذہنی ٹینشن میں مبتلا کر کے رکھ دے گی۔ وہ اس کی

انسلٹ کر کے، اس کا راستہ روک کر اسے جتنا غصہ دلانے کی کوشش کرتا وہ اتنا ہی پرسکون رہتی جیسے اس کی گھٹیا حرکتیں اس پر کوئی اثر ہی نہ کرتی ہوں۔ وہ جو آج تک ہر حسین ترین لڑکی کو فقط ایک بے جان سا کھلونا سمجھ کر ان کے جذبات سے کھیلتا آیا تھا۔ اب زندگی میں پہلی بار اس بالکل ہی عام لڑکی نے اسے سخت اپ سیٹ کر کے رکھ دیا تھا۔ کسی چکنی مچھلی کی طرح وہ ہر روز ہاتھ سے پھسل جاتی اور عدنان رؤف اسے تپ کر طیش کے عالم میں دیکھنے کی حسرت ہی کرتا رہ جاتا۔

آج تک بے شمار لڑکیوں سے پالا پڑا تھا اس کا۔ کچھ نے اس کی دوستی کی آفر کو کھلے دل اور کھلی بانہوں سے ویلکم کیا تھا تو کچھ پہلے پہل خاصے غصے اور عتاب کا شکار بنی نظر آئی تھیں اور اسے ایسی ہی لڑکیوں کو توپٹانے میں لطف آتا تھا جو اپنے آپ کو نجانے کون سی دنیا کی مخلوق سمجھتی تھیں۔

اس کے ذہن کے کسی کونے میں یہ بات شاید اچھی طرح اٹک گئی تھی کہ عورت کی کوئی قدر، کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ وہ فقط اک حسین کھلونا ہے جو اللہ تعالیٰ نے مرد کا دل بہلانے کے لئے پیدا کیا ہے۔ اگر عورت کا کوئی روپ آپ کے لئے باعث احترام ہے بھی تو صرف آپ کی جنم دینے والی ماں کا یا آپ کی سگی بہن کا۔ بصورت دیگر ہر عورت ایک تماشا ہے۔ اسے دیکھو، چھیڑو اور لطف سمیٹو۔

تب ہی تو اسے غصے سے سرخ، اپنے آپ کو کوئی ماورائی مخلوق سمجھنے والی لڑکیوں کو جھکا کر بچی خوشی ملتی تھی اور وہ خوب جشن مناتا تھا۔

مگر اب یہ لڑکی مسلسل اسے زچ کر رہی تھی اور ہر گزرتے دن کے ساتھ اک مشکل چیلنج ثابت ہو رہی تھی اس کے لئے۔ وہ جو نہ صرف ایک دولت مند حسین لڑکا تھا بلکہ معزز اور بارسوخ گھرانے کا لیبل بھی حاصل تھا اسے۔ والدین کی نظروں میں وہ ایک ہونہار، لائق فائق، فرماں بردار اور محنتی لڑکا تھا جس کا سارا دن آفس میں فائلوں کے بیچ گزرتا تھا مگر یہ تو وہی جانتا تھا کہ وہ کیسے شب و روز آنکھوں میں دھول جھونک رہا ہے، اور اس کے لئے یہ بات بھی کسی طرح حیرت سے کم نہیں تھی کہ وہ اپنے آپ کو بہت منفرد سمجھنے والی لڑکی اسے اور اس کے والدین کو کیسے جانتی ہے؟ تب ہی تو وہ اسے طیش دلا کر اس سے یہ راز اگلوانا چاہتا تھا مگر وائے نصیب کہ اسے کامیابی نہ مل سکی تھی۔

انجشاء اسے چاروں شانے چت کر کے ابھی کچھ ہی قدم آگے بڑھی تھی کہ اچانک ایک وائٹ کرولا اس کے بالکل پاس آرکی اور اگلے ہی پل اس کے باس کے فرسٹ فرینڈ مسٹر مجتبیٰ حسن گاڑی سے باہر نکلے اور پھر دروازہ بند کر کے اپنا نفیس چشمہ سیٹ کرتے ہوئے شائستگی سے بولے۔

''اینی پرابلم مس شاہ۔ وہ عدنان رؤف کیوں پریشان کر رہا تھا آپ کو......؟''

وہ شاید عدنان رؤف کو اس کے ساتھ الجھتے ہوئے دیکھ چکا تھا تب ہی نرمی سے بولا تو انجشاء نے اک سرد آہ بھرتے ہوئے سرسری سی اک نظر ان پر ڈالی پھر قدرے دھیمے لہجے میں بولی۔

''کچھ نہیں سر! بس یوں ہی آفس کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔''

''اوکے! آپ پلیز میرے ساتھ چلئے۔ مجھے بزنس کے سلسلے میں کچھ ضروری امور ڈسکس کرنے ہیں آپ سے۔'' اگلے ہی پل بات سمیٹتے ہوئے وہ خاصی متانت سے بولے تو انجشاء نے چپ چاپ سر اثبات میں ہلا دیا۔

''آیئے مس انجشاء! ان سے ملئے۔ یہ ہیں مسٹر اریج احمر شاہ۔ شاہ گروپ آف انڈسٹریز کے اکلوتے وارث۔ یہ اپنا نیا پراجیکٹ شروع

کرنا چاہتے ہیں جس کے لئے انہیں ایک نہایت محنتی اور بزنس امور میں ماہر ایک ساتھی کی ضرورت ہے۔ میں نے انہیں آپ کے بارے میں بتایا تو انہوں نے آپ سے روبرو ملنے کی خواہش کا اظہار کر دیا۔ سو مجھے آپ کو یہاں آنے کی زحمت دینا پڑی۔ اب آپ پلیز تفصیل سے تمام معاملات ان سے ڈسکس کر لیجئے۔ آئی ہوپ آپ دونوں کے لئے فائدے کا سودا ہوگا۔''

اگلے دس پندرہ منٹ میں اپنے آفس پہنچنے کے بعد مسٹر مجتبیٰ اپنی بات کہہ کر امید افزا نگاہوں سے اس کی سمت دیکھنے لگے جبکہ وہ یوں پتھر کا بت بن گئی تھی گویا منزل کے اتنی جلدی مل جانے کا اسے قطعی گمان نہ ہو۔

☆☆☆

''ایکسکیوز می!''

مانوس سی آواز پر تمکین اور شیزا دونوں نے چونک کر سر اٹھایا۔ اریج احمر لبوں پر بڑی مسحور کن سی دھیمی دھیمی مسکراہٹ پھیلائے انہیں ہی دیکھ رہا تھا۔

''کیا ہوا بھئی! ابھی کچھ دیر پہلے تو خاصی تیز دھوپ نکلی تھی اور ابھی یہ بن بادل برسات؟'' شوخ نگاہیں، تمکین کے آنسوؤں سے تر بتر چہرے پر ٹکائے وہ خاصے متبسم لہجے میں بولا تو شیزا اسے زبان بند رکھنے کی نصیحت کرتی خاصے تحمل آمیز انداز میں بولی۔

''دیکھئے اریج صاحب! آپ کی وجہ سے میری کزن کا کتنا بڑا نقصان ہو گیا۔ اس نے دن رات ایک کر کے بڑی مشکل سے اپنی اسائنمنٹ تیار کی تھی مگر آپ کی گاڑی کی ٹکر کی وجہ سے وہ ساری کیچڑ میں لت پت ہو گئی۔ اب آپ ہی بتائیے کہ ہم کیا کریں؟ کیوں کہ کل اسائنمنٹ جمع کروانے کی لاسٹ ڈیٹ ہے اور اتنی جلدی پھر سے اسائنمنٹ تیار کرنا بہت مشکل ہے اس کیلئے...... اوپر سے آپ پھر طنز کر کے پریشان کر رہے ہیں اسے۔''

وہ جب بھی بولتی تھی سوچ سمجھ کر بولتی تھی۔ تمکین کی مانند بغیر سوچے سمجھے شروع ہو جانے سے اسے شدید چڑ تھی۔

''او آئی سی! یہ تو خاصا گمبھیر مسئلہ ہے۔ بہر حال چوں کہ اس سارے قصے میں تھوڑا بہت قصور میرا بھی نکلتا ہے لہٰذا میں آپ کی مدد کرنے کو تیار ہوں۔ لائیے آپ اپنی بکس اور یہ اسائنمنٹ مجھے دے دیجئے۔ میں اسے خود تیار کر کے آپ کے بورڈ کو بھجوا دوں گا۔''

شیزا کے تفصیلی بیان کے بعد وہ خاصے رسان سے بولا تو تمکین نے آنسو پونچھتے ہوئے قدرے چونک کر خاصی مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھا مگر وہ اس وقت بے حد سیریس تھا۔ تب ہی شیزا نے فائل کے اندر سے اسائنمنٹ نکال کر اسے تھما دی اور قدرے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

''بکس تو اس وقت گھر پر ہوں گی۔ آپ پلیز مجھے اپنا ایڈریس دے دیجئے تا کہ میں شام تک وہ کتابیں آپ تک پہنچا سکوں۔''

''اوکے! لیکن اگر میں اس وقت آپ کو آپ کے گھر ڈراپ بھی کر دوں اور کتابیں بھی لے لوں تو کیسا رہے گا؟''

گلابی لبوں پہ بڑی مسحور کن مسکراہٹ پھیلی۔ تمکین نے ٹپٹا کر شیزا کی طرف دیکھا جیسے کہنا چاہتی ہو کہ رہنے دو اس کی مدد کو۔ میں کسی نہ کسی طرح دوبارہ خود ہی اپنا کام مکمل کر لوں گی مگر شیزا اس وقت اس کی جانب متوجہ نہیں تھی تب ہی مسکراتے ہوئے بولی۔

''وائے ناٹ! یہ تو بہت ہی اچھا ہوگا۔ ویسے بھی ہم لوگ خاصے تھک چکے ہیں۔''

خاصے فریش موڈ میں اس نے اپنا عندیہ پیش کیا تھا۔لہٰذا اریج نے ایک بھرپور مسکراتی نظر تمکین کے تپے تپے سے سرخ چہرے پر ڈالنے کے بعد قدم گاڑی کی طرف بڑھا دیے۔

اگلے پندرہ بیس منٹ میں وہ لوگ ''حسن ولاج'' کے بالکل سامنے تھے۔شیزا تو خوش تھی کہ انہیں مفت میں لفٹ بھی مل گئی اور ان کی پریشانی بھی اس بھلے مانس نے منٹ میں دور کردی۔تب ہی اس نے بڑے خلوص کے ساتھ اسے اندر آنے کی دعوت دی جسے اس نے خاصی معذرت کے ساتھ مسترد کردیا کیونکہ اس وقت اس کے پاس ٹائم بالکل نہیں تھا،اور اس کے اگلے ہی چند منٹوں میں بہت اہم میٹنگ اٹینڈ کرنا تھی۔

تب مجبوراً شیزا نے اندر جا کر تمکین سے اس کی کتابیں،اسائنمنٹ اور چند ضروری کاغذات لا کر اریج کے ہاتھ میں تھما دیے۔ساتھ ہی ڈھیروں ڈھیر شکریہ بھی ادا کر ڈالا تو وہ مسکرا کر ''نومینشن'' کہتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا کہ آج اس نے اس خوب صورت جیتی جاگتی مورت کو پالیا تھا کہ جس کی تصویر نجانے کب سے دل کے مندر میں سجی ہوئی تھی۔بہت دل آویز مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھرتی گئی اور وہ سرشار سا اپنے آفس کی طرف روانہ ہوگیا۔

اتنا بے حس کہ پگھلتا ہی نہ تھا باتوں سے
آدمی تھا کہ تراشا ہوا پتھر دیکھا
دکھ ہی ایسا تھا کہ رویا تیرا محسن ورنہ
غم چھپا کر اسے ہنستے ہوئے اکثر دیکھا

O

تمہیں رسوا کروں ایسا تو ہرگز ہو نہیں سکتا
تمہاری یاد ہی دل کو بہت بے چین رکھتی ہے
تمہیں پانے کی اک موہوم سی امید رہتی ہے
میں اپنی سرگزشتوں سے تمہیں آگاہ کر بیٹھا
یہی اک بھول تھی میری کہ اپنا ہوش کھو بیٹھا
اب اک وعدہ کرو مجھ سے
کہ مجھ کو بھول مت جانا!
سہارا بے سبب ہی تو نہیں، اے شاد اس دل کو
کہ تم میری محبت ہو!

نجانے کتنے ہی لمحے گزر گئے تھے، مگر وہ مسلسل چپ چاپ رو رہا تھا۔ ماہم لوگوں کے کٹیلے الفاظ رہ رہ کر اس کا جگر چھلنی کر رہے تھے۔ کتنی شکستہ یاسی کیفیت میں چلتے ہوئے وہ آئینے کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ جہاں اس کا اپنا آپ بخوبی اس پر عیاں تھا۔

اس نے تو کبھی اپنے دل میں خوش فہمیوں کو جگہ نہیں دی تھی۔ کبھی وہ اس بات کو بھولنے کی جسارت نہیں کر پایا تھا کہ وہ شاہ ولاج کے تمام حسین سے حسین ترکینوں کی طرح قطعی خوبصورت نہیں ہے، اور نہ ہی وہ اریشہ سے محض اس لئے انیچ ہوا تھا کہ وہ بے انتہا خوبصورت تھی۔

بارہا اس نے اپنے دل کو ٹٹولا، مگر وہاں کسی ایک کونے میں بھی یہ خواہش نہیں ابھری تھی کہ وہ اریشہ کے بے حد حسن کو کیش کرے، وہ اگر حسین نہ بھی ہوتی، تب بھی وہ اس کے ساتھ اتنا ہی کلوز ہوتا جتنا کہ اس وقت تھا۔

دوسرے تمام لوگوں کی طرح اس نے کبھی ظاہری خوبصورتی کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ اس کے نزدیک تو ہر وہ انسان خوبصورت اور قابل توجہ تھا کہ جس کے پہلو میں محبت بھرا ایک گداز دل اور سب سے عزت و احترام سے پیش آنے والی نرم زبان تھی، بھلا عزت اور محبت سے بڑھ کر کیا چیز

اہم ہوسکتی ہے؟

تو پھر کیوں اس کے بارے میں گھٹیا انداز سے سوچا گیا۔اس نے تو کبھی کسی کو یہ تاثر نہیں دیا تھا کہ وہ اریشہ پر مرمٹا ہے، بلکہ پچھلے کئی دنوں سے تو وہ اسے ٹھیک سے دیکھ بھی نہیں پایا تھا۔

پھر.....پھر کیوں اس پر گھٹیا الزام لگایا گیا؟

کیوں اسے، اس کی ہی نظروں میں اس طرح سے گرادیا گیا کہ اس میں اٹھنے کی ہمت ہی باقی نہ رہی......؟ وہ تو ساری عمر محبتوں کے لئے ترستا رہا تھا، مگر پھر بھی کوئی شکوہ نہ تھا اس کے لبوں پر، تو پھر اب کہ جب عمر کا ایک طویل وقت گزر جانے پر وہ ان محبتوں کا لمس محسوس کر کے خوشی سمیٹنے لگا تھا، تو ایک مرتبہ پھر اسے درد کے پاتال میں دھکیل دیا گیا، کیوں......؟

آخر کیوں اس کی تقدیر میں خوشیوں کا قحط پڑ گیا تھا؟ کیوں اس کا مسکرانا کسی کو گوارہ نہیں تھا؟ اور اریشہ......اس نے دوست بن کر کتنا بڑا دھوکا دیا تھا اسے...... جب وہ جانتی تھی کہ ازمیر اپنے دل کی باتیں صرف اسی کے ساتھ شیئر کرتا ہے تو اس نے کیوں پورے گھر میں پھیلا دیں۔کیوں ایک ایک بات ان سب لوگوں کے ساتھ شیئر کر کے، گہرے دکھ سے ہمکنار کردیا تھا اسے؟ اس نے تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اریشہ اسے اتنا بڑا فریب بھی دے سکتی ہے؟ تب ہی تو بری طرح ٹوٹ کر بکھرا تھا وہ......دل تھا کہ اک واحد اچھا دوست کھو دینے پر خون کے آنسو رو رہا تھا اور وہ بے بسی سے اپنے بیڈ پر پڑا، ساری رات بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔یہاں تک کہ صبح ہوگئی تب وہ خاموشی سے اٹھا اور وضو کر کے گھر سے باہر نکل گیا تاکہ مسجد میں باجماعت نماز ادا کر سکے۔

نماز کی ادائیگی کے بعد قدرے پرسکون ہو کر وہ دھیرے دھیرے گھر کی طرف بڑھنے لگا تاکہ ٹھنڈی معطر ہواؤں اور صبح کے سہانے موسم کو، جی بھر کر انجوائے کر سکے۔

تقریباً آدھ پون گھنٹے کے بعد، وہ جب گھر واپس آیا تو سامنے ہی اپنے کمرے میں اریشہ کو اپنا منتظر پایا۔جو اس کی رائٹنگ ٹیبل پر پڑی، خوبصورت شاعری کی کتاب، ”محبتیں جب شمار کرنا“ کے ورق درورق مطالعے میں خاصی دلچسپی کے ساتھ منہمک تھی۔

وہ قدرے دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوا تھا مگر اریشہ اس کے مسحور کن پرفیوم کی خوشبو محسوس کر کے ہی چونک گئی، اور کتاب کے مطالعے سے نظر ہٹا کر، قدرے پرشکوہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا، پھر قدرے اٹھلاتے ہوئے بولی۔

”ازمیر مجھے تم سے اس درجہ وعدہ خلافی کی قطعی توقع نہیں تھی، تمہیں پتہ ہے رات میں کتنی دیر تک تمہارے واپس لوٹنے کا انتظار کرتی رہی۔“

اس کے دل کی حالت سے قطعی بے خبر وہ اپنی ہی رو میں بولی تھی۔ازمیر چپ چاپ اس پر اک خاموش نظر ڈال کر بیڈ پر آبیٹھا۔تو گویا اریشہ کی جان پر بن گئی ہرنی جیسی آنکھوں میں، کس قدر حیرانگی در آئی تھی تب ہی وہ قدرے الجھ کر اس کے قدموں میں آ بیٹھی۔

”ازمیر کیا ہوا ہے؟ کوئی پرابلم درپیش ہے کیا......؟“

کس قدر پریشان کن انداز تھا اس کا، ازمیر کی سوجھی ہوئی سرخ آنکھوں میں پھر سے پانی جمع ہونے لگا تو وہ رخ پھیر کر قدرے بے نیازی سے بولا۔

''کوئی پرابلم ہے بھی تو تمہارا اس کے ساتھ کیا واسطہ؟ پلیز میری پرابلم مجھے خود ہی حل کرنے دیا کرو، بہت مہربانی ہوگی تمہاری۔''

کس قدر اجنبی انداز تھا اس کا، اریشہ تو حیرت سے گنگ ٹکر ٹکر اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔ جبکہ وہ بے نیازی سے وارڈ روب سے اپنے پریس شدہ کپڑے اٹھا کر واش روم میں گھس گیا۔

میں نے جب بھی پیار مانگا مجھے نفرتیں ملی ہیں
جسے ساری دنیا ترسے مجھے ایسا پیار دے دو
تیرے ساتھ کھیلنی ہے مجھے زندگی کی بازی
میں کبھی نہ جیت پاؤں، مجھے ایسی ہار دے دو

''محبتیں جب شمار کرنا'' کے فرنٹ ٹائٹل پیج پر ازمیر نے خود اپنے ہاتھوں سے نہایت خوبصورتی کے ساتھ، بڑا بڑا کر کے یہ قطعہ لکھا ہوا تھا، اور اوپر لکھا تھا۔ ''تمہارے نام'' تو پھر اب بلاوجہ وہ کیوں اسے ڈانٹ گیا تھا؟ ایک تو قصور اس کا اپنا تھا، کہ وعدے کے باوجود وہ رات کو اسے ڈنر پر نہیں لے کر گیا اور وہ رات بھر اس کے انتظار میں بھوکی رہی، پھر اب؟ جبکہ وہ اسے معاف کر کے خود سے ہی اس کا پریشان چہرہ دیکھ کر اس کی پرابلم شیئر کرنا چاہتی تھی کہ وہ کیسے یک دم سے اجنبی بن گیا تھا؟

مسئلہ خواہ جو بھی تھا، پریشانی چاہیے کچھ بھی تھی، مگر وہ کہاں قصوروار تھی کہ ازمیر اس کے ساتھ، اتنے برے طریقے سے پیش آتا، آنکھیں تھیں کہ پل کے پل چھلکنے کو بے قرار ہو گئی تھیں۔ تب وہ آنسو پونچھتی خاصے آف موڈ کے ساتھ وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بھاگ آئی کہ اب جب تک ازمیر سوری کر کے اسے منانہ لیتا، اسے ازمیر سے روٹھے ہی رہنا تھا۔

☆☆☆

''مون بیٹے! برسوں جڑے انمول رشتے یونہی اک پل میں نہیں توڑے جاتے تم اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرو، انجشا، واقعی اک بہت اچھی بچی ہے۔ تم اس کے ساتھ ہمیشہ خوش رہو گے۔''

دادا جی کی بہت لرزتی ہوئی آواز، سماعتوں کی نذر ہوئی تھی۔ انجشاء کو اپنا پہلو میں دھڑکتا دل بے جان ہوتا محسوس ہوا۔

تب ہی وہ گہری گہری سانسیں بھرنے لگی تھی مگر اندر کمرے میں موجود بزرگوں کی عدالت میں کھڑا وہ شخص کہ جس کے ساتھ اس کی زندگی جڑی تھی، اس کے دل کی حالت سے قطعی بے نیاز تھا۔

''پلیز دادا جی، فار گاڈ سیک، میں نے کب کہا کہ انجشاء اچھی لڑکی نہیں ہے، بہت اچھی لڑکی ہے وہ۔ مگر مجھے اچھی نہیں لگتی اور نہ کبھی لگ سکتی ہے۔ پھر فضول کی اس بحث سے فائدہ......؟''

ایک مرتبہ پھر اس کی تیز آواز، حویلی کے در و دیوار میں لرزش پیدا کر رہی تھی۔ انجشاء کو پتہ ہی نہ چلا کہ کب اس کی آنکھوں سے گرم سیال لاوا، بہہ کر گالوں پر لڑھک آیا ہے۔

''تم اپنے باپ کو یہاں بھیجو میں اسی کے ساتھ اس مسئلے پر بات کروں گا۔''

دادا جی پھر مدہم انداز میں گویا ہوئے تھے۔ مگر وہ قطعی ان کی حلیمی کو خاطر میں نہیں لایا اور چیخ کر بولا۔

''ان سے کیا بات کریں گے آپ؟ زندگی میری ہے اسے مجھے بسر کرنا ہے۔ لہٰذا آپ کو جو بات بھی کرنی ہے وہ مجھ سے کیجئے، پاپا کو بیچ میں لانے کا مقصد؟''

نہایت گستاخی سے وہ بول رہا تھا۔ دادا جی کو بھی جلال آ گیا تب ہی ان کی آواز بھی بلند ہو گئی۔

''برخوردار! مت بھولو کہ اس وقت تم اپنے دادا کے سامنے کھڑے ہو، تم لوگوں نے شہر جا کر چاہے کتنی بھی ترقی کر لی ہو، مگر ہو تم میرے ہی پوتے اور اس رشتے کو تم چاہو بھی تو بدل نہیں سکتے ہو۔ تم بھیجو اپنے باپ کو یہاں تاکہ میں اس سے پوچھوں کہ اس نے کیوں جھولی پھیلا کر محض تین دن کی انجشاء کو تم جیسے نااہل شخص کے لئے مانگا مجھ سے؟ کیوں تمہارے بچپن میں ہی اس معصوم بچی کو تم جیسے گستاخ لڑکے کے ساتھ نکاح کے بندھن میں باندھا اس نے؟ تم کہتے ہو کہ یہ تمہاری زندگی کا معاملہ ہے تو پھر تمہارے باپ نے میری اس معصوم بچی کی زندگی کو کیوں داؤ پر لگا دیا؟ اب اسے ہم سے نظر ملانے کی ہمت نہیں ہو رہی، بزدل چھپ کر بیٹھا ہے وہاں، اسے کہو کہ آ کر ہم سے اس مسئلے پر بات کرے تب ہی ہم کوئی فیصلہ کریں گے۔ کیونکہ اب تمہاری اصلیت جاننے کے بعد ہم خود بھی اس معصوم بچی کو تمہارے سپرد کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔''

مارے اشتعال کے دادا جی کے بوڑھے ہاتھ کانپنے لگے تھے جبکہ باہر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی انجشاء کو لگا جیسے کسی نے تیز دھاری خنجر سے اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا ہو۔

''ٹھیک ہے، تو پھر آپ بھی کان کھول کر سن لیں دادا جی، کہ میں اپنی زندگی میں کبھی انجشاء کو شامل نہیں کروں گا۔ خواہ آپ اور پاپا لاکھ اس کی کوشش کریں، مجھے کل بھی اس رشتے سے قطعی دلچسپی نہیں تھی اور آج بھی اس مجبوری کے بندھن کے لئے میرے دل میں قطعی کوئی جگہ نہیں ہے۔ بٹھا کر رکھیں اسے تاعمر اپنی دہلیز پر۔''

وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے پاپا انجشاء کے ساتھ اس کا رشتہ طے کرنے، اور صرف انجشاء کو ہی اپنے گھر کی بہو بنانے کے لئے کس قدر سیریس تھے۔ لہٰذا ان کے سامنے تو اس کی دال گلنا ممکن ہی نہ تھی جب ہی تو وہ یہاں گوٹھ چلا آیا تھا تاکہ اس رشتے کے خلاف اپنی نفرت اور بےزاری کا اظہار کر کے وہ دادا جی کو اس رشتے سے بدگمان کر سکے، اور اپنے اس ارادے میں وہ خاصی حد تک کامیاب بھی ہو چکا تھا۔ مگر دادا جی کی شرط کے پیشِ نظر، اپنے پاپا کو یہاں بھیجنا گویا ان کی تمام دولت و جائیداد سے بےدخل ہونا تھا۔ تب ہی تو اس روز نہایت غصے کے عالم میں اپنے دل کی بھڑاس نکال کر تن فن کرتا، وہاں سے چلا گیا اور انجشاء گھٹنوں میں سر دیئے روتی سسکتی وہیں بیٹھی رہ گئی۔ اس کے گھر کے کسی فرد کو شاید گمان بھی نہیں ہو سکا تھا کہ وہ یوں اچانک بنا کوئی اطلاع دیئے سرپرائز کرنے کے چکر میں یہاں آ بھی سکتی ہے۔ کسی کو اس کی حویلی میں آمد کے بارے میں کوئی خبر

نہیں تھی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ ابھی ابھی اس کا دل کن طوفانوں کی زد میں آیا تھا، کیا قیامت گزری تھی اس کے جذبات پر؟

ایک لڑکی کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی دکھ بھلا اور ہو بھی کیا سکتا ہے کہ اسے بے دیکھے، بغیر پرکھے، کسی بے جان چیز کی مانند رد کر دیا جائے جبکہ اس کا کوئی قصور بھی نہ ہو۔

بیٹھے بیٹھے ہی اس کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر آئیں، تب اس نے بہت آہستگی کے ساتھ، انگلی کی پور سے اپنے لڑھکتے آنسو سمیٹ لئے، پھر قدرے بھرائے ہوئے لہجے میں، باری باری اریج احمر اور مجتبیٰ احمد کو مشکور نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''میں آپ کی بہت مشکور ہوں سر، کہ آپ نے مجھ نا اہل کو اس قابل سمجھا، اور یقیناً یہ آپ کا حسن نظر ہے کہ آپ مجھے ایک محنتی اور قابل ورکر سمجھتے ہیں، اریج صاحب نے بھی مجھ پر مکمل اعتبار کیا، تو میرا آپ سے وعدہ ہے سر کہ میں انشاء اللہ، ضرور آپ کی امیدوں پر پورا اتروں گی اور کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔''

''تھینک یو مس شاہ، مجھے آپ سے یہی امید تھی، اب آپ مسٹر اریج احمر سے ڈائریکٹ اس موضوع پر بات کریں تب تک میں تھوڑا کام نپٹا لوں۔

وہ اس کے آنسوؤں کو خوشی کا آنسو ہی سمجھے تھے۔ تب ہی مسکرا کر اپنائیت بھرے انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے وہ قدرے مصروف انداز میں بولے۔ تو انجشاء نے دھیمے سے اثبات میں سر ہلا کر سوالیہ نگاہوں سے اریج احمر کی طرف دیکھا کہ اب وہ اسے کیا کہتا ہے؟

''مس شاہ! اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو ہم باہر چل کر اس موضوع پر بات کر سکتے ہیں۔''

وہ پہلے اچھی طرح سے اس کے بارے میں جاننا چاہتا تھا، تب ہی خاصے مدبرانہ انداز میں بولا تو انجشاء نے اجازت طلب نگاہوں سے مجتبیٰ احمد کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی سیٹ چھوڑ دی۔

''مس شاہ! آپ اپنی جاب کی طرف سے قطعی فکر مند مت ہوں، میں آپ کے باس سے بات کر لوں گا۔ یقیناً انہیں بھی آپ کی ترقی سے دلی خوشی ہوگی۔''

اسے متذبذب سا دیکھ کر وہ اس کی الجھن کو سمجھتے ہوئے اپنائیت سے بولے تو انجشاء، دل سے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اریج احمر کے ہمراہ ان کے شاندار سے آفس سے باہر نکل آئی۔ میرا خیال ہے کہ ہم کسی اچھے سے ریستوران کے پُرسکون ماحول میں بیٹھ کر زیادہ بہتر انداز میں بات کر سکتے ہیں۔'' اپنی گاڑی تک پہنچ کر وہ ایک مرتبہ پھر اُس کی سمت دیکھتے ہوئے بولا تو انجشاء نے فقط سرسری سی ایک نظر ان پر ڈالی پھر سر جھکا کر دھیمے سے بولی۔

''ایز یو وش''

وتھینکس۔''

اریج احمر نے بھی خاصے دھیمے مگر مشکور انداز میں کہا اور گاڑی کا لاک کھول کر فرنٹ ڈور اس کے لئے کھول دیا تو وہ اس کا شکریہ ادا کرتے

ہوئے خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔

زندگی کبھی ایسے موڑ پر بھی لے آئے گی، اس نے تو آج تک کبھی تصور میں بھی نہیں سوچا تھا۔

☆☆☆

شیزا کی برتھ ڈے تھی، اور اسے اپنی اک عزیز دوست سے مل کر، اسے انویٹیشن کارڈ دینا تھا، تب ہی وہ تمکین کو بھی ساتھ ہی گھسیٹ لائی، جو آج کل اشعر کے پنڈی چلے جانے پر بری طرح اپ سیٹ تھی، کیونکہ پنڈی میں اشعر کے ماموں رہتے تھے اور ان کی اکلوتی، حسین وجمیل بیٹی، دل وجان سے اشعر پر مرتی تھی، اور وہ اس سے ناراض ہو کر، اسے جلانے کے لئے ہی وہاں چلا گیا تھا۔ پیچھے وہ جلتی کڑھتی، اس کی منتیں کرتی ہی رہ گئی، مگر اسے نہیں رکنا تھا سو وہ نہیں رکا، اور اس کی ہزار منتوں کے باوجود پنڈی چلا گیا۔ تب ہی سے وہ بے حد اپ سیٹ تھی روز اس کے فون کا انتظار کرتی اور روز انتظار کرتے کرتے ہی نیند کی گود میں چلی جاتی، مگر اس نے پنڈی جا کر نہ تو فون پر اس سے کوئی بات کی، نہ کوئی خط ہی لکھا، اور اس کی یہ اتنی دیرپا ناراضگی، حقیقی معنوں میں تمکین کی جان پر بنا رہی تھی، تب ہی اس کا کہیں آنے جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا، مگر شیزا کے سامنے، اس کی کہاں چلتی تھی بھلا؟ سو وہ زبردستی گھسیٹ لائی اسے۔

اور اب پچھلے کئی منٹوں سے اسے محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی لڑکا، مسلسل ان کا تعاقب کر رہا ہے، تب ہی شیزا کے مطلوبہ ایک شاندار آفس کے سامنے رکتے ہی، وہ بولی۔

''تم اندر چلو، میں ابھی آتی ہوں'' یہ کہتے ہوئے چند قدم پیچھے آئی اور بغور آف وائٹ شرٹ اور بلیک جینز میں ملبوس اس سنجیدہ سے پرکشش لڑکے کو دیکھا جو بیچارا اتفاقیہ ان کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا، پھر جونہی وہ اس کے قریب پہنچا، اپنی عادت سے مجبور، تمکین، خاصے جھگڑالو انداز میں اس سے الجھ پڑی۔

''او مسٹر! کوئی شرم وحیا ہے تم میں کیوں پیچھا کر رہے ہو میرا''

نوجوان نے مڑ کر خاصی حیرانگی بھری استفہامیہ نگاہوں سے اسے دیکھا جو بڑے خطرناک تیور لئے اسے گھور رہی تھی۔

''سوری میڈیم آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، میں تو یہاں......''

''کیا میں تو یہاں......؟ کوئی کرکٹ میچ ہو رہا ہے یہاں جو تم دیکھنے کیلئے آئے ہو، اور تمہیں کیا لگتا ہے میں کوئی اندھی ہوں، مجھے کچھ نظر نہیں آتا؟ دیکھو مسٹر یہ جو شاندار آفس تم دیکھ رہے ہو ناں، یہ اپنے فیانسی کا ہے، کیا سمجھے؟ اور اگر میں چاہوں ناں تو کھڑے کھڑے تمہیں ملازمت سے نکلوا سکتی ہوں، کیونکہ میرا فیانسی، میری انگلیوں پر ناچتا ہے، لہٰذا آئندہ کسی بھی لڑکی کا پیچھا کرنے کی کوشش کی ناں تو ناکوں چنے چبوا دوں گی سمجھے تم۔'' اس کے ہاتھ میں دفتری فائلز دیکھ کر وہ فوراً شومارنے لگی تو نوجوان بیچارہ حیرت سے گنگ ٹکر ٹکر اس عجیب وغریب لڑکی کو دیکھتا رہ گیا۔

''مسٹر عزیز! آپ پلیز جا کر اپنا کام کیجئے، میں ان سے بات کرتا ہوں''

اب کے حیران ہونے کی باری تمکین کی تھی جب ہی وہ اپنی پشت پر کسی کی مانوس آواز سن کر، چونک اٹھی اور فوراً پیچھے مڑ کر دیکھا تو اریج احمر

کا دلکش سا سراپا نگاہوں کے حلقے میں آ گیا، نوجوان ''جی سر'' کہہ کر کب کا جا چکا تھا۔ تب وہ خاصی دلچسپی سے تمکین کا خفت آمیز سرخ سرخ چہرہ دیکھتے ہوئے قدرے شوخ انداز میں گویا ہوا۔

''جی محترمہ تمکین صاحبہ! کیا کہہ رہی تھیں آپ، کہ یہ آفس آپ کے فیانسی کا ہے؟'' ابرو اچکا کر وہ خاصے تفتیشی انداز میں بولا۔ تو تمکین کی پلکیں آپ ہی آپ ندامت سے جھک گئیں منہ سے اک لفظ تک نہ نکل سکا۔

''ویسے فار یور کائینڈ انفارمیشن کہ یہ آفس، جس کے سامنے اس وقت آپ کھڑی ہیں، یہ اس خاکسار کا ہے، ہاں یہ اور بات ہے کہ نیو برانچ کی تکمیل کی وجہ سے میں یہاں زیادہ نہیں آتا۔ مگر یقین کیجئے کہ مجھے آپ کے فیانسی ہونے پر قطعی کوئی اعتراض نہیں۔''

وہی اس کا ٹھہرا ٹھہرا مدھر انداز، مگر اس بار تمکین نے ایک جھٹکے سے جھکا ہوا سر اوپر اٹھایا اور خاصا گھور کر اس کے بے حد فریش چہرے کو دیکھا، پھر نہایت تپے ہوئے لہجے میں بولی۔

''منہ دھو رکھیں، آپ کی فیانسی ہونے سے کہیں بہتر ہے کہ میں کسی نہر میں کود کر اپنی جان دے دوں۔'' اسے تو ابھی اس روز ایکسیڈنٹ والا واقعہ ہی نہیں بھولا تھا اوپر سے اس کی اتنی جرأت کہ کھڑے کھڑے خود کو اس کا فیانسی بنانے پر آمادہ ہو گیا۔ تب ہی قدرے سنگ کر بولی تو اریج احمر بے ساختہ ہنس دیا۔

''کیوں ایسی کیا برائی ہے مجھ میں.....'' سیدھا اس کی بلوری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ قدرے گھمبیر لہجے میں بولا تو تمکین اپنی جگہ غصے سے بل کھا کر رہ گئی پھر اسی طرح جلے ہوئے انداز میں بولی۔

''اچھائی بھی کیا ہے، سوائے لڑکیاں پٹانے کے نجانے اور بھی کچھ آتا ہے یا نہیں۔''

''یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں؟ ویسے بھی میری اچھائیوں کے بارے میں جاننے کے لئے تو آپ کو کافی وقت درکار ہوگا، یوں روڈ پر کھڑے کھڑے تو ہرگز آپ میرے بارے میں کچھ نہیں جان سکتیں۔''

اس کے خوبصورت لبوں پر بڑی متاثر کن سی مسکراہٹ بکھری تھی۔

''مجھے آپ کے بارے میں جاننے کی، کوئی ضرورت بھی نہیں ہے، سمجھے آپ؟'' بے حد کٹ کر اس نے کہا تھا، اور پھر بنا اس کا کوئی جواب سنے، اریج کے آفس کے سامنے ہی اس شاندار سی عمارت کے طرف بڑھ گئی کہ جہاں شیزا اپنی کسی دوست کو انویٹیشن کارڈ دینے گئی تھی مگر ابھی وہ صرف چند قدم ہی اٹھا پائی تھی کہ شیزا سامنے سے آتے ہوئے دکھائی دی، مجبوراً تمکین کو وہیں رک جانا پڑا۔

''تم کہاں اٹک گئی تھیں؟ میں کتنی دیر تمہارا انتظار کرتی رہی۔'' وہ جونہی تمکین کے قریب پہنچی، خاصے کڑک انداز میں استفسار کیا، اور تمکین اس کے جواب میں ابھی کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ اریج دو ہی پھلانگوں میں ان کے قریب پہنچ گیا۔ پھر قدرے متبسم انداز میں بولا۔

''یہ میرے پاس رک گئی تھیں، بہت بے چین تھیں اپنی اسائنمنٹ کے بارے میں، پوچھ رہی تھیں کہ میں نے ان کی اسائنمنٹ تیار کر کے بھجوا دی یا نہیں؟ سو میں انہیں یقین دلانے لگا کہ میں نے اپنی ذمہ داری پر نہ صرف ان کی اسائنمنٹ تیار کر کے بھجوا دی بلکہ ان کے ایگزیم کے بارے

میں بھی ان کے بورڈ آفیسرز سے بھی بات چیت کر لی۔''

اپنی طرف سے بڑی سہولت کے ساتھ، بات بنا کر وہ خاصے تفصیلی انداز میں بولا۔ تو شیزا نے مڑ کر خاصی حیرانگی سے اسے دوبارہ اپنے سامنے دیکھا، پھر اس کی تفصیلی بات سننے کے بعد، دھیمے سے مسکرا کر مشکور انداز میں بولی۔

''تھینک یو سوچ ارتیج بھائی، آپ واقعی بہت اچھے ہیں اور دیکھئے پرسوں میری سالگرہ ہے، پلیز آپ ضرور آیئے گا۔ مجھے خوشی ہو گی۔''

دوسری ہی ملاقات میں وہ اس سے اتنی انسپائر ہو چکی تھی کہ جھٹ سے اپنی برتھ ڈے میں انوائیٹ کر لیا اور اس کے اس خلوص پر ارتیج مسکرائے بغیر نہ رہ سکا، تب ہی دل آویز لہجے میں بولا۔

''کیوں نہیں، آپ اتنے خلوص سے بلائیں اور ہم نہ آئیں یہ کیسے ہو سکتا ہے......؟''

''تھینک یو...... تھینک یو ویری مچ، میں آپ کا انتظار کروں گی۔''

وہ واقعی بہت ایکسائیٹڈ ہو رہی تھی۔ تمکین نے قدرے طنزیہ انداز میں شیزا کی طرف دیکھا پھر ناک چڑھا کر آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

مجھے خوف ہے کہ

نبھا کے کسی موڑ پر آ کر

وہ مجھ سے یہ نہ کہہ دے کہ

یہ وفا کا سلسلہ اب نہیں

میرے دل کو تیری طلب نہیں

شاعری کی کتاب ''محبتیں جب شمار کرنا'' اس کے سامنے کھلی پڑی تھی، اور وہ چپ چاپ سسکتے ہوئے، پچھلے کئی گھنٹوں سے مسلسل روئے جا رہی تھی۔

آج اسے ازمیر سے بات کیے پورے تین دن ہو گئے تھے، اور ان تین دنوں میں، ازمیر نے اسے منانا ایک طرف نگاہ بھر کر دیکھا بھی نہیں تھا اور ایسا اس کی لندن سے پاکستان کی واپسی پر، پہلی مرتبہ ہوا تھا۔ ورنہ وہ دونوں تو، ایک گھنٹے کے لئے بھی ایک دوسرے سے خفا نہیں ہوئے تھے۔

پھر نجانے ایسی کون سی بات ہو گئی تھی کہ وہ اس سے اتنا شدید ناراض ہو گیا تھا کہ اسے اس کے آنسوؤں کی بھی کوئی پروا نہیں رہی تھی۔

اس نے بہت کوشش کی کہ اپنے دل کو سمجھا سکے، مت اس سنگدل کے سامنے اپنی عزت نفس اور انا کا پرچم سرنگوں کرے، مگر وہ دل ہی کیا جو عقل کی بات مان جائے، اس کی تو بس ایک ہی رٹ رہتی ہے اور وہ ہوتی ہے اس کی اپنی خوشی...... خواہ اس کے لئے انا کی بلی چڑھے یا کانٹوں پر چلنا پڑے، یہ تو اپنی منوا کر ہی رہتا ہے۔ سو وہ بھی تھک ہار کر، اپنے دل کے ہاتھوں مجبور، اس روز دوپہر میں اس کی آفس واپسی پر، چائے بنا کر بہت

شکستہ قدموں سے، خود ہی اس کے کمرے میں چلی گئی۔

دل میں یہ احساس ہی درد کی ٹیسیں اٹھا رہا تھا کہ ازمیر کو اس کی کوئی پروا نہیں ہے، نہ اس کے پیار کی، اور نہ ہی اس کی ناراضگی کی اور بس یہی احساس تو تھا جو اسے خون کے آنسو رلا رہا تھا۔ پھر جس وقت وہ اس کے کمرے میں داخل ہوئی ازمیر بے خبر بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔

آستین ہاف فولڈ کیے ہوئے دونوں بازو اس نے آنکھوں پر رکھے ہوئے تھے، اور کمرے میں تاریکی کا راج تھا، وہ چائے ٹیبل پر رکھ کر، بیڈ پر ہی اس سے قدرے فاصلے پر اس کے پہلو میں بیٹھ گئی، تو ازمیر نے چونک کر بازو آنکھوں سے ہٹائے پھر نظر جو نہی اس کے کمہلائے ہوئے چہرے پر پڑی، وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''کیسے ہو ازمیر......؟'' بہت اپنائیت سے اس نے پوچھا تھا، جواب میں ازمیر نے اک سرسری سی نظر اس پر ڈال کر رخ پھیر لیا۔

''کیا بات ہے ازمیر، کیا ہوا ہے تمہیں؟ پلیز مجھے بتاؤ کسی نے تم سے کچھ کہا ہے کیا؟''

اس کی مسلسل خاموشی سے وہ خاصی زچ ہو گئی تھی۔ تب ہی قدرے بلند آواز میں چیخی تو ازمیر نے بہت سپاٹ انداز میں ہاتھ اٹھا کر اسے مزید کچھ بھی بولنے سے روک دیا۔ پھر خاصے سرد انداز میں بولا۔

''مجھے کسی نے کچھ کہا ہو، یا نہ کہا ہو تم سے مطلب؟''

''ازمیر......''

پھٹی پھٹی آنکھوں میں ڈھیروں حیرت در آئی تھی، وہ تو سمجھ رہی تھی کہ شاید تین دن سے، اس سے بات تک نہ کرنے کے دکھ میں ازمیر اپنی ساری خفگی اور غصہ بھول کر، اس سے ملنے کے لئے تڑپ رہا ہو گا۔ مگر یہاں تو الٹی ہی گنگا بہہ رہی تھی۔ وہ تو کوئی قصور نہ ہوتے ہوئے بھی، تین دن کی ناراضی کے باوجود، اس سے بات تک نہ کرنے کا روادار نظر آ رہا تھا۔ تب ہی وہ حیرت سے گنگ رہ گئی تھی۔

''پلیز اریشہ، تمہیں میری خوشی یا غم سے قطعی کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہئے تم جاؤ پلیز یہاں سے مجھے تمہاری ہمدردیوں کی قطعی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

بے حد روڈ انداز میں اس نے کہا تھا اور اریشہ عجیب پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔ تب دل کے اندر کہیں پل کے پل اشتعال کی اک لہر اٹھی اور وہ اس پر چلا اٹھی۔

''تم سے کس نے کہا کہ مجھے تم سے کوئی ہمدردی ہے، تم کوئی اپاہج ہو، لولے لنگڑے ہو یا نابینا ہو، جو میں تم سے ہمدردی کروں گی، پھر کیوں سوچا تم نے ایسا؟''

گھر والے ان دونوں کو خواہ کچھ بھی کہتے، اسے پروا نہیں ہوتی تھی، مگر اس وقت ازمیر کے الفاظ نے اسے حقیقی معنوں میں دکھی کر ڈالا تھا۔

''میں اس وقت بحث کے موڈ میں نہیں ہوں اریشہ، بہتر ہو گا تم مجھے تنہا چھوڑ دو۔''

اس پر اریشہ کے چلانے کا قطعی اثر نہیں ہوا تھا۔ تب ہی وہ قدرے چیخ کر بولا تو اریشہ بے بسی سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

''اوکے مت بات کرو مجھ سے، مگر پلیز یہ چائے تو پی لو، کیونکہ میں دیکھ رہی ہوں کہ اس وقت تمہیں، اس کی اشد ضرورت ہے۔''

گرم گرم چائے کا کپ، قریبی ٹیبل سے اٹھا کر اس نے ازمیر کی طرف بڑھاتے ہوئے صلح جو انداز میں کہا۔

''میں نے کہا ناں مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے''

نجانے کس احساس کے زیر اثر وہ قدرے اکتا کر بولا۔'' اور ہاتھ مار کر چائے کو پرے ہٹانا چاہا مگر افسوس کہ اس کوشش میں، ساری کی ساری گرم چائے، اریشہ کے کپڑوں پر گر گئی، اور مارے تکلیف کے اس کے منہ سے سسکاری نکل گئی۔

ہاتھوں اور پیروں پر شدید جلن کا احساس ہوا۔ تب ہی آنکھیں لبالب آنسوؤں سے بھر آئیں، اور اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے، قدرے شکوے بھرے انداز میں، ازمیر کی طرف دیکھا، جو بے دردی سے لب کاٹتے ہوئے خود سخت اذیت کے عالم میں لگ رہا تھا۔

اریشہ سے وہاں مزید کھڑے رہنا دشوار ہو گیا تو وہ روتے ہوئے اس کے کمرے سے باہر نکل آئی، جبکہ ازمیر غصے اور بے بسی کے عالم میں اپنا ہاتھ دیوار پر مار کر رہ گیا۔

یہ سچ تھا کہ اس نے کبھی بہت حسین خواب نہیں دیکھے تھے، کبھی کسی سے امیدیں بھی نہیں باندھ رکھی تھیں، ہمیشہ اپنے کام سے کام رکھا تھا، مگر یونیورسٹی پریڈ میں، نجانے کیسے، اسے بے اختیاری میں ہی شہرزین خان سے محبت ہو گئی۔

پتہ نہیں کیا خاص چیز تھی اس میں؟ اس کی دھیمی مترنم آواز، یا لہجے، گھٹاؤں جیسے ریشمی بال، یا پھر گلاب کی مانند کھلا، مسکراتا ہوا شگفتہ معصوم چہرہ جو کچھ بھی تھا۔ اسے بے سوچے سمجھے ہی وہ اچھی لگنے لگی تھی تب ہی وہ پہروں چپ چاپ دیوانوں کی مانند اسے دیکھتا رہتا، اس کی میٹھی باتیں اور مترنم قہقہے اپنی سماعتوں میں انڈیلتا رہتا۔

اور وقت کے ساتھ ساتھ، اس کی محبت کی دلدل میں دھنستا چلا گیا۔ اس وقت یہ سوچ قطعی اس کے ذہن میں نہیں تھی کہ وہ ایک عام سا نوجوان ہے، اور شہرزین خان حسن کا شہکار، اس وقت اگر کوئی چیز، اس کے ذہن میں ہلچل مچا رہی تھی، تو وہ پہلی پہلی محبت کا پاگل کر دینے والا خمار تھا کہ جس میں گم ہو کر اسے پوری کائنات خوبصورت لگ رہی تھی یہاں تک کہ خود اپنا وجود بھی۔

مگر جب شہرزین خان نے اپنے کڑوے الفاظ کی مدد سے اسے اس کی اوقات یاد دلائی تو اسے بخوبی احساس ہو گیا وہ کیا ہے؟ مزید یہ بھی کہ اسے کبھی بھی خوبصورت لڑکی سے پیار کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، اور یہ بات اچھی طرح اس کے ذہن میں بیٹھی ہوئی تھی، تب ہی تو پاکستان واپسی پر، اس نے اریشہ کے اچھے سلوک اور بے پناہ محبت جتانے کے باوجود، اسے محض اپنی اک اچھی دوست ہی سمجھا۔ اک ایسی راز دار قریبی دوست کہ جس سے وہ بلا جھجک اپنے دل کی ہر بات کر سکتا تھا، جس سے اپنا ہر غم، ہر خوشی وہ بڑے سکون کے ساتھ شیئر کر سکتا تھا۔

اور آج اسی عزیز دوست کے باعث، وہ مسلسل تین دنوں سے دن رات تڑپ رہا تھا۔ ماہم اور عدیلہ کے الفاظ اسے رہ رہ کر تڑپا رہے تھے۔ کتنی گہری چوٹ کھائی تھی اس نے، کیونکہ اپنے اور اریشہ کے درمیان شیئر ہونے والا یہ راز، جو اس نے کبھی تنہائی میں خود سے بھی شیئر نہیں کیا تھا، آج سب لوگوں کو پتہ چل چکا تھا اور سیدھی سی بات تھی کہ اس کا محرک اریشہ کی ذات ہی تھی ورنہ وہ خود تو، کسی کو یہ بات بتانے سے رہا۔

بہر حال جو کچھ بھی ہوا تھا، اریشہ کی وجہ سے خواہ اسے کتنی بھی تکلیف اٹھانی پڑی تھی، مگر یہ تو سچ تھا کہ وہ اسے بے حد عزیز تھی۔ اسی لئے اس کے ساتھ اپنائے گئے اپنے بی ہیویئر پر اسے شدید افسوس ہوا، نجانے کیا بات تھی کہ وہ کم از کم اس لڑکی کو، کوئی دکھ نہیں دینا چاہتا تھا۔ تب ہی اسے اریشہ پر چائے کے گر جانے نے، بے چین کر دیا اور وہ سخت اذیت کے عالم میں اپنے کمرے سے نکل کر اسے تلاش کرنے لگا جو نجانے کس کونے کھدرے میں جا چھپی تھی۔

تقریباً دس پندرہ منٹ اسی تلاش میں گزر گئے تب ہی وہ گھر کے لان کی طرف نکل آیا تو وہ سامنے ہی بیٹھی ہچکیوں کی زد میں آئی ہوئی نازک سی حساس لڑکی پر اس کی نظر جا پڑی، جو بے دردی سے آنسو بہاتے ہوئے خود ہی اپنے زخموں پر مرہم لگا رہی تھی۔

''اریشہ..... آئی ایم سوری..... میں تمہیں تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا، مگر میں بہت اپ سیٹ تھا، اسی لئے یہ سب کچھ ہو گیا جو کہ ہرگز نہیں ہونا چاہیے تھا، اس لئے پلیز مجھے معاف کر دو.....''

تھکے تھکے قدموں سے چلتا، وہ اس کے بالکل سامنے آ بیٹھا تھا، اور اب اکڑوں بیٹھے ندامتی انداز میں اپنی غلطی کی معذرت کر رہا تھا، اریشہ نے چپ چاپ ہتھیلی کی پشت سے اپنے آنسو صاف کیے پھر قدرے ناراضگی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی

''مجھے اپنے جسم کے جلنے کی کوئی تکلیف نہیں ہے ازمیر، بلکہ تمہارے اجنبی انداز نے رلایا ہے مجھے، تمہارے کڑوے الفاظ تکلف پہنچا رہے ہیں مجھے۔''

بھیگے ہوئے نم لہجے میں وہ بولی تو ازمیر نے بے حد ندامت محسوس کرتے ہوئے چپ چاپ سر جھکا لیا۔

''ازمیر، میں نے ہمیشہ خلوص دل سے تمہارا ساتھ دیا ہے۔ بنا کسی غرض، کسی ہمدردی کے، ہمیشہ تمہیں اک اچھا دوست مانا ہے، مگر تم نے میرے خلوص پر شک کر کے، سخت اذیت دی ہے مجھے، میں کبھی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ تم میرے ساتھ ایسا سلوک کر سکتے ہو۔'' بہت دل گرفتہ سا انداز تھا اس کا، ازمیر نے پل کے پل جھکا ہوا سر اوپر اٹھایا، اور قدرے معذرتی انداز میں اس کی بھیگی ہوئی پلکوں کو بغور دیکھتے ہوئے بولا۔

''سوری یار۔ کہہ رہا ہوں ناں کہ غلطی ہو گئی، آئندہ خیال رکھوں گا۔''

''او کے..... مگر خالی سوری سے کام نہیں چلے گا۔''

اس کے قدرے فریش لہجے پر وہ بھی ساری کلفت بھول کر بشاشت سے بولی تو ازمیر نے بھنوئیں اچکا کر، چونکنے والے انداز میں اسے دیکھا۔

''تو پھر..... پاؤں پڑ جاؤں کیا.....؟'' قدرے متبسم مگر شوخ انداز میں وہ گویا ہوا۔

''نہیں، بلکہ تم وعدے کے مطابق آج رات کا ڈنر شاندار سے ہوٹل میں کرواؤ گے مجھے، کہو، منظور ہے؟''

''جی منظور ہے۔'' اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے ازمیر نے مسکرا کر کہا تو اریشہ اس کے بال بکھیرتے ہوئے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

☆☆☆

موسم بے حد خوبصورت ہو رہا تھا جب وہ دونوں قریبی ریستوران میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے، خاموشی سے دوسرے فریق کی طرف سے گفتگو میں پہل کا انتظار کر رہے تھے۔ بالآخر اس گھمبیر خاموشی کو اریج نے ہی کافی کا آرڈر دیتے ہوئے توڑا، پھر کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا۔

''جی مس شاہ، سب سے پہلے تو یہ بتایئے کہ مسٹر رحمان کے ہاں جاب کرتے ہوئے آپ کو کتنا عرصہ ہو گیا، آئی مین بزنس لائن میں کتنا تجربہ ہے آپ کے پاس؟''

اسے وہ پرکشش سی لڑکی کافی اچھی لگی تھی۔ پھر اس کے فرسٹ فرینڈ مجتبیٰ نے بھی اس کی ایمانداری اور محنت کی گارنٹی دے دی تھی۔ مگر وہ اپنے طور پر تسلی کرنا چاہتا تھا، تب ہی یہ سوال اٹھایا، جواب میں انجشاء بس ایک لمحے کے لئے نظر اٹھا کر اسے دیکھ پائی' پھر دوبارہ نظریں جھکا کر، قدرے سلجھے ہوئے لہجے میں بولی۔

''میں پچھلے سات سال سے اس شہر میں ہوں' اور تقریباً سات سال ہی ہو گئے ہیں مجھے یہ جاب کرتے ہوئے۔''

''تو اس کا مطلب ہے کہ آپ مستقل اس شہر کی رہنے والی نہیں ہیں' ایم آئی رائٹ۔''

''جی آپ درست کہہ رہے ہیں، میں لاہور کے قریب ایک گوٹھ کی رہنے والی ہوں' میرے دادا جی اور بابا دونوں، اپنے علاقے کے معزز اور امیر ترین زمیندار رہ چکے ہیں۔ مگر اپنے بابا اور ممی کی ڈیتھ کے بعد، میں اپنے دادا کے ساتھ یہاں آ گئی جاب میری مجبوری نہیں ہے، مگر اس کے باوجود، میں نے اچھی جاب کے لئے پورے چھ ماہ دھکے کھائے ہیں، تب رحمان صاحب کے ہاں ملازمت ملی اور انہی کے توسط سے مجتبیٰ صاحب سے جان پہچان ہوئی اور اب رحمان صاحب کے توسط سے' آپ کے سامنے ہوں۔''

انجشاء نے اس کے سوال پر سوال کرنے سے قبل ہی تفصیل سے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا، تو اریج نے پرسوچ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے، پھر سے سوال اٹھا دیا۔

''بقول آپ کے جاب یا بزنس آپ کی مجبوری نہیں، مگر پھر بھی آپ، اس کے لئے کمربستہ ہیں، کیوں......؟ کیا آپ بتانا پسند فرمائیں گی......؟''

''نہیں...... کیونکہ یہ میرا پرسنل معاملہ ہے، بس آپ یہ سمجھ لیجئے کہ ایک طرح سے یہ فیلڈ اپنانا میرے لئے از حد ضروری ہے، مزید میں اس بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتی۔''

قطعی لہجے میں، اس کی بات ختم ہوتے ہی وہ بولی تھی۔ تب اریج نے بھی اسے مزید کریدنا مناسب نہیں سمجھا، اور چپ چاپ کافی کے بڑے بڑے گھونٹ بھرنے لگا۔

''ٹھیک ہے مس شاہ، آپ رحمان صاحب کو اپنا ریزائن پیش کر دیں۔ کیونکہ اگلے کچھ ہی روز میں ہم بزنس میں، پارٹنرز کی حیثیت سے تمام کاغذی کارروائی مکمل کر لیں گے۔ یہ نئی برانچ جو میں قائم کر رہا ہوں اس کی ترقی کا مکمل انحصار آپ کی قابلیت، ذہانت اور محنت و عمدہ کارکردگی پر

ہو گا۔ بزنس میں جتنا پیسہ چاہیے ہو گا وہ میں انویسٹ کروں گا مگر تمام امور کو۔ اہم میٹنگز کو ڈیل آپ کریں گی۔ کسے رکھنا ہے۔ کسے نکالنا ہے۔ سب آپ کی صوابدید پر ہو گا او کے۔''

کافی کا مگ خالی کر کے وہ حتمی انداز میں بولا، تو انجشاء نے مشکور نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے چپ چاپ اثبات میں سر ہلا دیا، پھر کچھ لمحوں کے توقف کے بعد بولی۔

''اگر آپ چاہیں تو اس ڈیلنگ میں، بزنس کی ترقی کے لئے، میں بھی اک خطیر رقم انویسٹ کر سکتی ہوں۔ کیونکہ روپے پیسے کی ہمارے ہاں کوئی کمی نہیں، ہاں مہربانی ہوگی جو آپ قدم قدم پر میری رہنمائی فرمائیں گے اور مجھے ہر موڑ پر بتائیں گے کہ میں نے کہاں غلطی کی، اور کہاں عقل سے کام لیا، کیونکہ میں آپ کی رہنمائی میں ایک کامیاب بزنس ویمن بننا چاہتی ہوں۔''

اب کے خاصی پراعتمادی تھی اس کے لہجے میں، اریج فقط ایک لمحے کے لئے چونکا تھا، پھر دوسرے ہی پل مسکرا کر بولا۔

''نو پرابلم، آپ انشاء اللہ اس فیلڈ میں، میرے ساتھ رہ کر بزنس امور کے بارے میں بہت کچھ سیکھیں گی ہاں جہاں تک پیسوں کی بات ہے تو اس کی فی الحال کوئی ضرورت نہیں، جب ضرورت ہوگی، تب دیکھا جائے گا، اس وقت تو میرے خیال سے ہمیں واپس جانا چاہیے، کیونکہ میں آل ریڈی، آپ کا بہت سا قیمتی وقت لے چکا ہوں۔'' بہت اپنائیت سے وہ کہہ رہا تھا۔ انجشاء نے مسرور انداز میں ذرا سا مسکراتے ہوئے اس کی روشن آنکھوں میں دیکھا، پھر نظریں جھکا کر اس کی تقلید میں اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کے ہمراہ بڑے تفاخر سے قدم سے قدم ملا کر ریستوران سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

''بلے نی بلے...... پنجابن دی ٹور تے دیکھو''

آج اس آفس میں اس کا آخری دن تھا، تب ہی وہ اپنا ریزائن دے کر اور عزیز کولیگز سے مل کر، خاصے افسردہ موڈ میں آہستہ آہستہ چلی آ رہی تھی جب ایک مرتبہ پھر عدنان رؤف اور اس کے گروپ سے ٹکراؤ ہو گیا۔

''بھئی آج تو بلبل بڑی اداس ہے کیا وجہ ہے یار۔''

پھر سے اس کے کسی دوست نے پھبتی کسی تھی جبکہ خود عدنان رؤف بڑی سنجیدہ نگاہوں سے، گاڑی سے ٹیک لگائے دونوں بازو سینے پر باندھے، بغور اسے دیکھ رہا تھا۔

''عدی یار پوچھو تو سہی، آخر مسئلہ کیا ہے بھابھی کے ساتھ۔''

اب کے دوسرا لڑکا پرجوش آواز میں چہکا تھا، جواب میں سب کے مشترکہ قہقہوں سے فضا میں عجیب سا، ارتعاش پیدا ہو گیا۔

''آپ بھابھی سمجھتے ہیں ناں مجھے تو پھر بھابیوں کو یوں سرِعام سڑکوں پر پکارا جاتا ہے؟''

آہستگی سے سنبھلے تلے قدم اٹھاتے ہوئے وہ عدنان رؤف کے گروپ کے عین سامنے جا کھڑی ہوئی اور ہاتھ میں پکڑی کتاب سینے سے

لگاتے ہوئے خاصے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی، تو بالکل بے ساختہ ہی عدنان رؤف جو دونوں ہاتھ سینے پر باندھے، چپ چاپ دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا، اپنے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی اس کے صبیح چہرے پر لکیر کھینچنے کے انداز میں پھیرتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

''بہت شوق ہے تمہیں ان کی بھابی بننے کا......؟''

''نہیں...... میں نے تو اس بارے میں ایک سیکنڈ کے لئے بھی نہیں سوچا، مگر وہ کیا ہے کہ آپ سبھی لوگ نجانے کتنی مشکل سے اپنا قیمتی ٹائم نکال کر، صرف میرے لئے یہاں آتے ہیں، تو مجھے اچھا نہیں لگتا کہ میں آپ لوگوں کا دل دکھاؤں یا آپ کی انسلٹ کروں۔''

بہت پُر سکون انداز تھا اس کا، جواب میں عدنان رؤف کے لبوں پر بڑی طنزیہ سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

''اچھا...... بہت خیال ہے تمہیں ہماری خوشی کا۔''

''نہیں آپ کی خوشی کا نہیں، آپ کے وقت کا خیال ہے مجھے۔''

اس نے فوراً تصحیح کرنا مناسب سمجھا اور اس کی تصحیح پر عدنان رؤف دل کھول کر ہنسا، اور اس کی تقلید میں اس کے تمام دوست بھی اپنا لازمی فرض سمجھتے ہوئے کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

''بہت دلچسپ لڑکی ہو، کیا...... نام کیا ہے تمہارا؟''

دائیں ہاتھ سے اپنے ریشمی بال سمیٹتے ہوئے وہ پھر سے گویا ہوا تھا۔ انجشاء نے بہت خاموشی سے چپ چاپ اسے دیکھا۔

''میرے دفتر والے دوست احباب مجھے مس شاہ کہتے ہیں۔ آپ چاہے جس نام سے یاد کریں۔''

''چاہے تو جان من بھی؟'' اس کا کوئی دوست ندیدے پن سے دانت نکالتے ہوئے چہکا تھا۔ جواب میں عدنان کو نجانے کیا ہوا تھا کہ اس نے ایک زبردست سا تھپڑ اس کے چہرے پر جڑ دیا، اور خاموشی سے وہاں سے چلا گیا۔

☆☆☆

خوبرو سے اریج احمر کی تیس سالہ زندگی میں تمکین رضا، وہ پہلی لڑکی تھی، جو اپنی تمام تر بدتمیزیوں اور گستاخیوں کے باوجود سیدھی اس کے دل میں اتر گئی تھی۔ عشق محبت...... یہ سب اسے فالتو وقت کی بیکار باتیں لگتی تھیں۔ مگر نجانے تمکین رضا نے ایسا کون سا منتر پڑھ کر پھونک ڈالا تھا اس پر، کہ وہ اپنے دل کو سمجھاتے سمجھاتے تھک گیا تھا۔

عورت کا پیار، محبت، توجہ وہ ان چیزوں سے کبھی آشنا نہیں رہا تھا، کیونکہ یہ چیزیں، قسمت نے کبھی اسے دان ہی نہیں کی تھیں، پھر کسی حد تک وہ عورت ذات سے متنفر بھی تھا، اور اس کا محرک خود اسے جنم دینے والی، اس کی ماں کا وجود تھا۔

وہ محض پانچ سال کا تھا، جب اس کے بے حد پیار کرنے والے پاپا کا ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا، تب اس کے معصوم سے ذہن نے اس بات کو بے حد سیریس لیا، وہ جو اپنی مما اور پاپا کے ساتھ اپنے محل جیسے گھر میں، اپنی مرضی کے ساتھ رہتا آیا تھا، اب ایک دم سے اپنے گھر میں، لوگوں کے جمع شدہ ہجوم نے اسے پریشان کر ڈالا تھا، اس نے کبھی اپنی مما کو روتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، مگر اس وقت وہ رو رہی تھیں تڑپ تڑپ کر بلک بلک کر رو رہی تھیں اور وہ بے حد حیرانی سے انہیں مچلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

آج صبح ہی اس کے پاپا نے اس سے پرامس کیا تھا کہ وہ آفس سے واپسی پر اسے گھمانے لے جائیں گے، اور نہ صرف اسے اس کی پسند کے کھلونے دلائیں گے، بلکہ خوب ساری آئس کریم اور چاکلیٹ بھی کھلائیں گے۔ اسی لئے وہ صبح سے ہی ان کی واپسی کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا تھا۔ اپنی مما سے ضد کر کے اس نے وقت سے پہلے ہی کپڑے بھی پہن لئے اور خوب اچھی طرح تیار ہو گیا۔ مگر جب شام ڈھلنے لگی تب اس کے پاپا گھر تو لوٹ آئے مگر ہمیشہ کی طرح خوشی سے بولتے اور چہکتے ہوئے نہیں بلکہ ماتھے پر سفید پٹیاں باندھے، آنکھیں بند کئے، ایک دم چپ چاپ، اور بے جان انداز میں، وہ حیرت سے گنگ انہیں دیکھتا ہی رہ گیا تھا جو آج پہلی مرتبہ اپنے پاؤں پر، چل کر گھر آنے کی بجائے شفیع انکل اور رفیع انکل کی بانہوں کا سہارا لے کر گھر میں داخل ہوئے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے، اس کا پورا گھر مختلف اجنبی اور واقف کار لوگوں کے ہجوم سے بھر گیا تھا اور یہ سلسلہ رات کو دیر تک جاری رہا، اسے چونکہ بہت نیند آ رہی تھی لہٰذا نجانے کب اس کی آنکھ لگ گئی اور اسے پتہ ہی نہ چلا کہ اس کے پاپا، اب اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر جا چکے ہیں۔

کتنے ہی دن تو وہ سہما سہما ہی رہا، کیونکہ اسے لوگوں سے گھلنے ملنے کی عادت نہیں تھی، اور اس کی مما، اب ہمہ وقت بری طرح روتے ہوئے مختلف لوگوں کے بیچ ہی گھری بیٹھی رہتیں۔

وہ روز ان سے اپنے پاپا کے بارے میں پوچھنا چاہتا، اور روز انہیں مختلف لوگوں کے بیچ گھرا دیکھ کر دور ہٹ جاتا، تب وہ اسے کھینچ کر سینے سے بھی لگاتیں، اور اسے ڈھیر سارا پیار بھی کرتیں تو وہ اپنے لب کھولنے کی جسارت نہ کر پاتا۔

کتنے بہت سے دن بیت گئے تھے، اس کا گھر رفتہ رفتہ لوگوں کے وجود سے خالی ہوتا گیا اب اس کے نانا جی، نانی، ماموں اور ممانیاں ان لوگوں کے ساتھ رہنے لگے تھے، مگر اس کے باوجود بھی وہ ایک دن اپنی مما سے پاپا کے بارے میں سوال کرنے کی ہمت کر ہی بیٹھا۔

''مما...... میرے پاپا کہاں ہیں؟''

بہت دنوں کے بعد اس نے یہ سوال کیا تھا ان سے، جواب میں وہ اسے بانہوں میں بھینچ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں تھیں اور اس دن کے بعد انہیں یوں بلک بلک روتے ہوئے دیکھ کر، وہ دوبارہ کبھی ان سے یہ سوال پوچھنے کی ہمت ہی نہ کر سکا، کیونکہ وہ اپنی ماں کو روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ حالات نے اسے خود ہی سمجھا دیا کہ اس کے پاپا کہاں چلے گئے ہیں؟ اور یہ بھی کہ وہ اب کبھی لوٹ کر ان کی زندگی میں نہیں آئیں گے، تب وہ اپنی ماں کی آغوش میں سر رکھ کر، خود بھی پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتا تھا۔

مگر پھر اپنی ماں کی تکلیف کی وجہ سے اپنی اس خواہش کو، دل میں ہی دبا لیا پتھر کر لیا اس نے اپنی آنکھوں میں آنسوؤں کو۔

اور تب ایک دن ہمیشہ کے لئے اس کی مما، اس کی انگلی تھام کر، اس محل سے شاندار گھر کو چھوڑ کر، اپنے میکے چلی آئیں کہ جس کی دیوار و در میں چپے چپے میں اس کے پاپا کی یادیں، ان کی خوشبو بسی تھی۔

نئے گھر میں، نئے لوگوں کے درمیان رہنے کا تجربہ بہت کٹھن تھا اس کے لئے پورے دن، وہ اپنی مما کے آنچل کو تھامے رکھتا کہ کہیں وہ بھی پاپا کی طرح اسے چھوڑ کر کہیں چلی نہ جائیں، تمام وقت وہ ان کی گود میں منہ چھپا کر لیٹا رہتا، اور خواب میں ہی سہی، اپنے پاپا کو دیکھنے کی حسرت کرتا رہتا۔

سب سے الگ تھلگ ہر وقت سہمے ہوئے، چپ چاپ رہنے کی وجہ سے، وہ یہاں کسی سے بھی گھل مل نہ سکا۔ اسے اس نئے گھر میں اپنے ننھیال والوں کے ساتھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ تو کبھی پاپا کی زندگی میں، ایک رات بھی یہاں نہیں سویا تھا کیونکہ اس کے پاپا، کبھی اسے خود سے الگ کرتے ہی نہیں تھے، اور اب ان کے بعد اسے مستقل یہیں رہنا پڑ رہا تھا تو وہ اُکتا سا گیا تھا۔ تب ہی اس نے اپنی مما سے اپنے گھر واپس چلنے کی ضد کرنا شروع کر دی، مگر اس کی مما ہر روز اسے بڑے پیار سے ٹال دیتیں، یا کسی اور چیز میں بہلا دیتیں۔

بہت سا وقت یونہی گزر گیا اب وہ اپنے کزنز کے ساتھ اسکول بھی جانے لگا تھا اور کسی حد تک پاپا کے بغیر رہنا قبول بھی کر لیا تھا کہ تقدیر نے ایک مرتبہ پھر اس کے معصوم سے دل پر ظلم کی بجلیاں گرا دیں اور پاپا کے ساتھ ساتھ، اسے مما کی محبتوں سے بھی ہمیشہ کے لئے محروم کر دیا۔

وہ تو مطمئن تھا کہ چلو پاپا نہ سہی۔ مگر مما تو اس کے پاس ہیں، مگر تقدیر نے ماں کے وجود کی چھاؤں بھی اس سے چھین لی۔

اس رات جب وہ معمول کی مانند اسے پریوں کی کہانی سناتے ہوئے اس کے بال سہلا رہی تھیں، تو نجانے کیوں بار بار ان کا لہجہ بھرا رہا تھا۔ آنکھیں نم ہو رہی تھیں، اور اس وقت اسے گمان تک بھی نہیں تھا کہ وہ اب یہ پیار یہ ممتا بھری نرم آغوش کبھی نہ پا سکے گا۔

دن کا سورج طلوع ہوا اس نے معمول کی مانند خوشی خوشی مما کے ہاتھوں سے ناشتہ کیا اور سکول چلا گیا لیکن جب وہ سکول سے واپس آیا تو اس کے نانا کے سدا سے پُرسکون گھر میں عجیب سی ہل چل کا احساس ہوا مختلف لوگ وہاں جمع ہو رہے تھے۔

کھانے پک رہے تھے رنگ برنگ کپڑے پریس کیئے جا رہے تھے اور اس کی مما...... وہ کہیں نظر نہ آ رہی تھیں۔ تب اس نے بڑی ممانی سے اپنی مما کے بارے میں پوچھا تو وہ اس کے گال کو چومتے ہوئے بولی۔

''آپ کی مما اپنے کمرے میں آرام کر رہی ہیں بیٹے'' ''آپ انہیں ڈسٹرب مت کرو اور جا کر حمزہ کے ساتھ باہر کھیلو'' اس وقت وہ سمجھا کہ شاید اس کی مما کا سر درد کر رہا ہوگا، آخر وہ روتی بھی تو بہت تھیں۔ تب ہی مطمئن ہو کر دیگر بچوں کے ساتھ باہر کھیلنے کے لئے چلا گیا۔ مگر ایک گھنٹے کے بعد ہی یہ عقدہ بھی اس پر کھل گیا کہ مما اندر اپنے کمرے میں کیا کر رہی تھیں؟

''اس کی پیاری مما، جو پاپا کی وفات کے بعد بالکل رف حلیے میں رہنے لگی تھیں، اب ایک مرتبہ پھر سے سجا سنوار دی گئی تھیں اور وہ ٹکر ٹکر انہیں یوں اتنا پیارا لگتے ہوئے دیکھتا رہا۔ تب تھوڑی ہی دیر میں، آف وائٹ تھری پیس سوٹ میں ملبوس، ایک سوبر سے شخص کے پہلو میں اس کی مما کو، کندھوں سے تھام کر لا بٹھایا گیا، اور وہ گم سم سا کھڑا دیکھتا رہا۔

جانے کون کون سی رسمیں ہوئیں؟ وہ تو بس چپ چاپ ایک کونے میں سہما ہوا کھڑا رہا، کسی کو اس کا خیال نہیں تھا، وہ اپنی مما کے پاس جانا چاہتا تھا مگر ان تک اس کی رسائی نہ ہو سکی تھی، کوئی عورت افراتفری میں، اپنے ہیل والے جوتے سمیت، اس کے ننھے پاؤں پر چڑھ گئی تھی اور وہ تکلیف کی شدت سے تڑپ اٹھا، رو رو کر مما کو پکارنا چاہا مگر کسی نے اس کی طرف توجہ کرنے کی زحمت گوارہ نہیں کی۔ وہ کتنی ہی دیر، وہیں لوگوں کے ہجوم سے کچھ فاصلے پر اپنے پاؤں کو پکڑے ہوئے روتا رہا، مگر کسی نے اسے چپ کروانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

تب تقریباً آدھ پون گھنٹے کے بعد، جب اس کی مما رخصت ہو کر اس اجنبی شخص کے ہمراہ جانے لگیں تو انہیں اچانک ہی اس ننھے سے وجود کا خیال آیا تھا کہ جس کے گالوں پر اس وقت نہ جانے کتنے ہی آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہے تھے۔

پل کے پل وہ اس کے قریب ٹھہری تھیں اور اس کے بہتے ہوئے آنسو اپنے ہاتھوں سے پونچھ کر اس کے گال پر ممتا سے بھرپور بوسہ دیا تھا، اس وقت اسے قطعی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ صرف اس کی مما، اسے چھوڑ کر، کہاں اور کیوں جا رہی ہیں؟ جب پاپا اس سے دور چلے گئے تھے تو مما اس کے پاس تھیں، تب ہی وہ پاپا کے دکھ کو بہادری سے سہہ گیا تھا، مگر اب جب کہ مما اسے چھوڑ کر جا رہی تھیں تو اس کے پاس کوئی نہیں تھا کوئی بھی ایسا اس کا اپنا، کہ جو اس کی ڈھارس بندھاتا اس کے آنسو پونچھ کر اسے اپنے سینے سے لگاتا، وہ اس وقت اپنی مما سے لپٹ کر رونا چاہتا تھا، انہیں بتانا چاہتا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک عورت اس کے ننھے سے پاؤں پر چڑھ کر اسے شدید تکلیف سے ہمکنار کر چکی ہے، مگر انہوں نے تو اسے کچھ بھی کہنے کا موقع نہیں دیا اور اس کے گال پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولیں۔

''اپنا خیال رکھنا اریج بیٹے...... اور کسی کو تنگ بھی مت کرنا...... او کے؟''

اس کا منا سا ہاتھ اپنے سرد ہاتھوں میں لے کر جو آخری الفاظ انہوں نے کہے تھے، وہ یہی تھے اور اریج...... اسے اپنے پاؤں کی تکلیف تو بھول ہی گئی تھی، اس وقت تو دل صرف مما سے جدا ہونے کا خیال کر کے ہی تڑپ رہا تھا۔ اس نے ہمیشہ اپنی مما کا کہا مانا تھا۔ ہمیشہ وہی کام کیا تھا جو مما نے کرنے کا حکم دیا، کبھی اپنے کسی عمل سے گھر کے کسی فرد کو تنگ نہیں کیا، چپ چاپ، سر جھکا کے ہمیشہ سب کے حکم کی تعمیل کرتا رہا۔

ہاں مگر...... زندگی کے ہر موڑ پر آنسو بہت بہائے، اپنے کمرے کی تنہائیوں میں بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رویا بہت، تاہم اگر مما، جاتے ہوئے اسے یہ بھی کہہ دیتیں کہ!

''اریج...... کبھی رونا بھی مت بیٹے۔'' تو شاید وہ ان کے حکم کی تعمیل میں، آنکھوں کو بھی پتھر کر لیتا مگر انہیں تو جو کہنا تھا وہ کہہ کر چلی گئی تھیں اور پیچھے وہ پانچ چھ سالہ، معصوم سا، احمر روتا، بلکتارہ گیا تھا۔ مگر مما نے پیچھے مڑ کر اسے نہیں دیکھا تھا۔

آج مما سے بچھڑ کر اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ اس نے کیا کھویا ہے؟ اس وقت اسے لگ رہا تھا کہ آج اس نے صرف ایک مما کو ہی نہیں کھویا، بلکہ حقیقی معنوں میں پاپا سے جدائی کا دکھ بھی، آج ہی بیدار ہوا تھا اس کے دل میں۔ اسے لگتا تھا کہ وہ اپنے مما، پاپا کے بغیر ایک پل نہیں جی سکتا مگر آج اسے ان دونوں سے بچھڑے پورے پچیس سال ہو گئے تھے، اور وہ زندہ تھا۔

ہاں یہ اور بات تھی کہ اس کے اندر، ایک بہت بڑا خلا رہ گیا تھا، جسے وقت کا مرہم بھی بھرنے میں ناکام رہا تھا، مگر وہ زندہ تھا، گو وقت کے ساتھ ساتھ اس کا معصوم سا بچپن اس کی ننھی منی شرارتیں چھوٹی چھوٹی معصوم سی خوشیاں، سب آنسوؤں میں بہہ گئی تھیں مگر وہ پھر بھی زندہ تھا۔

اسے وہ دن کبھی نہیں بھولتے تھے، جب وہ مما کے لئے بلکتے ہوئے حلق پھاڑ پھاڑ کر مما...... مما چلاتا تھا اور اس کی ممانی اسے کمرے میں بند کر کے باہر سے لاک لگا دیتی تھیں، تب ان دنوں اسے بند کمرے میں خود اپنے وجود سے بھی خوف آتا تھا اور وہ شدت دل سے رو رو کر خدا سے اپنی مما کی واپسی کی دعائیں مانگتا اور پھر خدا نے اس کی دعائیں قبول فرمالیں، اور اس کی مما پورے ڈیڑھ سال بعد، بالآخر لوٹ آئیں۔ مگر اس وقت بھی وہ اکیلی نہیں تھیں بلکہ پانچ چھ ماہ کا ایک گول مٹول پیارا سا بچہ ان کی گود میں تھا اور وہ اس کی بھوک کی فکر میں ہلکان ہو رہی تھیں۔

اریج ان سے لپٹ کر رونا چاہتا تھا، ان سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ اسے بھی اپنے ساتھ ہی لے جائیں۔ کتنی ڈھیر ساری باتیں تھیں جو وہ ان سے کرنا چاہتا تھا، مگر اب اس کی پیاری مما کے پاس اس کے لئے پہلی جیسی فرصت نہیں رہی تھی، ہاں وہ اسے پیار کرتی تھیں اس کے گال چومتے ہوئے اس کے لاڈ بھی اٹھاتی تھیں مگر صرف پل دو پل کے لئے بہت مرتبہ ایسا ہوتا کہ وہ مما کے ساتھ لپٹ کر، اپنے پچھلے دنوں کی باتیں کر رہا ہوتا اور مما کا نومولود بیٹا رو پڑتا، تب وہ اس کی بات مکمل سنے بغیر ہی، اس کے پاس سے اٹھ کر، اپنے دوسرے بیٹے کے پاس چلی جاتیں، کبھی وہ انہیں اپنے سکول کے بارے میں بتا رہا ہوتا، یا ان کے ساتھ کچھ کھیلنا چاہتا مگر وہ اس سے معذرت کر کے اپنے دوسرے بیٹے میں محو ہو جاتیں یا گھر والوں کے ساتھ باتیں کرنے لگتیں اور ان کا سلوک ننھے سے اریج احمر کے لئے بے حد تکلیف دہ تھا، تب ہی وہ ان سے روٹھ گیا تھا من کے کسی کونے میں یہ خوش گمانی تھی کہ شاید پہلے کی طرح مما اسے منائیں مگر اس کا یہ خواب، خواب ہی رہا اور مما اسے ایک مرتبہ پھر چھوڑ کر، شاید ہمیشہ کے لئے ہی اس کی زندگی سے چلی گئیں۔

اس کے نانا جی نے اسے پڑھایا لکھایا، مگر وہ زندگی کے ہر موڑ پر اپنی مما کو یاد کر کے روتا رہا، جب بھی اسے کوئی چوٹ لگتی، تیز بخار ہوتا، کوئی ڈش کھانے کا شدت سے من چاہ رہا ہوتا، یا وہ امتحان میں فرسٹ پوزیشن لے کر پاس ہوتا اور کوئی میڈل جیت کر لاتا، تب مما شدت سے اسے یاد آتیں اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑتا مگر وقت کے ساتھ ساتھ، آہستہ آہستہ اسے حالات سے سمجھوتہ کرنا پڑا، اور اس نے مما کو بھول کر اپنی تمام تر توجہ اپنی تعلیم پر مرکوز کر دی، اور انگلش لٹریچر میں اعلیٰ نمبروں سے ایم اے کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لئے باہر چلا گیا جہاں سے وہ پورے پانچ سال کے بعد وطن واپس لوٹا اور واپس آتے ہی برسوں سے بند اپنے پاپا کی فرم دوبارہ کھول لی۔ کچھ اس کا جنوں، کچھ اللہ پر بھروسہ، اور کچھ اس کی قابلیت اور اس

کا ٹینلنٹ، کہ بہت جلد اس کا شمار شہر کے امیر ترین بزنس مینوں میں ہونے لگا۔ آج اسے زندگی کی ہر آسائش میسر تھی، محل جیسا گھر، نوکر چاکر گاڑی سب کچھ پھر بھی اس کا دل خالی تھا، گزرے تیس سالوں میں وہ پھر دوبارہ کبھی اپنی مما سے نہیں ملا اور نہ ہی من میں ایسی کوئی خواہش پیدا ہوئی، ہاں اس کے دل میں کہیں نہ کہیں، اپنی مما کی رنجش ضرور رہ گئی تھی تب ہی وہ ان کے ذکر سے بھی چڑنے لگا تھا، بلکہ ایک ان کے ہی کیا، وہ تو ہر عورت کو ہی نفرت کی نگاہوں سے دیکھنے لگا تھا، مگر نجانے تمکین رضا کو دیکھ کر اسے یہ احساس کیوں ہوتا کہ جیسے وہ اس کی آنکھوں میں ٹھہر گئی ہے اور یہی وہ لڑکی ہے جسے اس کی تمام محرومیاں سمیٹ کر، اسے اپنی پُرخلوص محبت کا سہارا دینا ہے۔

☆☆☆

پورے ''شاہ ولاج'' میں رنگوں اور قہقہوں کا اک روشن جہان آباد تھا کیونکہ اس امیر گھرانے کے سب سے بڑے ہونہار سپوت، ارسلان احمد شاہ کی شادی کے دن رکھے جا چکے تھے اور گھر کے تمام افراد بری طرح اپنی اپنی تیاریوں میں الجھے بے حال ہو رہے تھے۔

اور ان میں سرفہرست لڑکیوں کی فوج تھی کہ جن کے مارکیٹ اور پارلر کے چکر ہی کسی طور سے کم نہیں ہو پا رہے تھے۔ ازمیر ان تمام جھمیلوں سے قطعی آزاد خود کو سارا دن آفس میں مصروف رکھتا، پھر وہاں سے اٹھنے کے بعد لانگ ڈرائیو پر نکل جاتا، ہر روز نت نئے علاقوں کی سیر، اور مختلف لوگوں سے ملاپ، اسے دلی سکون بخشتے تھے، تب ہی یہ اس کا روز کا معمول بن گیا تھا۔

اس روز بھی وہ تھک کر ابھی اپنے کمرے میں آ کر بیڈ پر لیٹا ہی تھا کہ اریشہ دھڑ سے دروازہ کھول کر کمرے کے اندر چلی آئی۔ پھر نہایت عجلت بھرے انداز میں بولی۔

''میر مجھے کچھ شاپنگ کرنی ہے، پلیز تم میرے ساتھ چلو۔''

اس کے فل اسپیڈ انداز پر، ازمیر نے پل کے پل آنکھیں کھول کر، سستی سے اسے دیکھا پھر دوبارہ پلکیں موند کر دھیمے لہجے میں بولا۔

''سوری یار، میں آل ریڈی بہت تھک چکا ہوا ہوں، تم کسی اور کے ساتھ چلی جاؤ۔''

''مگر اس وقت کوئی بھی فری نہیں ہے میر، پلیز تم میرے ساتھ چلو آئی پرامس میں زیادہ دیر نہیں گھماؤں گی۔'' اس کا بازو تھام کر وہ اسے زبردستی اٹھاتے ہوئے بولی تو ازمیر کو مجبوراً اس کے ساتھ چلنا ہی پڑا۔ پھر جونہی اس نے اک بڑے سے شاپنگ ہال کے سامنے گاڑی روکی، اریشہ مشکور نگاہوں سے اس کی سمت تکتے ہوئے خوشی سے مسکرا دی۔

''تھینک یو ازمیر'' تم نے تھکن کے باوجود، میری ہیلپ کی، مجھے بے انتہا خوشی ہوئی۔'' اس کا بازو تھام کر وہ بہت سرشاری سے بولی تھی، جواب میں ازمیر بھی دھیمے سے مسکرا دیا۔

''چلو تمہیں خوشی ہوئی تو سمجھو میں بھی خوش ہو گیا۔ اب جلدی سے بولو، کیا خریدنا ہے تمہیں؟'' اریشہ کو خوش دیکھ کر اسے بھی حقیقت میں خوشی ہوئی تھی، تب ہی وہ خوش دلی سے بولا تھا۔ نتیجتاً اریشہ دل سے مسکراتے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

پھر جب ازمیر گاڑی کو لاک کر کے، اس کے برابر آیا تو ایک لمحے کے لئے اس کے ہمراہ چلتے ہوئے، اریشہ کا سر قدرے تفاخر سے بلند ہو

گیا اور اس نے دل سے دعا کی کہ کاش ان کا یہ ساتھ دائمی ہو جائے اور دعا کی اسی سرشاری میں، شاپنگ مال کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اچانک اس کا پاؤں لڑکھڑا گیا اور اس نے سہارے کے لئے لپک کر ازمیر کا بازو تھام لیا۔

''سنبھل کر ڈیئر گھر سے زبردستی مارکیٹ تک تو لے آئی ہو، اب ہاسپٹل نہ لے جانا۔'' اسے سہارا دیتے ہوئے وہ قدرے تیز لہجے میں بولا تو اریشہ نے منہ پھلا کر قدرے خفگی سے اسے دیکھا پھر اس کا بازو چھوڑ کر، اپنے ہی سہارے پر چلتی، اس سے آگے نکل گئی تو ازمیر دھیمے سے مسکرا کر رہ گیا۔

''ازمیر دیکھو یہ سوٹ مجھ کو کیسا لگے گا؟'' پرپل کلر کا اک نفیس سا سوٹ اٹھا کر، خود سے لگاتے ہوئے اس نے ازمیر سے مشورہ طلب کیا تو وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔

''بھئی سوٹ تو واقعی بہت خوبصورت ہے مگر افسوس کہ تم اسے پہنو گی تو ساری خوبصورتی ماند پڑ جائے گی۔''

''کیا.....تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ میں خوبصورت نہیں ہوں؟''

وہ موقع محل کا لحاظ کئے بغیر خفگی سے چلائی تھی، جواب میں ازمیر نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا۔ پھر مزید ستاتے ہوئے بولا

''میں نے ایسا کب کہا، تم نے مجھ سے میری رائے پوچھی، سو میں نے حقیقت بتا دی، اب آگے جیسے تمہاری مرضی۔'' کندھے اچکا کر بڑے مزے سے وہ بولا تھا، اریشہ نے قدرے مایوسی سے وہ سوٹ پرے ہٹا دیا، جو اسے دل سے بے حد پسند آیا تھا، تب ازمیر بے ساختہ ہی ہنس پڑا، پھر اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے بولا۔

''پاگل لڑکی مذاق کر رہا تھا میں اتنی سی بات نہیں سمجھتیں تم؟ تم پر تو ہر رنگ ہر سوٹ جچتا ہے۔'' اس کی خوبصورت غلافی آنکھوں میں ستائش ہی ستائش تھی، اریشہ تو گویا نہال ہی ہو گئی۔

کپڑوں کے بعد جیولری کا مرحلہ آیا اور یہاں ازمیر نے اپنی پسند سے اسے ایک نیکلس سیٹ خرید کر دیا اسی طرح اس کے ہر سوٹ کے ساتھ میچنگ چوڑیاں بھی اس نے اپنی پسند کی ہی خریدیں اور اریشہ نے اس پر بے پناہ خوشی کا اظہار کیا۔

''چلو اب جلدی سے پے منٹ کرو۔ میری شاپنگ مکمل ہو گئی ہے۔''

ضرورت کی تمام چیزیں خرید کر وہ بڑے استحقاق بھرے انداز میں ازمیر کو مخاطب کرتے ہوئے بولی تو وہ چونکنے کی بے مثال اداکاری کرتے ہوئے بڑے بھول پن سے بولا۔

''مگر شاپنگ تو تم نے کی ہے پھر میں پے منٹ کس خوشی میں کروں۔''

''ارے واہ، تو گھر سے شاپنگ کے لئے مجھے لے کر کون آیا ہے؟ تم ناں، تو اب پے منٹ بھی تم ہی کرو گے۔ کیا سمجھے۔''

نہایت فری انداز تھا اس کا، ازمیر نے بمشکل اپنی مسکراہٹ کو ضبط کیا۔

''کمال ہے اچھی زبردستی ہے۔ ایک تو میں تھکن کے باوجود تمہیں یہاں تک لے کر آیا اوپر سے اب جرمانہ بھی میں ہی ادا کروں؟'' وہ

کہاں ہار ماننے والا تھا، اریشہ اپنی جگہ سٹ پٹا کر رہ گئی۔

''کیا......تم نے میری شاپنگ کو جرمانہ کہا تمہاری یہ مجال۔''

خطرناک تیور کے ساتھ، خاصے ناراض لہجے میں کہتے ہوئے وہ اس کی طرف بڑھی تو ازمیر بے ساختہ ہی کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

''توبہ......توبہ......نجانے لڑکی ہے کہ پٹاخہ، ہر وقت لڑنے پر تیار رہتی ہے۔ جس کے گھر جائے گی وہ تو بیچارہ ساری عمر سر پکڑ کر روئے گا اپنا۔''

بے منت کرنے کے بعد وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے شاپنگ مال سے باہر آیا تو قدرے چڑانے والے انداز میں اسے ستاتے ہوئے بولا، مگر وہ جواب میں خوش دلی سے مسکرا دی اور قدرے شگفتہ انداز میں بولی۔

''چچ......چچ مجھے تم سے پوری ہمدردی ہے کیونکہ ہوسکتا ہے گھر والے تمہارے ہی پلے باندھ دیں۔''

''نہیں بھئی مجھے تو معاف ہی رکھو تم، میں ابھی اتنا بھی عقل سے پیدل نہیں ہوا کہ جانتے بوجھتے تم جیسی مصیبت کو اپنے گلے میں ڈال لوں۔''

گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے وہ قطعی جولی موڈ کے ساتھ بولا، تو اریشہ بلا سبب ہی ایک مرتبہ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ وہ لوگ گھر پہنچے تو ماہم انہیں ساتھ ساتھ آتے دیکھ کر ہی لپک کر ان کی طرف بڑھی وہ خاصے ڈپٹنے والے انداز میں اریشہ سے مخاطب ہو کر بولی۔

''تم کہاں چلی گئی تھیں میں کب سے ڈھونڈتی پھر رہی ہوں تمہیں۔''

''کیوں خیریت......؟ کوئی کام تھا مجھ سے؟''

پل کے پل رک کر وہ خاصے خشک انداز میں بولی تو ماہم سر جھٹک کر قدرے چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔

''لو مجھے کیا کام ہونا تھا تم سے، وہ تو اذہان بھائی کب سے یاد کر رہے ہیں تمہیں آتے ہی انہوں نے سب سے پہلے تمہارا ہی پوچھا تھا، اور ایک تم ہو کہ تمہیں سیر سپاٹوں سے ہی فرصت نہیں۔'' طنزیہ نگاہیں ازمیر پر جماتے ہوئے اس نے بہت کٹیلے انداز میں کہا تھا جواب میں اریشہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ پھر وہاں ازمیر کی موجودگی کا لحاظ کر کے قدرے تحمل سے بولی۔

''اوکے......تم چلو میں آتی ہوں ابھی۔''

خشمگیں نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے وہ خاصے خشک لہجے میں کہتی ہوئی ازمیر کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھ گئی اور ماہم سخت غصے کے عالم میں سلگتی ہوئی نگاہوں سے انہیں ایک ساتھ دیکھ کر، پاؤں پٹختی ہوئی اپنی مما فرزانہ بیگم کے پاس چلی آئی۔

''مما! آپ دادا جی، سے اذہان بھیا اور اریشہ کی شادی کی بات کب کر رہی ہیں؟'' ان کے قریب آتے ہی وہ قدرے روٹھے لہجے میں بولی، تو فرزانہ بیگم بیٹی کا انداز دیکھ کر دھیمے سے مسکرا دیں، پھر پیار سے اس کا گال چھوتے ہوئے نرم لہجے میں بولیں۔

''بہت جلد میری جان، بہت جلد، بس ایک بار یہ ارسلان کی ذمہ داری سے فارغ ہو جاؤں پھر فوراً ہی اذہان کے پاؤں میں بھی اریشہ کے

ساتھ کی بیڑیاں ڈال دوں گی۔"

"اور اگر اس سے قبل ہی اسے کسی اور نے مانگ لیا تو......"

دل کا خدشہ وہ زبان پر لے ہی آئی، فرزانہ بیگم نے بہت مشکوک انداز میں اس کے سوال کی اصل وجہ اس کے چہرے پر تلاشنا چاہی تھی، پھر دھیمے سے بے فکرے انداز میں بولیں۔

"ڈونٹ وری مائی چائلڈ......ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، اریشہ صرف اور صرف میرے اذہان کی دلہن ہی بنے گی، اور کسی کی نہیں، تم اپنی مما پر بھروسہ رکھو، یقیناً وہی ہوگا جو ہم چاہتے ہیں۔ او کے۔"

عجیب شاطرانہ انداز تھا ان کا، ماہم نے مطمئن ہو کر، چپ چاپ اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

میں اس کا نام لیتا ہوں

تو ہونٹوں پر تبسم کی

دھنک لہرانے لگتی ہے

میں اس کو یاد کرتا ہوں

تو اک مانوس سی خوشبو

مجھے مہکانے لگتی ہے

وہ میرے دل میں رہتا ہے

گل امید کی صورت

زمانے کی شب تاریک میں

خورشید کی صورت

"واہ نظم تو بہت خوبصورت ہے، مگر کس کے لئے گنگنا رہے ہیں آپ؟" فائقہ اور حمنیٰ ڈانس کر رہی تھیں، جبکہ وہ تالیاں پیٹتے ہوئے اذہان احمد شاہ کے پہلو میں آ کھڑی ہوئی۔ جو نہایت انہماک سے پلکیں موندے امجد اسلام امجد کی یہ خوبصورت نظم بہت سرگوشیانہ انداز میں گنگنا رہا تھا پھر جب اس کا کھنکتا لہجہ، سماعتوں کی زینت بنا، اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں اور اس کی طرف سے مسکرا کے دیکھتے ہوئے گھمبیر لہجے میں بولا۔

"یہ نظم نہیں حمد ہے مائی ڈیئر، ویسے میں ایسی نظمیں صرف تمہارے لئے ہی گنگنا سکتا ہوں، خدا کے بعد وہ کیا شعر ہے کہ

عمر سجدہ کروں میں تجھ کو اگر کفر یہ نہ ہو

کوئی نہیں عزیز تیرے سوا، خدا کے بعد

''شٹ اپ منہ دھو رکھو۔''

بہت مچل کر اذہان نے شعر پڑھا تھا مگر اریشہ نے فوراً سے ڈپٹ دیا تو وہ مزید شوخ ہوا۔

''منہ دھو ہی تو رکھا ہے، تم پر...... اب تو صرف دادا جی سے بات کرنے کی دیر ہے بس۔'' کندھا اس کے کندھے سے لگائے، وہ نچلا ہونٹ موتیوں سے سفید دانتوں میں دبا کر قدرے شریر انداز میں بولا تو اریشہ اسے محض جوک سمجھ کر اس کی طرف خفگی سے گھور کر رہ گئی، تب ہی اس کی نظر، اپنے سے کچھ ہی فاصلے پر بیٹھے، الگ تھلگ سے ازمیر کے اداس چہرے پر جا پڑی، تو وہ اذہان سے ایکسکیوز کر کے ازمیرے کے پاس چلی آئی، پھر اس کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے بہت اپنائیت سے بولی۔

''کیا بات ہے ازمیر، بہت اداس لگ رہے ہو۔''

اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھتے ہوئے وہ بہت دوستانہ انداز میں گویا ہوئی تھی، جبکہ ازمیر جو اپنے ہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا، ایک دم سے چونک کر، اپنی پلکوں پر لرزتے ہوئے آنسو پونچھ کر رخ موڑ کر اسے دیکھتے ہوئے دھیمے سے مسکرا کر بولا۔

''کچھ نہیں، بس ایسے ہی۔''

''ایسے ہی نہیں...... کوئی بات ہے تو ضرور، جو تم مجھے بتانا نہیں چاہ رہے۔''

وہ بھلا کہاں یونہی پیچھا چھوڑنے والی تھی اس کا، تب ہی پھرتی سے بولی تو ازمیر کے لئے اپنے آنسوؤں کا بھرم رکھنا دشوار ہو گیا، تب ہی وہ سرد آہ بھرتے ہوئے قدرے اداس لہجے میں بولا۔

''ایسی بات نہیں ہے اریشہ، میں چاہوں بھی تو تم سے اپنے دل کی بات چھپا نہیں سکتا مگر اس وقت میرا دل بہت بے چین ہے، پتہ نہیں کیوں، اتنے دنوں کے بعد شہزین بہت یاد آ رہی ہے مجھے، میرا دل چاہتا ہے، کہ کوئی معجزہ ہو اور وہ جادو کا روپ بھر کر میری نظروں کے سامنے آ جائے تاکہ میں اسے دل بھر کر دیکھ سکوں، اسے اپنی آنکھوں کے راستے، اپنے دل میں اتار سکوں، اس کے لمس کو محسوس کر سکوں۔''

قدرے پیار سے لہجے میں کہتے ہوئے وہ واقعی بہت بے تاب لگ رہا تھا، جبکہ اریشہ کے دل میں درد کی اک زبردست ٹیس اٹھی، جسے اس نے بمشکل ضبط کرتے ہوئے ازمیر کا حوصلہ بندھایا تھا۔

''کیا شہزین واقعی بہت خوبصورت تھی ازمیر؟''

اسے تسلی دے کر، بہت بکھرے ہوئے لہجے میں اس نے سوال کیا تھا۔ جس کے جواب میں ازمیر جیسے کھو سا گیا۔

''ہاں...... ہاں اریشہ، بہت خوبصورت تھی، وہ ساری دنیا میں سب سے حسین، سب سے پیاری، مگر...... میں نے کبھی اس سے صرف اس لئے پیار نہیں کیا کہ وہ بے تحاشہ خوبصورت تھی، بلکہ مجھے تو اس کا اندر، اس کا دل، اس کی باتیں، اس کی ہنسی، اس کی اچھی عادتیں ہمیشہ اچھی لگی تھیں تم یہ دیکھو اریشہ کہ مجھے اس کے مسترد کرنے کے باوجود بھی اس سے نفرت نہیں ہو سکی۔ میں خود کو اب بھی اس کے بارے میں سوچنے سے باز نہیں رکھ پا رہا، من چاہتا ہے ابھی اڑ کر لندن میں چلا جاؤں اور پھر کبھی وہاں سے لوٹ کر نہ آؤں کیونکہ شہزین سے میری بے پناہ محبت میں، اسے حاصل کر لینے کی

شرط، کہیں بھی نہیں ہے۔''

''ایکسکیوز می، میں ابھی آئی.....'' وہ اپنے ہی آپ میں گم بولے جا رہا تھا اور اریشہ ضبط کی انتہا پر کھڑی یہ درد برداشت کرنے کی کوشش کرتی رہی، پھر جب وہ اپنی اس کوشش میں ناکام ہوگئی تو چپ چاپ اس کے پاس سے اٹھ آئی اور اپنے کمرے میں آ کر بلک بلک کر رو پڑی۔

☆☆☆

''ساون آئے ساون جائے تجھ کو پکاریں گیت ہمارے۔''

عدنان رؤف کا سب سے قریبی دوست شاہد، لہک لہک کر یہ گیت گنگنا رہا تھا جبکہ وہ خاموشی سے دونوں بازو سینے پر لپیٹے، بس چپ چاپ اس راستے کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں سے وہ ہمیشہ مورنی کی چال چلتے ہوئے آئی تھی۔ آج پورے تین دن ہو گئے تھے اسے دیکھے ہوئے اور ان تین دنوں میں اس کی حالت بہت عجیب ہوگئی تھی۔ نہ وہ پہلے کی طرح ہنس بول رہا تھا، نہ کپڑوں کی طرح لڑکیاں بدلتے ہوئے، ان کے ساتھ موج مستی کر رہا تھا، کسی بات میں دل نہیں لگ رہا تھا اس کا، بس من کو ضد سی ہوگئی تھی کہ وہ کسی طرح معمول کی مانند اسے دکھائی دے جائے اور وہ اسے تنگ کرتے ہوئے لطف سمیٹ سکے مگر وہ دکھائی ہی تو نہیں دے رہی تھی اور یہ بات اسے مسلسل ڈسٹرب کر رہی تھی کہ وہ کیوں تین دن سے دفتر نہیں آ رہی؟

اس جیسی مڈل کلاس گھرانے کی لڑکی کے لئے تو ایک دن کی چھٹی کے پیسے بھی کٹتے تو بہت نقصان کی بات تھی، کجا کہ تین دن......؟ پھر من میں کہیں خیال آتا کہ شاید وہ بیمار ہو، یا شاید وہ کسی کی شادی میں شرکت کے لئے چلی گئی ہو، مگر یہ شاید کی گردان بھی اسے مطمئن نہیں کر پا رہی تھی۔ تب ہی وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر، چوتھے دن اس کے دفتر میں چلا آیا، آفس کے مالک مسٹر رحمان صاحب سے چونکہ اس کی گہری آشنائی تھی، لہٰذا وہ بلا جھجک پہلے کی مانند ان کے روم میں داخل ہوگیا، مسٹر رحمان صاحب نے اتنے دنوں کے بعد اسے اپنے آفس میں دیکھا تو ایک دم سے کھل اٹھے، اپنی سیٹ سے اٹھ کر بڑے پرتپاک انداز میں اسے ملے، پھر مسکراتے ہوئے اسے بیٹھنے کی آفر کر کے، محبت بھرے انداز میں بولے۔

''تمہیں آج ہماری خبر گیری کے لئے کیسے فرصت مل گئی نواب صاحب..... بڑے دنوں کے بعد ادھر کی راہ بھولے تم۔'' وہ جب بھی اس سے ملتے تھے اسی طرح خلوص سے پیش آتے کہ وہ شرمندہ سا ہو جاتا۔

اس وقت بھی سرد آہ بھرتے ہوئے سر کرسی کی پشت سے ٹکا کر، قدرے معذرتی انداز میں بولا۔

''بس یار ٹائم ہی نہیں ملتا، تم تو جانتے ہی ہو پاپا نے تمام ذمہ داری میرے کندھوں پر ڈال دی ہے۔ پھر ایسے میں یار دوستوں کے لئے وقت نکالنا، تم سمجھ سکتے ہو کہ کتنا مشکل ہوتا ہے۔''

''ہاں ہاں بھئی، تمہاری مصروفیات کا خوب اندازہ ہے مجھے، بہر حال آج یہاں کیسے آنا ہوا جناب کا؟'' اس کے لئے کافی کا آرڈر دیتے ہوئے قدرے فرینک انداز میں بولے تو عدنان دھیمے سے مسکرا کر رہ گیا پھر دونوں کہنیاں ٹیبل پر ٹکاتے ہوئے قدرے سنجیدگی سے بولا۔

''بات کچھ یوں ہے یار، کہ میں بہت جلد اک نئے پروجیکٹ پر کام کر رہا ہوں، جس کے لئے مجھے ایک ٹیلنٹڈ ورکر کی ضرورت ہے۔ ابھی

کچھ دنوں پہلے میں تمہارے دفتر، اک محنتی مگر سادہ سی لڑکی کے کام سے بہت انسپائر ہوا تھا، وہ کیا نام تھا اس لڑکی کا، جو اس روز یہاں میری موجودگی میں تمہیں کچھ فائلز دینے کے لئے آئی تھی۔"

ناک کھجاتے ہوئے اس نے انجان بننے کی بھرپور کوشش کی اور سو فیصد کامیاب بھی رہا، کیونکہ رحمان صاحب اس کے سوال پر سوچتے ہوئے چونک کر بولے تھے۔

"وہ......مس شاہ......ان کے بارے میں پوچھ رہے ہو تم۔"

"ہاں ہاں وہی، میں انہیں ہی اپنی فرم میں بہتر پوسٹ پر جاب کی آفر کرنے آیا تھا۔" رحمان صاحب کی نشاندہی کرتے ہی، وہ زور زور سے سر ہلا کر بے قرار لہجے میں بولا تو وہ مسکرا کر رہ گئے۔

"بھئی حیران ہوں میں اس لڑکی کے نصیب پر......؟" اس کی توقع کے قطعی خلاف وہ بولے تھے۔

"کیوں......کیا ہوا؟" رحمان صاحب کی بات پوری ہونے کا انتظار کئے بغیر وہ ان کی بات کاٹتے ہوئے بے چینی سے بولا۔

"بھئی دیکھو نا جب تک وہ یہاں میرے آفس میں کام کرتی رہیں، پورا آفس ان کا گرویدہ رہا، خود میں نے ان کی قابلیت ذہانت کی وجہ سے بزنس میں خاصی ترقی کی، اور اب جبکہ میں انہیں یہاں کا انچارج بنانے کا سوچ رہا تھا تو مسٹر ایچ احمر صاحب نے اپنی نیو فرم کے لئے انہیں بزنس پارٹنر کی آفر پیش کر دی، آپ تو مسٹر ایچ احمر کو جانتے ہی ہیں، اس شہر میں سب سے بڑے بزنس مین ہیں وہ اور بزنس میں ان کی پارٹنر بننا ذرا سوچو، مس شاہ کے لئے کتنا فائدے مند ہوگا؟ اور اب جبکہ وہ یہ ملازمت چھوڑ کر اپنا بزنس اسٹارٹ کر چکی ہیں تو تم ان کے لئے شاندار آفر لے کر آئے، اب تم ہی بتاؤ میں ان کے نصیب پر رشک نہ کروں تو کیا کروں؟"

رحمان صاحب سادہ لہجے میں، بہت تفصیل سے بولے تھے جبکہ وہ اپنی سیٹ پر ایک دم سے گم صم سا ہو گیا۔ اس کے تین دن سے نہ آنے کی وجہ یہ ہوگی، اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

تب ہی خالی خالی ذہن کے ساتھ، اس نے رحمان صاحب سے بمشکل اجازت چاہی اور قدم دہلیز کی طرف بڑھا دیئے۔ پھر جاتے جاتے من میں نجانے کیا خیال آیا کہ رک کر، پلٹتے ہوئے رحمان صاحب کو دیکھا اور بہت دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"رحمان......تم نے اسے کبھی میرے بیک گراؤنڈ کے بارے میں تو نہیں بتایا ناں؟"

"ہاں، اس بارے میں میری ایک مرتبہ اس سے بات تو ہوئی تھی، مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو......؟"

اس کے غیر متوقع سوال پر وہ قدرے الجھتے ہوئے اس کی سمت دیکھ کر سادگی سے بولے تھے، جبکہ عدنان کرسی کی پشت پر ہاتھ جماتے ہوئے قدرے بے چین سے انداز میں بولا۔

"کیا......کیا بات ہوئی تھی، پلیز مجھے بتاؤ۔"

ان کے سوال کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے وہ تیزی سے بولا تو رحمان صاحب کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے

بولے۔

''جس دن تم یہاں آفس میں میرے پاس آئے تھے، اس کے دوسرے یا شاید تیسرے دن ہی، مس شاہ نے مجھ سے تمہارے بارے میں پوچھا تھا۔''

''کیا، کیا پوچھا تھا؟'' وہ پھر سے بے صبری سے گویا ہوا۔

''کچھ نہیں، بس یہی کہ سر کل جو صاحب آپ کے روم میں بیٹھے تھے وہ کون تھے؟ تب میں نے انہیں تفصیل سے تمہارے اور تمہاری فیملی کے بارے میں بتا دیا اور معذرت کہ میں نے اس کی پاکیزگی کے پیش نظر انہیں یہ ایڈوائز بھی کر دی کہ آئندہ تمہاری موجودگی میں، میرے روم میں نہ آئیں، کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ تمہاری نظر اس مقدس لڑکی پر پڑے اور تم اسے پریشان کرو۔''

وہ اس کے کرتوتوں سے خوب اچھی طرح واقف تھے اور یہ بات خود عدنان بھی جانتا تھا۔ تب ہی تفصیل سے ان کی بات سننے کے بعد، وہ سر جھکا کر چپ چاپ ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے، ان کے آفس سے باہر نکل آیا۔

''ہاں تو مس شاہ صاحبہ..... تم یونہی مجھے نہیں کہہ رہی تھیں کہ میں آپ کے بارے میں سب کچھ جانتی ہوں'' اوپر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے سرد آہ بھرتے ہوئے سوچا اور دھیرے دھیرے چلتے ہوئے اپنی گاڑی میں آ بیٹھا۔

''تم خود کو پاکیزہ اور دوسری تمام لڑکیوں سے منفرد سمجھتی ہو ناں مس شاہ صاحبہ، بہت غرور ہے ناں تمہیں اپنی ذہانت اور قابلیت پر، بہت اعلیٰ و ارفع سمجھتی ہو ناں تم خود کو، اب میں تمہیں بتاؤں گا کہ تمہارا اصل مقام کیا ہے؟''

گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس نے بہت دل جلے انداز میں سوچا اور اپنے آفس کی طرف روانہ ہو گیا۔

تم مجھ سے چھوٹ کر، رہے سب کی نگاہوں میں
میں تم سے چھوٹ کر کسی قابل نہیں رہا
دل کو نہ چھیڑ اے غمِ فرقت کہ اب یہ دل
تیرے بھی التفات کے قابل نہیں رہا

شیزا کی سالگرہ کی تقریب پورے اہتمام کے ساتھ جاری تھی۔ جب وہ خوبصورت بوکے کے ساتھ ''حسن ولاج'' میں داخل ہوا۔ ہر طرف دل کش سی گہما گہمی اپنے عروج پر تھی۔ سجے سنورے لوگ، اپنے اپنے گروپ بنائے خوش گپیوں میں مصروف تھے اور وہ بوکے ہاتھ میں لئے ایک طرف کھڑے ہوکر، چپ چاپ شیزا کی تلاش میں نگاہیں دوڑانے لگا کہ وہ اسے کچھ ہی فاصلے پر اپنی دوستوں کے ساتھ گپ شپ کرتی نظر آ گئی، اور اس سے پہلے کہ اریج قدم اٹھا کر اس کی طرف بڑھتا، شیزا نے خود ہی اسے دیکھ لیا۔ پھر اگلے ہی پل اپنی دوستوں سے ایکسکیوز کر کے وہ دلکشی سے مسکراتی ہوئی اس کے قریب چلی آئی۔

''تھینک یو سوچ، مجھے پورا یقین تھا کہ آپ ضرور آئیں گے۔'' اس کے ہاتھ سے بوکے تھامتے ہوئے وہ بے حد خوشی کے ساتھ بولی۔ تو اریج بھی رسماً مسکرا دیا۔ پھر اپنے خلوص بھرے لہجے میں بولا۔

''آپ نے اتنے پیار سے مجھے انوائیٹ کیا تھا لہٰذا اگر میں نہ آتا تو ہوسکتا ہے آپ کو ناگوار گزرتا، بس اسی لئے چلا آیا۔''

''بہت اچھا کیا، مجھے واقعی بہت افسوس ہوتا کہ آپ نے میرے کہے کا مان نہیں رکھا۔''

بھرپور خوشی اس کے سرشار لہجے سے بخوبی عیاں تھی۔ اریج احمر فقط دھیمے سے مسکرا کر رہ گیا۔ اسی اثناء میں اس کی نظر اپنے بیسٹ فرینڈ علی حسن پر پڑی تو وہ شیزا سے ایکسکیوز کر کے اس کی طرف بڑھ گیا جس کی یہاں شرکت اس کے لئے واقعی بہت حیرت کا باعث تھی، کیونکہ علی پشاور کا رہنے والا تھا، اور یہاں اس کا چکر سالوں بعد ہی لگتا تھا۔

''ایکسکیوزمی...... مجھے مسٹر اریج احمر کہتے ہیں اور آپ......؟''

چند قدم اٹھا کر وہ بالکل اس کے قریب پہنچ گیا۔ پھر اس کے چوڑے شانے پر ہاتھ دھرتے ہوئے اسے اپنی طرف متوجہ کر کے، متبسم لہجے میں بولا۔ تو علی چونک کر مسرت آمیز حیرانگی سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

''مجھے علی حسن کہتے ہیں، پشاور کا رہنے والا ہوں، اور آپ......؟''

بالکل اسی کا انداز اپنا کر وہ ہنستے ہوئے بولا تو اریج نے ایک دھپ اسے رسید کر دی، پھر دونوں ہی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

''تو یہاں کیسے......؟ تیرے پاس تو یاروں کے لئے ٹائم نہیں، پھر ایسی تقریبات کیلئے......؟ کچھ یقین نہیں آرہا۔'' اریج مسکراتی نگاہوں

سے اسے دیکھتے ہوئے قدرے شکوہ آمیز انداز میں بولا۔ تو علی محبت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سر کھجا کر رہ گیا۔ پھر وضاحتی انداز میں بولا۔

''سوری یار تم میری مصروفیات سمجھتے ہو، یہاں بھی صرف ممی اور شیزا کی حد درجہ ضد کے باعث مجبوراً آنا پڑا، اور اس تقریب سے فارغ ہو کر میں تمہاری طرف جانے کا پکا ارادہ کیے بیٹھا تھا کہ تم یہیں مل گئے، اور اس محفل کا لطف دوبالا ہو گیا۔''

اس کے مضبوط کندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے وہ بھرپور اپنی صفائی میں بولا۔ تو اریج اس کی ہوشیاری پر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

''اور سناؤ، بھابھی اور بچے کیسے ہیں؟''

اس کی معذرت قبول کرتے ہوئے وہ بشاش لہجے میں بولا تو علی نے سرد آہ بھر کر کن انکھیوں سے اسے دیکھا پھر اپنے مخصوص کھلنڈرے انداز میں بولا۔

''وہ سب تو ایک دم فرسٹ کلاس ہیں۔ تم اپنی سناؤ، کسی کی زلف کے اسیر ہوئے کہ نہیں؟''

علی کے بولڈ لہجے نے ایک پل کے لیے تو اسے کنفیوز کر دیا تاہم اگلے ہی پل وہ دل کی دھڑکن پر قابو پا کر دوستانہ انداز میں بولا۔

''فی الحال تو ایسی کوئی بات نہیں، جب ہو گی تو سب سے پہلے تمہیں ہی بتاؤں گا۔''

''شیور'' ذرا سی گردن جھکاتے ہوئے وہ بغور اس کی آنکھوں میں دیکھ کر قدرے بے یقین لہجے میں بولا۔ تو اریج نے ہنستے ہوئے چپ چاپ اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ دونوں اسی طرح اپنی گپ شپ میں مشغول تھے جب تمکین خوب نفاست سے تیار ہو کر اپنے کمرے سے نیچے ہال میں آئی، جہاں تقریباً تمام گیسٹ آ چکے تھے۔ شیزا کی نظر جونہی اس پر پڑی وہ لپک کر اس کی طرف بڑھی۔

''واہ...... آج تو لگتا ہے کہ اشعر بھائی کی خیر نہیں......؟''

ستائش سے بھرپور نگاہیں اس کے دلکش سراپے پر جماتے ہوئے وہ بھرپور خلوص سے بولی تو جواب میں تمکین نے قدرے تفاخر سے گردن اکڑا کر اپنے ریشمی بالوں پر ہاتھ پھیرا، اور اس کا یہ من چلا انداز دیکھ کر شیزا اپنے بے ساختہ قہقہے پر قابو نہ پا سکی پھر اسی طرح ہنستے ہوئے بولی۔

''ویسے وہ ہیں کہاں نظر نہیں آ رہے اتنی دیر سے۔''

''اپنے کمرے میں تیار ہو رہے ہیں۔ آخر مقابلہ ہونا ہے ہم دونوں میں، کہ کون زیادہ خوبصورت لگتا ہے۔'' اس کے شگفتہ سوال پر وہ خاصے تیز لہجے میں بولی۔ پھر کچھ یاد آنے پر سنجیدگی سے بولی۔

''عروشہ آپی اور علی بھائی پہنچ گئے کیا......؟''

''ہاں وہ تو کب کے پہنچ گئے ہیں بلکہ کوئی پچاس بار تمہارا پوچھ بھی چکے ہیں۔ مگر تمہیں اپنے آپ کو سنوارنے سے فرصت ملے تو پتہ کرو ناں، ہونہہ سالگرہ میری ہے اور بن سنور نے سے فرصت تم لوگوں کو نہیں مل رہی۔'' قدرے خفا سے انداز میں سر جھٹکتے ہوئے وہ خفگی سے بولی پھر کچھ

یاد آنے پر آہستگی سے رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔

''سنو، وہ اشعر بھائی کی تم سے صلح ہوگئی کیا......؟''

''ہاں......صلح ہوئی ہے تو محترم پنڈی سے واپس آئے ہیں۔ بہر حال تم یہ بتاؤ کہ علی بھائی اور عروشہ آپی اس وقت کہاں ہیں۔'' خاص ادا سے بائیں ہاتھ کی انگلیاں وہ اپنے ریشمی بالوں میں پھیرتے ہوئے قدرے مصروف انداز میں بولی تو شیزا نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے عجلت میں اسے بتایا۔

''عروشہ آپی، اوپر اپنے بیٹے کو سلا رہی ہیں اور علی بھائی وہ اس کونے میں کھڑے ہیں، جاؤ جلدی سے سلام دعا کر آؤ۔ تب تک میں مما سے پوچھ کر کیک کاٹنے کا اہتمام کرتی ہوں۔''

''او کے دوپٹے کو سنبھالتے ہوئے اس نے مختصراً کہا۔ پھر شیزا کی نشاندہی پر اس کارنر کی طرف چلی آئی جہاں بقول اس کے علی بھائی موجود تھے۔ تب اس کی نظر ان پر جا پڑی، وہ اس سے کچھ ہی فاصلے پر اس کی طرف پشت کئے غالباً اکیلے ہی کھڑے تھے۔ تمکین دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے دبے پاؤں ان کے قریب آئی، پھر نہایت پھرتی سے اپنے دونوں ہاتھ ان کی آنکھوں پر رکھ دیئے انہوں نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے پہلے اس کے چوڑیوں بھرے نازک ہاتھوں کو ٹٹولا، پھر ایک دم سے اس کے ہاتھ اپنی آنکھوں سے ہٹا کر، جونہی وہ مڑے، تو مسرور سی تمکین اپنی جگہ بھونچکاں رہ گئی۔ وہ علی بھائی کے روپ میں اریج احمد ہوگا اس کے تو فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی۔ تب ہی منہ پر ہاتھ رکھ کر پھٹی پھٹی سی حیران نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے وہ جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی جبکہ دوسری طرف اریج احمر کی نگاہوں میں عجیب سے الوہی جذبوں کی چمک تھی اور متبسم ہونٹوں پر نہایت مسحور کن دھیمی سی دل آویز مسکراہٹ۔

''وہ......آ......ایم سو، سوری میں سمجھی کہ آپ علی بھائی ہیں۔''

نگاہیں جھکا کر مخروطی انگلیاں مروڑتے قدرے ندامت سے کہتی وہ اسے بے حد اچھی لگی۔ پرپل کلر کے باریک ریشمی سوٹ میں نفاست سے میک اپ کئے وہ واقعی پرستان کی کوئی پری ہی لگ رہی تھی تب ہی اس کی شوخ نگاہیں اس کے دلکش سراپے پر جم کر رہ گئیں۔

''تھینک گاڈ۔ کہ آپ نے سوری کرنا سیکھا تو سہی، ورگرنہ ہمیشہ اپنی غلطیاں بھی میرے حصے میں ڈال کر بہت پریشان کرتی رہی ہیں آپ۔''

دل کی مراد اچانک ہی بر آئے تو بندہ خود بخود گلاب کے پھول کی مانند کھل اٹھتا ہے۔ بات بے بات مسکرانے کو من چاہتا ہے، اور اس وقت یہی حال اریج احمر کا تھا۔ تمکین نے لرزتی ہوئی پلکیں بمشکل اٹھا کر پل دو پل کے لئے اس مسحور کر دینے والے اجنبی کو دیکھا، پھر انگلیاں مروڑتے ہوئے نگاہیں جھکا کر بولی۔

''آپ کیوں ہر بار ٹکرا جاتے ہیں مجھ سے۔''

قدرے جھنجھلا کر اس نے کہا تھا، جبکہ اریج احمر اس کی اس پریشانی پر کھلکھلا کر ہنس پڑا، پھر قدرے متبسم لہجے میں بولا۔

"دل کو دل سے راہ ہوتی ہے میڈم، اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتیں آپ؟"

تمکین کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کی پرسنالٹی کو دل کش کہے یا اس کی مسحور کر دینے والی مدھر آواز کو۔ تب ہی وہ اس پر خواہ مخواہ کا رعب ڈالتے ہوئے بولی۔

"آپ نے خوش فہمیاں کچھ زیادہ ہی پال رکھی ہیں۔ گو کہ ہم دونوں کے بیچ آج تک سوائے جھگڑے کے اور کچھ نہیں رہا۔"

جانے کیوں آج وہ اس سے الجھنا نہیں چاہتی تھی۔ تب ہی اس کے قدرے چٹختے ہوئے لہجے پر وہ دھیمے سے مسکرا کر رہ گیا۔ پھر بازو سینے پر لپیٹتے ہوئے ذرا سا اس کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔

"ایسا تو آپ سوچتی ہیں ناں، کبھی میرے دل میں جھانک کر تو دیکھیے کہ وہاں کا کیا موسم ہے۔" بھرپور نگاہوں سے اس کا ایک ایک روپ اپنے اندر اتارتے ہوئے اس نے قدرے گھمبیر لہجے میں کہا تھا اور اس کے اس بولڈ انداز پر تمکین اپنی جگہ گڑبڑا کر رہ گئی پھر اپنی پوزیشن کلیئر کرنے کو قدرے تیز لہجے میں بولی۔

"سوری..... مجھے آپ کے دل میں جھانکنے کا قطعی کوئی شوق نہیں، اور ہاں آپ کی اطلاع میں اضافے کے لیے عرض کرتی چلوں کہ....."

"ارے تمکین، تم یہاں کھڑی ہو، اور میں کب سے تمہیں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔"

وہ شہادت کی انگلی اٹھا کر تنبیہی انداز میں اسے کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اسی پل اشعر اسے ڈھونڈتے ہوئے وہاں آ پہنچا، اور وہ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر اس کی طرف بڑھ گئی۔ جبکہ اریج دور تک مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔

☆☆☆

"ہیلو اریشہ فلم دیکھنے جاؤ گی کیا؟ سب لوگ چل رہے ہیں، ارسلان بھائی اور صالحہ بھابھی بھی۔"

ارسلان بھائی کی شادی خوب دھوم دھام کے ساتھ انجام پا چکی تھی، اور اب دعوتوں کا دور دورہ چل رہا تھا۔

جب وہ ادا اس سی لان میں کرسٹل کی چیئر پر بیٹھی سوچوں کے سمندر میں غوطہ زن تھی کہ فائقہ اسے ڈھونڈتی ہوئی وہاں چلی آئی اور اس کے پیچھے ہی کاشف بھی چلا آیا۔ ان لوگوں کے یوں ایک دم سے وارد ہونے پر اس کی سوچوں کا محور ٹوٹا اور وہ ان کی طرف سرسری سا دیکھتے ہوئے قدرے بیزار لہجے میں بولی۔

"نہیں یار، تم لوگ جاؤ۔ میرا آج کہیں بھی جانے کو دل نہیں چاہ رہا ہے۔"

"او کے ایز یو وش۔"

دونوں کندھے اچکا کر وہاں سے چلے گئے کہ حسن کے مرکز "شاہ ولاج" میں کسی فرد کو فورس کرنے کا قطعی رواج نہ تھا۔ ہر بندہ اپنی مرضی کا مالک تھا۔ پھر فائقہ تو مابہم لوگوں کو بلانے کے لیے چل دی اور کاشف سیدھا ازمیر کے کمرے میں چلا آیا۔ جو بیڈ پر نیم دراز کسی کتاب کے مطالعے میں مشغول تھا۔

''ازمیر بھیا! چلیں جلدی سے اٹھیں اور تیار ہو جائیں۔''

اس کے قریب پہنچ کر وہ بشاشت سے بولا تو مطالعے میں گم ازمیر نے کتاب سامنے سے ہٹا کر خاصی حیرت سے اسے دیکھا جو ہوا کے دوش پر سوار، نہ جانے کہاں چلنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے وہ کہنیوں کا سہارا لے کر اٹھ بیٹھا اور قدرے متبسم نگاہیں کاشف کے چہرے پر مرکوز کر کے دھیمے لہجے میں بولا۔

''خیریت، کوئی جنگ دنگ چھڑ گئی ہے کیا......؟''

''ہاں......بس کچھ ایسا ہی سمجھیں۔ اکچو لی ہم سب لوگ صالحہ بھابھی کو لے کر فلم دیکھنے جا رہے ہیں تو میں نے سوچا آپ کو بھی اس موج مستی میں شامل کر لیا جائے مگر وہ اریشہ ہے ناں، وہ مجھ سے لڑ پڑی کہ آپ ہمارے ساتھ ہرگز نہیں جائیں گے۔ تو میں نے بھی اس سے شرط لگا لی کہ میں آپ کو لے کر ہی آؤں گا۔ اب یہ آپ پر ڈیپینڈ کرتا ہے کہ آپ کسے شکست سے ہمکنار کرتے ہیں، مگر یاد رکھئے بھیا کہ اگر آپ نہیں جائیں گے تو اریشہ بھی نہیں جائے گی اور میں بھی نہیں جاؤں گا۔ اس سے قبل اس طرح کے کسی موقع پر آپ گھر پر ہی نہیں ملتے قسمت سے آج اگر آپ گھر پر مل ہی گئے ہیں تو پلیز انکار مت کیجئے گا پلیز، میری خوشی کی خاطر ہی سہی۔''

وہ حقیقت میں اریشہ کو ستانا چاہتا تھا تب ہی ہر قیمت پر اسے ساتھ لے جانے کا مصمم ارادہ کر لیا تو ازمیر اس کے اس قدر تفصیلی بیان پر دھیمے سے مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ جو اسے ساتھ لے جا کر یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اریشہ کا فیصلہ ازمیر کی شراکت میں کیا رخ اختیار کرتا ہے، اور وہ بھی اس وقت نہ جانے کس موڈ میں تھا کہ کاشف کے ساتھ چلنے پر راضی ہو گیا، اور جب وہ تیار ہو کر کاشف کے ہمراہ باہر نکلا تو اریشہ وہیں لان میں بیٹھی ہنوز سوچوں میں گم تھی اور اسے وہیں گم صم سا بیٹھے دیکھ کر اک شریری مسکراہٹ کاشف کے لبوں پر بکھر گئی۔

''ارے اریشہ، تم یہاں بیٹھی ہو، ہمارے ساتھ نہیں چل رہی ہو کیا۔؟''

ماہم کو سب سے پہلے اس کی فکر ہوئی تھی۔ تب ہی وہ اس کے قریب آتے ہوئے قدرے حیرانی سے بولی تو اریشہ نے دل گرفتہ سے انداز میں اس کی سمت دیکھا، پھر نگاہیں جھکا کر انگلیاں مروڑتے ہوئے بولی۔

''ہاں ماہم وہ......میں''

اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اپنے انکار کی کیا وجہ بیان کرے کہ تب ہی اچانک اس کی نگاہ اپنے دائیں طرف کھڑے متبسم سے کاشف اور اس کے پہلو میں سجے سنورے کھڑے ازمیر شاہ پر جا پڑی اور وہ حیرت سے گنگ، تقریباً پہلی بار اسے یوں سب لوگوں کے ساتھ چلنے پر تیار دیکھتی رہ گئی۔ کاشف کے لبوں پر بڑی شریری مسکراہٹ رینگ رہی تھی، اور وہ پل بھر میں اس کی شرارت سمجھ کر جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی پھر اپنی گردن پر آئے سلکی بال، نازک انگلیوں کی مدد سے پیچھے کرتے ہوئے قدرے مسکرا کر بولی۔

''نن......نہیں، میں چل رہی ہوں تمہارے ساتھ، لیکن تم سب لوگ اتنی جلدی کیسے تیار ہو گئے......؟'' نظر کاشف پر جمی تھی جو حسب توقع فوراً اس کے یوں فیصلہ بدلنے پر ہنسنے لگا تھا۔ پھر اسی طرح آنکھیں نچاتے ہوئے قدرے متبسم لہجے میں بولا۔

''مگر......ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ تم نہیں جا رہیں۔''

وہ کہاں بھرم رکھنے والا تھا تب ہی وہ جل کر بولا تو اریشہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ پھر اس کے کندھے پر ہلکا سا تھپڑ لگاتے ہوئے بولی۔

''دنیا جہان کے جھوٹے، میں نے کب کہا تھا کہ میں نہیں جا رہی، تم لوگ ٹھہرو میں ابھی تیار ہو کر آتی ہوں۔'' چٹکی بجا کر ہنستے ہوئے وہ فوراً وہاں سے بھاگ گئی، اور اس کے اس انداز پر دھیمی سی مسکراہٹ ازمیر کے لبوں کو چھو گئی جبکہ اس کے پہلو میں کھڑا کاشف کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

''بہت عجیب لڑکی ہے بھئی، پل میں تولہ پل میں ماشہ۔''

اسی طرح ہنستے ہوئے ہی اس نے اپنے کمنٹس جاری کیے تھے۔ جبکہ اس کے فقرے کے جواب میں ماہم سر جھٹکتے ہوئے قدرے اٹھلا کر بولی۔

''ہاں بھئی، اب کیسے نہ جاتی، ضرور ازہان بھیا نے فون کر کے اپنی شمولیت کی نوید سنا دی ہوگی۔ تب ہی تو ارادہ بدل گیا محترمہ کا۔''

اس کے وہاں سے بھاگتے ہی ماہم نے قدرے بلند آواز میں کہا تھا اور جواب میں وہاں موجود بھی لوگ بشمول صالحہ بھابھی کے کھلکھلا کر ہنس پڑے، جبکہ ازمیر نے کسی قدر چونک کر ماہم کو دیکھا تھا جس نے مبہم لفظوں میں بڑا واضح اشارہ دے دیا تھا۔

''اوہ...... تو یہ بات ہے، تب ہی یہ ماہم بیگم اریشہ کو میرے ساتھ دیکھ کر جل جاتی ہے۔''

لمحہ بھر کے لئے اس نے سوچا تھا پھر سر جھٹک کر دھیرے سے مسکرا دیا۔

اریشہ اگلے پانچ سات منٹ میں سادگی سے تیار ہو کر وہاں پہنچی تو ازمیر وہاں سے جا چکا تھا۔ ایک پل کے لئے قدرے الجھ کر اس نے کاشف کی سمت دیکھا تو وہ اس کی متغیر رنگت دیکھ کر اطمینان سے مسکرا دیا۔ پھر انگوٹھے کی مدد سے باہر کی طرف اشارہ کیا کہ ازمیر باہر اپنی گاڑی میں ہے۔ لہٰذا وہ بے فکر رہے۔ تب سکون کی سانس بھرتے ہوئے وہ بنا کسی کا انتظار کیے باہر کی طرف لپکی اور دوڑ کر ازمیر کی گاڑی کا دروازہ کھول کر اس کے برابر میں جا بیٹھی، اور اس کی اس حرکت پر ازمیر نے سرسری طور پر مسکرا کر اسے دیکھا، پھر نہایت محتاط ہو کر اپنی سمت کا دروازہ کھولتے ہوئے، اس نے جونہی گاڑی سے باہر نکلنے کا قصد کیا، اریشہ نے ایک بھی لمحے کی تاخیر کیے بغیر جلدی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''پلیز ازمیر...... میں صرف تمہاری وجہ سے ہی فلم دیکھنے کے لئے چل رہی ہوں، اگر تم یہاں سے اٹھے تو میں ابھی اور اسی وقت گھر واپس چلی جاؤں گی۔''

تنبیہی انداز میں اس نے کہا تھا، تب ہی ازمیر ایک سرسری نظر اس پر ڈال کر خاموش رہ گیا۔

''ارے......ادھر تو دیکھو، محترمہ ہیروئن صاحبہ تو آل ریڈی یہاں چپکی بیٹھی ہیں، اب ہم کہاں بیٹھیں بھئی؟''

ماہم سب سے پہلے ازمیر کی گاڑی کی طرف آئی تھی، مگر وہاں اریشہ کو ازمیر کے برابر میں بیٹھے دیکھا تو اپنا خدشہ درست ہونے پر خاصے تیکھے انداز میں بولی۔ جواب میں کاشف نے مسکرا کر اریشہ کی سمت اک نگاہ کی، پھر ماہم کو دیکھتے ہوئے قدرے متبسم لہجے میں بولا۔

''تو تم کیوں جل رہی ہو جاؤ جا کر ارسلان بھیا کی گاڑی میں بیٹھ جاؤ یا پھر کہو تو میں اپنی گاڑی میں لے جاتا ہوں کیا خیال ہے......؟''

کاشف کے شگفتہ انداز پر ماہم نے جل کر اسے دیکھا پھر پاؤں پٹختی ہوئی وہاں سے ارسلان کی گاڑی کی طرف بڑھ گئی تو اریشہ اور کاشف اس کے انداز پر دل کھول کر ہنسے۔

''چلئے جناب، اب آپ لوگ جلدی سے یہاں سے نکل جایئے ورنہ چڑیلوں کی فوج گھیر لے گی آپ کو آ کر۔'' گاڑی کی کھڑکی میں بازو نکا کر قدرے تنبیہی انداز میں کہتے ہوئے کاشف نے ازمیر اور اریشہ کو دیکھا پھر اریشہ کے اثبات میں سر ہلانے پر مسکراتا ہوا اپنا چشمہ سیٹ کر کے اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ تب اریشہ کے اصرار پر ازمیر نے دھیرے سے گاڑی آگے بڑھادی۔

''پتہ ہے اریشہ، شہزین کو بھی فلموں سے بہت انٹرسٹ ہے۔ یونیورسٹی میں گھنٹوں وہ میرے ساتھ اپنی پسند کے مختلف ہیروز پر باتیں کرتی رہتی تھی۔ کتنا اچھا لگتا تھا اسے اپنی فیورٹ موویز پر ڈسکس کرنا۔'' آہستگی سے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے کافی دیر کی خاموشی کے بعد، ازمیر پھر سے ماضی کی یادوں کو کریدنے لگا۔ تو اریشہ جو گاڑی سے باہر کے نظاروں میں گم تھی، چونک کر دل گرفتگی کے انداز میں اسے چپ چاپ دیکھنے لگی۔ پھر آہستگی سے گویا ہوئی۔

''اور کیا کیا پسند تھا شہزین کو.....؟'' دل تو جلا، مگر اس نے ازمیر کو احساس نہیں ہونے دیا جو اس کے سوال پر بڑے مبہم سے انداز میں مسکراتے ہوئے گویا ماضی کی ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ تب ہی خوشگوار لہجے میں بولا۔

''وہ زندگی سے پیار کرنے والی لڑکی تھی اریشہ، لہٰذا زندگی کی ہر چیز اچھی لگتی تھی اسے، پھول، پودے، کتابیں، کھیل، فلمیں، سب کچھ..... بات بے بات اس کے احمریں لب کھلکھلا اٹھتے تھے۔ ہر وقت ہنستی مسکراتی رہتی تھی۔ مگر جب غصے میں آتی تو زمین آسمان ایک کر کے رکھ دیتی تھی، جانتی ہو ایک دن میں یونہی اس سے الجھ بیٹھا۔ بحث کرتے کرتے تکرار تک بات جا پہنچی اور وہ مجھ سے الجھ پڑی، اب وہ غصے سے بے حال اپنی بات پر اڑے ہوئے مجھے دیکھ رہی تھی اور میں ہر بات سے بے خبر چپ چاپ اس کے سرخ سرخ گلاب سے چہرے کو دیکھے جا رہا تھا اور.....''

''ازمیر..... پتہ نہیں کیوں میرا سر چکرا رہا ہے۔''

ازمیر اپنی ہی دھن میں بولے جا رہا تھا، جبکہ وہ مزید برداشت نہ کر سکی تو درمیان میں ہی اس کی بات کاٹ کر سر درد کا بہانہ کر دیا۔ جواب میں ازمیر نے گاڑی روکتے ہوئے پریشان ہو کر اسے دیکھا۔

''کیا ہوا..... گھر میں تو تم بالکل ٹھیک ٹھاک تھیں۔''

''ہاں..... بس ابھی ابھی سر میں درد ہونے لگا ہے۔'' یونہی سر دباتے ہوئے وہ نظریں چرا کر بولی۔

''او کے..... چلو کسی ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں، یا پھر گھر.....'' پریشانی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے وہ بولا۔

''نہیں نہیں، یونہی ذرا سا درد ہے۔ ابھی ٹھیک ہو جائے گا، تم گاڑی ڈرائیو کرو پلیز۔''

اس کا دھیان ہٹا کر وہ کمال ہوشیاری سے بولی تو ازمیر نے اس کی طرف سے مطمئن ہو کر چپ چاپ گاڑی آگے بڑھا دی۔

☆☆☆

عدنان کو جب سے انجشاء کے جاب چھوڑنے کا پتہ چلا تھا، اک عجیب سی بے قراری اس کے پورے وجود میں سرایت کر گئی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح سے مس شاہ اس کے سامنے آ جائے اور وہ دل بھر کر اس کی انسلٹ کر سکے۔ یہ واحد لڑکی تھی جس نے اسے سرور بخشنے کی بجائے ٹینشن میں مبتلا کر دیا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس ٹینشن سے چھٹکارا پانے کے لئے وہ کیا کرے؟

ابھی وہ اسی تانے بانے میں الجھا ہوا تھا کہ اسی پل اس کا موبائل بج اٹھا۔ سخت کوفت کے عالم میں اس نے ٹیبل سے اپنا موبائل اٹھایا، پھر اس پر شاہد کا نام دیکھا تو نہ چاہتے ہوئے بھی اسے کال ریسیو کرنا پڑی، جبکہ دوسری طرف شاہد بے تابی سے اس کے کال ریسیو کرنے کا منتظر تھا۔ تب ہی اس کے ہیلو کہتے ہی بے قراری سے بولا۔

''باس! اک بہت فریش اور خوش کر دینے والی خبر ہے تمہارے لئے۔''

''بولو۔''

عدنان کا موڈ ہنوز آف تھا، مگر شاہد نے توجہ نہیں کی اور اپنی ہی مستی میں سرشار ہو کر بولا۔

''وہ جس لڑکی کا تمہیں بے صبری سے انتظار تھا ناں.....؟ وہ تمہارے خوابوں کی شہزادی.....تمہاری لامحدود خواہشوں کی حاصل.....''

''ہاں بتاؤ کیا ہوا اسے.....؟''

اس کی بات کاٹ کر وہ پھر بے زاری سے گویا ہوا تو شاہد سیدھی لائن پر آ گیا تب ہی سنجیدگی سے بولا۔

''وہ پاکستان آئی ہے، اور خود تم سے ملنا چاہتی ہے۔''

''رئیلی.....''

ادھر عدنان کو شاید اپنی سماعتوں پر یقین ہی نہیں آیا تب ہی قدرے تیز لہجے میں بے یقینی سے بولا۔

''ہاں یار، اس نے خود مجھ سے کہا ہے کہ وہ تم سے ملنا چاہتی ہے کل ریستوران میں ملاقات ہوئی تھی ہماری، بہت بدل گئی ہے یار۔ میں نے تو پہلی نظر میں پہچانا ہی نہیں اسے۔''

شاہد کا لہجہ کسی بھی قسم کی بناوٹ سے پاک تھا، تب ہی عدنان نے کرسی کی پشت سے سر ٹکتے ہوئے اک سرد آہ بھری، پھر اسی انداز میں پوچھا۔

''پاکستان میں کب تک قیام ہے اس کا؟''

''پتہ نہیں، میں ٹھیک سے کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن اس کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ کم از کم ایک ماہ تو ضرور رکے گی۔''

''او کے.....تو پھر اسے کہہ دو کہ میں اک ضروری کام کے سلسلے میں ایک ہفتے کیلئے شہر سے باہر گیا ہوا ہوں آتے ہی اس سے مل لوں گا۔''

اس وقت اس کا ذہن بالکل کام نہیں کر رہا تھا، تب ہی بے دلی سے کہتے ہوئے اس نے کال کاٹ دی اور پھر سے سوچوں کے بھنور میں گم ہو گیا۔

''مس شاہ کو اس کی اوقات دکھانے کے لئے مجھے کیا کرنا چاہیئے۔''

کتنی ہی دیر وہ اسی بات پر سوچتا رہا، پھر کچھ ذہن میں آنے پر اپنا کوٹ اور موبائل اٹھا کر اریج احمر سے ملنے کے لئے نکل کھڑا ہوا۔

پھر جس وقت وہ اریج کے آفس میں پہنچا، شام اچھی خاصی ڈھل چکی تھی، سیکرٹری کو اپنا پیغام دے کر وہ وہیں کرسی پر ٹک کر اس کے جواب کا انتظار کرنے لگا کہ اسی پل اریج احمر، اور انجشاء ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اپنے آفس سے باہر نکل آئے۔

''ایکسکیوزمی سر، یہ صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

جونہی وہ اپنی سیکرٹری کے قریب سے گزرنے لگا اس نے اریج کو مطلع کیا۔ جواب میں وہ ٹھٹک کر رکا اور خاصی لاعلمی سے عدنان رؤف کے اجنبی چہرے کی طرف دیکھا، جو مسکراتے ہوئے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''جی فرمایئے۔''

وہیں کھڑے کھڑے اس نے خاصے فارمل انداز میں کہا۔ جواب میں عدنان اپنی سیٹ سے اٹھتے ہوئے اس کی طرف مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔

''مجھے عدنان رؤف کہتے ہیں اے آر گروپ آف انڈسٹری کا ہیڈ ہوں۔ آپ سے اک ضروری کام کے سلسلے میں ملنا چاہتا تھا۔ آئی ہوپ کہ آپ مجھے اپنے قیمتی وقت میں سے تھوڑا سا ٹائم ضرور دیں گے۔''

''یس..... وائے ناٹ......ہم لوگ ڈنر کے لئے باہر جا رہے تھے۔ آیئے آپ بھی ساتھ چلیے ہمارے.....''

اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے اریج نے خاصے خلوص سے کہا اور اس کے اثبات میں سر ہلانے پر قدم آگے کی جانب بڑھا دیئے۔

گاڑی میں دیر تک خاموشی کا راج رہا، تب عدنان نے ہی اس خاموشی کو توڑا، اور قدرے نارمل سے انداز میں بولا۔

''ڈنر کچھ جلدی نہیں کر رہے ہیں آپ لوگ؟''

انجشاء اور اریج احمر دونوں نے اس قطعی غیر متعلق سوال پر ایک لمحے کے لئے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، پھر اریج نے ہی خاصے خشک انداز میں اسے جواب دیا۔

''ہاں..... کیونکہ مس شاہ نے صبح سے کچھ بھی نہیں کھایا ہے، اسی لئے انہیں بھوک ستا رہی تھی تو میں نے سوچا کہ آج جلدی ڈنر کر لیا جائے۔''

''بالکل درست سوچا آپ نے، وہ کیا ہے کہ بھوک اور نفرت دونوں ہی انسان ضبط نہیں کر سکتا۔''

نگاہیں انجشاء کی پشت پر جماتے ہوئے اس نے مبہم لفظوں کا سہارا لیا تھا۔ جواب میں اریج سر جھٹک کر رہ گیا۔ جبکہ انجشاء لب کاٹ کر اپنے اندر کا انتشار چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔

''مس شاہ! بھئی آپ تو بہت لکی نکلیں کہ بزنس میں مسٹر اریج جیسے پارٹنر مل گئے آپ کو، وگرنہ آپ کی کلاس کی تو ہزاروں لڑکیاں دو جمع دو کی

فکر میں ہی ہلکان رہتی ہیں، ہے ناں......؟''

بہت پست لہجہ تھا اس کا، انجشاء نے کن انکھیوں سے اریج احمر کی طرف دیکھا، جو لب بھینچے ان دونوں سے بے نیاز بیٹھا تھا، تب اس نے اپنے آپ پر قابو پا کر بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

''جی آپ نے بالکل درست فرمایا مسٹر رؤف کہ مجھے بزنس میں اریج احمر جیسے پارٹنر کے ساتھ بہت کچھ سیکھنے کا موقع مل رہا ہے اور میں آپ کو بتاتی چلوں، کہ خدا جب اپنے بندے کا ہاتھ پکڑتا ہے ناں تو وہ پل میں فقیر کو بادشاہ بنا سکتا ہے اور وہی خدا جب چاہے بادشاہ کو لا کر زمین پر پٹخ سکتا ہے۔ آپ لوگ شاید مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو انسانوں میں شمار نہیں کرتے ہوں گے، مگر میں انہی لوگوں سے حقیقی زندگی کا درس لیتی ہوں جو زندگی کی ہر آسائش سے بے نیاز اس کے ایک ایک پل کا قرض اپنی محنت سے چکاتے ہیں۔ ہاں جہاں تک میری بات ہے تو بے فکر رہیئے میں دو جمع دو کی فکر کرنے والی لڑکی نہیں ہوں۔ بلکہ میرا جس فیملی سے تعلق ہے وہ اتنی ویل آف ہے کہ میں آپ جیسے بیس عدنان رؤف خرید کر اپنے گیٹ پر چوکیداری کے لئے کھڑا کر دوں تب بھی ہمیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

قدرے ترش لہجے میں اس نے کہا تھا۔ جواب میں عدنان رؤف کے چہرے کا رنگ پل میں متغیر ہو گیا جبکہ اک دھیمی سی مسکراہٹ اریج احمر کے لبوں کو چھو گئی، تب ہی اس نے اپنی گاڑی اک شاندار سے ریستوران کے سامنے روک دی۔

''جی مس شاہ کہیے کہ کھانا پسند فرمائیں گی آپ؟''

وہ لوگ ایک نسبتاً پر سکون کارنر والی ٹیبل سنبھال چکے تھے۔ جب اریج احمر نے نہایت شائستگی سے اس سے پوچھا۔ جواب میں اس نے سر سری سے انداز میں اس کی طرف دیکھا پھر قدرے مسکراتے ہوئے بولی۔

''آج چونکہ یہ ڈنر آپ کی طرف سے ہے تو میں کھانا بھی آپ کی پسند کا ہی کھاؤں گی۔ ویسے ہماری پسند بہت حد تک ملتی بھی ہے۔''

اس کے دھیمے لہجے میں کہے متبسم جملے پر اریج احمر کھلکھلا کر ہنس پڑا جبکہ عدنان رؤف نے چبھتی ہوئی نگاہوں سے انجشاء کو دیکھا جو مسکراتے ہوئے اسے سخت زہر لگ رہی تھی۔ اریج احمر نے اپنی پسند کا کھانا آرڈر کر دیا۔ پھر مسکراتے ہوئے عدنان رؤف کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

''جی مسٹر عدنان! کہیے کیا ضروری بات کرنا تھی آپ کو؟''

اب کے اس کا لہجہ کسی بھی قسم کی سرد مہری سے پاک تھا۔ عدنان نے اندر کا طوفان اندر ہی دباتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر متانت سے کہا۔

''مسٹر رحمان کی معرفت مجھے پتہ چلا کہ آپ نیا پراجیکٹ شروع کر رہے ہیں، جس کے لئے آپ کو پارٹنر کی ضرورت ہے، تو میں اسی سلسلے میں آپ سے بات کرنا چاہ رہا تھا کہ میرے پاس ایک قابل اعتماد اور تجربہ کار آدمی ہے۔ آپ چاہیں تو اسے آزما سکتے ہیں مگر یہاں آ کر پتہ چلا کہ آپ تو آل ریڈی ایک پارٹنر ڈھونڈ چکے ہیں۔''

کس قدر دل جلا لہجہ تھا اس کا، انجشاء نے بمشکل اپنا غصہ ضبط کیا جبکہ اریج احمر نے قطعی کچھ نہ سمجھتے ہوئے استفہامیہ نگاہوں سے اسے دیکھا

اور مختصراً بولا۔

''تو پھر......اب آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

اسے واقعی یہ پراسرار سا شخص سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، جو نہ جانے کس مقصد کے تحت وہاں چلا آیا تھا۔

''میرے کچھ کہنے نہ کہنے سے کیا ہوتا مسٹر اریج احمر صاحب۔ بہرحال آپ اپنا نیا پراجیکٹ شروع کریں، میں آپ کے ساتھ بزنس ڈیلنگ کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ یہ ہم دونوں کے لئے فائدہ مند ہے۔''

اریج کو بخوبی اے آر گروپ آف انڈسٹری کی ترقی کا اندازہ تھا۔ تب ہی عدنان کی پیشکش پر وہ اطمینان سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''موسٹ ویلکم......یہ تو میرے لئے اعزاز کی بات ہے۔''

''تھینک یو۔ میرے خیال میں نے آپ کا کافی قیمتی وقت لے لیا ہے، لہٰذا اب چلنا چاہیے مجھے، مطلب کی بات کر کے اس نے فوراً وہاں سے رخصت چاہی، تب ہی اریج کی بات ڈن کرتے ہی حتمی انداز میں شکریہ ادا کرتے ہوئے بولا، اور اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''پلیز بیٹھیے ناں مسٹر عدنان، کم از کم کھانا تو شیئر کیجیے نا ہمارے ساتھ۔''

اریج نے اسے اٹھتے ہوئے دیکھا تو فوراً ریکویسٹ کی، جسے اس نے معذرت کے ساتھ مسترد کر دیا۔

''نہیں تھینک یو مجھے اصل میں ارجنٹلی کہیں پہنچنا ہے تو میرے خیال سے مجھے چلنا ہی چاہئے۔''

اک نظر قیمتی رسٹ واچ پر ڈالتے ہوئے بولا، تو اریج نے بھی زیادہ اصرار مناسب نہیں سمجھا اور اپنی سیٹ سے کھڑے ہو کر اس سے مصافحہ کرتے ہوئے جلد ہی دوبارہ ملنے کا پرامس کیا تو عدنان شکریہ ادا کر کے انجشاء کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے تیز تیز قدموں سے چلتا ریستوران سے باہر نکل گیا۔

آج اس کی ایک بہت بڑی مشکل حل ہو گئی تھی، اور اب اسے زیادہ سے زیادہ انجشاء کے قریب رہ کر اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانی تھی۔

☆☆☆

''تم اگر ساتھ دینے کا وعدہ کرو میں یونہی مست نغمے لٹاتا رہوں
تم مجھے دیکھ کر مسکراتی رہو، میں تمہیں دیکھ کر گیت گاتا رہوں''

تمکین کچن میں اشعر کے لئے پکوڑے تل رہی تھی۔ جب وہ گنگناتے ہوئے وہیں چلا آیا پھر اپنی ٹھوڑی اس کے کندھے پر ٹکاتے ہوئے سامنے سے ایک پکوڑا اٹھا کر منہ میں ڈال لیا، تو تمکین نے گھور کر خفگی سے اسے دیکھا پھر رخ پھیرتے ہوئے برہمی سے بولی۔

''ندیدے کہیں کے تھوڑا صبر نہیں ہوتا تم سے۔''

''نہیں......قسم لے لو اب تو بالکل صبر نہیں ہوتا، تم میری ہو میری ہی آنکھوں کے سامنے ادھر اُدھر سارے دن چلتی پھرتی رہتی ہو اور میں حق

رکھتے ہوئے بھی تمہاری انگلی تک نہیں پکڑ سکتا اب تم ہی بتاؤ کہ اس سے بڑھ کر اور کیا ستم ہوگا مجھ پر۔''

وہ بات کو فوراً اپنے رخ میں لے گیا تھا اور اس کی اس شرارت پر تمکین نے زچ ہو کر اسے دیکھا پھر اسی طرح بھنائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''چلو تم، چل کر باہر سب کے ساتھ بیٹھو، میں ابھی یہ لوازمات باہر لے کر آتی ہوں۔''

''کیوں...... میں یہاں کھڑے ہو کر تمہیں کیا کہہ رہا ہوں؟''

وہ کہاں اس کے رعب میں آنے والا تھا، جبکہ تمکین جانتی تھی کہ وہ اس کے پاس کھڑا رہا تو اس سے کچھ بھی نہیں ہو سکے گا، تب ہی وہ قدرے روہانسی ہو گئی تو اشعر اس کی چھوٹی سی ناک دباتے ہوئے ہنس پڑا، پھر اسی طرح سے فریش لہجے میں بولا۔

''اتنا ڈرتی کیوں ہو مجھ سے...... میں تمہیں کھا تو نہیں جاؤں گا۔ ویسے بھی پردیسی ہوں، دو چار دنوں تک واپس چلا جاؤں گا۔ تمہیں تو بلکہ مجھے زیادہ سے زیادہ کمپنی دینی چاہئے کجا کہ تم مجھ سے یوں دور بھاگتی ہو۔''

''ہاں بس مجھے تنہائی میں تمہارے ساتھ یوں گھلنا ملنا اچھا نہیں لگتا، بہر حال اب پلیز تم باہر جاؤ، تاکہ میں کوئی کام کر سکوں۔''

سنجیدگی سے اس نے کہا تھا، اشعر اس کا مزاج سمجھتے ہوئے خاموشی سے سر ہلا کر کچن سے باہر چلا گیا تو اس نے سکون کا سانس بھرا اور ابھی چمچا اٹھایا ہی تھا کہ وہ لپک کر پھر وہیں آ گیا اور اپنا منہ اس کے کان کے پاس لا کر سرگوشیانہ انداز میں بولا۔

''کیوں...... اچھا نہیں لگتا؟''

بے حد شریر انداز میں اسے ستانے کے لئے اس نے کہا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ عادت کے مطابق چڑ کر اس کے پیچھے لپکتی وہ بھاگ کر کچن سے باہر نکل آیا، جبکہ تمکین بری طرح زچ ہو کر رونے بیٹھ گئی، پھر حسب معمول اسے ڈھیروں القابات سے نوازتے ہوئے خود ہی اپنے آنسو صاف کر کے دوبارہ سے کام میں لگ گئی۔

اشعر کچن سے سیدھا ٹی وی لاؤنج میں چلا آیا۔ جہاں اس وقت باقی گھر والے براجمان تھے اور اپنے اپنے پسندیدہ موضوعات پر ڈسکس کر رہے تھے۔ وہ جوں ہی آ کر ان کے قریب بیٹھا، دادی اماں اسے دیکھتے ہوئے بول پڑیں۔

''اشعر پتر، اور کتنی چھٹیاں باقی ہیں تمہاری؟''

ان کے سادہ انداز پر اس نے بمشکل لب بھینچ کر اپنی مسکراہٹ کو ضبط کیا، پھر فرمانبردار لہجے میں بولا۔

''میں آزاد ویزے پر آیا ہوں بڑی ماں...... چھٹیوں پر نہیں، ہاں البتہ مجھے جلدی جانا پڑے گا، کیونکہ وہاں لندن میں ممی پاپا بالکل اکیلے ہیں، پھر مام تو آل ریڈی بیمار ہیں۔ اب پاپا نہ جانے کیسے سنبھالتے ہوں گے سب کچھ۔

بس اسی لئے میں نے سوچا ہے کہ میں دو چار روز میں واپس چلا جاؤں۔''

''وہ سب تو ٹھیک ہے بیٹا، لیکن اسے کیا ضرورت پڑی ہے کہ ہم سب سے دور، وہ یوں سمندر پار، ساری مصیبتیں اکیلا جھیلتا پھرے؟ تم

اسے سمجھاؤ بیٹا، اسے یہاں پاکستان لوٹنے پر مجبور کرو۔“

اس کے قدرے سنجیدہ لہجے میں بات کے بعد دادا جی نے اسے کہا تھا اور ان کے حکم پر اشعر نے چپ چاپ اثبات میں سر ہلا دیا۔

”اشعر پتر، میں چاہتی ہوں کہ تم لندن واپس جانے سے پہلے ذرا ایک دو دن اپنی پھوپھو کے پاس سے ہو آؤ، بہت چاہتی ہے وہ تمہیں، پھر تم نے تو ابھی تک اس کا گھر بھی نہیں دیکھا ہے، اور شیزا پتر بھی اب اپنے گھر جانا چاہتی ہے۔ اب اکیلی لڑکی کو کیسے اتنی دور بھیجوں؟ تم ساتھ جاؤ گے تو دونوں مسئلے نپٹ جائیں گے۔“

اب کے دادی ماں نے اپنے مخصوص انداز میں حکم جاری کیا، تو اشعر بھی اپنی اکلوتی پھوپھو سے ملنے کے خیال میں خوش ہو گیا، تاہم فرمانبرداری سے سر جھکا کر بولا۔

”وہ سب تو ٹھیک ہے دادی ماں، لیکن منزہ پھوپھو عاشر بھیا کی شادی پر کیوں نہیں آئیں؟ پاپا کی تو چلو مجبوری تھی۔ مگر پھوپھو تو یہیں اسی ملک میں رہتی ہیں ناں، پھر بھی وہ نہیں آئیں؟؟“

اس کا لہجہ قدرے الجھا ہوا تھا، جواب میں دادی اماں کے چہرے پر پل کے پل میں فکرمندی کے تاثرات ابھر آئے تب ہی وہ قدرے اداسی سے بولیں۔

”ہاں بیٹے، تمہارے پاپا کی طرح اس بے چاری کی بھی مجبوری تھی، کیونکہ پچھلے ہی دنوں تمہارے پھوپھا کا بہت زبردست ایکسیڈنٹ ہوا ہے، بہت مشکل سے جان بچی ہے اس کی۔ اب وہ بے چاری اسے سنبھالے یا یہاں بھتیجے کی خوشیاں مناتی پھرے، بس اسی لئے وہ خود نہیں آ سکی اور اپنی جگہ پر شیزا بیٹی کو یہاں بھیج دیا، چل اب تو جلدی سے تیاری پکڑ لے، تاکہ کل صبح جلدی ہی سفر کے لئے نکل سکو۔“

اس کے استفہامیہ انداز پر وہ خاصی تفصیل سے گویا ہوئی تھیں۔ جواب میں ایک مرتبہ پھر اشعر نے فرمانبرداری سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”اشعر بھائی، آپ نے تو کہا تھا کہ بڑی ممانی اور بڑے ماموں، عاشر بھیا کی شادی کے بعد پاکستان آ جائیں گے مگر وہ تو آئے نہیں، الٹا آپ خود ان کے پاس جانے کی تیاری پکڑ رہے ہیں۔“

شیزا جو بظاہر وہاں بیٹھی کتاب کے مطالعے میں گم تھی، مگر اس کا تمام دھیان ادھر ہی تھا تب ہی اچانک کتاب سے توجہ ہٹاتے ہوئے اس نے اشعر سے سوال کیا۔ تو وہ چونک کر اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

”ہاں پاپا نے کہا تو یہی تھا مگر اب وہ نہیں آ سکے ہیں تو ضرور کوئی وجہ ہو گی۔ ایکچولی بہت دنوں سے میرا ان سے کانٹیکٹ نہیں ہو پا رہا ہے۔ مما سے بات ہوئی تھی وہ بتا رہی تھیں کہ پاپا شہر سے باہر ہیں۔ بہرحال، تم اپنی تیاری مکمل کر لو کل ہم لوگ اپنی سواری پر ذرا جلدی نکل پڑیں گے۔“

اس کے سوال کا تفصیلی جواب دے کر وہ ابھی فارغ ہوا ہی تھا کہ تمکین اپنے تیار شدہ لوازمات کی ٹرالی گھسیٹتے ہوئے وہیں چلی آئی تو اشعر اسے دیکھ کر جیسے کھل اٹھا۔

”واہ..... دیکھا دادا جی! اسے کہتے ہیں دل سے دل کو راہ ہونا، آئی مین، ابھی میرا دل کافی کو چاہ رہا تھا اور دیکھ لیجئے میرے کہے بغیر، میری

نصف بہتر میرے لئے کافی بنالائیں۔''

اپنے چہکتے ہوئے لہجے میں وہ بولا تھا، جواب میں داداجی اور دادی ماں ہنس پڑے، جبکہ شیزا پہلو بدل کر رہ گئی۔

''اشعر، یہ کباب کھا کر بتاؤ کیسے بنے ہیں؟ تمہیں کباب پسند ہیں ناں؟''

تمکین اس کی تعریف پر بے پناہ خوش ہوتے ہوئے داداجی اور دادی ماں کے ساتھ شیزا کو بھی کباب اور پکوڑوں کی پلیٹ کے ساتھ چائے کے مگ تھماتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوئی، اور مسرور لہجے میں کہا تو اشعر نے ہاتھ بڑھا کر ایک کباب پلیٹ سے اٹھالیا، پھر ذرا چکھتے ہی بُرا سا منہ بنا کر بولا۔

''یہ کباب ہے؟ ایسے کباب بناتی ہو تم؟''

وہ منہ بگاڑ کر بولا تو تمکین مایوس ہو کر استفہامیہ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے پریشانی سے بولی

''کیوں کیا ہوا تمہیں پسند نہیں آئے کیا؟''

اشعر کے چہرے کے بگڑے زاویے دیکھ کر اس کا سارا خون خشک ہوگیا۔ جواب میں وہ داداجی کو آنکھ مارتے ہوئے کھلکھلا کر ہنس پڑا، پھر باقی کباب منہ میں ڈالتے ہوئے شوخ نگاہیں تمکین کے پریشان چہرے پر جما کر بولا۔

''بے وقوف لڑکی، مذاق کر رہا تھا۔ بہت مزے کے کباب بنائے ہیں تم نے۔ عین میری پسند کے مطابق۔'' اس کے ریلیکس انداز پر جہاں تمکین کی جان میں جان آئی وہیں شیزا اس کے چہرے سے نگاہیں چرا کر چائے کی چسکیاں بھرنے لگی۔

''داداجی، دادی ماں پلیز ایکسکیوز می، مجھے تمکین سے اک ضروری بات کرنی ہے اگر آپ کی اجازت ہو اور آپ ظالم سماج کا کردار ادا نہ کریں تو میں اسے اپنے کمرے میں لے جاؤں؟'' نہایت بولڈ انداز میں اس نے کہا تھا۔ داداجی اور دادی ماں چونکہ دونوں ہی اس کی شرارتوں سے بخوبی واقف تھے تب ہی ایک مرتبہ پھر اس کی بات پر ہنستے ہوئے اثبات میں سر ہلا کر اجازت دے ڈالی۔ تو وہ صوفے سے اٹھتے اٹھتے ایک اور کباب منہ میں ڈال کر تمکین کا ہاتھ تھامتے ہوئے فوراً وہاں سے کھسک گیا۔ جبکہ تمکین ایک مرتبہ پھر اس کے انداز پر زچ ہو کر استفہامیہ نگاہوں سے اسے تک رہی تھی کہ جس کی کوئی کل سیدھی نہیں تھی۔

''شعری کیا کر رہے ہو تم۔''

اشعر نے اپنے کمرے میں پہنچ کر جونہی اسے بیڈ پر بٹھایا وہ پوچھ بیٹھی۔ جواب میں وہ نرمی سے مسکراتے ہوئے اپنی وارڈروب کی طرف بڑھا پھر واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں بہت نفیس اور خوب صورت سا جیولری بکس تھا تمکین خاصی حیرانگی سے اسے دیکھ رہی تھی، جو اس وقت نہ جانے کیا کیا کرتا پھر رہا تھا۔

پھر جیولری بکس کے ساتھ اپنے سفری بیگ کی زپ بند کر کے وہ نپے تلے قدم اٹھاتے ہوئے اس کے پاس آیا اور نیچے زمین پر ہی اکڑوں بیٹھ کر تمکین کا ہاتھ تھامتے ہوئے عقیدت سے بولا۔

''سویٹ کزن، میں سارے گھر والوں کے لئے قیمتی گفٹس لے کر آیا تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ تمہیں بھول جاتا۔تم تو ایک دم پگلی ہو میں نے کہا کہ تمہارے لئے گفٹ لانا بھول گیا اور تم تھوڑی دیر خفا رہ کر مان بھی گئیں، کیوں کرتی ہو ایسے تمی؟ کیا کوئی اپنے آپ کو بھی بھول سکتا ہے؟ تم کیا سمجھتی ہو محبت کرنا صرف تمہیں ہی آتا ہے، میرے لئے اپنا کمرہ دان کر کے، میری پسند کے مختلف کھانے مختلف پکوان بنا کر، میری خوشی کا ہر طرح سے خیال رکھ کر تم یہ سمجھتی ہو کہ میں بے پرواہ، بے نیاز ہوں؟ ہرگز نہیں بس وہ کیا ہے کہ تمہیں ستانے، جلانے کی جو عادت بچپن سے پڑ گئی ہے وہ اب چھوٹ نہیں سکتی۔کیا سمجھیں؟''

ہمیشہ اسے تنگ کرنے والا اشعر اس وقت اپنی خوبصورت آنکھوں میں اس کے لئے ڈھیروں محبت لئے نہایت سنجیدگی سے کہہ رہا تھا اور وہ حیرانی سے ٹکر ٹکر اسے دیکھے جا رہی تھی۔

''میں کل ایبٹ آباد جا رہا ہوں تمی، پھر وہیں سے لندن کے لئے روانہ ہو جاؤں گا۔دوبارہ تو اب تمہیں ہمیشہ کے لئے اپنے ساتھ لے جانے کے لئے ہی آؤں گا، تو یہ اتنے بہت سارے دن جو ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ ہنسی خوشی بتائے، بہت یاد آئیں گے مجھے، اس تمام وقت میں اگر تمہیں مجھ سے کوئی شکوہ ہوا ہو، یا میری کوئی بات بری لگی ہو تو پلیز مجھے ابھی بتا دو، تا کہ میں کان پکڑ کر تم سے معذرت کرسکوں؟''

کوئی اس وقت تمکین کے دل سے پوچھتا کہ اسے وہ اس وقت کتنا پیارا لگ رہا تھا۔تب ہی اس نے آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے چھڑایا اور پلکوں پر لڑھکتے آنسو ہاتھوں میں جذب کرتے ہوئے نم لہجے میں بولی۔

''کچھ دن اور رک جاؤ ناں شعری..... اتنی جلدی کیوں جا رہے ہو، ابھی تو میں نے تمہیں اپنے شہر کی سیر کروانی تھی اور اک یادگار ڈنر کرنا تھا تمہارے ساتھ۔''

بے حد دل کی گرفتگی سے اس نے کہا تو اشعر بھی رخ پھیر کر، بھری بھری آنکھوں میں پھسلنے کو بے تاب آنسو انگلی کی پور پر چنتے ہوئے، پھر قدرے بشاش لہجے میں بولا۔

''کچھ دن اور رکنے سے کیا ہوگا تمی..... اب تو بس دعا کرو کہ میں پاپا کو منا کر ہمیشہ کے لئے یہیں اس وطن میں لوٹ آؤں اور پھر ہمارے دلوں سے ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہونے کا خوف مٹ جائے، بہر حال ڈنر کی فکر تم مت کرو، آج ہی ہم باہر چلیں گے اور سب کے ساتھ مل کر یادگار ڈنر کریں گے۔اوکے۔''

پھر سے اس کا ہاتھ تھام کر وہ اس کی نم آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا تو تمکین نے خوش ہو کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

''گڈ، یہ ہوئی ناں بات۔چلو اب جلدی سے یہ سیٹ دیکھو، کیسا ہے؟''

خوبصورت نگینوں کا جگمگاتا نیکلس سیٹ، وہ ہاتھ میں لے کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا تو تمی نے سیٹ ہاتھ میں لے کر سرسری سی ایک نظر ڈالی، پھر ناپسندیدہ انداز میں بولی۔

''ہاں رکھ دو ٹھیک ہے بس، ہاں اگر یہ وائٹ کلر کی بجائے گولڈن ہوتا تو زیادہ اچھا لگتا۔''

اس کے ناپسندیدگی کے اظہار پر اشعر کا کھلتا چہرہ ایک دم مرجھا گیا پھر جوں ہی اس کی نظر اس کے احمریں لبوں پر رقصاں مسحور کن مسکراہٹ پر پڑی وہ اس کی شرارت سمجھتے ہوئے اسے خفگی سے گھور کر رہ گیا جبکہ تمکین ابھی تھوڑی دیر پہلے والا اپنا بدلہ چکاتے ہوئے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''چلو، تمہیں یہ سیٹ پسند نہیں ہے ناں؟ کوئی بات نہیں، میں شیزا کو دے دیتا ہوں، تمہیں وہاں سے تمہاری پسند کا گولڈن سیٹ ہی بھیج دوں گا۔''

اس کی شرارت سمجھتے ہوئے وہ اسے ہی ستانے کو بولا تو تمکین نے جھپٹ کر سیٹ اس سے چھین لیا اور غصے سے بولی۔

''میں تمہارا سر نہ پھاڑ دوں گی جو اگر تم یہ سیٹ میرے بجائے کسی اور کو دو گے تو؟ کل کو میری محبت بھی کسی اور کی جھولی میں ڈال دینا۔''

وہ واقعی بری طرح سلگ گئی تھی۔اشعر نے دلچسپی سے اسے دیکھتے ہوئے کس قدر لطف لیا۔

''اشعر بڑی ماں کہہ رہی ہیں کہ اگر تم دونوں کی پرائیویٹ باتیں ختم ہو گئی ہوں تو آ کر ان کی بات سن لو۔''

وہ ابھی اسے نہ جانے کیا کہتا کہ اسی پل شیزا وہاں چلی آئی اور وہ اس کی موجودگی میں ،بس محبت سے تمکین کا گال تھپتھپاتے ہوئے کمرے سے نکل گیا تو شیزا ستائشی نگاہیں خوبصورت نیکلس سیٹ پر جما کر وہیں تمکین کے پاس بیٹھ گئی۔ پھر اس کے ہاتھوں سے سیٹ لے کر دیدہ زیب نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''ویری پریٹی اشعر نے دیا ہے کیا؟''

''ہاں۔'' تمکین نے مختصراً جواب دینے میں ہی عافیت جانی وگرنہ وہ بال کی کھال ادھیڑنے بیٹھ جاتی۔

''بہت خوبصورت ہے اشعر سے بھی زیادہ۔''

عجیب سا لہجہ تھا اس کا، تمکین نے فقط ایک لمحے کے لئے چونک کر اسے دیکھا، پھر نیکلس سیٹ اس کے ہاتھ سے لے کر واپس بکس میں رکھتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئی، تو شیزا کی روح جیسے ایک مرتبہ پھر بے چین سی ہو گئی بالکل ویسی ہی بے قراری اس کے اندر اتر گئی کہ جیسی اشعر کو پہلی مرتبہ دیکھنے کے بعد اس نے محسوس کی تھی، اور جس پر اس کا کوئی اختیار نہیں تھا۔آج تک اسے کوئی لڑکا متاثر نہیں کر سکا تھا اور نہ ہی اس نے کسی کو اس نظر سے دیکھا تھا۔مگر اشعر کی شاندار پرسنالٹی نے نہ جانے کیا سحر پھونک ڈالا تھا اس کی آنکھوں میں کہ وہ پہلے ہی دن سے اس کے بارے میں سوچنے لگی تھی، اور اب تو گزرتے ہر دن کے ساتھ یہ سوچیں بڑھتی ہی جا رہی تھیں اس وقت بھی اس کے اندر طوفان اٹھ رہے تھے اور وہ سوچ رہی تھی کہ!

''تم دیکھتی جاؤ مس تمکین احمد صاحبہ، کہ میں اشعر کو کیسے تم سے دور اور اپنے بے حد قریب کرتی ہوں۔''

☆☆☆

''ازمیر تم نے صالحہ بھابھی پر چند ہی دنوں میں ایسا کون سا منتر پھونک ڈالا ہے کہ جب دیکھو ان کے لبوں پر تمہارے ہی قصیدے ہوتے ہیں۔''

وہ خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا جب اریشہ نے فریش لہجے میں اس سے کہا۔

''کیوں......کیا ہوا......تم سے کیا کہہ دیا ہے انہوں نے۔''

پل کے پل سامنے سڑک سے نگاہیں ہٹا کر اسے دیکھتے ہوئے وہ قطعی لاعلمی سے بولا تو اریشہ نے خوشی خوشی اسے اطلاعات پہنچائیں اور مسرور لہجے میں بولی۔

''مجھ سے تو انہوں نے کچھ نہیں کہا، البتہ کل جب ہال میں سب ہی لوگ اکھٹے بیٹھے تھے تو وہ دادی اماں سے کہہ رہی تھیں کہ مجھے اس پورے گھر میں ازمیر بہت اچھا لگتا ہے، اور یہ بھی کہ ارسلان بھائی انہیں بتا رہے تھے کہ تم بے حد ذہین اور ٹیلنٹڈ ہو اور تو اور تمہاری ایم اے فرسٹ کلاس ڈگری پر تو ان کی خوشی اور مسرت دیکھنے کے لائق تھی۔''

اس کے سادہ سے پُرخلوص لہجے میں چھپی مسرت وہ بخوبی محسوس کر سکتا تھا، تب ہی دھیمے سے مسکراتے ہوئے کچھ جتانے والے انداز میں اس کی طرف دیکھا تو وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

پھر جس وقت وہ لوگ سینما پہنچے تو ارسلان بھیا اور صالحہ بھابھی کے ساتھ ساتھ، ماہم، فائقہ، وغیرہ سب وہاں پہنچ چکی تھیں۔ جبکہ کاشف بھی عدیلہ، دانیہ اور میمونہ وغیرہ کو لے کر آل ریڈی وہاں موجود تھا۔

''ازمیر! بہت دیر کر دی تم نے یہاں پہنچنے میں، راستے میں تو سب خیریت تھی ناں؟''

اسے سامنے آتا دیکھ کر صالحہ بھابھی شوخی سے گویا ہوئیں اور ان کے اس مبہم سوال پر وہاں کھڑے سب لوگ بے ساختہ کھلکھلا اٹھے۔ جبکہ ازمیر بس ذرا سا مسکرا کر اریشہ کے سرخ چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

''اب چلیں۔''

اگلے ہی پل اسے محبت پاش نگاہوں سے دیکھتے ہوئے وہ بولیں تو ازمیر نے جھٹ اثبات میں سر ہلا دیا کہ پہلے ہی اسے سب کے بلاوجہ کھلکھلانے کی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

''یار یہ ازمیر بھائی کو ساتھ چلنے کیلئے کس نے کہہ دیا؟ اب یہاں کوئی دوست مل گئی اور اس نے محترمہ کے بارے میں پوچھ لیا تو ہم کیا جواب دیں گے؟''

ماہم نے جان بوجھ کر پیچھے رک کر فائقہ کے کان میں باآواز بلند سرگوشی کی، جسے اس کے پیچھے آتے ازمیر نے بخوبی سن لیا، جب ہی پل کے پل میں اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا اور مارے ضبط کے اس نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں جب کہ اریشہ مارے دکھ کے وہیں گڑ کر رہ گئی۔ وہ ازمیر کو جس احساس سے چھٹکارا دلانا چاہتی تھی نہ جانے کیوں ماہم، بار بار اسے اسی احساس کے غم میں مبتلا کیے رکھنا چاہ رہی تھی۔

اب چونکہ ماہم کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ لہٰذا اس نے مسکرا کر ادائے بے نیازی سے قدم آگے بڑھا دیئے۔

جبکہ ازمیر وہیں رک گیا۔ مارے دکھ کے اس کی آنکھیں دھواں دھواں ہو رہی تھیں اور وہ واپس جانے کو پلٹ گیا۔ تب ہی اریشہ بھاگ کر اس کے برابر پہنچی، اور ڈبڈباتی آنکھوں سے اس کا سرخ چہرہ دیکھتے ہوئے اس کا مضبوط ہاتھ اپنے نازک سرد ہاتھ میں تھام لیا۔

''میں نے کبھی خود کو خوبصورت نہیں سمجھا ازمیر...... مگر تمہارا ساتھ مجھے خوبصورت بنا دیتا ہے۔ کیا تم مجھے یہ خوبصورتی دان کرو گے؟''
بھیگے ہوئے نم لہجے میں ندیدوں کی طرح اسے دیکھتے ہوئے وہ بڑبڑائی تھی مگر ازمیر نے اس کے خوبصورت الفاظ کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑا لیا۔

''مجھے یہ فارمل باتیں اٹریکٹ نہیں کرتیں اریشہ۔''
بہت خشک لہجے میں اس نے کہا تھا، اریشہ جیسے گویا تڑپ کر رہ گئی تب ہی اس کے سامنے آکر اس کی بھیگی ہوئی پلکیں خود اپنے ہاتھوں سے صاف کرتے ہوئے بولی۔

''تم خود کو میری نگاہ سے کیوں نہیں دیکھتے ازمیر، کبھی ان آنکھوں میں اپنا عکس دیکھو تو تمہیں پتہ چلے کہ تم کتنے خوبصورت ہو؟'' وہ اس وقت خلوص دل سے کہہ رہی تھی مگر ازمیر کو لگا کہ جیسے وہ اسے دکھ سے بچانے کیلئے یونہی رسمی لفظوں میں بہلانا چاہتی ہے۔

اور چاہے جو کچھ بھی تھا وہ کم از کم ہوش میں رہتے ہوئے اپنی وجہ سے اس پیاری سی لڑکی کی ساری خوشی ملیامیٹ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جب ہی دھیمے سے سر ہلاتے ہوئے اس نے بہت توجہ سے اریشہ کے بے دردی سے بکھرتے آنسوؤں کو دیکھا اور اپنی جینز کی پاکٹ سے رومال نکال کر تمام قیمتی موتیوں کو اپنے رومال سے چن لیا، پھر افسردہ سی مسکراہٹ بمشکل لبوں پر پھیلا کر قدم آگے کی سمت بڑھا دیئے تو روہانسی سی کیفیت میں گھری اریشہ خان بھرپور مسرت سے کھل اٹھی تب ہی دل سے مسکراتے ہوئے لپک کر وہ اس کے برابر پہنچ گئی۔

اور پھر جس وقت وہ لوگ اپنی اپنی سیٹ تک پہنچے، فلم تقریباً شروع ہونے والی تھی۔ ازمیر آگے بڑھ چکا تھا، جبکہ اریشہ ماہم لوگوں کی سیٹ کے سامنے سے گزر کر اپنی سیٹ کی طرف بڑھنے لگی تو ماہم نے جان بوجھ کر پاؤں اس کے سامنے پھیلا دیا جواب میں وہ لڑکھڑا کر گرنے ہی والی تھی کہ ازمیر نے پلٹ کر اپنا مضبوط ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے اسے تھام لیا، پھر نفرت سے ماہم کی طرف دیکھتے ہوئے ترش انداز میں بولا۔

''بیٹھنے کا سلیقہ سیکھئے مس ماہم، وگرنہ ایسا نہ ہو کہ دوسروں کو گراتے گراتے ایک دن آپ کو خود زمین چاٹنی پڑ جائے۔''
اسے غصہ بہت کم آتا تھا، مگر جب آتا تھا تو وہ خود اپنے آپ پر سے اپنا اختیار کھو بیٹھتا تھا۔ تب ہی اس وقت بھی بمشکل خود کو کنٹرول کر کے وہ ترشی سے بولا، تو ماہم نے بے نیازی سے سر جھٹک کر اس کی بات کو گویا ہوا میں اڑا دیا، جبکہ اریشہ نے ازمیر کا بازو تھام کر اسے آگے کی طرف دھکیل دیا۔

پھر جس وقت اس نے سکون سے اپنی سیٹ پر بیٹھ کر نگاہیں سامنے سکرین پر مرکوز کیں، صلح جو اریشہ نے گویا سکون کا سانس لیا۔
لوگ کیوں کہتے ہیں کہ یہ چہرہ خوبصورت نہیں کیا کمی ہے بھلا اس میں؟ غلافی چمکدار سیاہ آنکھیں، کشادہ پیشانی، اوپر کو اٹھی ہوئی تیکھی مغرور ناک، اور گندم کے خوشوں کی مانند دمکتا گندمی رنگ،، کمی کہاں تھی بھلا؟ اور اگر کہیں چھپی ہوئی تھی بھی تو اسے نظر کیوں نہیں آرہی تھی۔
کیوں وہ اس ایک چہرے کے لئے پاگل ہوئے جا رہی تھی؟
ازمیر بظاہر فلم میں منہمک تھا مگر اریشہ کی بے قرار نگاہیں اسے بخوبی اپنے چہرے پر جمی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ تب ہی اچانک سامنے

اسکرین سے نگاہ ہٹا کر پل دو پل کے لئے اس نے اریشہ کی سمت نگاہ کی تو وہ چونک کر رہ گیا وہ عجیب پاگلوں کی طرح دیوانہ وار پیاسے انداز میں اسے مسلسل دیکھ رہی تھی۔

''اریشہ......آر یو......اوکے؟''

قدرے پریشانی سے اس نے پوچھا تھا۔ جواب میں اریشہ اس کے کندھے پر ذرا سا سر ٹکاتے ہوئے سسک پڑی۔ اب وہ اسے کیا بتاتی کہ وہ اوکے نہیں ہے، بلکہ پاگل پن کی حد تک جا پہنچی ہے اس کی محبت میں، اور وہ بے خبر اس کے آنسو پونچھ کر، اسے سلی گرل کہتے ہوئے پھر سے فلم کی طرف متوجہ ہو گیا۔

☆☆☆

''انجشاء کیا سوچ رہی ہو بیٹی اور یہ تم نے کھانا واپس کیوں بھجوا دیا۔''

وہ اپنے کمرے میں گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے بیٹھی مسلسل عدنان رؤف، اریج اور اپنے نئے بزنس کے بارے میں سوچ رہی تھی جب ہلکی سی آہٹ کے ساتھ دروازہ کھول کر دادا جی اس کے کمرے میں چلے آئے اور وہ جو سوچوں کے گرداب میں دھنسی تھی، چونک کر سر اٹھاتے ہوئے انہیں دیکھنے لگی، جو اس کے ماں باپ کے بعد، ماں باپ بن کر ہی اس کا خیال رکھ رہے تھے، اور اس وقت بھی اس کے کھانا نہ کھانے پر پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ تب وہ بے حد شرمندگی محسوس کرتے ہوئے بیڈ پر سے اٹھی پھر ان کا ہاتھ تھام کر انہیں بیڈ پر لا بٹھایا اور خود ان کی گود میں سر رکھ کر نہایت پر سکون لہجے میں بولی۔

''میں نے آج اریج صاحب کے ساتھ دوپہر میں بہت شاندار لنچ کر لیا تھا بابا، بس اسی لئے بھوک نہیں تھی تب ہی میں نے منع کر دیا پر آپ تو چھوٹی چھوٹی بات پر پریشان ہو جاتے ہیں جیسے میں کوئی دودھ پیتی بچی ہوں اور اپنا خیال خود نہیں رکھ سکتی ہوں۔''

وہ ان سے یونہی لاڈ سے مخاطب ہوئی تھی اور اس کا یہ بچکانہ انداز ہمیشہ انہیں مسکرانے پر مجبور کر دیتا تھا تب ہی وہ شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

''بچی ہی تو ہو تم......کہاں خیال رکھنا آتا ہے تمہیں اپنا، تب تو اتنا فکر مند رہتا ہوں تمہارے لئے۔''

بڑھاپے اور کمزوری کے باعث ان کے لاغر ہاتھ اور لہجہ کپکپا رہا تھا۔ انجشاء نے ان کی محبت پر سرشار ہو کر مسکراتے ہوئے محبت سے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا پھر قدرے مسرور لہجے میں بولی۔

''اب آپ میرے لئے فکر مند ہونا چھوڑ دیجیے بابا، کیونکہ میں نے اپنی منزل کا راستہ تلاش کر لیا ہے، اور آپ دیکھئے گا اب بہت جلد آپ کی گڑیا کی تقدیر خود اس کی مٹھی میں ہو گی۔''

نہایت پُرعزم لہجہ تھا اس کا، جواب میں دادا جی اس کی طرف دیکھتے ہوئے اطمینان سے مسکرا دیئے۔

اگلے روز وہ جیسے ہی اریج کے آفس جانے کے لئے گھر سے نکلی راستے میں ہی عدنان رؤف سے مڈ بھیڑ ہو گئی۔ وہ چونکہ پیدل ہی چل رہی

تھی اور عدنان اپنی گاڑی پر تھا۔ لہٰذا اس نے نہایت لوفرانہ انداز میں گاڑی کو ٹرن دے کر عین انجشاء کے سامنے روک دیا، پھر گاڑی سے نکل کر چپ چاپ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''اس بدتمیزی کا مطلب......''

فائل سینے سے لگا کر وہ نہایت سرد مہری سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولی تو اک کروفر بھری طنزیہ مسکراہٹ عدنان رؤف کے لبوں پر پھیل گئی، اور وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر، گاڑی سے ٹیک لگائے ہوئے خاصی دلچسپی سے اس کی سمت دیکھتے ہوئے بولا۔

''دوسروں کے ساتھ بیٹھ کر خود کھانا کھالینا، ان سے لفٹ لینا، وہ تو بدتمیزی نہیں، اور میں آپ کو خود اپنے ساتھ بیٹھنے کی آفر کرتا ہوں تو یہ بدتمیزی ہے واہ...... کیا بات ہے آپ کی؟''

''ان میں اور تم میں بہت فرق ہے عدنان۔''

پہلی مرتبہ وہ اس کے کسی جملے پر ایموشنل ہوئی تھی، تب ہی شدت سے چلا کر بولی تو سامنے کھڑے اس ضدی سے خوبرو لڑکے نے گویا بے حد لطف لیا تب ہی مزے سے مسکراتے ہوئے بولا۔

''وہی تو میں جاننا چاہتا ہوں مس شاہ، کہ ان میں اور مجھ میں کیا فرق ہے، جو آپ کو ان پر اتنا اعتماد ہے کہ آپ خود ان سے لفٹ مانگتی ہیں، اور میں جو نہ جانے کب سے آپ کے پیچھے پیچھے پھر رہا ہوں میری طرف آپ دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرتیں۔''

کتنا خوبرو، اور قابل محبت تھا یہ شخص؟ مگر اس کی حرکتیں کسی بھی شریف لڑکی کے دل میں اس کا کوئی بھی مقام بنانے میں سب سے بڑی رکاوٹ تھیں۔ تب ہی انجشاء نے بھی تماشہ بننے کے ڈر سے بنا اس کے سوال کا کوئی جواب دیئے قدم آگے بڑھا دیئے تو وہ گویا غصے سے پاگل ہی ہو گیا۔ تب ہی لپک کر فرلانگ بھر کر فاصلہ کاٹا اور نہایت درشتگی سے اس کی کلائی تھام کر غصے میں بولا۔

''میں نے کچھ پوچھا ہے آپ سے مس شاہ؟ جب تک آپ میرے سوال کا جواب نہیں دیتیں، میں آج آپ کو یہاں سے جانے نہیں دوں گا۔''

نہایت ضدی انداز تھا اس کا۔ انجشاء نے قدرے بے بسی سے اپنے اردگرد متوجہ ہوتے لوگوں کی طرف دیکھا پھر لب بھینچ کر غصے میں بولی۔

''میں تم سے الجھنا نہیں چاہتی بہتر ہوگا کہ تم میرا راستہ چھوڑ دو ورنہ......''

''ورنہ کیا میڈم...... ورنہ کیا......؟''

اس کی بات کاٹ کر وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا تھا۔

''کیا کر لیں گی آپ؟ ہاں کیا بگاڑ لیں گی میرا؟ میرے باپ کو میری شکایت لگا دیں گی۔ تو نو پرابلم، آیئے ہمارے گھر کے دروازے چوبیس گھنٹے کھلے ہیں آپ کے لئے مزید کیا کریں گی آپ، بولئے بتایئے مجھے......؟''

اس کے انداز میں اس کا ضدی پن بہت واضح تھا انجشاء نے فرسٹ ٹائم خود کو اس کے سامنے بے بس تصور کیا۔تب ہی اپنی کلائی اس کی گرفت سے چھڑانے کی بھرپور کوشش کرتے ہوئے بولی۔

''تم کیوں ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئے ہو میرے۔ جب میں تمہارے منہ نہیں لگنا چاہتی تو کیوں بار بار سامنا کرتے ہو میرا۔ کیوں راہ میں کھڑے ہوتے ہو میری؟؟''

اس کے بے بس انداز پر پہلی مرتبہ عدنان رؤف کھل کر ہنسا۔ پھر ہونٹ سکیٹر کر اس کی بے بسی سے لطف اٹھاتے ہوئے بولا۔

''اپنا دل آ گیا ہے تم پر، مگر تم ہو کہ میری محبت کو کسی خاطر میں ہی نہیں لا رہی ہو، اب تم ہی بتاؤ میں اور کیا کروں؟''

آرام سے اس کا بازو چھوڑ کر اس نے خود کو معصوم بنانے کی کوشش کی، جواب میں انجشاء نے بےزاری سے ہاتھ پر بندھی رسٹ واچ پر سرسری سی ایک نظر ڈالی اور قدرے پریشان لہجے میں بولی۔

''مجھے آفس کے لئے دیر ہو رہی ہے، پلیز راستہ چھوڑو میرا۔''

''اور اگر نہ چھوڑوں تو؟''

جواب میں انجشاء نے مدد کے لئے ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو وہ ہنس پڑا پھر دائیں ہاتھ سے اپنی پیشانی پر بکھرے بال سمیٹتے ہوئے بولا۔

''پرابلم کیا ہے تمہارا؟ لائین پر کیوں نہیں آجاتی ہو تم؟ اور کتنے ناز اٹھواؤ گی اب مجھ سے؟'' کس قدر گھٹیا انداز تھا۔ اس کا۔ انجشاء دل ہی دل میں سلگ کر رہ گئی۔ تاہم چہرے کو اس نے پرسکون ہی رکھا اور اسی طرح ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی۔

''میرے بارے میں آپ کا نظریہ غلط ہے مسٹر عدنان۔ یہ بات اب میں بار بار دہرانا پسند نہیں کروں گی، بہر حال بہتر ہوگا کہ آپ اپنا قیمتی وقت کہیں اور کسی کوشش میں صرف کریں تاکہ کم از کم شکست کا بوجھ تو نہ اٹھانا پڑے آپ کو، کیونکہ میں آپ کو آل ریڈی بتا چکی ہوں کہ میں میرڈ ہوں۔''

نہایت سکون کے ساتھ اپنی بات مکمل کر کے اُس نے عدنان کے چہرے پر بھرپور نظر ڈالی پھر اعتماد کے ساتھ قدم آگے بڑھا دیئے کہ اسے دور سے ہی اریج کی گاڑی آتی ہوئی دکھائی دے گئی تھی۔ جبکہ عدنان کو ایک مرتبہ پھر اس کے پرسکون چہرے نے بےقرار کر ڈالا، اور وہ سلگتی نگاہوں سے اسے دور تک جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

☆☆☆

''ہیلو عدنان، کتنے دنوں کے بعد ملے ہو، کہاں تھے تم اتنے دنوں سے......؟''

اس روز وہ اپنے کسی ضروری کام کے سلسلے میں مارکیٹ کی طرف آیا تو اچانک ہی اپنی سابقہ محبوبہ درناشہ سے ٹکراؤ ہو گیا اس کا، اور اسے مل کر جہاں عدنان کا دل خوشی سے دھڑکا تھا وہیں وہ بھی بہت پُرجوش اور خوش دکھائی دے رہی تھی۔ تب ہی اسے دیکھتے ہوئے بلند آواز میں چہکی تو عدنان بھی مصافحے کے انداز میں اس کا نازک سا ہاتھ تھام کر سرشار لہجے میں بولا۔

''شہر سے باہر تھا یار! بزنس کے سلسلے میں جانا پڑ گیا، کیوں شاہد نے بتایا نہیں تمہیں......؟'' نہایت صفائی سے جھوٹ بولتے ہوئے اس نے نشاء پر بھرپور نظر ڈالی تو وہ شاہد کے بیان پر یقین کی مہر ثبت کرتے ہوئے مسکرا دی پھر اسی انداز میں بولی۔

''نہیں، تمہارے دوست نے بتایا تو تھا، مگر تم اتنے دن لگا دو گے یہ نہیں کہا تھا، اور آج بھی دیکھو سرِ راہ میں تم سے ٹکرا گئی ورنہ تو تم آج بھی نہ ملتے۔''

اس کے پُرخلوص لہجے میں ہلکا سا شکوہ چھپا ہوا تھا۔ جبکہ عدنان اس کے اس قدر بدل جانے پر اپنی حیرت پر قابو پانے میں ناکام رہا، تب ہی اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

''کسی اچھی سی جگہ چل کر نہ بیٹھیں نشاء، یہاں تو کھل کر بات کرنا قطعی ممکن نہیں۔''

''ییس وائے ناٹ۔''

وہ دلکشی سے مسکراتے ہوئے فوراً بولی تھی اور اگلے ہی پل اس کی ہمراہی میں اس کے ساتھ وہاں سے چل بھی پڑی۔

تقریباً پانچ دس منٹ میں ہی وہ قریبی ریسٹوران میں بیٹھے تھے۔ تب عدنان نے کولڈ ڈرنک آرڈر کرتے ہوئے بہت توجہ سے اس کے گلاب کی مانند کھلے کھلے چہرے پر نگاہیں ٹکا کر حیرانی بھرے لہجے میں پوچھا۔

''نشاء کیا، تمہیں نہیں لگتا کہ تم بہت بدل گئی ہو یونیورسٹی میں تو تم ایسی نہیں تھیں۔''

''اچھا۔'' اس کے استفہامیہ انداز پر نشاء نے حسبِ عادت بے ساختہ سا قہقہہ لگایا تھا پھر اگلے ہی پل اپنی ہنسی پر قابو پا کر پُرلطف انداز میں بولی۔

''کیوں تم نے کیا تبدیلی محسوس کرلی مجھ میں، کچھ مجھے بھی تو پتہ چلے؟''

ایک ادا سے اپنے سلکی بال پیچھے دھکیل کر اس نے خاصی بے نیازی سے کہا تھا۔ عدنان فقط اسے دیکھ کر رہ گیا پھر قدرے فری انداز میں بولا۔

''دیکھو ناں تم، پہلے تم بہت روڈ ہوا کرتی تھیں، کسی سے سیدھے منہ بات تک کرنا پسند نہیں تھا تمہیں، خود مجھے کتنی مرتبہ اگنور کیا تم نے آج خود ہی ملنے کے لئے بے قرار ہوگئی، یہ کیا سرپرائز ہے یار؟''

''کوئی سرپرائز نہیں ہے، بس وقت کے ساتھ ساتھ انسان بدل جاتا ہے، اس میں حیرت کی تو کوئی بات نہیں۔''

''ہاں کہہ تو تم بھی ٹھیک ہی رہی ہو بہرحال دیر آید درست آید۔''

نشاء کا ہاتھ بدستور اس کے ہاتھ میں تھا، تب ہی اس نے فوراً بجث سمیٹ دی تو در نشاء پھر سے ہنس پڑی۔

اور اسی وقت انجشاء نے اریج احمر کے ہمراہ ریسٹوران میں قدم رکھا تھا، وہ لوگ چونکہ درمیان میں بیٹھے تھے تب ہی انجشاء کی نظر سیدھی ان پر جا پڑی تھی اور اس نے خاصی ملامتی نگاہوں سے بھنورہ بنے عدنان کی طرف دیکھا جو درنشاء کے ہاتھ کو لبوں تک لے جاتے ہوئے اچانک ہی

ٹھٹھک کر رک گیا تھا، اور اب خاصی شرمندگی محسوس کر رہا تھا، مگر انجشاء نے پہلی نظر کے بعد ہی قدم آگے بڑھا دیے تھے اور عدنان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا دل یوں پہلی مرتبہ کسی لڑکی کے سامنے اپنی اصلیت کھل جانے پر بے کل و بے قرار کیوں ہو گیا تھا۔

☆☆☆

''چلو ناں تمی......اب اور کتنی دیر لگاؤ گی تم؟''

اشعر کو چونکہ کل صبح ہی ایبٹ آباد کے لئے نکل جانا تھا، لہٰذا آج رات اس کا پروگرام گھر کے سبھی لوگوں کے ساتھ مل کر شاندار سا ڈنر کرنے کا تھا اور اب اس سلسلے میں، جبکہ گھر کے سبھی لوگ وقت سے پہلے ہی تیار ہو چکے تھے، تمکین مسلسل پچھلے دو گھنٹوں سے اپنے کمرے میں بند وقفے وقفے سے آنسو بہائے جا رہی تھی۔ اشعر سے بچھڑنے کا دکھ اسے نڈھال کئے ہوئے تھا کیسے اس کی ہمراہی میں دو ماہ کا عرصہ پر لگا کر اڑ گیا تھا، اور اسے وقت کا احساس تک نہ ہو سکا اور اب جبکہ وہ واپس جا رہا تھا تو اس کی جان پر بن آئی تھی۔ کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ تب ہی وہ پچھلے دو گھنٹوں سے سب کے ساتھ ڈنر کے لئے باہر جانے پر تیار نہیں کر پا رہی تھی خود کو، لہٰذا اس وقت اشعر خود اسے بلانے کے لئے اس کے کمرے میں آیا تو اس نے صرف کپڑے چینج کئے تھے، تب ہی وہ زچ ہو کر بولا تو تمکین نے اس کے سامنے بے دلی سے بال بنائے پھر سینڈل میں پاؤں کو جکڑتے ہوئے جھٹ سے اٹھ کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

''بس، چہرے پر رنگ و روغن نہیں کرنا کیا؟''

وہ اس کی روئی روئی سی سرخ آنکھوں اور بالکل سادہ چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے قدرے اچنبھے سے بولا تو تمکین نے خاموشی سے نفی میں سر ہلا دیا۔

''چلو......کوئی بات نہیں، تم ایسے ہی بہت پیاری لگ رہی ہو، اب جناب کا حکم ہو تو چلیں؟''

اس کے لہجے سے قطعی نہیں لگ رہا تھا کہ وہ اداس ہے، یا اسے تمکین سے بچھڑنے کا کوئی دکھ ہے، تب ہی وہ بھی خود کو سنبھالتے ہوئے چپ چاپ سر ہلا کر اس کے ہمراہ چل پڑی۔

''کیا یار، اب تم یہ روتی بسورتی صورت لے کر میرے ساتھ چلو گی تو میں کیا خاک ان یادگار لمحوں کو انجوائے کروں گا؟''

دو قدم ہی چل کر وہ اس کی گھمبیر خاموشی سے اکتاتے ہوئے پلٹ کر درشتگی سے بولا تو تمکین محض خاموش نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گئی، تب اس کے دل کی کیفیت سمجھتے ہوئے وہ بھی نرم پڑ گیا، اور ایک ہاتھ اس کے گال پر رکھتے ہوئے قدرے متانت سے بولا۔

دیکھو ناں تمی، میں پندرہ سال کے بعد صرف تمہارے لئے یہاں آیا ہوں، وگرنہ انکل وغیرہ کے ساتھ تو بزنس کے سلسلے میں مختلف ممالک میں ملنا ملانا ہو ہی جاتا ہے۔ ان سے ہی سب کا حال بھی معلوم کر لیتا ہوں۔

مگر پندرہ سال کے بعد اللہ تعالیٰ نے تم سے ملنے کا ایک موقع دیا تو دیکھو میں سر کے بل دوڑا دوڑا چلا آیا لیکن ہمیشہ یہاں رہنے کے لئے نہیں، اور اب جبکہ میں تم سے پرامس بھی کر چکا ہوں کہ بہت جلد ممی پاپا کو منا کر یہاں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے لے آؤں گا تب بھی تم خوش نہیں ہو پا رہی

ہو، کیوں......؟''

وہ بہت جلد ایموشنل ہو جاتا تھا، تمکین کو بمشکل اپنے دل پر جبر کرنا پڑا، تب ہی وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولی۔

''میں تمہارے معاملے میں بہت حساس ہوں اشعر۔ پندرہ برس کا طویل عرصہ تمہارے لئے تڑپ تڑپ کر گزارا ہے میں نے۔ آج سے پندرہ سال پہلے بھی تم اسی طرح مجھے بلکتا ہوا چھوڑ گئے تھے اور آج بھی میں تمہیں خود سے دور کرنے کا حوصلہ نہیں پا رہی ہوں خود میں بہرحال اب چلو، میرا خیال ہے کہ ہم کافی لیٹ ہو چکے ہیں۔''

''تھینک گاڈ کہ تمہیں اس بات کا خیال تو آیا۔ تمہیں پتہ ہے سارے گھر والے تمہارا انتظار کر کر کے گھر سے نکل بھی چکے ہیں اور میں مظلوم تمہیں لے کر جانے کی ڈیوٹی نبھانے کے لئے اکیلا رہ گیا اب خدارا میرے حال پر رحم کرو، اور چلنے کا نام لو۔''

موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے وہ قدرے شوخ لہجے میں بولا تو تمکین واقعی ہنس پڑی تب اشعر نے سکون کا سانس لیا اور اس کا ہاتھ تھام کر گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

''تھینک گاڈ اشعر بھائی کہ آپ آ گئے ورگرنہ ہم تو سمجھ رہے تھے کہ آپ ہمیں چکر دے کر رفو چکر ہو گئے۔'' وہ تمکین کے ہمراہ جونہی اپنی مطلوبہ ٹیبل کی طرف بڑھا، شیزا نے اسے مسرت سے دیکھتے ہوئے چہک کر کہا جواب میں وہ اس کی تیکھی ناک دبا کر مسکراتے ہوئے بولا۔

''ہم وعدہ کر کے رفو چکر ہونے والوں میں سے نہیں ہیں محترمہ، دیکھ لینا کسی دن آزما کر۔''

''خیر آزما کر تو آپ کو ہماری تمکین بی بی ہی دیکھیں گی، ہم تو فی الحال مزے دار کھانے کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ کہ آپ آئیں اور کب کھانا آرڈر کریں، کیونکہ پیٹ میں اس وقت چوہوں کا فائنل میچ چل رہا ہے۔''

اشعر کی بات کو فوراً اچکتے ہوئے وہ اپنے مخصوص شوخ و شریر انداز میں بولی تو اشعر کے ساتھ ساتھ وہاں موجود سبھی لوگ بے ساختہ ہنس پڑے۔ تب اشعر نے سب کی پسند سے فوراً کھانا آرڈر کر دیا، ساتھ ہی کولڈ ڈرنک بھی منگوالی تو شیزا نے اسے ہزاروں دعائیں دے ڈالیں کیونکہ وہ ہمیشہ سے ہی پیپسی یا کوک وغیرہ کے ساتھ کھانا کھانے کی شوقین تھی۔

پُر لطف کھانے کے بعد آئس کریم کا مرحلہ آیا اور یہاں بھی شیزا نے کھانے کی مانند سب سے مہنگی آئس کریم کی فرمائش کی جسے اشعر نے جھٹ پورا کر دیا اور تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ اس سے کہہ رہی تھی۔

''اشعر بھائی! کیوں نہ ہم اپنی اپنی آئسکریم چینج کر لیں، مجھے اس کا ذائقہ کچھ اچھا محسوس نہیں ہو رہا ہے۔''

تمکین نے چونک کر خاصی حیرانی سے اسے دیکھا تھا، جو اپنی پسند کی مہنگی ترین آئسکریم منگوا کر بھی ناپسندیدگی کا اظہار کر رہی تھی اور اس سے بھی زیادہ حیرت اسے اس وقت ہوئی جب اشعر نے اپنی آئس کریم فوراً اس کی طرف بڑھا دی اور خود مزے سے اس کی چھوڑی ہوئی آئس کریم کھانے لگا۔

آئس کریم کے بعد وہ لوگ لانگ ڈرائیو پر نکل گئے۔

پھر دیر تک ٹھنڈی ہواؤں میں موج مستی کرنے کے بعد وہ لوگ ریس کورس کی طرف نکل آئے جہاں انہوں نے مختلف پوز کے ساتھ ڈھیر ساری تصویریں بنوائیں یہاں بھی شیزا نے تمکین کو حیرانی سے ہمکنار کیا، اور سب کے درمیان بڑے فری انداز میں اشعر کے کندھے پر جھولتے ہوئے ملتجی لہجے میں بولی۔

''اشعر بھائی! کیوں ناں ہم دونوں بھی مل کر ایک تصویر اکٹھی کھنچوائیں؟''

''یس وائے ناٹ اس میں کیا حرج ہے؟''

وہ فوراً مان گیا تھا، تب ہی تمکین کو کیمرہ پکڑا کر بولا، پلیز ہماری اک تصویر کھینچ دو۔ اس کے لفظ ''ہماری'' نے تمکین کو سر سے پاؤں تک جلا کر رکھ دیا تھا۔ تب ہی وہ اپنے غصے کو دباتے ہوئے اس سے کیمرا لے کر فوراً مان گئی اور پھر جب شیزا نے کچھ جتانے والے انداز میں اشعر کے بے حد قریب ہو کر پوز بنایا تو مارے غصے کے وہ کانپ اٹھی، اور اسی کیفیت میں اس نے کیمرا صرف اشعر پر فٹ کر کے اس اکیلے کی تصویر بنا ڈالی اور اس کی اس چالاکی کی کسی کو خبر تک نہ ہو سکی۔

''چلو اب ہم دونوں بھی ایک یادگار تصویر بنالیں۔''

اگلے ہی پل وہ تمکین سے کہہ رہا تھا، جواب میں اس نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے خاموشی سے کیمرا اسے تھما کر سختی سے انکار کر ڈالا اور اس کے اس طرح انکار نے اشعر کے دل کو کتنا جلایا، یہ صرف وہی جانتا تھا۔ کتنے مان سے ریکویسٹ کی تھی اس نے؟ اور کتنی بے دردی سے تمکین نے ہرٹ کر ڈالا تھا اسے۔

اس رات وہ لوگ تقریباً ساڑھے تین بجے گھر واپس لوٹے تھے اور آتے ہی جہاں جگہ ملی سو گئے یہی وجہ تھی کہ صبح سب کی آنکھ بھی دیر سے ہی کھلی اور ناشتہ بھی دیر سے ہی ہوا ورنہ تو حسن ولاج میں اذان کے ساتھ چہل پہل شروع ہو جاتی تھی۔ ناشتے کے فوراً بعد شیزا نے جانے کی جلدی مچا دی تو مجبوراً اشعر کو بھی دادی ماں کے حکم پر تیار ہونا پڑا وگرنہ اس وقت تو واقعی اس کے دل کو بھی تمکین سے دور جاتے ہوئے کچھ ہو رہا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ ابھی کچھ دن مزید یہاں اور رک جائے، لیکن وہ چونکہ فیصلہ سنا چکا تھا لہٰذا اسے جانا تو تھا ہی، تب ہی دل کی خواہش کو دبا کر خوب ٹائم لے کر تیار ہوا، اور جب رخصت کا ٹائم آیا تو کل رات کی ناراضگی خود بخود کہیں منہ چھپا کر بھاگ گئی یاد رہا تو فقط اتنا کہ وہ تمکین سے دور جا رہا ہے۔ تب ہی وہ تھکے تھکے سے قدموں سے چلتا ہوا اس کے قریب آیا، اور اس کے ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں لیتے ہوئے نم آواز میں بولا۔

''اپنا خیال رکھنا تمی...... کیوں کہ تم یہاں میری امانت ہو، اور میری امانت میں خیانت ہو یہ میں برداشت نہیں کروں گا۔ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میرے جانے کے بعد خوب خوش رہنا اور پہلے کی مانند روز نیٹ پر رابطہ کرنا مجھ سے۔ اگر دوبارہ پاکستان آمد پر تم مجھے ذرا سی بھی دبلی نظر آئیں تو یقین کرو، وہیں ایئر پورٹ پر جھگڑ پڑوں گا تم سے، کیا سمجھیں؟''

بات کے اختتام پر اپنی عادت کے مطابق وہ اس کی چھوٹی سی ناک دباتے ہوئے بولا تو مارے دکھ کے تمکین کے منہ سے جواب میں اک حرف تک نہ نکل سکا۔ نازک ہاتھ اس کی مضبوط گرفت میں بھی کانپ رہے تھے اور حلق میں جیسے غم کا کوئی پھندا سا پھنس گیا تھا جو اسے بولنے نہیں دے

رہا تھا۔ بس وہ بے بسی سے ڈبڈبائی آنکھوں کو اس کے دلکش چہرے پر مرکوز کیے چپ چاپ اسے دیکھتی رہی، اور وہ اپنے دل کی تمام باتیں اس کے گوش گزار کر کے وہاں سے چلا بھی گیا۔ جاتے وقت گھر کے ایک ایک فرد سے ملتے ہوئے اسے ان سے بچھڑنے کا بے حد دکھ ہو رہا تھا لیکن پھر دوبارہ جلدی ہی لوٹ آنے کا سوچ کر اس نے خود کو سنبھال لیا اور خوب دعاؤں کی چھاؤں میں سب کو ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہتے ہوئے اپنی گاڑی میں آ بیٹھا۔

آسمان پر چھائے گھٹا ٹوپ بادلوں اور ٹھنڈی معطر ہواؤں کے باعث موسم بے حد خوشگوار تھا۔

راستے بھر شیزا نے اپنی چٹ پٹی باتوں سے اسے خوب لطف اندوز کیا اور ابھی وہ لوگ ایبٹ آباد سے کچھ فاصلے پر ہی تھے کہ اچانک ان کی گاڑی خراب ہو گئی ایک تو سنسان راستہ، اوپر سے یکا یک موسم نے بھی اپنے تیور بدل لئے تھے۔ اشعر سچ مچ خاصا پریشان ہو گیا اگر وہ اکیلا ہوتا تو شاید زیادہ مسئلہ نہ ہوتا مگر شیزا کی وجہ سے وہ زیادہ پریشانی محسوس کر رہا تھا۔ تب ہی جھنجلا کر گاڑی کے اسٹرینگ وہیل پر ہاتھ مارتے ہوئے وہ ایک نظر شیزا کی طرف دیکھ کر گاڑی سے باہر نکل آیا۔

خاصی دور دور تک آبادی نظر نہیں آ رہی تھی اوپر سے بارش ہونے کا امکان بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اچھا بھلا چمکدار دن گھنگھور بادلوں کی وجہ سے شام کی مانند ہو گیا۔ تب بے حد کوفت کے عالم میں اس نے دس پندرہ منٹ تک گاڑی کو ہر ممکن طریقے سے ٹھیک کرنے کی کوشش کی، مگر گاڑی کا انجن تھا کہ ٹھیک ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

تب قدرے مایوس ہو کر اس نے مزید کوشش ترک کر دی، کہ یکا یک آسمان پر بادل گرجنے لگے اور بجلی کی کڑک پورے زور شور کے ساتھ گونجنے لگی۔

''شیزا چلو جلدی سے باہر آؤ مجھے لگتا ہے کہ ہمیں پیدل ہی یہاں قریبی آبادی تک پہنچنا پڑے گا۔''

بارش کے خوف سے وہ اگلے ہی پل کھڑکی پر جھکے ہوئے شیزا سے کہہ رہا تھا جواب میں وہ سمٹ کر بیٹھ گئی اور قدرے ڈرتے ہوئے بولی۔

''نہیں اشعر بھائی مجھے بجلی سے بہت ڈر لگتا ہے، میں گاڑی سے باہر نہیں نکلوں گی۔''

''لیکن شیزا، ایسے ہم یہاں ہاتھ پہ ہاتھ دھر کے کب تک بیٹھے رہیں گے ابھی تھوڑی دیر میں بارش شروع ہو جائے گی اور پھر جانے کب رکے گی۔ تم پلیز فوراً باہر نکلو۔''

اس نے ڈپٹ کر کہا تھا اور اس کے کہنے کے ساتھ ہی زوردار بارش کا سلسلہ شروع ہو گیا بارش کی موٹی موٹی بوندوں نے پل کے پل میں اسے بھگو کر رکھ دیا تب مجبوراً وہ موسم کے تیور دیکھتے ہوئے خود بھی گاڑی میں آ بیٹھا۔

ہجر کی آنکھوں سے آنکھیں تو ملاتے جایئے
ہجر میں کرتا کیا، یہ تو بتاتے جایئے
آخرش رشتہ تو ہم میں اک خوشی، اک غم کا تھا
مسکراتے جایئے، آنسو بہاتے جایئے

''کالا شاہ کالا...... میرا کالا اے دلدار تے گوریاں نوں پراں کرو......''

ازمیر گزشتہ تین روز سے بزنس کے سلسلے میں شہر سے باہر تھا اور آج چوتھے روز تھکن سے بے حال، اس نے جوں ہی گھر میں قدم رکھا، ماہم اسے دیکھتے ہی بلند آواز میں گنگنانے لگی تھی اذیت کی ایک شدید لہر اس کے رگ و پے میں سرایت کر گئی، تاہم سر جھٹک کر اسے یکسر اگنور کرتے ہوئے اس نے قدم تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھا دیئے۔

''ارے......ازمیر بھائی آپ کو پتہ ہے اریشہ اور اذہان بھائی کی بات طے ہوگئی ہے۔'' اسے قدم اٹھاتے دیکھ کر وہ فوراً اس کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔ ازمیر نے قدرے چونک کر حیران کن نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا، تو وہ دلکشی سے مسکرادی۔

''ارے......آپ تو پریشان ہوگئے، کیوں یقین نہیں آیا کیا......؟''

اس کی حیران نگاہوں میں مسکرا کر دیکھتی ہوئی وہ اس وقت بہت مسرور دکھائی دے رہی تھی۔ دل کے کسی کونے میں ابھی تک وہ سنیما ہال والی بات تازہ تھی، تب ہی تو اس وقت اسے ڈسٹرب کر کے وہ دلی خوشی محسوس کر رہی تھی۔ ازمیر بس کچھ بے یقینی اور خاموش نگاہوں سے ٹکر ٹکر اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

''ازمیر بھائی! آپ تو ایسے حیران ہو رہے ہیں کہ جیسے اریشہ نے آپ کے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھا رکھی ہوں۔ حالانکہ بات صرف اتنی سی ہے کہ وہ ہمدرد دل رکھنے والی حساس لڑکی ہے، تب ہی آپ کی یہ 'انفرادیت' اسے آپ سے ہمدردی جتانے پر مجبور کرتی ہے مگر آپ نہ جانے کن خوش فہمیوں میں گم رہتے ہیں کہ اس کلاس فیلو شہزرین نے ٹھکرا دیا تو اپنے ہی گھر کی راہ دیکھ لی آپ نے۔''

وہ نہایت سنگ دلی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ ازمیر کے اوسان پر تو جیسے ساتوں آسمان گر پڑے۔ کسی قدر چونک کر اس نے ماہم کی طرف دیکھا تھا جو اس وقت اس کی حالت سے خوب لطف اٹھا رہی تھی۔

''ازمیر بھائی! کان کھول کر اچھی طرح سن لیں آپ، اریشہ اور اذہان بھائی ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں۔ دونوں کی جوڑی کتنی جچتی ہے، مگر آپ محبت بٹورنے کے چکر میں جان بوجھ کر ان دونوں کے بیچ آرہے ہیں تا کہ وہ اگر آپ کو نہیں مل سکی تو اذہان بھائی کو بھی نہ ملے۔ چچ......چچ

،چچ میں نے آپ جیسا خود غرض انسان اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھا۔''

اس کے دل کے زخموں کی پروا کئے بغیر وہ نہایت سنگ دلی سے لفظوں کے نشتر چلاتی رہی اور ازمیر دھواں دھواں ہوتی آنکھوں کے ساتھ گم سم سا کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ سچ ہی تو کہہ رہی تھی وہ، جوڑی تو اس کی اذہان ہی کے ساتھ سجتی تھی، مگر وہ بھی درمیان میں کہاں تھا ان کے؟ کہاں اس نے دانستہ یا نادانستہ یہ کوشش کی تھی کہ وہ اریشہ یا اذہان کی خوشیوں پر ڈاکہ ڈالے، ان دونوں کے درمیان دیوار بن کر کھڑا ہو جائے بلکہ وہ تو خود اپنے ہی عشق کے غم میں نڈھال تھا۔ دن رات کا کوئی پل ایسا نہیں تھا جب شہرین خان کی یاد بھول کر بھی اس کے دل سے نکل جاتی ہو۔ وہ تو آبلہ پا تھا، کانٹوں کی راہ گزر پر چلتے چلتے لہولہان ہو کر یہاں آیا تھا۔ جواب میں اریشہ نے اس کے زخم زخم دل پر اپنی محبت و اپنائیت کے پھاہے رکھے تو وہ قدرے بہل گیا۔

روز بروز شہرین خان کی طرف سے ملنے والے دکھ سے پیچھا چھڑانے کی خاطر عادی ہوتا گیا اریشہ کی مہربانیوں کا وگرنہ کیا وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ ہرگز اس قابل نہیں کہ کسی حسین لڑکی کی رفاقت کا خواب دیکھ سکے۔ بلکہ خوابوں کا یہ سلسلہ تو بہت عرصہ ہوا ترک کر دیا تھا اس نے۔ وہ تو بس کسی بچے کی مانند خود کو بہلانا چاہتا تھا اور اس کی اس معصوم سی خواہش کو لے کر آج اس کی اپنی ہی کزن ماہم نے کتنا بے عزت کر ڈالا تھا اسے، کہ اس سے اپنا توازن برقرار رکھنا ہی دشوار ہو گیا تھا۔ تب ہی بے حد نڈھال ہو کر لٹا لٹا سا وہ وہیں ٹی وی لاؤنج میں صوفے کی پٹی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

ماہم اپنی جلی کٹی سنا کر کب کی وہاں سے جا چکی تھی۔ جب کہ اس کے پاؤں میں تو اپنے کمرے تک جانے کی سکت ہی نہیں رہی تھی۔ آپ ہی آپ اس کی بھری بھری سی آنکھوں میں اریشہ کا خوب صورت سراپا جھلملا گیا، جب وہ آنکھوں میں ہزاروں درد سموئے اس کا ہاتھ تھام کر کہہ رہی تھی۔

''میں نے کبھی خود کو خوب صورت نہیں سمجھا ازمیر، مگر تمہارا ساتھ مجھے خوب صورت کر دیتا ہے۔ کیا تم مجھے یہ خوب صورتی دان کرو گے......؟''

نہ جانے کیا کہنا چاہتی تھی وہ......؟ مگر وہ تو کچھ سمجھنے کی پوزیشن میں رہا ہی نہیں تھا۔ سماعتوں میں پھر کہیں اس کا رسیلا لہجہ گونجا تھا۔

''تم خود کو میری نظر سے کیوں نہیں دیکھتے ازمیر۔ کبھی اپنا آنکھوں میں دیکھو تو تمہیں پتہ چلے کہ تم کتنے خوبصورت ہو۔''

''نہیں...... میں خوب صورت نہیں ہوں اریشہ...... نہیں ہوں میں تمہاری مہربانیوں کے قابل، تم بھی کیوں نہیں سب کی طرح اگنور کر دیتی ہو مجھے؟ کیوں قدم قدم پر میرے آنسو پونچھ کر، کمزور بناتی ہو مجھے؟ مجھے کھل کر رونے دو اریشہ...... مجھے اس بھیانک حقیقت کا سامنا کرنے دو کہ میں کسی کی محبت یا مہربانی کے قابل نہیں ہوں؟ کیوں دیوی بننا چاہتی ہو تم؟ کیوں دوسروں کی طرح تم بھی مجھے اپنی محبت سے محروم نہیں کر دیتیں؟''

وہ اس وقت خود سے الجھتے ہوئے شدید تکلیف دہ مراحل سے گزر رہا تھا۔ ایک تو پہلے ہی اس کا ذہن بے حد تھکا ہوا تھا اوپر سے ماہم کی الزام تراشیوں نے اسے مزید چور چور کر دیا۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ وہ کہاں اور کس پوزیشن میں بیٹھا ہے۔

آنسوؤں کا سلسلہ تھا کہ قطار در قطار اس کی پلکوں کا بند توڑ کر رخساروں پر بہے جا رہا تھا۔ اور وہ خالی خالی سی ویران آنکھوں میں ماضی کے

گزرے ہوئے ہر دن کو یاد کر کے تڑپتا رہا۔

بچپن ہی سے وہ دونوں، ایک دوسرے کے کس قدر قریب تھے، اسے تو کبھی اریشہ کے ساتھ، یہ پتہ بھی نہیں چلا کہ وہ خوب صورت نہیں ہے، پتہ چلتا بھی کیسے؟ اریشہ نے کبھی اسے یہ احساس ہی نہیں ہونے دیا کہ وہ شاہ ولاج کی کوئی انوکھی مخلوق ہے۔

وہ چھوٹا سا تھا جب اس نے یہ محسوس کیا کہ اس کے بزرگ اسے وہ اہمیت اور پیار نہیں دیتے جو گھر کے دوسرے بچوں کو حاصل تھا۔ دادی اماں تو شاید اسے اپنے پاس بٹھانا بھی گوارہ نہیں کرتی تھیں، ہاں مگر دادا جی، بہت پیار کرتے تھے اس سے، سارا سارا دن وہ اسے اور اریشہ کو انگلی تھمائے اپنے ساتھ ساتھ لئے پھرتے اور جو چیز خود کھاتے وہی ان دونوں کو کھلاتے اور خوش ہوتے۔

دادا جی کی بدولت ہی وہ اریشہ سے اٹیچ ہوا تھا اور پھر جب ایک دن، دادا جی ہمیشہ کے لئے میٹھی نیند سو گئے تو گھر والوں نے اسے پڑھنے کے لئے ہوسٹل بھیج دیا کہ وہ گھر میں سارا سارا دن دادا جی کو یاد کر کے روتا رہتا یا پھر غصے میں آ کر دوسرے بچوں کے ساتھ لڑائی جھگڑا کرتا اور یوں گھر کا ماحول خراب ہوتا۔

ایک تو ''شاہ ولاج'' پہلے ہی آزمائشوں اور مصیبتوں کی زد میں آیا ہوا تھا کہ اس گھر کی اکلوتی بیٹی نورینہ بیگم اپنے خاوند کے ساتھ لڑ جھگڑ کر، شاہ ولاج'' چلی آئی تھیں، شاید ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اور بیٹی کے اسی دکھ نے شاہ محمد صاحب کی جان لے لی، یہ شاہ ولاج پر ٹوٹنے والی دوسری بڑی قیامت تھی پھر اس حادثے کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد ازمیر کی مما حائقہ بیگم کسی بات پر گھر والوں سے لڑ جھگڑ کر اپنے میکے چلی گئیں اور اتنی بہت ساری وجوہات نے مل کر ''شاہ ولاج'' کے مکینوں کو سخت ڈسٹرب کر کے رکھ دیا تب ہی انہوں نے ازمیر کی حرکتوں سے اکتا کر اس کے ماما کے پاس ملک سے باہر بھیج دیا اور اس فیصلے میں خود ازمیر کے پاپا احسن شاہ کی مرضی بھی سو فیصد شامل تھی۔ کیونکہ وہ خود بے حد ڈسٹرب رہتے تھے، ایسے میں ان کے لیے آفس اور بچوں کی ذمے داری ایک ساتھ نبھانا بہت مشکل تھا۔ سو اس مشکل سے جان چھڑانے کے لئے انہوں نے بھی گھر والوں کے فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور یوں ازمیر کو ایک طویل مدت کے لئے گھر اور گھر کے سب رشتوں سے دور ہونا پڑا۔

وہ اپنے گھر سے دور نہیں جانا چاہتا تھا، مگر اسے زبردستی بھیج دیا گیا اور گھر والوں کے اس فیصلے نے اس کی تنہا ذات میں تلخیوں کے مزید بیج بو دیے، تب ہی وہ پڑھائی کے ساتھ ساتھ بے راہ روی کا شکار ہو گیا۔

ایسے میں اریشہ کی ذات نے اسے سنبھالا، وہ قدم قدم پر اپنی فون کالز، اپنے خطوط اور ای میلز کے ذریعے ہمیشہ اس کی رہنمائی کرتی رہی، اسے غلط اور صحیح میں فرق سمجھاتی رہی، اور یہ اسی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ وہ سنبھل گیا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے ہر گرتے قدم پر اٹھنے کے لئے اریشہ کے سہارے کی عادت پڑ گئی بلکہ بعض اوقات تو اس کی ڈانٹ اور دیر تک اس سے رابطے کی خواہش میں وہ جان بوجھ کر کوئی نہ کوئی غلط کام کرتا اور جواب میں اریشہ دیر تک اسے طویل لیکچر سناتی۔

پھر جب وہ اپنی تعلیم مکمل کر کے ہمیشہ کے لیے گھر لوٹا تو اس کی واپسی کی سب سے زیادہ خوشی اریشہ کو ہی ہوئی تھی وہ اس وقت شہرین خان کی بے وفائی اور سنگ دلی پر نڈھال تھا، جب ہی تو اس پر نہ ''شاہ ولاج'' میں حائقہ بیگم کی واپسی کوئی اثر ڈال سکی نہ فاطمہ بیگم کی وفات کی خبر، مگر اس

کٹھن وقت میں بھی اریشہ نے اسے متاع کل کی مانند سمیٹ لیا اور وہ چونکہ درد سے نڈھال تھا تب ہی وہ اس کے محبت بھرے ہاتھ کو جھٹک نہ سکا اور یوں ہر گزرتے دن کے ساتھ وہ پھر سے اس کی اپنائیت، اس کے وجود اور مہربانیوں کا عادی ہوتا چلا گیا۔

اس نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا تھا کہ اریشہ ایک بے حد حسین لڑکی ہے اور وہ خود ایک معمولی سی شکل کا عام سا نوجوان بلکہ حقیقت تو یہ تھی کہ دوسروں کی مانند، اریشہ کی ظاہری خوبصورتی سے نہیں بلکہ باطنی اچھائی سے شدید انسپائر ہوا تھا۔

کتنی ہی بار ایسا ہوا تھا کہ اسے فلو ہوتا یا سر میں ہلکا سا درد تو وہ بنا کسی کی پرواکئے اسے زبردستی بیڈ پر لٹا کر اس کی تیمارداری میں جت جاتی کبھی اس کے لئے چائے بنا رہی ہوتی تو کبھی اپنے نازک ہاتھوں سے گھنٹوں اس کا سر دباتی رہتی، اور ساتھ ساتھ اپنے کالج، اور گھر کی ہر ہر بات اس کے گوش گزار تی جاتی، اسے اسٹڈی میں کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو بھاگ کر سیدھی اسی کے پاس آتی اور وہ خواہ کتنا بھی مصروف یا کتنا بھی تھکا ہوا کیوں نہ ہوتا، اریشہ بڑے استحقاق سے اسے مجبور کر کے اس کے بالکل سامنے بیٹھ جاتی اور ناچار ازمیر کو اس کی مدد کرنا پڑتی۔

بہت مرتبہ اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ اسے کوئی فارمولا سمجھا رہا ہوتا کہ اریشہ دونوں ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ ٹکائے، یک ٹک محویت سے اسے دیکھ رہی ہوتی، پھر جب ازمیر کی نگاہ اچانک اس پر پڑتی اور وہ اسے ڈانٹتا تو اریشہ عجیب ڈھٹائی سے کھلکھلا کر اس کے بال بکھیر دیتی اور اس کا یہ انداز اسے کتنا ڈسٹرب کرتا تھا وہ آج تک نہیں بتا پایا تھا اسے۔ ہمیشہ اپنی کم مائیگی کے احساس نے اسے اریشہ کی بھی ستائشی نگاہوں سے دیکھنے سے بھی روکے رکھا، تو پھر وہ اریشہ اور راذہان کے بیچ کیسے آ گیا؟

سوچ سوچ کر اس کے دماغ کی رگیں پھٹنے کو تھیں، تب بمشکل ہمت کر کے وہ اٹھا اور اپنے نڈھال وجود کو سمیٹتے ہوئے اپنے کمرے میں چلا آیا۔

نرم بستر بھی آج جانے کیوں اسے چبھ رہا تھا۔ پوری رات وہ کروٹیں بدلتا اور روتا رہا، مگر قرار تھا کہ مل ہی نہ سکا اسے، اور شاید یہی وجہ تھی کہ صبح جب اس نے بیڈ سے اٹھ کر واش روم تک جانے کی کوشش کی تو اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ عجیب سی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں پورے وجود میں۔ نتیجتاً وہ بے دلی سے دوبارہ بیڈ پر گر پڑا۔

دائیں ہاتھ کو ہلکی سی جنبش دے کر اس نے اپنے چہرے کو چھوا تو وہاں شدید تپش کا احساس ہوا۔ جس سے اسے پتہ چلا کہ وہ تیز بخار میں مبتلا ہے، تب ہی وہ پلکیں موند کر دوبارہ لیٹ گیا کہ اسی پل حائقہ سیدھی ڈائننگ ٹیبل سے اس کے کمرے میں چلی آئیں کہ آج ڈائننگ ٹیبل پر اس کی عدم موجودگی نے انہیں بے حد متفکر کر ڈالا تھا، اور اب اسے بے سدھ سا بستر پر پڑے دیکھ کر تو ان کا دل ہی کانپ گیا اور وہ تڑپ کر آگے بڑھی تھیں۔

”ازمیر...... کیا ہوا ہے بیٹے...... ایسے کیوں لیٹے ہوئے ہو تم......؟“

کس قدر فکرمندی سے وہ اس کے بیڈ کی طرف لپکی تھیں پھر جوں ہی انہوں نے اپنا سرد ہاتھ اس کی جلتی ہوئی پیشانی پر رکھا تو گویا کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹیں۔

”ارے...... تمہیں تو بہت تیز بخار ہے، بتایا کیوں نہیں؟ تم نے، وہ جسے ہمیشہ نارمل سی محبت جتانے والی ماں سمجھتا رہا تھا اس وقت اس کے

بخار پر کیسے ہوش اڑ گئے تھے ان کے؟ تب ہی وہ ایک لمحہ مزید ضائع کیے بغیر کمرے سے باہر بھاگیں اور جلدی سے اپنے فیملی ڈاکٹر کو فون گھما ڈالا۔

اگلے کچھ ہی لمحوں میں احسن شاہ، ارسلان احمد شاہ، آفاق شاہ، بلال شاہ، فرزانہ بیگم، صالحہ بھابھی اور اس کے تمام کزنز ماسوائے اریشہ اس کے کمرے میں جمع تھے۔ پھر تھوڑی ہی دیر کے بعد ڈاکٹر صاحب آ گئے، اور تب اس کے تفصیلی چیک اپ کے بعد انہوں نے قدرے متفکر ہو کر احسن شاہ صاحب کی طرف دیکھا اور نہایت متانت سے گویا ہوئے۔

"مسٹر شاہ! آپ کے بیٹے ضرورت سے زیادہ حساس اور کسی بھی بات کو انتہائی حد تک سیریس لینے والی فطرت کے حامل ہیں، اس وقت ان کی جو کنڈیشن ہے وہ انتہائی ڈپریشن کے باعث ہوئی ہے، اور ان کا اتنی سیریس حد تک ڈپریس ہونا نہ صرف خود ان کے لئے بلکہ آپ کے لئے بھی خاصا نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ایسی حالت میں مریض کے دماغ کی رگ پھٹ جانے کے چانسز بہت بڑھ جاتے ہیں۔ سو پلیز بی کیئر فل۔"

اپنے پیشہ ورانہ انداز میں گھر کے سب لوگوں کو نصیحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا تو گویا احسن شاہ اور حائقہ بیگم کے پاؤں تلے سے زمین ہی کھسک گئی۔ ڈاکٹر صاحب انہیں نصیحت کرنے کے بعد ضروری دوائیاں لکھ کر پرچی ارسلان شاہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے جبکہ احسن شاہ اور حائقہ بیگم پتھر بنے وہیں کھڑے رہے۔

☆☆☆

''کیا بات ہے عدنان بیٹے، بہت پریشان دکھائی دے رہے ہو؟''

وہ کل سے کچھ گم سم سا تھا، اور اس وقت بھی اپنے کمرے میں بیٹھا نہ جانے کن سوچوں میں الجھا ہوا تھا کہ سیال بیگم کمرے میں داخل ہوئیں اور اسے گم سم سا بیٹھے دیکھ کر پوچھ بیٹھیں، تو وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگا، پھر سر جھٹکتے ہوئے زبردستی مسکرا کر بولا۔

''نہیں مما...... ایسی تو کوئی بات نہیں، بس یوں ہی؟''

جو بات وہ خود نہیں سمجھ رہا تھا انہیں کیسے سمجھاتا، تب ہی صاف مکر گیا تو سیال بیگم مسکرائے بغیر نہ رہ سکیں، پھر اس کی کشادہ پیشانی پر بکھرے بال پیار سے سمیٹتے ہوئے بولیں۔

''خوش رہا کرو میری جان، کیونکہ تمہاری مما کو تمہارے اس پیارے سے چہرے پر صرف خوشی کے دیپ جلتے ہی اچھے لگتے ہیں۔''

''یس مما...... آئی نو بیٹر...... میں بخوبی جانتا ہوں کہ؟ آپ نے صرف میری خوشی کے لئے کیا کیا نہیں کیا...... اور یہ آپ ہی ہیں مما کہ آج آپ کی وجہ سے میں زندگی کو اپنی خوشی اور مرضی سے انجوائے کر رہا ہوں۔ سچ مما آپ بہت گریٹ ہیں اگر آپ قدم قدم پر میرے لئے اسٹینڈ نہ لیں، میری ہیلپ نہ کریں تو نہ جانے کیا ہو جائے۔'' وہ اپنا سر ان کی نرم آغوش میں رکھتے ہوئے عقیدت سے بھرپور لہجے میں بولا تو سیال بیگم حسب عادت کھلکھلا کر ہنس پڑیں پھر اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے ''ناٹی بوائے'' کہا اور اسے اپنا خیال رکھنے کی تنبیہ کرتے ہوئے اس کے کمرے سے باہر چلی گئیں۔

تب وہ ایک مرتبہ پھر ریستوران کے کل والے واقعے کی طرف گھوم گیا، نہ جانے دل کیوں اس بات کو اتنا سیریس لے رہا تھا، کیوں مچلا جا رہا تھا انجشاء کے ہاتھ سے پھسل جانے کے خوف سے......؟ بار بار رہ کر ایک ہی خیال اسے پریشان کر رہا تھا کہ نہ جانے اب انجشاء اس کے جھانسے میں آئے گی بھی یا نہیں......؟ اور شاید رات بھر کی یہی بے کلی تھی جو صبح سرخ خمار بن کر اس کی بادامی آنکھوں سے واضح جھلک رہی تھی۔ آج وہ معمول سے بھی پہلے آفس کے لئے تیار ہو گیا تھا اور اس کی اس تبدیلی کو، جہاں احمد رؤف صاحب نے دل سے سراہا وہیں سیال بیگم اس کی آنکھوں میں جھلکتی بے قراری کی داستان پڑھ کر لب بھینچے دھیمے سے مسکرا دیں۔

آج سے پانچ سال پہلے احمد رؤف صاحب آفس سے گھر آتے ہوئے ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں اپنی دونوں ٹانگیں کھو چکے تھے، جس کی وجہ سے سیال بیگم اور عدنان نے انہیں قطعی طور پر آفس جانے سے روک دیا تھا۔ اب وہ ہمہ وقت گھر پر رہتے اور اپنی نایاب کتابوں کے مطالعے میں کھوئے رہتے تھے۔ ان کے ذوق کے پیش نظر عدنان ہر دوسرے تیسرے دن مارکیٹ میں ان کی مزاج اور پسند کی جو بھی اچھی کتاب آتی، انہیں لا کر دیتا رہتا۔ یوں تھوڑے ہی عرصے میں کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو گیا تھا ان کے پاس۔

مطالعے سے ہٹ کر اگر انہیں کچھ پسند تھا تو وہ آؤٹنگ تھی، اور یہاں بھی عدنان نے ایک فرماں بردار بیٹے کا رول پوری طرح نبھایا تھا، وہ جب بھی ان کا من ہوتا، انہیں اپنے ساتھ آؤٹنگ کے لئے باہر لے جاتا اکثر وہ تینوں رات کا کھانا باہر ہی کھا آتے۔

البتہ جہاں تک آفس کا سوال تھا، وہ تو اب مکمل طور پر عدنان کے رحم و کرم پر ہی تھا، احمد رؤف صاحب کبھی مہینوں بعد ایک آدھ چکر لگاتے

تو آفس کا پورا اسٹاف عدنان کی محنت، ذہانت اور ایمانداری سے ہمہ وقت کام میں مگن رہنے کی تعریف میں رطب اللسان ملتا۔ تب وہ مزید خوش ہو جاتے اور مارے فخر کے ان کا سر پہلے سے بھی زیادہ بلند ہو جاتا۔

وہ سارا دن کیا کرتا ہے؟ کن کاموں میں مصروف رہتا ہے؟ اس حقیقت سے وہ قطعی بے خبر تھے اگر باخبر ہوتے تو شاید ٹانگوں کے ساتھ ساتھ زندگی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے۔

ہاں البتہ سیال بیگم کچھ کچھ ضرور بیٹے کی آوارہ حرکتوں سے واقف تھیں اور یہ ان کے نزدیک جوانی کے دور کے کھیل اور موج مستی تھی، تب ہی انہوں نے کبھی اسے اُف تک نہیں کہا، الٹا ہر قدم پر سپورٹ کرتی رہیں اسے، اور شاید یہی وجہ تھی کہ وہ کبھی غلط اور صحیح میں فرق جان ہی نہیں سکا۔ اسے بچپن سے ہی اپنی من مانی کرنے کی عادت پڑی ہوئی تھی اور اب جوانی میں بھی وہ اسی عادت کے زیر اثر تھا۔ چیزوں کے ساتھ ساتھ، اب زندہ وجود بھی اس کی خواہشات کے حامل ہو گئے تھے، اور وہ اپنی دولت کے بل بوتے پر جس لڑکی کو چاہتا خرید لیتا اگر دولت سے بات نہ بنتی تو اس کے پاس دوسرے بھی بہت سے ہتھیار تھے، لڑکیاں پھانسنے کے، جن میں سرفہرست اس کے سحر انگیز الفاظ، جن کی وجہ سے وہ کسی بھی نک چڑھی سے نک چڑھی لڑکی کو اپنی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کر دیتا۔

مگر اس انجشاء صاحبہ میں نہ جانے کون سی روح سمائی ہوئی تھی کہ نہ اس کی دولت وامارت سے مرعوب ہو رہی تھی اور نہ ہی اس کے الفاظ اس پر کوئی اثر کر رہے تھے۔ حالانکہ وہ اتنی شاندار پرسنالٹی کا مالک تھا کہ ایک بار کسی لڑکی کو نظر بھر کر دیکھ لیتا تو اس لڑکی کے لئے پلکیں اٹھا کر اس کی آنکھوں میں دوبارہ دیکھنا دشوار ترین ہو جاتا تھا۔ مگر یہ انجشاء تھی کہ نہ صرف اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اعتماد سے بات کرتی، بلکہ ہر بار اسے زیر کر کے چلی جاتی تھی اور وہ بے بس سا کھڑا اسے دیکھتا رہ جاتا۔

اس روز اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ آج انجشاء کو ضرور اس کی اوقات یاد دلائے گا، اگر وہ سیدھے طریقے سے راستے پر نہیں آ رہی تھی تو اس کا غرور سے تنا ہوا سر جھکانے کے لئے آج اسے الٹا طریقہ ہی اختیار کرنا پڑ رہا تھا، تب ہی وہ اپنے معمول سے ذرا جلدی ہی اٹھ کر آفس کے لئے تیار ہو گیا تھا، اور اب ماں باپ کی تعریف سمیٹتے ہوئے جلدی جلدی ناشتے میں صرف جوس کا گلاس پی کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ارادہ انجشاء کو راستے ہی میں کڈنیپ کرنے کا تھا تب ہی گھر سے نکل کر روڈ پر آتے ہوئے اس نے فوراً اپنے موبائل سے آفس میں اپنے منیجر سے رابطہ قائم کیا اور انہیں بتایا کہ وہ ایک نہایت ضروری کام کے سلسلے میں شام تک کے لیے شہر سے باہر جا رہا ہے۔ لہٰذا وہ اس کے پیچھے آفس میں پوری ذمے داری سے اپنا کام سنبھال لیں۔ پھر تمام امور اچھی طرح منیجر کے گوش گزار کرنے کے بعد اس نے بڑے مسحور کن انداز میں مسکراتے ہوئے موبائل آف کر کے ڈیش بورڈ پر ڈال دیا، اور نگاہیں پوری توجہ کے ساتھ سامنے روڈ پر مرکوز کر دیں، جہاں اسے انجشاء کو پیدل مارچ کرتے ہوئے تلاش کرنا تھا کہ یہی اس کا راستہ تھا۔

اور ابھی وہ اپنے منصوبے پر دل ہی دل میں مسرور ہو رہا تھا کہ اسے تھوڑے ہی فاصلے پر، وہ اکیلی جاتی ہوئی نظر آ گئی۔ سونے پر سہاگہ، اس وقت روڈ بھی تقریباً سنسان ہی تھا۔ اکا دکا لوگ اور گاڑیاں گزر رہی تھیں۔

وہ اطمینان سے مسکراتے ہوئے گاڑی بالکل اس کے قریب لے گیا، پھر جب وہ ٹھٹک کر رک گئی تو وہ بڑے سکون کے ساتھ گاڑی سے باہر نکلا اور اسی طرح مسکراتے ہوئے عین اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''آیئے میں ڈراپ کر دوں آپ کو۔'' لبوں پر بڑی شاطرانہ سی مسکراہٹ بکھیر کر اس نے کہا انجشاء کا چہرہ غصے کی سرخی سے منٹ میں متغیر ہو گیا۔

''شٹ اپ...... دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ میں تمہاری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔''

غصے کی شدت سے کانپتے ہوئے اس نے کہا تھا مگر عدنان اس کے جواب پر کھلکھلا کر ہنس پڑا پھر اسی طرح ہنستے ہوئے اس نے انجشاء کے متغیر چہرے پر اک بھرپور نظر ڈالی اور اگلے ہی پل انجشاء کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنی مضبوط گرفت میں لے کر بے بس کرتے ہوئے عدنان نے اسے اپنی شاندار گاڑی میں دھکیل دیا۔

☆☆☆

بارش کا سلسلہ تقریباً دس پندرہ منٹ کے بعد ہی تھم گیا تھا تاہم بادلوں کی گڑگڑاہٹ اور بجلی کی چمک، ہنوز جاری تھی۔ تب اشعر گاڑی سے نکل کر پھر باہر آ گیا، ساتھ ہی شیزا کا ہاتھ پکڑ کر اسے زبردستی گاڑی سے باہر نکالا تو وہ بری طرح ڈرتے ہوئے اس کے ساتھ لپٹ گئی۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے شیزا۔''

وہ اسکی بے باک حرکت پر بری طرح جز بز ہوا تھا، مگر شیزا اسکے لہجے کی کڑواہٹ کو سنی ان سنی کرتے ہوئے خاصے ڈھیٹ انداز میں بولی۔

''میں نے آپ کو بتایا تو ہے کہ مجھے بجلی سے بہت ڈر لگتا ہے، پھر کیوں زبردستی کر رہے ہیں آپ میرے ساتھ۔''

''او کے...... چلو گاڑی میں چل کر بیٹھو''

اس کی عجیب سی منطق اور فضول وہم پر سخت جھنجلاتے ہوئے اس نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا مگر شیزا نے اس بار پھر سخت ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا اور معصوم سا منہ بنا کر بولی۔

''لیکن اشعر بھائی اگر گاڑی پر بجلی گر گئی تو......؟''

اس کے جواز پر اسے بے حد تاؤ آیا تھا، تاہم وہ بے ساختگی سے ہنس پڑا، پھر زبردستی اسے خود سے الگ کرتے ہوئے قدرے مزاحیہ انداز میں بولا۔

''اتنی گناہ گار ہو تم......؟ کہ کہیں بھی اکیلی بیٹھو گی تو بجلی تم پر گر جائے گی؟''

شیزا نے اس کے شوخ لہجے پر صرف پل دو پل کے لیے پلکیں اٹھا کر ناراضگی سے اسے دیکھا، پھر چپ چاپ اس کے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو گئی، اشعر نے مسکرا کر اس کے پھولے پھولے سے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے سر جھٹک دیا اور پوری توجہ سے نگاہیں سامنے کی طرف راستے پر جما دیں جہاں بارش کے باعث کچھ ہی لمحوں میں خاصا پانی جمع ہو گیا تھا، اور چونکہ راستہ زیادہ پختہ نہیں تھا تب ہی اسے بہت سنبھل کر قدم رکھنا پڑ

رہا تھا۔ تاہم پھر بھی وہ بار بار پیچھے مڑ کر شیزا کو سنبھل کر چلنے کی نصیحت کر رہا تھا کہ اچانک وہ تھوڑی ہی دور اس کے ساتھ چل کر زمین پر بیٹھ گئی اور پھر دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھامتے ہوئے پریشان لہجے میں بولی۔

''اف..... اشعر بھائی، مجھے چکر آ رہے ہیں..... مم..... میرے سر کو کچھ ہو رہا ہے۔''

اس نے انداز ایسا بنا لیا تھا کہ اشعر لپک کر اس کے قریب آیا اور پریشانی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''پلیز خود کو سنبھالو شیزا..... ہم جلد ہی قریبی آبادی تک پہنچ جائیں گے۔''

مگر شیزا کے سر پر تو اس وقت عشق کا بھوت سوار تھا۔ تب ہی اسے اس وقت سوائے اپنے دل کی خوشی کے اور کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہاں تک کہ اشعر کی بے انتہا پریشانی اور الجھن بھی نہیں جب ہی اس کا متفکر لہجہ یکسر نظر انداز کر کے اس نے شاندار ایکٹنگ کی اور دیکھتے ہی دیکھتے پلکیں موند کر بے ہوش ہو گئی۔

اشعر کو تو حقیقی معنوں میں دن میں تارے نظر آ گئے۔ اجنبی جگہ خراب موسم، اور ایک نوجوان دوشیزہ کا ساتھ اوپر سے اس کی یہ ڈرامہ بازی، ہاتھوں کے طوطے کیسے اڑتے ہیں، اس وقت بخوبی وہ اس محاورے کے معنی سمجھ گیا تھا، مگر شیزا اس کی پرابلم نہیں سمجھ رہی تھی، تب ہی تو اس کے لاکھ ہلانے جلانے اور جھنجوڑنے پر بھی ٹس سے مس تک نہ ہوئی تو مجبوراً اسے شیزا کو اپنی باہوں میں اٹھا کر چلنا پڑا، اور یہی تو وہ چاہتی تھی، یعنی زیادہ سے زیادہ اشعر احمد کی قربت......!

وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جو جذبات میں اندھی ہو کر انتہائی قدم اٹھانے سے بھی گریز نہیں کرتیں۔ پھر جب اشعر اسے بازوؤں میں اٹھائے اٹھائے قریبی گاؤں تک پہنچا تو وہ تھکن سے بے حال ہو چکا تھا۔ اسے ایک نوجوان لڑکی کو باہوں میں اٹھا کر آتے ہوئے دیکھتے ہی گاؤں کے کافی لوگ اس کے قریب پہنچ گئے۔ تب اس نے شیزا کو قریبی چارپائی پر لٹاتے ہوئے ان سے اپنی پرابلم ڈسکس کی، ایک بزرگ نے آگے بڑھ کر اس کے شانے تھپتھپاتے ہوئے اسے تسلی دی پھر ایک نوجوان کو گاؤں کے واحد ڈاکٹر کی طرف دوڑایا اور ایک دوسرے نوجوان کو اشعر کے لئے چائے پانی لانے کا حکم دیا۔

اشعر کو ویسے بھی اس وقت چائے کی شدید طلب محسوس ہو رہی تھی۔ لہٰذا اس نے مروتاً بھی منع نہیں کیا اور منہ ہاتھ دھونے کے بعد وہیں قریبی چارپائی پر ٹک گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں گاؤں کے ڈاکٹر صاحب تشریف لے آئے، اور انہوں نے تفصیلی اور توجہ سے شیزا کا چیک اپ کیا پھر اشعر کی جانب رخ پھیرتے ہوئے بولے۔

''پلیز ڈونٹ وری، یہ غالباً کمزوری کے باعث بے ہوش ہو گئی ہیں، وگرنہ الحمدللہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں پریشانی والی کوئی بات نہیں۔ میں میڈیسن لکھ کر دیتا ہوں یہ ابھی تھوڑی دیر میں ہوش میں آ جائیں گی۔''

''تھینک یو ڈاکٹر۔ تھینک یو سو مچ۔''

اشعر کی چونکہ بہت بڑی مشکل حل ہوگئی تھی، لہٰذا اس نے تشکر کے اظہار میں بھی قباحت محسوس نہیں کی، پھر تھوڑی ہی دیر میں گاؤں کا ایک نوجوان قریب ہی سے ایک موٹر مکینک کا بھی انتظام کر لایا، اور یوں گاؤں والوں کی مدد سے اگلے ایک گھنٹے میں وہ پھر سے اپنے سفر پر گامزن ہو گئے تھے۔مگر اس وقتی مصیبت سے چھٹکارا پاکر مطمئن ہونے والا اشعر یہ ہرگز نہیں جانتا تھا کہ کل کو یہی منحوس لمحے، اس کے جیون کی خوشیوں کو نگل جائیں گے۔اس وقت تو شاید اسے اپنے گلے میں ہمیشہ پڑی رہنے والی اس قیمتی چین کا کوئی خیال نہیں تھا، جو تمکین نے اس کی سالگرہ پر بہت محبت کے ساتھ اسے گفٹ کی تھی اور ساتھ میں کارڈ پر یہ بھی لکھا تھا کہ!

''اشعر.....تمہاری سالگرہ پر میری پاکیزہ اور بے پناہ محبت کا یہ چھوٹا سا گفٹ زندگی بھر میری چاہتوں کا، میری موجودگی کا احساس دلاتا رہے گا پلیز اسے کبھی خود سے جدا مت کرنا کیونکہ جس دن تم نے ایسا کیا، اس دن میں سمجھوں گی کہ تمہارا دل میری محبت سے بھر گیا ہے۔''

اور اس کے ان سادہ سے پُرخلوص الفاظ کو پڑھ کر وہ کتنی ہی دیر ہنسا تھا، ساتھ میں، خلوص دل سے تمکین کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس نے یہ پرامس کیا تھا کہ اب زندگی بھر وہ کبھی تمکین کی گفٹ کی ہوئی چین کو اپنی گردن سے جدا نہیں کرے گا بلکہ ایسا صرف اس دن ہی ہوگا جس دن تمکین اسے خود اس قید سے آزاد کرے گی۔

مگر تقدیر نے اس کے ساتھ یہ کیسا بھیانک کھیل کھیلا تھا کہ وہ بے خبری میں ہی، تمکین سے کئے اپنے وعدے سے منحرف ہو گیا تھا اور ستم ظریفی یہ کہ اسے اس کا احساس تک بھی نہ تھا۔

اگلے ایک گھنٹے کی ریش ڈرائیونگ کے بعد وہ لوگ ایبٹ آباد پہنچ گئے تھے۔وہ واقعی پہلی بار یہاں آیا تھا۔اس لئے وہاں کا ایک ایک منظر اسے بہت بھلا لگ رہا تھا پھر جس وقت وہ لوگ گھر پہنچے مسز منزہ ترمذی بے قراری سے ان کا انتظار کر رہی تھیں کیونکہ حسن ولاج سے انہیں یہ اطلاع پہنچا دی جا چکی تھی کہ اشعر، شیزا کو لے کر ایبٹ آباد کے لئے روانہ ہو چکا ہے، اور اب جبکہ شام ڈھلنے کو تھی وہ ان کے نہ پہنچنے پر بڑی متفکر تھیں کہ وہ لوگ آ گئے۔اشعر اگرچہ بہت نڈھال سا نظر آ رہا تھا مگر شیزا کے چہرے پر اس وقت خوشی کے جو رنگ تھے انہیں دیکھ کر وہ حیران ہی رہ گئیں۔تاہم اگلے ہی پل وہ اس کے گلنار چہرے سے نگاہ ہٹاتے ہوئے اشعر کی طرف بڑھیں اور اسے گاڑی سے باہر نکلتے ہی جھٹ پٹ ڈھیروں پیار کر ڈالا۔

''شکر ہے خدا کا کہ تمہیں یہ پھوپھو اور اس کا چھوٹا سا غریب خانہ یاد تو آیا ورنہ میں تو سوچتی تھی کہ شاید اپنے بھتیجے کی پیاری سی شکل دیکھے بغیر ہی ملک عدم سدھا جاؤں گی۔''

اسے دیکھتے ہی انہوں نے فوراً شکوہ جڑ دیا تو اشعر ان کی پُرخلوص محبت کو دیکھتے ہوئے ذرا سا مسکرا کر شرمندگی سے سر جھکا گیا۔

''نہیں پھوپھو، آپ یقین کریں کہ ایسی تو کوئی بات نہیں تھی، بس وقت ہی نہیں مل سکا، ورنہ میں تو خود آپ سے ملنے کے لئے بہت بے چین تھا۔''

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے اپنی صفائی پیش کرے۔اب وہ انہیں کیسے بتاتا کہ ''حسن ولاج'' میں ایک پیاری سی لڑکی کا وجود اسے اپنے سحر میں باندھ کر کسی اور طرف دیکھنے ہی نہیں دیتا، وہ تو پنڈی میں اپنے ماموں کے ہاں بھی صرف اس سے ناراض ہو کر چلا گیا تھا ورنہ شاید

پھوپھو کی طرح ماموں بھی شکوہ کناں ہی رہتے، اور اسے اپنی ممی سے ڈانٹ الگ پڑتی۔

''چل ہٹ، میں کیا جانتی نہیں تم لوگوں کو، تم دونوں باپ بیٹے ایک جیسے ہو، لگتا ہے گھر کے ساتھ ساتھ دل بھی بہت دور کر لیا ہے تم لوگوں نے اپنا۔''

وہ بولنے میں بہت شارپ تھیں اشعر فقط مسکرا کر رہ گیا۔ کہتا بھی تو کیا کہ وہ کوئی وضاحت سننے کو تیار ہی نہیں تھیں۔ تب ہی شیزا نے اس کی مدد کی اور اپنی مما کی طرف مسکراتی نگاہوں سے دیکھ کر بولی۔

''اب بس کیجئے ناں مما، اشعر کو پہلے اندر تو آ لینے دیں۔ ایک تو یہ پہلے ہی تھکن سے بے حال ہے اوپر سے آپ شکووں کی پٹاری کھول کر بیٹھ گئی ہیں۔''

''ارے میں تو بھول ہی گئی۔ اتنے برسوں کے بعد تمہیں دیکھا ہے ناں تو خوشی سے ہاتھ پیر پھول گئے ہیں میرے، بہر حال تم چلو جلدی سے اندر آؤ، ایک تو میں پہلے ہی تمہارے لیٹ ہو جانے کی وجہ سے بہت پریشان تھی، اب اچانک تمہیں اپنے سامنے دیکھا تو رہے سہے ہوش بھی گنوا بیٹھی ہیں۔''

وہ ہر بات تفصیل سے کرنے کی عادی تھیں۔ اشعر انہیں سفر میں اپنے لیٹ ہو جانے کی وجوہات بتاتے ہوئے گھر کے اندر چلا آیا۔ محل جیسا شاندار ان کا گھر، اسے بے حد اچھا لگا۔

وہ کل تین دن وہاں رہا اور ان تین دنوں کو اس نے دل بھر کر انجوائے کیا، پھوپھو اور انکل کی محبت تو الگ، شیزا نے بھی اسے ایک لمحے کے لئے بور نہیں ہونے دیا، اور تین دنوں میں ایبٹ آباد کا چپہ چپہ گھما ڈالا تھا اسے۔

اس روز بھی شام کے بعد جب وہ پھوپھو اور شیزا کے ساتھ بیٹھا کافی پی رہا تھا تو انہوں نے ایک نیا ہی انکشاف کر ڈالا، اس پر جسے سن کر وہ تو حیرت سے گنگ ہی رہ گیا جب کہ وہ کہہ رہی تھیں۔

''حسن ولاج'' محبت کرنے والوں کی پناہ گاہ نہیں ہے اشعر بیٹے، شاید اسی لئے مجھے ''حسن ولاج'' سے ایک طویل عرصے کے لئے در بدر ہونا پڑا۔ مگر میرے اس قصور کی سزا میری بیٹی کو ملی کہ اس سے تمہارے جیسے لائق اور پیارے بیٹے کا ساتھ چھن گیا۔ جن بزرگوں نے خود صلاح مشورے سے تمہاری اور شیزا کی منگنی کا بندھن باندھا تھا، پھر انہوں نے خود ہی اسے توڑ دیا، کیونکہ میں شیزا کے پاپا کی ڈ-تھ کے بعد اپنی محبت کو پانا چاہتی تھی، اور یہ حسن ولاج کے مکینوں کو گوارہ نہیں تھا، بہر حال میں تو وہ سب کچھ کب کا بھلا چکی ہوں۔ اب تو بس یہی دعا ہے کہ تم لوگ جہاں بھی، جس حال میں رہو، ہمیشہ خوش اور آباد رہو۔''

وہ تو اپنی رام کہانی سنا کر خاموش ہو چکی تھیں مگر اشعر کو پھر سکون نہیں ملا، اس کے اپنوں نے اس سے ہمیشہ اتنی بڑی بات چھپائے رکھی، یہ خلش لندن پرواز کرنے تک مسلسل اس کے دل میں چبھتی رہی۔

☆☆☆

''شاہ ولاج'' کے تمام مکینوں کے چہرے اس وقت پریشانی کی لپیٹ میں تھے، ڈاکٹر احسان ضروری ہدایات کے بعد وہاں سے جا چکے تھے اور ان کے جانے کے فوراً بعد حائقہ بیگم آنسوؤں سے لبالب بھری ہوئی آنکھوں کے ساتھ ازمیر کی طرف بڑھیں پھر اس کا ماتھا چوم کر بے اختیار رو پڑیں۔

وہ آج تک کبھی اپنی اولاد سے پیار نہیں جتا پائی تھیں کیونکہ قدرت نے انہیں اس کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ جب ان کے بچوں کو ان کے پیار کی ان کی آغوش کی گرمی کی ضرورت تھی تو وہ ذاتی جھگڑے کے باعث انہیں شاہ ولاج میں ہی چھوڑ کر اپنے میکے چلی گئی تھیں، اور پھر جب وقت نے انہیں ان کی غلطی کا احساس دلایا اور وہ دوبارہ شاہ ولاج آئیں تو ان کے دونوں ہی بچے ان سے دور جا چکے تھے۔ ازمیر کو پڑھنے کے لئے اس کے سسرال والوں نے انہیں قطعی بے خبر رکھ کر ملک سے باہر بھیج دیا تھا جبکہ ان کی بیٹی ان کی نگاہوں کے سامنے ہوتے ہوئے بھی کوسوں دور تھی۔ کیونکہ وہ انہیں مما نہیں کہتی تھی۔ نہ ہی اپنی ماں سمجھتی تھی وہ انہیں دوبارہ شاہ ولاج میں دیکھ کر قطعی خوش بھی نہ ہوئی تھی، بلکہ ان پر سرسری سی نظر ڈال کر وہ بلال شاہ کی وائف عائشہ بیگم کی طرف بڑھ گئی تھی اور ان کے ہاتھ تھامتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

''مجھے بہت بھوک لگی ہے، پلیز جلدی سے کھانا لگا دیں۔''

تب انہیں جس گہرے درد کا احساس ہوا تھا، وہ آج تک ان کی رگوں میں سرایت کر رہا تھا، کیونکہ ان کے بیٹے ازمیر نے بھی پندرہ سال کے بعد وطن واپسی پر انہیں قطعی ماں کا مقام نہیں دیا اور ایک عورت کے لئے بھلا اس سے بڑھ کر دکھ اور کیا ہوتا ہوگا کہ وہ اولاد کے ہوتے ہوئے بھی خالی دامن ہو۔

پچھلے دس برسوں سے وہ مسلسل اسی کوشش میں لگی ہوئی تھیں کہ کاش ان کے بچے ان کا قصور معاف کر کے انہیں اپنی ماں تسلیم کر لیں مگر انہیں اس سلسلے میں کوئی خاطر خواہ کامیابی نصیب نہ ہوسکی تھی۔ ہاں یہ الگ بات تھی کہ ان کی بیٹی سمیہ شاہ اب ان کے ساتھ پہلے کی طرح اجنبی برتاؤ نہیں رکھتی تھی اور ازمیر نے بھی اب ان سے کھلم کھلا نفرت کا اظہار ختم کر دیا تھا، مگر وہ اپنے بچوں کی ماں اب بھی نہیں بن پائی تھیں۔ تب ہی تو اندر ہی اندر ان کے لئے سوچ کر دکھی ہوتی رہتیں۔

اس وقت بھی وہ خود پر قابو نہیں پا سکی تھیں اور ازمیر کی پیشانی چومتے ہوئے رو پڑیں تو احسن شاہ نے آگے بڑھ کر انہیں حوصلہ دیا، پھر انہیں گرم دودھ لانے کی ہدایت کرتے ہوئے خود ازمیر شاہ کے پہلو میں آبیٹھے، جس کی سوجی ہوئی سرخ آنکھوں میں درد کی عجیب سی کہانی ہلکورے لے رہی تھی۔ تب ہی وہ اس کی روشن پیشانی پر بکھرے ہوئے بال سمیٹ کر نہایت حلیمی سے بولے۔

''کیا بات ہے بیٹے......؟ اس قدر ڈپریس کیوں ہو تم؟''

''کچھ نہیں پاپا......بس یوں ہی......کل کی مس ہو جانے والی ڈیل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ حالانکہ میں نے کتنی بار کوشش کی کہ ہماری ڈیل فائنل ہو جائے مگر ایسا نہیں ہوسکا۔ آئی ایم ویری سوری پاپا، کہ میں چاہ کر بھی کچھ نہیں کر پایا، اور میری وجہ سے ہماری کمپنی کو اتنا بڑا نقصان اٹھانا پڑا۔''

فوری طور پر اس کی سمجھ میں یہی بہانہ آیا تو اس نے احسن صاحب کے گوش گزار کر دیا۔ اور اس کے اس سفید جھوٹ پر اطمینان کا سانس لیتے ہوئے ماہم شاہ اس کے کمرے سے باہر نکل گئی۔ جبکہ احسن شاہ مسکراتی ہوئی نگاہوں سے اپنے قابل بیٹے کو دیکھ کر بولے۔

''بیٹے میں جانتا ہوں کہ تم بزنس میں بے حد انٹرسٹڈ ہو، بہت فکر رہتی ہے تمہیں ہر بات کی، مگر اسے اپنے سر پر سوار کر لینا کہاں کی دانش مندی ہے مائی ڈیئر، پلیز بیٹے بزنس کو بزنس ہی سمجھو، اسے خود پر اتنا طاری مت کرو کہ بیمار پڑ جاؤ، اور پھر دیکھو بیٹا، ہماری کمپنی الحمدللہ اتنی بڑی ہے کہ اسے ایسی چھوٹے موٹی ڈیلنگز کینسل ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، سو پلیز بی کیئر فل مائی جان۔''

اپنی بات کے اختتام پر وہ اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے محبت سے پر لہجے میں بولے تو ازمیر نے رسمی سا مسکرا کر دھیرے سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے انہیں مطمئن کر دیا، تب وہ تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اسے آرام کرنے کی تلقین کرتے کمرے سے باہر نکل گئے تو اسی وقت حائقہ بیگم دودھ کا گلاس لے کر کمرے میں چلی آئیں۔

کمرے میں اس وقت ازمیر کے پاس ان کے سوا کوئی بھی نہیں تھا، تب ہی وہ دودھ کا گلاس ٹیبل پر رکھ کر بیڈ پر اس کے پہلو میں آ بیٹھیں اور ماماتا سے مجبور محبت بھرے لہجے میں بولیں۔

''ازمیر...... میں جانتی ہوں بیٹے کہ تم نے اپنے پاپا سے جھوٹ بولا ہے، میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ تمہیں بزنس کی کوئی پرابلم نہیں ہے لیکن میں یہ نہیں جانتی ہوں کہ تمہیں کس بات نے اس حد تک پریشان کر دیا ہے کہ بات خطرے کی حد تک جا پہنچی، پلیز اپنی ماما کو بتاؤ بیٹے کہ اصل بات کیا ہے؟ کیوں اس حد تک ڈیپریس ہو گئے ہو تم؟''

بھلے کچھ بھی تھا، وہ ایک ماں تھیں اور ایک ماں کے لئے اولاد کا دکھ برداشت کرنا بہت دشوار ہوتا ہے، تب ہی ان کی آواز نا چاہنے کے باوجود بھی بھیگ گئی تھی۔ تاہم ازمیر نے ان کی طرف کروٹ بدل لی اور لہجے کو قطعی اجنبی بناتے ہوئے بولا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں، آپ کو بیکار میں میری فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور اب آپ پلیز جائیں یہاں سے، میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔''

کوئی اس وقت حائقہ بیگم کے دل سے پوچھتا کہ ان کے جگر پر بیٹے کے انتہائی روڈ انداز نے کیسے چھریاں چلا دی تھیں۔ مگر اس وقت تو وہ واقعی اسے مزید پریشان کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ تب ہی اسے دوا کھلا کر دودھ پینے کی تلقین کرتے ہوئے وہ چپ چاپ اس کے کمرے سے باہر نکل آئیں۔

ایک ایک لمحہ تھا کہ عذاب بن گیا تھا ازمیر کے لئے۔ کبھی کبھی اس کا دل چاہتا کہ وہ پھر سے لندن چلا جائے اور پھر کبھی لوٹ کر ان اپنوں کے درمیان نہ آئے کہ جنہوں نے ہمیشہ اسے درد کی سوغات ہی دی تھی۔ اگلے تین چار روز میں اس کی حالت قدرے سنبھل گئی تھی مگر بخار نے مکمل طور پر اس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ اریشہ ان دنوں اپنے ڈیڈی سے ملنے دوبئی گئی ہوئی تھی۔ تب ہی ازمیر کے حال سے بے خبر رہی، پھر اگلے ہفتے جیسے ہی اس نے شاہ ولاج میں قدم رکھا اور اسے ازمیر کے بخار کے بارے میں پتہ چلا وہ تو گویا تڑپ کر رہ گئی۔ مگر ازمیر چونکہ اس وقت گھر پر نہیں تھا۔ لہٰذا

مجبوراً وہ اس کی حالت کے بارے میں سوچ سوچ کر کڑھتی رہی حالانکہ حائقہ بیگم اور صالحہ بھابھی نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ اب پہلے سے بہت بہتر ہے مگر اس کی روح کو قرار نہ آیا، تب بے چینی کے عالم میں وہ اپنے کمرے میں چلی آئی اور اپنے موبائل سے ازمیر کا موبائل نمبر پریس کر ڈالا۔ مگر دو تین بار بیل ضرور گئی پھر اس کا فون کاٹ دیا گیا۔ تب اسے شدید دھچکا لگا اور وہ بے حد ماؤف ہوتے ذہن کے ساتھ وہیں اپنے بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی۔

اسے تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ ازمیر اس کی کال کاٹ بھی سکتا ہے؟ کیا ہوا ہوگا میرے پیچھے ایسا کہ ازمیر مجھ سے بات کرنا بھی گوارہ نہیں کر رہا؟

''آنے دو اسے گھر، دیکھنا میں کیسے کلاس لیتی ہوں اس کی۔'' دل ہی دل میں اس نے سوچا اور دھیمے سے مسکرا دی۔

☆☆☆

''یہ کیا بدتمیزی ہے عدنان؟ کہاں لے جا رہے ہو تم مجھے؟''

صاف سڑک پر اس کی شاندار گاڑی فراٹے بھر رہی تھی، سانس بحال ہونے پر انجشاء نے بے حد تفکر سے پوچھا، جواب میں عدنان اک بھرپور نظر اس پر ڈالتے ہوئے بلاوجہ ہنس پڑا۔ انداز صاف اس کا مذاق اڑانے والا تھا کیونکہ انجشاء کے چہرے پر اس وقت ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور عدنان کو یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا۔ تب ہی مسکراتے ہوئے وہ کروفر بھرے انداز میں بولا۔

تمہیں تمہاری اصل اوقات یاد دلانے جا رہا ہوں، بہت غرور ہے ناں تمہیں، اپنی نسوانیت پر، خود کو کوئی ماورائی مخلوق سمجھتی ہو ناں تم، اب دیکھنا میں کیسے تمہارا سارا غرور خاک میں ملاتا ہوں۔'' بہت جلن تھی اس کے لہجے میں، انجشاء کا دل ان جانے خوف سے دھڑک اٹھا، بے حد گھبرا کر اس نے گاڑی سے باہر ادھر ادھر دیکھنے کی کوشش کی، مگر روڈ بالکل سنسان تھا، کبھی کبھار کوئی گاڑی گزر رہی تھی، شاید یہ پلان پہلے سے تیار تھا، تب ہی تو اس نے اس سنسان راستے کا انتخاب کیا تھا۔ انجشاء کی ساری خود اعتمادی ہوا ہوگئی، اس وقت وہ مکمل طور پر عدنان کے رحم و کرم پر تھی اور وہ اس کی حالت سے بہت لطف اٹھا رہا تھا۔

اور ابھی وہ اسے کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ ان کی گاڑی کے سامنے ایک بلیک کلر کی گاڑی آ کر رک گئی تو مجبوراً عدنان کو بھی اپنی گاڑی روکنا پڑی، پھر دیکھتے ہی دیکھتے سامنے والی بلیک گاڑی سے تین چار آوارہ ٹائپ کے لڑکے نکلے، اور شیر کی مانند عدنان کی گاڑی کی طرف لپکے، انجشاء حیرت سے گنگ یہ کارروائی دیکھتی رہی، پھر اس کی آنکھوں کے سامنے ہی ان لڑکوں نے عدنان کو گریبان سے پکڑ کر گاڑی سے باہر گھسیٹا اور ان میں سے ایک پُر جوش لڑکے نے آگے بڑھ کر ایک زوردار طمانچہ اس کے گال پر جڑ دیا۔

''کہا تھا ناں تمہیں کہ مالکہ کی طرف میلی نظر سے مت دیکھنا، سمجھایا تھا ناں تمہیں، پھر بھی تم نے اسے نہیں چھوڑا اور اسے صحیح راستے سے بھٹکا دیا، اب بتاؤ تمہارا کیا حشر کریں ہم لوگ؟''

وہی لڑکا اسے گریبان سے پکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے درشتگی سے بولا تو عدنان نے اپنی بھرپور طاقت کا استعمال کرتے ہوئے اسے دھکا

دے کر دور گرا دیا۔

انجشاء مارے خوف کے گویا برف میں لگ گئی تھی۔ اس نے اکثر ایسے مناظر صرف فلموں یا ڈراموں میں دیکھے تھے۔ حقیقی زندگی میں ایسا تجربہ پہلی بار ہو رہا تھا، اور عدنان کو آج اس کی آوارہ مزاجی لے ہی ڈوبی تھی۔ وہ اس وقت اکیلا تھا جبکہ وہ لڑکے تین تھے اور تینوں کے پاس ہتھیار تھے، شاید انہیں عدنان کے پروگرام کا پتہ چل چکا تھا، اور وہ بھی اس کی مانند، راستے میں گھات لگائے بیٹھے تھے۔

بہر حال معاملہ جو بھی تھا، انجشاء کا دل خوف کی شدت سے کسی پتے کی مانند کانپ رہا تھا۔ تب ہی اس نے دھکا کھا کر گرنے والے لڑکے کو، زمین پر پڑے پڑے چلاتے ہوئے سنا۔

''عدیل، ریحان، دیکھ کیا رہے ہو، پکڑو اسے اور ختم کر دو۔''

الفاظ تھے کہ نشتر، اسے لگا وہ پل میں مسمار ہو گئی ہو، ہاں کبھی وہ خود بھی اس کی موت چاہتی تھی مگر اس وقت نہیں، وہ چاہے جیسا بھی تھا، اس کا سائبان تھا، اور وہ اسے اجنبی لوگوں کے ہاتھوں موت کے منہ میں جاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ تب ہی بجلی کی سی سرعت سے وہ گاڑی سے باہر نکلی، اور اس جوشیلے نوجوان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر منت بھرے لہجے میں بولی۔

''پلیز..... پلیز بھیا..... میں آپ سے ریکویسٹ کرتی ہوں، پلیز آپ انہیں چھوڑ دیں۔'' اس کی التجاء نے جہاں ان اجنبی لڑکوں کو چونکا یا تھا، وہیں کچھ ہی فاصلے پر کھڑا عدنان رؤف بھی اس وقت اس کی ہمدردی پر ششدر رہ گیا تھا۔

''ہماری تمہارے ساتھ کوئی دشمنی نہیں ہے، لہٰذا تم سائیڈ پر ہو جاؤ۔''

وہ لڑکے حلیئے سے ضرور آوارہ لگ رہے تھے مگر ان کی گفتگو، ان کا لہجہ انہیں پڑھے لکھے گھرانوں سے تعلق رکھنے والے نوجوان ثابت کر رہا تھا۔ تب ہی وہ ان سے التجاء کر بیٹھی تھی۔ مگر اس کی التجا فوراً مسترد کر دی گئی۔

''پلیز، پلیز آپ انہیں چھوڑ دیجیے، انہوں نے جو غلطی کی ہے اس کے لئے میں آپ سے معافی مانگتی ہوں پلیز۔''

وہ اس لمحے ان اجنبی نوجوانوں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر عدنان رؤف کی زندگی کی بھیک مانگتے ہوئے بہت قابلِ رحم لگ رہی تھی جبکہ وہ ساری سچویشن بھلا کر اسے یوں پھٹی پھٹی سی نگاہوں سے التجاء کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا گویا اسے اپنی بصارت پر یقین ہی نہ آ رہا ہو، وہ ایک لڑکی، جسے اس پر اتفاقیہ نظر ڈالنا بھی گوارہ نہیں تھا۔ جو اسے ہر قدم پر زچ کرتی آئی تھی، اور جسے اس کے غرور کی سزا دینے کے لئے اس نے بہت بھیانک منصوبہ بنایا تھا۔ اب وہی اس کی زندگی کی بھیک مانگ رہی تھی کیوں.....؟

نہ جانے وہ کب تک اسی ''کیوں'' میں الجھا رہتا کہ ایک لڑکا، شدید غصے کے عالم میں انجشاء کے بالکل پاس آ کھڑا ہوا، اور قدرے چبا چبا کر لفظ ادا کرتے ہوئے وارن انداز میں بولا۔

''اے جاپانی گڑیا، تمہاری سلامتی اور بھلائی اسی میں ہے کہ چپ چپ یہاں سے بھاگ جاؤ۔ اور کسی کو اس بارے میں کچھ نہ بتاؤ ورنہ ابھی جو ہم حشر تمہارے اس ہیرو کا کریں گے ناں، مجبوراً ویسا ہی تمہارا بھی کرنا پڑے گا، سمجھیں تم.....''

''ہاں سمجھ رہی ہوں میں اچھی طرح، مگر پہلے اس کا قصور تو بتاؤ، آخر کیا بگاڑا ہے اس نے تمہارا؟'' وہ بھرپور شدت سے چلائی تھی، جواب میں اس کے سامنے کھڑے لڑکے نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے بے ساختہ قہقہہ لگایا پھر اس کی سہمی ہوئی آنکھوں میں سنگ دلی سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''قصور جاننا چاہتی ہو تم اس کا، تو سنو اس نے میری بہن کو راہ راست سے بھٹکایا ہے، اسے اپنی جھوٹی محبت کے چنگل میں پھنسا کر باغی کر دیا ہے، ہم سب گھر والوں سے، صرف اس کی وجہ سے میرے پاپا کو ہارٹ اٹیک ہوا، صرف اس کی عیاشی کی وجہ سے میری بہن کا اچھا بھلا رشتہ ٹوٹ گیا، میں نے منع کیا تھا اسے، کہا تھا کہ یہ میری بہن سے دور رہے، مگر اس نے میری وارننگ کو سیریس نہیں لیا، لہٰذا اب سزا تو ملنی چاہیے ناں اسے۔''

اس لڑکے نے پوری تفصیل اس کے گوش گزار کر دی تھی، جسے سن کر ایک مرتبہ پھر اس کی نگاہیں جھک گئیں اور دل میں درد کی ایک شدید لہر سرایت کر گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ جواب میں کیا کہے تب ہی عدنان اس کی طرف بڑھا تھا اور اسے بازو سے پکڑ کر گاڑی میں دھکیلتے ہوئے وہ اس نوجوان سے الجھ پڑا، جو انجشاء کو اپنی رام کہانی سنا رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ تینوں لڑکے عدنان پر پل پڑے، اور اسے اپنی ٹھوکروں پر رکھ دیا۔

وہ ممکن حد تک خود کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر لڑکوں نے اسے اس کوشش میں کامیاب نہیں ہونے دیا، اور باری باری اتنا پیٹا کہ وہ خون میں لت پت ہو گیا۔ تب انجشاء نے اس کی حالت دیکھتے ہوئے بلند آواز میں چیخنا شروع کر دیا، اور اس کی چیخوں کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ وہ لڑکے بوکھلا گئے، تب ہی ایک گاڑی ان کے قریب آ کر رکی، تو وہ تینوں لڑکے، عدنان کو مزید پیٹنے کا ارادہ ترک کر کے فوراً وہاں سے بھاگ نکلے اور ان کے بھاگتے ہی، بدحواس سی انجشاء عدنان رؤف کے قریب لپکی، اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کا خون میں لت پت سر اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ جبکہ وہ بند ہوتی آنکھوں میں مسلسل حیرت سموئے اسے یوں اپنے لئے پریشان ہوتا دیکھ کر، اگلے ہی پل آنکھیں موند گیا۔

☆☆☆

اشعر کو گئے آج پورا ایک مہینہ ہونے کو آیا تھا، مگر وہ ابھی تک ''حسن ولاج'' کے درودیوار میں اس کی خوشبو محسوس کر رہی تھی، کتنی بور ہو کر رہ گئی تھی زندگی اس کے بغیر۔ اوپر سے اس سے کوئی کنٹیکٹ نہیں ہو پا رہا تھا۔ صرف تایا جی کی معرفت اس کی خیریت کی اطلاع ملی تھی اور بس...... وہ نہ فون کر رہا تھا نہ کمپیوٹر پر اس کی میلز کا کوئی جواب دے رہا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ مزید ڈپریس ہو گئی تھی، وہ پورا پورا دن گم سم سی اپنے کمرے میں پڑی رہتی، یا کمپیوٹر پر انگلیاں مارتی رہتی۔

گھر والے اس کی حالت سے بے خبر نہیں تھے۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ وہ کسی کو کچھ بتاتی بھی نہیں تھی۔ اگر کوئی اس کی اداسی کی وجہ پوچھ بھی لیتا وہ ہزار بہانے بنا کر ٹال دیتی، اور پھر کسی حد تک وہ لوگ اس کی اداسی کو اشعر کی جدائی سے بھی کمپیئر کر رہے تھے، تب ہی اسے زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔

پھر ایک روز جب گھر کے تمام افراد، ڈائننگ ٹیبل پر جمع ناشتے میں مصروف تھے، اس نے ایک نیا شوشہ چھوڑ دیا اور ناشتے کے دوران ہی حسن احمد صاحب کو مخاطب کر کے بولی۔

''دادا جی...... میری تعلیم مکمل ہو گئی ہے، پھر بی ایڈ کا کورس بھی کر لیا ہے میں نے۔ تو میں اب چاہتی ہوں کہ سارا دن گھر میں بور بیٹھنے کی بجائے اپنی زندگی کے قیمتی لمحات کو کسی کام میں لاؤں، میں نے ایک کمپنی میں جاب کے لئے اپلائی کیا ہے، اور اس کے لئے مجھے آپ کی اجازت درکار ہے دادا جی۔''

پھول سا چہرہ چند ہی دنوں میں مرجھا گیا تھا۔ تاہم گھر والوں کے اعصاب پر اس کی نئی فرمائش نے گویا بجلیاں گرا دیں۔ حسن صاحب نے بھی کھانے سے ہاتھ روک لیا تھا اور اب وہ بہت توجہ سے اپنی لاڈلی پوتی کے مرجھائے ہوئے چہرے کا بغور مطالعہ کر رہے تھے۔ پھر اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے متانت سے بولے۔

''اگر میں اجازت نہیں دوں گا تو کیا تم اپنا فیصلہ بدل لوگی؟''

ان کے نہایت مدبرانہ انداز نے تمکین کو چونکا ڈالا۔ جب ہی اس نے ایک جھٹکے سے جھکا ہوا سر اٹھا کر انہیں دیکھا پھر دوبارہ نگاہیں جھکاتے ہوئے بولی۔

''نہیں دادا جی میں آپ کے حکم اور آپ کی اجازت کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتی۔ مگر میں جانتی ہوں کہ آپ مجھے اجازت ضرور دیں گے، کیونکہ آپ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں، اسی لئے آپ ہرگز نہیں چاہیں گے کہ میں ہمہ وقت اداس اور بے زار سی رہوں، ہے ناں دادا جی۔''

اسے ان کی بے پناہ محبت کا بخوبی اندازہ تھا تب ہی تو اتنے لاڈ اٹھواتی تھی ان سے جب کبھی اسے کوئی مسئلہ درپیش ہوتا، یا اپنی کوئی بات منوانا ہوتی، وہ فوراً دادا جی سے رجوع کرتی اور دادا جی عین اس کی توقع کے مطابق فوراً اس کا مسئلہ حل کر دیتے کہ ان کے فیصلے کے سامنے کسی کو آواز اٹھانے کی جرأت نہیں تھی۔ اس وقت بھی لگ بھگ کچھ ایسا ہی ہوا تھا، انہوں نے محض چند لمحوں کے لئے سنجیدگی سے تمکین کے اُترے اُترے سے چہرے کی جانب دیکھا پھر یکا یک مسکرا اٹھے، اور محبت سے اس کا سر تھپتھپاتے ہوئے بولے۔

''جب دادا جی کی کمزوری جانتی ہو تو پھر یوں منہ کیوں اترا ہوا ہے تمہارا؟''

وہ اس کے دادا جی کم اور دوست زیادہ تھے، وہ متبسم لہجے میں بولے تو تمکین کے چہرے پر فوراً خوشی کی لہر دوڑ گئی اور اس نے فرط جذبات سے اپنے دادا جی کے گال چوم لئے، پھر اسی سرشاری کے عالم میں وہ ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنی سیٹ سے اٹھی اور اپنے کمرے کی جانب دوڑ گئی جہاں اسے اپنی مطلوبہ جاب کیلئے ابھی کافی تیاری کرنی تھی، اور اس کے وہاں سے جانے کے بعد فاروق احمد اور خود تمکین کے پاپا سعید احمد نے، دبے دبے لفظوں میں اعتراض اٹھانا چاہا تھا مگر حسن صاحب نے فوراً ہاتھ اٹھا کر انہیں روک دیا کہ انہیں ہمیشہ اپنی اس لاڈلی پوتی کی خوشی ہر چیز سے بڑھ کر عزیز تھی۔

☆☆☆

اگلے ہی روز تمکین باقاعدہ سب گھر والوں کی اجازت اور خوشی سے اپنے تمام ڈاکومنٹس پر مبنی فائل اٹھا کر مطلوبہ کمپنی میں چلی گئی، جہاں آج امیدواروں کے انٹرویوز متوقع تھے۔ وہ اس جاب کے لئے یوں بھی پر جوش تھی کہ اس کی مطلوبہ کمپنی شہر میں سب سے بڑھ کر ابھری تھی، یہاں کا ماحول، کام اسٹاف، اور پے کے بارے میں اسے نہایت حوصلہ افزاء انفارمیشنز ملی تھیں اور پھر سب سے بڑھ کر اس کے گھر والوں نے بھی اسے اس کمپنی کا نام سن کر خوشی خوشی جاب کی اجازت دے دی تھی۔

مگر بعض اوقات جیسا انسان سوچتا ہے ویسا ہوتا نہیں اس نے کس قدر سرشاری کے عالم میں کل انٹرویو کی تیاری کی تھی، خود سے مختلف سوالات کر کے، اپنے آپ کو آج کے اس انٹرویو کے لئے تیار کیا تھا، مگر جب وہ متعلقہ دفتر پہنچی تو اسے یہ روح فرسا خبر سننے کو ملی کہ اس کی متعلقہ کمپنی کو جن امیدواروں کی ضرورت تھی انہیں سلیکٹ کر لیا گیا ہے۔ لہٰذا وہ انٹرویوز کی دوسری ڈیٹ کا انتظار کرے۔

آفس منیجر کے اس جواب نے اس قدر ہرٹ کیا یہ صرف اس کا دل ہی جانتا تھا، کتنی امیدیں لگائی تھیں اس نے اس جاب میں کامیابی کے لئے، کس قدر پر جوش تھی وہ، اب جو گھر والے اس سے سوال کرتے اور وہ انہیں بتاتی کہ اس کا تو انٹرویو لئے بغیر ہی اسے رد کر دیا گیا ہے تو بھلا کیا عزت رہ جاتی اس کی؟ اور سب سے بڑھ کر یہ بات اشعر تک پہنچتی تو کتنا مذاق اڑاتا وہ اس کا......؟

اسی طرح کے ڈھیروں سوالات اور خیالات تھے جن میں وہ اس وقت الجھی ہوئی تھی۔ ارد گرد سے قطعی بیگانی اپنے آپ میں گم، کہ اسی پل اچانک وہ ایک تیز رفتار گاڑی کے سامنے آتے آتے بچی، اس کا ذہن چونکہ کہیں اور تھا لہٰذا وہ سامنے سے آتی گاڑی کو دیکھ ہی نہ پائی، وہ تو خدا کا لاکھ لاکھ شکر کہ گاڑی والی نے فوراً بریک لگا لی وگرنہ شاید آج اس کی موت یقینی تھی پہلو میں دل تھا کہ دھڑ دھڑ کر رہا تھا اور وہ بوکھلا کر گاڑی کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں سے کچھ لمحوں کے بعد ایک پیاری سی شکل والی سادہ سی لڑکی باہر نکلی، اور آنکھوں میں مسرت کے ہزاروں دیپ روشن کئے، قدرے طنزیہ انداز میں بولی۔

''کیوں میڈم دکھائی نہیں دیتا کیا......؟''

''نہیں۔''

وہ جو کھڑا اسے دیکھ رہی تھی فوراً قطعی لہجے میں بولی تو گاڑی کے پاس کھڑی وہ سادہ سی لڑکی، گاڑی کا دروازہ بند کر کے چھوٹے چھوٹے اسٹیپ اٹھاتے ہوئے اس کے قریب آئی تھی، پھر دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر دلچسپی سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

''اگر نظر نہیں آتا تو یوں کھلے عام سڑکوں پر گھومنے کا مقصد.....مس.....؟''

''مس تمکین رضا.....تمکین نام ہے میرا، اور سڑکوں پر گھومنا آج کل اپنا فیورٹ مشغلہ ہے، مس.....''

بالکل اسی کے انداز میں پٹ سے جواب دیتے ہوئے اس نے جملہ ادھورا چھوڑا، تو سامنے والی لڑکی کے لبوں پر بڑی مسحور کن سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ جب کہ گاڑی کے ایک طرف کھڑے ہوئے اریج احمر نے مچلتے دل کے ساتھ نہایت دلچسپی سے، ان دونوں کو الجھتے ہوئے دیکھا۔ گیند اب انجشاء کے کورٹ میں تھی، تب ہی وہ سامنے کھڑی تمکین رضا کو خاصی دلچسپ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولی۔

''مجھے انجشاء احمر کہتے ہیں، مس تمکین رضا صاحبہ۔'' قدرے چبا کر وہ بولی تو تمکین کا چہرہ بہر حال سپاٹ ہی رہا۔

نائس ٹو میٹ یو۔'' اسی کے انداز میں کہتے ہوئے تمکین نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھا دیا تو انجشاء نے خاصی گرم جوشی سے اس کا ہاتھ تھام لیا پھر مسکراتے ہوئے پرجوش لہجے میں بولی۔

''سیم ہی۔''

''تھینکس.....ورنہ میں سمجھتی ہوں کہ مجھ سے مل کر، کم از کم خوشی نہیں ہو سکتی کسی کو۔''

اریج احمر اس کی بات پر دلکشی سے مسکراتے ہوئے ان کے قریب چلا آیا، پھر متبسم لہجے میں بولا۔

''انجشاء یہ مس تمکین رضا، معروف بزنس مین جناب حسن احمد صاحب کی پوتی اور رضا احمد صاحب کی اکلوتی بیٹی ہیں میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں انہیں۔''

''اچھا.....؟'' انجشاء نے گویا خاصی حیرت کا مظاہرہ کیا جواب میں جوں ہی اریج نے خوشی سے اثبات میں سر ہلایا تمکین اور انجشاء ایک ساتھ کھلکھلا کر ہنس پڑیں اور وہ ٹھٹک کر ان کی اس بے وجہ کھلکھلاہٹ کو دیکھنے لگا۔

''چڑیل کہیں کی، کہاں تھیں تم اتنے عرصے سے، پتہ ہے تمہاری حویلی کے نمبر گھما گھما کر میری تو انگلیوں میں درد ہونے لگا تھا۔''

اگلے ہی لمحے اسے تمکین کی پاٹ دار آواز سنائی دی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو پہلے سے جانتی ہوں گی، اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

''ایکسکیوز می، اریج صاحب، تمکین میری بیسٹ فرینڈ ہے اور ہم نے تعلیمی میدان میں ایک لمبا عرصہ ایک دوسرے کے ساتھ گزارا ہے، آئی ایم سوری کہ ہم نے آپ کو پہلے نہیں بتایا۔''

بالآخر انجشاء نے اس سسپنس کو ختم کیا اور اس کی وضاحت سن کر اریج کا دل مزید خوشی سے دھڑکنے لگا اور ابھی وہ انہیں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ انجشاء، تمکین کے کندھے پر ایک ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے فرینڈلی انداز میں بولی۔

''یہ تم ہوش وحواس سے بیگانہ ہو کر کیوں چل رہی تھی، اگر گاڑی کے نیچے آجاتی تو......؟''

''ارے......ایسے کیسے گاڑی کے نیچے آجاتی، تم بھلا اتنی جلدی کہاں مرنے دو گی مجھے، بہر حال میں یہاں ایک جاب کی تلاش میں آئی تھی، مگر منیجر صاحب سے پتہ چلا کہ تمام سیٹس او کے ہو چکی ہیں، تو بہت ہرٹ ہوئی میں، میں تمہیں بتا نہیں سکتی کہ میں نے کس مشکل سے اس جاب کے لئے دادا جی اور دیگر گھر والوں کو راضی کیا......مگر......جاب مجھے نہیں ملی۔''

اس کے مختصر سوال پر تمکین نے خاصا تفصیلی جواب اس کے گوش گزار کیا، تو اریج احمر نے ذرا رخ پھیر کر کچھ ہی فاصلے پر قائم اپنی شاندار بلڈنگ کو ایک نظر دیکھا جہاں تمکین نے نشان دہی کی تھی۔ تب ہی وہ انجشاء کے کچھ بھی بولنے سے قبل ڈائریکٹ اس سے مخاطب ہوا۔

''اگر آپ واقعی اس کمپنی میں جاب کے لئے سیریس ہیں تو سمجھئے کہ جاب آپ کو مل گئی۔''

''ارے......ایسے کیسے مل گئی، ابھی تو انہوں نے مجھے صاف کورا جواب دے کر ٹرخایا ہے۔''

وہ مزاج کی ہمیشہ سے تیز تھی، لہٰذا اس وقت بھی خاصی تنک کر بولی تو انجشاء نے لب بھینچ کر بمشکل اپنی مسکراہٹ چھپائی جبکہ اریج ہنوز مسکراتے ہوئے پُراعتماد لہجے میں بولا۔

''کل ان لوگوں نے پھر سے انٹرویو ڈیٹ رکھی ہے، میں جانتا ہوں انہیں، بہت اچھے دوست ہیں میرے، آپ کل دوبارہ آیئے گا۔ آئی ایم شیور، کہ اس بار آپ کو کامیابی ضرور ملے گی۔''

وہ جس پر اپنی پوری زندگی وار سکتا تھا، اس کے لئے ایک سیٹ نکالنا تو نہایت معمولی سی بات تھی پھر وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''اور ہاں......یہاں آپ کی ہیلپ کے لئے آپ کی بیسٹ فرینڈ مس شاہ صاحبہ بھی ہوں گی۔ کیوں مس شاہ؟''

''بالکل۔'' انجشاء نے اس کی مسکراہٹ سے محظوظ ہوتے ہوئے فوراً کہا تو تمکین کے چہرے پر دیکھتے ہی دیکھتے مسرت کے ڈھیروں گلاب کھل گئے۔

☆☆☆

اریشہ کے ایگزیم کی ڈیٹ شیٹ فائنل ہو چکی تھی، اس نے چونکہ انگلش اور کیمسٹری میں بہت کم مارکس حاصل کئے تھے لہٰذا کسی اچھے میڈیکل کالج میں داخلے کی بیس نہیں بن رہی تھی، تب ہی وہ ازمیر کے مشورے پر یہ دونوں پیپر دوبارہ دے رہی تھی۔ پرسوں ہی اس کا انگلش کا پرچہ تھا، مگر وہ ازمیر کی ہیلپ کے بغیر، اپنی تیاری کو صفر سمجھ رہی تھی، دل تھا کہ مطمئن ہی نہیں ہو پا رہا تھا، لہٰذا وہ بے تابی سے ازمیر کے گھر لوٹنے کا انتظار کر رہی تھی، جس سے کھل کر بات کئے ہوئے اسے تقریباً پورا ہفتہ بیت گیا تھا۔

مگر وہ کسی طرح ہاتھ ہی نہیں آ رہا تھا، رات کو دیر سے آتا اور سیدھا اپنے کمرے میں گھس جاتا، صبح وہ ناشتے کی ٹیبل پر، اس سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی اور اسی کشمکش میں دو تین دن گزر گئے تھے، آخر بہت سوچ کر اس نے لفظوں کا سہارا لیا اور Miss you کے دلکش کارڈ پر اپنی بے پناہ محبت کا اظہار کر کے کارڈ ازمیر کی رائٹنگ ٹیبل پر کتابوں کے درمیان رکھ آئی تا کہ رات کو جب ازمیر اپنے کمرے میں آئے اور اسٹڈی کرے تو یہ کارڈ

پڑھ لے اور یوں اریشہ کے جذبات اس پتھر کے صنم تک پہنچ جائیں اور وہ اپنی بلاوجہ ناراضگی ختم کر دے۔

وہ بے قراری سے اس کے گھر لوٹنے کا انتظار کر رہی تھی کہ بالآخر وہ گھر لوٹ آیا تو اریشہ لپک کر اس کی طرف بڑھی اور بازو تھامتے ہوئے پرشکوہ لہجے میں بولی۔

''تم نے آج گھر لوٹنے میں کتنی دیر کر دی۔ ازمیر۔ تمہیں پتہ ہے میں پچھلے دو گھنٹوں سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔''

''کیوں؟''

بہت روکھے انداز میں اس کے ہاتھ اپنے بازو سے جھٹکتے ہوئے ازمیر نے کہا تھا اریشہ کو اس سرد انداز سے بے حد تکلیف پہنچی اور وہ سر جھکا کر دھیمے لہجے میں بولی۔

''مجھے تم سے بات کرنی تھی، تمہاری اس بلاوجہ ناراضگی کی وجہ جاننا چاہتی ہوں۔''

''سوری میں بہت تھکا ہوا ہوں بعد میں بات کریں گے۔''

جینز کی پاکٹ میں ہاتھ ڈالتے ہوئے اس نے قطعی خشک انداز میں کہا پھر اس کا جواب سنے بغیر ہی لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا، تو اریشہ ڈبڈبائی آنکھوں سے اس کی چوڑی پشت دیکھتے ہوئے مایوس سی ہو کر وہیں صوفے پر بیٹھ گئی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سے کیسے کھل کر بات کرے۔

اگلے روز چونکہ سنڈے تھا لہٰذا ازمیر کو آج گھر پر ہی ہونا تھا، مگر وہ اس خوش فہمی سے قطع نظر اپنے آفس کے معمول کے مطابق ہی تیار ہو کر گھر سے نکل گیا اور وہ جلتی کڑھتی اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگی، کہ اسی پل اس کی تلاش میں ماہم وہاں چلی آئی پھر اسے ایک طرف الگ تھلگ اداس سا بیٹھے ہوئے دیکھا تو قدرے اپنائیت سے بولی۔

''کیا بات ہے اریشہ کچھ پریشان ہو......؟''

''نہیں'' وہ اس کی وہاں آمد پر فوراً سنبھل کر بیٹھ گئی۔ کیونکہ جانتی تھی کہ اگر ماہم کو کسی بات کی ذرا سی بھی بھنک پڑ گئی تو پھر بات کو پورے گھر میں پھیلنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

''اوکے..... تم کہتی ہو تو مان لیتی ہوں، ویسے تمہاری شکل دیکھ کر تو لگتا ہے کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔''

اس کے مختصر جواب پر اس نے قدرے برا مانتے ہوئے پرشکوہ انداز میں کہا تو اریشہ زچ ہو کر پھٹ پڑی۔

''تمہیں کون کہتا ہے کہ ہر وقت میری شکل دیکھتی رہو۔''

''ارے شکل تو تمہاری اب دیکھنی پڑے گی ناں، آخر بھابھی جو بننے والی ہو میری۔''

اس پر اریشہ کے چلانے کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا، تب ہی مزے سے اس کی سماعتوں میں زہر انڈیلتے ہوئے وہاں سے چلی گئی تو اریشہ گم سم سی کیفیت میں پتھر بنی پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

کیا بم گرا گئی تھی وہ اس کی سماعتوں پر، اس نے تو کبھی خواب میں بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ ازمیر سے ہٹ کر کسی اور کے ساتھ منسوب ہو سکتی ہے یہ تو پھر حقیقت تھی، اور وہ بھی شدید کڑوی، کیا وہ فرزانہ بیگم یا ماہم کے مزاج سے آشنا نہیں تھی؟ کیا وہ نہیں جانتی تھی کہ فرزانہ بیگم کی بہو اور ماہم جیسی فسادی لڑکی کی بھابھی بن کر اس کی زندگی کا ہر لمحہ عذاب بن جاتا؟ سب کچھ جانتی تھی وہ بہت اچھے طریقے سے، تب ہی تو سماعتوں میں گویا زہر اتر آیا تھا۔ سخت بے یقین انداز میں اس نے سر جھٹکا اور بے قراری سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''مجھے ازمیر سے اس معاملے میں بات کرنی چاہیے، جلد از جلد۔''

فیصلہ کن انداز میں اس نے سوچا، اور تھکے تھکے سے قدم اٹھاتی اپنے کمرے میں چلی آئی باہر موسم بہت خوشگوار ہو رہا تھا بہت حد تک ممکن تھا کہ ابھی کچھ لمحوں میں بارش کا سلسلہ شروع ہو جائے۔ کل اسے اپنا پہلا پرچہ دینا تھا۔ مگر ذہن تھا کہ الجھتا ہی جا رہا تھا اور اس الجھن کو صرف ایک ہی شخص سلجھا سکتا تھا ازمیر حسن شاہ جس کے گھر لوٹنے کا وہ بہت بے صبری کے ساتھ انتظار کر رہی تھی۔

وہ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد گھر لوٹ آیا۔ باہر بارش کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جس کی وجہ سے اس کی شرٹ قدرے بھیگ چکی تھی تاہم اریشہ کو گھریلو ملازمہ کے ذریعے جیسے ہی اس کی گھر آمد کا پتہ چلا، وہ ایک منٹ کی تاخیر کیے بغیر اپنی انگلش کی بک اٹھا کر اس کے کمرے کی طرف دوڑ گئی۔

اندر وہ بھیگی شرٹ اتار کر، دوسری شرٹ پریس کر رہا تھا، اریشہ کتاب بیڈ پر پھینکتے ہوئے تیزی سے اس کی جانب لپکی اور اس کے ہاتھ سے شرٹ لیتے ہوئے بولی۔

''لاؤ میں پریس کر دیتی ہوں۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے کتنے مان سے کہا تھا مگر ازمیر نے نہایت سنگ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شرٹ اس کے ہاتھ سے جھپٹ لی تو وہ چپ چاپ اس کے بیڈ پر جا کر بیٹھ گئی۔

ازمیر شرٹ پریس کرنے سے فارغ ہوا تو کمپیوٹر کھول کر بیٹھ گیا۔ ازمیر کیا تم مجھے اس بے وجہ کی ناراضگی کا سبب بتاؤ گے۔''

وہ شدید انسلٹ محسوس کرنے کے باوجود اس کے قریب چلی آئی، اور دھیمے لہجے میں پوچھا تو ازمیر نے اپنی توجہ کمپیوٹر کی اسکرین پر مرکوز کیے ہوئے نہایت بے رخی سے جواب دیا۔

''میں اس وقت مصروف ہوں اریشہ، پلیز جاؤ تم یہاں سے۔''

''او کے...... چلی جاؤں گی...... جب تمہیں ہی میری طرف دیکھنا گوارہ نہیں تو مجھے بھی زبردستی تمہارے منہ لگنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ مگر پھر بھی مجھے تمہاری ہیلپ چاہیے ازمیر۔ کیونکہ کل میرا انگلش کا پرچہ ہے، اور میں تمہارے بغیر اپنی تیاری سے مطمئن نہیں ہو پا رہی ہوں، سو پلیز میری ہیلپ کر دو۔''

اس کا خیال تھا کہ شاید اسی طرح سے وہ اسے منانے میں کامیاب ہو جائے مگر یہاں بھی اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ وہ بڑے روکھے انداز میں کہہ رہا تھا۔

''سوری.....میں نے کہا ناں کہ میں اس وقت بزی ہوں، تم اذہان کو فون کر کے بُلا لو وہ کر دے گا تمہاری ہیلپ۔''

خاصا چبھتا ہوا لہجہ تھا اس کا، اریشا اپنے اور اس کے بیچ اذہان کا ذکر سن کر گنگ رہ گئی۔ پھر وہ قدرے جتانے والے انداز میں بولی۔

''وہ اگر یہاں پر ہوتا ضرور مدد کرتا میری، اور اس کے ہوتے ہوئے مجھے تمہیں زحمت دینے کی کوئی ضرورت بھی نہیں تھی مگر اس وقت وہ یہاں پر نہیں ہے، تب ہی تمہارے آگے ہاتھ جوڑنا پڑ رہے ہیں مجھے۔''

اسے بھی خاصا تاؤ آ گیا تھا۔ لہٰذا قدرے جل کر بولی تھی اور اس کے الفاظ نے ازمیر کو مزید جلا دیا تھا۔

وہ قدرے سلگتے ہوئے بولا۔

''سوری میں بھی اس وقت تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا جاؤ تم۔''

''کیوں..... کیوں مدد نہیں کر سکتے تم میری، ہوا کیا ہے آخر..... بتاؤ مجھے۔''

وہ مزید اس کی بے رخی کو برداشت نہیں کر پائی اور جھلا کر اس کے بازو کو جھنجھوڑ ڈالا تو ازمیر نہایت اجنبی انداز میں اسے پرے دھکیلتے ہوئے برہمی سے کہا۔

''کہا تو ہے کہ اس وقت میں بزی ہوں، اب اور کتنی بار دہراؤں یہ بات؟''

وہ ایک مرتبہ پھر اس کے رویے سے ہکا بکا رہ گئی تھی۔ ذہن تھا کہ پل بھر میں گھوم گیا اور اس نے بنا سوچے سمجھے نہایت ضدی انداز میں آگے بڑھ کر اس کا کمپیوٹر آف کر دیا۔

''اب تو فارغ ہو ناں تم.....؟''

وہ اسے ہر حال میں اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتی تھی مگر اس کی اس قدر جرأت پر ازمیر کا دماغ تو ایک منٹ میں گھوم گیا اور اس نے اگلے ہی پل کھینچ کر ایک زبردست چانٹا اس کے خوب صورت گال پر دے مارا، اس چانٹے کی شدت اس قدر شدید تھی کہ اریشہ خود کو سنبھال ہی نہ سکی اور لڑکھڑا کر قریب ہی پڑے رائٹنگ ٹیبل پر جا گری۔

''میں اپنے معاملات میں کسی کی مداخلت قطعی برداشت نہیں کرتا، سمجھیں تم.....؟''

شہادت کی انگلی اٹھا کر، نہایت درشت انداز میں وارن کرتا وہ اسے کوئی اور ازمیر ہی لگا وگرنہ اس سے قبل اس نے، اس کا ایسا روپ قطعی نہیں دیکھا تھا، تب ہی جلتے گال پر ہاتھ رکھ کر ڈبڈبائی آنکھوں میں ڈھیروں بے یقینی لئے وہ ٹکر ٹکر اسے دیکھتی رہ گئی، جبکہ ازمیر بنا اس پر کوئی نظر ڈالے فوراً کمرے سے باہر نکل گیا۔

وہ کتنی ہی عجیب گم سم سی کیفیت میں گھری گال پر ہاتھ رکھے ہوئے وہیں کھڑی رہی، پھر آنکھوں سے آنسو نکل کر گالوں پر لڑھکے تو جیسے وہ چونک کر ہوش کی دنیا میں واپس آئی، تب ہی اس کی نظر سامنے رائٹنگ ٹیبل پر دھری کتابوں کے ڈھیر پر پڑی۔ جہاں اس نے اپنے دل کا حال کاغذ کے ایک بے جان ٹکڑے کے سپرد کر کے ایک کتاب میں رکھ چھوڑا تھا، مگر اب وہ کتاب میز پر کھلی پڑی تھی اور اس میں کوئی کاغذ نہیں تھا، جس کا مطلب

تھا کہ ازمیر اس کا حال دل جان چکا تھا، اور اس کے باوجود بھی اس نے اتنا سخت ری ایکٹ کیا......؟

رہ رہ کر یہ سوال اس کے ذہن میں گردش کرتا رہا، اور وہ بوجھل سے دل کے ساتھ اس کے کمرے سے باہر نکل آئی۔

''ارے......اریشہ...... یہ نشان کیسا ہے تمہارے گال پر......''

وہ جوں ہی آنسو پونچھتے ہوئے ازمیر کے کمرے سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف بڑھی، فرزانہ بیگم سے مڈبھیڑ ہوگئی اور اب وہ اس کے سرخ و سفید گال پر ہاتھ کی انگلیوں کے جے ہوئے نشان دیکھ کر، بڑے کڑے لہجے میں اس سے تفتیش کر رہی تھیں۔ اریشہ کا ذہن تو پہلے ہی ماؤف ہو چکا تھا۔ اوپر سے فرزانہ بیگم کا تھانیدار والا انداز لہٰذا ایک لمحے کے لئے تو وہ گڑبڑا کر رہ گئی۔ سمجھ میں نہ آیا کہ فوری طور پر کیا بہانہ گھڑے، تب ہی اس نے چپ چاپ سر جھکا لیا تو اس کی خاموشی پر فرزانہ بیگم اسے بازو سے پکڑ کر ہال میں سب کے درمیان لے آئیں۔ تو اریشہ کی رہی سہی جان بھی لبوں پر آگئی۔ تب ہی وہ ان کی گرفت سے بازو چھڑانے کی کوشش میں منمناتے ہوئے بولی۔

''وہ......وہ آنٹی......مم......میں......''

''کیا......میں......میں سچ سچ بتاؤ کس نے چانٹا مارا ہے تمہیں؟''

اس کے منمنانے پر وہ مزید بلند آواز میں دھاڑیں تو اریشہ سے خود اپنا ہی بھرم رکھنا دشوار ہوگیا۔ تب ہی ماہم وہاں چلی آئی، پھر اس کے گال پر تھپڑ کے نشان کو بغور دیکھتے ہوئے مسکرا کر طنزیہ لہجے میں بولی۔

''مما......آپ کتنا بھی پوچھ لیں مگر یہ اپنے منہ سے کبھی ازمیر بھائی کا نام لینے والی نہیں، پتہ نہیں کیا جادو کر رکھا ہے انھوں نے اس پر۔''

ماہم کا تیر نشانے پر لگا تھا، وہ اتنے لوگوں کے درمیان تماشہ بن کر رہ گئی۔

''وہ......وہ آنٹی غلطی میری ہی تھی، مم......میں نے ہی اسے ڈسٹرب کیا تھا، تب ہی اسے غصہ آگیا۔''

ماہم بھانڈا نہ پھوڑتی تو وہ کبھی ازمیر کا نام اپنے لبوں پر نہ لاتی، مگر اس وقت وہ خود کو بے حد لاچار محسوس کر رہی تھی، تب ہی اصل بات بتانا پڑی تھی، جسے سن کر خود اس کی والدہ نورینہ بیگم کا پارہ آسمانوں کو چھو گیا۔

''اس دو ٹکے کے لڑکے کی یہ مجال کہ اس نے تمہیں چانٹا مارا ہے کیا وہ کسی ریاست کا جاگیردار......؟'' قریبی صوفے سے اٹھ کر اس کے قریب آتے ہوئے وہ بے حد غصے سے چلائی تھیں۔ جبکہ اریشہ ان کا منہ دیکھ کر بری طرح کانپ کر رہ گئی۔ وہ کسی بھی قیمت پر، گھر میں لڑائی فساد نہیں چاہتی تھی، تب ہی ازمیر کی پوزیشن کلیئر کرتے ہوئے منمنائی۔

''مم......مما......پلیز میری بات سنیں، غلطی میری ہی تھی میں نے اسے ڈسٹرب کیا تھا، اس کا پورا پروگرام خراب کر ڈالا تھا، تب ہی اس نے ہاتھ اٹھایا۔ مگر بہت زور سے چانٹا نہیں مارا اس نے مجھے، میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں مما، پلیز میرا یقین کریں، ازمیر کی اس میں کوئی غلطی نہیں۔''

وہ ایک مرتبہ پھر عاجزی سے گڑگڑائی تھی، مگر غصے سے بے حال نورینہ بیگم نے نخوت سے سر جھٹک دیا۔

بہت زور سے چانٹا نہیں مارا اس نے تمہیں......؟'' تو پھر یہ نشان کیسے بن گیا تمہارے گال پر؟''

''وہ......مما......''

''شٹ اپ......کوئی ضرورت نہیں ہے تمہیں اس کی ہمدردی کرنے کی، میں آج اچھی طرح مزاج ٹھیک کرتی ہوں اس کا۔''ان کا غصہ ساتویں آسمان کو چھو رہا تھا فرزانہ بیگم نے اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور لوہے کو گرم دیکھ کر اس پر چوٹ لگاتے ہوئے بولیں۔

''نور آپا......پلیز مائنڈ مت کیجئے گا لیکن انصاف سے کام لیں تو کہیں نہ کہیں قصور آپ کی اریشہ کا بھی بنتا ہے، اسے کون دعوت دیتا ہے کہ بھاگ بھاگ کر اس کے ناز اٹھائے، آخر ہماری بیٹیاں بھی ہیں مگر ہم نے اپنے بچوں پر ایک حد قائم کی ہوئی ہے۔ یہ نہیں کہ ہر ایک کسی بھی ایرے غیرے سے ہمدردی کا بخار چڑھا رہے۔''

پتہ نہیں وہ اپنے دل کے کون سے پھپھولے پھوڑنے کی کوشش کر رہی تھیں اریشہ نے حد درجہ دکھ اور بے بسی سے ان کی طرف دیکھا۔

''ارے سچ کہتی ہیں آپ، جب اپنا ہی آنگن ٹیڑھا ہو تو دوسرے کو الزام دینے سے کیا فائدہ، پتہ نہیں ان باپ بیٹیوں کو ہر کسی سے ہمدردی کا بخار کیوں چڑھا رہتا ہے۔ اب ان کے باپ کا گھر تو چھوڑ آئی مگر ان بیٹیوں کو کیسے چھوڑوں......؟'' یہ تو میری ذمے داری ہیں، لیکن لگتا ہے کہ اب اس ذمے داری سے بھی جلد ہی سبکدوش ہونا پڑے گا مجھے۔''

آج سچ مچ اریشہ نے سب کے سامنے ان کی ناک کٹوادی تھی، تب ہی وہ کوئی فیصلہ کرتے ہوئے دل گرفتہ انداز میں بولیں تو گویا اریشہ کا دل طوفانوں کی زد میں آ گیا۔ کسی قدر الجھ کر بے یقینی سے اس نے اپنی ماں کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔

سنتے ہیں کہ اپنے ہی تھے دل لوٹنے والے
اچھا ہوا کہ میں نے تماشا نہیں دیکھا
یہ شہرِ صداقت بھی عجب شہر ہے جنجم
میں نے یہاں اک شخص بھی سچا نہیں دیکھا
اب جو آئے ہو تم تو کیا ہو گا.....؟
خود دکھو گے مجھے دکھاؤ گے
اب یہی ہو گا تم درِ جاں پر
دستکیں دے کے لوٹ جاؤ گے
وہ جو اک شخص مجھ میں زندہ تھا
اس کو زندہ کہاں سے لاؤ گے؟
ایسے موسم گزر گئے ہیں اب
مجھ کو بھی مجھ سا تم نہ پاؤ گے!

عدنان کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ہسپتال کے ایک کشادہ پرسکون کمرے میں نرم بستر پر لیٹے ہوئے پایا اور اس کے قریب پڑی کرسی پر وہ محسن لڑکی بیٹھی تھی جسے وہ پامال کرنے کے بھیانک ارادے سے لے جارہا تھا۔ جس کا فخر سے اٹھا ہوا سر جھکا کر وہ اپنے دل کا سکون پانا چاہتا تھا۔ جسے وہ اپنے سامنے گڑگڑاتے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا، اور اس وقت وہی لڑکی اس کی جان بچا کر اسے یہاں زندگی سونپنے لے آئی تھی۔ وہ جسے برباد کرنا چاہتا تھا، اسی نے رو رو کر ان آوارہ لڑکوں سے اس کی زندگی کی بھیک مانگی تھی۔

کیوں.....؟

کیا کوئی لڑکی اتنی اعلیٰ ظرف ہو سکتی ہے؟ اتنی پاگل ہو سکتی ہے؟ تو پھر انجشاء احمر کیوں اتنی اعلیٰ ظرف ہو گئی تھی؟ کیوں پاگل پن کا مظاہرہ کیا تھا اس نے.....؟

آنکھ کھلتے ہی اس کے ذہن میں جو بھونچال آیا تھا وہ ان ہی سوالات کا تھا، جب ہی وہ کسی قدر الجھ کر اسے دیکھ رہا تھا، جو اسے ہوش میں آتے دیکھ کر، مطمئن چہرے کے ساتھ دھیمے سے مسکرائی تھی۔

''اب کیسے ہیں آپ.....؟'' مسکرا کر اپنائیت سے اس نے پوچھا تھا۔

''ٹھیک ہوں۔'' نگاہیں چرا کر اس نے مختصر جواب دیا۔

''شکر ہے خدا کا' آپ کو پتہ ہے، آپ پورے تین روز کے بعد ہوش میں آئے ہیں۔''

اپنائیت کے ساتھ ساتھ اس کے لہجے میں احترام کی آمیزش بھی تھی۔ عدنان چپ چاپ گم سم سا اسے دیکھے گیا۔

''پلیز مائنڈ مت کیجیے گا، وہ میں چونکہ آپ کے گھر والوں کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی، تو میں انہیں آپ کے بارے میں انفارم بھی نہیں کر پائی، اسی لیے تین دن سے یہاں میں اور اریج، آپ کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ اب اریج آئیں تو پلیز آپ انہیں اپنا فون نمبر دیجیے گا، تاکہ آپ کے گھر والوں کو اطلاع کی جا سکے، بہت پریشان ہوں گے ناں وہ لوگ، تین دن سے آپ کی غیر حاضری پر۔''

وہ ایسے انداز میں بات کر رہی تھی گویا ان دونوں کے مابین کوئی ناخوشگوار واقعہ ہوا ہی نہ ہو۔ کتنا حیران کر رہی تھی اسے یہ لڑکی اول روز سے ہی، اور دن بدن کتنا الجھتا جا رہا تھا وہ اس کی انفرادیت کے سحر میں۔ وہ اسے یک ٹک یوں ہی، حیران حیران سا دیکھ رہا تھا جب وہ ایک مرتبہ پھر مخاطب ہوئی۔

''عدنان! میں جانتی ہوں کہ آپ بہت اچھے نوجوان ہیں، مجھے یہ بھی معلوم ہے آپ کو آپ کی بری صحبت نے راہ راست سے بھٹکا دیا ہے، لیکن میں آپ سے امید کرتی ہوں کہ اس حادثے کے بعد آپ خود کو تھوڑا بہت ضرور بدل لیں گے۔ کیونکہ لائف کو انجوائے کرنے کے لیے جس غلط راستے کا انتخاب آپ نے کیا ہے، وہ راستہ سوائے آپ کو رسوائی اور مصیبت کے گھٹا ٹوپ اندھیروں کے اور کہیں نہیں لے جائے گا، تاریخ ہمیشہ اپنا آپ دہراتی ہے۔ اس لیے ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھایئے، کیونکہ بعض اوقات اپنے ہی قدموں سے اٹھی ہوئی دھول انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔ میں چلتی ہوں اب، آپ پلیز اپنا خیال رکھیے گا۔''

وہ ایک لڑکی نہیں تھی، ساحرہ تھی، جادوگرنی تھی کوئی، جو اپنی باتوں، اپنے لفظوں اور اپنے عمل سے سامنے والے بندے پر جادو کر کے اسے بے بس کرنے کا گر جانتی تھی۔ عدنان کو یکلخت ہی اس سے ڈر لگنے لگا۔ تب ہی اس نے فوراً ہی اپنی پلکیں موند لیں، مگر وہ تو بند آنکھوں میں بھی در آئی تھی۔ تب ہی اس نے گھبرا کر دوبارہ آنکھیں کھول دیں تو وہ کمرے میں نہیں تھی۔ وہ وہاں سے جا چکی تھی۔ مگر اس کے باوجود کمرے میں اس کے وجود کی مخصوص خوشبو، اسے ہر طرف بکھری ہوئی محسوس ہوئی، یوں لگا جیسے وہ، وہیں بیٹھی ہو، بس صرف اسے نظر آنا بند ہو گیا ہو۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے جس خوف کے سحر میں آ کر اس نے اپنی پلکیں موندیں تھیں۔ وہ ڈر تو پورا ہو گیا تھا اس کا۔ مگر وہ اپنے وجود کے ساتھ پل کے پل میں اس کے دل میں اتر آئی تھی، اور وہ بے بس سا، بستر پر پڑا اس اچانک ڈکیتی کی واردات پر کچھ نہیں کر سکا۔

اگلے کچھ ہی لمحوں میں اریج وہاں چلا آیا۔ پھر اس سے گھر کا نمبر لے کر اسی نے عدنان کے گھر والوں کو اس کی خیریت کی اطلاع دی اور انہیں عدنان کے ہسپتال میں ایڈمٹ ہونے کے متعلق بتایا۔ نتیجتاً اگلے دس پندرہ منٹ میں، وہ لوگ ہسپتال میں تھے۔ اس کی مما کا تو رو رو کر برا حال ہو چکا تھا۔ جبکہ اس کے پاپا، یوں نڈھال دکھائی دے رہے تھے گویا برسوں کے بیمار ہوں۔

''عدنان! ہوا کیا تھا بیٹے' پلیز مجھے بتاؤ، میں تھانے میں ابھی رپورٹ درج کرواتا ہوں۔'' مسٹر رؤف احمد بے چینی سے ہو کر اس کے بیڈ

پر بیٹھتے ہوئے بولے تھے جبکہ وہ شرمندہ نظروں سے فقط سرسری سا انہیں دیکھتے ہوئے آنکھیں جھکا گیا، کہتا بھی تو کیا......؟ کہنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں اس کے پاس، تب ہی بمشکل تھوک نگلتے ہوئے بولا۔

''یہ بس ایک ایکسیڈنٹ تھا پاپا، جس میں غلطی میری ہی تھی۔ میں ہی دھیان سے ڈرائیونگ نہیں کر رہا تھا۔'' وہ اس کے علاوہ کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ رؤف احمد صاحب کے چہرے پر تھوڑی سی نرمی آئی، جبکہ مسز رؤف مسلسل اس کی پیشانی اور اس کے گال چومتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

''اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو ہم کیا کرتے بیٹے، تم ہی تو ہمارے جینے کا سہارا ہو، تمہارے بغیر کیسے زندہ رہتے ہم۔'' وہ پہلے ہی اولاد کی محبت میں بہت پٹی تھیں۔ تب ہی انہیں اپنے جذبات پر کنٹرول رکھنا بہت دشوار ہو رہا تھا۔

''مما! اب تو ٹھیک ہوں ناں؟ پلیز اب تو آپ رونا بند کر دیجیے۔''

اسے حقیقت میں اپنی ماں کے آنسو تکلیف دے رہے تھے۔ ایک تو پہلے ہی مارے ندامت کے وہ اپنے ضمیر کے سامنے بے حد چھوٹا محسوس کر رہا تھا خود کو، اوپر سے اس کی اوچھی حرکتوں نے اس کے پیارے ماں باپ کو بھی شدید تکلیف پہنچا ڈالی تھی۔ اسے ہمیشہ اپنے حسب ونسب، اپنے خاندانی وقار پر فخر ہوتا تھا، مگر اس وقت اسے خود اپنے آپ سے کراہیت آ رہی تھی۔ نفرت ہو رہی تھی اپنے وجود سے اور اس پہ ستم ظریفی یہ کہ وہ اپنے اس گناہ کا اعتراف بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس وقت اس کا پورا وجود سفید پٹیوں میں جکڑا تھا، مگر وہ محض دل میں محسوس ہو رہا تھا۔ اریج اس کے ممی پاپا سے کیا کہہ رہا تھا، وہ اس سے کیا پوچھ رہے تھے، اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ نظر کے کینوس پر اگر کوئی تھا تو وہ اس منفرد سی لڑکی کا سراپا تھا جس نے بالآخر اپنی ذات کی اچھائیوں سے اس کے اندر کے برے انسان کو شکست دے ڈالی تھی، اور اب اسے اس عظیم لڑکی سے مل کر اپنے گناہوں کا اعتراف کرنا تھا، معافی مانگنی تھی اس سے، اپنے تمام برے اعمال کے لیے، اور یہی سوچ کر اس نے قدرے پرسکون انداز میں اپنی پلکیں موند لیں۔

☆☆☆

''پاپا...... مجھے آپ سے کچھ بات کرنی تھی۔''

فاروق احمد صاحب، کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے اخبار کے مطالعے میں گم تھے، جب اشعر نے بجھے بجھے سے انداز میں انہیں مخاطب کیا، جواب میں انہوں نے قدرے چونک کر سر اٹھایا اور محبت پاش استفہامیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا، جو پاکستان سے آنے کے بعد بہت بجھا بجھا سا رہنے لگا تھا۔

''ہاں کہو بیٹے، کیا بات ہے؟ میں سن رہا ہوں۔''

اخبار لپیٹ کر سائیڈ پر رکھتے ہوئے انہوں نے مکمل توجہ اشعر کی جانب مرکوز کی۔ تو وہ کچھ الجھے الجھے سے انداز میں انہیں دیکھتے ہوئے سامنے ہی کرسی پر ٹک گیا پھر بمشکل ہمت جمع کرتے ہوئے بولا۔

''پاپا...... کیا یہ بات درست ہے کہ بچپن میں آپ لوگوں نے تمکین سے قبل شیزا کو مانگا تھا میرے لیے۔''

''ہاں، لیکن تمہیں یہ بات کس نے بتائی؟''

وہ پل کے پل میں بوکھلا کر رہ گئے تھے۔ اشعر ان سے یہ سوال کرے گا اس کا تو تصور بھی نہیں تھا ان کے پاس، تب ہی اشعر مزید ڈسٹرب ہو کر دھیمے سے بولا۔

''منزہ پھوپھو نے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ لوگوں نے شیزا کو ان کے گناہوں کی سزا دے ڈالی، آپ نے ایسا کیوں کیا پاپا؟''

یہی الجھن تو تھی اسے اتنے دنوں سے، تب ہی تو فاروق احمد بیٹے کی ٹینشن کو مدنظر رکھتے ہوئے چاہنے کے باوجود، اس سے کچھ بھی نہیں چھپا پائے، اور ٹھنڈی آہ بھر کر تفصیل سے گویا ہوئے۔

''ہاں بیٹے، شیزا بیٹی کو اس کی ماں کے قصور کی سزا ملی مگر ایسا تو ہونا ہی تھا، تم میرے اکلوتے بیٹے ہو، میں جان بوجھ کر تمہاری زندگی دکھوں کی دلدل میں نہیں دھکیل سکتا تھا۔ کیونکہ منزہ نے جو قدم صرف اپنے دل کی خوشی کے لیے اٹھایا تھا، اس میں اس کی بیٹی کی زندگی بکھر جانے کے چانسز 99 پرسنٹ تھے اور ہم میں سے کوئی بھی نہیں چاہتا تھا کہ ایک ادھوری لڑکی کو تمہارا شریک سفر بنا دیں۔ کیونکہ شادی محض دو انسانوں کا نہیں، بلکہ دو خاندانوں کا ملاپ ہوتی ہے، پھر ہم کیسے جھک جاتے، منزہ کی غلط ضد اور ناپسندیدہ محبت کے سامنے؟ اس نے تو اپنے شوہر کی قبر کی مٹی پرانی ہونے کا بھی انتظار نہیں کیا، اور جھٹ سے دوبارہ گھر بسانے کا سوچ لیا۔ بہرحال اس سارے قصے میں کہیں نہ کہیں تھوڑا بہت قصور تو ہمارا بھی ہے کیونکہ ہم نے اس کی پسند، اور اس کی رائے کو خاطر میں لائے بغیر، اسے زبردستی، اپنی پسند کے شخص کے ساتھ شادی پر مجبور کر دیا۔ جسے اس نے کبھی دل سے قبول نہیں کیا' اور جب مجبوری کا یہ اینڈھن اللہ کی رضا سے خود بخود ٹوٹ گیا تو اس نے اپنے حق کے لیے آواز اٹھا دی اور یوں ہمیں اس سے ہر طرح کا تعلق ختم کر کے اسے شیزا سمیت ''حسن ولاج'' سے رخصت کرنا پڑا۔ اب تم ہی بتاؤ بیٹے کہ ان حالات میں ہم کیا کرتے؟ تمکین تو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئی تھی۔ ورنہ ہم کبھی شیزا کو تمکین پر ترجیح نہ دیتے۔'' فاروق احمد اپنے تفصیلی بیان کے بعد خاموش ہوئے تو اشعر نے پرسکون ہو کر ایک سرد آہ بھری، پھر وہاں سے اٹھتے ہوئے بولا۔

''تھینکس پاپا...... آپ نے آج یہ سچائی مجھ پر کھول کر میرے دل کو بہت ہلکا پھلکا کر دیا۔ اب انشاء اللہ، میرے اور تمکین کے درمیان کوئی نہیں آ سکتا، کوئی بھی نہیں۔''

اس کے لہجے میں چٹانوں جیسی مضبوطی تھی۔ فاروق صاحب نے دلی طور پر مطمئن ہو کر، مسکراتے ہوئے اپنے جوان بیٹے کو محبت سے دیکھا پھر اس کی بات پر سر ہلاتے ہوئے، دوبارہ اخبار کی طرف مصروف ہو گئے تو اشعر وہاں سے چلا آیا۔

☆☆☆

ہزاروں پل تمہارے بن

نہ پوچھو کیسے کاٹے ہیں

کبھی یادیں ستاتی ہیں

کبھی موسم رلاتے ہیں

ہمارا مان رکھ لینا

ہمیں دل میں بسا لینا

بہت ٹوٹے ہوئے دل سے

بہت روٹھا نہیں کرتے

محبت تو عبادت ہے

زمانے سے چھپاتے ہیں

اسے رسوا نہیں کرتے

سنو، ایسا نہیں کرتے

وہ اپنے کمرے میں بہت اداس سی بیٹھی تھی جب نورینہ بھابی نے معنی خیزی سے ہنستے ہوئے اسے اشعر کا ارسال کردہ کارڈ لا کر تھمایا، جسے اس نے نورینہ بھابی کی وہاں موجودگی کا لحاظ کیے بغیر فوراً جھپٹ کر لیا اور بے قراری سے لفافہ پھاڑ کر نگاہیں کارڈ پر درج تحریر پر جما دیں تو یہی نظم سب سے پہلے پڑھنے کو ملی۔ نیچے اس نے اتنے دن تک کوئی رابطہ نہ کرنے پر سوری لکھا تھا اور ساتھ میں Miss You کے چند انگریزی فقرے جنہیں پڑھ کر وہ خوشی سے جھوم اٹھی۔

''خیریت ...... کہیں پھر سے اپنی آمد کی نوید تو نہیں سنا دی اشعر نے۔''

نورینہ بھابی نے جو اس کے خوبصورت چہرے پر خوشی کے ہزار رنگوں کو پھوٹتے ہوئے دیکھا تو مسکرا کر پوچھ لیا۔ جواب میں تمکین ان کی طرف حیرانی سے دیکھتی ہوئی اپنی بے اختیاری پر جی بھر کر شرمندہ ہوئی۔ پھر دھیمے سے مسکرا کر بولی۔

''نہیں بھابی، وہ دراصل اشعر مجھ سے ناراض تھا تو میں اس بات کو لے کر ٹینس ہو گئی تھی۔ اب اس کارڈ کے ذریعے اس نے مجھ سے صلح کر لی تو میں اپنے دل کی خوشی پر قابو ہی نہیں پا سکی۔''

''ہاں ہو جاتا ہے کبھی کبھی ایسا بھی، بہر حال، آل دا بیسٹ۔''

محبت و اپنائیت سے اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے وہ اس کے کمرے سے باہر نکل گئیں تو تمکین احتیاط سے دروازہ بند کر کے خوب کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

آج کتنے دنوں کے بعد سکون ملا تھا اس کے دل کو؟ وگرنہ تو زندگی ایک دم سے جیسے بوجھل سی ہو کر رہ گئی تھی، اور ابھی وہ جی بھر کر ہنسنا بھی چاہتی تھی کہ اس کے موبائل کی بزر بج اٹھی۔

''ہیلو عزیز از جان، کہو کیسی ہو......؟''

جوں ہی اس نے موبائل کان سے لگا کر ہیلو کہا، اشعر کی کھنکتی ہوئی شوخ آواز سماعتوں سے ٹکرائی۔ اس اچانک سرپرائز پر وہ تو مارے خوشی

کے اچھل سی گئی۔

''ہیلو تمی، تم سن رہی ہوناں۔ دیکھو تم مجھ سے ناراض تو نہیں ہوناں۔''

دوسری طرف وہ بے قرار ہوا تھا۔ تب تمکین نے اس کی پریشانی کا جی بھر کر مزہ لیا اور ہنستے ہوئے بولی۔

''میں جھینگروں سے ناراض نہیں ہوا کرتی، یہ بات اچھی طرح سن لو تم۔''

''اوکے..... تھینک گاڈ..... دیکھو میں رات میں تم سے تفصیلی بات کروں گا، اس وقت تھوڑا جلدی میں ہوں اوکے۔''

جلد بازی تو اس کے لہجے سے ہی عیاں تھی۔ تب ہی تمکین نے بجھے دل کے ساتھ اوکے کہا جواب میں وہ دوسری طرف سے دھیمے سے تھینک یو بول کر رابطہ منقطع کر گیا اور تمکین نے موبائل آف کر کے سینے سے لگاتے ہوئے کچھ لمحوں کے لیے اس کے لفظوں کو سوچا، پھر آپ ہی آپ اس کے گلابی لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ عود آئی، اور وہ سرشاری ہو کر اپنے کل ہونے والے انٹرویو کی تیاری کرنے لگی۔

☆☆☆

شب کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے جب ازمیر نے نڈھال قدموں سے چلتے ہوئے وسیع ٹی وی ہال میں پہلا قدم رکھا، اس کے جسم کے ایک ایک عضو میں درد ہو رہا تھا، اور دماغ تھا کہ جیسے سن سا ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ ابھی اپنے کمرے کی طرف بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک اس کی نظر وہیں لاؤنج میں بیٹھیں حائقہ بیگم پر جا پڑی، جو رات کے اس پہر میں وہاں الگ تھلگ سی بیٹھی نہ جانے کب سے آنسو بہائے جا رہی تھیں۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ان کے قریب چلا آیا، پھر بہت مدھم لہجے میں پوچھا۔

''آر یو اوکے مما.....؟''

حائقہ بیگم نے اس کے سوال پر بہت آہستگی سے جھکا ہوا سر اوپر اٹھایا تھا، پھر شکستہ سے انداز میں کھڑی ہو کر بنا ایک لفظ کہے ایک زوردار طمانچہ اس کے گال پر دے مارا۔

''مما.....؟''

ازمیر نے گال پر ہاتھ رکھ کر پھٹی پھٹی بے یقین آنکھوں سے حائقہ بیگم کی طرف دیکھا جو اس وقت بے حد آزردہ لگ رہی تھیں۔ وگرنہ انہوں نے تو کبھی آج تک اسے بلند آواز میں ڈانٹا بھی نہیں تھا۔

''سمجھتا کیا ہے تو اپنے آپ کو.....؟ شہزادہ ہے کسی ریاست کا؟ جو جلال میں آ کر اس معصوم بچی کا پھول سا گال ادھیڑ ڈالا تم نے.....؟''

وہ گھٹی گھٹی سی نم آواز میں چلائی تھیں۔ ازمیر کو ان کے اس زبردست چانٹے کی اصل وجہ معلوم ہو گئی۔

''اوہ تو یوں کہیے ناں کہ اس گھنی لڑکی نے میری شکایت کی ہے آپ سے۔''

عجیب نفرت سی تھی اس کے لہجے میں، حائقہ بیگم نے نہایت دل گرفتگی سے اپنے بیٹے کے مرجھائے ہوئے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ تب ہی وہ آنسو پیتے ہوئے قدرے نرم لہجے میں بولیں۔

''مجھ سے اریشہ نے شکایت نہیں کی ہے بلکہ اس کے گال پر، تمہاری انگلیوں کے چھپے ہوئے نشان دیکھ کر، سب گھر والوں نے سوال اٹھایا ہے تمہاری اس حرکت پر۔ کتنا خیال کرتی ہے وہ تمہارا، اور آج تم نے ہی اسے بے قصور سب گھر والوں کے بیچ تماشہ بنا چھوڑا۔''

نہایت دکھ تھا ان کے لہجے میں، تاہم ازمیر نے نفرت سے سر جھٹک دیا۔

''ازمیر...... دیکھو بیٹے اریشہ بہت اچھی لڑکی ہے، بچپن سے دیکھتی آ رہی ہوں میں اسے، تو گھر پر نہیں ہوتا تب بھی وہ مجھ سے صرف تمہاری ہی باتیں کرتی رہتی ہے۔ پھر کیوں دکھی کر رہے ہو تم اسے؟ تمہیں پتہ ہے آج نورینہ آپا کتنا غصہ ہو رہی تھیں تم پر، صاف لفظوں میں انہوں نے اریشہ کو تم سے بات تک نہ کرنے کی دھمکی دی ہے، یہ اچھی بات تو نہیں ہے بیٹے، پھر کیوں شکایت کا موقع دیتے ہو تم ان لوگوں کو۔''

انہوں نے اسے ممکنہ حد تک سمجھانے کی کوشش کی، مگر ازمیر ان کے لفظوں پر گویا ہتھے سے اکھڑ گیا۔ تب ہی چلاتے ہوئے بولا۔

''اریشہ اچھی لڑکی ہے یا بری، مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، اور رہا سوال نورینہ آنٹی کا، تو انہیں مجھ پر غصہ ہونے کی بجائے، اپنی بیٹی پر کنٹرول کرنا چاہیے، جسے ہمہ وقت دوسروں سے ہمدردیاں جتانے کا بخار چڑھا رہتا ہے، اگر اتنی ہی غصے والی ہیں وہ تو روک کیوں نہیں دیتیں اپنی بیٹی کو؟ میں اسے کھینچ کر تو نہیں لاتا اپنے پاس۔''

ہاتھ اٹھا کر نہایت بدتمیزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ سخت بے زاری کے عالم میں بولا تھا اور اگلے ہی پل انہیں کچھ بھی کہنے کا موقع دیئے بغیر لمبے لمبے ڈگ بھرتا تیزی سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ تو وہ دکھ سے وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

کس دوراہے میں لا کر کھڑا کیا تھا آج زندگی نے انہیں، کہ وہ نہ اولاد کو کچھ کہہ سکتی تھیں اور نہ ہی شاہ ولاج کے دوسرے مکینوں کو، گویا دونوں طرف سے ان کی حیثیت ڈاؤن ہو کر رہ گئی تھی۔

گھر میں آج کل اریشہ اور اذہان کی شادی کے تذکرے ہو رہے تھے۔ باقاعدہ بزرگوں سے صلاح مشورے کے بعد ان دونوں کو پہلے منگنی کے بندھن میں باندھنے کی تیاری شروع کر دی گئی تھی، مگر ازمیر کو چونکہ ان جھمیلوں سے قطعی کوئی غرض نہیں تھی لہٰذا وہ سارا دن خود کو آفس میں مصروف رکھتا، پھر وہاں سے فارغ ہونے کے بعد لانگ ڈرائیو پر نکل جاتا کہ اب یہ اس کی روزمرہ کی عادت میں شامل ہو چکا تھا۔

حائقہ بیگم دن رات بیٹے کی اس ٹوٹ پھوٹ پر کڑھتی رہتیں، مگر بے بس تھیں کہ کچھ بھی کرنا ان کے اختیار میں نہیں تھا۔

اس روز بھی وہ گم صم سی کچن میں رات کے کھانے کی تیاری کر رہی تھیں جب بجھی بجھی سی اریشہ نہایت رف حلئے میں ان کے پاس چلی آئی۔

''آنٹی مجھے آپ سے بات کرنی تھی۔''

وہ سالن میں چمچہ چلا رہی تھیں جب انہیں اریشہ کی دھیمی آواز سنائی دی۔ تب قدرے چونک کر وہ اس کی طرف پلٹیں، اور استفہامیہ نگاہوں سے اس کے مرجھائے ہوئے چہرے کو دیکھا جو اس وقت بہت مضطرب دکھائی دے رہا تھا۔

''آنٹی، وہ آپ نے اس دن مما کی بات کو لے کر ازمیر سے تو کچھ نہیں کہا ناں......؟ آنٹی پلیز یقین کریں غلطی میری ہی تھی، میں نے ہی

خواہ مخواہ اسے ڈسٹرب کیا تھا۔ اس کا پورا نیٹ پروگرام خراب کر ڈالا تھا۔ تب ہی وہ غصہ ہوا، اس میں اس کا کوئی قصور نہیں آنٹی، پلیز آپ میرا یقین کریں۔''

بھری بھری آواز کے ساتھ، اس کی سرخ سوجھی ہوئی آنکھوں میں ایک مرتبہ پھر نمی چھلک آئی، جو اس نے نہایت تیزی کے ساتھ فوراً ہتھیلی کی پشت سے ہاتھوں میں جذب کر لی۔

حائقہ بیگم نے کسی قدر توجہ سے اس پیاری سی اداس لڑکی کو دیکھا، جسے وہ چاہنے کے باوجود بھی کبھی سمجھ نہیں پائی تھیں۔ پھر وہ نہایت شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں۔

''تم اسے اگنور کر دو بیٹا، وہ تمہاری دوستی کے لائق نہیں ہے۔ تم فی الحال مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارے پیپرز کیسے ہوئے؟ اس بار تو فرسٹ ڈویژن آئے گی ناں۔''

وہ نہ جانے اسے سمجھانا چاہتی تھیں یا بہلانا بہر حال انکے الفاظ نے کچھ لمحوں کیلئے اریشہ کو پر سکون سا کر دیا' تب وہ مسحور کن لہجے میں بولی۔

''وہ میرا دوست ہے آنٹی، بہت اچھا دوست، اور میں اس کی وقتی غلطیوں کی بنا پر اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ نہیں سکتی۔ آپ کی دعاؤں سے میرے پیپرز بہت زبردست ہو گئے، بس اب تو بے قراری سے رزلٹ کا انتظار ہے۔'' وقتی ہی سہی، وہ بہل گئی تھی۔ حائقہ بیگم نے فرطِ مسرت سے اس کی پیشانی چوم لی۔

''شاباش...... اب انشاءاللہ ضرور میری بیٹی کو میڈیکل کالج میں داخلہ ملے گا۔ چلو جلدی سے منہ ہاتھ دھو لو، میں ابھی کھانا لگا دیتی ہوں۔''

اریشہ کے لیے ان کے لہجے میں محبت ہی محبت تھی۔ تب ہی وہ ان کے ہاتھ تھام کر مسرت سے کھلکھلا اٹھی۔ مگر مسرتوں اور کھلکھلاہٹوں کا یہ دورانیہ بہت طویل نہیں تھا۔ وہ ابھی تک بزرگوں کے مابین ہونے والی کھسر پھسر سے بے نیاز تھی، اور یہ بے نیازی، اس وقت ہوا ہو گئی جب ماہم نے اسے اگلے ہی ہفتے اس کی اور اذہان کی منگنی کی خبر سنائی، جس نے ایک پل کے لیے تو اس کے پاؤں تلے سے زمین ہی کھینچ لی مگر اگلے ہی پل وہ خود کو سنبھالتے ہوئے نورینہ بیگم کے کمرے کی طرف بڑھ گئی کہ جن سے اس قدر جلدی اسے ایسے اقدام کی توقع نہیں تھی۔

☆☆☆

''مما! یہ ماہم جو کہہ رہی ہے کیا وہ درست ہے؟''

نورینہ بیگم کے کمرے میں دھڑ سے دروازہ کھول کر داخل ہوتے ہوئے اس نے نہایت دل جلے انداز میں سوال کیا۔ جواب میں نورینہ بیگم جو فون پر کسی سے الجھ رہی تھیں معذرت کر کے ریسیور رکھتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوئیں' پھر قدرے مطمئن انداز میں بولیں۔

''کیا کہہ رہی ہے ماہم......''

''یہی کہ آپ میری اور اذہان کی نسبت طے کر رہی ہیں۔''

کس قدر بے چینی تھی اس کے لہجے میں، تاہم نورینہ بیگم اس کی بے چینی سے قطعی بے نیاز اطمینان سے مسکرا دیں۔

''ہاں، بالکل درست سنا ہے تم نے، کیوں، تمہیں کوئی اعتراض ہے؟''

ان کے لہجے کے اطمینان میں قطعاً کوئی فرق نہیں آیا تھا، جبکہ اریشہ کو لگا کہ جیسے کسی نے اس کے دل کا سارا لہو نچوڑ لیا ہو۔ تب ہی وہ نہایت شکستہ انداز میں بولی۔

''لیکن مما...... آپ نے میری رائے لیے بغیر اتنا بڑا فیصلہ کیسے کرلیا؟''

''ہاں...... کیونکہ یہ فیصلہ تمہاری بھلائی اور محفوظ مستقبل کے پیش نظر ہی کیا ہے میں نے۔''

''لیکن میں اس رشتے سے خوش نہیں ہوں مما۔ میں فرزانہ آنٹی اور ماہم لوگوں کے ساتھ ایڈجسٹ نہیں ہوسکتی۔'' وہ دبے دبے انداز میں چلائی تھی، مگر نورینہ بیگم نے بالکل اس کے لہجے کی پروا نہیں کی، اور مستقل مطمئن انداز میں بولیں۔

''ساری عمر فرزانہ بھابی اور ماہم کے ساتھ نہیں رہنا ہے تمہیں...... اذہان کے ساتھ رہنا ہے، اگر اس میں کوئی خامی ہے تو بتاؤ مجھے۔''

''خامی ہے ناں مما...... بہت بڑی خامی ہے، اور وہ خامی یہ ہے کہ اس نے فرزانہ آنٹی جیسی شعلہ صفت عورت کے بطن سے جنم لیا ہے۔ بظاہر وہ بہت اچھا ہے مگر کہیں نہ کہیں تو اس میں فرزانہ آنٹی کی فطرت کا اثر آیا ہوگا، اور میں ایسے حالات میں گھٹ گھٹ کر زندگی بسر کرنا نہیں چاہتی۔''

بہت ضبط کے باوجود اس کی آواز بھرا گئی تھی مگر نورینہ بیگم گویا اس کے الفاظ پر مجھے سے ہی اکھڑ گئیں۔ تب ہی تقریباً چلاتے ہوئے بولیں۔

''شٹ اپ اریشہ۔ میں نے اگر تمہیں بہت سالاڈ پیار دے رکھا ہے تو اس کا ناجائز فائدہ مت اٹھاؤ، جو مسئلہ تمہارا درد سر نہیں ہے اس کو ل پر لے کر مت الجھاؤ خود کو، ابھی تمہارا اچھا برا سوچنے کے لیے میں زندہ بیٹھی ہوں، جس دن مر جاؤں، اس دن سوچتی پھرنا اپنے لیے۔'' وہ اچھی خاصی سخت گیر ہوگئی تھیں۔ اریشہ کے لیے انہیں اپنا مدعا سمجھانا بہت مشکل ہوگیا۔

''مما! پلیز پلیز مما، میں اذہان کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی۔''

ایک مرتبہ پھر اس نے اپنے دفاع کے لیے آواز اٹھائی تھی۔ مگر نورینہ بیگم کا غصہ ہنوز قائم رہا۔ تب ہی وہ ہاتھ اٹھا کر حتمی انداز میں چلائیں۔

''بس اریشہ، میں مزید اس موضوع پر بحث نہیں چاہتی۔ ساری زندگی تمہارے باپ نے مجھے اپنے فیصلوں سے دکھی رکھا۔ اب تم لوگ فیصلے جماؤ گے مجھ پر اپنے۔ کیا میری کوئی حیثیت کوئی اختیار نہیں، کیا میں زندگی بھر تم باپ بیٹیوں کے فیصلوں کے سامنے ہی سر جھکاتی رہوں گی؟''

بہت ضبط کے باوجود ان کے لہجے میں نمی در آئی تھی۔ تب ہی انہوں نے رخ پھیر لیا جبکہ نڈھال سی اریشہ بے بسی سے ان کی پشت کی جانب ڈبڈبائی نظروں سے دیکھتے ہوئے ان کے کمرے سے باہر نکل آئی کہ اب ازمیر کے سامنے صاف صاف دل کا حال کھول کر رکھ دینے کا وقت آ گیا تھا۔

☆☆☆

''ازمیر مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔''

اگلے ہی دن وہ اسے ٹیرس پر تنہا پا کر کہہ رہی تھی۔ جواب میں ازمیر نے پلٹ کر اسے دیکھا تک نہیں، وہ دیکھنا بھی نہیں چاہتا تھا کیونکہ اسے اپنی تنہائیوں اور اداسیوں کا بار بانٹنے سے کہیں بڑھ کر اریشہ کی خوشیاں اور اس کی عزت عزیز تھی۔ وہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ اس کے اپنے، اس کی وجہ سے اریشہ کے کریکٹر پر انگلی اٹھائیں، اسے محض ہمدردی اور خلوص کی کڑی سزا دے ڈالیں۔

وہ ایسا کچھ بھی نہیں چاہتا تھا کیونکہ وہ خود غرض نہیں تھا۔ تب ہی تو دل کی پروا کیے بغیر مسلسل اتنے دنوں سے اگنور کر رہا تھا اسے، اور کتنی عجیب بات تھی کہ وہ جتنا اسے اگنور کر رہا تھا، اتنا ہی وہ اس کی سوچوں، اس کے خیالات میں گھسی چلی آ رہی تھی۔ تب ہی تو اتنا الجھ کر رہ گیا تھا وہ کہ اب نہ کھانے پینے کا ہوش رہا تھا اور نہ کسی بھی طرح سے اپنا خیال رکھنے کا۔

''ازمیر! پلیز مجھے بتاؤ کہ تم مجھے میرے کس گناہ کی سزا دے رہے ہو؟ پلیز ازمیر اس ناراضگی کی وضاحت تو کرو؟''

وہ اسے دیکھ کر اتنی مسحور کیوں ہو جاتی تھی، آج تک یہ بات وہ خود بھی سمجھ نہیں پائی تھی۔ نہ اسے ایک نظر میں عشق ہوا تھا، نہ وہ ازمیر کے کسی اسٹائل پر مرمٹی تھی۔ بلکہ اس کی سادہ سی محبت تو برسوں سے ازمیر کی رفاقت کا نتیجہ تھی۔ اس کے اندر کے حساس اور اچھے انسان کی پرکھ کا باعث تھی۔ تو اب وہ کیسے فقط چند ہی دنوں میں اس کی بے رخی کو، اسے اپنے دل سے نکال پھینکتی۔ جبکہ اسے تو اپنے سیکنڈ چوائس ہونے پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہوا تھا۔ نہایت سادہ مگر عجیب محبت تھی اس کی، جس میں کسی غرض، کسی وجہ، کسی لحاظ پل کا کوئی گزر نہیں تھا۔ تب ہی تو وہ ہنسی خوشی اس کا ہر ستم ہمیشہ سے، مسکرا کر برداشت کرتی آئی تھی اور اس وقت بھی کر رہی تھی، مگر ازمیر تھا کہ اسے اس کے ٹوٹے بکھرے دل کا احساس تک ہی نہ تھا۔ تب ہی وہ قدرے خفگی سے بولا۔

''جب میں تم سے بات ہی نہیں کرنا چاہتا تو کیوں فورس کرنے چلی آتی ہو تم؟ کیا چاہتی ہو تم، بولو۔ چلا جاؤں یہاں سے ہمیشہ کے لیے...... یہی چاہتی ہو نا تم......؟ تو ٹھیک ہے...... چلا جاؤں گا، بہت جلد، مگر پلیز جتنے دن میں یہاں ہوں، اتنے دن تو مجھے سکون سے جینے دو۔''

کس قدر بے زاری تھی اس کے لہجے میں اریشہ کے مچلتے آنسو جیسے ساکت سے ہو کر پلکوں پر ہی اٹک گئے۔ حلق میں مارے دکھ کے کانٹے سے اگ آئے۔ یوں لگا جیسے وہ کچھ بھی بول نہیں پائے گی، اس کے سامنے۔

''ازمیر، مم، میرا یہ مطلب تو نہیں...... پپ پلیز...... میرا یقین کرو، میں تو تم سے کہنے آئی تھی کہ مما میری مرضی کے خلاف میری شادی کر رہی ہیں، جبکہ میں......''

''پلیز اسٹاپ اٹ اریشہ...... یہ تمہارا اور تمہاری مما کا پرسنل مسئلہ ہے، میں کہیں بھی اس میں انوالو نہیں ہوں، اینڈ ناؤ پلیز لیومی الون۔''

اس کی بات پوری ہونے سے قبل ہی ہاتھ اٹھا کر بے زاری سے وہ چلا یا تھا۔ جبکہ اریشہ ٹھٹک کر رہ گئی، وہ تو جیسے کچھ بھی سننے کا روادار نہیں تھا تو پھر وہ کیسے اپنے دل کی بات اس کے دل تک پہنچاتی، حالانکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ ازمیر صرف شہزرین خان کو چاہتا ہے' مگر پھر بھی دل وحشی تھا کہ کسی طرح قابو میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ ایک ہی رٹ لگائے ہوئے تھا کہ ''ازمیر شاہ چاہیے۔'' اب وہ اس پاگل دل کو کیسے سمجھاتی کہ ازمیر شاہ کوئی

کھلونا نہیں ہے جسے وہ خرید لے، اور نہ ہی وہ زبردستی اس کے دل میں اپنی جگہ بنا سکتی ہے، تب ہی تو کس قدر دکھ سے وہ اس کی چوڑی پشت کو بے بسی سے دیکھتی وہاں سے چلی گئی۔ جبکہ ازمیر نے اس کے چلے جانے پر سرد آہ بھرتے ہوئے آنکھوں سے ٹپکا آنسو انگلی پر اتار کر کس قدر دکھ سے پرے جھٹک دیا۔

☆☆☆

''عدنان...... کیا بات ہے بیٹے، کیا نیند نہیں آ رہی۔''

شب کے تقریباً ساڑھے بارہ ہو رہے تھے اور وہ بے چینی سے بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا جب احمد رؤف صاحب اپنی وہیل چیئر گھسیٹتے ہوئے اس کے کمرے میں چلے آئے۔ کمرے کی لائٹ جل رہی تھی اور وہ بے چینی سے بار بار بستر پر پہلو بدل رہا تھا، جب ہی وہ فکرمندی سے اسے پوچھ بیٹھے تو وہ جو خود سے بھی دل کی بات چھپا رہا تھا، ان کے اچانک استفسار پر قدرے بوکھلا کر بے بسی سے بولا۔

''ہاں...... پاپا نیند نہیں آ رہی ہے مجھے...... نہ جانے کیوں؟''

اس کی سرخ غلافی آنکھوں کے گوشے ہلکے ہلکے نم ہو رہے تھے اور لہجے میں بھی بوجھل پن نمایاں تھا تب احمد صاحب اس کے ریشمی بالوں میں شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

''مجھے معلوم ہے کہ تمہیں نیند کیوں نہیں آ رہی ہے۔ یقیناً تم اس لڑکی کے بارے میں سوچ رہے ہو نا، جس نے تمہاری جان بچانے کے لیے تمہاری مدد کی تھی۔''

بے حد پرسکون لہجہ تھا ان کا، عدنان ان کے اس قدر درست قیاس پر چونک کر ان کو دیکھنے لگا جبکہ وہ کہہ رہے تھے۔

''بہت اچھی بچی ہے وہ...... کل ہی اس نے فون پر مجھ سے بات کی ہے۔''

''ک...... کیا بات کی تھی پاپا؟''

عدنان کو تو گویا چکر ہی آ گیا، یہ سن کر جب کہ وہ ہنوز پرسکون انداز میں بولے۔

''تمہاری خیریت پوچھ رہی تھی اور بتا رہی تھی کہ تمہیں حادثہ کیسے در پیش آیا، بہت تعریف کر رہی تھی تمہاری...... بہت سلجھا ہوا لہجہ تھا اس کا، ضرور کسی اچھے گھرانے سے تعلق رکھتی ہوگی۔ بہت اچھا لگا مجھے اس سے بات کر کے بیٹے۔''

وہ مسرور سے انداز میں بول رہے تھے اور عدنان گم صم سا پتھر بنا انہیں سانس روکے سن رہا تھا۔ جب انہوں نے اچانک ہی سوال اٹھا دیا۔

''عدنان بیٹے! تم ایک مرتبہ پھر گاؤں کا چکر لگا آؤ ناں...... شاید بابا جان وغیرہ کا کوئی اتا پتہ مل جائے۔'' عجیب حسرت تھی ان کے لہجے میں، عدنان ایک مرتبہ پھر الجھ کر انہیں دیکھنے لگا۔ اب وہ انہیں کیا بتاتا کہ دوریوں کے یہ بیج تو اس نے خود بوئے ہیں۔ دلوں میں رنجشوں اور فاصلوں کے یہ پیڑ خود اس کے اپنے ہاتھوں کے لگائے ہوئے ہیں۔ صرف ایک اپنے دل کی خوشی، اور اپنی پسند کی زندگی کی خواہش میں اس نے عزت واحترام، وقار، محبت، خونی رشتوں سب کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ تو اب وہ انہیں کیا بتاتا، اور کیسے بتاتا کہ اس بار گاؤں جا کر بھی وہ کسی رشتے کا سراغ نہیں پا سکا

کیونکہ گاؤں والوں کے مطابق اس کے چچا احمر رؤف اور ان کی بیگم فائزہ رؤف کا سات سال پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا، اور یہ بات اسے آج سے چھ سال قبل ہی معلوم ہو چکی تھی، جب وہ احمد رؤف صاحب کے حادثے کے بعد ان کے مجبور کرنے پر ایک مرتبہ پھر گاؤں گیا تھا، مگر اس بار گاؤں میں اسے اپنی شاندار حویلی تو ملی لیکن اس میں رہنے والے مکین نہیں، گاؤں کے لوگوں کی معرفت ہی اسے اپنے اکلوتے چچا احمر رؤف اور چچی فائزہ بیگم کے اچانک انتقال کی خبر ملی تھی اور یہ بھی کہ اس کے دادا رؤف حسین صاحب اپنی پوتی انجشاء احمر کو لے کر گاؤں سے کہیں چلے گئے ہیں۔ کہاں چلے گئے ہیں، یہ کسی کے علم میں نہیں تھا اور یہ بات وہ پچھلے سات سالوں سے اپنے دل میں چھپائے ہوئے تھا، اس نے کبھی احمد رؤف صاحب کو یہ نہیں بتایا تھا کہ ان کے اکلوتے بھائی احمر اور بھابی فائزہ اب اس دنیا میں نہیں رہے اور یہ بھی کہ وہ گاؤں جا کر بجائے ان سے انجشاء کی رخصتی کی بات کرنے کے، ہمیشہ اس رشتے کو توڑنے کی جدوجہد کرتا رہا ہے اور ان سے ہمیشہ یہ جھوٹ بولتا آیا ہے کہ وہ لوگ ان سے ناراض ہیں لہٰذا انجشاء کو اس کے ساتھ رخصت نہیں کرنا چاہتے بلکہ وہ لوگ اس رشتے کو توڑنے کا اصرار کر رہے ہیں اور احمد رؤف صاحب ہمیشہ اس کے اس سفید جھوٹ پر دل مسوس کر رہ جاتے کہ ان کے والد ان کے قصور کی سزا ان کے لاڈلے بیٹے کو دے رہے ہیں۔ ان کے ضد کر کے شہر چلے آنے اور یہاں اپنا بزنس اسٹیبلش کرنے کے جرم میں وہ انجشاء جیسی پیاری لڑکی اس کے بیٹے کے نصیب سے چھیننا چاہتے ہیں، یہی وہ حقیقت تھی جو انہیں ہر عیش و آرام کے باوجود پہروں اداس رکھتی اور وہ بیٹے سے نگاہیں چرانے پر مجبور ہو جاتے۔

اس کی غلط حرکتوں سے بے خبر وہ ہمیشہ اپنے آپ کو اپنے بیٹے کا قصوروار سمجھتے، تب ہی اسے بار بار گاؤں جانے کی تاکید کرتے کہ شاید ان کے بابا کا دل ان کی طرف سے صاف ہو جائے، اور وہ ان کے حق میں نرم پڑ کر اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور ہو جائیں مگر انہیں ہمیشہ مایوسی کا سامنا ہی کرنا پڑا، کیونکہ عدنان جب بھی گاؤں سے واپس آتا، مایوسی کی خبر ہی لاتا، اور پھر ایک دن یہ آس، یہ امید، یہ خوش گمانی بھی ختم ہو کر رہ گئی جب عدنان نے گاؤں سے واپسی پر انہیں یہ بتایا کہ دادا جی اس کی بار بار گاؤں آمد پر اکتا کر گاؤں ہی چھوڑ کر کہیں چلے گئے، تب کتنا روئے تھے، وہ کتنا ٹوٹ کر بکھرے تھے، مگر اپنی پسند کی زندگی کے خواب سجانے والا عدنان رؤف ان کا لائق فائق اور فرماں بردار بیٹا، ان کے دل کی حالت سے قطعی بے نیاز انہیں بکھرنے کے لیے اکیلا چھوڑ کر، سیال بیگم کے پاس چلا گیا تاکہ ان سے حقیقت شیئر کر سکے اور انہیں ہمیشہ کے لیے انجشاء سے جان چھوٹنے کی خبر سنا سکے، کتنا خوش تھا وہ اس دن، وہ تو گاؤں، دادا جی کو ڈائیورس پیپر پر، انجشاء کے سائن لینے کے لیے مجبور کرنے گیا تھا اور دادا جی اس سے پہلے ہی گاؤں چھوڑ کر نہ جانے کس کوچے کی جانب رخت سفر باندھ گئے۔ اس روز پہلی مرتبہ عدنان کو قدرے پرسکون نیند آئی، بچپن سے اپنے نام کے ساتھ جڑی ایک بے وقوف لڑکی سے چھٹکارا پا کر کتنا ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا وہ مگر اسے یہ خبر کہاں تھی کہ کل کو یہی بے وقوف لڑکی اس کا چین و قرار لوٹ لے گی اور وہ اس حقیقت سے بے خبر ہی رہ جائے گا۔

''کن سوچوں میں کھو گئے بیٹا، میں تو یوں ہی کہہ رہا تھا شاید ان لوگوں کا کوئی سراغ مل جائے تو اب کے میں خود جا کر، بابا جی سے معافی مانگ لوں گا، میں اپنی خطاؤں پر تمہاری خوشیوں اور تمہارے روشن مستقبل کو بھینٹ نہیں چڑھنے دوں گا بیٹے، کبھی اپنے جیتے جی ایسا نہیں ہونے دوں گا میں۔''

اسے گم صم سا کھویا ہوا پا کر وہ ایک مرتبہ پھر پر محبت لہجے میں گویا ہوئے تھے، عدنان دیکھ سکتا تھا کہ ان کی آنکھوں کے گوشے ہلکے ہلکے نم ہو رہے تھے۔ تب ہی وہ اپنے ہاتھوں میں ان کا ہاتھ لے کر دھیمے لہجے میں بوجھل انداز سے بولا۔

''آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں پاپا، میں نے کبھی ایسا نہیں سوچا، اور نہ ہی انجشاء کے لیے کبھی کوئی خاص جذبات پالے ہیں دل میں، پلیز بی لیومی پاپا، آپ جب بھی مجھے گاؤں لے کر جاتے تھے، اور میں وہاں بالکل عام سی شکل وصورت والی، دو چوٹیوں سے کھیلتی ہوئی بے سری سی انجشاء کو دیکھتا تھا تو مجھے گاؤں جانا ہی اچھا نہیں لگتا تھا، اس وقت تو مجھے پتہ بھی نہیں تھا کہ اسی لڑکی کو آپ نے میرے لیے مانگا ہوا ہے۔ تاہم جب انگلینڈ سے واپسی پر مما نے مجھے اس رشتے کی بابت بتایا تو مجھے بہت دکھ ہوا، بچپن میں آپ کے اور داداجی کے مابین طے پانے والے اس رشتے کو میرا دل ہرگز ماننے کے لیے تیار نہیں تھا لیکن میں مما کے سمجھانے پر، آپ کی زبان کا مان رکھتے ہوئے ہمیشہ چپ رہا، مگر اب اور نہیں پاپا، مجبوری کے اس بندھن کو میں مزید نہیں نبھا سکتا ویسے بھی میں سمجھتا ہوں کہ والدین کو اپنے بچوں کی کم عمری میں ان کے مستقبل کو کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ وقت، حالات اور انسان کے بدلتے کوئی دیر نہیں لگتی ایسے میں رشتے مضبوط کرنے کی کوشش کبھی کبھی پہلے سے بھی قائم رشتوں میں دراڑیں ڈال دیا کرتی ہے۔''

اس کا انداز بے حد سلجھا ہوا تھا، احمد رؤف صاحب اس کے مدلل انداز پر دھیمے سے سر اثبات میں ہلانے لگے پھر اگلی صبح وہ اٹھا تو اس کی طبیعت کسی حد تک فریش تھی۔ تب ہی ہلکے پھلکے ناشتے سے فارغ ہو کر وہ سیدھا آفس چلا آیا اور پھر وہیں سے اریج احمر کے آفس کی طرف گامزن ہو گیا کہ اس وقت دل انجشاء کو ایک نظر دیکھنے کے لیے مچلا جا رہا تھا۔

''ہیلو مسٹر عدنان...... کہیے، اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟''

اریج کے آفس میں قدم رکھتے ہی پہلی مڈبھیڑ اسی کے ساتھ ہوئی، وہ کسی ورکر کو کچھ کہنے کے لیے آئی تھی جب اچانک اس کی نظر عدنان پر پڑی اور اس نے تمام تر توجہ اس کی جانب مبذول کرتے ہوئے خاصے بے تکلف لہجے میں پوچھا جواب میں عدنان محض دھیمے سے سر ہلا کر رہ گیا۔

''گڈ...... ویسے بات ہوئی تھی میری آپ کے پاپا سے، آپ شاید سو رہے تھے اس وقت، میرے خیال سے ابھی آپ کو کچھ روز مزید آرام کرنا چاہیے۔''

ہمیشہ کی طرح اس کا لہجہ بے حد فریش تھا، عدنان بس اسے پیاسی نظروں سے دیکھ کر رہ گیا۔

''ارے...... آپ گم صم کیوں کھڑے ہیں، آیئے پلیز بیٹھے ناں۔''

اسے مسلسل خاموش پا کر وہ چہکتے ہوئے بولی تو عدنان نے اس کی آفر پر چپ چاپ قدم اس کی ہمراہی میں اس کے کیبن کی طرف بڑھا دیئے۔

''جی اب بتایئے کہ کیسے آنا ہوا نہیں میرا خیال ہے کہ مجھے آپ سے پہلے یہ پوچھنا چاہئے کہ آپ کیا لیں گے۔ چائے یا کافی۔''

اس کا انداز ایسا تھا گویا وہ برسوں سے بہت اچھے دوست رہے ہوں، تب عدنان نے زبان کھولی اور دھیمے سے مختصر جواب دیا۔

''چائے۔''

''اوکے، اب آپ بتائیے کہ یہاں کیسے آنا ہوا؟''

چائے آرڈر کر کے وہ پھر سے اس کی طرف متوجہ ہوئی تو عدنان کو اپنا مدعا بیان کرنا بے حد دشوار ہو گیا۔

''مس شاہ، مجھے آپ سے کچھ بات کرنی تھی۔''

نگاہیں جھکا کر بمشکل وہ کہہ سکا، جواب میں انجشاء نے دل چسپی سے اسے دیکھا۔

''جی فرمائیے، میں ہمہ تن گوش ہوں۔''

دونوں ہاتھ باندھ کر ٹیبل پر ٹکاتے ہوئے وہ اپنائیت بھرے انداز میں بولی تو عدنان کو کچھ حوصلہ ہوا۔

''مس شاہ...... میں بہت ڈسٹرب ہوں، پلیز بلیو می، میں پچھلے تین روز سے رات کو سو نہیں سکا، رہ رہ کر یہ سوال مجھے پریشان کرتا رہا کہ آپ نے میرے غلط سلوک کے باوجود میری مدد کیوں کی، ہمیشہ میرے تنگ کرنے کے باوجود آپ نے ان لڑکوں سے میری زندگی کی بھیک مانگی، کیوں مس شاہ......؟ کیوں ایسا کیا آپ نے......؟ میں نے تو کبھی آپ کے ساتھ اچھا نہیں کیا، ہمیشہ پریشان کیا ہے آپ کو، اس روز بھی میں آپ کو برے ارادے سے کڈنیپ کر کے لے جا رہا تھا، پھر بھی آپ نے میرے ساتھ اچھا کیا، کیوں......؟ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے تھا کہ مجھے میری غلطیوں کی سزا مل رہی ہے۔ مگر آپ نے تو ان کے سامنے ہاتھ جوڑے اور مجھے وہاں سے ہسپتال پہنچا دیا تاکہ میں زندہ بچ جاؤں، کیوں مس شاہ، پلیز مجھے بتائیے۔''

جو بات پچھلے کئی روز سے اسے ڈسٹرب کر رہی تھی، آج ہونٹوں کی دہلیز تک آ ہی گئی۔ دل میں جو غبار پچھلے کئی دنوں سے چھایا ہوا تھا وہ آج لبوں سے پھسل پڑا، انجشاء نے کس قدر مسحور کن انداز میں مسکرا کر خاموشی سے اسے دیکھا، پھر اسی طرح متبسم لہجے میں بولی۔

''اس میں ڈسٹرب ہونے والی کیا بات ہے مسٹر عدنان! اگر آپ توجہ فرماتے تو بخوبی سمجھ جاتے کہ ہم دونوں نے ہی اپنا اپنا کریکٹر پلے کیا ہے، آپ کو آپ کی پرورش میں جو سکھایا گیا وہ ہمیشہ آپ نے کیا، اور مجھے میرے موم، ڈیڈ نے جن اصولوں اور ضابطوں کا درس دیا، وہ ہمیشہ میں نے نبھایا۔ آپ مجھے اپنی راہ پر لانے کے لیے بے چین تھے اور میں آپ کو اپنی راہ پر لانے کے لیے سرگرداں تھی۔ اپنی اپنی کوشش میں اپنے اپنے مقصد کے حصول کے لیے ہم ہمیشہ ایک دوسرے سے ٹکراتے رہے لیکن دیکھیے جیت تو آخر ہماری ہی ہوئی یعنی کہ اچھائی کی۔''

نہایت مدلل انداز تھا اس کا، مسحور کر دینے والا، عدنان کو لگا سامنے بیٹھی یہ لڑکی دنیا میں سب سے زیادہ اچھا بولنے والی لڑکی ہے، جو اپنے لفظوں کے سحر سے کسی کو بھی اپنے زیر دام کر سکتی ہے، تب ہی وہ اس کے حرکت کرتے احمریں لبوں کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا۔

''کیا آپ مجھے میری کوتاہیوں کے لیے معاف کر سکتی ہیں۔''

''لیس...... وائے ناٹ، بشرطیکہ آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ اب آپ ہمیشہ اپنا ہر قدم اچھائی کی طرف ہی بڑھائیں گے، کیونکہ اسی میں آپ کی اور آپ کے والدین کی بھلائی مضمر ہے۔''

ہر قسم کی غرض سے پاک اس کا سادا سا پُر اعتماد لہجہ گویا عدنان رؤف میں ایک نئی روح پھونک رہا تھا، تب ہی وہ ایک دم سے ہلکا پھلکا ہو کر

مسکراتے ہوئے بولا۔

''تھینکس ...... مجھے پورا یقین تھا کہ آپ مجھے ضرور معاف کر دیں گی۔''

انجشاء نے اس کے جملے پر بس مسکرا کر دھیمے سے سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا، جب وہ پھر بولا۔

''مس شاہ، ایک بات کہوں، آپ برا تو نہیں منائیں گی ناں......؟''

''کہہ دیں برا نہ ماننے والی بات ہوئی تو وعدہ رہا کہ ہرگز برا نہیں مانوں گی۔''

جھٹ سے مسکراتے ہوئے وہ دوستانہ انداز میں گویا ہوئی تو عدنان کو گویا مزید حوصلہ ملا۔ تب ہی وہ اس کی روشن آنکھوں میں محبت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''آ...... آپ بہت اچھی ہیں، دنیا میں سب سے اچھی لڑکی ہیں آپ۔''

بلاشبہ اس کا لہجہ کسی بھی قسم کی منافقت سے پاک تھا، تاہم انجشاء اس کے جملے پر کھلکھلا کر ہنس پڑی پھر اسی طرح متبسم لہجے میں بولی۔

''یہ تو آپ نا جانے مجھ سے پہلے ملنے والی کتنی ہی لڑکیوں سے کہہ چکے ہیں، کچھ نیا کہیں تو اچھا بھی لگے۔''

عدنان کو توقع نہیں تھی کہ وہ یوں موقع پر شرمندہ کر دے گی۔ تب ہی ایک پل کے لیے اس کی نگاہیں جھک گئیں پھر جب وہ بولا تو اس کے لہجے میں پہلے سی کھنک نہیں تھی۔

''آپ ایسا کیوں سوچتی ہیں، میرا یقین کیجیے، میں زندگی میں پہلی مرتبہ کسی لڑکی سے متاثر ہوا ہوں۔''

''کیوں، کیا مجھ سے پہلے ملنے والی لڑکیوں کے پاس، آنکھ، ناک، کان، یا زبان نہیں تھی کیا......؟ پھر مجھ میں ایسے کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں کہ آپ مجھ سے انسپائر ہو گئے۔''

اس کے سادہ سے لہجے پر وہ فوراً چہک کر بولی تو عدنان کے لیے اپنے الفاظ کی وضاحت کرنا بہت مشکل ہو گیا۔

''بہر حال مجھے ابھی تھوڑی دیر کے بعد ایک بہت ارجنٹ میٹنگ اٹینڈ کرنی ہے، آپ سے ملاقات تو اب انشاء اللہ ہوتی رہے گی، اس وقت پلیز میں رخصت چاہوں گی۔''

اسے الجھا ہوا دیکھ کر وہ فوراً اپنی سیٹ سے اٹھتے ہوئے عجلت بھرے انداز میں بولی تو عدنان بھی اس کی تقلید میں چپ چاپ اٹھ کھڑا ہوا، پہلی مرتبہ ایسا ہوا تھا کہ وہ کسی لڑکی سے خود دیر تلک باتیں کرنا چاہتا تھا مگر یہاں اسے بھی ویسی ہی مایوسی ملی تھی جیسی وہ پہلے خود پر مرمٹنے والی لڑکیوں کو دیا کرتا تھا۔ اس روز انجشاء سے مل کر جانے کیوں وہ پہلے سے زیادہ الجھ کر رہ گیا۔

☆☆☆

تمکین رضا اپنے ڈاکومنٹس کی فائل مضبوطی سے تھامے جس وقت اپنے مطلوبہ دفتر تک پہنچی، تو باوجود بھرپور تیاری کے وہ خاصی نروس ہو رہی تھی کیونکہ ایک تو کسی ویل آف کمپنی میں جاب کرنے کا یہ پہلا تجربہ تھا، دوسرا وہ آج بالکل اکیلی تھی، آج فرسٹ ٹائم اس کے کسی کارنامے میں

''شیزا'' اس کے ساتھ نہیں تھی۔

اور تیسری سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ آج اس کے ساتھ کسی لڑکی کو انٹرویو کے لیے نہیں بلایا گیا تھا، مطلب، یہ جاب اسے اریج کی سفارش پر، اسپیشلی آفر کی جارہی تھی۔ جس میں مختصر انٹرویو کا مرحلہ غالباً رسمی طور پر ہی رکھا گیا تھا۔ تب ہی قدرے بے قراری، وہ آفس سیکریٹری کی طرف چلی آئی اور اسے انٹرویو کے متعلق بتایا تو اس نے سرسری سا اس کی طرف دیکھتے ہوئے قدرے مصروفیت سے کہا۔

''آپ پلیز تشریف رکھئے اندر بہت ارجنٹ میٹنگ چل رہی ہے، سر اور میڈم جیسے ہی فارغ ہوں گے میں آپ کے متعلق انہیں بتادوں گی۔''

''اوکے۔''

سیکرٹری کی ہدایت پر وہ اس کے سامنے ہی رکھی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی اور اندر جاری ارجنٹ میٹنگ کے ختم ہونے کا انتظار کرنے لگی مگر پندرہ منٹ، تیس منٹ، پچاس منٹ، یہاں تک کہ دو گھنٹے ہو گئے، تب تک میٹنگ کے ختم ہونے کی کوئی اطلاع نہیں ملی، نتیجتاً وہ اکتا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''سوری...... میں مزید ویٹ نہیں کرسکتی، آپ کے باس فارغ ہو جائیں تو میرے متعلق بتا دیجئے گا۔'' اپنے مخصوص خفا خفا سے لہجے میں اس نے کہا اور سیکرٹری کے مزید اصرار کے باوجود وہاں سے چلی آئی۔ جبکہ انجشاء اور اریج تقریباً دو منٹ کے بعد ہی فارغ ہو کر کیبن سے باہر چلے آئے تو سیکرٹری کے تھرو تمکین کی آمد اور دو گھنٹے اس کے انتظار کے متعلق سن کر دونوں کو ہی بے حد افسوس ہوا۔ تب اریج نے کہا۔

''وہ تو بہت برہم ہوگی مس شاہ، اب کیا کریں؟''

اگر آج کی میٹنگ اس کے لیے بہت اہم تھی تو تمکین رضا کی ذات، اس کا دیدار اس سے کہیں بڑھ کر اہم تھا اس کے لیے۔ تب ہی وہ مضطرب ہوا تھا، جبکہ انجشاء اسے بے قرار سا دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔

''ڈونٹ وری اریج...... وہ دھوپ چھاؤں سی لڑکی ہے۔ اگر جلد غصے میں آجاتی ہے تو جلد غصہ بھول بھی جاتی ہے۔ سو پلیز آپ پریشان مت ہوں، میں اسے منالوں گی، بلکہ میرا خیال ہے کہ ہم اس شاندار پروجیکٹ کے ملنے کی خوشی میں پرسوں ہی جو پارٹی دے رہے ہیں اس میں انوائیٹ کر لیتے ہیں نمی کو، کہئے کیا خیال ہے آپ کا۔'' ابرو اچکا کر وہ فریش لہجے میں بولی۔ تو اس کی تجویز پر اریج احمر بھی دھیمے سے پرسکون انداز میں مسکرا دیا پھر ہلکے پھلکے انداز میں کندھے اچکا کر اس کی سمت دیکھتے ہوئے بولا۔

''ایز یو وش۔''

سر کو ہلکی سی جنبش دے کر وہ مسکرایا تو آپ ہی آپ ایک مسحور کن سی مسکراہٹ انجشاء کے لبوں کو بھی چھو گئی۔

''میرا خیال ہے کہ لنچ کا ٹائم ہو گیا ہے لہٰذا ہمیں کسی اچھے سے ریستوران میں چلنا چاہیے۔''

دل سے تفکر کے بادل چھٹے تھے تو لہجے میں خود بخود کھنک در آئی، انجشاء نے مطمئن نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے چپکے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''مس شاہ، آپ تمکین کو کب سے جانتی ہیں؟''

قریبی ریسٹورنٹ میں پہنچ کر کھانا آرڈر کرتے ہوئے اس نے دلچسپی سے پوچھا تھا، جواب میں ماضی کے بہت سے خوبصورت سہانے دنوں کا عکس پل دو پل کے لیے انجشاء کی آنکھوں میں جھلملا گیا۔تب ہی وہ نگاہیں جھکائے قدرے کھوئے کھوئے سے انداز میں بولی۔

''کالج پریڈ سے، جب میں تعلیم کے حصول کے لیے لاہور آئی، تو سب سے پہلے تمکین کے گروپ نے ہی میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا، مجھ سے پہلے ہمارے گروپ میں تین لڑکیاں تھیں تمکین، شیزا اور اریشہ، تینوں ہی کالج کی ذہین ترین اسٹوڈنٹس مانی جاتی تھیں، پھر میں ان کے گروپ میں آ گئی، کالج شروع ہوئے تقریباً دو تین ماہ ہو چکے تھے، دادا جی کی سفارش پر بمشکل میرا ایڈمیشن ہوا، اس وقت میں بہت دبو قسم کی لڑکی ہوا کرتی تھی، مگر میری فرینڈز نے مجھے اعتماد بخشا، مجھے سر اٹھا کر، زمانے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا سکھایا، گھنٹوں ہم لوگ کالج کی سیڑھیوں پر بیٹھے، گپیں اڑاتے، ایک دوسرے کو تنگ کرتے، اور ہر ہر طریقے سے زندگی کا لطف اٹھاتے، پورے کالج پر بی اے کے آخر تک ہماری دھاک بیٹھی رہی، ہر ٹیچر، ہر پروفیسر کے فیورٹ اسٹوڈنٹ تھے ہم لوگ...... پھر کالج کا دور بیتا اور ہم چاروں نے ایک ساتھ یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا۔ یہاں بھی میری فرینڈز نے میری بہت مدد کی، کیونکہ میرے بابا اور میری ماں، میری مزید تعلیم کے حق میں نہیں تھے، اور ان کی وجہ سے دادا جی بھی تھوڑے بے نیاز ہو گئے تھے میری خوشی سے، لیکن تمی اور اریشہ نے دادا جی کو نہ جانے کون کون سی دلیلیں دے کر بالآخر رضامند کر لیا اور یوں میں نے گھر والوں کی اجازت سے بالآخر یونیورسٹی میں اپنی فرینڈز کے ساتھ ایڈمیشن لے لیا۔

یونیورسٹی پریڈ، کالج کی دنیا سے بھی بڑھ کر حسین تھا۔ میں اور اریشہ ہوسٹل میں روم میٹ تھے جبکہ تمکین اور شیزا یہیں اپنے گھر میں رہتی تھیں، بہت حسین دن تھے وہ، مگر بہت جلد بیت گئے، اتنی تیزی سے کہ ہمیں وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوا اور ہم چاروں ایک دوسرے سے بچھڑ گئیں......''

بیتے ہوئے دنوں کو یاد کر کے، انجشاء کا لہجہ خاصی حد تک افسردہ ہو گیا، تب بغور اس کی باتیں سنتے ہوئے اریج نے ہلکے سے کھنکھار کر اسے ماضی کی یادوں سے باہر نکالا اور قدرے مسکراتے ہوئے بولا۔

''لگتا ہے واقعی بہت خوبصورت یادیں ہیں آپ کی، پلیز کھانا شروع کیجیے، ٹھنڈا ہو رہا ہے۔''

اس کے توجہ دلانے پر، اداس سی انجشاء نے چونک کر اسے دیکھا پھر دھیمے سے مسکراتے ہوئے کھانے کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''مس شاہ، کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ تمکین جاب کیوں کرنا چاہتی ہے؟ آئی مین، جہاں تک میں جانتا ہوں وہ ایک ویل آف فیملی سے تعلق رکھتی ہے، تو پھر اس معمولی سی جاب کا مقصد؟''

چمچ اور کانٹے سے کھیلتے ہوئے بلا مقصد ہی یہ سوال اس کے لبوں پر آ گیا، تو پانی کے گھونٹ بھرتے ہوئے انجشاء نے، پل دو پل کے لیے سرسری سی ایک نظر اس پر ڈالی، پھر گلاس ٹیبل پر رکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولی۔

''یہ تو اس سے مل کر ہی پتہ چلے گا کہ وہ یہ جاب کیوں کرنا چاہتی ہے، ویسے بدقسمتی سے ہماری اب تک تفصیلی ملاقات نہیں ہو پائی ہے۔

حالانکہ ہم لوگ ایک عرصے کے بعد ایک دوسرے سے ملے ہیں، بہت سی باتیں ہیں ذہن و دل میں جو ایک دوسرے کے گوش گزار نی ہیں، میرا خیال ہے کہ وہ یہ جاب ضرور اشعر کی وجہ سے کر رہی ہو گی۔"

"اشعر کون؟"

اس کے تفصیلی جواب پر اریج نے فوراً چونکتے ہوئے پوچھا تھا۔ تب وہ مختصر خاموشی کے بعد بولی۔

"اشعر، فرسٹ کزن ہے تمکین کا، بہت ہی شرارتی اور نٹ کھٹ، بچپن سے ہی بہت پیار ہے دونوں میں، لیکن دونوں لڑتے جھگڑتے بھی اتنا ہی ہیں، ضرور اسی نے تمی کو کچھ کر دکھانے کے لیے چیلنج کیا ہو گا اور وہ عقل سے پیدل لڑکی ہمیشہ کی طرح اس پر اپنی اہمیت جتانے کے لیے یہ فضول کا درد سر مول لینے پر تیار ہو گئی ہو گی۔"

وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی جبکہ اریج احمر عجیب بے قراری سے اسے بغور سن رہا تھا۔

"کالج میں تمی بہت کارنامے سناتی تھی اس کے، اور جواب میں ہم لوگ اشعر کی حرکتوں کے بارے میں سن کر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔ آپ یہ دیکھیں اریج کہ وہ لندن میں رہائش پذیر ہے۔ مگر اس کے باوجود ڈیلی فون کرتا ہے تمی کو، شاعری، ادب فلسفہ، تاریخ، چٹکلوں غرض مختلف موضوعات پر ڈھیروں خوب صورت کتابیں ارسال کرتا رہتا ہے، بہت خوب صورت ذوق ہے اس کا، تمی کے لبوں پر تو ہمہ وقت اشعر، اشعر ہی ہوتا تھا۔ اشعر یہ کرتا ہے، اشعر وہ کرتا ہے، اشعر کو یہ پسند ہے، اشعر کو وہ پسند نہیں، غرضیکہ ہر وقت اشعر نامہ جاری رہتا تھا اس کے منہ سے۔"

انجشا اپنی ہی رو میں مگن بولے جا رہی تھی اور وہ گم صم سا چپ چاپ دیکھے جا رہا تھا اسے، پل دو پل میں ہی نہ جانے کیوں وہ اس اجنبی لڑکے سے جیلسی فیل کرنے لگا تھا کہ جس کا نام اشعر تھا۔ تب ہی بے قرار ہو کر وہ انجشا کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

"آپ کے بقول آپ تمکین کی کالج فیلو اور یونیورسٹی فیلو رہی ہیں تو یقیناً اس پریڈ میں اس کے گھر آنا جانا بھی رہا ہو گا۔ پھر بھی آپ اتنے سال بعد اس شہر میں دوبارہ آ کر اس سے نہیں ملیں، کیوں......؟"

"کیونکہ میں اس سے یا کسی بھی آشنا سے ملنا ہی نہیں چاہتی تھی اریج...... میں ایک نئی پہچان لے کر اس شہر میں آئی تھی کیونکہ اس شہر سے میری بہت سی یادیں، میرا مستقبل جڑا ہے، ممی پاپا کی ڈیتھ کے بعد مجھے اپنی حویلی کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی تب ہی میں داداجی کو فورس کر کے یہاں لے آئی کیونکہ ہمیں کہیں نہ کہیں تو جانا ہی تھا، پھر اس شہر میں کیوں نہ آتی جہاں میری زندگی کا مقصد سانس لے رہا ہے۔ تمی سے دوبارہ مل کر بہت خوش ہوں میں۔" اس کے سوال کا فوری جواب دیتے ہوئے وہ اداسی سے بولی تو اریج احمر خاموشی سے اس کی اداس آنکھوں میں دیکھ کر رہ گیا کہ جہاں ڈھیر سارا حزن ہلکورے لے رہا تھا، تب ہی وہ اس سے نگاہ ہٹا کر سامنے دیکھنے لگا کہ اچانک اس کی نظر ریستوران میں داخل ہوتی تمکین رضا پر پڑی، جو بے نیازی سے چلتے ہوئے سیدھی ہی آ رہی تھی اور اس سے پہلے کہ اریج اٹھ کر اسے اپنی جانب متوجہ کرتا، انجشاء نے اس کی نگاہوں کی سمت میں خود ہی پیچھے پلٹ کر تمکین کو دیکھا پھر دھیمے سے پکار کر اپنے پاس بلا لیا۔

"ارے......تم لوگ بھی یہیں ہو۔ آج تو لنچ کا مزہ آ جائے گا۔"

ان دونوں کو حیران کرتے ہوئے وہ بشاش لہجے میں بولی تو اس کی ناراضگی کے خوف سے پریشان اریج احمر کے لبوں پر بڑی مسحورکن سی مسکراہٹ بکھر گئی، تب ہی وہ متبسم لہجے میں بولا۔

''آئی ایم سوری مس تمکین کہ آپ کو انٹرویو کے لیے ویٹ کر کے ناکام واپس جانا پڑا تاہم اب یہ جاب آپ بنا انٹرویو کے کل سے ہی اسٹارٹ کر سکتی ہیں۔''

اس کی بادامی نگاہیں تو گویا سیر ہی نہ ہو پا رہی تھیں۔ جبکہ سیٹ سنبھال کر ان ہی کے ٹیبل پر بیٹھی ہوئی تمکین نے سرسری سا اس کی طرف دیکھا، پھر مسکراتے ہوئے دل کش انداز میں بولی۔

''نہیں اب اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے مسٹر اریج۔''

''کیوں......؟''

انجشاء اور اریج دونوں نے چونک کر ایک ساتھ پوچھا تب وہ چہرے کو چھوتے ریشمی بالوں کو نازک انگلیوں کی مدد سے گردن کے پیچھے دھکیلتے ہوئے بولی۔

''کیونکہ اشعر نے منع کر دیا ہے، آپ کے آفس سے نکلنے کے بعد ہی، میرے موبائل پر اس کی کال آگئی، وہ لوگ اگلے ہی ہفتے پاکستان واپس آ رہے ہیں اور انشاء اللہ بہت جلد ہم دونوں شادی کے بندھن میں بندھ جائیں گے تب ہی خوشی خوشی، میں گھر جانے کی بجائے سیدھی یہیں چلی آئی کیونکہ بھوک بہت لگ رہی تھی۔''

اپنے دل فریب لہجے میں وہ بولے جا رہی تھی اور اریج احمر پھٹی پھٹی نگاہوں سے گم صم سا اسے دیکھتا رہ گیا۔

ٹو سمندر ہے تو اپنی سخاوت بھی دکھا

کیا ضروری ہے کہ پیاس کا دامن کھولوں

میں کہ اک صبر کا صحرا نظر آتا ہوں تجھے

ٹو تو چاہے تو تیرے واسطے دریا رولوں

میرے ہمسفر میرے چارہ گر

میرے درد کی تجھے کیا خبر

تو میرے سفر کا شریک ہے

میرے ہاتھ سے تیرے ہاتھ تک، وہ جو ہاتھ بھر کا تھا فاصلہ

کئی موسموں میں بدل گیا.....

اسے ناپتے اسے کاٹتے، میرا سارا وقت نکل گیا

نہیں جس پہ کوئی نشان پا، میرے سامنے ہے وہ راہ گزر

میرے ہمسفر، میرے چارہ گر

میرے درد کی تجھے کیا خبر.....؟

یہ جو ریگ دشت فراق ہے

میرے راستوں میں بچھی ہوئی، کسی موڑ پہ تو رکے کہیں

یہ جو رات ہے میرے چار سو، مگر اس کی کوئی سحر نہیں

نہ ہی چھاؤں ہے، نہ ثمر کوئی، میں نے چھان دیکھا شجر شجر

میرے چارہ گر، میرے درد کی تجھے کیا خبر؟

آسمان چھاجوں مینہ برسا رہا تھا، اور وہ ہر چیز سے بے نیاز، لٹا لٹا سا پارک میں بیٹھا مسلسل تمکین رضا کے متعلق سوچتے ہوئے آنسو بہا رہا تھا۔ کتنی سادہ سی پرخلوص محبت تھی اس کی۔ مگر کتنی جلد اپنے انجام کو پہنچ گئی تھی۔ وہ تو ابھی تمکین کو بتا بھی نہیں پایا تھا کہ وہ اس کی محبت میں زندگی کا وجود تلاشنے لگا ہے، کہ تقدیر نے اسے ایک مرتبہ پھر اکیلے پن کے جنگل میں لا کھڑا کیا تھا، جہاں کوئی اس کے آنسو پونچھنے والا نہیں تھا، اس کے دکھ شیئر کر کے اس کی ڈھارس بندھانے والا نہیں تھا۔

کوئی اپنائیت کا احساس دلانے والا نہیں تھا، پچھلے دو گھنٹوں سے ہوتی مسلسل بارش نے اسے بری طرح بھگو دیا تھا۔ مگر اسے بھلا اپنا ہوش

ہی کہاں تھا؟

زندگی نہایت سفاکی سے قدم قدم پر اس سے محبتوں کو چھین کر اسے بالکل تہی داماں کرتی آئی تھی، اور وہ زندگی کے ہر موڑ پر ہمیشہ آنسو بہا کر صبر کرتا رہا تھا۔ خدا کی رضا پر صبر کر کے اس کا شکر ادا کرتا رہا تھا۔ مگر آج وہ بری طرح ٹوٹ چکا تھا۔

زندگی میں پہلی بار اس نے خلوص دل سے کسی لڑکی کو چاہا، اس کے دائمی ساتھ کی تمنا کی اور تقدیر کی ستم ظریفی نے اس لڑکی کو بھی بے دردی سے چھین لیا اس سے، آنسو تھے کہ قطار در قطار بہے جا رہے تھے، جب اچانک کسی نے اس کے مضبوط شانے پر اپنائیت سے ہاتھ دھرا۔

''اریج! پلیز سنبھالئے ناں خود کو، ایسے کب تک چلے گا؟ پرسوں سے دیکھ رہی ہوں میں، نہ آپ کچھ کھا پی رہے ہیں نہ کسی سے بات کر رہے ہیں، اور اس وقت بھی دیکھئے کب سے بارش میں بھیگ رہے ہیں آپ.....خدانخواستہ اگر بیمار پڑ گئے تو.....''

انجشاء کی فکر میں ڈوبی مانوس آواز پر اس نے دھیرے سے جھکا ہوا سر اوپر اٹھایا پھر شہادت کی انگلی سے بھیگی پلکیں صاف کر کے بمشکل کچھ کہنے کی ہمت کر پایا۔

''میں نے زندگی میں بہت کچھ کھویا ہے مس شاہ، بہت آنسو بہائے ہیں میں نے اپنی محرومیوں پر، لیکن اب یہ درد مجھ سے سہا نہیں جا رہا ہے۔ نہ جانے کیوں، میرا دل تمکین کو ہمیشہ کے لیے کھو دینے کے احساس سے کٹ رہا ہے۔ میں بھی اس سے بہت بے تکلف نہیں ہوا، کبھی اسے جی بھر کر دیکھا بھی نہیں، پھر بھی نہ جانے کیوں میری سانسیں، میرے سینے کے اندر گھٹ رہی ہیں، جانے کیوں مجھے یہ لگ رہا ہے کہ جیسے میں ریت سے بنا ایک پتلا ہوں، جو اپنی محبت کو کھو دینے کا تصور کر کے دھیرے دھیرے ڈھے رہا ہے۔ ختم ہو رہا ہے، میں کیا کروں مس شاہ، میں خود کو سنبھال نہیں پا رہا ہوں۔''

نم پلکوں کے ساتھ اس کا لہجہ بھی خاصا بھیگ چکا تھا۔ انجشاء نے کسی قدر افسوس سے اس کی طرف دیکھا پھر دھیمے لہجے میں بولی۔

''اریج، میں نے تو کہیں پڑھا نہ سنا کہ دنیا صرف ایک ہی لڑکی پر ختم ہو گئی ہو۔ پھر اتنے قیمتی آنسو، ایسی بے دردی سے کیوں لٹا رہے ہیں آپ؟ دیکھئے اریج دنیا میں بہت سارے لوگ ہوتے ہیں جن کے لیے ہم کہتے ہیں کہ ہم ان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے، لیکن یہ صرف لفاظی ہوتی ہے اریج، فقط جذباتیت ہوتی ہے ہماری، کیونکہ جب وہ لوگ ہم سے بچھڑ جاتے ہیں تو کیا ہم ان کے پیچھے مر جاتے ہیں.....؟ نہیں.....ہم نہیں مرتے' کوئی کسی کے لیے نہیں مرتا.....یہ صرف کہنے اور محسوس کرنے کی باتیں ہیں، یہاں اپنے اپنے حصے کا، جیسے تیسے کر کے سب کو ہی جینا پڑتا ہے۔ اس لیے پلیز آپ بھی اپنے آپ کو سنبھالیں، اپنے پندار کو سنبھالیں، اور اگر ممکن ہو تو تمکین کو بھلانے کی کوشش کریں، بھلا نہیں سکتے تو اس کی محبت کے دکھ کو دل میں سنبھال کر رکھیں، کیونکہ اس طرح آنسوؤں میں اگر محبت کے دکھ کو بہا دیا جائے تو پھر ہم بالکل خالی ہاتھ رہ جائیں گے اریج۔ محبت کے ساتھ ساتھ محبت کا دکھ بھی چھن جائے گا ہم سے۔''

وہ جانے اس کی ڈھارس بندھا رہی تھی یا اپنے دل کو تسلی دے رہی تھی۔ بہر حال اتنا ضرور ہوا تھا کہ اس کے کہنے پر اریج احمر نے خود کو سنبھال لیا تھا، اور اب وہ خاموشی سے اٹھ کر آگے بڑھ گیا تھا۔ انجشاء نے اسے چھاتہ دینا چاہا، لیکن وہ آہستہ سے نفی میں سر ہلا کر بارش میں ہی بھیگتا

رہا۔ دل کے اندر ارمانوں کے اجڑ جانے پر جو آگ لگی تھی اسے بارش کے سرد قطروں سے بجھانے کی کوشش کرتا رہا، اور پھر چپ چاپ انجشاء کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر آ بیٹھا۔

انجشاء کو اس وقت اس کی بکھری ہوئی حالت بہت دکھ دے رہی تھی، لیکن وہ چاہ کر بھی اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی، اور اگر اسے ذرا سا بھی علم ہوتا کہ تمکین دل میں کیا کہنے کا ارادہ رکھتی ہے تو وہ کبھی ایسے موضوع پر اریج کے سامنے اس سے کوئی سوال نہ کرتی۔

اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ہر وقت اشعر، اشعر کی تسبیح نکالنے والی تمکین سچ مچ اس سے شادی کرنے کا ارادہ بھی رکھتی ہے اور وہ بھی یوں اتنی جلدی، بالکل اچانک...... ورنہ وہ پہلے روز سے ہی اریج کے بڑھتے قدموں کو روک دیتی، اسے حقیقت سے باخبر کر دیتی۔ مگر اریج کے ساتھ خود اس پر بھی یہ راز پہلی مرتبہ کھلا تھا کہ تمکین اشعر سے شادی کر رہی ہے اور وہ بھی بہت جلد، تو وہ کیسے اس کی مدد کرتی......؟ جبکہ وہ تو خود گھائل تھی، اس کے تو اپنے دل میں ٹھکرائے جانے کا درد پل رہا تھا۔ محبت کے چھن جانے، خوابوں کے اجڑ جانے کا دکھ اسے پتھر کیے ہوئے تھا، تو پھر وہ کیسے اسے تسلی دیتی؟ کیسے کہہ دیتی کہ وہ بھی تمکین کو بھول جائے؟

وہ خود گزشتہ سات سالوں میں ایک پل ایک لمحے کے لیے بھی اپنی محبت کو فراموش نہیں کر پائی تھی، باوجود اس کے کہ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کے محبت بھرے جذبات پر انتقام اور بے حسی کی گرد جمتی گئی، وہ کبھی چاہ کر بھی عدنان رؤف کو اپنی یادوں سے بے دخل نہیں کر پائی، اسے زندگی بھر تڑپانے کا فیصلہ کر کے بھی دل کو اس کی پروا کرنے سے بے نیاز نہ رکھ پائی، اور یہی تو جادو ہوتا ہے محبت کا، آپ خواہ کتنی بھی کوشش کر لو، کتنا بھی دامن جھٹک لو، محبت کا کانٹا اگر ایک بار دل کی دھرتی میں چبھ جائے تو پھر اس کی کسک ساری زندگی پر محیط ہو جاتی ہے اور پھر آپ چاہ کر بھی اس کے سحر سے پہلو نہیں بچا سکتے۔

☆☆☆

اگلے دس پندرہ دنوں میں اشعر احمد سچ مچ اپنے گھر والوں کے ساتھ مستقل پاکستان میں سیٹل ہو گیا، تمکین کے قدم تو مارے خوشی کے زمین پر لگنا ہی بھول گئے۔ اس کا بس چلتا تو ہواؤں میں اڑنے لگتی۔ دل کی مراد اتنی جلدی بر آئے گی، وہ چاہ کر بھی سوچ نہیں پائی تھی۔

دوسری طرف نٹ کھٹ سا شریر اشعر احمد خود اتنا مسرور تھا کہ اس کے مچلتے دل کا حال بخوبی اس کی بادامی آنکھوں میں دکھائی دیتا تھا، بہانے بہانے سے کبھی وہ کچن میں تمکین کے قریب ہونے کی کوشش کرتا، تو کبھی شاپنگ، آئس کریم، یا ڈنر کے بہانے اسے گھر سے باہر جا کر بے تاب دل کی ڈھیروں رومانی باتیں اس کے گوش گزارتا، جواب میں تمکین کے چہرے پر اترتے گلاب کھلتے کہ وہ مبہوت سا ہو کر اسے بس دیکھتا ہی رہ جاتا۔

اک طویل عرصے کے بعد سعید صاحب اور رخسانہ بیگم واپس پاکستان لوٹے تھے۔ احسن ولاج کی نئی نسل نے تو شعور سنبھالنے کے بعد ان کو ٹھیک سے دیکھا بھی نہیں تھا، جب ہی سب لوگ ایک لمبے عرصے کے بعد ان کی ''حسن ولاج'' میں واپسی پر بے انتہا خوش اور پرجوش دکھائی دے رہے تھے۔ سعید صاحب اور رخسانہ بیگم بھی ایک لمبی جدائی کے بعد اپنوں کے درمیان آ کر بہت فرحت محسوس کر رہے تھے، خوشیاں ہی خوشیاں بکھر گئی تھیں ہر طرف، سونے پر سہاگہ اشعر اور تمکین کی شادی کی ڈیٹ بھی فکس ہو گئی تو گویا خوشیوں کا ایک خزانہ لگ گیا سب کے ہاتھ۔

دیر تک رات کو اکٹھے بیٹھ کر مستقبل کی پلاننگ کرنا، ماضی کے بھولے بسرے دنوں کو یاد کرنا، سب کتنا اچھا لگتا تھا، لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ جب بھی ماضی کی کسی بات کا کہیں تذکرہ ہوتا تو بے وجہ ہی رخسانہ بیگم کے مسکراتے چہرے پر ایک عجیب سا حزن پھیل جاتا، ان کے مسکراتے لب آپ ہی آپ فوراً سمٹ جاتے اور آنکھوں میں ایک عجیب سی بے قراری ہلکورے لینے لگتی اور یہ بات تمکین نے نہایت توجہ سے بارہا نوٹ کی تھی، تب ہی اس روز جب وہ لان میں ان کے ساتھ تنہا بیٹھی شام کی چائے پی رہی تھی تو یوں ہی انہیں کرید بیٹھی۔

''آنٹی! میں بہت دنوں سے آپ سے کچھ پوچھنا چاہ رہی تھی، لیکن نہ جانے کیوں مجھے سب کے درمیان کچھ پوچھنا مناسب نہیں لگا، اسی لیے میں نے مناسب وقت کا انتظار کیا، آنٹی، آپ بہت خوب صورت، بہت باوقار ہیں، پھر سعید انکل، اشعر اور حسن ولاج سے وابستگی تو اور بھی خوب صورت بنا دیتی ہے آپ کو، لیکن نہ جانے کیوں جب بھی کبھی اس گھر کے مکین ماضی کی کسی یاد کا ورق پلٹتے ہیں تو آپ کی آنکھوں میں اداسی اتر آتی ہے، ایسا کیوں ہے آنٹی، پلیز بتایئے ناں؟''

کئی روز سے دل میں مچلتے سوال کو وہ لبوں تک کھینچ ہی لائی، جبکہ اس کے اس بے ساختہ سوال پر کم گو سی رخسانہ بیگم نے یوں چونک کر اس کی طرف دیکھا، جیسے ان کی بہت بڑی چوری پکڑی گئی ہو۔ مخروطی انگلیوں والے نفیس ہاتھ میں ہلکی سی لرزش ہوئی اور وہ گڑبڑا کر خاموشی سے تمکین کے سوالیہ چہرے کو دیکھنے لگیں۔ پھر کچھ ہی دیر میں خود کو سنبھالتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولیں۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں ہے بیٹے' بس ماضی کی یادیں کبھی کبھی دل کو اداس کر دیتی ہیں' اور ماضی کو یاد کر کے تو ہر انسان ہی افسردہ ہو جاتا ہے بیٹے' پھر میں کوئی دنیا سے ہٹ کر تو نہیں ہوں' بہر حال' تم کپڑے وغیرہ چینج کر لو' ہم اشعر کے آتے ہی مارکیٹ چلیں گے جیولر کے پاس۔''

بہت سہولت کے ساتھ وہ اس کے سوال کو ٹال گئی تھیں۔ تب تمکین بھی کندھے جھٹک کر تیار ہونے چل دی۔

اشعر اور سعید صاحب مل کر آج کل اپنا بزنس پاکستان میں سیٹ کر رہے تھے۔ جس کی وجہ سے دن کی مصروفیات بھی بڑھ گئی تھیں۔ سعید صاحب تو زندگی پاکستان سے باہر گزارنا چاہتے تھے مگر انہیں اپنے اکلوتے لخت جگر اشعر کے اصرار پر پاکستان واپس آنا پڑا' اور یہاں آ کر سچ مچ انہیں یوں محسوس ہوا گویا وہ واقعی کسی جنت میں آ گئے ہیں۔

اپنی مٹی کی خوشبو' اپنی معطر فضائیں' اپنے لوگ...... اس اپنے پن کا سرور ہی الگ ہوتا ہے۔ تب ہی تو انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا گویا وہ دوبارہ نئے سرے سے جی اٹھے ہیں۔

اس روز اشعر کچھ جلدی ہی گھر واپس آ گیا' تاہم تب تک رخسانہ بیگم اور تمکین مکمل تیار ہو کر بیٹھی تھیں' لہٰذا وہ فریش ہو کر چائے کا ایک کپ پیتے ہی ان دونوں کو لے کر مارکیٹ کے لیے نکل پڑا کہ شادی میں بمشکل ایک ماہ رہ گیا تھا۔ جبکہ انہیں کام ڈھیروں کرنے تھے۔ اشعر اور تمکین دونوں کے والدین خوب زور و شور سے اپنے اپنے اکلوتے بچوں کی خوشی پر جی بھر کر دل کے ارمان نکالنے کے خواہشمند تھے۔ تب ہی تیاریاں بھی بڑے پیمانے پر ہو رہی تھیں۔ سب کچھ اشعر اور تمکین کی پسند پر خریدا جا رہا تھا اور دونوں ہی اس پر بے حد مسرور تھے۔ اشعر نے پندرہ بیس منٹ کی ڈرائیو کے بعد اپنی مطلوبہ جیولر شاپ کے سامنے گاڑی روک دی تو تمکین باہر سے ہی دکان کی شان و شوکت دیکھ کر دل ہی دل میں ''واہ'' کہہ اٹھی۔ اشعر کی پسند

بچپن سے ہی بہت نفیس رہی تھی۔

وہ لوگ دکان کے اندر آئے تو تمکین اتنی بڑی شاپ کی سج دھج اور وسیع پیمانے پر وہاں دکھائی دینے والے انواع واقسام کے خوب سے خوب تر جیولری سیٹ دیکھ کر دنگ ہی رہ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کون سا سیٹ خریدے اور کون سا رد کر دے۔ جیولر صاحب اشعر کی کافی آؤ بھگت کر رہے تھے ان کے ملازمین بھی رخسانہ بیگم اور تمکین کو احترام کے ساتھ بٹھا کر ایک سے بڑھ کر ایک سیٹ دکھا رہے تھے، اور ہر سیٹ دیکھ کر تمکین کا دل چاہتا کہ وہ بس یہی خرید لے' تاہم دو تین گھنٹے کی کشمکش کے بعد بالآخر اس نے اپنے لیے دو تین سیٹ پسند کر لیے تو اشعر کے ساتھ ساتھ رخسانہ بیگم نے بھی شکر کا کلمہ پڑھا۔

پھر پے منٹ وغیرہ کر کے وہ لوگ شاپ سے باہر آئے تو تمکین کے چہرے کی خوشی دیدنی تھی۔

''آنٹی! یہ تو شہر کی سب سے بڑی شاپ ہے' میں تو کبھی یہاں آنے کے متعلق سوچ بھی نہیں پائی۔'' وہ بے حد متاثر ہو رہی تھی۔ جس پر رخسانہ بیگم کے ساتھ ساتھ اشعر بھی دھیمے سے مسکرا دیا۔

''مما' آپ لوگ پلیز گاڑی میں بیٹھیں' میں بس ابھی آیا۔''

گاڑی کا لاک کھول کر اگلے ہی پل اس نے رخسانہ بیگم سے کہا' پھر انہیں گاڑی میں بٹھا کر خود نہ جانے کہاں چلا گیا۔

اگلے دو تین منٹ میں ہی ایک وائٹ کرولا ان کی گاڑی کے بالکل برابر میں آ کر رکی' اور اس میں سے ہینڈسم سا ایک لڑکا نکل کر سامنے والی جیولر شاپ کی طرف بڑھ گیا۔ رخسانہ بیگم نے بس سرسری سا اسے دیکھا تھا' پھر تمکین کے ساتھ باتوں میں مشغول ہو گئیں' تب تھوڑی ہی دیر کے بعد اشعر ٹھنڈے جوس کے پیک لے آیا اور انہیں تھما کر ابھی اپنی سیٹ سنبھالی ہی تھی کہ اسی پل وہ خوب صورت سا لڑکا واپس اپنی گاڑی کے قریب آیا اور پھر...... بالکل اچانک بائے چانس ہی اس کی نگاہ جوں ہی اپنی بائیں سائڈ والی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی رخسانہ بیگم کے چہرے پر پڑی' بے ساختہ ہی وہ چونک اٹھا۔

''مما......'' دھیرے سے اس کے لبوں نے جنبش کی اور وہ گویا اپنی جگہ پتھر بن کر رہ گیا۔

☆☆☆

''ارے نورینہ آپا...... کیا بات ہے' کچھ پریشان لگ رہی ہیں آپ......؟''

نورینہ بیگم مسلسل اریشہ کے بارے میں سوچتے ہوئے لان میں اداس سی بیٹھی تھیں جب فرزانہ بیگم وہیں ان کے قریب چلی آئیں۔

جواب میں نورینہ بیگم نے فوراً خود کو سنبھال لیا اور ان کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولیں۔

''نہیں...... ایسی تو کوئی بات نہیں ہے بھابھی' بس یوں ہی اریشہ کے مستقبل کے بارے میں سوچ رہی تھی۔''

حقیقتاً انہیں اریشہ کے اذہان کے لیے انکار سے تکلیف پہنچی تھی' مگر وہ یہ بات کھلم کھلا فرزانہ بیگم پر کسی طور ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھیں تب ہی مسکرا کر بات کو سنبھالا تو فرزانہ بیگم دھیمے سے مسکرا کر ان کے سامنے والی کرسی پر ہی بیٹھ گئیں اور قدرے ہوشیاری سے بولیں۔

''اب اریشہ کی فکر کرنا آپ چھوڑ دیجئے آپا...... کیونکہ اب وہ آپ کے ساتھ ساتھ میری بھی بیٹی ہے' اور میں اپنی بیٹی کا خیال رکھنا خوب جانتی ہوں' آپ تو فی الحال بھائی صاحب کے متعلق بتائیے' کیونکہ میں نے سنا ہے وہ اپنی سیکنڈ وائف کو بھی طلاق دے رہے ہیں۔''

''ہاں بھابھی' آپ نے ٹھیک ہی سنا ہے' لیکن مجھے اب ان کی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ کیونکہ اپنی زندگی میں محبت کا یہ باب میں نے آج سے انیس سال قبل ہی بند کر دیا تھا۔ جب انہوں نے میرے اعتماد کو کرچی کرچی کرتے ہوئے دوسری شادی رچائی تھی۔ لہٰذا اب میں ان کے متعلق کوئی بات نہیں کرنا چاہتی' آپ پلیز مجھے یہ بتائیے کہ اذہان بیٹا' لمبی چھٹی لے کر کب آ رہا ہے۔''

اپنی زندگی کے متعلق کوئی بھی سوال انہیں ہمیشہ ڈسٹرب کر کے رکھ دیتا تھا' تب ہی وہ فوراً بات کو بدل گئیں تو ان کے انداز پر قدرے بے مزہ ہو کر فرزانہ بیگم انہیں اذہان کی آمد سے متعلق بتانے لگیں۔

''بھابھی! میں سوچ رہی تھی کہ اس بار اذہان بیٹے کی آمد پر کیوں نہ ہم لوگ اریشہ اور اذہان بیٹے کو باقاعدہ منگنی کے بندھن میں باندھ دیں۔''

''بالکل...... کیوں نہیں میں تو خود یہی سوچ رہی تھی کہ یہ فرض جتنی جلدی ادا ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔'' نورینہ بیگم نے گویا ان کے منہ کی بات چھین لی تھی۔ تب ہی وہ مسکراتے ہوئے فوراً بولیں تو نورینہ بیگم نے سرد آہ بھر کر دھیرے سے ان کا شکریہ ادا کر دیا۔

''آپا! کچھ ازمیر میاں کے متعلق بھی آپ کو پتہ ہے یا نہیں؟''

اگلے ہی پل انہیں خاموش پا کر وہ دوبارہ گویا ہوئی تھیں' جواب میں نورینہ بیگم نے چونک کر استفہامیہ نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

''کیوں' ازمیر کو کیا ہو گیا؟'' بھنویں اچکا کر انہوں نے پوچھا تھا۔ جس پر اک دلفریب سی مسکراہٹ فرزانہ بیگم کے لبوں پر بکھر گئی۔

''اسے کیا ہونا ہے آپا' لیکن صاحب زادے کے کارنامے بڑے حیران کن ہیں' پتہ ہے لندن میں جہاں وہ پڑھتا تھا' اسی یونیورسٹی میں جناب ایک لڑکی سے عشق لڑا بیٹھے' لیکن بھئی وہ لڑکی ضرور کسی اچھے گھر کی تھی' تب ہی اس نے پورے گروپ کے سامنے ایک زبردست تھپڑ اس کے گال پر جڑ دیا' اور صاحب زادے مایوس ہو کر یہاں لوٹ آئے تاکہ باہر سے گھاس نہیں ملی تو گھر کے اندر کسی کو شیشے میں اتار سکیں' اور میں تو خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی ہوں کہ اس نے ہماری اریشہ کو بھٹکنے سے بچا لیا' ورنہ نہ جانے یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا؟

ان کے تیز لہجے میں گہری کاٹ چھپی تھی۔ نورینہ بیگم تو بس حیرانی سے ان کی طرف دیکھتی ہی رہ گئیں۔

معصوم سے ازمیر شاہ کی اصلیت یہ ہو گی' انہوں نے تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ ذاتی طور پر آج تک انہوں نے کبھی ازمیر یا سمیہ سے کوئی پرخاش نہیں رکھی تھی مگر جب سے فرزانہ بیگم نے اس کی ذات کو ان پر کھولنا شروع کیا تھا' تب سے نہ جانے کیوں وہ ازمیر کے لیے دل میں کوئی اچھا جذبہ نہیں رکھ پا رہی تھیں' اور اب اس کی فلرٹ عادت کے متعلق سن کر تو انہیں اور بھی برا لگا' تب ہی اگلے پل وہ قدرے دھیمے لہجے میں بولیں۔

''آپ کو یہ بات کیسے پتہ چلی؟''

فرزانہ بیگم کی فطرت سے اچھی طرح واقف ہونے کے باوجود وہ کبھی کبھی ان کی باتوں میں آ جاتی تھیں۔ سو اس وقت بھی ان کی بات پر

یقین کرتے ہوئے انہوں نے قدرے متاسف لہجے میں کہا تو فرزانہ بیگم اپنے مقصد میں کامیاب ہوکر مسکراتے ہوئے بولیں۔

''بچوں نے بتایا مجھے......ازمیر میاں غالباً اریشہ بیٹی کو اپنی کتھا سنا رہے تھے جب انہوں نے بھی سن لیا' بہرحال ہمیں کسی سے کیا۔ جب احسن اور حائقہ کو ہی اپنے بچوں کی کوئی پرواہ نہیں' تو ہم کیوں کسی کے عیبوں سے پردہ اٹھاتے پھریں۔''

ان کے تیز لہجے پر نورینہ بیگم نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا' پھر سرد آہ بھر کر معذرت کرتے ہوئے تھکے تھکے سے انداز میں وہاں سے اٹھ کر چل دیں' تو ایک مطمئن سی مسکراہٹ فرزانہ بیگم کے لبوں پر بکھر گئی' اور وہ قدرے ہلکی پھلکی ہوکر خود بھی وہاں سے اٹھ کر اندر چلی گئیں۔ رات کو دیر تک سڑکوں پر آوارہ گردی کے بعد ازمیر جوں ہی گھر واپس لوٹا' اریشہ لاؤنج میں ہی اس کی منتظر بیٹھی تھی' وہ اسے سرسری نظر سے دیکھ کر آگے بڑھنا ہی چاہتا تھا' جب اریشہ جھٹ سے اٹھ کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

''میں تم سے بات کرنا چاہتی ہوں ازمیر......پلیز میری بات سنو تم......''

اس کی سرخ آنکھوں میں مکمل اعتماد سے دیکھتے ہوئے وہ مدھم لہجے میں بولی تو تھکے تھکے سے ازمیر شاہ کے لبوں پر بڑی پھیکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ تب ہی وہ قدرے چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''اپنی مما سے پوچھ لو پھر بات کر لینا مجھ سے' ورنہ وہ پھر کوئی نیا ڈرامہ پیش کر دیں گی۔''

''تم غلط سوچ رہے ہو ازمیر۔ میری مما ایسی نہیں ہیں۔''

وہ فوراً تپ کر بولی تھی، جس پر ازمیر بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے ہنس پڑا۔

''تو اور کیسی ہیں وہ......؟'' خاصا دل جلا انداز تھا اس کا، اریشہ نے سر جھٹک کر اپنا غصہ کم کیا۔

''ازمیر! میں اس وقت مما کو لے کر تم سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی، پلیز تم ان کے بارے میں غلط انداز سے سوچنا چھوڑ دو۔''

''چھوڑ دیا......مزید کوئی حکم۔''

دوبدو جواب دیتے ہوئے مختصر لہجے میں وہ فوراً بولا تھا، جس پر اریشہ نے کسی قدر بے بسی سے اسکے نڈھال سراپا پر ایک اداس سی نظر ڈالی۔

''ازمیر......تم میرے سب سے اچھے دوست ہو، سب سے زیادہ فکر کرتے ہو میری، تو پھر اس وقت جبکہ مجھے تمہاری مدد کی اشد ضرورت ہے تو تم مجھ سے دور بھاگ رہے ہو۔ کیوں ازمیر، پلیز بتاؤ، کہ ایسا کیوں کر رہے ہو تم؟''

نگاہیں اس کے تھکے تھکے سے چہرے پر جمائے وہ قدرے بے بسی سے بولی تو ازمیر فقط دکھ سے اسے ایک نظر دیکھ کر رہ گیا، پھر سرد آہ بھرتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا۔

''میں بھی تم سے یہی سوال کرنا چاہتا ہوں اریشہ......کیوں کر رہی ہو تم یہ سب......؟''

''ک......کیا کر رہی ہوں میں......؟''

حیرت سے گنگ وہ یک ٹک اسے دیکھتے ہوئے بولی تو ازمیر نے دھیمے سے سر جھٹک کر رخ پھیر لیا۔ پھر سیڑھیوں کی گرل پر ہاتھ جمائے

ہوئے مضبوط لہجے میں بولا۔

''تم مجھے میرے انداز سے جینے نہیں دے رہی ہو اریشہ..... ہر بار میرے راستے میں آ کر ڈسٹرب کر کے رکھ دیتی ہو مجھے، آخر کیوں نہیں تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دیتی۔ کیوں نہیں گھر کے دوسرے لوگوں کی مانند مجھ سے لاپرواہ ہو جاتی، بولو..... کیوں نہیں ایسا کرتی ہو تم۔''

''کیونکہ..... کیونکہ میں.....''

اس کے بے ساختہ سوال پر وہ قدرے بوکھلا گئی تھی۔ تب ہی دل کی بات فوراً لبوں پر نہ لا سکی تو نڈھال سا ازمیر شاہ اس کی بوکھلاہٹ پر دھیمے سے مسکرا دیا۔

''کوئی جواب نہیں ہے ناں تمہارے پاس۔'' رخ اس کی طرف پلٹتے ہوئے وہ بولا۔

''لیکن میرے پاس اس کا جواب ہے اریشہ..... تم ایسا اس لیے نہیں کر سکتی ہو کیونکہ تمہیں مجھ سے ہمدردی ہے، تم سمجھتی ہو کہ اگر تم بھی دوسرے لوگوں کی طرح مجھے ٹریٹ کرو گی تو کہیں میں ٹوٹ کر بکھر نہ جاؤں، کہیں میرا دل زندگی سے بھر ہی نہ جائے، کہیں میں خود کو کوئی نقصان ہی نہ پہنچا بیٹھوں، بٹ ڈونٹ وری اریشہ..... میں ایسا کچھ نہیں کروں گا' کیونکہ میں خود کو بدصورت نہیں سمجھتا، جس طرح تم لوگ اپنے حسن کے خیال میں خوش و خرم رہتے ہو، بالکل ویسے ہی میں بھی اپنے آپ سے مطمئن ہوں اور شکر گزار ہوں اس پروردگار کا، جس نے مجھے کوئی ادھورا پن نہیں دیا، جس نے تم سب کی مانند، مجھے ہاتھ ناک، کان، پاؤں سب دیئے، ہاں اریشہ میں اپنی زندگی سے خوش اور مطمئن ہوں، بھلے تم لوگ مجھے کسی قابل نہ سمجھو، لیکن میں تمہارے رویوں کو لے کر ہرٹ ہونے والا نہیں، کیونکہ مجھے اپنے خدا پر مکمل یقین ہے، پورا بھروسہ ہے اس وحدہٗ لاشریک کی ذات پر، کہ اس نے اگر مجھے دنیا میں بھیجا ہے تو ضرور کسی کے دل میں میرے لیے سچی محبت بھی ڈالی ہوگی، جو کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں تو مجھے مل ہی جائے گی۔''

اریشہ ٹکر ٹکر اسے دیکھتی ہی رہ گئی، اور وہ بکھرے ہوئے لہجے میں اپنی بات مکمل کر کے لمبے لمبے ڈگ بھرتا، وہاں سے رخصت ہو گیا۔

بنا اریشہ کے دل کی کوئی بات سنے، بنا اس کی محبت کی حقیقت جانے..... اور وہ گم صم سی، دل کی بات دل میں ہی رہ جانے پر، نڈھال ہو کر وہیں صوفے کا پایہ پکڑ کر بیٹھ گئی، وہ اسے بتا ہی نہ سکی کہ اسے ازمیر سے کوئی ہمدردی نہیں ہے، دوستی، مصلحت یا اس دل رکھنے کی کوئی بات ہے، بلکہ اسے تو اس کے وجود سے اس کی پرکشش اور سلجھی ہوئی ذات سے، اس کے محبت بھرے حساس دل سے، ٹوٹ کر شدید محبت ہے، اتنی شدید محبت کہ وہ چاہے بھی تو دل کے جذبوں پر کوئی بند نہیں باندھ سکتی۔

مگر ایک یہی اظہار تو دشوار ترین ہو گیا تھا اس کے لیے، تب ہی تو اپنی بے بسی پر بے اختیار ہی اسے رونا آ گیا اور وہ وہیں صوفے سے سر ٹکا کر چپ چاپ آنسو بہانے لگی، جب ماہم شاہ بالکل اتفاقیہ طور پر اسے وہاں تنہا بیٹھے دیکھ کر اس کی طرف چلی آئی۔

''ارے..... اریشہ..... تم اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو بھئی..... سب اپنے اپنے کمروں میں آرام کر رہے ہیں اور تم یہاں بیٹھی رو رہی ہو، کیوں.....؟''

خاصے جانچتے ہوئے لہجے میں اس کے قریب پہنچ کر اس نے پوچھا تھا، جواب میں اریشہ نے سرعت سے اپنے آنسو پونچھ کر فقط ایک نظر

اس پر ڈالی، پھر بھرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''وہ......مم، مجھے نیند نہیں آ رہی تھی، اس لیے۔''

''اچھا...... ویسے کیا تم بتانا پسند کرو گی کہ یہ نیند کیوں نہیں آ رہی تھی تمہیں، ضرور اس کی وجہ ازمیر بھائی ہیں...... ہے ناں۔''

اپنے مخصوص شارپ انداز میں فوراً وہ بولی تو اریشہ کے لیے اس سے دامن چھڑانا مشکل ہو گیا۔ تب دوبارہ وہ اس کا جگر کاٹتے ہوئے نوکیلے لہجے میں بولی۔

''ویسے تمہارا ابھی کوئی جواب نہیں اریشہ...... کبھی تم انہیں رو رو کر منا رہی ہوتی ہو، تو کبھی کاغذوں پر دل کا حال لکھ کر ان کی ڈائریوں میں رکھ رکھ کر آتی ہو وہ تو شکر ہے خدا کا کہ میں نے تمہیں ایسی حرکت کرتے ہوئے دیکھ کر ازمیر بھائی کے کمرے سے وہ خط غائب کر دیا اور کسی سے اس کے متعلق کچھ نہیں کہا، ورنہ سوچو کہ اگر یہ بات گھر کے بزرگوں کو پتہ چل جاتی تو سب کی نظروں میں کیا مقام رہتا تمہارا......؟ اور وہ...... جن سے بڑا پیار جتاتی ہو تم...... انہیں اگر تمہاری ذرا سی بھی پروا ہوتی ناں، تو وہ تمہاری آنکھوں میں دیکھ کر تمہارے دل کا حال جان لیتے، اس کے لیے تمہیں ایسی چیپ حرکتیں کرنے کی ضرورت کبھی نہ پیش آتی، مگر انہیں تمہاری کوئی پروا نہیں ہے کیونکہ وہ صرف اور صرف شہرین خان سے پیار کرتے ہیں، اور ہمیشہ اسی کے متعلق سوچتے رہیں گے، چاہے تم کتنا بھی ان کے پیچھے بھاگو، وہ پلٹ کر تمہیں کبھی نہیں دیکھیں گے، سمجھی تم۔''

پہلا جھٹکا ابھی تھوڑی دیر قبل ازمیر نے اسے لگایا تھا، اس کی سچی اور پرخلوص محبت کو ہمدردی کا نام دے کر، اور اب دوسرا شدید جھٹکا اسے ماہم کے کڑوے الفاظ نے لگایا تھا جو اس کی ہر حرکت سے باخبر ہونے کا دعویٰ کر رہی تھی۔

''تو...... تو اسی لیے ازمیر میرے دل کے حال سے بے خبر رہا، اور میں...... میں سوچتی رہی کہ وہ سب کچھ جان کر بھی بے خبر بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ جبکہ حقیقت میں، میرے الفاظ تو اس تک پہنچے ہی نہیں۔''

گومگو سی کیفیت میں ماہم شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے سوچا' تب ہی وہ دوبارہ بول پڑی۔

''دیکھو اریشہ...... ہم نے آنکھوں دیکھ کر بھی تمہاری بہت سی خامیوں اور غلطیوں کو نظر انداز کیا ہے' صرف اس لئے کہ تم اذہان بھائی کی پسند ہو' ان کی خوشی ہو' اسی لیے ہم سب کچھ جان کر بھی تمہیں اپنے گھر کی زینت بنانا چاہتے ہیں۔ کیونکہ اسی میں سب کی خوشی ہے' لیکن اگر تم اپنی ان غلط حرکات سے باز نہ آئیں تو ہو سکتا ہے کہ تاریخ پھر اپنا آپ دہرا دے اور تمہیں بھی اپنی مما کی طرح ساری عمر اپنے شوہر کے پیار سے ترسنا پڑے' اور یاد رکھو کہ اگر ایسا ہوا تو تم ہم سب کی محبت اور اپنے حصے کی عزت سے تو ہاتھ دھو ہی بیٹھو گی' ساتھ میں کہیں تمہیں اپنی مما کے پیار اور ان کی شفقت سے شاید عمر بھر کے لیے محرومی نہ اٹھانی پڑ جائے' کیونکہ ان کے لیے تمہارا یہ قدم شدید صدمے کا باعث ہو گا' جسے وہ چاہ کر بھی برداشت نہیں کر پائیں گی۔''

ماہم جو بات اس کے ذہن میں ڈالنا چاہتی تھی' وہ ڈال چکی تو اریشہ لرز کر رہ گئی۔ اسے کسی بھی صورت اپنی مما سے جدائی گوارہ نہیں تھی' تب ماہم کی بات پر تڑپ کر سر گھٹنوں میں دیئے وہ پھر سے اپنی بے بسی پر آنسو بہانے لگی۔

☆☆☆

''ایکسکیوزمی...... مس شاہ......''

انجشاء اپنے فیورٹ بوتیک سے اپنے لیے کچھ ڈریس خرید رہی تھی ' جب مانوس پکار پر اس نے پلٹ کر دیکھا' پھر جوں ہی نظر عدنان رؤف کے فریش چہرے سے ٹکرائی' وہ دھیمے سے مسکرا کر اسے دیکھنے لگی۔

''وہ...... میں یہاں اپنی مما کے لیے کچھ ڈریس اپنی پسند سے خریدنے آیا تھا' کہ آپ کو بھی یہاں دیکھ کر میں خود کو آپ سے مخاطب ہونے سے روک نہیں پایا' بائی دا وے' کل پارٹی میں آپ نے تو مجھے سحر زدہ ہی کر دیا' کس خوب صورتی سے آپ نے مسٹر ہمدانی والا کنٹریکٹ اپنی کمپنی کو دلایا' میں سچ بزنس میں آپ کی قابلیت پر حیران رہ گیا۔'' وہ جلدی جلدی یوں بول رہا تھا گویا ابھی انجشاء اس کی بات کاٹ کر کہیں چلی جائے گی۔

''او تھینکس...... مجھے تو پتہ ہی نہیں تھا کہ میں آپ کو متاثر کر رہی ہوں ورگرنہ شاید میں اس سے زیادہ محنت کرتی۔''

اپنے ڈریسز کی پے منٹ کر کے وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے قدرے شگفتہ لہجے میں بولی تو بے قرار سے عدنان رؤف نے دھیمے سے مسکرا کر ستائشی انداز میں اسے بغور دیکھا۔ بلیک لان کے سادہ سے سوٹ میں اس کا دل کش سراپا' نہ جانے کیوں دل میں ہلچل مچا رہا تھا۔ تب ہی وہ اس کی نگاہوں میں اپنے لیے عجیب سی پیاس دیکھ کر مسکراتے ہوئے دوبارہ گویا ہوئی۔

''مسٹر عدنان! مجھے تو اس وقت بہت بھوک لگ رہی ہے' اس لیے معذرت کہ آپ کو' آپ کی مما کے لیے ڈریسز کے انتخاب میں کوئی مدد دیئے بغیر یہاں سے جا رہی ہوں۔''

اپنے مخصوص سلجھے ہوئے لہجے میں اس نے کہا تو عدنان فوراً اس کی بات پر سر اثبات میں ہلاتے ہوئے بولا۔

''ہاں...... وہ مجھے بھی اس وقت بہت بھوک لگ رہی ہے' اس لیے شاپنگ تو میں بعد میں بھی کر لوں گا' اس وقت چلیے' اکٹھے ہی لنچ کرتے ہیں۔''

کسی قدر بے قراری سے فوراً اس نے کہا تھا' جواب میں انجشاء دھیمے سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مسکرا کر اسے دیکھنے لگی' پھر اس کی ہمراہی میں ہی قدم بوتیک سے باہر کی طرف بڑھا دیئے۔

''جی...... اب بتایئے کیا کھانا پسند فرمائیں گی آپ؟''

جوں ہی وہ لوگ قریبی ریستوران میں پہنچے' اپنی سیٹ پر انجشاء کے بالکل سامنے بیٹھتے ہوئے عدنان نے' ایک دم فریش لہجے میں پوچھا' جواب میں انجشاء نے بے نیازی سے کندھے اچکا دیئے۔

''جب مجھے بھوک لگی ہو تو میں پسند ناپسند کبھی نہیں دیکھتی' بس جو بھی دستیاب ہوتا ہے' پیٹ بھرنے کی کرتی ہوں' ویسے بھی یہاں آپ مجھے لے کر آئے ہیں' تو یقیناً یہاں کی کوئی ڈش آپ کی فیورٹ تو ضرور ہو گی' لہٰذا آپ جو منگوائیں گے' وہی میری پسند ہو گی۔''

''وتھینکس۔''

اس کے کھلے کھلے لہجے پر عدنان نے سرشاری سے مختصر کہا۔ پھر اپنی پسند پر چکن رائس کی دو پلیٹیں منگوا لیں۔

''مس شاہ' آپ نے کبھی اپنے بارے میں کھل کر کچھ بتایا نہیں' آئی مین کہاں رہتی ہیں؟ پہلے جاب اور پھر بزنس کی طرف کیوں آئیں؟ گھر میں آپ کے علاوہ اور کون کون ہے۔وغیرہ وغیرہ۔'' اسے حقیقت میں بھوک تو تھی نہیں تب ہی چمچ کو بے مقصد پلیٹ میں چلاتے ہوئے دوستانہ انداز میں بولا تو انجشاء چاولوں کا چمچ منہ میں ڈالتے ڈالتے رک گئی' پھر بغور اس کی طرف دلچسپی سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''مجھے انجشاء کہتے ہیں۔یہیں اس شہر میں سمن آباد کے قریب گھر ہے میرا' اور بزنس کی طرف کیوں آئی' تو یہ سو فی صد میرا شوق تھا' زندگی کو مصروف انداز میں بسر کرنے کی اک موہوم سی کوشش' ویسے آپ نے بھی تو کبھی اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔''

بڑی خوب صورتی کے ساتھ اسے مطمئن کر کے اس نے اپنا سوال اس پر داغ دیا تو عدنان بے حد مسرور انداز میں اسے اپنے متعلق بتانے لگا۔اپنے لائف اسٹائل' اپنے مشاغل' اپنے والدین' اپنی عادات' یہاں تک کہ اپنی منگیتر انجشاء کے متعلق سب کچھ بتا دیا اسے۔

''آپ کی اسٹوری تو بڑی انٹرسٹنگ ہے' اب دیکھئے ناں' آپ کی منگیتر صاحبہ اور میرا نام ایک ہی ہے' شاید تب ہی میں آپ کو دوسری تمام لڑکیوں سے منفرد لگتی ہوں۔'' اس کے فریش لہجے سے قطعی یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ اس کے دل میں کتنے طوفان پل رہے ہیں۔تب ہی عدنان رؤف بڑے مسحور کن سے انداز میں مسکرا دیا تھا۔

''نہیں' ایسی بات نہیں ہے' آپ ریئلی بہت گریٹ ہیں' بہت کم میں نے آپ جیسی لڑکیوں کو اتنی ساری فیلڈز میں کامیابیاں سمیٹتے دیکھا ہے' بلکہ سچ پوچھیں تو کوئی بھی عام سی لڑکی اتنی خود اعتماد ہو ہی نہیں سکتی۔''

''چلئے' آپ کہتے ہیں تو مان لیتے ہیں' ویسے شادی کب کر رہے ہیں آپ......؟''

ٹشو پیپر سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اس نے خاصی بے نیازی سے کہا تو جانے کیوں عدنان رؤف چاہ کر بھی اس سے اپنے دل کی بات شیئر نہ کر سکا۔تب ہی نگاہیں چرا کر دھیمے لہجے میں بولا۔

''میں اپنی منگیتر سے شادی نہیں کر سکتا' مس انجشاء کیونکہ وہ مجھے قطعی پسند نہیں ہے۔''

''کیوں......؟ آئی مین کیا بہت بدصورت ہیں وہ......''

انجشاء کو اس کے لہجے میں اپنی منگیتر کے لیے کسی قسم کی کوئی محبت یا عزت کا تاثر نہیں ملا تھا اور اس بات نے اسے پھر سے ہرٹ کر دیا تھا' تب ہی اس نے فوراً پوچھا تو عدنان رؤف سرد آہ بھر کر گلاس کے کنارے پر انگلی پھیرتے ہوئے بولا۔

''پتہ نہیں' میں نے بہت پہلے اسے دیکھا تھا' جب وہ محض آٹھ نو سال کی تھی' اس کے بعد پاپا ترقی کے چانس میں گاؤں سے شہر آ بسے تو میں اور مما مکمل طور پر اپنے رشتہ داروں سے کٹ کر رہ گئے' پھر شہر آنے کے تین چار سال بعد ہی پاپا ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں اپنی دونوں ٹانگیں کھو بیٹھے تو ہم بالکل ہی گاؤں سے کٹ گئے' سچ کہوں تو مجھے اپنے گاؤں اور گاؤں میں بسنے والے اپنے رشتہ داروں سے قطعی کوئی انٹرسٹ تھا بھی نہیں' مجھے اپنے ننھیال طرز زندگی پسند تھا' آزادانہ اور بولڈ......سو میں زیادہ تر اپنے ننھیال ہی میں رہا' تاہم پاپا کے اصرار پر کبھی کبھی گاؤں بھی چکر لگا لیتا تھا' لیکن جس روز میں انگلینڈ سے اپنی تعلیم مکمل کر کے ہمیشہ کے لیے پاکستان واپس لوٹا' اور مجھے مما کی معرفت یہ علم ہوا کہ پاپا نے میری لائف پارٹنر کے

طور پر انجشاء کا انتخاب کیا ہے تو مجھے ان پر بہت غصہ آیا' کیونکہ میں ایک دیہاتی لڑکی کو اپنے پلے باندھ کر زندگی بھر کا دردِ سر مول لینا نہیں چاہتا تھا' سو پاپا سے چوری' بالآخر ایک دن یہ رشتہ ہمیشہ کے لیے توڑ دیا لیکن پاپا کو ابھی تک میں نے اس حقیقت سے باخبر نہیں کیا کیونکہ وہ اپنے گھر والوں سے بہت پیار کرتے ہیں' دن رات انہیں یاد کر کے روتے رہتے ہیں' انہیں اگر میری اس حرکت کا پتہ چل جاتا تو شاید وہ یہ صدمہ برداشت نہ کر پاتے' یا پھر طیش میں آ کر مجھے اپنی جائیداد سے بے دخل کر دیتے' جو کہ میں اور مما ہرگز نہیں چاہتے' سو ان سے میں نے یہی کہا کہ خود دادا جی نے ان سے ناراض ہو کر یہ رشتہ توڑ دیا ہے' اور اب وہ بے چارے دن رات خود کو قصوروار سمجھتے ہوئے میرا زیادہ سے زیادہ خیال رکھنے لگے ہیں۔''

انجشاء دھواں دھواں سے دل کے ساتھ چپ چاپ اس کی روداد سن رہی تھی اور وہ اپنی ہی ترنگ میں اس کے دل کی حالت سے بے نیاز کہہ رہا تھا۔

''پتہ ہے انجشاء.....شروع شروع میں پاپا کو اپنے گھر والوں کے لیے روتا دیکھ کر میں سوچتا تھا کہ شاید میں اپنی خوشی کے لیے جو کچھ بھی کر رہا ہوں' وہ ٹھیک نہیں ہے' لیکن اب جب سے میں نے آپ کو دیکھا ہے' تو سوچتا ہوں کہ شاید میں نے جو کیا' وہ بہت اچھا ہی کیا کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ میری زندگی میں کیسے آتیں.....؟''

خاصی ہوشیاری سے وہ اپنے دل کی بات اس پر عیاں کرتے ہوئے مسرور لہجے میں بولا' تو انجشاء نے کس قدر دکھ سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر خاصے تھکے ہوئے لہجے میں بولی۔

''آپ غالباً بھول رہے ہیں مسٹر عدنان' کہ میں آل ریڈی میرڈ ہوں' لہٰذا میں تو آپ کی زندگی میں کہیں بھی نہیں ہوں' ہاں اتنا ضرور ہے کہ اپنی خوشی اور اپنی پسند کی زندگی کے حصول کے لیے آپ نے جو اتنے سارے دلوں کا خون کیا' اس پر بہت افسوس ہے مجھے' آئی ایم سوری' لیکن میں آپ کو اتنا خود غرض نہیں سمجھتی تھی۔'' عدنان افسوس خیزی سے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا اور وہ دکھ سے کہہ رہی تھی۔

''آپ نے اپنی خوشیوں کی خاطر' کبھی ایک لمحے کے لیے بھی اس پرخلوص لڑکی کے لیے نہیں سوچا' جس نے بچپن سے آپ کا نام اپنے نام کے ساتھ جڑا دیکھ کر نہ جانے آپ کے حوالے سے کتنے خواب اپنی آنکھوں میں بھر لیے ہوں گے' لیکن آپ نے اکیلے ہی دو زندگیوں کا فیصلہ کر لیا۔ اسے بنا پرکھے' بنا جانے' بنا دیکھے رد کر دیا' کیوں مسٹر عدنان' کیا قصور تھا اس معصوم سی لڑکی کا اور پھر آپ کے پاپا' جنہوں نے نہ جانے کتنی خوشی کتنے مان سے آپ کی زندگی کا یہ فیصلہ کیا ہوگا لیکن آپ نے ان کی بھی کوئی پروا نہیں کی' الٹا انہیں ہمیشہ اندھیرے میں رکھ کر مزید دکھ سے ہمکنار کرتے رہے' کیوں عدنان.....؟ آپ بھی تو دیکھنے میں بہت سلجھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں' لیکن آپ نے شاید یہ کبھی سوچا نہیں کہ خوب صورتی ہمیشہ صرف اچھے رنگ و روپ کا عنوان نہیں ہوتی' بلکہ یہ تو آنکھوں میں ہوتی ہے' اور ان آنکھوں میں جو چہرہ بس جائے' وہ خواہ کسی کو اچھا لگے نہ لگے' لیکن ہماری تو پوری دنیا بسی ہوتی ہے اس ایک چہرے میں میرے خیال سے ہمیں کافی دیر ہو گئی ہے اب چلنا چاہیے۔''

نہایت تفصیل کے ساتھ قدرے افسردہ لہجے میں اپنے خیالات اس کے ذہن میں انڈیل کر وہ کلائی پر بندھی رسٹ واچ کو ایک نظر دیکھتے ہوئے بولی تو دل کے نا چاہتے ہوئے بھی عدنان اس کی تقلید میں اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

پھر جس وقت وہ لوگ ریستوران سے باہر نکلے اپنی گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے عدنان نے خاصے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''مجھے آج آپ سے اپنے دل کی باتیں شیئر کر کے بہت اچھا لگ رہا ہے مس انجشاء...... یقین جانئے کہ آج مدت کے بعد میں اپنے دل کی بات مکمل اعتماد کے ساتھ کسی سے کہہ پایا ہوں۔ بہر حال امید کرتا ہوں کہ آپ آئندہ بھی مجھے اس خوشی سے محروم نہیں کریں گی۔''

''بالکل۔''

اس کے بجھے ہوئے لہجے پر انجشاء نے مسکرا کر بے نیازی سے کندھے اچکائے تب وہ گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے دوبارہ بولا۔

''مس انجشاء پرسوں میری مما کی برتھ ڈے پارٹی ہے۔ جسے ہم خوب دھوم دھام سے منانا چاہتے ہیں۔ اسی لیے وسیع پیمانے پر اہتمام کیا ہے میری خواہش ہے کہ آپ بھی اس تقریب میں شرکت کریں' کیونکہ اس سے مجھے تو خوشی ہوگی ہی' ساتھ میں میرے ممی پاپا کو بھی آپ سے مل کر بہت اچھا لگے گا۔''

وہ خالص اپنائیت سے کہہ رہا تھا لیکن اس کے برابر میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے انجشاء نے ذرا سا مسکرا کر صاف انکار کر دیا۔

''دیکھیے مسٹر عدنان' پرسوں ہی مسٹر اریج احمر کے ساتھ مجھے ایک بہت اہم میٹنگ اٹینڈ کرنی ہے پھر میرے گھر والے بھی مجھے اجنبی تقریبات میں شرکت کی اجازت نہیں دیتے' سو میں معذرت چاہوں گی کہ میں چاہ کر بھی آپ کی پارٹی اٹینڈ نہیں کر سکتی۔''

''لیکن کوئی بھی میٹنگ آپ کے لیے ایک دوست کی خوشی سے بڑھ کر تو نہیں ہو سکتی اور جہاں تک آپ کے گھر والوں کا سوال ہے تو ان سے میں اجازت لے لوں گا۔''

وہ اپنی گھریلو تقریب میں اس کی شرکت کے لیے بے حد بے قرار دکھائی دے رہا تھا لیکن انجشاء کے مزاج پر اس کی بے قراری نے کوئی اثر نہیں ڈالا' تب ہی وہ نگاہیں گاڑی سے باہر کے دلکش نظاروں پر جماتے ہوئے قدرے سرد لہجے میں بولی۔

''سوری مسٹر عدنان...... میں نے کہا نا کہ میں آپ کی فیملی گیدرنگ کا حصہ نہیں بن سکتی' سو پلیز مجھے فورس مت کریں' ویسے بھی مجھے بڑے لوگوں کی سوشل سی تقریبات زیادہ اپیل نہیں کرتیں۔''

اس کا انداز اتنا روڈ تھا کہ عدنان چاہ کر بھی اسے مزید فورس نہیں کر سکا' اور چپ چاپ دکھی دل کے ساتھ گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی۔

''اپنی مما کو میری طرف سے مبارکباد ضرور دیجئے گا' اور اپنے پاپا کو بہت بہت سلام کہئے گا میرا۔''

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ دوبارہ اس کے مرجھائے ہوئے چہرے کی طرف دیکھ کر بولی تو چپ چاپ سے عدنان رؤف نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''بس...... پلیز یہیں گاڑی روک دیجیے۔ مجھے کچھ پھل خریدنے ہیں' پھر جانے کب چکر لگے۔''

اپنے گھر سے تھوڑے ہی فاصلے پر اس نے گاڑی رکوائی تو اس کے حکم کی تعمیل میں عدنان نے فوراً بریک پر پاؤں رکھ دیا۔

''بس اب میں خود ہی چلی جاؤں گی' آپ پلیز اپنا ٹائم مزید ویسٹ مت کیجیے۔''

اگلے ہی لمحے اس نے بیگانگی سے کہا تو عدنان خاصی شکوہ بھری نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گیا، اور انجشاء دور تک اسے جاتے ہوئے دیکھ کر اطمینان سے اپنے گھر کی طرف چل دی۔

☆☆☆

''تمکین...... بھئی کہاں ہو تم...... کب سے ڈھونڈ رہا ہوں تمہیں۔''

وہ کچن میں اپنے لیے چائے بنا رہی تھی' جب بے قرار سا اشعر تقریباً چلا کر اسے پکارتے ہوئے وہیں کچن میں چلا آیا۔

''کہو...... کیوں بندروں کی طرح حلق پھاڑ پھاڑ کر چلا رہے ہو؟''

چائے پتیلی سے کپ میں انڈیل کر وہ اشعر کی طرف پلٹتے ہوئے بولی تو اشعر جھٹ سے کپ اس کے ہاتھ سے چھین کر آرام سے وہیں کرسی پر ٹک گیا۔

''جناب' ایک بہت بڑی خوش خبری ہے تمہارے لیے' سنو گی تو زمین سے اچھل پڑو گی۔'' مزے سے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے وہ فریش لہجے میں بولا تو اسے گھور کر دیکھتی ہوئی تمکین رضا' فوراً اشتیاق سے قریب آ کر بولی۔

''کیسی خوش خبری' پلیز بتاؤ ناں؟''

''اوہو...... بے قراریاں تو دیکھو' ویسے جناب میں اس وقت ہماری شادی کے متعلق کوئی بات نہیں کر رہا بلکہ میں تو تمہیں شیزا کے متعلق خبر دینے آیا تھا' کہ محترمہ کل پہلی فلائٹ سے ہی لاہور پہنچ رہی ہیں۔''

جان بوجھ کر ستاتے ہوئے وہ شرارتی لہجے میں بولا تو مشتاق سی تمکین ہلکا سا ایک تھپڑ اس کے کندھے پر رسید کرتے ہوئے واقعی خوش ہو گئی۔

''دیکھو...... دوستوں کے لیے دل میں اتنا پیار...... اور یہاں میں ترس رہا ہوں ایک محبت بھرے جملے کے لیے' مگر مجال ہے کہ تمہیں کبھی میرا خیال آ جائے۔''

کپ خالی کر کے آرام سے اسے تھماتے ہوئے وہ مسرور لہجے میں بولا تو تمکین نے کھلکھلاتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیے۔

''بس...... اشعر پلیز' تم واقعی بہت گریٹ ہو' مگر اس وقت میں ہرگز تم سے چونچ لڑانے کے موڈ میں نہیں ہوں۔''

''چلو شکر ہے خدا کا' تم نے مجھے گریٹ تو مانا' یہ اونٹ کسی کروٹ بیٹھا تو سہی۔''

اس کے لہجے کی کھنک میں قطعی کوئی فرق نہیں آیا تھا' جبکہ کھلکھلاتی ہوئی تمکین کے کان فوراً کھڑے ہو گئے۔

''یہ تم نے اونٹ کسے کہا ہے......؟''

بھنوئیں اچکا کر فوراً وہ تیز لہجے میں بولی تو اس کا سرخ سرخ سا چہرہ دلچسپی سے دیکھتے ہوئے اشعر نے مسکرا کر کہا۔

''او...... سوری' اونٹ نہیں' اونٹنی' ہے ناں؟''

منزے سے کہنے کے ساتھ ہی اس نے باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ تو جلتی بھنتی تمکین اس کے پیچھے ہی باہر بھاگ آئی مگر وہ کہاں ہاتھ آنے والا تھا۔ سوز چ ہو کر وہ حسب عادت اسے بے بھاؤ کی سناتی دوبارہ کچن میں چلی آئی۔

''ایک بار شادی ہو جائے پھر دیکھنا کیسے ساری عمر انگلیوں پر نچاتی ہوں میں۔''

چائے کے لیے دوبارہ پانی چڑھاتے ہوئے وہ بڑبڑائی پھر شیزا کی آمد کے متعلق سوچ کر دل ہی دل میں مسرور ہونے لگی۔ اس بات سے قطعی بے خبر کہ شیزا ایبٹ آباد سے اس کی خوشیاں بانٹنے آ رہی ہے یا پھر اس سے خوشیاں چھیننے؟

تب ہی مسرت سے بے حال وہ اس کی آمد پر دل ہی دل میں ڈھیروں پلان خوشی خوشی ترتیب دینے لگی۔

اور اگلے روز جب تک شیزا نہیں گئی اس نے ایک ایک پل بے قراری سے انگلیوں پر گن گن کر گزارا پھر اشعر جیسے ہی شیزا کو ایئر پورٹ سے گھر لایا وہ اسے دور ہی سے دیکھ کر بھاگتے ہوئے اس سے لپٹ گئی۔

''بے وفا' بے مروت' اتنے دن ہو گئے' نہ کوئی فون' نہ ای میل' بتا' کیا سلوک کروں تجھ سے......؟''

''جو مزاج یار میں آئے۔''

اس سے الگ ہو کر ذرا سا جھکتے ہوئے وہ شوخ لہجے میں بولی تو تمکین آہستہ سے ایک دھپ اسے رسید کر کے خود بھی ہنس پڑی۔

''شیزا! کیا بات ہے بیٹے' بہت کمزور لگ رہی ہو۔''

وہ تمکین سے فارغ ہو کر عائشہ بیگم کی طرف پیار لینے کے لیے آئی تو انہوں نے محبت سے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا' جس پر وہ پھر بے ساختگی سے ہنس پڑی اور قدرے شریر لہجے میں بولی۔

''ہاں بڑی ماں' وہ میں نے نمی کو فون اور ای میل نہیں کیا تھا ناں' اسی ہجر کا نتیجہ ہے یہ' پورے چار ماہ تک سخت بیمار رہی ہوں میں' مگر مجال ہے جو کسی کو میرا ذرا سا بھی خیال آیا ہو......'' باری باری سب سے ملتے ہوئے وہ شکوہ کر رہی تھی' اور ''حسن ولاج'' کے مکین اس کے اس شکوے پر چپ چاپ سر جھکا گئے۔

''ارے رخسانہ آنٹی......آپ یہاں؟ مزہ آیا آپ سے مل کر تو۔''

بھرپور محبت کے ساتھ رخسانہ بیگم سے لپٹ کر وہ ان پر دلی خلوص نچھاور کرتے ہوئے بولیں تو رخسانہ بیگم بھی محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کی پیشانی چومنے لگیں۔

''ماشاء اللہ بہت پیاری بیٹی ہے منزہ کی' بالکل اپنی ماں پر گئی ہے۔''

اسے خود سے الگ کر کے انہوں نے پھر کہا تھا' جس پر شیزا ممنون نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے مسکرا دی۔

رات تک خوب گپ شپ لگی رہی' تب بزرگوں کے حکم پر سب اٹھ کر سونے کے لیے چل دیئے تو بادل نخواستہ شیزا اور تمکین بھی اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئیں۔

''شیزا' پتہ ہے کچھ روز پہلے ناں' میں یہیں اسی شہر میں انجشاء سے ملی تھی' بالکل اچانک' بائے چانس' اور تم اب اسے دیکھو گی ناں' تو حیران ہی رہ جاؤ گی' اتنا بدل گئی ہے وہ۔''

دھپ سے بیڈ پر بیٹھتے ہی اس نے خوشی خوشی یہ خبر شیزا کو سنائی تھی' جس پر وہ قدرے حیران ہو کر مسرت سے اسے دیکھنے لگی پھر اشتیاق سے بولی۔

''سچ...... کہاں ملی وہ تمہیں...... اور اب کہاں رہتی ہے۔ وہ؟''

''یہیں اسی شہر میں' وہ مسٹر اریج احمر تھے ناں' ان کے ساتھ مل کر بزنس کر رہی ہے۔''

تمکین نے پھر خوشی خوشی اسے باخبر کیا۔

''یہ تو بہت دلچسپ خبر سنائی تم نے۔ ہم کل ہی اس سے ملنے کے لیے چلیں گے۔''

''اوکے۔'' اس کے بے قرار لہجے پر تمکین نے دھیمے سے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''چلو اب سو جاؤ' بہت تھکن ہو رہی ہے' صبح مزید بات کریں گے۔''

وہ شاید زبردستی ہنس ہنس کر تھک گئی تھی۔ تب ہی حتمی لہجے میں بولی تو تمکین جو ابھی اس سے اپنے دل کی ڈھیروں باتیں کرنا چاہتی تھی اس کی تھکن کے خیال سے چپ چاپ لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

☆☆☆

''واہ بھئی مان گئے' تمہیں...... کیا ولن کا رول پلے کیا ہے تم نے ازمیر بھائی اور اریشہ کی محبت میں......؟'' ماہم اور دانیہ اپنے کمرے میں بیٹھی کمپیوٹر پر کسی سے چیٹ کر رہی تھیں جب دانیہ نے چہکتے ہوئے خوشامدی لہجے میں اس سے کہا' جواب میں وہ کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''مبارک ہو' آخر تمہاری کوششوں سے اریشہ صاحبہ تمہاری بھابھی بن ہی گئیں۔''

کی بورڈ کے نمبروں سے کھیلتے ہوئے خاصے مصروف انداز میں اس نے پھر مسکرا کر کہا تو ماہم کا سر فخریہ انداز میں ذرا سا مزید اونچا ہو گیا۔ تب ہی وہ متبسم لہجے میں بولی۔

''جناب ابھی صرف بات طے ہوئی ہے' باقاعدہ طور پر بھابھی نہیں بنی ہے وہ میری اور ویسے بھی میں اگر کوشش نہ بھی کرتی تب بھی اریشہ کو میری ہی بھابھی بننا تھا' تم نے دیکھا نہیں کہ نورینہ پھوپھو ازمیر بھائی کے کتنی خلاف ہو گئی تھیں جب انہوں نے اریشہ کو چانٹا مارا تھا ویسے بے چارے ازمیر بھائی کے ساتھ ہوا بہت برا۔ اب دیکھو ناں' لندن میں اس شہرین صاحبہ نے ٹھینگا دکھا دیا' اور یہاں نورینہ پھوپھو نے اس کی دال نہیں گلنے دی۔ اب پتہ نہیں کیا بیت رہی ہو گی بے چارے ازمیر بھائی پر۔''

ماہم کا طنزیہ لہجہ مزاح سے بھرپور تھا' تب ہی دانیہ اس کے شریر انداز پر کھلکھلا کر ہنس پڑی تو ماہم کے جاندار قہقہے نے بھی بھرپور انداز میں

اس کا ساتھ دیا۔

''ویسے ماہم! تمہیں کیسے پتہ چلا کہ ازمیر بھائی کو کسی شہرین صاحبہ سے بھی محبت ہوئی تھی۔''

اگلے ہی پل دانیہ نے ہنستے ہوئے پوچھا تھا' جواب میں قدرے مغرور سی ماہم شاہ ایک ادا سے اپنے سلکی بال سیٹ کرتے ہوئے اٹھلا کر بولی۔

''میں نے چوری چوری ازمیر بھائی اور اریشہ کی باتیں سنی تھیں' جب ایک روز اریشہ کو بلانے کے لیے میں ازمیر بھائی کے کمرے کی طرف آئی' بس تب ہی مجھ پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا' اور میں نے تم سب لوگوں کو بھی اس میں شریک کرلیا۔''

''گڈ...... ویسے میرا خیال تھا کہ شاید اریشہ نے خود تمہیں یہ بات بتائی ہو۔''

''جانے دو' وہ ازمیر کی چمچی' اتنی بے وقوف نہیں ہے اور نہ ہی ازمیر بھائی کے سامنے اس کے لیے ہماری کوئی ویلیو۔''

دانیہ کے مختصر سے لہجے پر فوراً وہ جل کر بولی' پھر سر جھٹک کر دوبارہ کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہوگئی' تو دانیہ نے بھی گویا سکون کا سانس لیا' جبکہ ان کے کمرے کی دہلیز سے باہر کھڑی حائقہ بیگم' گم صم سی اپنی جگہ کھڑی ان کے جملوں کی بازگشت میں ہی الجھتی رہیں۔

یہ گھر اور اس گھر کے رہنے والے ان کے لخت جگر سے ایسا سلوک روا رکھتے ہوں گے' انہوں نے تو آج تک کبھی ایسا محسوس کرنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی' وہ تو آج تک اپنے بچوں کے دکھ ان کی خوشی سے مکمل بے نیاز ہی بنی رہی تھیں' اور یہاں نہ جانے کون کون سی سازشیں ہو رہی تھیں۔ وقت جیسے ایک مرتبہ پھر ماضی کی طرف پلٹ رہا تھا' آج سے ٹھیک بائیس برس قبل فرزانہ بیگم نے جیسے ان کی زندگی کو تہس نہس کر دیا تھا' پل کے پل میں ہی جانے کیوں' انہیں آج اپنا بیٹا بھی اسی مقام پر کھڑا نظر آنے لگا' تب ہی ان کا دل کسی سوکھے پتے کی مانند کانپ کر رہ گیا۔

''نہیں نہیں...... میں اپنے بیٹے کے ساتھ کچھ بھی برا نہیں ہونے دوں گی' میں اسے اس کی خوشیاں دلا کر ہی رہوں گی۔'' ایک عزم کے ساتھ وہیں کھڑے کھڑے انہوں نے سوچا' اور مطمئن ہو کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

زبان ملے تو سنائیں جو ہم پہ بیتی ہے
قلم ملے تو حقیقت کی داستاں لکھیں
کوئی شجر ہو کہ سائے میں بیٹھ کر جس کے
جو دھوپ میں تھیں ساری تمازتیں لکھیں

☆

دل کے صحرا میں کوئی آس کا جگنو بھی نہیں
اتنا رویا ہوں کہ اب آنکھ میں آنسو بھی نہیں
کاسۂ در لیے پھرتی ہے گلشن کی ہوا
میرے دامن میں تیرے پیار کی خوشبو بھی نہیں

رات کے تقریباً دو بج رہے تھے، مگر نیند حائقہ بیگم کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ تب ہی وہ اپنے بستر سے اٹھ کر باہر لان میں کھلنے والی کھڑکی کی طرف چلی آئیں۔

باہر ٹھنڈی ٹھنڈی معطر ہوائیں، روح کو عجیب سا سرور بخش رہی تھیں مگر ان کے دل میں جو آگ لگی تھی اس کی تپش، ان کی سانسوں تک کو جھلسا رہی تھی۔

آج سے بائیس سال قبل انہوں نے کس قدر خوشی اور ڈھیروں ارمانوں کے ساتھ ''شاہ ولاج'' میں پہلا قدم رکھا تھا۔ دل میں ہزاروں خوشی کے دیپ جل رہے تھے۔ من چاہا ساتھی پا کر وہ خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھیں مگر خوشیوں کا یہ دورانیہ بہت زیادہ دیر تک ان کے نصیب میں نہ رہ سکا اور ان کی آنکھیں جو صرف مسکرانا جانتی تھیں، اب دھیرے دھیرے آنسوؤں کی عادی ہونے لگیں۔

وہ جو کروڑپتی باپ کی لاڈلی بیٹی تھیں۔ دو جان لٹانے والے بھائیوں کی اکلوتی بہن تھیں، جن کی زندگی کا بڑا حصہ مختلف یورپی ممالک میں بسر ہوا تھا۔ اب دھیرے دھیرے ''شاہ ولاج'' میں ایک بے بس پنچھی کی طرح مقید ہوتی گئیں۔

وہ جو احسن شاہ کے دل کی دھڑکن تھیں، شاہ محمد اور فاطمہ بیگم کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھیں، گھر بھر میں سب کی فیورٹ تھیں۔ فرزانہ بیگم کی سازشوں کا شکار ہو کر ایک ایک کر کے سب رشتوں کو گنواتی چلی گئیں۔

قدرت گواہ تھی کہ انہوں نے دل میں کسی قسم کی برتری کو کبھی جگہ نہیں دی تھی، لیکن انہیں آزادی سے اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنا پسند ضرور تھا اور یہ پسند بدل سکتی تھی۔ اگر وہ فرزانہ بیگم کی سازشوں کا شکار نہ ہوتیں تو۔ فرزانہ بیگم ہمیشہ ان کی سادہ دلی سے فائدہ اٹھا کر انہیں ''شاہ

ولاج'' کے مکینوں سے زیادہ سے زیادہ دور کرتی گئیں۔ بظاہران کی ہمدرد بن کروہ انہیں ایسے راستوں پر چلاتی رہیں۔ جوانہیں شاہ ولاج سے قدم بہ قدم دور لے جاتے گئے۔تب ہی آئے روز گھر میں جھگڑے اور فساد جنم لینے لگے۔فرزانہ بیگم جوانہیں تنہائی میں خوب بہکاتی تھیں۔سب کے سامنے، جب وہ بولتیں تو گویاان کے لبوں پر جامد، چپ لگ جاتی اور یوں ہر گزرتے دن کے ساتھ وہ سب کی نظروں سے گرتی گئیں۔

انہی دنوں اس گھر کی بیٹی نورینہ بیگم اپنی تین بیٹیوں کے ساتھ شوہر سے الگ ہو کر ہمیشہ کے لیے شاہ ولاج چلی آئیں۔جس پر فرزانہ بیگم نے انہیں مزید بھڑکایا اور وہ نورینہ بیگم سے بھی خار کھانے لگیں۔ہر وقت، ہر بات پر جلنے کڑھنے کے باعث وہ اپنے دونوں بچوں پر بھی ٹھیک سے توجہ نہ دے پائیں۔ان دنوں ان کا ذہن صرف وہی سچ مانتا تھا جو فرزانہ بیگم ان سے کہہ دیتیں۔گھر والوں سے الجھتے وقت ان کے لب وہی جملے ادا کرتے تھے۔جو فرزانہ بیگم انہیں دیتی تھیں۔

اور یہ فرزانہ بیگم کے ہاتھوں کٹھ پتلی بننے کا نتیجہ ہی تھا کہ بڑھتے بڑھتے نوبت ایک دن یہاں تک آ گئی کہ وہ پل میں ہمیشہ کے لیے شاہ ولاج چھوڑ دینے کا فیصلہ کر بیٹھیں۔حالانکہ احسن شاہ نے دیر تک انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔شاہ محمد صاحب نے بھی ان کا ذہن صاف کرنے کی بہت کوشش کی۔مگر جو زہر پچھلے تین سالوں سے فرزانہ بیگم شب و روز ان گھر والوں کے خلاف ان کے دماغ میں بھر رہی تھیں۔وہ بھلا فقط ایک ہی دن میں کیسے صاف ہو جاتا۔سو فرزانہ بیگم کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے وہ دونوں چھوٹے چھوٹے بچے احسن شاہ کی چھاتی پر مار کر، ہر طرح کے انجام سے بے خبر اپنے پاپا کے گھر چلی آئیں۔

حالانکہ یہ انتہائی قدم اٹھاتے ہوئے ان کے دل نے کس قدر ان کے فیصلے کی خلاف ورزی کی تھی مگر وہ تو اس وقت مکمل طور پر فرزانہ بیگم کے طلسم میں جکڑی ہوئی تھیں۔سو اپنے دماغ سے کیسے کام لیتیں؟

اس وقت جب بھی وہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے کی کوشش کرتیں۔ذہن میں فوراً فرزانہ بیگم کے جملے گونج اٹھتے۔

''تم دیکھنا حائقہ! تمہارے گھر چھوڑنے کے بعد کیسے ان لوگوں کے مزاج ٹھکانے آتے ہیں۔ارے ہم تو غریب گھروں کے تھے۔سو جیسے انہوں نے چاہا ویسے ہی ڈھل گئے۔مگر تم یہ حماقت کبھی مت کرنا کیونکہ تم کروڑ پتی باپ کی بیٹی ہو۔خوب اوقات پر رکھنا انہیں اور اپنی بات منوا کر ہی دم لینا۔تمہارے جانے کے بعد جب یہ لوگ دو چھوٹے چھوٹے بچوں کو سنبھالیں گے ناں تو دو دن میں عقل ٹھکانے آ جائے گی۔پاؤں پکڑ کر واپس لائیں گے تمہیں۔دیکھنا تم......اور یہ احسن کو دیکھ رہی ہوناں تم؟ کیسے کاٹھ کا الو بنا ہوا ہے۔بڑا محبت محبت کرتا تھا۔اب دیکھو ماں باپ کا فرماں بردار بنا ہوا ہے۔''

شاہ ولاج کے مکینوں کے خلاف ان کا زہر اگلتا لہجہ، جوں ہی پھر سے حائقہ بیگم کی سماعتوں میں اترتا، وہ نئے سرے سے غصے کی آگ میں سلگ اٹھتیں، اور تب انہوں نے پہلے سے بھی زیادہ اصرار کے ساتھ الگ گھر کا مطالبہ کر دیا۔مگر احسن شاہ کسی طور شاہ ولاج چھوڑنے پر رضامند نہ ہوئے تو غصے میں آ کر انتہائی قدم اٹھاتے ہوئے وہ ایک روز ہمیشہ کے لیے شاہ ولاج چھوڑ آئیں اور یہیں سے ان کی بربادی کی داستاں شروع ہو گئی۔

فرزانہ بیگم جو شروع ہی سے ان کی اہمیت اور ان کے بلند مقام سے شدید جیلس تھیں شاہ ولاج سے ان کی رخصتی کے بعد گویا چین کی نیند سونے لگیں۔

دن گزرتے گئے۔ شاہ ولاج میں اور بھی کئی طوفان آئے۔ فاطمہ بیگم اور شاہ محمد کی وفات کی خبر بھی ملی انہیں لیکن نہ جانے یہ کیسی انا کیسا غصہ تھا کہ وہ اپنے فیصلے پر بری طرح پچھتانے کے باوجود واپس نہ پلٹ سکیں اور ان ہی دنوں انہیں یہ پتہ چلا کہ احسن شاہ نے اپنے گھر والوں کے کہنے میں آ کر ان کے بیٹے کو ملک سے باہر، خود ان ہی کے بھائی کے پاس بھیجنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ تب ان کی انا کا بُت پاش پاش ہوا اور وہ اولاد کی محبت میں ان کی لمبی جدائی کے خوف سے جھک کر خود ہی شاہ ولاج واپس چلی آئیں۔

مگر شاید بہت دیر کر دی تھی انہوں نے واپسی میں، تب ہی تو نہ وہاں کے لوگ انہیں پہلے جیسے ملے نہ اس گھر کا ماحول، سنگِ مرمر سے تعمیر شدہ شاہ ولاج میں، سناٹے اتر آئے تھے۔ کسی کو ان کی واپسی سے کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ انہیں بھی نہیں کہ جن کے بہکاوے میں آ کر وہ گھر چھوڑنے پر رضامند ہوئی تھیں۔

بیتا ہوا وقت اپنے ساتھ سب کچھ بہا کر لے گیا۔ ان کی سب خوشیاں، ساری محبتیں، سب ہی پچھتاوے، سارے حسین لمحے۔ اب تو سوائے آنکھوں میں آنسوؤں کے اور کچھ بھی نہ بچا تھا ان کے پاس۔ یہاں تک کہ شوہر کی توجہ اور بچوں کی محبت بھی نہیں۔ تقدیر نے سب کچھ چھین لیا تھا ان سے اور ایسا تو ہونا ہی تھا، دوسروں کا سہارا لے کر چلنے والے جب تنہا چلنے کی کوشش کرتے ہیں تو یوں ہی منہ کے بل تو گرتے ہیں۔ ایسے ہی تو ٹھوکر لگتی ہے انہیں اور اتنے زور کی لگتی ہے کہ پھر سلامت کچھ بھی نہیں رہتا۔

وہ بھی حالات سے ہار گئی تھیں تنہائیوں سے لڑتے لڑتے تھک گئی تھیں مگر ان کی دولت و امارت انہیں سکون کی ایک گھڑی نہ نصیب کر سکی۔ نتیجتاً وہ نڈھال ہو کر شاہ ولاج میں پناہ لینے کے لیے آ گئیں۔

رو رو کر گڑگڑا کر احسن شاہ کے پاؤں پکڑتے ہوئے انہوں نے اپنی کوتاہیوں کی معافی ان سے مانگی تو احسن شاہ نے ان کی ہر زیادتی بھلا کر کھلے دل سے انہیں معاف کر دیا مگر ان کے بچے، آج تک انہیں معاف نہ کر پائے تھے۔ بیٹے کی صورت دیکھنے کو تو وہ ویسے ہی ترس گئی تھیں۔ اب تو بیٹی بھی ان کی طرف نگاہ ڈالنا گوارہ نہیں کرتی تھی۔ ان کی موجودگی میں بھی وہ آمنہ بیگم کو ماں کہتی اور ان کا ممتا بھرا ٹوٹا پھوٹا دل مزید تڑپ کر رہ جاتا۔

وقت نے جتنی گہری چوٹ انہیں لگائی تھی۔ آج جانے کیوں انہیں اپنا بیٹا بھی اسی آگ کی تپش میں جھلستا ہوا محسوس ہوا۔ تب ہی تو ان کی آنکھوں سے نیند اڑ گئی تھی اور وہ مکمل سنجیدگی کے ساتھ جلد سے جلد اپنے بیٹے سے اس موضوع پر بات کرنے کو بے تاب ہو گئیں۔

اگلے روز سنڈے تھا۔ لہٰذا ازمیر دیر تک اپنے بستر میں پڑا سوتا رہا۔ ہر سنڈے کو اس کا یہی معمول تھا۔ دیر تک سونا، پھر دوپہر کے قریب فریش ہو کر گھر سے باہر نکل جانا اور رات کو دیر سے ہی واپس آنا۔

اسی لیے حائقہ بیگم ناشتے کے فوراً بعد اس کے کمرے میں چلی آئیں کہ آج وہ ہر بات صاف صاف جان لینا چاہتی تھیں۔

ازمیر ابھی ابھی نیند سے جاگا تھا۔ لہٰذا واش روم میں جانے سے قبل وہ اپنے کپڑے پریس کر رہا تھا کہ اسی پل حائقہ بیگم دھیمے سے

دروازہ ناک کر کے اس کے کمرے میں چلی آئیں۔

''جاگ گئے بیٹے؟''

محبت پاش نگاہوں سے اس کا مرجھایا ہوا سا چہرہ دیکھتے ہوئے وہ بولیں۔

''جی مما۔'' ازمیر نے مختصر جواب دیا۔

''خیریت۔آج تو کچھ جلدی اٹھ گئے تم؟''

وہ پہلے اس کا موڈ جاننا چاہتی تھیں۔تب ہی فوراً اصل بات کی طرف آنے کا حوصلہ نہ کر پائیں۔ جواب میں ازمیر قدرے مشکوک سی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے مدہم لہجے میں بولا۔

''ہاں۔ کچھ دوستوں کے ساتھ آؤ ٹنگ کا پروگرام بنا رکھا ہے۔ بہر حال آپ کو کوئی کام تھا؟''

''نہیں۔بس ایسے ہی تم سے بات کرنے کو من چاہا تو چلی آئی۔ وگرنہ دن بھر تو نہ جانے کہاں غائب رہتے ہو کہ شکل دیکھنے کو ترس جاتی ہوں تمہاری۔''

پیاسی نگاہوں سے اس کے نکھرے سراپے کو دیکھتیں۔ وہ خاصی دل گرفتگی سے کہہ رہی تھیں مگر نہ جانے کیوں محرومیوں کے مارے ازمیر شاہ کو ان کا لہجہ خاصا بناوٹی لگا۔تب ہی وہ سر جھٹک کر قدرے سلگتے ہوئے بولا۔

''پلیز مما۔ مجھے ایسے فارمل سے جملے سننے کی عادت نہیں ہے اور نہ ہی میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو کسی بھی طرح سے ہماری پرواہ ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو آپ کبھی بھی ہمیں اس وقت اکیلا چھوڑ کر نہ جاتیں کہ جب ہمیں آپ کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ بہر حال میں اس وقت ذرا جلدی میں ہوں۔ آپ مجھ سے بات کرنے کا احسان پھر کسی وقت کے لیے اٹھا رکھیے۔'' نہایت ترش لہجے میں کہنے کے ساتھ ہی وہ اپنے کپڑے اٹھا کر واش روم میں گھس گیا اور بے بس سی حائقہ بیگم وہیں کھڑی اس کا منہ دیکھتی رہ گئیں۔

کیسی عجیب بے بسی تھی کہ وہ اپنی سگی اولاد سے پیار بھی نہیں جتا سکتی تھیں۔ایک ماں کے لئے بھلا اس سے بڑھ کر دکھ کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کی اولاد کے دل میں اس کا کوئی مقام ہی نہ ہو۔

شام ڈھلے جب وہ گھر واپس لوٹا تو اپنے کمرے میں جانے سے قبل ہی اریشہ سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ جو سیڑھیوں پر ہی رک کر خاصی خشک نگاہوں سے گھور رہی تھی اسے۔مگر وہ اس کے موڈ کے متعلق پروا نہ کرتے ہوئے بے نیازی سے اس کے مقابل آ کھڑا ہوا۔

''راستہ چھوڑو میرا۔'' اسے اپنے راستے میں کھڑے دیکھ کر خاصی سرد مہری سے اس نے کہا۔ جواب میں اریشہ نے کس قدر افسوس سے اسے دیکھا۔پھر قدرے چیختے ہوئے لہجے میں بولی۔

''مجھے بے حد افسوس ہے ازمیر! کہ میں نے ہمیشہ تمہیں ایک اچھا انسان سمجھا۔سب تمہیں غلط کہتے رہے، غلط مانتے رہے، دور بھاگتے رہے تم سے، مگر میں ہمیشہ سب کو جھٹلاتے ہوئے تمہیں اچھا ثابت کرتی رہی۔ سب سے تمہارے لیے جھگڑا کرتی رہی۔مگر آج میں نے یہ جانا کہ تم ہر

گزا چھے انسان کہلانے کے لائق نہیں ہو۔ بھلا جس انسان کو اپنی ماں کے مرتبے کی تمیز نہ ہو اس سے کسی اور رشتے کے لیے اچھائی کی امید کیسے کی جا سکتی ہے۔''

وہ خوب صورت احمریں لب، جن سے اس نے ہمیشہ پھول جھڑتے دیکھے تھے۔ آج جانے کیوں انگارے برسا رہے تھے اور وہ حیرانگی سے ٹکر ٹکر بمشکل اپنے غصے کو کنٹرول کر کے اسے دیکھتا رہ گیا۔

''چلو شکر ہے خدا کا کہ سب کے ساتھ ساتھ آج تم پر بھی میری اصلیت کھل گئی۔ اب یقیناً تم مجھ سے ہمدردی جتانا بند کر دو گی، ہے نا۔''

جب وہ بلا سبب انگارے چبا رہی تھی تو پل پل سلگتا ازمیر شاہ کیوں پیچھے رہتا۔ جواب میں اریشہ تپ اٹھی۔

''شٹ اپ۔ تمہیں انسانوں سے بات کرنے کی تمیز بھی نہیں ہے۔''

وہ چلائی تھی مگر ازمیر شاہ اس سے بھی زیادہ بلند آواز میں اس پر چلا اٹھا۔

''یو شٹ اپ۔ مجھے تم جیسے انسانوں سے بات کرنے کے لیے تمیز سیکھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ سمجھیں تم۔''

نہایت غصیلے انداز میں شہادت کی انگلی اٹھا کر دھاڑتے ہوئے وہ اسے اپنے راستے سے ہٹا کر اوپر کی طرف بڑھ گیا جبکہ ایک مسحور کن سی مسکراہٹ دور کھڑی ماہم شاہ کے لبوں کو چھو گئی۔

☆☆☆

''عدنان! کیا بات ہے بیٹے؟ کچھ دنوں سے بہت پریشان دکھائی دے رہے ہو۔'' شب کے دو بج رہے تھے اور وہ بستر پر پڑا بے قراری سے پہلو بدل رہا تھا۔ جب سیال بیگم اس کے کمرے کی لائٹ جلتے دیکھ کر ادھر ہی چلی آئیں۔ جواب میں گڑبڑا کر انہیں دیکھتے ہوئے وہ فوراً بستر سے اٹھ بیٹھا۔ پھر ان سے نگاہیں چرا کر قدرے ریلیکس لہجے میں بولا۔

''نہیں مما! ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ بس یوں ہی۔''

اب وہ کس کو کیا بتاتا کہ اصل بات کیا ہے؟ کیسے کہتا کہ اس کا دل اب اس کے اختیار میں نہیں رہا ہے تب ہی پچھلے کئی روز سے وہ اپنے ممی پاپا سے نگاہیں چرائے ہوئے تھا۔ مگر آج اس کی چوری پکڑی گئی تھی اور اب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے دفاع کے لیے کیا بہانہ کرے؟ تب ہی قدرے بوکھلا گیا تو اس کے نگاہیں چرانے پر سیال بیگم دھیمے سے مسکرا دیں۔

''بہت چالاک سمجھتے ہو اپنے آپ کو۔ خوب جانتی ہوں میں تمہاری بے قراریوں کو۔ ضرور کوئی لڑکی پسند آ گئی ہو گی۔ ہے نا؟''

وہ اس کی سرگرمیوں سے کچھ کچھ واقف تھیں۔ تب ہی نرم لہجے میں بولیں۔ تو عدنان نے چونک کر انہیں دیکھتے ہوئے جھٹ سے نفی میں سر ہلا دیا۔

''نن...... نہیں مما...... ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ وہ بس میں تو یوں ہی جاگ رہا تھا لیکن آپ ابھی تک کیوں جاگ رہی ہیں؟''

وہ فوراً ہوشیاری سے بات بدل گیا تو سیال بیگم محبت سے مسکرا کر اسے دیکھتے ہوئے بولیں۔

''میں تمہارے ہی بارے میں سوچ رہی تھی بیٹے۔ آئی مین تمہاری شادی کے بارے میں۔ بس بہت عیش کر لیے تم نے۔ اب گھر میں بہو چاہیے۔ سمجھے تم؟''

''لل...... لیکن مما......''

''کوئی لیکن ویکن نہیں۔ بہت آزادی دے دی میں نے تمہیں۔ اب میں جلدی تمہارے ڈیڈی سے بات کر کے تمہارے لیے ایک اچھی سی لڑکی پسند کرنے والی ہوں اور کان کھول کر سن لو۔ اس بار تم کوئی شرارت نہیں کرو گے اور میری بات مانو گے۔''

اس کے گڑبڑانے پر وہ نرمی سے اس کا کان پکڑتے ہوئے قدرے رعب سے بولیں تو عدنان بری طرح پھنس کر بے بسی سے ان کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ جبکہ وہ اپنی بات مکمل کر کے فوراً وہاں سے اٹھ گئیں۔ پھر تھوڑی دور جا کر واپس پلٹتے ہوئے بولیں۔

''اور ہاں...... یاد آیا کل مسز ہمدانی کے گھر بہت شاندار پارٹی ہے۔ مجھے چونکہ کل تمہارے پاپا کے منتھلی ٹیسٹ کے سلسلے میں پنڈی کے لیے روانہ ہونا ہے۔ لہٰذا تم میری جگہ اس پارٹی میں جاؤ گے اور وہاں سب سے ملو گے۔ بہت دن ہو گئے تمہیں ایسی تقریبات میں شرکت کیے ہوئے۔ اب کل جاؤ گے تو وہاں اچھی سی اپنی پسند کی لڑکی تلاش کر لینا اور واپسی پر مجھے بتا دینا۔ یاد رکھو یہ لاسٹ چانس ہے۔ اس کے بعد تم اسی لڑکی سے شادی کرو گے جو میں تمہارے لیے پسند کروں گی۔ انڈرسٹینڈ۔''

''یس مما۔''

ان کے حتمی لہجے پر عدنان نے بمشکل حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز نکالی۔ پھر ان کے کمرے سے باہر نکلتے وقت ہی سرد آہ بھر کر بیڈ پر پڑا۔ دل تھا کہ بری طرح مچل رہا تھا۔ اعصاب تھے کہ انجشاء کے متعلق سوچ سوچ کر شل ہو رہے تھے اور وہ بے بسی سے اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

شادی کرنا یا نہ کرنا اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ سیال بیگم کو بھی وہ بڑی آسانی کے ساتھ ہینڈل کر سکتا تھا مگر مصیبت تو یہ تھی کہ پہلی مرتبہ اس کے دل نے جس لڑکی کو تمام تر خلوص اور بھرپور سچائی کے ساتھ چاہنے کی گستاخی کی تھی۔ وہ لڑکی کسی طرح اس کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ جتنا وہ اس کے لیے بے قرار ہو رہا تھا اتنا ہی وہ لڑکی اس سے دور بھاگ رہی تھی۔ جس پر وہ خاصا جھنجلا اٹھا تھا۔ شاید اسی لیے اب اس کی محبت آہستہ آہستہ جنون کا روپ دھارتی جا رہی تھی اور اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اگر انجشاء اس کی زندگی میں نہ آئی تو وہ ضرور پاگل ہو جائے گا۔ تب ہی وہ پوری سنجیدگی کے ساتھ شب و روز اس کے متعلق سوچ رہا تھا۔

یہ تو اسے پورا یقین تھا کہ وہ کسی بھی طرح سے میرڈ ہرگز نہیں ہو سکتی۔ اس کے خیال میں وہ یہ سفید جھوٹ صرف اس سے دامن بچانے کے لیے بول رہی تھی۔ تب ہی اس کی اس بات کو اس نے سیریس نہیں لیا تھا۔

تاہم اب وہ پوری سنجیدگی کے ساتھ اسے شیشے میں اتارنے کے متعلق سوچ رہا تھا۔

اسی لیے تو اس نے اپنی آوارگی خاصی حد تک کم کر دی تھی۔ بہت سی نت نئی لڑکیوں سے روابط بھی ختم کر لیے تھے اور اپنے دوستوں سے ملنا

جلنا تقریباً ترک کر دیا تھا۔ جس پر وہ سب اس سے شدید خفا تھے لیکن اسے کسی بات کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اس کے سامنے اس وقت جو سب سے اہم ٹارگٹ تھا وہ انجشاء کا دل جیتنے کا مرحلہ تھا۔ جس کے لیے وہ ہر ممکن طریقے سے اس کے قریب ہونے کی کوشش کر رہا تھا، اور پھر اگلے ہی روز اسے سیال بیگم کے اصرار پر بادل نخواستہ ہمدانی کی پارٹی کے لیے تیار ہونا پڑا کیونکہ آج وہ انجشاء سے مل کر اپنے متعلق دوٹوک بات کر لینا چاہتا تھا لیکن سیال بیگم نے چونکہ ہمیشہ اس کی خوشی کا خیال رکھا تھا تو وہ بھی ان کی خوشی کے لیے اپنا پروگرام اگلے دن پر ملتوی کر کے مسز ہمدانی کے گھر ان کی شاندار پارٹی میں چلا آیا۔

یہی گیدرنگ، یہی شور ہنگامے، یہی میک اپ سے لیس رنگ برنگے چہرے، کل تک اس کی زندگی کا حصہ تھے لیکن آج نہ جانے کیوں وہ چاہ کر بھی کسی چیز کو انجوائے نہیں کر پا رہا تھا۔ دل تھا کہ کسی بھی چیز سے بہل ہی نہیں رہا تھا۔ تب ہی بے حد بور ہو کر وہ واپسی کا ارادہ کر رہا تھا کہ اچانک اس کی نگاہ سامنے ہی کچھ فاصلے پر کھڑی انجشاء کے سادہ سے مگر پرکشش چہرے سے جا ٹکرائی اور تب پل دو پل میں ہی گویا ہر منظر بدل گیا۔

یہی گندرنگ، یہی لوگ، یہی شور ہنگامہ جو ابھی تھوڑی دیر پہلے اسے بور کر رہا تھا۔ اب ایک دم سے سب اچھا لگنے لگا اور وہ دل کی اس بے ایمانی پر مسرور سا ہو کر یک ٹک سامنے کی طرف دیکھنے لگا۔ جہاں انجشاء اپنی تمام تر دلکشی کے ساتھ کھڑی کسی سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی اور وہ اسے یوں ہنستے دیکھ کر قدرے مبہوت سا رہ گیا۔

''ہیلو مسٹر عدنان! آپ کیسے......؟''

انجشاء کی نظر جیسے ہی اس پر پڑی وہ مسکراتے ہوئے اس کے قریب چلی آئی، اور خاصے فریش لہجے میں دریافت کیا۔ تو وہ اپنی بے تاب دھڑکنوں کو بمشکل سنبھالتے ہوئے قدرے ناراضی سے بولا۔

''اگر یہی سوال میں آپ سے کروں تو......؟''

خاصا ناراض لہجہ تھا اس کا۔ انجشاء نے جی بھر کر انجوائے کیا پھر مسکراتے ہوئے بولی۔

''مسز ہمدانی ہمارے قریبی جاننے والوں میں سے ہیں اسی لیے میں انہیں انکار نہیں کر پائی۔ بہرحال آپ سے وعدہ رہا کہ آئندہ آپ کے گھر جو بھی تقریب ہوگی۔ میں اس میں شرکت ضرور کروں گی۔''

''تھینک یو..... تھینک یو سوچ...... مجھے پورا یقین تھا کہ آپ جیسی اچھی لڑکی کسی کو ہرٹ کر ہی نہیں سکتی۔'' وہ مسرور ہو کر بولا تھا۔ جواب میں انجشاء بس دھیمے سے مسکرا کر رہ گئی۔

''مس انجشاء! آج میں آپ سے ایک بہت ہی ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ مجھے تھوڑی دیر مزید کمپنی دیں گی؟''

اسے واپسی کے لیے قدم اٹھاتے دیکھ کر وہ فوراً بولا تھا۔ جس پر انجشاء نے حیرانی سے اس کے بے قرار چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے ایک نظر اپنی کلائی پر بندھی رسٹ واچ پر ڈالی پھر دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے قدرے بے نیازی سے بولی۔

''جی فرمایئے۔ کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟''

اس کا انداز اتنا اجنبی تھا کہ عدنان بمشکل تھوک نگل کر کچھ کہنے کی ہمت کر پایا۔

''وہ......وہ میں آپ سے یہ کہنا چاہتا تھا کہ......کہ آپ بہت اچھی ہیں۔ بہت خوب صورت......''

''تھینک یو۔''

اس کے کمزور لہجے پر انجشاء نے مکمل اعتماد سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے مختصراً کہا۔

''اور......اور میں آپ سے کہنا چاہتا تھا کہ میں......آپ کو پرپوز کرنا چاہتا ہوں۔''

تمام تر ہمت جمع کر کے بالآخر اس نے کہہ ہی دیا۔ جواب میں انجشاء نے چونک کر اسے یوں حیرانی سے دیکھا۔ گویا اس کی دماغی حالت پر شک ہوا ہے۔

''وہاٹ......آپ جانتے ہیں کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

لب بھینچ کر خاصے سرد انداز میں کہتے ہوئے وہ دھیمے سے چلائی تھی۔ جس پر عدنان نے تڑپ کر بے قراری سے اس کے سرخ چہرے پر ایک نظر ڈالی۔ پھر قدرے عاجزی سے بولا۔

''پلیز مس انجشا! مجھ سے ناراض مت ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں مگر یہی سچ ہے میں آپ کو بہت پیار کرتا ہوں۔ بہت چاہنے لگا ہوں آپ کو۔ اگر آپ میری زندگی میں نہیں آئیں تو میں زندہ نہیں رہ پاؤں گا۔ اس لیے پلیز آپ ٹھنڈے دل سے میرے پرپوزل پر غور کریں۔ پلیز مس انجشاء پلیز......''

پل کے پل میں ہی اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں اور وہ رو دینے کو ہو گیا۔ تب انجشاء نے سخت غصے کے عالم میں ایک کڑی نگاہ اس کے چہرے پر ڈالتے ہوئے سنگ دلی سے منہ پھیر لیا۔ پھر خاصے کٹیلے لہجے میں بولی۔

''عجیب پاگل آدمی ہیں آپ......جب میں آپ سے کہہ چکی ہوں کہ میں آل ریڈی میرڈ ہوں تو فضول میں ایسی بے سروپا باتیں کیوں کر رہے ہیں آپ؟''

''کیونکہ میں آپ سے بہت پیار کرتا ہوں، کیونکہ میں آپ کے بغیر خوش نہیں رہ سکتا۔ اس لیے۔'' فوراً مچل کر وہ بولا تھا۔ جواب میں انجشاء نے خاصے تنفر سے سر جھٹک دیا۔

''تو......اس میں میرا کیا قصور ہے؟''

واپس رخ اس کی طرف پلٹ کر وہ خاصے چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔ تو لاکھوں دلوں سے فلرٹ کرنے والے عدنان رؤف کا سر آپ ہی آپ نیچے جھک گیا۔ کچھ لمحوں کے لیے تو اس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ پھر ہمت کر کے اس نے اپنا سر دوبارہ اوپر اٹھایا تو اس کی آنکھوں کے ساتھ اس کے لہجے میں بھی واضح نمی گھلی ہوئی تھی۔

''مجھ میں کس چیز کی کمی ہے۔ مس انجشاء اللہ تعالیٰ کا دیا سب کچھ ہے میرے پاس۔ آئی پرامس میں آپ کو ہمیشہ بہت خوش رکھوں گا۔ کبھی

کوئی تکلیف نہیں دوں گا۔ کبھی کسی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔ پلیز صرف ایک مرتبہ میرے متعلق سوچ کر تو دیکھیں۔ آپ ضرور اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور ہو جائیں گی۔"

"شٹ اپ۔ جسٹ شٹ اپ مسٹر عدنان صاحب۔ میں نے آپ کا لحاظ کیا۔ آپ اس پارٹی میں تماشہ نہ بن جائیں۔ اس لیے بہت برداشت سے کام لیا میں نے لیکن اب اگر آپ نے مزید کوئی بکواس کی تو اتنی زور سے چانٹا لگاؤں گی منہ پر کہ آپ ساری عمر اپنی اوقات نہیں بھول پائیں گے۔ ہونہہ عزت سے بات کیا کرلی۔ آپ تو میرے سر پر ہی چڑھ گئے۔" نہایت طیش کے عالم میں کانپتے ہونٹوں کے ساتھ وہ ترش لہجے میں بولی تو عدنان کا دماغ بھی جیسے گھوم کر رہ گیا۔ تب ہی اس نے کسی بھی انجام کی پروا کیے بغیر ایک جھٹکے سے اس کا بازو اپنی گرفت میں لیا۔ پھر اسے کھینچتے ہوئے گھر سے باہر لان میں لے آیا۔

"مجھے میری اوقات یاد دلاؤ گی تم۔ ہاں مجھے چانٹا مارو گی۔ لو لگاؤ چانٹا میرے منہ پر کم آن مارو مجھے۔"

اپنی مضبوط انگلیاں نہایت بے دردی کے ساتھ اس کے بازو میں گاڑھتے ہوئے وہ چلایا تو انجشاء نے نفرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے فوراً رخ پھیر لیا۔

"میری اوقات کی بات کرتی ہو اور اپنی اوقات اتنی جلدی بھول گئیں تم۔ وہ بسوں کے دھکے، وہ دفتر، وہ مہینہ بھر فائلوں میں سر کھپا کر فقط چند ہزار تنخواہ پانا۔ وہ سب بھول گیا تمہیں۔ بولو جواب دو۔ تمہاری اوقات کیا ہے؟ ہاں یہ جمعہ جمعہ آٹھ دن اس اریج احمر کے ساتھ بزنس پارٹنر بن کر تم کیا سمجھتی ہو کہ تم نے تمام دنیا کی عورتوں پر فضیلت حاصل کر لی۔ بولو۔ بزنس ٹائیکون بن گئی تم۔"

وہ اب بھی غصے سے چلا رہا تھا مگر انجشاء نے اس کی سمت نہیں دیکھا۔

"ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا مس انجشاء صاحبہ! زندگی میں اگر تمہارا نام کسی مرد کے نام کے ساتھ ہمیشہ کے لیے جڑا تو وہ صرف اور صرف عدنان رؤف ہی ہوگا۔ سمجھیں تم۔"

ایک جھٹکے سے اس کا بازو اپنی گرفت سے آزاد کرتے ہوئے وہ شہادت کی انگلی اٹھا کر تنبیہ کرنے والے انداز میں بولا پھر کچھ دیر یک ٹک اس کا گم صم سا چہرہ دیکھنے کے بعد وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا۔

جبکہ انجشاء وہیں بیٹھ کر اپنا بازو سہلاتے ہوئے چپ چاپ اپنے آنسوؤں کو پینے کی کوشش کرنے لگی کہ ابھی اسے عدنان رؤف سے ہرگز ہار نہیں ماننی تھی۔

☆☆☆

"ممی! چلو انجشاء سے ملنے چلتے ہیں۔"

تمکین اپنے کمرے میں بیٹھی فون پر کسی سے بات کر رہی تھی۔ جب شیزا خاصے فریش موڈ میں اس کی طرف چلی آئی۔ جواب میں وہ منہ لٹکا کر مایوسی سے بولی۔

''سوری شیزا! آج ہم انجشاء سے نہیں مل سکتے۔''

''کیوں؟'' فوراً بھنوئیں اچکا کر اس نے پوچھا تو تکیہ گود میں لیتے ہوئے تمکین نے آرام سے جواب دیا۔

''وہ اس لیے سویٹ ہارٹ کہ انجشاء آج آفس نہیں آئی ہے اور اس کے یہاں گھر کے متعلق مجھے کچھ پتہ نہیں۔ سو اب کل ہی چلیں گے۔''

''لیکن آج ہم آؤٹنگ پر تو چل سکتے ہیں نا؟ وہ کیا ہے کہ تھوڑے ہی دنوں میں تمہاری شادی ہو جائے گی پھر تمہارے پاس ہم جیسوں کے لیے ٹائم کہاں ہوگا! تو کیوں نا فرصت کے ان لمحات سے فائدہ اٹھایا جائے۔''

چٹکی بجاتے ہی اس نے تفریح کا ایک اور بہانہ ڈھونڈ لیا تو تمکین کو اس کا اشتیاق دیکھتے ہوئے موڈ نہ ہونے کے باوجود اثبات میں سر ہلانا پڑا۔ جس پر وہ بے پناہ خوش ہوتے ہوئے کمرے سے باہر بھاگ گئی تو تمکین کے لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''پاگل......'' دھیمے سے سر جھٹک کر مسکراتے ہوئے اس نے کہا۔ پھر اپنے کمرے کی بگڑی حالت درست کرنے لگی اور شام میں جیسے ہی اشعر آفس سے لوٹا۔ شیزا اس کے سر ہوگئی۔ نتیجتاً اشعر کو ڈنر کا پروگرام بھی باہر ہی بنانا پڑا اور وہ گھر والوں سے اجازت لے کر تمکین کو جلدی سے باہر آجانے کا کہتے ہوئے اپنی گاڑی کی طرف چلا آیا۔

''اشعر! کیا اس شادی سے تم خوش ہو؟''

تمکین ابھی کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی مگر شیزا نے فوراً قدم اشعر کی ہمراہی میں باہر کی طرف بڑھا دیے تھے کہ وہ اس کے آفس سے لوٹنے سے قبل ہی اپنی تیاری مکمل کر چکی تھی۔

''بتاؤ اشعر! کیا تم تمکین کے ساتھ شادی پر خوش ہو؟''

اسے چونک کر اپنی طرف دیکھتے پا کر وہ دوبارہ بولی تھی۔ جواب میں اشعر دھیمے سے مسکرا دیا پھر گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے مسرور لہجے میں بولا۔

''یس...... وائے ناٹ۔ آفٹر آل میری ہی پسند اور خوشی پر تو یہ بندھن قائم ہوا ہے ہمارا لیکن تم یہ سب کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''کیونکہ...... کیونکہ جتنا پیار تم تمکین سے کرتے ہو۔ وہ تمہیں اتنا پیار نہیں کرتی۔''

دونوں بازو سینے پر باندھ کر وہ اس سے نگاہیں چراتے ہوئے بولی تو اشعر نے کسی قدر حیرانگی سے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ...... تم کیسے کہہ سکتی ہو؟''

قدرے الجھ کر اس نے پوچھا تھا۔ جواب میں شیزا کے لبوں پر بڑی بے جان سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

''میں اس کی گہری دوست ہوں اشعر! اور اس کے دل کا رازدار بھی۔ تب ہی نہ جانے مجھے یہ کیوں لگتا ہے کہ جیسے تمکین تمہارے ساتھ ساتھ خود کو بھی بے وقوف بنا رہی ہے۔ بہرحال ہو سکتا ہے یہ میرے دماغ کا فتور ہو۔''

''بالکل...... اپنے دماغ کا علاج کراؤ اور غلط فہمیوں کے متعلق سوچنا چھوڑ دو کیونکہ میں اپنی نمی کو سب سے زیادہ جانتا ہوں۔ اس کے دل

میں جتنا پیار میرے لیے ہے اور کسی کے لیے نہیں۔ سمجھیں تم کہ نہیں؟''

اپنی شہادت کی انگلی اس کی چھوٹی سی ناک سے ٹچ کرتے ہوئے وہ خاصے پُراعتماد لہجے میں بولا تو جانے کیوں شیزا کا دل جل کر رہ گیا اور وہ اپنا بھرم رکھنے کے لیے دھیمے سے مسکرا بھی نہ سکی۔

''اشعر! ہنی مون کے لیے کہاں جا رہے ہو تم لوگ؟''

تمکین آ کر گاڑی میں بیٹھ چکی تھی جب شیزا نے قدرے بجھے ہوئے لہجے میں پوچھا تو جواب تمکین نے دیا اور جھٹ سے بولی۔

''چاند پر۔''

''پھر تو ضرور نیا ریکارڈ قائم کرو گے تم لوگ۔''

''ہاں اب تو نئے نئے ریکارڈ ہی قائم کرنے ہیں۔''

نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر اشعر نے کن اکھیوں سے تمکین کی طرف دیکھا۔ پھر اس کے ہنستے ہی خود بھی ہنس پڑا۔

''ویسے یہ تمہارے منہ پر بارہ کیوں بج رہے ہیں بھئی؟ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو بہت خوش تھیں تم۔'' اسے چپ چاپ سا پا کر تمکین نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو شیزا اپنے ہاتھ مسل کر بے مقصد مسکرا دی۔

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔ اصل میں میں رخسانہ آنٹی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔''

''کیوں؟ انہیں کیا ہوا؟''

اس کے عجیب سے جواب پر تمکین کے ساتھ ساتھ اشعر نے بھی چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''وہ...... انہیں تھوڑا سا ٹمپریچر تھا۔ اس وقت بھی جب ہم لوگ گھر سے باہر نکلے تو مجھے ان کے ہاتھ خاصے گرم محسوس ہوئے۔ وہ ممی کو اپنے پاس روکنا چاہتی تھیں۔ مگر تمہیں برا نہ لگ جائے۔ اس لیے نہیں روک پائیں۔ حالانکہ میں نے کتنا کہا ان سے کہ میں ان کے پاس رک جاتی ہوں مگر نہیں مانیں۔ کہنے لگیں کہ تم تو مہمان ہو۔ تمہارا خیال رکھنا تو ہمارا فرض ہے۔ جبکہ تمکین تو میری بہو ہے۔ مگر افسوس اسے میرا کوئی خیال نہیں۔''

''وہاٹ...... ایسا کہا ممی نے؟''

تمکین کے ساتھ ساتھ اشعر کو بھی اس کی فرضی کہانی سے خاصا جھٹکا لگا۔ جواب میں شیزا بس چپ چاپ سر ہلا کر رہ گئی۔

''ارے اگر ایسی بات تھی تو تم نے پہلے کیوں نہیں کہا ہم سے۔ ہم یہ پروگرام ہی کینسل کر دیتے۔''

اسٹیرنگ پر ہاتھ مارتے ہوئے اشعر نے افسوس سے کہا۔ تو خاموش سی تمکین فوراً بول اٹھی۔

''نہیں اشعر! پروگرام کینسل کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ کچھ ہی دنوں میں ہماری شادی ہو جائے گی اور تم ہم شیزا کو کمپنی نہیں دے پائیں گے۔ اس لیے پلیز آج آپ لوگ جائیں۔ میں آنٹی کے پاس رک جاتی ہوں۔''

اپنی سیٹ سے اٹھ کر گاڑی سے باہر نکلتے ہوئے اس نے کہا تو شیزا اطمینان سے ہلکی پھلکی ہو کر رہ گئی۔ تاہم اشعر نے اس کے بغیر جانے

سے صاف انکار کر دیا تو تمکین نے شیزا کی خوشی کی خاطر اسے اصرار کے ساتھ آؤٹنگ کے لیے منا لیا اور خود ان لوگوں کو جلدی لوٹنے کی ہدایت کرتے ہوئے واپس گھر کی طرف گئی۔

"ارے تمی بیٹے! آپ آؤٹنگ کے لیے اشعر کے ساتھ نہیں گئیں؟"

راہداری میں ہی رخسانہ بیگم سے اس کا ٹکراؤ ہو گیا تو انہوں نے خاصی حیرانی سے پوچھا۔

جواب میں تمکین پلکیں جھکا کر احترام سے بولی۔

"نہیں آنٹی! ایکچولی مجھے پتہ چلا تھا کہ آپ کو معمولی سا ٹمپریچر ہے تو میں نے سوچا کہ میں آپ کے پاس ٹھہر جاتی ہوں۔ تاکہ آپ کا خیال بھی رکھ سکوں اور آپ اکیلے کمرے میں لیٹی لیٹی بور بھی نہ ہوں۔"

لیکن...... مجھے تو ٹمپریچر نہیں ہے۔"

اس کے فکر مند لہجے پر اگلے ہی پل انہوں نے حیرانی سے کہا تو تمکین کا سر ایک جھٹکے سے اوپر اٹھ گیا۔

"وہاٹ......؟"

"ہاں بیٹے۔ مگر تم سے کس نے کہا کہ مجھے ٹمپریچر ہے؟"

اس کے گال پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ پیار سے بولی تھیں۔ جواب میں تمکین نے دھیرے سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کسی نے نہیں آنٹی! وہ ایکچولی مجھے ہی ایسا لگا تھا کہ شاید آپ کو ہلکا سا بخار ہے۔"

شدید ہیجان کے عالم میں کھوئے کھوئے سے ذہن کے ساتھ بمشکل اس نے کہا تو رخسانہ بیگم اس کی سادگی پر دھیمے سے مسکرا دیں۔ پھر اسے اپنا خیال رکھنے کی تاکید کرتے ہوئے وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئیں تو ابھی ابھی ہی تمکین رضا بھی تھکے تھکے قدموں سے چلتی اپنے کمرے میں چلی آئی۔

"شیزا نے جھوٹ کیوں بولا میرے ساتھ؟"

رہ رہ کر یہی سوال اسے ڈپریس کر رہا تھا اور وہ اس کا جواب سوچ سوچ کر بھی سمجھ نہ پائی۔

شیزا اس کی فرسٹ کزن ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی گہری راز دار دوست بھی تھی۔ بچپن سے ان کے درمیان محبت اور اعتماد کا رشتہ قائم تھا۔ وہ چاہ کر بھی اس کے خلوص پر شک نہیں کر سکتی تھی کیونکہ آج سے اٹھارہ سال پہلے جب اس کی پھوپھو اپنی پسند کے مرد کے ساتھ شادی کر کے ہمیشہ کے لیے "حسن ولاج" سے کنارہ کش ہو گئی تھیں تو تب بھی شیزا نے "حسن ولاج" کے مکینوں کو اپنی ماں کی محبت پر ترجیح دی اور فقط دو ماہ کے بعد ہی اپنی ماں کی مرضی کے خلاف دوبارہ حسن ولاج میں چلی آئی۔ گو تمکین کو اس پرانے قصے کا کوئی پتہ نہیں تھا مگر اس نے یہ کہانی بارہا اپنی ممی اور حسن ولاج کے مکینوں سے سنی تھی۔ پھر جس وقت تمکین پیدا ہوئی تو تین سالہ شیزا کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ بہانے بہانے سے اس کے قریب آتی اور اس سے پیار کرتی کئی بار اسے اس دیوانگی پر اشعر سے مار بھی کھانی پڑی تھی۔ مگر وہ پیچھے نہیں ہٹی اور تمکین کے لیے اس کی اس قدر محبت کے پیش نظر ہی حسن

ولاج کے مکینوں نے اسے اس گھر میں آنے جانے سے نہیں روکا۔ وہ ماں کو چھوڑ کر مہینوں اس گھر میں رہتی اور کبھی دل چاہنے پر ایک یا دو دن کے لیے اپنی ماں کے پاس چلی جاتی۔ پڑھائی لکھائی، جوتے کپڑے جیولری، غرض کہ اس کی ضرورت حسن ولاج کے مکینوں نے پوری کی اور اسے کبھی تمکین سے کم تر نہیں سمجھا۔

تمکین نے ہوش سنبھالتے ہی شیزا کو خود سے مخلص پایا تھا۔ تب ہی وہ ہمیشہ سے اس پر اعتبار کرتی آئی تھی۔ یہ شیزا کی ذات ہی تو تھی کہ وہ اشعر کے بچھڑ کر یورپ چلے جانے پر جلد ہی سنبھل گئی وگرنہ نہ جانے کیا حال ہوتا اس کا لیکن اب نہ جانے کیوں اسے شیزا کی محبت پر شک ہونے لگا تھا۔ پچھلی بار بھی جب وہ لوگ ڈنر کے لیے باہر گئے تھے تو شیزا نے اس کی آنکھوں کے سامنے اشعر کے ساتھ کیا کیا حرکات کی تھیں اور وہ سب کچھ دیکھ کر بھی صبر کے گھونٹ پی کر رہ گئی تھی۔

''لیکن اب میں تمہیں ایسا کچھ نہیں کرنے دوں گی شیزا کہ جس سے تم ہمارے درمیان قائم پرخلوص دوستی کے بندھن کو کوئی زک پہنچا سکو۔ میں تم سے یہ جان کر ہی رہوں گی کہ تم میں اچانک یہ تبدیلی کیوں آئی؟ اور تم کیوں میرے اور اشعر کے بیچ آ کر اپنا وقار کھو رہی ہو؟''

بے قرار دل کے ساتھ اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑے ہو کر اس نے سوچا اور آہستہ سے پلکیں موند لیں۔

☆☆☆

خاصا الجھا الجھا سا ازمیر شاہ جب اپنے کمرے میں آیا تو حد سے زیادہ ڈپریس تھا۔ رہ رہ کر اسے اریشہ کے پُرنفرت جملوں کی بازگشت سنائی دے رہی تھی اور وہ سخت اضطراب کے عالم میں دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامے وہیں بیڈ پر ٹک گیا تھا۔

دماغ کی شریانیں تھیں کہ..... شدید ڈپریشن کے باعث پھٹنے کو تیار ہو گئی تھیں۔ تب ہی آمنہ بیگم ہلکے سے دروازہ دھکیل کر اس کے کمرے میں چلی آئیں۔

''ازمیر! کیا بات ہے بیٹے۔ کوئی پریشانی ہے تمہیں؟''

اس کے پہلو میں بیٹھ کر انہوں نے پیار سے پوچھا تو الجھے الجھے سے ازمیر شاہ نے ان کی طرف دیکھے بغیر دھیرے سے نفی میں سر ہلا دیا۔

''اوکے۔ تم بتانا نہیں چاہتے تو کوئی بات نہیں لیکن یہ تو طے ہے کہ تم کچھ پریشان ضرور ہو۔ اب وہ پریشانی کیا ہے یہ تو میں نہیں جانتی۔ ہاں مگر اتنا ضرور جانتی ہوں کہ تم بلاوجہ اپنی پہلے سے دکھی ماں کو مزید دکھی کر رہے ہو۔ بیٹے تم نہیں جانتے کہ انہوں نے تم لوگوں کے لیے ماضی میں بہت دکھ دیکھے ہیں۔ غلط لوگوں کی سازشوں کا شکار ہو کر انہوں نے بہت بڑی غلطی ضرور کی تھی لیکن اس غلطی کی سزا کاتب تقدیر انہیں بہت زیادہ دے چکا ہے بیٹے۔ آج وہ اکیلی اور نڈھال ہیں۔ انہیں زندہ رہنے کے لیے تم لوگوں کی محبت کی ضرورت ہے تو کیا تم لوگ انہیں سہارا نہیں دو گے؟ دیکھو بیٹا ماضی میں جو ہو چکا اسے یاد رکھ کر اپنے حال کو عذاب بنا لینا عقل مندی کا تقاضا نہیں ہے۔ اب بہتر یہی ہے کہ تم سب کچھ بھول کر اپنی ماں کو محبت دو اور ان سے دعائیں لو۔ تم شاید جانتے نہیں کہ آج صبح تمہاری بدتمیزی سے انہیں کس قدر گہری چوٹ پہنچی ہے۔ اپنے کمرے میں بے ہوش پڑی تھیں وہ، اور ان کا بلڈ پریشر انتہائی کم ہو گیا تھا۔ اگر ماہم سب گھر والوں کو اس بارے میں تفصیلاً نہ بتاتی تو ہمیں تو ان کے متعلق پتہ ہی نہیں چلنا تھا۔ بہرحال تمہاری اس حرکت پر سب گھر والے تم سے بہت ناراض ہیں۔ اس لیے فوراً اٹھو اور اپنی مما سے معذرت کرو۔''

آمنہ بیگم کے تفصیلی بیان نے گویا اس کے ہوش ہی اڑا دیے۔ کس قدر بے یقینی سے اس نے الجھ کر ان کی طرف دیکھا تھا۔

ایک معمولی سی بات بڑھ کر یوں رائی کا پہاڑ بن جائے گی اس کے تو وہم و گماں میں بھی نہیں تھا۔

''چلو ازمیر بیٹے! میرے ساتھ حائقہ کے پاس چلو۔''

اسے گم صم سا اپنی طرف دیکھتے پا کر وہ اسے بازو سے تھامتے ہوئے بولیں تو مضطرب سا ازمیر چاروناچار اٹھ کر ان کے ہمراہ چل پڑا، اور جس وقت اس نے حائقہ بیگم کے کمرے میں پہلا قدم رکھا۔ اسی وقت پریشان سی اریشہ ٹرے میں کچھ خالی برتن لیے کمرے سے باہر نکل رہی تھیں۔ تب ہی ان دونوں کا ٹکراؤ ہوا اور اریشہ کے ہاتھ سے ٹرے چھوٹ کر نیچے زمین پر گر پڑی۔ دیکھتے ہی دیکھتے شیشے کے برتن ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو گئے اور ان کرچی کرچی ٹکڑوں کو سمیٹتے ہوئے اریشہ خود اپنے ہاتھ بھی زخمی کر بیٹھی۔

''چوٹ کھانے اور چوٹ دینے میں بہت لطف آتا ہے تمہیں۔''

گھٹنوں کے بل اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے وہ اس کا زخمی ہاتھ تھام کر بولا تو اریشہ نے خفگی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنا ہاتھ اس سے چھڑا لیا۔ پھر ٹرے میں ٹوٹے ہوئے برتنوں کی کرچیاں سمیٹ کر فوراً کمرے سے باہر نکل گئی۔

''مما!''

اریشہ کے کمرے سے باہر نکلتے ہی وہ حائقہ بیگم کے بیڈ کی طرف چلا آیا۔ پھر ان کے پہلو میں بیٹھ کر محبت سے ان کے ہاتھ تھامتے ہوئے اس نے کہا تو بے اختیار ہی ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

''آئی ایم سوری مما۔ میں ہرگز آپ کو ہرٹ کرنا نہیں چاہتا تھا۔''

ان کے ہاتھ چوم کر وہ اپنی آنکھوں سے لگاتے ہوئے بولا تو حائقہ بیگم نے تڑپ کر اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ پھر بے تابی سے اس کی کشادہ پیشانی چومتے ہوئے سسک پڑیں۔

''آئی پرامس مما۔ میں آئندہ ایسا کبھی نہیں کروں گا۔ پلیز مجھے معاف کر دیجیے۔''

ان کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے وہ پھر بولا تو حائقہ بیگم اسے ڈھیروں پیار کرتے ہوئے گویا ہلکی پھلکی ہو گئیں تب ہی اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے بولیں۔

''چلو کر دیا معاف لیکن اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارے اور اریشہ بیٹی کے مابین کیا ٹینشن چل رہی ہے؟''

بہت دوستانہ انداز میں انہوں نے پوچھا تھا۔ جواب میں ازمیر نے قدرے حیرانی سے ان کی سمت دیکھا وہ اس کی اتنی پروا کرتی ہوں گی۔ بھلا کہاں سوچا تھا اس نے، تب ہی فوراً بات بنا کر بولا۔

''کوئی ٹینشن نہیں مما۔ وہ ایک اچھی لڑکی ہے اور ابھی تھوڑے ہی دنوں میں اذہان کے ساتھ اس کی نسبت طے ہونے جا رہی ہے۔ بس اسی لیے میں نہیں چاہتا کہ کوئی میری وجہ سے اسے پریشان کرے۔ اسے میرے قریب پا کر بلاوجہ اس کے کریکٹر کو نشانہ بنائے۔''

''لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم اس سے بات کرنا ہی چھوڑ دو۔''

''ہاں آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن بس میں اس گھر کے لوگوں کو اپنے متعلق یا اریشہ کے متعلق کچھ بھی غلط سوچنے یا غلط کہنے کا موقع نہیں دینا چاہتا مما۔ بس اسی لیے محتاط ہو گیا ہوں۔''

''لیکن تمہارا یہ محتاط رویہ، اریشہ کو ہرٹ کر رہا ہے بیٹے۔''

''سو واٹ مما...... آئی ڈونٹ کیئر دس۔''

قدرے بیزاری سے اس نے کہا تھا۔ جواب میں حائقہ بیگم افسوس سے اس کی طرف دیکھ کر رہ گئیں۔

''اچھا یہ بتاؤ کہ یہ شہزین خان کون ہے؟''

اگلے ہی پل دوبارہ انہوں نے پوچھا تھا۔ جس پر ازمیر نے فوراً چونک کر ان کی سمت دیکھا۔

''آپ شہزین کے متعلق کیسے جانتی ہیں یقیناً اریشہ نے بتایا ہو گا آپ کو؟''

''نہیں۔ اس پاگل لڑکی کو تمہارے راز افشا کرنے کی عادت نہیں ہے۔''

اس کے سلگتے لہجے پر بہت نرمی سے انہوں نے کہا تھا، تب ازمیر نے قدرے الجھ کران کی سمت دیکھا۔

''تو پھر......؟''

''پھر یہ کہ مجھے یہ بات ماہم اور دانیہ کی معرفت پتہ چلی۔ دونوں چھپ کر تمہارے اور اریشہ کے متعلق کچھ ڈسکس کر رہی تھیں کہہ رہی تھیں کہ انہوں نے چھپ کر یہ بات تمہیں اریشہ کو بتاتے ہوئے سنی ہے۔ بس اسی سے مجھے بھی پتہ چل گیا۔ وہ تو میں اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی کہ تمہارا اور اریشہ کا نام سن کر رک گئی وگرنہ مجھے اس بات کا کیا پتہ چلنا تھا؟''

''او گاڈ۔''

ان کے تفصیلی بیان پر ازمیر نے پریشانی سے سر تھام لیا۔ کتنا غلط سوچ رہا تھا وہ اریشہ کے متعلق۔ جبکہ اس کے قیمتی راز میں یہ نقب تو ماہم شاہ کی کارستانی تھی۔

''بتاؤ نا ازمیر! کون ہے یہ شہرین خان؟''

اسے خاموش پا کر انہوں نے دوبارہ اصرار کیا تھا۔ تب مجبوراً ازمیر شاہ کو دل کا حال ان پر کھولنا ہی پڑا جبکہ دودھ کا گلاس تھامے حائقہ بیگم کے کمرے کی طرف بڑھتی اریشہ کا گویا ایک ایک عضو کان بن گیا۔ جب اس نے کہا۔

''وہ ..... وہ لڑکی یہاں نہیں رہتی مما۔ انگلینڈ میں رہتی ہے۔ پہلے کلاس فیلو تھی میری، بعد میں، میں اسے چاہنے لگا لیکن اس نے مجھے ٹھکرا دیا مما اور کسی اور کے ساتھ شادی کر لی۔ میں نے اسے بہت چاہا مما۔ بہت ٹوٹ کر محبت کی ہے اس کے ساتھ لیکن اسے میرے جذبات کی کوئی پروا نہیں ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ خوش ہے اور میں...... یہاں اس سے کوسوں دور رہ کر بھی اس سے لاتعلق نہیں ہو پا رہا مما۔ نہیں خوش ہو پا رہا میں اس کے بغیر۔''

شہرین کا ذکر اسے ہمیشہ توڑ کر رکھ دیتا تھا۔ لہٰذا اس وقت بھی وہ خود کو سنبھال نہ سکا۔ نتیجتاً اس کی آنکھیں فوراً ابھر آئیں جنہیں اس نے حائقہ بیگم سے چھپا کر فوراً ہی رگڑ ڈالا۔

''کیا..... بہت خوبصورت ہے وہ۔ اپنی اریشہ سے بھی زیادہ؟''

حائقہ بیگم کی مدھم سی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔ تب ہی اس نے ازمیر شاہ کو تھکے تھکے سے انداز میں کہتے ہوئے سنا۔

''پتہ نہیں...... کیونکہ میں نے کبھی اسے اس کی خوب صورتی کی وجہ سے نہیں چاہا مما بلکہ وہ میرے دل کو اچھی لگی تھی اور میں اس کے لیے سیریس ہو کر سوچنے لگا۔ اب اپنے ایک دوست کی معرفت مجھے یہ پتہ چلا ہے کہ اس کا شوہر اس کے ساتھ مخلص نہیں ہے۔ وہ صرف اس کی دولت ہتھیانے کے چکر میں فلرٹ کر رہا ہے اسی لیے میں نے پھر سے انگلینڈ جانے کا فیصلہ کیا ہے مما تاکہ میں وہاں جا کر اس کی کوئی مدد کر سکوں۔ بہت زیادہ نہیں تو کم از کم اسے اس کے شوہر کی اصلیت سے ہی آگاہ کر سکوں۔''

اس کے لہجے میں، اس کی فکر میں، اس کی ایک ایک سانس میں، صرف اور صرف شہرین خان بسی ہوئی تھی۔

اس کا کہیں بھی کوئی ذکر نہیں تھا تب ہی اریشہ کو یوں لگا کہ اس کی امید کا آخری دیا بھی ایک دم سے بجھ گیا ہو۔ چند لمحوں میں ہی جیسے اس کے اندر ڈھیروں سناٹے اتر آئے ہوں اور وہ ایک دم سے خالی ہو کر رہ گئی ہو۔ اس میں اتنی ہمت بھی نہیں رہی تھی کہ وہ دودھ کا گلاس لے کر کمرے کے اندر چلی جائے۔ اسی لیے وہ دہلیز سے واپس پلٹ آئی اور اپنے کمرے میں آ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ جبکہ مضطرب سے ازمیر شاہ نے جو اس کا سایہ وہاں سے غائب دیکھا تو اطمینان کی سانس بھرتے ہوئے وہ اپنے دل کے درد کی پرواہ کیے بغیر آہستہ سے مسکرا دیا۔

☆☆☆

اریشہ کی منگنی کی ڈیٹ فکس ہو گئی تھی اور اگلے ہی ہفتے اذہان کی گھر آمد پر یہ نسبت طے ہونا قرار پا گیا تھا جبکہ ازمیر مکمل مصروفیت کے ساتھ انگلینڈ جانے کی تیاریوں میں لگا ہوا تھا۔'' اور پھر جیسے ہی اس کی سیٹ کنفرم ہوئی اذہان بھی دو ہفتے کی چھٹی پر چپ سے گھر لوٹ آیا۔ اریشہ کی منگنی کے تیسرے ہی روز اس کی فلائٹ تھی، لہٰذا جہاں گھر والے فنکشن کی تیاریوں میں الجھے ہوئے تھے۔ وہیں وہ اپنے سفر کی تیاری میں بے حد مصروف دکھائی دے رہا تھا اور بالآخر وہ دن بھی آ گیا کہ جس کا سب کو بے قراری سے انتظار تھا۔

گھر کے بچے بڑے، سب بہت مسرور دکھائی دے رہے تھے۔ اسپیشلی فرزانہ بیگم اور ماہم شاہ کی خوشی تو دیکھنے کے لائق تھی۔ ''شاہ ولاج'' میں عرصے کے بعد دوسری بڑی خوشی کا موقع تھا۔ جس پر گھر کا ایک ایک فرد بے حال اپنی اپنی تیاریوں میں مگن تھا۔

فنکشن اپنے عروج پر تھا۔ موم کی بنی گڑیا کی مانند بجی سنوری اریشہ خان کو نٹ کھٹ سے شریر اذہان خان کے پہلو میں لا بٹھایا گیا تھا۔

تب تھکے تھکے سے ازمیر شاہ نے گھر کی دہلیز پر قدم رکھا تھا۔ آج صبح سے ہی اس کا جسم جل رہا تھا۔ دل میں عجیب سی بے قراری پھیلی تھی اور وہ اپنے ہی آپ سے بے نیاز بنا خود کو سنبھال رہا تھا۔ رنگ و نور میں نہایا ''شاہ ولاج'' آج بھی اسے متاثر نہیں کر پا رہا تھا۔ نہ جانے کیا ہو گیا تھا اس کے مضطرب دل کو کہ کہیں قرار ہی نصیب نہیں تھا اسے۔ نہ گھر کے اندر نہ باہر ہر طرف جیسے ایک آگ سی جل رہی تھی اور وہ اس میں جھلس رہا تھا۔

''ارے ازمیر! تم یہاں کیوں کھڑے ہو؟''

وہ سنگ مرمر کے پلر سے ٹیک لگائے خالی خالی سی آنکھوں کے ساتھ اریشہ اور اذہان کو ساتھ ساتھ بیٹھے دیکھ رہا تھا جب صالحہ بھابی اس کی طرف چلی آئیں۔ جواب میں ازمیر نے سرعت کے ساتھ اپنی بھیگی پلکیں صاف کر کے دھیمے سے مسکراتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔ پھر قدرے دھیمے لہجے میں بولا۔

کچھ نہیں بھابی! بس یوں ہی۔

''یوں ہی نہیں۔ تم یقیناً اریشہ کے متعلق سوچ کر ٹینس ہو رہے ہو۔ ہے نا؟''

قدرے کھلنڈرا انداز تھا ان کا لیکن ازمیر شاہ ان کے اس قدرے درست قیاس پر چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔

''خوب جانتی ہوں میں تمہیں۔ ضرور تم اپنی اتنی اچھی دوست کے پرائے ہو جانے پر افسردہ ہو اور یقیناً یہ سوچ کر پریشان ہو رہے ہو کہ اب تمہارا خیال کون رکھے گا؟ اریشہ چلی جائے گی تو تمہارے کپڑے کون پریس کرے گا؟ تمہارے لیے چائے کون بنا کر لائے گا؟ تم دل کی باتیں

کس کے ساتھ شیئر کرو گے۔ ہے نا۔"

بہت فری لہجے میں وہ بولی تھیں۔ جواب میں ازمیر کا سر آپ ہی آپ اثبات میں ہل گیا۔تو صالحہ بھابی اس کی اس قدر سادگی پر بے ساختگی سے کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

"ایک دم بدھو ہو تم بھی......ارے پاگل اگر اریشہ چلی گئی تو کیا ہوا؟ میں تو یہاں ہوں نا؟ تمہاری بھابی، تمہاری بڑی بہن۔ میں تمہارا خیال رکھوں گی۔تمہارے کپڑے پریس کر کے دوں گی۔تمہارے لیے اپنے ہاتھوں سے بار بار چائے بنا کر دوں گی اور تم بے دھڑک اپنے دل کی ہر بات مجھ سے ڈسکس کر سکو گے او کے......؟"

"جی بھابی۔"

ان کے فریش لہجے سے وقتی ہی سہی بہرحال وہ سنبھل گیا تھا تب ہی سر جھکا کر مثبت جواب دیا۔تو صالحہ بھابی اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے مسکرا کر واپس چلی گئیں اور وہ وہیں کھڑا اداس سا سب کو ہنستے کھیلتے دیکھتا رہا کہ اسی اثنا میں اریشہ بالکل اچانک مسکراتے ہوئے کھلکھلاتے اذہان شاہ کے پہلو سے اٹھی اور اس سے پہلے کہ وہ چند قدم آگے بڑھاتی ایک دم سے چکرا کر گر پڑی۔آنِ واحد میں ہی وہاں تمام کے تمام منظر بدل گئے۔سب لوگ مسکرانا بھول کر بے حد پریشانی کے ساتھ اریشہ کے اردگرد جمع ہو گئے جبکہ وہ دور کھڑا گم صم سے ذہن کے ساتھ سب کچھ دیکھتا رہ گیا۔

"ارے جلدی سے کوئی ڈاکٹر کو بلاؤ۔"

اسے نورینہ پھوپھو کی بلند صدا سنائی دی تھی مگر وہ نڈھال سا وہیں سیڑھیوں پر جم گیا۔

ہم نے کب اس سے ملاقات کا وعدہ چاہا
دور رہ کر تو اسے اور بھی زیادہ چاہا
یاد آیا وہ ہمیں اور بھی شدت کے ساتھ
بھول جانے کا اُسے جب بھی ارادہ چاہا

☆

آنکھ کے ساحل سے سارے خواب چن کر لے گیا
وہ میرے دل کے سمندر میں' جو اک مہمان تھا

صبح کے گیارہ بج رہے تھے اور وہ ابھی تک بستر پر پڑا، کسلمندی سے پہلو بدل رہا تھا۔ کل رات مسٹر اینڈ مسز ہمدانی کی پارٹی میں، اس نے آپے سے باہر ہو کر جو رویہ انجشاء احمر کے ساتھ اپنایا تھا۔ اب اس پر بے حد شرمندگی ہو رہی تھی اسے تب ہی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ انجشاء سے اپنے غلط رویے کی معافی کیسے مانگے؟

اور نہ جانے وہ کب تک اسی الجھن میں رہتا کہ سیال بیگم ناشتے سے فارغ ہو کر سیدھی اس کے کمرے میں چلی آئیں پھر اسے جاگتے ہوئے پایا تو مسکرا کر بولیں۔

''بیٹے! کہو کل رات مسز ہمدانی کی پارٹی کیسی رہی؟''

''اے ون۔'' کہنیوں کے بل اٹھتے ہوئے عدنان نے مختصر کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ کل وہاں جا کر تم نے خوب انجوائے کیا؟''

''یس موم! بہت انجوائے کیا میں نے۔'' اس نے پھر مختصر جواب دیا۔

''کوئی لڑکی وڑکی پسند کی تم نے کہ نہیں؟'' انہوں نے کریدنے کی کوشش کی۔ جواب میں عدنان محض سرد آہ بھر کر رہ گیا۔

''موم! لڑکی تو پسند کر لی میں نے لیکن افسوس کہ وہ آپ کے بیٹے کو گھاس نہیں ڈالتی۔'' کسی قدر مایوس لہجہ تھا اس کا جبکہ سیال بیگم نے قدرے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

''کیا؟ ایسی کون سی حور پری ہے وہ کہ جس نے میرے چاند سے بیٹے کو ناپسند کر دیا۔'' انہیں تو کوئی جھٹکا ہی لگا تھا یہ سن کر جبکہ عدنان ان کے انداز پر دھیمے سے مسکرا دیا۔

''وہ کوئی حور پری نہیں ہے مما لیکن پھر بھی اس جیسا اس پوری کائنات میں اور کوئی نہیں۔''

قدرے کھوئے کھوئے سے لہجے میں وہ بولا تھا۔ ''اور آپ تو اسے جانتی ہیں۔ وہی جس نے اس حادثے میں میری جان بچا کر مجھے ہسپتال پہنچایا تھا اور جس سے آپ نے اور ڈیڈ نے فون پر بات بھی کی تھی۔''

''اوہ۔ اچھا اچھا اس لڑکی کی بات کر رہے ہو تم ویسے وہ تمہیں کہاں ملی؟'' اس کی تفصیلی وضاحت پر قدرے سوچتے ہوئے وہ بولیں تو عدنان نے الف سے لے کر یے تک تمام کہانی ان کے گوش گزار کر دی۔ پھر ان کے ہاتھ تھام کر ملتجی لہجے میں بولا۔

''مما! میں سچ مچ اسے بہت چاہنے لگا ہوں اب اگر کوئی مجھے سنوار سکتا ہے تو وہ انجشاء احمر ہی ہے مما آئی ایم شیور۔ وہ اس گھر کو بھی جنت بنا دے گی۔ اس لیے پلیز اس سلسلے میں آپ میری مدد کریں اور مسز ہمدانی سے اس کے گھر والوں کے متعلق کچھ پوچھیں نا۔'' وہ اس کے شادی شدہ ہونے والی بات صاف ان سے چھپا گیا تھا۔ تب ہی اس کی خوشی کی خاطر سیال بیگم اسے ریلکس رہنے کی ہدایت کرتی ہوئیں مسز ہمدانی سے مل کر ان سے انجشاء احمر کے متعلق تمام معلومات جاننے کے متعلق سوچنے لگیں۔

اور انہیں نہایت آسانی سے اس بات کے لیے رضامند دیکھ کر عدنان رؤف نے گویا سکون کا سانس لیا۔

☆☆☆

''حسن ولاج'' میں اشعر اور تمکین کی شادی کے ہنگامے بالآخر گونج اٹھے تھے۔ محل جیسا ''حسن ولاج'' اتنی خوب صورتی کے ساتھ سجایا گیا تھا کہ جو ارد گرد دیکھتا بس دیکھتا ہی رہ جاتا۔ موی گڑیا کی مانند خوب صورت سی تمکین رضا بیوٹی پارلر سے تیار ہو کر مزید قیامت ڈھا رہی تھی۔ خوب صورت تو وہ پہلے ہی بہت تھی۔ اس پر ماہر بیوٹیشن کے ہاتھوں کے کمال نے واقعی اسے دید کے قابل بنا دیا تھا جس کی نظریں اس کے محو کر دینے والے سراپے پر پڑتیں بے اختیار منہ سے ''ماشاءاللہ'' نکل جاتا۔

نکاح کی رسم کے بعد جب اسے سجے سنورے خوب صورت سے اشعر کے پہلو میں لا کر بیٹھایا گیا تو کتنے ہی لبوں سے ایک ساتھ توصیفی جملے ادا ہوئے کیونکہ راسلک کے کرتا شلوار میں ملبوس نٹ کھٹ سا اشعر احمد نظر لگ جانے کی حد تک پیارا لگ رہا تھا۔ عائشہ بیگم نے بھرپور محبت کے ساتھ آگے بڑھ کر ان دونوں پر سرخ مرچیں وار دیں تو دور کھڑی شیزا احمد کے لبوں پر اک طنزیہ سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

''ان دونوں کے ساتھ کو تو میری نظر آل ریڈی لگ چکی ہے نانی اماں پھر اب آپ چاہے کتنی بھی مرچیں وار لیں۔ یہ جوڑی زیادہ دیر ساتھ رہنے والی نہیں۔''

دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے اس نے سوچا تھا اور ایک ادا سے گردن جھٹک کر انجشاء احمر کی طرف بڑھ گئی جو اس شادی میں خوشی سے بے حال سب سے آگے آگے تھی۔

''ارے شیزا! تم ممی کے پاس چلو نا۔ وہ بے چاری وہاں اسٹیج پر اتنے سارے لوگوں کے درمیان نروس ہو رہی ہو گی۔''

مختلف ذمہ داریوں میں الجھی انجشاء احمر کی نظر جوں ہی اس پر پڑی اس نے فوراً اسے تنبیہہ کی جسے شیزا نے دھیرے سے سر جھٹک کر گویا ہوا میں اڑا دیا۔

''وہ کبھی نروس نہیں ہوتی انجشاء! بہر حال تم سناؤ تمہارے کیا حال ہیں آج کل سنا ہے کوئی بزنس جوائن کرلیا ہے تم نے۔''
اسے ابھی تک انجشاء سے کھل کر بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ تب ہی انجشاء فارغ ہو کر اس کے ساتھ اوپر تمکین کے کمرے میں چلی آئی۔ پھر مختصر الفاظ میں اپنی داستان اس کے گوش گزار کی۔ تو بے ساختہ ہی شیزا کے لبوں پر بڑی بے جان سی مسکراہٹ بکھر گئی۔
''یہ محبت کیا ہے یار؟ جسے دیکھو اس نامراد کے سحر میں جکڑا ہوا دکھائی دیتا ہے۔'' اس کا لہجہ قدرے رکن تھا تب ہی انجشاء افسردگی سے مسکراتے ہوئے بولی۔
''تم اس نامراد سے بچ کر رہنا آؤ چلو نیچے چلتے ہیں۔''
وہ اس موضوع پر مزید کچھ بھی ڈسکس کرنا نہیں چاہتی تھی۔ تب ہی سرد آہ بھر کر اس نے کہا تو شیزا احمد بے زار سے دل کے ساتھ اس کے ہمراہ نیچے چلی آئی جہاں اب اسٹیج پر دلہا اور دلہن کو سلامی کی رسم ادا کی جا رہی تھی۔ مختلف کیمرے دھڑا دھڑ اس خوب صورت سے جوڑے کو اپنی آنکھ میں مقید کر رہے تھے جبکہ مووی میکر بھی مکمل انہماک اور مختلف اسٹائلز کے ساتھ ان کے پوز بنا رہا تھا۔
اور اسی وقت نڈھال سے اریج احمر نے وہاں قدم رکھا۔ انجشاء کی نظر سب سے پہلے اس پر پڑی اور وہ سرعت کے ساتھ اس کے قریب چلی آئی۔
''اریج! آپ یہاں؟ آپ کو تو بخار تھا نا؟'' اسے وہاں دیکھ کر وہ خاصی حیران ہوئی مگر اریج خاموش ہی رہا اور پھر اسی خاموشی سے اسٹیج کی طرف بڑھ گیا تو وہ وہیں کھڑی قدرے حیرانگی سے اس کا یہ طرزِ عمل دیکھتی رہ گئی۔
''شکر ہے خدا کا جو تمہیں میری خوشی میں شریک ہونے کا وقت تو ملا ورنہ میں تو مسلسل یہ سوچ سوچ کر جل رہا تھا کہ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں۔'' اشعر اسے دیکھتے ہی کھل اٹھا تھا جس پر گم صم سی کھڑی انجشاء کو مزید حیرانی ہوئی۔
''تمی! ان سے ملو۔ یہ اریج احمر ہیں۔ میرے بہت عزیز دوست اور اب بزنس پارٹنر بھی۔'' گرم جوشی کے ساتھ اریج کو اپنے ساتھ لگا کر وہ تمکین سے مخاطب ہوا تو اس نے سر اوپر اٹھا کر سرسری سی ایک نظر نڈھال سے اریج احمر پر ڈالی اور اس کا بکھرا ہوا سراپا دیکھ کر گویا پلکیں جھپکانا ہی بھول گئی۔ ستے ستے سے چہرے اور سرخ سوجی ہوئی رت جگوں کی غماز آنکھوں کے ساتھ وہ اسے کوئی اور ہی اریج احمر لگا۔
''شادی بہت بہت مبارک ہو مسز اشعر صاحبہ۔ میری دعا ہے کہ خدا آپ کو زندگی کی ہر وہ خوشی دے کہ جس کی آپ کبھی تمنا کریں۔''
نہایت بجھا ہوا انداز تھا اس کا، بے حد شکستہ پا۔ تمکین حیرت سے گنگ ٹکر ٹکر اسے دیکھتی رہی اور وہ اپنی پیاسی نگاہیں اس کے دلکش چہرے سے ہٹا کر اشعر سے معذرت کرتے ہوئے اسٹیج سے نیچے اتر آیا۔ وہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر رخسانہ بیگم کھڑی تھیں۔ اپنے تمام تر وقار اور خوب صورتی کے ساتھ۔ ایک پل کے لیے اس کا دل چاہا کہ وہ دوڑ کر جائے اور ان کا آنچل تھام کر کہے۔
''آپ کہاں کھو گئی تھیں مما؟ زندگی کے اتنے سال مجھ سے دور رہ کر کیسے بسر کر لیے آپ نے؟'' مگر یہ سب اس کے اختیار میں نہیں تھا سو وہ بے بسی کے ساتھ سر جھکا کر وہاں سے چلا آیا۔

ادھر خوبرو سا اشعر احمد تمکین رضا کی زندگی میں کیا آیا کہ اس کے لیے ایک ایک سانس جیسے قدرت کا سب سے خوب صورت انعام بن گئی۔ دونوں جہاں کی خوشی جیسے سمٹ کر اس کی آنکھوں میں آ چکی تھی۔

اشعر اتنا رومینٹک، اتنا ذمہ دار اور خیال رکھنے والا ہوگا شادی سے پہلے وہ قطعی اندازہ نہیں لگا پائی تھی۔ ان دونوں کی شادی کو پورے دو ماہ ہو گئے تھے مگر ابھی تک اشعر کی دیوانگی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ہر وقت وہ اسے اپنے ساتھ رکھتا اور ایک پل کے لیے بھی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دیتا۔

فاروق صاحب کے حکم پر اس نے آفس تو جوائن کر لیا تھا مگر آفس میں بیٹھ کر بھی اس کا دل اپنے گھر میں اٹکا رہتا۔ بار بار بہانے بہانے سے فون کھڑکھڑاتا اور وہ اس کی اس قدر دیوانگی پر زچ ہو کر رہ جاتی۔ شیزا شادی کے فوراً بعد ہی اپنی ماں کی بیماری کا بہانہ بنا کر اپنے گھر کیوں چلی گئی تھی۔ مگر تمکین اچھی طرح یہ جان گئی تھی کہ وہ اتنی جلدی ''حسن ولاج'' سے واپس اپنے گھر کیوں چلی گئی؟ اس کی موٹی موٹی آنکھوں کی سرخی اور وجہ بے وجہ آنکھوں میں تیرتا پانی قطعی اس سے پوشیدہ نہ رہ سکا تھا لیکن اشعر اس تمام سچویشن سے بے خبر ہی دکھائی دے رہا تھا۔ سو اس نے شیزا احمد کے اپنے گھر چلے جانے پر اطمینان کی سانس لی اور خدا سے خلوص کے ساتھ اپنے اور اشعر کے دائمی ساتھ کی دعا مانگی۔

اشعر اور تمکین ان دنوں ہنی مون کے سلسلے میں شمالی علاقہ جات کی طرف آئے ہوئے تھے اور یہاں چونکہ ان کا ذاتی گھر تھا جو ملازمین کے رحم و کرم پر تھا سو وہ لوگ سیر و تفریح کے کچھ دن گزارنے اسی گھر میں چلے آئے جو وہاں کے ملازمین نے ان کی آمد سے قبل ہی صاف کر دیا تھا۔

''اشعر! یہ جگہ کتنی خوب صورت ہے نا۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ۔ اللہ تعالیٰ نے کتنا خوب صورت بنایا ہے ہمارے ملک کو اور یہاں کے لوگ پھر بھی اڑوس پڑوس کے ملکوں میں خوب صورتی تلاش کرتے ہیں۔''

وہ لوگ ان دنوں ناران میں ٹھہرے ہوئے تھے اور یہاں کی خاموش فضا میں نگاہوں کو مسحور کر دینے والی بے مثال خوب صورتی تمکین کو مبہوت کر رہی تھی۔ تب ہی اس روز جھیل سیف الملوک کے قریب ایک پتھریلی چٹان پر اشعر کے مقابل بیٹھتے ہوئے اس نے کہا تو بے قرار سا اشعر اس کی خوبصورت آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سرگوشی میں بولا۔

''ہاں یہ جگہ خوبصورت تو ہے لیکن تم سے زیادہ نہیں۔''

''اوکے۔ مان لیا لیکن اب تم یہ پچاس بار پہلے سے کہی ہوئی بات دہرانا بند کرو۔''

''کیوں بند کروں؟ اپنی لائف پارٹنر سے محبت کے اظہار پر کوئی پابندی ہے کیا؟''

اس کا ہاتھ تھام کر لبوں سے لگاتے ہوئے وہ پھر مدہوش لہجے میں بولا تو تمکین سٹ پٹا کر رہ گئی۔

''فار گاڈ سیک اشعر! دو ماہ ہو گئے ہیں ہماری شادی کو اور تمہارا رومینس ہی کم ہونے میں نہیں آ رہا۔''

''آئے گا بھی نہیں کیونکہ لوگ شادی محبت کرنے کے لیے ہی تو کرتے ہیں۔''

اس کی جھنجلاہٹ کا اشعر کے رومینٹک موڈ پر قطعی کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ جس پر وہ مزید چڑ گئی تھی۔ تب ہی جھٹ سے بولی۔

''اچھا اور محبت کیوں کرتے ہیں؟''

''ویری سمپل۔شادی کرنے کے لیے۔'' اپنی دانست میں اشعر نے بڑا شاندار جواب دیا تھا۔

''اشعر! پلیز وہاں دیکھو نا۔جھیل سیف الملوک کا منظر کتنا خوب صورت دکھائی دے رہا ہے۔'' وہ مکمل طور پر قدرت کے حسن میں کھوئی ہوئی تھی جبکہ اشعر اس کی آنکھوں میں جو اس وقت کاجل سے بے نیاز سیدھی دل پر وار کر رہی تھیں۔

''اشعر! یہاں کی فضا میں کتنی عجیب سی خاموشی ہے نا۔ایسے لگتا ہے جیسے یہ کوئی تصوراتی جگہ ہو جہاں قدرت نے ہر طرف سرسبز گھاس رنگ برنگ کے پھول اور یہ اونچی اونچی پتھریلی چٹانیں بنا کر گویا اس جگہ کو خاموشی سے محسوس کرنے کا احساس بخش دیا ہو کتنی خوشبو گھلی ہے نا ان فضاؤں میں۔''

وہ کاغان فرسٹ ٹائم آئی تھی۔تب ہی یہاں کی ہر چیز اسے متاثر کر رہی تھی اور اشعر اس کی اس دیوانگی پر عجیب وارفتہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''اب واپس چلیں۔میرے خیال میں ہمیں کافی دیر ہو گئی ہے۔پھر واپسی کا راستہ بھی کتنا دشوار ہے۔'' اسے دیوانگی سے مسلسل اپنی طرف دیکھتے پا کر وہ قدرے نروس ہوتے ہوئے بولی پھر اس کا کوئی بھی جواب سنے بغیر ہی وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی تو مجبوراً اشعر کو بھی ہوش کی دنیا میں واپس آنا پڑا۔

''ارے.....اریج احمر اور یہاں۔''

وہ لوگ جیسے ہی ناران پہنچ کر اپنے بنگلے کی طرف بڑھے تھوڑے ہی فاصلے پر گاڑی میں بیٹھے اریج احمر کو دیکھ کر اشعر نے چونکتے ہوئے کہا تو جانے کیوں یک بارگی ہی تمکین کا دل بھی دھڑک اٹھا۔جس پر بمشکل کنٹرول پا کر وہ تیز تیز چلتی اپنے بنگلے کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

مضطرب سا ازمیر شاہ رات دیر تک بے مقصد سڑکوں پر گاڑی دوڑاتا رہا۔ذہن تھا کہ بری طرح بھٹکا ہوا تھا۔رہ رہ کر اسے اریشہ کا خیال آ رہا تھا۔آنسوؤں میں ڈوبی اس کی متورم آنکھیں اور اس کا عین منگنی والے دن شدید ڈپریشن کے باعث بے ہوش ہو جانا، جانے کیوں اسے بے قرار کر رہا تھا۔اس روز جب وہ ٹیرس پر اس کے پاس آئی تھی اور اس سے کہہ رہی تھی کہ وہ اذہان کے ساتھ شادی پر خوش نہیں ہے لیکن ازمیر نے اس کی بات پوری سننے سے قبل ہی اسے ٹوک دیا تھا جانے وہ اس سے کیا کہنا چاہتی تھی؟ رہ رہ کر اب اسے خود پر غصہ آ رہا تھا کہ اس نے کیوں اریشہ کی بات پوری نہیں سنی، کیوں دل میں اس کے خلاف غلط فہمیوں کو جگہ دی جبکہ اس کا تو کوئی قصور بھی نہیں تھا۔سارا قصور تو ماہم شاہ کا تھا۔ان دونوں کے بیچ فاصلے تو ماہم شاہ نے بڑھائے تھے اور وہ اریشہ خان سے بدظن ہو گیا کہ جس نے ہمیشہ ہر قدم پر اس کا ساتھ دیا تھا خود سے بڑھ کر اس کا خیال رکھا تھا۔

''یہ مجھے کیا ہو رہا ہے میں کیوں اس کے متعلق اس طرح سے سوچ رہا ہوں؟ مجھے تو شہرین خان کے متعلق سوچنا چاہیے کیونکہ میں اسی سے تو پیار کرتا ہوں تو پھر یہ دل اریشہ خان کے لیے کیوں مضطرب ہو رہا ہے کیوں اس کی خوشی اس کی مسکراہٹوں کے لیے مچلا جا رہا ہے؟''

بے حد الجھ کر اس نے خود سے پوچھا مگر اس کے کسی سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

کل اسے انگلینڈ کے لیے روانہ ہو جانا تھا مگر دل تھا کہ کسی طرح سنبھل ہی نہیں رہا تھا۔ اس نے کبھی یہ نہیں چاہا تھا کہ اریشہ اس سے محبت کرے، اسے ٹوٹ کر چاہے اور صرف اسی کا ہاتھ تھام کر زندگی کی مسافتوں کو طے کرے۔ ہاں مگر وہ اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا اسے تکلیف پہنچا کر خوش نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ خوش فہم نہیں تھا اور نہ ہی اپنی ذات کو پھر سے ایک نیا تماشہ بنا دینے کی ہمت تھی اس میں۔ مگر پھر بھی نہ جانے کیوں وہ اریشہ کے متعلق سوچ کر ہرٹ ہو رہا تھا۔ اس کی آنسوؤں میں ڈوبی جھیل سی گہری آنکھوں میں اپنا عکس دیکھ کر پریشان ہو رہا تھا۔

اس روز سینما ہال میں جب وہ مکمل انہماک کے ساتھ فلم دیکھنے میں مشغول تھا تو اریشہ کیسے دیوانوں کی مانند پیاسی نظروں سے یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔ اس لمحے وہ اس کی آنکھوں میں اپنا عکس دیکھ کر بوکھلا گیا تھا اور اس کے بعد بھی جب دل بہکنے لگا، خوش فہم ہونے لگا تو خود کو بکھرنے سے بچانے کے لیے اس نے یوں فرار کر راستہ اپنا لیا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ وہ اریشہ سے دور ہوتا چلا گیا مگر کتنی عجیب بات تھی کہ وہ اس سے دور ہو کر بھی اس کے تصور سے چھٹکارہ نہیں پا رہا تھا۔

اور کیا یہ ممکن تھا کہ وہ ملک بدر ہو کر بھی اسے بھلا دیتا؟ شاید نہیں۔

''تو پھر میں کیا کروں؟ کیا ماہم شاہ کے سچائی سے پر حقائق سے نگاہیں چرا لوں، کیا پھر سے خوش فہم ہو کر اپنے ہی وجود کو تماشہ بنا لوں؟''

بے حد اضطراب کے عالم میں اس نے سوچا تھا اور نڈھال ہو کر سر اسٹرینگ سے ٹکا دیا تھا۔ اپنی کم صورتی، اپنا اکیلا پن، اپنی تقدیر ایک مرتبہ پھر اسے بری طرح رلا رہی تھی۔ تب ہی اس نے اریشہ سے دو ٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اس سے اس بندھن کی بابت صاف صاف سب کچھ جان لینے کا ارادہ کر کے گاڑی گھر کی طرف والے راستے پر ڈال دی۔

''ہاں مجھے انگلینڈ جانے سے قبل اریشہ سے بات کرنی چاہیے۔'' حتمی انداز میں اس نے سوچا اور قدرے مطمئن ہو گیا۔

☆☆☆

''ایکسکیوزمی مس انجشاء! مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔''

اگلے ہی روز بے قرار سا عدنان رؤف انجشاء کے کیبن میں اس کے مقابل بیٹھا شرمندہ سے انداز میں کہہ رہا تھا۔ جس پر فائلوں کے ڈھیر میں الجھی انجشاء احمر نے ایک لمحے کے لیے سر اٹھا کر سرسری سا اسے دیکھا پھر دوبارہ اپنے کام میں منہمک ہو کر سرد مہری سے بولی۔

''جی فرمایئے۔''

''دیکھئے۔ میں اپنے کل رات والے رویے پر بہت شرمندہ ہوں نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا کل رات سے ایک لمحے کے لیے بھی میں سو نہیں سکا۔ پوری رات آپ کا تصور رہ رہ کر مجھے بے قرار کرتا رہا۔ پلیز۔ پلیز مجھے معاف کر دیں۔''

''کر دیا۔ مزید کچھ؟''

اس کے التجائیہ لہجے پر فوراً سر اٹھا کر مختصر لہجے میں اس نے کہا۔ تو بے قرار سے عدنان رؤف کو گویا قرار مل گیا۔

''تھینک یو۔تھینک یو ویری مچ۔ مجھے پورا یقین تھا کہ آپ مجھے معاف کر دیں گی۔''

لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیلا کر وہ خاصے ہلکے پھلکے انداز میں بولا تھا جس پر ایک استہزائیہ سی مسکراہٹ انجشاء احمر کے لبوں کو چھوگئی۔

''مسٹر عدنان! آپ ایسے کام کرتے ہی کیوں ہیں کہ جن کے لیے آپ کو بار بار سوری کہنا پڑے۔کیا اس میں شرمندگی محسوس نہیں ہوتی آپ کو لیکن شاید آپ جیسے اونچے طبقے کے لوگوں نے اس لفظ کو بھی اپنا اسٹائل بنالیا ہے۔ہے ناں؟''

نہایت تلخ انداز تھا اس کا عدنان رؤف کے منہ سے جواب میں اک لفظ تک نہ نکل سکا۔

''آپ اونچے طبقے کے حامل لوگ راہ چلتے کسی کو گاڑی سے کچل دیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں سوری۔ بھری محفل میں کسی کو تماشہ بنا کر رکھ دیتے ہیں اور بعد کہہ دیتے ہیں سوری۔ جیسے آپ کے اس لفظ سوری سے سارے دکھوں کا مداوا ہو جاتا ہو۔''

پین ہاتھوں میں گھماتے ہوئے وہ پھر طنزیہ انداز میں بولی تھی جواب میں عدنان رؤف کی نگاہیں آپ ہی آپ جھک گئیں۔

''بہر حال اب آپ جا سکتے ہیں۔''

اگلے ہی لمحے وہ پھر بولی تھی تب عدنان نے تڑپ کر سر اٹھایا۔

''دیکھیے آپ چاہے مجھے کچھ بھی کہیں مجھے اپنے دفاع کے لیے کچھ بھی نہیں کہنا لیکن اس کے باوجود میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ پلیز مجھ سے خفا مت ہوں۔ میں آپ کو بہت چاہتا ہوں۔ بہت پیار کرتا ہوں اور اسی سلسلے میں میری مما آپ کے گھر والوں سے ملنا چاہتی ہیں۔ دیکھیے میں جانتا ہوں کہ آپ مجھے ناپسند نہیں کر سکتیں۔ آپ کی یہ سرد مہری، لاتعلقی محض وقتی تاثر ہے اس لیے پلیز میرے پرپوزل کو رجیکٹ مت کیجیے گا پلیز۔''

ملتجی لہجے میں وہ بولا تھا۔ جواب میں انجشاء کا چہرہ غصے کی شدت سے ایک مرتبہ پھر سرخ ہو گیا تب ہی وہ بولی۔

''کتنے ڈھیٹ انسان ہیں آپ مسٹر عدنان! پتہ نہیں کیسے لہجے، کیسی باتیں آپ کی سمجھ میں آتی ہیں؟ آپ کیوں بار بار مجھے اپنی فضول بکواس سے غصہ دلانے چلے آتے ہیں جبکہ میں بارہا آپ سے یہ کہہ چکی ہوں کہ میں میرڈ ہوں آخر کیوں میری بات آپ کی سمجھ میں نہیں آتی۔''

وہ چلا کر خود اپنا تماشہ نہیں بنانا چاہتی تھی مگر چلا اٹھی تھی جس پر گم صم سے عدنان رؤف نے قدرے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ مجھ سے جھوٹ بول رہی ہیں اور یہ بات آپ خود بھی اچھی طرح جانتی ہیں کیونکہ اگر آپ میرڈ ہوتیں تو یوں ٹکے ٹکے کی ملازمت کے لیے دھکے نہ کھا رہی ہوتیں۔ اس لئے پلیز بار بار یہ جھوٹ بول کر آپ خود کو گنہگار مت کیا کریں کیونکہ آپ کے اس جھوٹ کو سچ مان کر میں آپ کا پیچھا چھوڑنے والا نہیں۔'' زور سے دایاں ہاتھ ٹیبل کی چکنی سطح سے ٹکراتے ہوئے وہ بھی چلایا تھا جواب میں انجشاء ایک بے بس سی نظر اس پر ڈال کر رخ پھیر گئی۔

''آپ مجھ سے بھاگ کیوں رہی ہیں مس انجشاء! جب میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ میں آپ کی خاطر ہر بری عادت ترک کرنے کو تیار

ہوں تو کیوں میری بات سنجیدگی سے نہیں لیتیں آپ؟ آخر آپ کی اس مسلسل سرد مہری کو میں کیا سمجھوں؟''

وہ پھر دبے دبے غصے کے ساتھ بولا تھا جواب میں انجشاء احمر کی برداشت جیسے جواب دے گئی۔''آپ خود کو سمجھتے کیا ہیں مسٹر عدنان؟''
نہایت تنک کر اس کا سوال نظرانداز کرتے ہوئے برہمی سے وہ بولی تھی۔

''بولئے۔ جواب دیجیے۔ آخر چیز کیا ہیں آپ؟ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ چند سرپھری لڑکیوں کو بے وقوف بنا کر آپ پوری دنیا کے ہیرو بن بیٹھے ہیں۔ بتایئے مجھے آپ کا کیا خیال ہے کہ آپ جس لڑکی پر نظر کریں گے وہ پکے ہوئے پھل کی طرح آپ کی جھولی میں آگرے گی۔ نیور مسٹر عدنان کیونکہ دنیا میں ہر چیز بکاؤ نہیں ہوتی۔ ہر لڑکی عقل سے پیدل نہیں ہوتی۔ اس لئے میری شرافت کو آپ میری کمزوری ہرگز مت سمجھیں کیونکہ میں آپ جیسے بگڑے ہوئے رئیس زادوں میں کوئی انٹرسٹ نہیں رکھتی۔'' غصے کی شدت سے اس کی ناک کی پھنگیں پھول گئی تھیں جب کہ عدنان رؤف اب بھی گم صم سا بیٹھا اسے حیرانی سے دیکھے جا رہا تھا۔

دیکھئے مسٹر عدنان میں ایک کول مائنڈ ڈلڑکی ہوں لہٰذا شرافت کے ساتھ آخری بار آپ کو سمجھا رہی ہوں کہ مجھے فضول گوئی قطعی پسند نہیں سو پلیز بہتر ہوگا کہ آپ عقل کے ناخن لیں اور میرا پیچھا چھوڑ دیں او کے۔''

نفرت سے بھرپور اس کا لہجہ عدنان کی سماعتوں میں زہر بن کر اترا۔''اور ہاں..... میں ایک مڈل کلاس گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں بالکل آپ کی فیانسی کی مانند میری زندگی کی روٹین بھی نہایت سادہ ہے۔ میرے مشاغل، میرا طرز زندگی، میری سوچ سب کچھ آپ کے اسٹیٹس سے ہٹ کر ہے لہٰذا میں اگر میریڈ نہ بھی ہوتی تب بھی آپ کی زندگی میں میری ذات کہیں فٹ نہ بیٹھتی کیونکہ میں نہ تو آپ کے طرزِ زندگی کو پسند کرتی ہوں اور نہ ہی آئندہ کبھی خود کو بدل کر آپ کے سانچے میں ڈھلنے کی کوئی خواہش میں کر پاؤں گی لہٰذا بہتر ہوگا کہ آپ اپنا راستہ بدل لیں اور اپنے لئے ایک ایسی ہی لڑکی کا انتخاب کریں، جو آپ کے معیار کے مطابق آپ کے اسٹیٹس اور لائف سٹائل کی حامل ہو۔ آپ کے ساتھ سوٹ کرتی ہو۔ جس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے میں آپ کو کسی قسم کی شرمندگی کا احساس نہ ہو او کے۔''

نہایت چبھتا ہوا انداز تھا اس کا، اس قدر کھرا کہ پل کے پل میں ہی عدنان رؤف کی شخصیت کا سارا غرور مٹی میں مل گیا اور وہ جو لڑکیوں کو مٹی کے کھلونے سمجھتا تھا آج ایک لڑکی کے ہاتھوں ہی پتھر کا بت بن کر رہ گیا تھا۔ تب ہی شکستہ سے انداز میں اٹھ کر اس کے کیبن سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

تمکین اور اشعر اپنے پندرہ روزہ ہنی مون ٹرپ کے بعد لاہور واپس لوٹ آئے تھے اور ان پندرہ دنوں میں سعید صاحب نے لاہور میں اپنا بزنس اچھا خاصا سیٹ کر لیا تھا۔ پھر وہ لوگ اپنے نیو بنگلے میں بھی شفٹ ہو چکے تھے۔ جس پر اشعر نے چھ ماہ قبل ہی کام شروع کروا دیا تھا۔ لہٰذا ان کی واپسی پر ایک زبردست سرپرائز ملا۔

رخسانہ بیگم نے اپنی پسند سے اشعر اور تمکین کے لئے لان کے اوپر دوسری منزل پر سب سے خوب صورت کمرہ سیٹ کروا دیا تھا۔ جس کی کھڑکیاں لان میں کھلتی تھیں اور یہاں سے ٹیرس پر کھڑے ہو کر صبح کا سہانا منظر اور شام میں سورج ڈوبنے کا اداس منظر بے حد بھلا لگتا تھا۔

اشعر اور تمکین دونوں نے ہی کمرے کے انتخاب پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے رخسانہ بیگم کا شکریہ ادا کیا تھا۔

''حسن ولاج'' بھی چونکہ اسی روڈ پر واقع تھا لہٰذا وہ لوگ تایا کی فیملی کے ساتھ ہی شام کی چائے پر حسن ولاج، میں اکٹھے ہو جاتے اور پھر جو بات سے بات نکلتی تو وقت گزرنے کا بالکل پتہ ہی نہ چلتا۔ دادا جی، دادی ماں، تایا فاروق احمد، ان کی وائف سمیہ بیگم، تمکین کے پاپا رضا احمد، مما آسیہ بیگم، سعید صاحب ان کی وائف رخسانہ بیگم، عاشر بھائی، نورینہ بھابھی اشعر اور تمکین جو مل کر گپ شپ لگاتے تو قربت کے یہ چند لمحے جیسے حسن ولاج کے مہکتے پھول بن جاتے۔

زندگی کس قدر حسین ہو گئی تھی ہر طرف جیسے خوشیوں کی ندیاں بہہ رہی تھیں تین ماہ کیسے گزر گئے تمکین اور اشعر کو قطعی خبر نہ ہو سکی۔ تاہم اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے اشعر نے بھی عاشر بھائی کی طرح مکمل طور پر بزنس کی ذمہ داری سنبھال لی تھی۔

نازک اندام تمکین نے بھی خوشی خوشی رخسانہ بیگم کو ہر طرح کی ذمہ داری سے فارغ کر کے گھر کا سارا انتظام اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔

کھانا پکانے سے لے کر ملازموں سے صفائی وغیرہ اپنی نگرانی میں کروانا، مہینے بھر کے بجٹ کی دیکھ بھال، سب کی پسند کی ڈشز تیار کرنا غرض کہ اس نے تمام امور اپنے ہاتھوں سے سرانجام دینے کا عندیہ دے دیا تھا۔ یہاں تک کہ صبح ناشتے کی تیاری کی ذمہ داری بھی اس نے خوشی خوشی اپنے سر لے لی تھی مگر رخسانہ بیگم پھر بھی جہاں ضرورت ہوتی اس کی مدد کر دیتیں۔ ہاں صبح صبح نماز کے لئے اٹھ کر کچن سنبھالنا انہیں تھوڑا مشکل لگتا تھا۔ لہٰذا وہ فجر کی نماز کے بعد تھوڑی دیر قرآن پاک کی تلاوت کرتیں، پھر دوبارہ سے سو جاتیں اور دو تین گھنٹے کے بعد اٹھتیں کہ لندن میں ان کی یہی روٹین بن چکی تھی۔ لہٰذا تمکین نماز فجر کی ادائیگی کے بعد سیدھی کچن میں چلی آتی۔ پھر سب سے پہلے آٹا گوندھتی، چائے کا پانی چڑھاتی۔ انڈے بوائل کرتی، کچھ ہاف فرائی کرتی اور یوں سب کی پسند کا ناشتہ بناتے بناتے اسے کافی ٹائم لگ جاتا۔ اشعر چونکہ سعید صاحب سے پہلے آفس جاتا تھا لہٰذا اسے پہلے اسی کے ناشتے کی فکر ہوتی اور وہ اس کے تیار ہونے تک ناشتہ ایک دم ریڈی رکھتی کہ اسے ناشتے میں تاخیر قطعی پسند نہیں تھی۔

پھر سعید صاحب بیدار ہوتے اور وہ ان کے ناشتے میں بوائل انڈا، توس اور ہلکے میٹھے کی چائے بناتی اور اس طرح ان دونوں کے آفس روانہ ہونے کے بعد وہ اپنے اور رخسانہ بیگم کے لیے پراٹھے بناتی اور دونوں ساس بہو مل کر ناشتہ کرتے ہوئے ڈھیروں باتیں کر لیتیں۔

اس روز وہ صبح دیر سے بیدار ہوئی اور جوں ہی نظر کلاک پر پڑی۔ وہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی کیونکہ صبح کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے اور اسکی فجر کی نماز قضا ہو گئی تھی جس کا اسے بے حد افسوس ہوا۔ پھر وہ جلدی سے فریش ہو کر سیدھی کچن میں چلی آئی۔ جلدی جلدی چائے کا پانی چڑھایا اور آٹا گوندھا پھر کمرے میں آ کر بے خبر سوئے ہوئے اشعر کو بمشکل جگا کر واش روم کی طرف دھکیلا اور اسکے کپڑے تھما کر پھر سے کچن کی طرف دوڑ پڑی۔

رات میں وہ لوگ دیر تک ''حسن ولاج'' میں بیٹھے رہے تھے پھر وہاں سے واپسی کے بعد اشعر نے آئس کریم وغیرہ کی خواہش کر دی جس پر تمکین کی طرف سے انکار نا ممکن تھا۔ سو آئس کریم وغیرہ کھا کر جس وقت وہ گھر واپس لوٹے۔ گھڑی پونے تین بجا رہی تھی اور یہی وجہ تھی کہ صبح وقت پر ان کی آنکھ بھی نہ کھل پائی تھی جس کی وجہ سے سارا انتظام گڑبڑ ہو گیا۔

جلدی جلدی ناشتہ تیار کرتے ہوئے وہ ابھی انڈے فرائی کر رہی تھی جب اشعر نے کمرے سے اسے باآواز بلند پکارنا شروع کر دیا۔

سوٹاول سے ہاتھ پونچھ کر وہ کمرے میں آئی تو اشعر وارڈ روب سے تمام کپڑے باہر پھینکے نہ جانے کیا تلاش کر رہا تھا۔ تمکین اشعر کی اس حرکت پر فوراً تپ گئی۔

''اشعر! یہ کیا بندروں والی حرکتیں کر رہے ہو تم مجھے بتاؤ کیا ڈھونڈ نا ہے۔''

کپڑوں کا پھیلاؤ دیکھ کر اسے سچ مچ غصہ آ گیا تھا مگر اشعر نے قطعی مائینڈ نہ کیا اور اسی طرح سے اپنے کام میں مصروف رہ کر بولا۔

''میرے موزے کہاں رکھ دیئے ہیں تم نے ،اور اس سوٹ کے ساتھ میچنگ کی ٹائی بھی نہیں مل رہی۔اس کی اپنی ہی پریشانی تھی جبکہ تمکین اس کے فکر مندے انداز پر دھیرے سے مسکراتے ہوئے آگے بڑھی اور تھوڑی ہی دیر میں اسی وارڈ روب سے اس کے مطلوبہ موزے اور ٹائی نکال کر اسے تھما دیئے تو وہ مسکرا دیا۔

''یہ جو اللہ تعالٰی نے بڑی بڑی خوب صورت آنکھیں دی ہیں ناں انہیں استعمال کرنا سیکھ لو۔ ہر وقت بچوں کی مانند ممی نہ چلاتے رہا کرو۔''

وہ چونکہ اپنا کام ادھورا چھوڑ کر آئی تھی پھر ٹائم بھی کم تھا لہٰذا تپ کر بولی تو مسکراتے ہوئے اشعر نے اسے کندھوں سے تھام کر گلے سے لگا لیا۔ پھر اسی متبسم لہجے میں بولا۔

وہ تو کچھ ہو ہی گئی تم سے محبت ورنہ

ہم وہ خود سر ہیں کہ اپنی بھی تمنا نہ کریں

''بس بس رہنے دو۔ سوائے رومینس کے اور آتا بھی کیا ہے تمہیں۔''

اس کے پھر سے رومینٹک ہو جانے پر وہ قدرے جھلا کر بولی تھی جس پر بے ساختہ ہی اشعر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

''سویٹ ہارٹ! آتا تو بہت کچھ ہے لیکن تم بھلا کچھ کرنے ہی کہاں دیتی ہو۔''

بھرپور شرارت کے موڈ میں کن انکھیوں سے وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ تو تمکین زچ ہو کر اسے پرے دھکیلتی جلدی سے کمرے سے باہر نکل آئی اور اس کے یوں بھاگنے پر اشعر ایک مرتبہ پھر اپنی ہنسی کو کنٹرول نہ کر سکا۔

آفس کے لیے تیار ہو کر وہ جیسے ہی ناشتے کی ٹیبل پر آ کر بیٹھا۔ اس کے موبائل کی بزر بج اٹھی اور پھر کال ریسیو کر کے جیسے ہی اس نے موبائل آف کر کے کوٹ کی جیب میں رکھا تمکین نے سرسری سا پوچھ لیا۔

''کس کا فون تھا؟''

''داداجی کا۔ کہہ رہے تھے کہ شیزا آ رہی ہے اسے ایئر پورٹ سے لے آؤں۔ سو آج آفس جانا کینسل۔'' بھرپور اطمینان کے ساتھ اس نے کہا تھا جبکہ تمکین رضا کے دل میں خطرے کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔

☆☆☆

رات کے تقریباً پونے بارہ کا ٹائم تھا۔ جب نڈھال سے ازمیر شاہ نے ٹی وی لاؤنج میں قدم رکھا۔ پورا لاؤنج سنسان پڑا تھا۔ وہ تھکے تھکے سے قدم اُٹھاتا کوٹ کندھے پر ڈالے۔ اپنے کمرے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ جب اچانک کسی کی سسکیوں کی پکار نے اس کے قدم وہیں جکڑ لیے اور وہ حیرانگی سے واپس پلٹ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ تب ہی اس کی نظر اوپر جاتی سیڑھیوں کے قریب بیٹھی اس سادہ سی لڑکی پر پڑی جو چہرے کو گھٹنوں میں چھپائے اپنی سسکیاں روکنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی۔

منگنی کے بعد اس کی طبیعت کے پیشِ نظر گھر والوں نے اس کے کمرے میں ماہم کو شفٹ کر دیا تھا۔ تاکہ وہ بوقت ضرورت اس کا خیال رکھے۔

''تو پھر یہ لڑکی۔ یہاں سیڑھیوں پر بیٹھی اس طرح کیوں رو رہی ہے؟''

اپنے ہی آپ سے الجھ کر اس نے پوچھا تھا۔

''کیا؟ کیا واقعی اریشہ اذہان کے ساتھ شادی پر خوش نہیں؟ کیا واقعی اس کے دل میں کہیں میرے لیے کوئی جگہ ہے؟ اگر نہیں تو ایسی کون سی پریشانی ہے اسے جو میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔''

خیالات کا ہجوم تھا کہ اس پر ابل پڑا تھا۔ تب ہی مضطرب سا وہ چھوٹے چھوٹے اسٹیپ اٹھاتا اس کے قریب چلا آیا۔ پھر جیسے ہی ہاتھ بڑھا کر اس نے اریشہ کا کندھا چھوا اس ہچکیوں میں ڈوبے وجود نے سرعت کے ساتھ سر اوپر اٹھایا اور ازمیر گویا اپنی جگہ ٹھٹھک کر رہ گیا۔ اریشہ کی آنسوؤں میں ڈوبی جھیل سی گہری آنکھیں رو رو کر سرخ ہو رہی تھیں اور وہ چاہنے کے باوجود اپنی سسکیوں پر قابو پانے میں ناکام تھی۔ تب ایک لمحے کے لیے تو جیسے ازمیر کا دل کانپ اٹھا تاہم اگلے ہی پل وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولا۔

''کیا بات ہے اریشہ۔ ایسے کیوں رو رہی ہو تم؟''

اس کے لہجے میں حد درجہ اپنائیت تھی مگر اریشہ نے ناراضگی سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

''میں ٹھیک ہوں۔ کم از کم تمہیں میری فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

اس کے لہجے سے اس کے دل کا حال بخوبی پتہ چل رہا تھا۔ تب ہی ازمیر شاہ کا سر ندامت سے جھک گیا۔ ''آئی ایم سوری اریشہ! کہ پچھلے دنوں تمہیں غلط سمجھ کر میں نے تمہارے ساتھ غلط رویہ اپنایا لیکن میرا یقین کرو۔ میں کبھی بھی تم سے لاتعلق ہو کر نہیں جی سکتا۔ سو پلیز مجھے بتاؤ کہ تمہیں کیا ٹینشن ہے، کیوں تم اذہان کے ساتھ شادی پر خوش نہیں ہو؟''

''آپ سے کس نے کہا کہ میں خوش نہیں ہوں؟''

اس کے اپنائیت سے پُر لہجے پر وہ خاصی تلخی سے بولی تھی۔

''میں خوش ہوں مسٹر ازمیر شاہ! اور بہت زیادہ خوش ہوں آپ کو خواہ مخواہ میرے لیے فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ سمجھے آپ؟''

''ہاں۔ سمجھ گیا لیکن من چاہا ساتھی پانے پر تو تمہیں خوشی سے بے حال ہونا چاہیے تھا۔ پھر یہ آنکھوں میں ساون کی جھڑی کیوں لگی ہے؟''

اس کے تلخ لہجے پرازمیر کے لفظوں میں بھی کاٹ پیدا ہوگئی تھی۔ تب ہی اس کے گال پرلڑھکا آنسوانگلی کی پور پراتارتے ہوئے قدرے طنزیہ لہجے میں بولا تواریشہ نے کسی قدر سلگ کراس کی طرف دیکھا تھا۔ جواس کے دل کے حال سے اچھی طرح واقف ہونے کے باوجود انجان بننے کی کوشش کررہا تھا۔ تب ہی وہ خاصی تڑپ کروہاں سے اٹھی اوراپنے کمرے میں بھاگ گئی جبکہ حیران ساازمیر شاہ دیرتلک وہیں بیٹھا اس کے یوں چپ چاپ بھاگ کر جانے پرنہ جانے کیا کیا سوچتارہا۔

''اریشہ گھر والوں سے الگ ہونے پربھی توروسکتی ہے پھر میں ہمیشہ اپنے بارے میں ہی کیوں سوچتا ہوں؟''

قدرے افسردگی کے ساتھ اس نے اپنے دل سے پوچھا تھا۔ پھرلبوں پرایک پھیکی سی مسکراہٹ پھیلا کرقدم ایک مرتبہ پھراپنے کمرے کی جانب بڑھادیئے۔

پھراگلے روزصبح ہی صبح وہ بیدار ہوا توصالحہ بھابھی۔ اپنے مخصوص مسکراتے چہرے کے ساتھ اس کے کمرے میں چلی آئیں۔ وہ اتنی صبح انہیں اپنے کمرے میں دیکھ کربوکھلا ہی تو گیا۔ تب ہی جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ توصالحہ بھابھی پاس ہی صوفے پربیٹھ گئیں۔

''آپ......اس وقت بھابھی؟ کوئی کام تھا کیا......؟''

قدرے کنفیوز ہوکراس نے پوچھا تھا۔ جواب میں صالحہ بھابھی نے دھیمے سے اثبات میں سرہلادیا۔

''ہاں......ایک بہت ضروری بات کرنی تھی تم سے، میں نے سوچا آج شام کوتوتم چلے جاؤ گے تو کیوں نہ ابھی تم سے دل کی بات شیئر کرلی جائے۔''

ان کے کھنکتے بامعنی لہجے پرازمیر نے کسی قدر چونک کران کی طرف دیکھا تھا۔

''کیسی بات بھابھی......پلیز کھل کر کہیے نا۔''

تکیئے سے ٹیک لگا کروہ اچھی طرح سنبھل کربیٹھ گیا۔ تب صالحہ بھابھی کے مسکراتے لب پھرسے واہوئے۔

''دیکھوازمیر! میرا خدا جانتا ہے کہ تم مجھے کتنے عزیز ہو۔ تمہارے بھیاسے شادی سے قبل ہی میں تم سے واقف تھی۔ آفس میں اکثرآنا جانا لگا رہتا تھا۔ تب میں تمہیں پوری ذمہ داری کے ساتھ کام میں محو دیکھتی تو دل میں ہی تمہاری قابلیت کوسراہتی تھی اورآج بھی میرے نزدیک تم ایک کامیاب انسان ہو۔ لہٰذا میں نے اپنے گھر والوں کی مرضی سے اپنی بھرپورخوشی کے ساتھ دل ہی دل میں ایک فیصلہ ترتیب دیا ہے۔ امید ہے تم میری خوشی کا بھرم ضروررکھو گے۔''

صالحہ بھابھی کی جگمگاتی آنکھوں کے حسین جگنوؤں سے ہی لگ رہا تھا کہ انہوں نے جوبھی فیصلہ کیا ہے۔ وہ یقیناً اس پربہت خوش ہیں۔ تب ہی اس نے قدرے مدہم لہجے میں پوچھا۔

''کیسا فیصلہ بھابھی! آپ پلیز کھل کر بتائیں ناں؟''

اس کے لیے توان کا بے وقت کمرے میں آنا ہی خاصا حیرانگی کا باعث بنا تھا۔ کجا کہ اس کی بے پناہ تعریف اورآپ ہی آپ فیصلے کا تعین

اسے حیران ہی تو کر گیا تھا۔

''دیکھو ازمیر! ''شاہ ولاج'' میں ان دنوں شادیوں کا سیزن چل رہا ہے۔ جو کہ بہت اچھی بات ہے۔ لہٰذا میں چاہتی ہوں کہ اب جلدی سے تمہارے سر پر بھی سہرا سج جائے اور ''شاہ ولاج'' کی رونقوں میں مزید اضافہ ہو جائے۔ دیکھو ازمیر پلیز مجھے اور میرے خلوص کو غلط مت سمجھنا۔ تم چونکہ مجھے بے حد پسند ہو لہٰذا میں نے سوچا کہ میں تمہیں ایک پیارے سے دیور سے ایک اچھا سا جیجا جی بنا لوں۔ اسی لیے میں نے تمہیں اپنی پیاری سی چھوٹی بہن کے لیے پسند کر لیا اور گھر والوں سے بات بھی کر لی ہے۔ کسی کو میرے فیصلے سے کوئی اعتراض نہیں اور تو اور سائلہ بھی تم سے بے حد امپریس ہے۔ اس لیے میں چاہتی ہوں کہ تم انگلینڈ جانے سے قبل ایک بار اسے دیکھ لو اور ہمیں اپنے فیصلے سے آگاہ کر دو۔ باقی باتیں بعد میں دیکھی جائیں گی۔''

صالحہ بھابھی اپنے مخصوص مترنم لہجے میں کہہ رہی تھیں اور وہ حیرت سے گنگ پتھر بنا ان کی طرف دیکھتا رہ گیا تھا۔

''ارے کس سوچ میں ڈوب گئے تم؟ اب دیکھو نا۔ تمہیں آج نہیں تو کل ایک نہ ایک دن شادی تو کرنی ہی پڑے گی۔ تو پھر کیا حرج ہے کہ یہ نیک کام ذرا جلدی ہو جائے۔''

اسے گم صم سا پا کر وہ ہنستے ہوئے بولی تھیں تب ازمیر نے چونک کر خالی خالی نگاہوں کے ساتھ انہیں دیکھا۔

''میں نے ابھی سائلہ کو فون کیا ہے۔ اسے کچھ شاپنگ کرنا تھی اور پاپا شہر سے باہر ہیں۔ میں نے اسے یہاں بلا لیا تاکہ تم سے جان پہچان بھی ہو جائے اور وہ شاپنگ بھی کر لے۔ تاہم اس سلسلے میں' میں نے سائلہ سے کوئی بات نہیں کی ہے۔ میں نے سوچا پہلے تم دونوں ایک دوسرے سے مل لو۔ ایک دوسرے کو اچھی طرح جان لو۔ تب تمہاری رائے پا کر ہی میں بات کو آگے بڑھاؤں گی۔''

وہ مسلسل خاموش تھا اور صالحہ بھابھی اپنی خوشی اس سے شیئر کر رہی تھیں۔

''ازمیر! تم خاموش کیوں ہو چندا؟ کیا تم کسی اور میں انٹرسٹڈ ہو؟''

اس کے لبوں پر جامد خاموشی دیکھ کر انہوں نے فکرمندی سے پوچھا تھا۔ جواب میں ازمیر نے دھیرے سے نفی میں سر ہلا دیا۔

''نہیں بھابھی! ایسی کوئی بات نہیں ہے لیکن فی الحال میں شادی کے جھنجٹ میں پڑنا نہیں چاہتا۔''

بہت اضطراب کے ساتھ اس نے کہا تھا۔ جواب میں صالحہ بھابھی کے لبوں پر پُرسکون مسکراہٹ پھیل گئی۔

''پاگل لڑکے۔ تمہیں ابھی سے ان بکھیڑوں میں پڑنے کے لیے کون کہہ رہا ہے۔ ابھی تو صرف تمہیں گرین سگنل اوکے کرنا ہے۔ سمجھے؟''

محبت سے مسکرا کر اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے انہوں نے کہا۔ پھر اسے اپنا خیال رکھنے کی تاکید کر کے اس کے کمرے سے باہر نکل آئیں۔ تو گم صم سا ازمیر شاہ جیسے الجھ کر رہ گیا۔

اور پھر چند گھنٹوں کے بعد جب وہ تیار ہو کر ڈائننگ ٹیبل پر آیا تو وہاں موجود سب لوگوں کے مابین گمبھیر خاموشی اسے حیران کر گئی۔ جبکہ نگاہوں کے بالکل سامنے بیٹھی اریشہ خان جیسے بمشکل اپنے آنسو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ تب ہی اسے ماہم شاہ کی بلند آواز سنائی دی۔

''ازمیر بھائی۔ سنا ہے آپ صالحہ بھابھی کی چھوٹی بہن سائلہ سے چوری چھپے شادی کر رہے ہیں۔''

نگاہوں میں عجیب سا تمسخر لیے اس نے خاصے اچنبھے سے پوچھا تھا۔ جس پر حیرانی سے ازمیر شاہ نے کسی قدر چونک کر پہلے اس کی طرف اور پھر قدرے ڈسٹرب سی صالحہ بھابھی کی طرف دیکھا جو خاموشی سے سر جھکائے سب کو چائے سرو کر رہی تھیں۔

''یہ سب کیا ہے بھابھی؟''

کس قدر دکھ سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے مدھم لہجے میں کہا تھا۔ جواب میں صالحہ بھابھی نے قدرے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

''ارے......ازمیر بھائی! آپ تو صالحہ بھابھی سے یوں پوچھ رہے ہیں جیسے یہ بات کوئی الزام ہو آپ پر یا جسے آپ شو نہ کرنا چاہتے ہوں لیکن میں نے خود اپنے کانوں سے آپ کے اور بھابھی کے درمیان ہونے والی ساری گفتگو سنی ہے۔ اب آپ یہ مت سمجھنا کہ مجھے چوری چھپے ہر ایرے غیرے کی خفیہ باتیں سننے کی بُری عادت ہے۔ وہ تو میں وضو کے لیے جا رہی تھی۔ جب میں نے صالحہ بھابھی کو منہ اندھیرے آپ کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا اور مارے تجسس کے رہ نہ پائی اور آپ دونوں کی پوشیدہ باتیں سن لیں ویسے صالحہ بھابھی منہ اندھیرے چوری چھپے اٹھ کر کسی غیر نوجوان مرد کے کمرے میں جانا۔ اچھی عورتوں کو زیب نہیں دیتا۔''

نہایت زہر خند لہجے میں باری باری ازمیر شاہ اور صالحہ بھابھی کو دیکھتے ہوئے ماہم نے کہا تھا۔ جس پر ہمیشہ کول ڈاؤن رہنے والی صالحہ بھابھی کا خون پل میں کھول اٹھا اور انہوں نے غصے سے کانپتے ہوئے بالکل غیر ارادی طور پر ایک زبردست طمانچہ ماہم شاہ کے سفید گال پر جڑ دیا۔

''شرم آنی چاہیے تمہیں ایسی گھٹیا گفتگو کرتے ہوئے۔ ازمیر بھائی ہے میرا اور سگے بھائیوں کی طرح ہی عزیز ہے مجھے تب ہی میں اس کے انگلینڈ جانے سے قبل ہی اس سے اپنی بہن کی بابت بات کرنا چاہتی تھی سمجھیں تم۔''

ان کا رواں رواں غصے کی شدت سے کانپ رہا تھا جبکہ ماہم شاہ ساکت سے انداز میں اپنا دایاں ہاتھ گال پر رکھے انہیں ٹکر ٹکر دیکھتی رہ گئی۔

''صالحہ تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ تم اپنا گناہ چھپانے کے لیے میری بیٹی کو یوں مارو پیٹو۔''

فرزانہ بیگم شدید غصے کے عالم میں فوراً سے پیشتر اپنی سیٹ چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ صبح ہی صبح ایک عجیب سا طوفان امڈ آیا تھا وہاں جس نے سب کو ڈسٹرب کر کے رکھ دیا تھا۔ ارسلان احمد شاہ نے افسوس بھری اک شکایتی نظر اپنی محبوب بیوی پر ڈالی پھر بنا ناشتہ کیے ہی آفس کے لیے روانہ ہو گیا۔

''مما......ماہم مجھ پر اتنا گھٹیا الزام لگا رہی ہے اور......اور آپ کہہ رہی ہیں کہ میں قصوروار ہوں۔ ساری غلطی میری ہے۔''

فرزانہ بیگم کے تلخ الفاظ نے انہیں حقیقی دکھ سے ہم کنار کیا تھا تب ہی ان کی آواز لڑکھڑا گئی تھی۔ جس پر فرزانہ بیگم نے نخوت سے سر جھٹک کر غصے سے انہیں دیکھا پھر کڑک کر بولیں۔

''بس بس۔ زیادہ ٹسوے بہانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میری بیٹی نے جو دیکھا سنا۔ وہی کہا۔ تمہیں اگر اپنی بہن کا ایسا ہی کوئی مسئلہ تھا تو ہم مر تو نہیں گئے تھے۔ تم ہم سے بھی ڈسکس کر سکتی تھیں پھر منہ اندھیرے ازمیر کے کمرے میں تنہا جانے کی نوبت کیوں پیش آ گئی تمہیں؟''

وہ جب بھی غصے میں ہوتیں اسی طرح بے رحم جملوں کا استعمال کرتی تھیں۔ جبکہ صالحہ بھابھی سے تو مارے دکھ اور شرمندگی کے اپنے پاؤں پر کھڑا رہنا ہی دشوار ہو گیا تھا۔ تب ان کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسو دیکھ کر حائقہ بیگم نے لب کھولے۔

''بھابھی! آپ کو اک معمولی سی بات کو لے کر صالحہ سے اس طرح بات نہیں کرنی چاہیے۔''

انہوں نے دبے دبے لہجے میں سمجھانا چاہا تھا مگر فرزانہ بیگم تو گویا تھے سے ہی اکھڑ گئیں تب ہی بپھرے ہوئے لہجے میں بولیں۔

''یہ ہمارا ساس بہو کا آپس کا معاملہ ہے حائقہ۔ غیروں کو بیچ میں ٹانگ اڑانے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں اور ویسے بھی تمہارا بیٹا جتنا شریف ہے وہ تم بھی اچھی طرح جانتی ہو اور میں بھی۔'' حد سے زیادہ کٹیلا لہجہ تھا ان کا جبکہ حائقہ بیگم تو منہ پر ہاتھ رکھ کر حیرانی سے ان کے چہرے کی طرف ہی دیکھتی رہ گئی تھیں۔

''بس۔ بہت ہو چکا یہ ڈرامہ۔ اب اسے یہیں پر ختم کرو اور جا کر اپنا کام کرو۔''

دادا جی کی بلند آواز پر سب تھوڑی ہی دیر میں ایک ایک کر کے وہاں سے چلے گئے لیکن ازمیر شاہ غم و غصے میں پاگل سا وہیں بیٹھا فرزانہ بیگم کے کٹیلے الفاظ کو سوچتا رہا۔

☆☆☆

اتنی بے رحم نہ تھی زیست کی دوپہر کبھی
ان خوابوں میں کہیں سایہ گیسو بھی نہیں
موج در موج تیرے غم کی شفق کھلتی ہے
مجھ کو اس سلسلہء رنگ پہ قابو بھی نہیں

الجھے الجھے سے عدنان رؤف نے جوں ہی گھر کی دہلیز پر قدم رکھا سامنے ہی لاؤنج میں کسی کتاب کے مطالعے میں مشغول سیال بیگم فوراً کتاب بند کر کے اس کے قریب چلی آئیں۔

''ارے عدنان! کہاں تھے تم اتنی دیر سے؟ کب سے تمہارا موبائل نمبر ٹرائی کر رہی ہوں مگر مسلسل آف ملا اور تم آفس میں بھی نہیں تھے۔''

پریشانی ان کے لہجے سے بخوبی عیاں تھی۔ تب عدنان نے کندھے پر ڈالا کوٹ قریبی صوفے پر پھینکتے ہوئے بیزاری سے کہا۔

''ایک ارجنٹ بزنس میٹنگ میں مصروف تھا ماما۔ تب ہی موبائل آف کر دیا تھا میں نے۔''

''لیکن تمہیں جانے سے قبل مجھے بتانا تو چاہیے تھا نا عدی۔''

اس کے پر تھکن لہجے پر وہ فوراً ہی شکایتی انداز میں بولی تھیں۔ جس پر عدنان نے کچھ نہ کہنے کا قصد کرتے ہوئے خاموشی اختیار کر لی کہ اس

وقت اس کا ذہن بے حد ڈسٹرب تھا۔

''بہر حال۔ میں تمہیں بتانا چاہ رہی تھی کہ میں نے وہ انجشاء احمر کے متعلق مسز ہمدانی سے بات کی تھی۔'' اگلے ہی پل وہ دھیمے لہجے میں محض اتنا ہی کہہ کر خاموش ہو گئیں تو بے قرار سے عدنان رؤف نے فوراً سر اٹھا کر بے تابی سے ان کی طرف دیکھا۔

''تو پھر......؟''

بھنویں اچکا کر دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ وہ محض اتنا ہی کہہ سکا جواب میں سیال بیگم کا سر قدرے جھک گیا۔ تب ہی وہ افسوس کے عالم میں بولیں۔

''سوری بیٹے! اس لڑکی سے تمہاری شادی نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ آل ریڈی میرڈ ہے اور یہ بات مجھے خود مسز ہمدانی نے ہی بتائی ہے۔''

اپنی دانست میں انہوں نے گویا بہت بڑا انکشاف کیا تھا مگر وہ نہیں جانتی تھیں کہ عدنان اس حقیقت سے واقف ہے۔ تب ہی اس نے مایوس کن انداز میں فقط ایک نظر سیال بیگم کی طرف دیکھا۔ پھر بے بسی کے عالم میں تھکے تھکے سے قدم اپنے کمرے کی جانب بڑھا دیئے۔ ساری دنیا ایک دم سے جیسے الٹ پلٹ ہو گئی تھی۔

وہ جو ہاتھ بڑھا کر ہواؤں کے رخ بدل دیا کرتا تھا۔ کسی بھی حسین سے حسین تر، مغرور سے مغرور، عقل مند سے عقل مند لڑکی کو ایک چیلنج سمجھ کر دنوں میں کٹ پتلی بنا کر رکھ دیتا تھا۔ آج خود کیسے ایک عام سی معمولی لڑکی کے ہاتھوں کھلونا بن کر رہ گیا تھا۔

زندگی میں اس سے پہلے بھی بے شمار دفعہ ایسے حالات آئے تھے۔ انجشاء احمر سے پہلے بھی بہت سی لڑکیوں نے اسے متاثر کیا تھا لیکن اس نے کبھی کسی لڑکی کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کا ہرگز نہیں سوچا تھا۔ تو پھر انجشاء احمر نے ایسا کون سا منتر پھونک ڈالا تھا اس پر کہ وہ اس کے بغیر خود کو ادھورا سمجھنے لگا تھا۔ سوچ سوچ کر بھی اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا پوری کائنات جیسے ایک ہی نقطے پر اٹک گئی تھی۔ دل جیسے کسی ضدی بچے کی مانند صرف اور صرف انجشاء احمر کے حصول کے لیے مچل رہا تھا اور وہ دیر تک اپنے دل کو سمجھاتے سمجھاتے جیسے تھک گیا۔

اس نے آج تک بے شمار دل توڑے تھے۔ محض اپنی خوشی کی خاطر۔ لاتعداد آنکھوں کو رلایا تھا۔ مگر دل ٹوٹنے کی تکلیف کیا ہوتی ہے اس کا اندازہ اسے آج ہو رہا تھا۔ رد ہونے کا درد، وہ آج بخوبی محسوس کر رہا تھا، آج اسے یہ حقیقت اچھی طرح سمجھ میں آ رہی تھی کہ محبت زبردستی کا سودا نہیں ہے اور نہ ہی خدا کی زمین پر چلتے پھرتے زندہ انسان کوئی کھلونا ہوتے ہیں کہ جن کے جذبات سے کھیل کر انہیں توڑ پھوڑ دیا جائے۔

آج جانے کیوں اسے رہ رہ کر اپنے وہ سارے گناہ یاد آ رہے تھے جو اس سے سرزد ہوئے تھے۔ آنسوؤں میں بھیگی نہ جانے کتنی ہی آنکھیں، آج اسے ہارا ہوا دیکھ کر اس پر ہنس رہی تھیں اور وہ اندر ہی اندر اپنے آنسوؤں کو ضبط کرنے کی کوشش میں لہولہو ہو رہا تھا۔

''نہیں انجشاء احمر! تم اتنی جلدی مجھے توڑ نہیں سکتیں۔ میں ابھی تم سے نہیں ہاروں گا۔ تم خواہ کتنا بھی دور بھاگو مجھ سے کتنا ہی دامن بچاؤ میں ہر حال میں ہر قیمت پر تمہیں پا کر ہی رہوں گا۔ یہ وعدہ ہے میرا اپنے آپ سے۔''

کچھ لمحوں کے بعد ہی خود سے الجھتے ہوئے اس نے اپنے دل کو تسلی دی پھر کچھ سوچ کر آنسو پونچھتے ہوئے وہ اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔

اگلے کچھ ہی لمحوں میں وہ نہایت تیزی سے ڈرائیونگ کے ساتھ اریج احمر کے آفس کی طرف گاڑی دوڑا رہا تھا اور وہاں پہنچ کر اسے ایک اور جھٹکا لگا کہ اریج احمر علالت کے باعث ان دنوں شہر میں نہیں ہیں۔ تب مایوسی نے بری طرح سے اس کا گھیراؤ کر لیا اور وہ خاصا تھک گیا۔ اس نے تو سوچا تھا کہ وہ کسی بھی طرح سے بہانہ بنا کر اریج احمر سے انجشاء کے گھر کا پتہ معلوم کرے گا اور پھر اس کے گھر والوں سے مل کر ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر وہ اپنا پرپوزل انجشاء کے لیے پیش کر دے گا۔ مگر یہاں بھی مایوسی اور لاچاری نے اسے تھکا ڈالا تھا۔ تب ہی ایک موہوم سی امید کے تحت اس نے اریج احمر کا موبائل نمبر پریس کر ڈالا مگر بار بار کی کوشش کے بعد بھی وہ مسلسل آف ملا تو عدنان رؤف نے اشتعال کے عالم میں اپنا موبائل ہی ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔

''ارے یہ آپ نے کیا کیا عدنان صاحب! اپنا موبائل ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔''

اشعر جو ابھی گاڑی سے نکلا تھا اور عدنان رؤف سے اریج کے تھرو تھوڑی بہت جان پہچان رکھتا تھا، نے خاصے اشتیاق کے عالم میں کہا تو عدنان اسے دیکھ کر بس چپ چاپ نگاہ چرا گیا۔

''لگتا ہے بہت ڈپریس ہیں آپ۔ اینی پرابلم......؟''

وہ پھر اپنائیت سے بولا تھا۔ جواب میں عدنان رؤف نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا اور مدہم لہجے میں بولا۔

''ہاں......وہ میں مس انجشاء سے ارجنٹلی ملنا چاہتا تھا مگر اریج یہاں پر نہیں ہے اس کا ہوم ایڈریس مجھے معلوم نہیں......''

''بس اتنی سی بات......؟ جناب وہ لارنس روڈ کے قریب رہتی ہیں۔ آپ وہاں جا کر کسی سے بھی ان کے گھر کے متعلق پوچھ سکتے ہیں۔''

اشعر کا دوستانہ لہجہ اسے ساون کی ٹھنڈی پھوار کی مانند لگا تھا۔ تب ہی وہ بے حد خوشی کے عالم میں اس کا شکریہ ادا کرتا ہوا تیزی سے وہاں سے نکل آیا۔ انجشاء کی اپنے گھر کے متعلق غلط بیانی نے اسے حقیقی معنوں میں گھما ڈالا تھا۔ تب ہی اشعر کی مدد سے وہ لارنس روڈ کے قریب واقع انجشاء کے گھر کے سامنے پہنچ گیا اور پھر بیل دینے کے بعد جس شخص نے دروازہ کھولا انہیں دیکھ کر عدنان کی آنکھیں مارے حیرت کے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

اس نفاست نے، سلیقے نے ہے دل شاد کیا
کس قرینے سے ہے تو نے مجھے برباد کیا
بے وفائی نہیں، مجھ پر تو یہ احسان ہے تیرا
اپنا غم دے کے ہر اک غم سے ہے آزاد کیا

میں کسی یاد کی عبادت میں
جب بھی مصروف ومحو ہوتا ہوں
دیر تک دوریوں پر روتا ہوں
میں کسی یاد میں عبادت میں
آنکھ میں آنسوؤں کے آنے کو
زیست کا معجزہ سمجھتا ہوں
پھر اسی یاد کے حوالے سے
اپنے آنسو سنبھال رکھتا ہوں
میں سمجھتا ہوں میرے یہ آنسو
ان گئی ساعتوں کی قیمت ہیں
جو کبھی لوٹ کر نہیں آتیں
ساعتیں جو بچھڑ گئیں مجھ سے
آ بھی جائیں تو خواب کی صورت
پھر مجھے چھوڑنے کو آتی ہیں
اور پھر دیر تک رلاتی ہیں

پچھلے تین دن سے اس کی عجیب کیفیت تھی۔ کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ ایک دم سے جیسے کوئی بیماری دل پر حملہ آور ہو گئی تھی جس سے چاہنے کے باوجود وہ چھٹکارہ نہیں پا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسی صورت حال میں وہ کیا کرے؟

وہ ایک لڑکی جو خاص نہیں تھی۔ مگر آنکھوں کے راستے دل میں اتر گئی تھی۔ پوری کائنات ایک اُسی پر ختم نہیں تھی۔ مگر پھر بھی اسی کے بغیر

جیسے پوری کائنات ویران ہو کر رہ گئی تھی۔ ایک دم سے جیسے زندگی کا مفہوم بدل کر رہ گیا تھا۔ آتی جاتی ہر سانس جیسے بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔

وہ گھر میں ہوتا در و دیوار کاٹ کھانے کو دوڑتے اور آفس میں ہوتا تو دماغ کی شریانیں جیسے پھٹ جانے کو تیار ہو جاتیں۔ دنیا کے کسی بھی گوشے میں جیسے اس کے لیے سکون ختم ہو کر رہ گیا تھا۔

اُس کی محبت اور اس کی جنت دونوں ایک ہی شخص کی تحویل میں تھیں' اور وہی شخص۔ اس وقت اسے دنیا کا سب سے خوش نصیب شخص محسوس ہو رہا تھا۔

آج سے چند ماہ قبل لندن سے آئے اشعر احمد کے ساتھ بزنس ڈیلنگ اور بعد میں محدود پیمانے پر بزنس پارٹنر شپ کرتے وقت اسے گماں بھی نہیں تھا کہ کل کو یہی شخص اس کی جنت اور محبت کا حق دار بن کر اسے زندگی کی ہر خوشی سے ترسا کر رکھ دے گا۔

تب ہی تو اس تکلیف دہ حقیقت کے انکشاف کے بعد وہ خود کو اس کی شادی میں شرکت کرنے سے نہیں روک پایا کیونکہ دل میں جہاں آخری بار سجے سنورے روپ کے ساتھ تمکین رضا کو دیکھنے کی جوت جاگی تھی وہیں دل کے کسی ایک کونے میں ہلکا سا یہ اصرار بھی ہوا تھا کہ وہ صرف ایک نظر اس مجبور عورت کی آنکھوں میں دیکھ کر یہ پتا لگائے کہ عرصہ پہلے اسے اپنی ممتا سے محروم کرنے والی رخسانہ بیگم کی اداس آنکھوں میں کہیں نہ کہیں بچھڑ جانے والے رشتوں کا درد ہے یا نہیں......"

نئے لوگوں' نئے رشتوں میں بندھ جانے والی اس بے بس عورت کے چہرے پر' کہیں نہ کہیں گزرے وقت کی کوئی پرچھائیں دکھائی بھی دیتی ہے یا نہیں......؟

لیکن عرصے کے بعد انہیں اپنے روبرو دیکھ کر وہ ان کی آنکھوں سے کچھ بھی نہیں پڑھ پایا اور پڑھتا بھی کیسے' اس کی آنکھیں تو انہیں مدت کے بعد دیکھتے ہی چھلک جانے کو بے قرار ہو گئی تھیں اور تب وہ اپنا بھرم بچانے کے لیے فوراً وہاں سے چلا آیا۔

زندگی نے آج تک ہمیشہ' ہر قدم پر' ہر موڑ پر' اس سے جڑے تمام رشتوں کو' وقتاً فوقتاً' اس سے چھین کر ہر گام پر اسے تنہا کیا تھا۔ ہر ہر منزل پر' اسے مات دے کر خالی ہاتھ کیا تھا اور اب اس کے اندر محرومیوں کا اس قدر زیادہ کوٹا جمع ہو گیا تھا کہ وہ چاہنے کے باوجود بھی خود کو اس ٹوٹ پھوٹ کی دلدل سے باہر نہیں نکال پا رہا تھا۔ دادی کا عمان سے پرسوں شام ہی اسکی لاہور واپسی ہوئی تھی اور اس وقت وہ اکتا کر آفس سے اٹھ آیا تھا۔

ارادہ کسی اچھے سے پارک میں دیر تک بیٹھ کر اپنے بارے میں آگے کے لیے سوچنے کا تھا' مگر وائے نصیب کہ کچھ دیر کی ڈرائیونگ کے بعد سامنے ہی روڈ پر وہ دشمن جاں اسے نظر آ گئی کہ جس کی بے قرار محبت نے اس کا روں رواں توڑ کر رکھ دیا تھا۔

سامنے روڈ تقریباً خالی پڑا تھا۔ صرف اکا دکا گاڑیاں گزر رہی تھیں جبکہ وہ شدید پریشانی کے عالم میں ایک چھوٹے سے زخمی بچے کو گود میں لیے' بار بار اس کا خون سے لت پت چہرہ صاف کرتے ہوئے رو رہی تھی۔ ہاتھ اٹھا اٹھا کر گاڑیوں کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی مگر وہاں کوئی اس کی صدا پر کان دھرنے والا نہیں تھا۔

تب جیسے ہی اریج نے اپنی گاڑی اس کے قریب روکی' وہ لپک کر اس کی طرف بڑھی اور التجائیہ لہجے میں بولی۔

''ایکسکیوزمی...... دیکھیے ابھی ایک تیز رفتار گاڑی' میری آنکھوں کے سامنے اس چھوٹے سے بچے کو کچل کر آگے بڑھ گئی ہے' بچے کی حالت بہت خراب ہے' اگر اسے فوراً ہسپتال نہ پہنچایا گیا تو کچھ بھی ہو سکتا ہے' اس لیے پلیز میری مدد کیجئے' پلیز......''

خوبصورت چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور وہ اپنے ہاتھ جوڑے اس سے التجاء کر رہی تھی جب ایک بھی پل ضائع کیے بغیر، وہ تیزی سے بچے کی طرف لپکا اور اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا کر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ڈال دیا۔ یہ اس کے ذاتی استعمال کی وہ گاڑی تھی کہ جس کی سیٹ پر وہ ہلکی سی گرد کا پڑنا بھی گوارہ نہیں کرتا تھا مگر آج تمکین کی محبت میں' اسی گاڑی کی نفیس سیٹ پر ایک اجنبی بچے کا بکھرا ہوا خون بھی اسے برا نہیں لگ رہا تھا کیونکہ یہ دل کا معاملہ تھا اور دل کا معاملہ انسان کو ہر نفع و نقصان سے بے نیاز کر دیتا ہے تاہم جس وقت وہ لوگ ہسپتال پہنچے بچے کا خون زیادہ بہہ گیا تھا اوپر سے ڈاکٹر صاحبان اسے پولیس کیس قرار دے کر کسی بھی قسم کی مدد سے صاف انکاری ہو گئے تھے۔

حالانکہ اریج نے کتنا سمجھایا' بچے کی زندگی کے کتنے واسطے دیئے' اپنی اہمیت اور عہدے کا کتنا استعمال کیا مگر سب بے سود رہا' وہاں تو جیسے کوئی بھی ان کی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔

تب سخت بے بسی کے عالم میں تمکین نے اشعر کا موبائل نمبر پریس کیا اور اس کے کال ریسیو کرتے ہی تڑپ کر بولی۔

''اشعر' میں چلڈرن ہسپتال سے بات کر رہی ہوں' میری آنکھوں کے سامنے ایک بچہ گاڑی سے کچل کر شدید زخمی ہو گیا ہے میں اور اریج اسے ہوسپٹل لے آئے ہیں مگر یہاں کوئی بھی ہماری بات نہیں سن رہا ہے' سب اسے پولیس کیس قرار دے رہے ہیں' بچے کی حالت بہت سیریس ہے اشعر' اگر فوری میڈیکل ٹریٹمنٹ نہ ملی تو...... تو وہ مر جائے گا اشعر...... پلیز تم فوراً یہاں چلے آؤ' مجھے تمہاری ضرورت ہے، کچھ کرو اشعر پلیز......''

بات کرتے کرتے ہی وہ رو پڑی تھی، جب اسے اشعر کی آواز سنائی دی۔

''پلیز' کول ڈاؤن تمی' دیکھو میں اس وقت وہاں نہیں آ سکتا کیونکہ ابھی دبئی سے ایک نہایت اہم ڈیلی گیشن کے ساتھ میری اہم میٹنگ چل رہی ہے، میں انسپکٹر تنویر سے بات کر کے انہیں وہاں بھیجتا ہوں' تم پلیز حوصلے سے کام لو' اوکے' بائے......''

نہایت حلیم لہجے میں کہنے کے ساتھ ہی اس نے موبائل آف کر دیا۔ تو بے بس تمکین رضا دیوار سے ٹیک لگا کر رو پڑی جبکہ اس کے پہلو میں کھڑا خاموش سا اریج احمر چاہ کر بھی اسے رونے سے منع نہیں کر پایا کہ ایسا کرنا اب اس کے اختیار میں نہیں تھا، اور تھوڑی ہی دیر بعد انسپکٹر تنویر وہاں پہنچ گئے اور مزید کچھ دیر معاملے کی جانچ پڑتال کے بعد ڈاکٹرز کو آپریشن کا آرڈر دیا تو زخمی بچہ اپنی سانسیں پوری کر چکا تھا۔

''آئی ایم سوری مسز اشعر' بچہ تو مر چکا ہے......''

ڈاکٹر اسد نے بے سدھ پڑے بچے کی نبض چیک کرتے ہوئے کہا تو تمکین کے اعصاب پر گویا بجلیاں ہی گر پڑیں' تب پھٹی پھٹی آنکھوں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے وہ چلائی۔

''یہ بچہ مرا نہیں ہے ڈاکٹر آپ لوگوں نے مارا ہے اسے، میں زندہ لے کر آئی تھی اسے آپ کے پاس مگر آپ نے اس کی سانسیں چھین لیں، اسے آپ کے قانون نے موت کی نیند سلا دیا ہے ڈاکٹر آپ نے جان لی ہے اس کی......''

آپے سے باہر ہو کر وہ چلائی تھی جس پر ڈاکٹر اسد نے خفگی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے دھیرے سے سر جھٹک دیا۔

''مسز اشعر غالباً قانون سے واقف نہیں ہیں اسی لیے جذبات سے کام لے رہی ہیں آپ پلیز انہیں یہاں سے لے جائیے......''

رخ اریج کی طرف پھیر کر انہوں نے دھیمے لہجے میں کہا تھا لیکن تمکین پھر چیخ اٹھی تھی۔

''ہاں میں آپ کے قانون سے واقف نہیں ہوں کیونکہ آپ کا یہ اندھا قانون، کبھی کسی بے بس کا بھلا نہیں کرتا مگر آپ تو شاید انسانیت سے ہی واقف نہیں ہیں ڈاکٹر لوگ اپنا مسیحا مانتے ہیں آپ کو مگر آپ کسی کے مسیحا نہیں ہیں بلکہ بے رحم قاتل ہیں، گنہگار ہیں آپ......''

بچے کی غیر متوقع موت نے اس کے اعصاب کو بری طرح متاثر کیا تھا، تب ہی وہ اپنے حواس کھو بیٹھی تھی جس پر مجبوراً اریج کو اسے کندھوں سے تھام کر باہر گاڑی تک لانا پڑا پھر اسے گاڑی میں بٹھا کر واپس ڈاکٹر اسد اور انسپکٹر تنویر کے پاس چلا آیا۔ تب بچے کی ڈیڈ باڈی کے متعلق ضروری امور نمٹا کر تقریباً بیس پچیس منٹ کے بعد وہ گاڑی میں آ بیٹھا تو دیکھا کہ تمکین زاروقطار رو رہی تھی تب ایک لمحے کے لیے تو جیسے کسی نے اس کا دل مٹھی میں لے لیا، پھر اگلے ہی پل، وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولا۔

''پلیز کول ڈاؤن تمکین...... یہ حادثہ اسی طرح ہونا لکھا تھا تو ہم اسے کیسے بدل دیتے؟ اور پھر یہاں تو ہر روز نہ جانے ایسے کتنے ہی غریب بچے کسی نہ کسی گاڑی کے نیچے آ کر مر جاتے ہیں اب ہم کس کس کے لیے آنسو بہائیں۔''

''ہاں...... بالکل درست کہہ رہے ہیں آپ۔ یہ لاوارثوں کا ملک ہے ناں' اس لیے یہاں کسی کی حادثاتی موت پر آنسو بہانا جائز نہیں، اس ملک کے چھوٹے چھوٹے معصوم بچے جو دن بھر پیٹ کا دوزخ بھرنے کی فکر میں، اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے بڑی بڑی گاڑیاں صاف کرتے ہیں، مختلف ہوٹلوں، آئس کریم پارلروں، سڑک کے کناروں پر' کام کام اور صرف کام میں مگن رہتے ہیں، انہیں واقعی جینے کا کوئی حق نہیں، بہت اچھا قانون ہے ہمارا...... کسی کی قیمتی جان چلی جائے لیکن ہمارے اصول نہ ٹوٹیں، ہاں اسی طرح ترقی کریں گے ہم...... یہی بھائی چارا ہے ہمارا......''

بہت نڈھال لہجے میں اپنے ہی آپ بڑبڑاتے ہوئے وہ اسے بہت دکھی محسوس ہوئی تب ایک لمحے کے لیے اس کا دل چاہا کہ وہ ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لے وہ اپنا سارا رونا دھونا بھول جائے۔ مگر وہ چاہ کر بھی ایسا نہیں کر پایا اور گاڑی ''حسن ولاج'' کے گیٹ کے سامنے روک دی۔ پھر تمکین کو سہارا دے کر جب وہ لاؤنج سے واپس آیا تو پلٹتے ہی رخسانہ بیگم سے مڈبھیڑ ہوگئی اور تب بمشکل اپنی دھڑکنوں پر قابو پا کر وہ خاموشی سے واپس چلا آیا۔

☆☆☆

صبح صبح شاہ ولاج میں جو طوفان ماہم شاہ کی غلط بیانی کے باعث اٹھا تھا اس نے ازمیر اور صالحہ بھابھی کے ساتھ ساتھ گھر کے ہر فرد کو ڈیپریس کر دیا تھا' کسی سے بھی صالحہ بھابھی اور ازمیر کی ''خفیہ'' میٹنگ ہضم نہیں ہو رہی تھی' تب ہی صبح دس بجے کے قریب سائمہ خان وہاں چلی آئی اور اس کی اس طرح سے اچانک شاہ ولاج میں آمد نے ایک مرتبہ پھر ازمیر کی شخصیت پر سوالیہ نشان لگا دیا تب ازمیر نے ملامتی نظروں سے سب کو فرداً فرداً دیکھتے ہوئے سائمہ خان کا ہاتھ تھاما اور نرم لہجے میں بولا۔

''بھابھی نے آپ کی آمد کے متعلق بتایا تھا، ایکچو لی میں پچھلے دو تین گھنٹوں سے آپ کا ہی انتظار کر رہا تھا تا کہ آپ کے درشن ہو جائیں تو ہم اپنی انگلینڈ جانے کی تیاری کو فائنل ٹچ دے سکیں......'' بظاہر کھلنڈرا انداز تھا اس کا مگر سچائی یہ تھی کہ اس نے ایسے الفاظ کا انتخاب صرف اور صرف فرزانہ بیگم اور ماہم شاہ کو جلانے کے لیے کیا تھا لیکن ان کے جلنے کے ساتھ ساتھ اس کے الفاظ نے معصوم سی اریشہ کو بری طرح سے ہرٹ کر ڈالا جس کا اسے قطعی اندازہ نہ ہو سکا۔

پھر جس وقت وہ سائمہ خان کے ہمراہ گھر سے باہر نکل گیا غصے سے تپتی ہوئی فرزانہ بیگم خاموش کھڑی نورینہ بیگم کی طرف دیکھ کر چبھتے ہوئے لہجے میں بولیں۔

''دیکھ لیا آپا کہ گھر میں ہم سے چوری چھپے کیا کھچڑی پک رہی ہے آپ ہی بہت شریف سمجھتی تھیں ناں ازمیر کو اب دیکھ لیجئے اریشہ بٹی نے گھاس ڈالنا بند کر دیا تو محترم سائمہ خان کے خواب دیکھنے لگے' توبہ توبہ نہ جانے یہ لڑکا اس گھر میں کون کون سے طوفان لائے گا......''؟

اپنے گال پیٹتے ہوئے انہوں نے بہت ترش لہجے میں کہا تھا۔ جواب میں نورینہ بیگم کے دھیرے سے اثبات میں سر ہلانے پر نہ جانے کیوں حائقہ بیگم اور اریشہ دونوں کا دل تڑپ اٹھا جبکہ حسن کی دولت سے مالا مال' کسی موم کی گڑیا کی مانند خوبصورت سی سائمہ خان جونہی بے نیازی سے گاڑی کا فرنٹ ڈور کھول کر اس کے برابر میں بیٹھی اپنی کم مائیگی کے احساس میں مبتلا حیران سا ازمیر شاہ اس سے پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''آپ یہاں کیوں آ بیٹھی ہیں......؟ آئی مین راستے میں اگر آپ کی کوئی دوست مل گئی اور اس نے آپ سے میرے متعلق پوچھ لیا تو کیا جواب دیں گی آپ......؟''

ماہم کے تیکھے لہجے میں کہی، پرانی بات نے اچانک اس کے دل میں کروٹ لی تھی جواب میں نازک سی سائمہ خان نے قدرے حیرانی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''بہت انٹرسٹنگ سوال ہے آپ کا لیکن میں اپنی فرینڈز کو نہ تو یہ کہہ سکتی ہوں کہ آپ میرے فیانسی ہیں جیسے کہ عموماً لڑکیاں آپ جیسے نائس لڑکوں کی کمپنی پر اترا کر شو مارتی ہیں اور نہ ہی یہ کہہ سکتی ہوں کہ آپ میرے کزن ہیں سو یہی کہوں گی کہ آپ میری پیاری سی آپی کے بہت لاڈلے سے دیور ہیں جن سے وہ بے حد انسپائر ہیں اور جب بھی گھر آتی ہیں بس ان کے لبوں پر فقط آپ کا ہی ذکر خیر ہوتا ہے اور ان کے منہ سے میں نے آپ کے متعلق اتنا کچھ سنا ہے کہ خواہ مخواہ ہی آپ کو دیکھنے اور آپ سے ملنے کے لیے دل مچل اٹھا اور آج آپ سے مل کر واقعی مجھے آپ کے تبصروں کی صداقت کا یقین ہو گیا۔ آپ رئیلی بہت منفرد ہیں، بہت ٹھہراؤ ہے آپ کے اندر......''

نٹ کھٹ سی سائمہ خان نے اس کے سوال کو اپنے ہی انداز میں لیا تھا۔ تب ہی اس کا انداز بے حد شوخ اور بولڈ تھا جبکہ چپ چاپ سا ازمیر شاہ، فرسٹ ٹائم کسی حسین لڑکی کے منہ سے اپنے لیے اس قدر تعریفی کلمات سن کر گویا حیرت سے گنگ ہی رہ گیا۔

''لگتا ہے کہ آپ کو اپنی پرسنالٹی کے سحر کا اندازہ نہیں ہے، ہے ناں......؟''

اسے حیرانگی کے عالم میں ٹکر ٹکر اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ پھر چہکتے ہوئے بولی تھی، جواب میں ازمیر شاہ نے اپنی نگاہ اس کے حسین چہرے

سے ہٹا کر سامنے روڈ پر مرکوز کر دی پھر بہت دھیمے لہجے میں بولا۔

''فرض کیجئے کہ قسمت سے اگر آپ کی شادی مجھ جیسے کسی عام سی شکل وصورت والے لڑکے سے ہو گئی تو آپ کیا کریں گی......؟ کیا اس وقت بھی آپ کے احساسات یہی ہوں گے......؟''

کس قدر سہما ہوا لہجہ تھا اس کا، پتہ نہیں وہ اپنے کون سے شک کا یقین پانا چاہتا تھا تا ہم خوبصورت سی سائلہ خان نے اس کی نلافی آنکھوں میں بکھری سنجیدگی کو بغور دیکھتے ہوئے دوستانہ انداز میں کہا۔

''لیس......وائے ناٹ......اور پھر یہ تو قسمت کی بات ہے کہ انسان کی زندگی کو کب کس سے جوڑ دے ہاں اگر مجھے آپ جیسا ہم سفر مل گیا تو میں اپنے نصیب پر رشک کروں گی اور لوگ ہمارے کپل کو دیکھ کر کہیں گے، واہ! کیا جوڑی ہے۔''

بہت پر مسرت لہجے میں اس نے کہا تھا' پھر اپنے الفاظ کو خود ہی انجوائے کرتے ہوئے کھلکھلا کر ہنس پڑی تو ازمیر نے سرسری سا اس طرح بے مقصد ہنسنے پر استفہامیہ نگاہوں سے اسے دیکھا جس پر وہ قدرے نروس ہوتے ہوئے بولی۔

''آئی ایم سوری' میں نے کچھ زیادہ ہی خوش فہمی سے کام لے لیا' دراصل آپ کے ساتھ تو کوئی آپ جیسی نائس لیڈی ہی سوٹ کر سکتی ہے میرے جیسی کھلنڈری لڑکی تو قطعی نہیں جچے گی ویسے آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ اتنی خوبصورت ہو کر میں اپنے لیے ایسا کیوں کہہ رہی ہوں، ہے ناں......؟''

نہایت فری انداز میں بولتے ہوئے اس نے ازمیر سے پوچھا۔ تو اس نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''وہ بات یہ ہے ازمیر کہ اصل خوبصورتی انسان کے چہرے پر نہیں، بلکہ اس کے باطن میں ہوتی ہے۔ انسان کی اچھی عادتوں، اچھے اخلاق' اچھی سیرت' ان سب چیزوں کے سامنے' صورت تو بڑی ثانوی سی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔ اب دیکھیں ناں' بس شکل اچھی ہو لیکن سیرت اچھی نہ ہو تو اس اچھی شکل کا کیا اچار ڈالنا ہے۔ اس کی نسبت اچھی عادتوں کے ساتھ تو کسی بھی انسان سے' رفتہ رفتہ' سچی محبت ہو جاتی ہے، اور ایک مزے کی بات اور آپ کو بتاؤں کہ یہ جو محبت ہے ناں یہ اگر خوبصورت چہرہ دیکھ کر کی جائے تو بہت جلد اس کا بھرم ٹوٹ جاتا ہے جبکہ یہی محبت اگر کسی انسان سے اس کی اچھی عادتوں کی وجہ سے ہو جائے تو پھر انسان ان اچھی عادتوں کا اپنی زندگی میں اس قدر زیادہ عادی ہو جاتا ہے کہ چاہ کر بھی اپنی محبت کا محور بدل نہیں سکتا' ہے ناں......''

شفاف آنکھوں میں ڈھیر ساری مسرت لیے وہ اس سے تصدیق چاہ رہی تھی۔ جواب میں خاموشی سے ازمیر شاہ نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اریشہ کے بعد یہ دوسری حسین لڑکی تھی جس کے خیالات باقی عام لڑکیوں سے قطعی مختلف تھے۔ تب ہی وہ لوگ شاپنگ سے گھر واپس لوٹے تو بے قراری صالحہ بھابی نے اُسے سیڑھیوں پر ہی آواز دے کر روک لیا۔

''ازمیر......پلیز بتاؤ ناں کہ تمہیں سائلہ کیسی لگی......؟''

اُن کے بے قرار لہجے میں کتنی تشنگی چھپی ہوئی تھی جیسے اس کی ہاں یا ناں پر ان کی شخصیت کا مان ٹکا ہو۔

تب ازمیر شاہ نے دھیمے سے مسکرا کر ان کے ہاتھ تھام لیے پھر قدرے فریش لہجے میں بولا۔

''سائلہ چھی لڑکی ہے بھابی، بلکہ بہت اچھی لڑکی ہے......''

کہنے کے ساتھ ہی وہ اوپر اپنے کمرے کی طرف بھاگ گیا جبکہ نیچے برآمدے میں کھڑی اریشہ خان کا دل جیسے کٹ کر رہ گیا۔

☆☆☆

''دادا جی آپ......!''

انجشاء احمر کی دہلیز پر نگاہوں کے سامنے وہ اپنے دادا رؤف حسین صاحب کو دیکھ کر گویا مبہوت ہی تو رہ گیا تب ہی اسے دادا جی کے پیچھے انجشاء کی مانوس آواز سنائی دی۔

''کون ہے دادا جی......؟''

پشت پر پھیلے وہ اپنے سلکی بالوں کو جوڑے کی شکل میں لپیٹتے ہوئے دور سے ہی پکاری تھی پھر انہیں خاموش پا کر وہ جونہی دروازے کے قریب آئی نگاہوں کے بالکل سامنے عدنان رؤف کا مُتاستا سا چہرہ دیکھ کر بے حد حیران رہ گئی جبکہ پتھر بنے عدنان رؤف کو تو گویا اپنی بصارتوں پر یقین ہی نہیں آیا تھا۔ تب انجشاء نے آگے بڑھ کر دروازہ بند کر دیا پھر اپنے دادا جی کو کندھوں سے تھام کر اُن کے کمرے کی طرف لے جاتے ہوئے بولی۔

''آپ پلیز آرام کیجئے دادا جی ان لوگوں سے نمٹنا میں بخوبی جانتی ہوں......''

اُس کے سرد لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ رؤف حسین صاحب چاہ کر بھی اس سے کچھ کہہ نہیں پائے تھے وگرنہ ان کے دل میں عرصے کے بعد اپنے اکلوتے پوتے کو دیکھ کر کیسی ہلچل مچی تھی یہ صرف ان کا دل جانتا تھا مگر اپنی خوشی کے لیے انجشاء کو ہرٹ کر دینے کا تصور بھی نہیں تھا ان کے پاس تب ہی اس کی ہدایت پر چپ چاپ اپنے کمرے میں واپس چلے آئے۔

گزرا ہوا وقت دل میں کیسے نقب لگا گیا تھا کتنا انتظار تھا انہیں کہ کبھی تو حالات بدلیں گے، کبھی تو ان کی انجشاء اپنے گھر میں جا کر بسے گی مگر ان کا یہ خواب تا حال پورا نہیں ہو پایا تھا اور وہ آج بھی دل کے زخموں پر امید کے پھاہے لگائے اچھے وقت کے منتظر تھے۔

جبکہ حیرت سے گنگ عدنان رؤف خالی خالی سے ذہن کے ساتھ خود اپنا ہی وجود نہ سہارتے ہوئے، وہیں اس کی دہلیز کے باہر نیچے زمین پر بیٹھ گیا۔

قسمت نے کیسا جا کر طمانچہ لگایا تھا اس کے چہرے پر، کتنی انکشاف انگیز حقیقت تھی کہ کل جس لڑکی کو اس نے اپنے قابل نہ سمجھتے ہوئے بے دردی سے ٹھکرا دیا تھا آج وہی لڑکی اسے اپنے قابل نہیں سمجھ رہی تھی۔

کس قدر دکھ کا مقام تھا کہ اسے بالآخر اسی لڑکی سے محبت ہو گئی تھی کہ جس کا نام اپنے نام سے جڑا پا کر کبھی وہ آپے سے باہر ہو جایا کرتا تھا۔

اس روز وہ گھر کیسے واپس آیا۔ اسے قطعی خبر نہ ہو سکی آنکھوں کے ساتھ ساتھ پورا جسم بری طرح سے جل رہا تھا۔ تب اس رات اپنے آپ سے دیر تک الجھنے کے بعد وہ احمد رؤف صاحب کے کمرے میں چلا آیا۔ جو اس وقت کسی کتاب کے مطالعے میں بری طرح سے منہمک تھے جبکہ ان کے پہلو میں بیڈ پر لیٹی سیال بیگم سونے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''ارے...... عدنان بیٹے ......تم اس وقت یہاں......؟''

اور رؤف صاحب کی نظر اتفاقیہ طور پر جونہی اس کی طرف اٹھی وہ اسے دروازے سے لگ کر کھڑا دیکھ کر خاصی حیرانی سے بولے جس پر سیال بیگم بھی آنکھوں سے بازو ہٹا کر فوراً اس کی طرف دیکھنے لگی تھیں۔

''پ...... پاپا...... م...... میں کچھ کہنا چاہتا ہوں آپ سے......''

کتنی مشکل سے ہمت سمیٹ کر لڑکھڑاتے ہوئے اس نے کہا تھا جس پر احمد رؤف صاحب کو مزید حیرانی ہوئی جواب میں کتاب بند کر کے اپنی وہیل چیئر گھسیٹتے ہوئے وہ اس کے قریب آئے پھر اس کے ہاتھ تھامتے ہوئے نرمی سے بولے۔

''کہو نا بیٹے...... کیا بات ہے......؟''

اُن کے شفقت بھرے لہجے نے عدنان کی ڈھارس بندھائی تھی تب وہ نڈھال سے انداز میں وہیں ان کے قدموں میں بیٹھتے ہوئے بولا۔

''پاپا...... میں نے آج دادا جی کو دیکھا ہے' خود اپنی آنکھوں سے...... اسی شہر میں......''

''کیا......؟''

اس کے انکشاف نے رؤف صاحب کو گویا سر سے پیر تک ہلا کر رکھ دیا' تب ہی انہوں نے بے یقینی سے پوچھا تو عدنان نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ہاں پاپا...... دادا جی انجشاء احمر کے ساتھ، اسی شہر میں رہتے ہیں، انجشاء احمر کو تو جانتے ہیں ناں آپ، وہی جس نے مجھے روڈ سے اٹھا کر ہسپتال پہنچایا تھا......''

اس کا لہجہ اتنا مدھم تھا کہ کچھ ہی فاصلے پر بیٹھی سیال بیگم چاہ کر بھی اس کی بات نہیں سن پائیں۔

''عدنان...... تم انہیں یہاں کیوں نہیں لے کر آئے؟ اور تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا اس بارے میں......''

وہ حد سے زیادہ حساس ہو رہے تھے تب عدنان رؤف نے مختصر لفظوں میں انہیں ساری سچائی بتا دی جسے سن کر احمد رؤف صاحب تو شاکڈ ہی رہ گئے، کس قدر بے یقینی سے انہوں نے اپنے فرمانبردار اکلوتے بیٹے کی سمت دیکھا جیسے انہیں اس کے کسی بھی لفظ پر یقین نہ آ رہا ہو۔

''آئی ایم سوری پاپا...... ایم ریئلی سوری...... میں اپنی خواہشوں کے حصول میں اتنا اندھا ہو گیا تھا کہ مجھے اپنی خوشی کے سامنے اور کسی کی آرزو یا جذبات کی تو پرواہ ہی نہیں رہی تھی لیکن اب میں بالکل بدل گیا ہوں پاپا۔ اب میں واقعی دل سے انجشاء کو اپنانا چاہتا ہوں، پلیز بلیو می پاپا' پلیز......''

آنسوؤں سے تر چہرہ، گم صم سے احمد رؤف صاحب کا ہاتھوں پر رکھ کر وہ سسک پڑا تو گویا وہ ہوش کی دنیا میں واپس آئے پھر بے حد شکستہ انداز میں بولے۔

''اب پچھتانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے بیٹے کیونکہ تم تو خود ہی میری واپسی کے سارے دروازے بند کر آئے ہو میں ہمیشہ خود کو گنہگار سمجھتا رہا دن رات جلتا کڑھتا رہا اور تم میری بے بسی پر ہنستے رہے۔ اب میں کس منہ سے ان کے پاس جاؤں کہ تم نے تو مجھے اس قابل چھوڑا ہی نہیں ہے۔''
تھکن ان کے دھیمے لہجے میں نمایاں تھی تب عدنان رؤف نے جیسے تڑپ کر سر اوپر اٹھایا۔

''پلیز پاپا۔ ایسا مت کہیں ہاں میں جانتا ہوں کہ میں گمراہ ہو گیا تھا، نہ جانے کیوں یہ سمجھ بیٹھا کہ دیہات میں بسنے والے لوگوں کو شہر والوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کا سلیقہ نہیں ہوتا میں یہ بھول بیٹھا تھا پاپا کہ کسی بھی جگہ رہنے والے انسان کو تمیز تو اس کی اچھی پرورش سکھاتی ہے، زندگی کا رہن سہن تو اس کی اچھی عادتوں پر منحصر ہوتا ہے، شعور تو اسے تعلیم دیتی ہے، گاؤں یا شہر کا ماحول نہیں، پلیز پاپا...... پلیز مجھے معاف کر دیں ورنہ میں جی نہیں پاؤں گا پاپا۔ پلیز......''

بری طرح سے آنسوؤں کو پیتے ہوئے وہ ایک مرتبہ پھر گڑگڑایا تھا، تب سیال بیگم بیڈ سے اتر کر اس کے قریب آئیں پھر اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

''ڈونٹ وری عدی بیٹے...... تم اپنے آپ کو ہلکان مت کرو، جہاں تک تمہاری کوتاہیوں کا سوال ہے تو اس میں کہیں نہ کہیں تھوڑا بہت قصور میرا بھی نکلتا ہے کیونکہ تمہاری ہر غلطی پر بجائے تمہاری اصلاح کرنے کے میں نے ہمیشہ تمہاری حوصلہ افزائی کی لہٰذا اب تمہاری یہ خوشی بھی میں ہی پوری کروں گی چاہے اس کے لیے مجھے انجشاء کے پاؤں ہی کیوں نہ پڑنا پڑے......''

کس قدر استقامت تھی ان کے لہجے میں، تب عدنان رؤف ان کے ہاتھ تھام کر سکون سے پلکیں موند گیا تو نہ جانے کب سے بے قراری کی آگ میں جلتے رؤف صاحب کو بھی یک گونہ سکون نصیب ہوا۔

☆☆☆

شام کو اشعر واپس گھر لوٹا تو اپنی بزنس ڈیل فائنل ہو جانے پر بے حد مسرور تھا، تب ہی شوخ سی دھن گنگناتے ہوئے اپنے کمرے کی جانب بڑھنے لگا تو ملازم نے اسے تازہ اطلاعات باہم پہنچاتے ہوئے باخبر کیا۔

''صاحب...... گھر میں اس وقت کوئی بھی نہیں ہے، بڑی بیگم صاحبہ اور چھوٹی بیگم صاحبہ دونوں حسن ولاج میں ہیں......''

''کیوں......؟'' اسے اس غیر متوقع اطلاع پر تھوڑی سی حیرانگی ہوئی تھی کیونکہ آج اسے تمکین کے ساتھ ڈنر کے لیے باہر جانا تھا اور یہ پروگرام خود تمکین نے ہی فائنل کیا تھا۔

''وہ تو صاحب ہمیں نہیں معلوم......''

سیدھے سادھے سے ملازم نے مدہم لہجے میں معذوری ظاہر کی تو وہ الجھا الجھا سا حسن ولاج چلا آیا۔

''مما.....نمی کہاں ہے.....؟''

لاؤنج میں داخل ہوتے ہی اس نے رخسانہ بیگم سے پوچھا تھا جواب میں انہوں نے بری طرح سے اسے لتاڑ دیا۔

''اب خیال آیا ہے تمہیں نمی کا اور دن بھر سے کہاں تھے تم؟ نہ تمہارا موبائل نمبر مل رہا تھا اور نہ آفس والے بات کرواتے تھے کہ صاحب بزی ہیں.....''

وہ خاصی بھری بیٹھی تھیں جس پر اشعر کو قدرے ندامت کے ساتھ ساتھ تھوڑی سی پریشانی نے بھی آگھیرا۔

''لیکن بات کیا ہے مما' آپ پلیز بتائیں ناں.....'' وہ قدرے جھنجلا گیا تھا۔

تب رخسانہ بیگم نے مختصر لفظوں میں وہ ساری کہانی اُس کے گوش گزار دی جو تمکین کی معرفت ان کے علم میں آئی تھی۔

''اوہ! ایک تو یہ لڑکی بھی حد سے زیادہ ایموشنل ہو جاتی ہے۔ اب یہاں تو ہر روز نہ جانے کتنے لوگ ایسے ہی مر جاتے ہیں اب ہم ان سب کے لیے اپنی روزی کو ٹھوکر مارتے رہے تو ہو گیا گزارا.....''

اسے اپنی بے نیازی پر ذرا سا بھی ملال نہیں تھا اور نہ ہی اس غریب بچے کی موت کا کوئی افسوس ہوا اسے کہ جس کے لیے تمکین کا نروس بریک ڈاؤن ہوتے ہوتے بچا تھا۔

''بہرحال.....اس وقت کہاں ہے نمی.....''

دونوں ہاتھ بالوں میں پھیر کر وہ قدرے نرم پڑتے ہوئے بولا تو رخسانہ بیگم نے اسے بتایا۔

''آرام کر رہی ہے دوسرے کمرے میں' دن بھر سے بے ہوش تھی' ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی ہوش آیا ہے اسے۔''

رخسانہ بیگم کی اطلاع پر وہ فوراً نمی کے کمرے کی طرف چلا آیا' جو اس وقت بیڈ پر لیٹے ہوئے نہ جانے کن سوچوں میں گم تھی۔

اشعر مسکرا کر بیڈ پر اس کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولا۔

''اب کیسی طبیعت ہے نمی.....؟'' لیکن اس نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا' نہ کوئی جواب دیا۔

''ناراض ہو گیا.....؟''

اسے خفا خفا سا' خود سے بے نیاز پا کر' اس نے اپنا سر اس کے کندھے سے نکاتے ہوئے دوبارہ پوچھا مگر اس بار بھی تمکین نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔

''دیکھو نمی' میں تم سے ہزار مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ تم مجھ سے لڑ لیا کرو مگر اس طرح ناراض نہ ہوا کرو نہیں سہہ سکتا میں تمہاری ناراضگی' مگر پھر بھی تم.....بہرحال! بتاؤ کیا ہوا ہے' ناراض کیوں ہو تم.....؟''

وہ ایسے شو کر رہا تھا جیسے اسے تو کسی بات کی خبر ہی نہ ہو' تب ہی قدرے تپ کر بولا تھا جواب میں تمکین نے کسی قدر شکایتی انداز میں اس کی طرف نگاہ کی پھر سرد لہجے میں بولی۔

''میں کیوں ہونے لگی تم سے ناراض، میرا حق ہی کیا ہے تم پر......؟''

ناچاہنے کے باوجود بھی اس کی آواز بھیگ گئی تھی جس پر اشعر کو مزید غصہ آ گیا۔

''پلیز نمی، بات کا بتنگڑ مت بنایا کرو ایک تو میں پہلے ہی آفس سے تھکا ہوا آتا ہوں، اوپر سے گھر آ کر تمہاری یہ روتی بسورتی شکل مزید تھکا ڈالتی ہے۔''

نہایت جھنجلا کر وہ بولا تھا اور اس کے الفاظ سیدھے تیر کی مانند تمکین کے دل کو کاٹ گئے تب ہی وہ چلا اٹھی۔

''تو بدل لو ناں یہ شکل، لے آؤ میری جگہ کوئی اور......''

وہ رونا نہیں چاہتی تھی مگر رو پڑی تھی جواب میں اشعر نے کن اکھیوں سے اس کی طرف دیکھا پھر نرم لہجے میں بولا۔

''فار گاڈ سیک نمی...... کیا ہو جاتا ہے تمہیں......؟ اور پھر اریج تھا ناں تمہارے ساتھ...... تم اکیلی تو نہیں تھیں'' اپنی طرف سے بچاؤ کا ایک اور جواز ڈھونڈا اس نے مگر تمکین اس کے جواز سے شانت نہیں ہوئی تب ہی مچل کر بولی۔

''اریج شوہر نہیں ہے میرا...... وہاں مجھے تمہارے ساتھ کی ضرورت تھی اریج کی نہیں۔''

''اوکے...... پلیز کول ڈاؤن۔''

اس کے بلند آواز میں چلانے پر اشعر نے فوراً گھبرا کر کہا، پھر اس نے اپنی چیک بک نکال کر ایک چیک پر پانچ لاکھ کا اکاؤنٹ بھرا پھر وہ چیک تمکین کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''میں اپنی کوتاہی کے لیے معذرت خواہ ہوں نمی، لیکن تم ہی بتاؤ کہ اس حادثے میں میرا یا تمہارا قصور کہاں نکلتا ہے ہم اگر چاہیں بھی تو سب لوگوں کے ذہن ان کے بے حس دل بدل نہیں سکتے اور نہ ہی ہمارا دکھ اس غریب بچے کو دنیا میں واپس لا سکتا ہے، لہٰذا یہ کچھ روپوں کا چیک ہے جو ہم اس غریب بچے کے گھر والوں کو دے کر ان کی زندگی میں تھوڑی آسانی پیدا کر سکتے ہیں کہ اب دل کو قرار پہنچانے کا، یہی ایک واحد ذریعہ ہے ہمارے پاس......''

اپنا ہاتھ اس کے کندھوں کے گرد پھیلاتے ہوئے وہ نرمی سے بولا تو تمکین اس کے سینے پر سر ٹکا کر پھر سے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی جیسے اس بچے کی موت اسے بھلائے نہ بھول رہی ہو تب اشعر نے نہایت نرمی کے ساتھ اسے خود سے الگ کرتے ہوئے دھیمے دھیمے لہجے میں کہا۔

''پلیز بس کرو نمی...... اور کتنا روؤ گی تم...... دیکھو تمہاری آنکھیں مسلسل رونے سے کس قدر سرخ ہو رہی ہیں چلو اب اٹھو ہم اس بچے کے گھر چلتے ہیں اور واپسی میں ڈاکٹر اسد سے بھی دو دو ہاتھ کر کے آتے ہیں، اوکے......'' اس کے آنسو خود اپنے ہاتھوں سے پونچھتے ہوئے اس نے کہا، پھر اس کے دھیرے سے اثبات میں سر ہلانے پر سکون کی سانس بھرتے ہوئے خود بھی فریش ہونے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

پھر بیگم روڈ کے قریب واقع اس بچے کے گھر جا کر انہوں نے تعزیت بھی کی اور پانچ لاکھ روپے بھی بچے کے والد کے ہاتھ پر رکھ دیئے تو اپنے بچے کے دکھ میں نڈھال وہ لوگ ان کا شکریہ ادا کرتے نہ تھک رہے تھے کہ جنہوں نے انسانیت کے ناطے ان کے بچے کے لیے اتنا کچھ کیا تھا۔

پھر گھر واپسی سے قبل اشعر تمکین کا دل بہلانے کی غرض سے اسے پورا شہر گھماتا رہا اور پھر وہ اسے ایک اچھے سے ریستوران میں آئس کریم کھلانے کے لیے لے آیا تو وہیں ان کی ملاقات اریج احمر سے ہوگئی، جو اپنی ٹیبل پر الگ تھلگ سا بیٹھا نہ جانے کن سوچوں میں گم تھا تب دیر تک اشعر اور اریج تو بچے اور بزنس کے متعلق گفتگو کرتے رہے اور تمکین خاصی توجہ سے اریج کی خوب صورت بادامی آنکھوں میں تیرتے دکھ کی کہانی میں الجھی رہی کہ جس نے اریج احمر کو بہت دل کش سا بنا دیا تھا اس روز نہ جانے کیوں رات گئے تک اریج کی آنکھوں میں چھپا یہی درد اسے مسلسل ڈسٹرب کرتا رہا اور وہ پوری رات سو نہ پائی۔

اگلے کچھ ہی دنوں میں اشعر کی سالگرہ تھی جسے سعید صاحب اور رخسانہ بیگم وسیع پیمانے پر ارینج کرنا چاہتے تھے، تب ہی نزدیک دور کے کافی سارے لوگوں کو انوائٹ کر لیا جس میں اریج احمر کی شرکت خصوصی تھی کہ وہ اشعر کے بیسٹ فرینڈز کی لسٹ میں سب سے ٹاپ پر تھا۔

شیزا چونکہ کافی روز پہلے ہی حسن ولاج میں آچکی تھی لہٰذا اسے اپنی تیاری کے لیے کافی ٹائم مل گیا ویسے بھی وہ اب پہلے کی نسبت کافی خاموش رہنے لگی تھی بقول عائشہ بیگم نہ جانے سارا دن یہ لڑکی اپنے کمرے میں گھسی کیا کیا لکھتی رہتی ہے......؟

بڑی ماں کا یہ انکشاف اشعر اور تمکین دونوں کے لیے حیران کن تھا لیکن انہوں نے اس طرف زیادہ توجہ نہیں دی اور اپنی ہی موج میں گم رہے۔

اشعر کی برتھ ڈے پر اریج جان بوجھ کر خاصی تاخیر سے پہنچا جس پر اشعر نے خفگی کا اظہار بھی کیا لیکن اس نے بہت آسانی کے ساتھ ایکسکیوز کر کے اسے شانت کر دیا۔

پھر جب پارٹی اسٹارٹ ہوگئی اریج حسب عادت سب دوستوں سے مل ملا کر ایک نسبتاً پر سکون سی جگہ پر تنہا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کی اداس نگاہیں مسلسل تمکین کے خوبصورت چہرے پر مرکوز تھیں جو ایک آف وائٹ کریپ کی ساڑھی میں ملبوس تھی۔ جس پر نہایت خوبصورتی کے ساتھ مکیش کا کام کیا ہوا تھا ساڑھی کا پلو اور بلاؤز خصوصی خوبصورتی کا مرکز تھے جبکہ وہ گلاب کے پھول کی مانند کھلی کھلی آج نظر لگ جانے کی حد تک پیاری لگ رہی تھی اور اس کے پہلو میں کھڑا انٹ کھٹ سا اشعر احمد بات بات پر کھلکھلاتا گہرے تھری پیس سوٹ میں ملبوس نفاست سے تیار ہوئے غضب ڈھا رہا تھا بلاشہ ان دونوں کے کپل کو لاجواب قرار دیا جاسکتا تھا۔

مگر وہ اپنے دل کا کیا کرتا کہ جہاں اب درد نے مستقل ڈیرا جما لیا تھا اور وہ اس درد سے لڑتے لڑتے نڈھال ہو رہا تھا۔ خود کو سنبھالتے سنبھالتے تھک رہا تھا۔

اسی پل رخسانہ بیگم نے تمکین کو کسی کام سے بلایا اور اریج نے دیکھا کہ اب وہاں اشعر کے پہلو میں تمکین کی جگہ شیزا احمد کھڑی تھی جس نے بغیر آستینوں کے نیٹ کا بلیک سوٹ زیب تن کر رکھا تھا اور اس کا دوپٹہ بے نیازی سے کندھے پر جھول رہا تھا۔ کھلے گلے کی وجہ سے اس کا سینہ بڑے کھلے پن سے واضح دکھائی دے رہا تھا اور وہ بلاشبہ اس سے قطعی بے خبر نہیں تھی۔ اشعر اب ہنس ہنس کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے باتیں کر رہا تھا جبکہ دور بیٹھے اریج احمر کا دل جیسے سکڑ کر رہ گیا۔

یہ حقیقت تھی کہ اس نے تمکین رضا سے بالکل سچی محبت کی تھی اس کے قرب کی تمنا بھی جاگی تھی دل میں، مگر وہ جان گیا تھا کہ تمکین کی خوشی اشعر کے پیار میں ہے' سو اس حقیقت کے انکشاف کے بعد اس نے اپنی محبت کو درمیان سے سمیٹ لیا تھا کیونکہ سچی محبت کرنے والوں کے لیے اپنی خوشی سے کہیں بڑھ کر محبوب کی خوشی اہم ہوتی ہے سو اس نے تمکین کے لبوں پر کھلتے گلابوں کے صدقے اپنی آرزوؤں کا گلہ گھونٹ دیا مگر اب ان دونوں کے پیار میں شیزا احمد کو دیکھ کر نہ جانے کیوں وہ چونک اٹھا تھا کیونکہ اس نے بارہا شیزا احمد کو اشعر سے قریب ہونے کی کوشش کرتے دیکھا تھا اور اس کی یہ حرکتیں نادانستہ طور پر قطعی نہیں تھیں۔ تب ہی اس کے اندر خطرے کے الارم بج اٹھے تھے مگر وہ یہاں بھی بے بس تھا کیونکہ تمکین کی مانند اسے اشعر کے بھی پرسنل معاملے میں ٹانگ اڑانے کا کوئی حق نہیں تھا۔

اور نہ ہی وہ ایسے کسی خدشے کا تمکین سے اظہار کر کے اس کی خوشگوار زندگی میں کوئی زہر گھولنا چاہتا تھا سو خاموشی سے یہ تماشہ دیکھتا رہا جہاں نگاہوں کے بالکل سامنے شیزا احمد بہانے بہانے سے اپنا کندھا اشعر کے کندھے کے ساتھ ٹچ کر رہی تھی۔ کبھی کھلکھلاتے ہوئے اپنا سر اس کے شانوں پر دھر رہی تھی تو کبھی اس کا بازو تھام کر اسے اپنی فرینڈز سے متعارف کروا رہی تھی جانے اس وقت اسے یہ کیوں لگ رہا تھا کہ کہیں نہ کہیں یہ تمکین کی بیسٹ فرینڈ معصوم سی تمکین کے حق پر ڈاکہ ڈالنے کی کوشش کر رہی ہے، اور وہ جانے کب تک انہی خیالوں میں کھویا رہتا کہ اچانک تمکین نے وہاں آ کر اسے چونکا ڈالا۔

''ارے۔ مسٹر اریج...... آپ یہاں تنہا کیوں بیٹھے ہیں......؟''

وہ اس کے سر پر کھڑی اس سے پوچھ رہی تھی جواب میں اریج نے چونک کر اسے دیکھتے ہوئے دھیرے سے نفی میں سر ہلا دیا پھر بمشکل لبوں پر بے جان سی مسکراہٹ پھیلاتے ہوئے بولا۔

''کچھ نہیں......بس یونہی شور ہنگاموں سے الرجی ہے، مجھے بہرحال آپ کو تو اشعر کے ساتھ ہونا چاہئے پھر یہاں کہاں پھر رہی ہیں آپ......؟''

دل کی بات وہ لبوں پر لے ہی آیا تھا۔ مگر تمکین اس کے لہجے کی گہرائی کو نہ ناپ سکی تب ہی بے نیازی سے بولی۔

''میں اسی کے ساتھ تو تھی صبح سے لیکن اب آپ کو یہاں الگ تھلگ سا بیٹھے ہوئے دیکھا تو ادھر چلی آئی، ویسے میں اگر آپ سے ایک پرسنل سا سوال پوچھوں تو آپ مائنڈ تو نہیں کریں گے ناں......''

اس کے سامنے ہی کرسی گھسیٹ کر اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے اس نے کہا تھا، جواب میں اریج نے دھیرے سے نفی میں سر ہلا دیا' تب تمکین نے بھرپور دلچسپی سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''جب میں فرسٹ ٹائم آپ سے ملی تھی تو آپ اتنے دکھی نہیں لگے تھے مجھے' لیکن اب پچھلے تین چار ماہ سے میں نہ جانے کیوں آپ کی آنکھوں میں ایک عجیب سا درد تیرتے ہوئے دیکھ رہی ہوں' حتیٰ کہ اپنی شادی والے دن بھی میں نے آپ کو بہت دکھی پایا تھا' یہ سب کیا ہے مسٹر اریج......؟ آپ پہلے تو ایسے نہیں تھے۔''

اس کے دل کے حال سے قطعی بے خبر اس نے جو سوال اریج احمر سے پوچھا تھا اس کے جواب میں وہ سر سے پاؤں تک ہل کر رہ گیا۔ اب وہ اسے کیا بتاتا کہ یہ درد خود اسی کی دین ہے تب ہی خود کو سنبھالتے ہوئے پھیکی سی مسکراہٹ لبوں پر پھیلاتے ہوئے بولا۔

''یہ سب آپ کا وہم ہے ورنہ میں تو شروع سے ہی ایسا ہوں' بہر حال آپ میری فکر کرنا چھوڑیے اور اشعر کی فکر کیجئے' کیونکہ وہاں اس کے پہلو میں آپ کی بیسٹ فرینڈ اپنی جگہ بنا رہی ہے.....''

بظاہر اس نے ہنسی مذاق میں کہا تھا مگر حقیقت میں وہ اسے ممکنہ خطرے سے آگاہ کرنا چاہتا تھا، تب ہی یہ بات چھپا نہ سکا تو قدرے چونک کر اس کی سمت دیکھتی ہوئی تمکین رضا اگلے ہی پل وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی' پھر دو ہی قدم اٹھا کر واپس پلٹتے ہوئے بولی۔

''لو میں تو بھول ہی گئی کہ میں یہاں انجشاء کے متعلق پوچھنے آئی تھی۔ کہاں ہے وہ..... آج اس تقریب میں آپ کے ساتھ آئی کیوں نہیں.....؟''

''آئی ڈونٹ نو..... میں انہیں ہر وقت اپنے ساتھ نہیں رکھتا۔ ویسے ان کے گھر فون کیا تھا میں نے وہاں سے پتہ چلا کہ انہیں تیز بخار ہے جس کی وجہ سے وہ کہیں نہیں جا سکتیں' سو اب یہاں اس تقریب سے فراغت کے بعد میرا ارادہ انہی کی طرف جانے کا ہے۔''

کندھے اچکا کر خاصے لاتعلق سے انداز میں اس نے کہا تھا جس پر تمکین فوراً فکر مند ہو گئی۔

''اوکے..... آپ پلیز وہاں جائیں تو میری طرف سے بھی خیریت پوچھئے گا۔ بعد میں اس تقریب سے فراغت پاتے ہی میں اور اشعر بھی اس کی طرف جائیں گے.....''

جاتے جاتے اس نے کہا تھا جواب میں اریج نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا جبکہ ان کی اس طویل گفتگو کو شیزا نے کس رنگ میں اشعر کو دکھایا تمکین کے فرشتوں کو بھی اس کی خبر نہیں ہو سکی تھی۔

☆☆☆

شاہ ولاج میں صالحہ بھابھی کے فیصلے اور سائلہ خان کی آمد سے جو طوفان اٹھا تھا وہ فرزانہ بیگم اور ماہم شاہ کی مہربانیوں کے طفیل ابھی تک تھما نہیں تھا بلکہ سائلہ خان کے گھر واپس جاتے ہی مزید شدت اختیار کر گیا تھا۔ فرزانہ بیگم اور ماہم شاہ کو شروع سے ہی ازمیر شاہ سے تو خدا واسطے کا بیر تھا ہی، لیکن اب صالحہ بھابھی کے زبردست طمانچے کے باعث وہ اور ان کی بہن سائلہ خان بھی فرزانہ بیگم کے عتاب کا نشانہ بنی ہوئی تھیں۔

آج ازمیر کے انگلینڈ واپس جانے کی وجہ سے سبھی لوگ آفس سے جلد آ گئے تھے جبکہ وہ خود اوپر اپنے کمرے میں بیٹھا چپ چاپ یہ سارا تماشہ دیکھ رہا تھا اس کی فلائٹ میں ابھی چھ گھنٹوں کا وقت باقی تھا، اور اسے ان چھ گھنٹوں میں کوئی بھی فیصلہ کر کے صالحہ کی پُر خلوص ذات کو فرزانہ بیگم کے عتاب سے چھٹکارہ دلانا تھا۔ تب ہی جب اُس نے ارسلان بھائی کو صالحہ بھابھی پر چلاتے ہوئے سنا تو اس سے رہا نہ گیا اور وہ خاموشی سے اٹھ کر نیچے ہال میں چلا آیا جہاں اس وقت گھر کے سبھی لوگ کھڑے چپ چاپ تماشہ دیکھ رہے تھے جبکہ نڈھال سی صالحہ بھابھی ایک طرف کھڑی آنسو بہا رہی تھیں۔ ''پاپا میں آج کی انگلینڈ کے لئے سیٹ کینسل کروار رہا ہوں۔''

نیچے آ کر وہ سیدھا احسن شاہ صاحب سے مخاطب ہوا تھا۔ جواب میں سب نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔

''ہاں پاپا...... میں فی الحال ایک دو روز تک انگلینڈ نہیں جا رہا......''

احسن صاحب کو حیران کن نگاہوں سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر اس نے کہا تھا۔

''لیکن کیوں بیٹے...... کل تک تو تمہارا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا......''

احسن صاحب کو اس کے اچانک فیصلے سے حد درجہ حیرت ہوئی تھی۔

''ہاں پاپا...... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں، کل تک واقعی میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر آج صالحہ بھابھی کی چھوٹی بہن سائلہ خان سے مل کر میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ پہلے ''شاہ ولاج'' اور آپ لوگوں کو ایک خوشخبری سنا دوں پھر اس کے بعد انگلینڈ فلائی کروں......''

نہایت تحمل سے اس نے کہا تھا' جواب میں احسن شاہ صاحب نے پھر چونک کر اس کی طرف دیکھا ''کیسی خوشخبری بیٹے......؟ تم کھل کر کہو نا کہ کیا کہنا چاہتے ہو......''

اُس کی مبہم گفتگو نے انہیں خاصا الجھا ڈالا تھا، تب ہی ازمیر نے ایک مسکراتی نظر غصے سے سرخ فرزانہ بیگم پر ڈالتے ہوئے ریلیکس انداز میں کہا۔

''پاپا...... میں سائلہ خان...... سے منگنی کرنا چاہتا ہوں' جلد از جلد......''

''وہاٹ......''

اس کے الفاظ نے گویا وہاں موجود ہر فرد کو دھچکا لگا دیا تھا جس لڑکی کی وجہ سے صبح سے ان کے گھر میں فساد مچا تھا اب ازمیر اسی لڑکی کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کا کہہ رہا تھا۔

''ہاں پاپا...... میں انگلینڈ جانے سے قبل یہ رسم ادا کرنا چاہتا ہوں اور اس کے لیے مجھے کسی کی پسند و ناپسند سے کوئی غرض نہیں ہے' اسپیشلی

فرزانہ آنٹی کے اعتراض سے تو قطعی نہیں، کیونکہ یہ زندگی کے کسی بھی موڑ پر مجھے اور میری مما کو مسکراتے ہوئے نہیں دیکھ سکتیں۔ لہٰذا میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ صالحہ بھابھی کے گھر جائیں اور سائلہ کو پورے استحقاق کے ساتھ میرے لیے مانگیں کہ یہ میری صالحہ بھابھی کی خوشی کا سوال ہے......"

کسی قدر ریلیکس انداز میں کہتے ہوئے وہ صالحہ بھابھی کی طرف پلٹ آیا' جو حیرانگی سے اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔

''بھابھی! اب تو خوش ہیں ناں آپ......؟ دیکھئے میں نے وہی فیصلہ کیا ہے جو آپ چاہتی تھیں اس لیے پلیز' اب تو یہ آنسو پونچھ لیجیے......"

انہی کا آنچل تھام کر وہ انہیں تھماتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا تو صالحہ بھابھی کی آنکھیں مارے خوشی کے پھر سے بھر آئیں۔

''بھابھی! آپ جانتی ہیں میں جانتا ہوں اور ہمارا خدا جانتا ہے کہ آپ بالکل میرے لیے میری مما کی طرح قابل احترام ہیں۔ میرے دل نے ہمیشہ آپ کو سگی بہنوں کی مانند تسلیم کیا ہے اس لیے خواہ کوئی کتنے ہی گھٹیا انداز سے ہمارے بارے میں سوچے ہمیں کسی کی پروا نہیں ہونی چاہیے کیونکہ اس دنیا میں ہر انسان اپنے سوچنے بولنے کے معاملے میں قطعی آزاد ہے' ہم زبردستی کسی کو اچھا سوچنے یا بولنے کے لیے مجبور نہیں کر سکتے ہاں جہاں تک سائلہ کا سوال ہے تو ٹھیک ہے صرف آپ کی خوشی کے لیے میں ابھی اور اسی وقت اس سے منگنی کرنے کو تیار ہوں، بنا کسی کی اجازت اور مرضی کے پلیز اب تو آنسو پونچھ لیں۔"

ان کا پلو تھامے تھامے وہ خاصے ملتجی انداز میں بولا تو گم صم سے کھڑی صالحہ بھابھی آنسوؤں سے بھری آنکھوں کے باوجود ہنس پڑیں۔

''میں جانتی تھی چندا کہ تم میرا مان کبھی نہیں توڑو گے اور تم سے ایک بھائی اور بیٹے کی حیثیت سے میرا جو پیار ہے مجھے اس پر کوئی شرمندگی نہیں، اس لیے خواہ کوئی کچھ بھی کہے مجھے پروا نہیں ہاں سائلہ کے لیے حامی بھر کر تم نے مجھے جو خوشی دی ہے اس کے لیے میں واقعی تمہاری ممنون ہوں تاہم میں تمہارا اور سائلہ کا بندھن اس گھر کے بزرگوں کی باہمی رضا سے ہی باندھوں گی کیوں حائقہ آنٹی' آمنہ آنٹی' بلال انکل' احسن انکل اور پاپا...... آپ سب اس رشتے پر راضی ہیں ناں......؟"

ازمیر کا ہاتھ تھام کر وہ فرزانہ بیگم کو قطعی نظر انداز کرتی' دیگر افراد کی طرف رخ پھیر کر بولیں تو تھوڑی سی کشش و پنج کے بعد آفاق شاہ نے آگے بڑھ کر ان کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا پھر ازمیر کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے دھیرے سے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا تو فرزانہ بیگم اپنی جگہ پر جل کر رہ گئیں۔

آفاق شاہ کی رضامندی کے بعد بلال شاہ اور احسن شاہ نے بھی اس رشتے پر رضامندی کا اظہار کر دیا اور حائقہ بیگم نے دل سے صالحہ بھابھی کے فیصلے کو سراہتے ہوئے ان کا ماتھا چوم لیا تو وہ ایک دم سے ہلکی پھلکی ہو کر مسکرا دیں تب ارسلان احمد شاہ نے بھی آگے بڑھ کر ان سے معذرت کر لی تو ان کی روح حقیقی معنوں میں سرشار ہو گئی جبکہ ان سے کچھ ہی فاصلے پر کھڑی فرزانہ بیگم اور ماہم شاہ تو یوں حیرت سے صالحہ بھابھی اور ہمیشہ جلی کٹی سن کر خاموش رہنے والے ازمیر شاہ کو دیکھ رہی تھیں گویا ان کی اس قدر جرأت پر بے ہوش ہی تو ہو جائیں گی۔

ماہم اور اس کی دیگر ہم خیالوں کے تو گمان میں بھی دور دور تک یہ نہیں تھا کہ ازمیر شاہ جیسے عام سی شکل وصورت والے لڑکے کو سائلہ خان جیسی پری نصیب ہو جائے گی، تب ہی وہ اک ٹرانس کی سی کیفیت میں وہاں سے کھسک گئی جبکہ ایک کونے میں مسلسل گم صم سی کھڑی اریشہ خان کی امید کا گویا آخری دیا بھی بجھ گیا۔ اس وقت ازمیر کے فیصلے کے بعد اس کا معصوم سا دل یوں کرچی کرچی ہو کر بکھر گیا کہ خود اس سے بھی اپنے دل کے ٹکڑے چننا دشوار ہو گیا۔

☆☆☆

وہ اتوار کا دن تھا اور انجشاء خاصی مصروفیت کے عالم میں گھریلو اشیاء کی خریداری کی لسٹ بنا رہی تھی، جب بے قرار سے عدنان رؤف کی شاندار گاڑی ایک مرتبہ پھر اس کے دروازے پر آ کر رکی مگر اس مرتبہ وہ اکیلا نہیں تھا بلکہ احمد رؤف صاحب اور سیال بیگم اس کے ہمراہ تھے تب ہی اس کی بیل کے جواب میں جب انجشاء نے دروازہ کھولا تو وہ اس کے ساتھ احمد رؤف صاحب اور سیال بیگم کو دیکھ کر چاہنے کے باوجود اس کے منہ پر دروازہ بند نہ کر سکی۔

''آیئے پلیز......''

قطعی بیگانگی سے دروازے کی ایک سمت میں ہو کر اس نے گم صم سے احمد رؤف صاحب سے کہا جن کی آنکھیں اسے اپنے سامنے دیکھتے ہی پل میں بھر آئی تھیں پھر ان لوگوں کے گھر میں داخل ہونے کے بعد وہ دروازہ بند کر کے انہیں اپنے چھوٹے سے ٹی وی لاؤنج میں ہی لے آئی' جہاں بیٹھ کر وہ ابھی کچھ دیر پہلے چند گھریلو اشیاء کی خریداری کی لسٹ بنا رہی تھی۔

''کیسی ہو بیٹی......اور بابا جان کا کیا حال ہے؟''

سیال بیگم نے صوفے پر بیٹھتے ہی سب سے پہلے گفتگو کا آغاز کیا۔ جواب میں ٹی وی لاؤنج سے مختلف چیزیں سمیٹتی انجشاء احمر نے مصروفیت سے جواب دیا۔

''میں اور بابا' اللہ پاک کے کرم سے بالکل ٹھیک ہیں آنٹی' البتہ آپ لوگ سنایئے کہ آج مدت کے بعد ہماری یاد کیسے کھینچ لائی آپ کو......؟''

اُس کا سرد لہجہ قطعی گستاخانہ نہیں تھا مگر اس کے باوجود اس کے الفاظ نے سیال بیگم کو سخت شرمندہ کر دیا تب ہی احمد رؤف صاحب نے لب کھولے۔

''دیکھو بیٹی' ہمیں معلوم ہے کہ تم ہم سب سے بہت ناراض ہو اور تمہیں ناراض ہونے کا پورا حق بھی ہے، لیکن ہم تمہارے بزرگ ہیں بیٹی مگر اس کے باوجود ہم تم سے معافی مانگتے ہیں' پلیز ہمیں ہماری غلطیوں کے لیے معاف کر دو بیٹی' پلیز......''

''ایک منٹ انکل......'' ان کے ملتجی انداز پر انجشاء نے انگلی اٹھاتے ہوئے انہیں مزید کچھ بھی کہنے سے روکا تھا۔

''آپ کس بات کی معافی مانگ رہے ہیں مجھ سے' میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا......''

بھنویں اچکا کر اس نے قطعی انجان بننے کا ناٹک کیا تھا جس پر احمد رؤف صاحب نے مدد طلب نظروں سے عدنان کی طرف دیکھا تو ان کی

نگاہوں کا مفہوم سمجھتے ہوئے قدرے کھنکھار کر بولا۔

''دیکھو انجشاء' پاپا یہاں تم سے میری غلطیوں کی معافی مانگنے آئے ہیں' ہم نے آج تک جو کچھ بھی تمہارے ساتھ کیا اس پر ہم سب کو شرمندگی ہے لیکن اب ہم غلطیوں کا ازالہ کرنا چاہتے ہیں جو رشتے ٹوٹ گئے تھے انہیں پھر سے جوڑنے آئے ہیں' اس لیے پلیز تم دادا جی کو بلاؤ' پاپا ان سے ہی بات کرنے آئے ہیں......''

''اچھا......؟ تو پہلے بتانا تھا ناں' میں خواہ مخواہ آپ لوگوں کا قیمتی ٹائم ویسٹ کرتی رہی' ویسے بابا تو اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔ اپنے ایک دوست کی تیمارداری کرنے گئے ہیں اس لیے آپ پھر کبھی تشریف لایئے گا کیونکہ مجھے بھی ابھی ایک ضروری کام کے سلسلے میں گھر سے باہر جانا ہے......'' اس کا انداز اتنا پر اعتماد اور اجنبی تھا کہ سیال بیگم اور احمد رؤف صاحب تو بس اس کی طرف دیکھتے ہی رہ گئے جبکہ عدنان رؤف نے شدید دکھ کے عالم میں سر جھٹکا۔

''تم بات کو سمجھ کیوں نہیں رہی ہو انجشاء' اتنی کٹھور کیوں بن رہی ہو تم......؟''

دبے دبے غصے کے ساتھ اگلے ہی پل وہ چلایا تھا جس پر انجشاء نے خاصی خفگی کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔

''پلیز! سٹاپ اٹ مسٹر عدنان' میں اونچا نہیں سنتی اور نہ ہی میرے اس چھوٹے سے گھر کی دیواروں کو بلند آوازیں سننے کی عادت ہے' اور بات جہاں تک پرانے رشتے دوبارہ جوڑنے کی ہے تو اس قسم کی باتیں آپ لوگ دادا جی سے ہی کیجئے گا۔ کیونکہ میرے دل اور میری زندگی میں اب آپ لوگوں کے لیے قطعی کوئی جگہ نہیں ہے' سمجھے آپ؟''

انتہائی سرد مگر تیکھے لہجے میں کہتے ہوئے اس کی چھوٹی سی ناک کی پھنگیں سرخ ہو گئی تھیں جب عدنان نے سخت بے بسی کے عالم میں ایک نظر سیال بیگم اور احمد رؤف صاحب پر ڈالی پھر تھکے تھکے سے انداز میں لب کاٹتے ہوئے واپس اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔

''انجشاء......کیا تم گزرے ہوئے وقت کو بھلا نہیں سکتیں بیٹا؟''

احمد رؤف صاحب نے ایک مرتبہ پھر دھیمے لہجے میں ریکویسٹ کی تھی۔ جواب میں انجشاء نے کسی قدر افسوس کے عالم میں ان کی طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''بھلا دیا انکل......سب کچھ بھلا دیا ہے میں نے اور بہت مشکل سے بھلایا ہے اس لیے پلیز اب دوبارہ مجھے کچھ بھی یاد کروانے کی کوشش مت کیجئے......پلیز......''

بہت ضبط کے باوجود بھی اس کی آواز بھرا گئی تھی' تب عدنان تھکے تھکے سے قدموں کو گھسیٹتا اس کے قریب آ بیٹھا پھر کچھ لمحے خاموشی کی نذر کرنے کے بعد ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔

''انجشاء......پلیز میری بات سنو دیکھو میں اپنی گزشتہ کوتاہیوں پر از حد شرمندہ ہوں' پلیز......پلیز مجھے معاف کر دو خدا کے لیے مجھے میری گمشدہ محبت واپس لوٹا دو پلیز......''

انتہائی بے بسی کے عالم میں دونوں ہاتھ جوڑے وہ کتنا قابل رحم لگ رہا تھا مگر انجشاء نے اس کے آنسوؤں کو یکسر نظر انداز کر دیا اور قطعی مضبوط لہجے میں افسوس سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''تم کتنے خود غرض ہو عدنان کہ جس محبت کو تم نے کبھی قابل توجہ نہیں جانا' آج اسی محبت کی طلب تمہیں یہاں کھینچ کر لے آئی تو تم سوالی بن گئے، مگر میں کہاں جاؤں عدنان' بتاؤ مجھے' میں نے تو اپنی زندگی کے پونے سات سال سلگنے میں گنوا دیئے' وہ ایک ایک دن' وہ ایک ایک لمحہ' وہ میری آنکھ سے گرا ایک ایک آنسو' کس سے واپس مانگنے جاؤں میں......؟ بولو' جواب دو' کیا تمہارے اس احساسِ پشیمانی سے' میرے وہ دن واپس آسکتے ہیں' کیا سوری کہہ کر تم مجھے میرا ماضی واپس لوٹا سکتے ہو......؟''

انجشاء کے تیکھے الفاظ نے ایک مرتبہ پھر اسے لاجواب کر دیا تھا تب ہی سر نیوڑائے وہ چپ چاپ اس کے پاؤں کو دیکھتا رہا کہ اسی اثناء میں دروازے پر ایک مرتبہ پھر ہلکی سی دستک ہوئی اور انجشاء نے سرعت سے اپنی بھیگی پلکیں صاف کر کے فوراً دروازہ کھول دیا۔

''سوری بیٹے' مجھے واپسی میں تھوڑی دیر ہو گئی' وہ کیا ہے کہ راستے میں مجھے ایک عزیز دوست مل گیا اور زبردستی اصرار کر کے اپنے گھر لے گیا۔ حالانکہ میں نے کتنا کہا کہ میری بچی گھر پر اکیلی ہے مگر اس نے میری ایک نہ سنی اور بس لے گیا اپنے گھر......''

دادا جی دروازہ کھلتے ہی اس کا پریشان سا چہرہ دیکھ کر وضاحتیں دینا شروع ہو گئے مگر چلتے چلتے جیسے ہی وہ لاؤنج میں آئے وہاں نگاہوں کے عین سامنے بیٹھے احمد رؤف صاحب' سیال بیگم اور عدنان رؤف کو دیکھ کر ایک دم سے ٹھٹھک گئے' دل و دماغ میں عجیب سی آندھیاں چلنے لگیں' تب کچھ دیر خاموش نگاہوں سے ان کی طرف دیکھنے کے بعد یکایک ہی ان کے دل میں شدید درد اٹھا اور وہ بایاں ہاتھ دل پر دھرے وہیں زمین پر نیچے بیٹھتے چلے گئے۔

یہ عجب ریت ہے اس زمانے کی
دلوں سے اپنے پیار بھرے ارمان گئے
اک ذرا سی مشکل تھی محبت میں
جدا ہوئے تو ہم دونوں جان گئے

پیار کے سمندر میں، ہر اترنے والے کو
کشتیاں نہیں ملتیں
دردور تک جاناں دھوپ کی مسافت ہے
اور کہیں بھی پل بھر کو دھوپ کے مسافر پر
سائباں نہیں کھلتے
اس عجب سمندر میں عمر کی ریاضت کے
بعد ہم نے جانا ہے
جس طرح فضاؤں میں اڑنے والے پنچھی پر
برس ہا برس میں بھی آسماں نہیں کھلتے
ہجر بیکراں میں بھی بھید بھید رہتا ہے
رازداں نہیں ملتے
بام و در نہیں کھلتے
ہر اترنے والے کو کشتیاں نہیں ملتیں
اور مل بھی جائیں تو
بادباں نہیں کھلتے
پیار کے سمندر میں بھید بھید رہتا ہے

شام کے دھندلکے کافی تیزی سے گہرے ہو رہے تھے۔ اس نے ذرا سی ونڈو کھول کر دیکھا۔ باہر رم جھم رم جھم پھوار کا سلسلہ تا حال جاری تھا۔ اشعر ابھی ابھی آفس سے لوٹا تھا۔ تب ہی وہ اس کے لیے گرم گرم چائے کا کپ لے کر اپنے بیڈ روم میں چلی آئی۔ جہاں جہازی سائز بیڈ پر آڑھا

ترچھا لیٹے وہ کوئی کتاب پڑھنے میں مشغول تھا۔تمکین نے چائے کا کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھا۔پھر پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں گھماتے ہوئے بولی۔

''اشعر! کتنے دن ہو گئے آپ مجھے کہیں باہر لے کر نہیں گئے' کیا خیال ہے؟ کل ساحل سمندر پر نہ چلیں؟''

اسے اچھی طرح یاد تھا کہ کل اس کی سالگرہ کا دن تھا۔مگر اشعر پہلی مرتبہ کتنی بے نیازی کے ساتھ یہ دن بھلائے ہوئے تھا۔نہ جانے کیوں ۔اب ہر گزرتے دن کے ساتھ تمکین کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اب اشعر کے پیار میں وہ پہلی سی دیوانگی ،وہ والہانہ پن ،وہ وارفتگی نہیں رہی ہے جو کہ شادی سے پہلے تھی لیکن اس کے پیار پر شک کرنا' خود اپنی ذات پر شک کرنے کے مترادف تھا۔سو وہ اسے اشعر کی مصروفیت جان کر ہمیشہ نظر انداز کرتی رہی۔

اس وقت بھی تمکین کی فرمائش پر اس نے صرف ایک پل کے لیے سرسری نگاہیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا' پھر اگلے ہی پل دوبارہ کتاب کے مطالعے میں مشغول ہو گیا تو تمکین انتہائی بجھے دل کے ساتھ اس کی اس بے سبب نظر اندازی پر شدید ہرٹ ہوتی کمرے سے باہر نکل آئی۔

رم جھم برسات کا سلسلہ اب بھی جاری تھا۔ماحول میں خنکی کا احساس قدرے بڑھ گیا تھا لیکن وہ اپنے آپ سے بے نیاز بغیر کوئی گرم شال اوڑھے ٹی وی لاؤنج میں آ بیٹھی۔

نہ جانے کیا وجہ تھی کہ آج کل اشعر' قدم قدم پر اسے تیز کر رہا تھا۔شیزا نے پچھلے دو تین ماہ سے بناء کسی کی اجازت اور مرضی کے اشعر کا آفس جوائن کر لیا تھا اور اب ان دونوں کا زیادہ وقت ایک دوسرے کے ساتھ ہی بسر ہو رہا تھا۔مگر تمکین چاہ کر بھی نہ تو اشعر کے وارفتہ پیار پر شک کر سکتی تھی اور نہ ہی شیزا کی پرخلوص دوستی پر۔سو اشعر کا یہ بدلا ہوا رویہ اندر ہی اندر اسے سلگا رہا تھا۔

سوچوں کے اس کبھی نہ ختم ہونے والے دائرے نے اسے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔جب اچانک ہی ٹی وی لاؤنج میں رکھے فون کی تیز بیل نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروالی۔

''ہیلو۔'' ریسیور اٹھا کر بہت دھیمے لہجے میں اس نے کہا تھا جب دوسری جانب چھائی خاموشی کا قفل ٹوٹا۔

''ہیلو تمکین۔میں اریج بول رہا ہوں۔پہچانا......''

اس کا لہجہ بھی قدرے تھکا ہوا تھا۔تب تمکین نے دھیرے سے اپنا سر صوفے کی پشت سے ٹکا دیا۔

''آپ کی آواز میں پہچانتی ہوں مسٹر اریج' بہر حال یہ بتایئے کہ اتنی رات کو فون کیسے کیا؟''

اس کے سوال پر دوسری جانب تھوڑی سی دیر کے لیے خاموشی چھائی۔پھر اریج احمر کی مدھر آواز سنائی دی۔

''میرے خیال سے مجھے اتنی رات کو فون نہیں کرنا چاہیے تھا، آپ کو یقیناً اچھا نہیں لگا، ہے ناں؟''

''نہیں ،ایسی بات نہیں ہے ،میں اس وقت اکیلی بیٹھی تھی ،اور نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔''

تمکین نے اس کی ندامت کے احساس کو کم کرنا چاہا تھا۔

''عجیب اتفاق ہے کہ آج مجھے بھی نیند نہیں آ رہی تھی تو میں نے سوچا، چلو فون پر ہی آپ کو وش کر دوں، ویسے مجھے ایک فیصد بھی گمان نہیں تھا کہ اس وقت میری آپ سے بات ہو جائے گی۔''

دوسری طرف وہ یقیناً دھیمے سے مسکرایا تھا۔

''ارے آپ کو میری برتھ ڈے یاد تھی......''

''کیوں، یاد نہیں ہونی چاہئے تھی......''

تمکین کی خوشگوار حیرت پر اس کا لہجہ بھی قدرے کھل اٹھا تھا۔ تب ہی دو بدو سوال کیا تو وہ خاموش ہو کر رہ گئی۔

''ہیپی برتھ ڈے ٹو یو تمکین ہیپی برتھ ڈے ٹو یو......''

اس کی خاموشی پر بہت اپنائیت کے ساتھ وہ گنگنایا تھا۔ جب تمکین کی آنکھیں لبالب آنسوؤں سے بھر گئیں۔

''تھینک یو سو مچ مسٹر ارتج'' بمشکل بھرائے ہوئے لہجے کے ساتھ وہ محض اتنا ہی کہہ پائی تھی۔

''اپنوں کا شکریہ ادا نہیں کرتے تمکین، مجھے یہ مناسب نہیں لگا کہ میں تمہیں کوئی گفٹ ارسال کروں اور اشعر اس کا غلط مطلب لے سو فون کو ہی بہترین وسیلہ سمجھا' ونس اگین ہیپی برتھ ڈے ٹو یو''

کتنا رسیلہ لہجہ تھا اس کا، مگر تمکین اپنے آنسوؤں پر مزید ضبط نہیں رکھ سکتی تھی۔ سو اس نے دھیرے سے ریسیور کریڈل پر رکھ کر اپنا سر گھٹنوں میں چھپا لیا۔ اس وقت اس سے اپنا بھرم رکھنا، اپنی سسکیاں چھپانا بہت دشوار ہو رہا تھا۔

وہ ایک شخص کہ جو اسے دل کی گہرائیوں سے چاہنے کا دعوے دار تھا۔ اسے اس کا جنم دن یاد نہیں رہا تھا لیکن وہ ایک شخص کہ جس سے اس کا کسی قسم کا کوئی رشتہ ہی نہیں تھا۔ وہ نہ صرف اس کی برتھ ڈے کو یاد رکھے ہوئے تھا بلکہ اسے اس کی پاسداری اس کی عزت بھی بے حد عزیز تھی۔

تب تقریباً آدھا پون گھنٹہ آنسو بہانے کے بعد وہ اپنے بیڈ روم میں واپس آئی تو اشعر کتاب سینے پر دھرے بے خبر سو رہا تھا۔ کمرے کی وسیع کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور اس میں سے سرد ہوا کے آوارہ جھونکے چھن چھن کر اندر آ رہے تھے۔ تمکین نے آگے بڑھ کر کھڑکی کے کھلے پٹ سمیٹے اور چٹخنی لگا کر واپس اپنے بیڈ کے قریب چلی آئی۔ سرد ہوا کے آوارہ جھونکوں کے باعث اشعر کی روشن پیشانی پر ریشمی بال بے ترتیبی سے بکھر گئے تھے۔

اپنا لباس چینج کیے بغیر وہ بہت سکون سے محو خواب تھا اور تمکین آنسوؤں بھری شکایتی نگاہوں سے اسے پر سکون انداز میں سوتے دیکھ کر اس پر جھک آئی تھی، بھاری کتاب اب بھی اس کے سینے پر دھری تھی جسے تمکین نے بہت آہستگی کے ساتھ اٹھا کر قریبی میز پر رکھ دیا تھا۔ پھر وہ اس کے پاؤں کو بھاری جوتوں کی قید سے آزاد کرواتے ہوئے اس کے موزے اتارنے لگی تھی۔ مگر اشعر اب بھی ٹس سے مس نہیں ہوا تھا۔ وہ جو پہلے اس کے پل پل کی خبر رکھتا تھا۔ اب نہ جانے کیوں اس سے اتنا غافل ہو گیا تھا کہ اس کے اتنی دیر تلک نہ سونے کی بھی اسے کوئی پرواہ نہیں تھی۔

آنسو تھے کہ قطار در قطار اس کی آنکھوں سے بہے چلے جا رہے تھے اور وہ کسی معصوم بچے کی طرح نیند سے روٹھی، نہ جانے کتنی ہی دیر گھٹنوں پر سر دھرے اسے پر سکون سوتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اس کے سسر سعید احمد اور ساس عائشہ بیگم ہفتے ہی کسی ضروری کام کے سلسلے میں پھر سے لندن

واپس چلے گئے تھے جس کی وجہ سے اشعر کو اپنی من مانیاں کرنے کا موقع میسر آ گیا تھا اور وہ اس پر بنا کسی سے گلہ کیے دل ہی دل میں کڑھ رہی تھی۔

☆☆☆

ہم وہ بے درد ہیں کہ
خواب لٹا کر بھی جنہیں نیند آ جاتی ہے
ٹوٹ پھوٹ کر بھی جن کے ذہنوں کو کچھ نہیں ہوتا
رو رو کر بھی جن کی آنکھیں
مسکرانا نہیں بھولتیں
اجڑ' بکھر کر بھی جن کے دل
دھڑکنا یاد رکھتے ہیں
ہم وہ بے درد ہیں کہ
جن کے آنسو' آنکھوں کا راستہ بھول کر
دل کی وادی میں گرتے ہیں
اور گرتے ہی چلے جاتے ہیں
ہم وہ بے درد ہیں کہ
شام سے پہلے مرجانے کی خواہش میں جو
جیتے ہیں اور جیتے ہی چلے جاتے ہیں

پورے شاہ ولاج میں اس وقت خاموشی کا راج تھا۔ گھر کے سبھی مکین اپنے اپنے کمروں میں پرُسکون، میٹھی نیند کے مزے لے رہے تھے، لیکن نیند کی یہ مہربان دیوی آج اس سے کس ضدی محبوب کی مانند روٹھی ہوئی تھی، اور وہ اپنی سرخ آنکھوں میں ڈھیروں آنسوؤں کو پامالی سے بمشکل بچاتے ہوئے مسلسل ازمیر شاہ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

وہ جسے شہرین خان سے بے پناہ عشق کا دعویٰ تھا۔ آج کیسے ایک عام سی اجنبی لڑکی سائرہ خان کو دیکھتے ہی اس پر مرمٹا تھا۔ کیسے دیوانہ ہو کر رہ گیا تھا اس کا۔

''تو تم بھی حسن پرست ہی نکلے ازمیر شاہ، لیکن حسن پرستی ہی اگر تمہاری فطرت کا خاصہ ہے تو تمہیں میں نظر کیوں نہیں آئی ازمیر، میری دیوانگی، میرا پیار، میرے آنسو، کیوں متوجہ نہیں کرتے تمہیں، کیوں تمہیں اپنی راہ میں میرا شکستہ وجود پڑا دکھائی نہیں دیتا۔ تم ہی بتاؤ ازمیر، میں تمہیں کیسے اپنے پیار کا یقین دلاؤں، کیسے سمجھاؤں اپنے پاگل دل کو.....''

بے بسی کی انتہا پر کھڑی وہ اپنے ہی آپ میں دھیمے سے بڑبڑائی تھی۔ آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر گالوں پر بکھر رہے تھے۔ تب اچانک ہی اسے اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی دھیمی سی آہٹ سنائی دی، اور اس نے سرعت سے اپنی بھیگی پلکیں رگڑ ڈالیں۔

ذرا کی ذرا جو گردن گھما کر اپنے پیچھے دیکھا تو نظر سے کچھ ہی فاصلے پر سیڑھیوں کی گرل سے ٹیک لگائے کھڑا سنجیدہ سا ازمیر شاہ دونوں بازو سینے پر باندھے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تب فوراً اس نے اپنی نظریں اس کے چہرے سے ہٹا لیں۔

''خیریت؟ یہ ہر روز رات کو رو کر سونے کی عادت کیوں ہوگئی ہے تمہیں......؟''

نہایت سرد لہجہ تھا اس کا لیکن اریشہ اس وقت قطعی اس کا سامنا کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی سو خاموشی سے اٹھ کر اس کی سائیڈ سے نکل گئی لیکن ازمیر نے بروقت اس کی کلائی تھام کر اس کے وہاں سے بھاگنے کا ارادہ کینسل کر دیا۔

''تمہیں کیا ہو گیا ہے اریشہ؟ تم پہلے تو ایسی نہیں تھیں اور اب جبکہ تمہیں تمہاری پسند کا جیون ساتھی بھی مل چکا ہے۔ اب تو تمہیں پہلے سے زیادہ خوش ہونا چاہئے۔ لیکن تم ہو کہ روز بروز کمزور ہوتی جا رہی ہو نہ کسی سے بات کرتی ہو نہ گھر سے باہر نکلتی ہو آخر کیوں اریشہ آخر کیوں......؟ کیوں کر رہی ہو تم یہ سب' بتاؤ مجھے......''

آج نہ جانے وہ کس رو میں بہہ نکلا تھا کہ پھر سے پہلے والا ازمیر شاہ بن کر اس سے اس کا حال دریافت کر رہا تھا، لیکن وہ تو اس وقت اپنے ہی دل کے درد سے نڈھال بکھر رہی تھی۔ اس کے کسی اور کے ساتھ منسوب ہو جانے پر سر سے پاؤں تلک سلگ رہی تھی۔ پھر وہ کیسے بتاتی اسے کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے؟ جبکہ ازمیر سے اس کی محبت اس کا رویہ کسی سے چھپا ہوا تو نہیں تھا۔

اس نے ہمیشہ سب کی جلی کٹی سن کر بھی ازمیر شاہ کا ساتھ نبھایا تھا اپنی انگلی کے پوروں سے اس کے آنسو چنے تھے۔ اپنے دل کا ہر راز اس کے ساتھ شیئر کیا تھا۔ کتنی ہی بار جذبے لٹاتی آنکھوں کے ساتھ اس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ اتنا بے خبر تو نہ تھا کہ ان آنکھوں کا پیغام پڑھ نہ سکتا تھا پھر وہ زبان سے کچھ بھی کہہ کر اپنے آپ کو ارزاں کیوں کرتی؟

اب بھی آنسو پلکوں پر لرز رہے تھے۔ تب ہی اس نے سختی سے اپنا بازو اس کی گرفت سے آزاد کرایا اور شکستہ قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی جبکہ ازمیر شاہ اسے شاکڈ نگاہوں سے سسکتے دیکھ کر وہیں کھڑا پکارتا رہ گیا۔

کل اسے صرف اور صرف صالحہ بھابھی کی خوشی اور فرزانہ بیگم و ماہم کو سلگانے کے لیے دل کے نہ چاہتے کے باوجود سائمہ خان کی انگلی میں اپنے نام کی انگوٹھی ڈالنا تھی۔ مگر یہ دل کم بخت نہ جانے کیوں کسی کروٹ قرار نہیں پا رہا تھا۔ اریشہ کی خاموشی اس کے آنسو اس کی جان پر بن رہے تھے۔ اسے سخت بے کل کر رہے تھے۔ مگر وہ الجھ الجھ کر بھی نہ تو اپنے دل کی بے سکونی کا حل تلاش کر پایا اور نہ ہی اریشہ کے آنسوؤں کا راز پا سکا۔

گزرتے وقت کا ہر لمحہ اسے اریشہ سے دور کر رہا تھا اور وہ چپ چاپ بے بسی کا اشتہار بنا' یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ حالات کتنے عجیب ہو گئے تھے کہ اس کے اختیار میں کچھ بھی نہیں رہا تھا۔

''اے کاش کہ تم میرا نصیب بن جاتیں اریشہ' اے کاش کہ تمہارے دل میں میری محبت کی چنگاریاں بھڑک اٹھتیں۔'' کھلی کھڑکی کے

دونوں پٹوں پر ہاتھ دھرے دور آسمان پر تنہا چاند کو دیکھتے ہوئے اس نے حسرت سے سوچا اور اپنی پلکوں تک آئے آنسوؤں کو تلخی سے انگلی کی پور پر اتارتے ہوئے دھیمے سے مسکرا دیا۔

فضا میں خنکی کا احساس بڑھ گیا تھا۔ مگر اسے اس کی قطعی پرواہ نہیں تھی۔ اس وقت وہ اپنے آپ سے بے نیاز صرف اور صرف اریشہ کے متعلق سوچ رہا تھا کہ جو اس کی سب سے بہترین دوست تھی۔ رفتہ رفتہ وہ جس کی رفاقت کا اتنا عادی ہو گیا تھا کہ اب اس کے بغیر ایک پل بھی جینا بہت کٹھن لگ رہا تھا، لیکن وہ کرتا بھی تو کیا کرتا؟

گھر والوں کے تبصرے اس کی کم صورتی پر...... کمنٹس خود اریشہ کی مما نورینہ بیگم کی نفرت اس سے کوئی ڈھکی چھپی تو نہیں تھی تو نہ ہی وہ اتنا خود غرض تھا کہ صرف اپنے دل کی خوشی کے لیے وہ اریشہ کی ذات کو سب کے بیچ تماشا بنا دیتا۔ اس کی بے لوث دوستی اور خلوص پر سوالیہ نشان لگا دیتا۔

وہ اسے سوچنے کا کوئی حق نہیں رکھتا تھا لیکن پھر بھی اسے سوچ رہا تھا۔ اس کی اداسی اس کے آنسو اسے بے کل کر رہے تھے۔

رات دھیرے دھیرے اپنا بقیہ سفر خاموشی سے طے کر رہی تھی۔

اریشہ نے اس وقت اسے سہارا دیا تھا کہ جب اس کی سگی ماں بھی اسے اکیلا چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ اریشہ اگر اس کی زندگی میں نہ ہوتی تو شاید وہ سلگ سلگ کر کب کا ختم ہو چکا ہوتا، لیکن آج زندگی کے اس موڑ پر کہ جب وہ ہمیشہ کے لیے اس کے ساتھ کا متمنی تھا تو حالات نے اسے مجبوریوں کی زنجیروں میں جکڑ کر رکھ دیا۔ اگلی صبح ''شاہ ولاج'' میں اس کی منگنی کی تقریب ہونا تھی جس کی تیاریاں تقریباً مکمل ہو چکی تھیں اور اسے اس تقریب کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنا تھا۔ سو سر جھٹک کر اریشہ کے تصور کو جھٹلاتے ہوئے وہ اپنے بیڈ روم کی طرف چلا آیا اور پلکیں موند کر سونے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔

☆☆☆

رؤف حسین صاحب کو دل کا زبردست اٹیک ہوا تھا۔ جو جان لیوا ثابت ہوا اور وہ فقط چند گھنٹے آکسیجن کے سہارے سانس لینے کے بعد اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

ہسپتال کے پرائیویٹ روم میں اس وقت ان کا بے جان وجود، بالکل ساکت پڑا تھا۔ لیکن ان کی لختِ جگر انجشاء کی چیخیں آسمان کو چھو رہی تھیں۔ اس وقت اس کا حال دیکھنے والا تھا۔ پاؤں میں چپل اور گلے میں دوپٹے سے بے نیاز، اپنے لمبے بال بکھرائے وہ کسی مچھلی کی مانند تڑپ تڑپ کر سب کی گرفت سے پھسل رہی تھی۔

''دادا جی...... دادا جی پلیز آنکھیں کھولئے ناں، دادا جی پلیز میرے ساتھ ایسا مت کریں، پلیز دادا جی میری طرف دیکھیں، میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی دادا جی اور کون ہے آپ کے سوا اس شہر میں میرا، مجھے یوں لاوارث مت کریں دادا جی پلیز......''

رو رو کر اس کی آواز بیٹھ چکی تھی مگر وہ سنبھالے نہ سنبھل رہی تھی۔ رؤف حسین صاحب کے بیڈ سے لپٹ کر وہ جس طرح سے بلک رہی تھی اس نے وہاں موجود ڈاکٹرز کی آنکھیں بھی نم کر ڈالی تھیں۔

''ڈاکٹر صاحب! پلیز میرے دادا کو پھر سے دیکھئے ناں، یہ...... یہ مجھے اس طرح سے چھوڑ کر نہیں جاسکتے، پلیز ڈاکٹر صاحب...... میرے دادا جی کو پھر سے چیک کیجئے ناں، پلیز......''

زمین پر گھٹنے ٹیک کر وہ دونوں ہاتھ اپنے سامنے کھڑے ڈاکٹر میسر کے سامنے جوڑتے ہوئے درد سے چور لہجے میں بولی تو دائیں طرف کھڑا عدنان رؤف شکستہ قدموں سے چلتا اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔ پھر اپنا دایاں ہاتھ اس کے کندھے پر نرمی سے رکھتے ہوئے دھیمے سے بولا۔

''پلیز خود کو سنبھالو انجشاء، دادا جی مر چکے ہیں، وہ اب تمہارے رونے سے واپس نہیں آئیں گے......''

اُس کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ وہ زخمی شیرنی کی مانند اس کا ہاتھ پرے جھٹکتے ہوئے کھڑی ہوئی، پھر اس کے روبرو کھڑے ہو کر اتنی زور سے ایک طمانچہ اس کے گال پر جمایا کہ پورے کمرے میں اس طمانچے کی گونج گنگنا اٹھی۔

''یو ایڈیٹ، اسٹوپڈ انسان، تم، تم نے مارا ہے میرے دادا جی کو، تت...... تم قاتل ہو ان کے، میں تمہیں جیل بھجواؤں گی، تمہیں پھانسی کے تختے تک لے جاؤں گی میں، تم دیکھنا میں تمہیں برباد کر دوں گی......''

اس کے گریبان کو اپنی مضبوط گرفت میں جکڑ کر وہ مچل اٹھی تھی جب آنسو بہاتی، سیال بیگم نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔

''انجو، حوصلہ کرو بیٹی، خدا کو یہی منظور تھا۔''

''آپ نے زندگی بھر انہیں تڑپائے رکھا، کبھی سکون کا سانس لینے نہیں دیا، ہر ہر قدم پر تکلیف پہنچائی انہیں اور آخر کار انہیں مار ڈالا، ان سے ان کی سانسیں بھی چھین لیں، کیوں آئے میرے گھر آپ، آخر کیوں؟''

اپنے آپ کو ان کی گرفت سے چھڑا کر وہ پھر چلائی تھی کہ اسی پل اریج وہاں پہنچ گیا۔ اریج کو اس حادثے کی اطلاع خود عدنان نے پہنچائی تھی، اور اب وہ خاصی پریشان نگاہوں سے ایک نظر بے جان پڑے رؤف حسین صاحب کو دیکھنے کے بعد انجشاء کو دیکھ رہا تھا کہ جو ہمیشہ ایک صاف ستھری، سمجھدار ایجوکیٹڈ لڑکی کے روپ میں اس کے سامنے آئی تھی لیکن اس وقت غم کی شدت سے نڈھال وہ اسے کوئی پاگل لڑکی ہی دکھائی دے رہی تھی۔

عدنان رؤف نے اس کی آمد پر خاصی بے بسی سے اس کی طرف دیکھا تھا اور وہ ان نگاہوں کا مفہوم جان کر چھوٹے چھوٹے اسٹیپ اٹھاتا انجشاء کی طرف بڑھ آیا تھا کہ جو اس وقت کسی سے نہیں سنبھل رہی تھی۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے انجشاء، آپ تو بہادر ہیں، پلیز سنبھالیں خود کو......''

''نہیں، مجھے میرے دادا جی واپس چاہئیں، میرے دادا جی کو واپس لاؤ، میں ان کے بغیر نہیں جی سکتی، مجھے ان کے بغیر سونے کی عادت نہیں ہے، پلیز، پلیز میرے دادا جی کو واپس لاؤ، مجھے میرے دادا جی واپس چاہئیں......''

آنسوؤں سے اس کا چہرہ تر تھا، لیکن وہ بری طرح سے سسک رہی تھی تب ہی ڈاکٹر میسر نے زبردستی اسے اریج کی ہدایت پر نیند کا انجکشن دے دیا کہ اس وقت اسے آرام کی اشد ضرورت تھی اور اس کی آہ و پکار سے ہسپتال کا ماحول بھی خاصا ڈسٹرب ہو رہا تھا۔

رؤف حسین صاحب کی میت۔ ''عدنان کا میچ'' پہنچی تو احمد رؤف صاحب پر رقت طاری ہوگئی کتنے بدنصیب رہے تھے وہ کہ انہیں اپنے محبوب باپ سے معافی مانگنے کا موقع بھی نہ مل سکا تھا۔ زندگی بھر وہ اپنے مفلوج بدن کے ساتھ انہیں ملنے کے لئے تڑپتے رہے لیکن زندگی نے جب ان سے ملنے کا موقع فراہم کیا تو وہ بناء کوئی عذر سنے ہی ان سب سے منہ موڑ گئے۔

قیامت سی قیامت تھی۔ جوان کے شکستہ دل پر ٹوٹ پڑی تھی۔ اپنے گنہگار ہونے کا احساس ان کی سوچوں کو مفلوج کر رہا تھا۔ آنسو لٹا لٹا کر ان کی آنکھیں خشک ہو چکی تھیں لیکن دل کا درد تھا کہ کم ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ عدنان خود ایک کونے میں کھڑا سسک رہا تھا۔ اس کے نزدیک اس انہونی آفت کا ذمہ دار، صرف اور صرف اس کا وجود تھا۔ اسی نے رؤف حسین اور احمد رؤف صاحب کے درمیان فاصلوں کی صلیب لٹکائی تھی۔ انجشاء کو ٹھکرا اپنے دادا کو شدید درد سے دوچار کرنے اور پھر ان کا سراغ پا کر بار بار ان کے ضبط کو آزمانے کی خطا بھی اسی سے سرزد ہوئی تھی۔ وہی تھا جس نے اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر احمد رؤف اور سیال بیگم کو اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کیا۔ اگر وہ تھوڑے صبر کا مظاہرہ کرتا تو شاید یہ حادثہ نہیں ہوتا۔

انجشاء نشہ آور دوائیوں کے باعث تا حال گہری بے ہوشی میں ڈوبی تھی۔ جبکہ رؤف حسین صاحب کو لوگ ان کی آخری آرام گاہ تک بھی پہنچا آئے تھے۔

پل کے پل میں ہی سب کچھ بدل کر رہ گیا تھا۔ انجشاء طویل بے ہوشی کے بعد اپنے ہوش میں آئی تو سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ والدین کے بعد جان لٹاتے والے پیارے دادا جی کی دائمی جدائی نے اسے بری طرح سے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ تب ہی اس کی بلوری آنکھوں سے گرم گرم آنسو پھسلے اور پلکوں کی باڑ کراس کرتے ہوئے تکیے میں جذب ہو گئے۔

''ایسے تو نہیں کرتے دادا جی، پھر آپ نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا، آپ تو میری آنکھوں میں ایک آنسو بھی نہیں آنے دیتے تھے، پھر ایک دم سے اتنے آنسو کیوں دے کر چلے گئے مجھے؟ میں اب کیسے جیوں گی دادا جی، کون سہارا دے گا مجھے.....''

بری طرح سے سسکتے ہوئے وہ دھیمے سے بڑبڑائی تھی جب اس کے کمرے کا دروازہ ہلکے سے وا ہوا اور اگلے ہی پل عدنان احمد رؤف، ناشتے کی ٹرے لئے کمرے کے اندر چلا آیا۔ انجشاء کو اس کے وجود سے اتنی نفرت ہوگئی تھی کہ وہ اس کی طرف ایک نظر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتی تھی تب ہی اس نے اس پر دوسری نگاہ ڈالے بغیر نفرت سے منہ پھیر لیا تو وہ خاصے پرسوچ انداز سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے وہیں اس کے بیڈ کے قریب کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا کہ اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل تو اسے نکالنا ہی تھا۔

☆☆☆

اگلے دن کا سورج طلوع ہوا تو وہ بڑی بے دلی کے ساتھ بستر سے نکلی۔ اشعر اس سے قبل ہی اٹھ کر باتھ لے چکا تھا اور اب وہ آئینے کے سامنے کھڑا یقیناً آفس جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ تمکین نے بجھی بجھی سی ایک نظر اس کے خوبرو سراپے پر ڈالی اور وارڈ روب سے اپنے کپڑے نکال کر چپ چاپ واش روم میں مقید ہوگئی۔ آدھا پون گھنٹہ ٹھنڈا پانی اپنے اعصاب پر بہا کر وہ جس وقت واپس کمرے میں آئی اشعر جوتے پہن رہا تھا۔ تمکین نے خاموشی سے اپنے بال سلجھائے، پرفیوم کا چھڑکاؤ کیا اور دوپٹہ سر پر ڈال کر اشعر کا آفس بیگ اس کے قریب ہی بیڈ پر دھر دیا۔

''تمکین بات سنو پلیز......''

وہ بیگ اس کے قریب رکھ کر خاموشی سے واپس پلٹ رہی تھی جب اچانک اس نے پکارلیا۔

''کہیئے......''

گردن گھما کر اس نے اشعر کی جانب نگاہ کی تھی جب وہ پرشوق نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس کے بالکل قریب چلا آیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اسے اپنی بانہوں میں بھر کر اپنا سر اس کے کندھے پر ٹکاتے ہوئے محبت سے چور لہجے میں بولا۔

''ہیپی برتھ ڈے ٹو یو، ہیپی برتھ ڈے ٹو یو مائی سویٹ ہارٹ، ہیپی برتھ ڈے ٹو یو......''

وہ بات جو کل سننے کے لئے اس کے کان ترس رہے تھے۔ آج بالآخر اس نے کہہ ڈالی تھی، اور نہ صرف اسے وش کیا تھا بلکہ بھرپور محبت کے ساتھ اس کی پیشانی چومتے ہوئے اس نے اپنی جینز کی پاکٹ سے ایک عدد انتہائی نفیس سا بریسلیٹ نکال کر تمکین کی کلائی میں بھی پہنا دیا تھا۔

''اب تو خوش ہو ناں......؟''

دونوں ہاتھوں کے پیالے میں اس کا چہرہ لے کر وہ ذرا سا جھکتے ہوئے اس کی نگاہوں میں دیکھ کر بولا تو تمکین فرطِ جذبات سے بے حال، پھر اس کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

''ممی، کیا ہو گیا جان، تم نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ تمہارا اشعر، اپنی ممی کی برتھ ڈے بھول سکتا ہے۔ ہرگز نہیں سویٹ ہارٹ، یہ سب تو میں یونہی تمہیں ستانے کے لئے کر رہا تھا۔ ورنہ اشعر اپنی سانس لینا تو بھول سکتا ہے، لیکن اپنی جان کی ذات سے وابستہ خوشی کی گھڑیوں کو نہیں، کیا سمجھیں......''

اسے خود سے الگ کر کے شہادت کی انگلی ہلکے سے اس کی ناک سے ٹچ کرتے ہوئے وہ مسکرا کر بولا تو تمکین محبت پاش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''بہت بُرے ہو تم، آنے دو ممی پاپا کو تمہاری ایک ایک شکایت نہ ان کے گوش گزار کردی تو تمکین نام نہیں میرا......''

دائیں ہاتھ کا مکا بنا کر ہلکے سے اس کے سینے پر مارتے ہوئے وہ شکایتی انداز میں بولی تو اشعر نے ہنس کر اس کا ہاتھ اپنی گرفت میں لے لیا، پھر دھیرے سے چوم کر اسے اپنی گرفت میں لیتے ہوئے بولا۔

''اوکے جناب، جتنی دل چاہے شکایتیں کر لینا، لیکن وہ کیا ہے کہ آج میری جان کا برتھ ڈے ہے تو اس برتھ ڈے کو دھوم دھام سے منانے کے لئے میں نے سیر و تفریح اور پُر تکلف ڈنر کا ایک شاندار پروگرام ترتیب دیا ہے۔ لہٰذا آج ہماری آفس سے چھٹی اور آپ کی گھریلو کام سے آج تم نہ تو کوئی کام کرو گی اور نہ ہی کسی سے ملو گی، سوائے میرے، اوکے......''

تمکین کی کمر کے گرد، اس کی گرفت خاصی مضبوط ہو گئی تھی جب وہ قدرے نروس ہوتے ہوئے بولی۔

''کیا کر رہے ہو اشعر...... آج میرا برتھ ڈے ہے۔ ممی پاپا اور گھر کے دیگر لوگ ہماری راہ دیکھ رہے ہوں گے اور اگر تھوڑی دیر میں ہم

وہاں نہیں پہنچے تو وہ لوگ یہاں آ جائیں گے......''

''نہیں آئیں گے......''

''کیوں......؟''اشعر کے اطمینان پر قدرے الجھ کر اس نے پوچھا تھا۔ جب وہ پھر سے گستاخی کرتے ہوئے بولا۔

''وہ اس لئے جناب کہ میں نے کل رات ہی رضا انکل اور آسیہ آنٹی کو بتا دیا تھا کہ کل کا دن ہم دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کی سنگت میں گھر سے دور کہیں، رومینٹک جگہ پر سیلیبریٹ کریں گے لہٰذا کل ہمیں بالکل ڈسٹرب نہ کیا جائے ہم لوگ رات میں خود ہی ''حسن ولاج'' پہنچ جائیں گے، کیسا......؟''

''مجھے نہیں پتہ......''

اشعر کی دیوانگی پر بوکھلا کر اس نے کہا اور فوراً اس کی گرفت سے نکل کر کمرے سے باہر بھاگ گئی۔ وہ پورا دن انہوں نے اپنی پسند سے ایک دوسرے کی سنگت میں ہی گزارہ تھا۔ شام ڈھلی تو تمکین نے اشعر کی فرمائش پر بلیک ساڑھی زیب تن کر لی جس کے باریک بلاؤز اور پلو پر انتہائی نفاست سے نگوں اور موتیوں کا کام کیا گیا تھا۔ آج وہ اتنی حسین لگ رہی تھی کہ اشعر کے لئے اپنے دیوانے دل پر قابو رکھنا دشوار ہو گیا تھا۔

شام کو عین اس ٹائم کہ جس وقت وہ اپنے گھر سے گاڑی میں بیٹھنے کے لئے نکل رہے تھے۔ شیزا احمد گلابوں کے خوب صورت بوکے کے ساتھ وہاں چلی آئی، اور زندگی میں پہلی مرتبہ تمکین کو اس کی یہ بے وقت آمد سخت ناگوار گزری۔

''ہیپی برتھ ڈے ٹو یو تمکین، ہیپی برتھ ڈے ٹو یو......''

خوب صورت گلابوں کا بوکے اسے تھما کر وہ محبت سے اس کے گلے لگتے ہوئے بولی۔ تو دل کے نا چاہنے پر بھی تمکین کو مسکرا کر اس کا شکریہ ادا کرنا پڑا۔

''ہیلو بھئی، کہیں جا رہے ہو کیا؟''

اُن دونوں کو نک سک سے تیار ہو کر دیکھ کر وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی تو مجبوراً اشعر کو اسے اپنا پروگرام بتانا پڑا۔

''یہ تو بڑے مزے کا پروگرام ہے، اگر تم لوگوں کو ناگوار نہ گزرے تو میں بھی تمہارے ساتھ چلوں......''

تمکین کی بلوری آنکھوں میں نمایاں الجھن دیکھ کر اس نے براہ راست اشعر سے پوچھا تھا۔ جس نے اخلاق کو مدنظر رکھتے ہوئے دھیمے سے سر ہلا کر اسے اپنے ساتھ چلنے کی رضامندی دے ڈالی اور اشعر کے اس فیصلے پر اس کے پہلو میں کھڑی تمکین رضا بری طرح سے سلگ کر رہ گئی۔

پروگرام کا سارا مزا کرکرا ہو کر رہ گیا تھا۔ آج کے دن وہ اشعر سے دل کی بہت سی باتیں کرنا چاہتی تھی۔ یہ دن وہ صرف اور صرف اشعر کے پیار میں اس کے ساتھ گزارنا چاہتی تھی۔ مگر اب شیزا کی موجودگی نے اس کے لبوں پر قفل ڈال دیئے تھے۔ اشعر خوب ہنس رہا تھا۔ مختلف پکنک اسپاٹس کی سیر کرواتے ہوئے ایک ایک لمحے کو انجوائے کر رہا تھا مگر اب وہ اس کے ساتھ نہیں تھی۔

وہ لوگ ساحل سمندر پر پہنچے تو سورج غروب ہونے کے قریب تھا۔ اشعر اور شیزا اپنی باتوں میں مشغول کبھی کبھی کسی بات پر اس سے رائے

طلب کرتے تو وہ محض سر ہلا کر رہ جاتی۔ اشعر اور شیزا دونوں ہی لہروں کے کافی قریب چلے آئے تھے جبکہ وہ جیسے مجبوراً ان کا ساتھ نبھا رہی تھی۔ اشعر اور شیزا دونوں نے ہی اپنی جینز کے پائنچے فولڈ کر لئے تھے جبکہ وہ خاموش نگاہوں سے ان دونوں کو مُھنسے لگاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ وہ تینوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے کہ اچانک شیزا کے قدموں میں تھوڑی سی تیزی آ گئی اور اس کا ساتھ دیتے ہوئے اشعر بھی کافی آگے بڑھ گیا تھا، تمکین بھی اپنے قدموں میں تیزی لا کر ان لوگوں کے ساتھ ہونا چاہتی تھی۔ مگر تیز چلنے کی ناکام کوشش میں یک لخت ہی اس کا پاؤں مڑا اور وہ کراہ کر وہیں بیٹھ گئی۔ جبکہ آج کے دن کو صرف اور صرف اس کے ساتھ منانے کا خواہشمند اشعر اس سے یکسر غافل شیزا احمد کے ساتھ آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔

☆☆☆

زندگی کے میلے میں، خواہشوں کے ریلے میں
تم سے کیا کہیں جاناں، اس قدر جھمیلے میں
وقت کی روانی ہے، بخت کی گرانی ہے
سخت بے زمینی ہے، سخت لامکانی ہے
ہجر کے سمندر میں
تخت اور تختے کی ایک ہی کہانی ہے
تم کو جو سنانی ہے
بات گو ذرا سی ہے بات عمر بھر کی ہے
عمر بھر کی باتیں کب، دو گھڑی میں ہوتی ہیں
درد کے سمندر میں
ان گنت جزیرے ہیں، بے شمار موتی ہیں
آنکھ کے جزیرے میں تم نے جو سجایا تھا
بات اس دیئے کی ہے بات اس گلے کی ہے
جو لہو کی خلوت میں چور بن کے آتا ہے
لفظ کی فصیلوں پر ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے
زندگی سے لمبی یہ بات رت جگے کی ہے
راہ میں کیسے کہیں، بات تخلیے کی ہے
تخلیے کی باتوں میں گفتگو اضافی ہے

پیار کرنے والوں کو ایک نگاہ کافی ہے

ہو سکے تو سن جاؤ ایک دن اکیلے میں

تم سے کیا کہیں جاناں اس قدر جھمیلے ہیں

شاہ ولاج ہاؤس میں اگلا دن اپنی پوری تاب ناکیوں کے ساتھ، روشن دھوپ لئے نکلا تھا۔ ازمیر شاہ اور سائمہ خان کی منگنی کی تیاریوں میں پورا گھر ہی جیسے گھن چکر بن کر رہ گیا تھا۔ ماسوائے فرزانہ بیگم اور ان کی بیٹی ماہم شاہ کے کیونکہ ان کے دل تو بری طرح سے حسد کی آگ میں جل رہے تھے۔

فرزانہ بیگم سائمہ خان جیسی امیر کبیر، حسین اور سمجھدار لڑکی کو اپنے بھتیجے سے منسوب کرنا چاہتی تھیں، اور دل ہی دل میں انہوں نے صالحہ سے بات کرنے کا ارادہ بھی کر لیا تھا کہ اچانک ازمیر شاہ کسی پکے ہوئے انگور کی طرح درمیان میں ٹپک پڑا اور وہ اپنے ارادوں پر پانی پھرتے دیکھ کر تلملا سی گئیں۔

اریشہ کو تو انہوں نے اس سے چھین لیا تھا لیکن اب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سائمہ خان کو اس کے نصیب سے دور کیسے رکھیں جبکہ ان کی بہو بھی ان کے ہاتھ میں نہیں تھی، اور شوہر کے ساتھ ساتھ بیٹا بھی مخالفین کی پارٹی میں شامل ہو گیا تھا۔ ایسے میں صرف تلملانے پر ان کا زور چل رہا تھا اور وہ خوب تلملا رہی تھیں۔ سائمہ خان آج ہلکے پھلکے میک اپ کے باوجود چودھویں کے چاند کی مانند حسین لگ رہی تھی۔ بالکل سادگی کے عالم میں بھی اس کا دل کش سراپا نگاہوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ خوشی کی ان گھڑیوں میں گھر کے ہر فرد کا چہرہ دمک رہا تھا۔ ماسوائے فرزانہ بیگم، ماہم شاہ اور اریشہ کے کہ جن کی آنکھیں بار بار ازمیر شاہ کو ہمیشہ کے لئے کھو دینے کے دکھ سے بات بے بات بھر آ رہی تھیں۔ اس کے لئے ازمیر شاہ سے بچھڑ جانے کا تصور ہی محال تھا۔ کجا کہ وہ اپنی آنکھوں سے اسے کسی اور کا ہوتے ہوئے دیکھتی اور اپنا بھرم رکھتی۔ دل پسلیوں کے اندر دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ اعصاب جیسے شل ہو رہے تھے، لیکن وہ اپنا ضبط آزماتی سرخ آنکھوں میں چھلکتے آنسو، دل پر گراتی سب کے ساتھ پتھر بنی کھڑی اسے نفاست سے تیار ہوئے سائمہ خان کے پہلو میں بیٹھا دیکھتی رہی۔

اذہان حسن شاہ بار بار اسے اپنی جانب متوجہ کر رہا تھا۔ اسے ہنسانے اور خود میں انٹرسٹ لینے پر فورس کر رہا تھا، لیکن وہ اپنا دھیان ازمیر شاہ سے ہٹا کر اس کی جانب مبذول کرنے پر رضامند نہ ہوئی تب ہی وہ خفا ہو کر وہاں سے چلا گیا۔

''مما، اریشہ مجھ میں انٹرسٹڈ نہیں ہے۔''

وہ سیدھا فرزانہ بیگم کے پاس آیا تھا جو پہلے ہی تنہا بیٹھی دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھیں۔

''انٹرسٹڈ نہیں ہے تو کیا ہوا، آرام سے شادی کرو، بعد میں دو دن عیش کر کے چھوڑ دینا۔''

''وہاٹ...... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں مما......؟'' اسے حد درجہ حیرانگی ہوئی تھی۔

''میں وہی کہہ رہی ہوں جو درست ہے، سمجھے تم......''

اس کی حیرانگی پر وہ درشتگی سے بولی تھیں۔ تب ہی وہ جھنجلا اٹھا۔

''لیکن مما۔ میں اس کے لئے سیریس ہوں اور چاہتا ہوں کہ وہ ہمیشہ میری وائف بن کر میرے گھر میں رہے......''

''لیکن وہ اس قابل نہیں ہے ازہان، اچھی طرح جانتی ہوں کہ اس نے ازمیر شاہ کے ساتھ کیسے کیسے گل کھلائے ہیں، یہ رشتہ تو میں نے صرف حائقہ اور اس کے بیٹے کو ان کی اوقات یاد دلانے اور نورینہ بی کو مٹھی میں کرنے کے لئے طے کیا ہے، ورنہ ایسی چپ گھنی، بدکردار لڑکی کا تو میں اپنے بیٹے پر سایہ بھی نہ پڑنے دوں۔''

''لیکن مما، اریشہ ہرگز ایسی لڑکی تھی نہیں میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں اُسے......''

اُس نے ایک بار پھر صدائے احتجاج بلند کرنا چاہی تھی لیکن ایک مرتبہ پھر فرزانہ بیگم نے اسے بری طرح سے ڈپٹ کر رکھ دیا۔

''خبردار، تمہیں اس دو ٹکے کی لونڈیا کی سائیڈ لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ فی الحال جیسے میں کہتی ہوں ویسے ہی کرو پھر اس کے بعد یہ دیکھتے ہیں کہ اس کا کیا کرنا ہے......؟''

''لیکن مما میں......''

''بس زیادہ دماغ خراب مت کرو میرا۔ وگرنہ آج ہی نورینہ کو جواب دے دوں گی میں......''

انتہائی کٹیلے لہجے میں اس کی بات کاٹتے ہوئے انہوں نے گویا دھمکی دی تھی جس پر اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتے ہوئے وہ ان کے کمرے سے باہر نکل آیا۔

فرزانہ بیگم کا یہ روپ اس کے لئے قطعی حیران کن تھا۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس کی مما، اریشہ کے لئے ایسے خیالات رکھتی ہوں گی۔ وہ تو سمجھتا تھا کہ اس کی مما نے ان دونوں کے مابین رشتے کا یہ بندھن صرف اور صرف اس کی خوشی کے لئے باندھا ہے۔ مگر یہ راز تو آج کھلا تھا اس پر کہ اس بندھن کے پیچھے دراصل اس کی مما کی دشمنی اور خودغرضی پوشیدہ تھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس وقت وہ کیا کرے۔

ازمیر شاہ کی جانب سے سائلہ خان کو انگوٹھی پہنائی جا رہی تھی۔ صالحہ بھابھی، احسن شاہ، حائقہ بیگم، ارسلان شاہ، غرضیکہ ہر فرد کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ سمیہ شاہ بھی اسلام آباد سے ایک ہفتے کی چھٹی پر یہاں آئی ہوئی تھی۔ خود صالحہ بھابھی اور سائلہ خان کے پیرنٹس خاصے مسرور دکھائی دے رہے تھے۔

ازمیر شاہ نے جس وقت انگوٹھی پہنانے کے لئے خوب صورت سی سائلہ خان کا نازک اندام ہاتھ تھاما تھا۔ اس وقت اریشہ کی آنکھیں خون آلود گرم آنسوؤں سے سلگ اٹھی تھیں۔ اتنی تکلیف تو اسے خود اپنی انگیجمنٹ پر بھی نہیں ہوئی تھی کہ جتنا اب اس کا ضبط ساتھ چھوڑ رہا تھا۔

سینے میں ایک دم سے ہی سانس جیسے گھٹنے لگا تھا۔ دل تھا کہ گہرے پاتال میں جیسے ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ کسی کے پاس اس کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت نہیں تھی۔ یہاں تک کہ خود اس کی مما، نورینہ بیگم کے پاس بھی نہیں۔ اس سے اپنی ٹانگوں پر مزید کھڑے رہنا دشوار ہو رہا تھا اور نظر کے بالکل سامنے گریس فل سے ازمیر شاہ اور اس کے پہلو میں بیٹھی سائلہ خان کی تصویریں دھڑا دھڑ کیمرے کی آنکھ میں محفوظ ہو رہی تھیں۔

پھر اس سے پہلے کہ وہ اپنا ضبط کھو دیتی۔ تیزی سے واپسی کے لئے پلٹی اور اسی اثناء میں سامنے سے آتے ہوئے اذہان احمد شاہ سے ٹکرا گئی جو خاصی استفہامیہ نگاہوں سے اس کی متورم بھیگی آنکھوں کو دیکھ رہا تھا۔ اریشہ اس وقت اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن وہ بنا، کچھ کہے سختی سے اس کا بازو تھام کر اسے اپنے کمرے کی طرف لے آیا۔

☆☆☆

''ناشتہ کر لو انجشاء تم نے پچھلے دو روز سے کچھ بھی نہیں کھایا ہے۔''

انجشاء کے بیڈ کے قریب دھری کرسی پر ریلیکس انداز میں بیٹھتے ہوئے اس نے التجا کی تھی مگر وہ اس کی التجا پر کسی زخمی ناگن کی طرح غصے سے بل کھا کر رہ گئی۔

''نہیں کھانا ہے مجھے کچھ بھی، جاؤ تم یہاں سے......''

''تم ایسا کیوں کر رہی ہو انجشاء، کیا تمہارے اس طرح کرنے سے دادا جی واپس آ جائیں گے اور پھر تم کیا سمجھتی ہو ان کے جانے کا دکھ صرف تمہیں ہے، مجھے یا میرے والدین کو ان کی ڈیتھ کا کوئی دکھ نہیں......''

''ہاں۔ کوئی دکھ نہیں ہے تمہیں ان کی ڈیتھ کا کیونکہ تم نے خود مارا ہے انہیں......''

''او کے۔ میں نے مارا ہے نا انہیں۔ تو چلو مجھے پھانسی کے تختے پر چڑھا دو، لیکن پلیز اس طرح کا بی ہیو کر کے میرے والدین کو پریشان مت کرو، پلیز......''

اس کی ضد کے سامنے عدنان کا لہجہ کافی پست ہو گیا تھا مگر انجشاء کے جلال میں قطعی کمی نہیں آئی تب ہی پھنکارتے ہوئے بولی۔

''میں انہیں یہاں پریشان کرنے نہیں آئی ہوں۔ تم لوگ خود مجھے یہاں لائے ہو، لیکن اب میں تمہارے ساتھ ایک پل بھی نہیں رہوں گی۔ میں ابھی اور اسی وقت یہاں سے جا رہی ہوں۔''

''تم ایسا کچھ نہیں کرو گی انجشاء۔''

اُسے بیڈ سے اترتے دیکھ کر خاصی تیزی سے وہ اس کی طرف لپکا تھا۔

''تم مجھے روکنے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔'' درشتگی سے اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے وہ کھڑی ہوئی تھی۔

''مت بھولو کہ تم میری منکوحہ ہو انجشاء......''

''نہیں بھولی۔ آج تک میں نے یاد رکھا ہے کہ میں تمہاری منکوحہ ہوں، وہ منکوحہ جسے دیکھے اور جانے بنا، تم ٹھکرا کر چلے آئے تھے لیکن اب تمہیں یہ بات بھولنی ہو گی مسٹر عدنان کیونکہ اب تک میں صرف اور صرف دادا جی کے لئے چپ تھی مگر اب میں چپ نہیں رہوں گی۔ اب میں تمہیں عدالت میں گھسیٹوں گی اور تم سے چھٹکارہ پانے کے بعد سکون کا سانس لوں گی۔''

شدید غصے کی وجہ سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ تب ہی عدنان نے اس کی سمت دیکھنے سے گریز کیا۔

''تم ایسا کچھ نہیں کرو گی انجشاء......''

''سوری۔اب مجھے ایسا کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔'' وہ اپنی ضد پر ہنوز قائم تھی۔

''تم سراسر حماقت کر رہی ہو انجشاء۔مت بھولو کہ دادا جی صرف تمہارے دادا جی نہیں تھے ان کا میرے ساتھ بھی کوئی رشتہ تھا۔وہ میرے بھی دادا جی تھے۔''

عدنان نے سخت جھنجلاہٹ کے عالم میں سامنے والی دیوار پر ہاتھ مارا تھا۔جب وہ بپھرتے ہوئے بولی۔

''کچھ نہیں لگتے تھے وہ تمہارے صرف میرے دادا جی تھے وہ،سنا تم نے......''

''ہاں سن لیا،لیکن تم بھی کان کھول کر سن لو انجشاء۔میرے پاپا اس وقت بہت ڈپریس ہیں ان کے لئے کسی بھی قسم کی پریشانی سخت نقصان دہ ہے۔سو جب تک وہ سنبھل نہیں جاتے۔تم کوئی حماقت نہیں کرو گی،انڈر اسٹینڈ......؟''

سخت درشت لہجے میں تنبیہہ کرتے ہوئے اس نے کہا اور اگلے ہی پل فوراً کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

پوچھنے والے تجھے کیسے بتائیں آخر
دکھ عبارت تو نہیں ہے جو تجھے لکھ بھیجیں
یہ کہانی بھی نہیں ہے کہ سنائیں تجھ کو
نہ کوئی بات ہی ایسی کہ بتائیں تجھ کو
زخم ہو تو تیرے ناخن کے حوالے کر دیں
آئینہ بھی تو نہیں ہے کہ دکھائیں تجھ کو
اب تجھے کیسے بتائیں کہ ہمیں کیا دکھ ہے

وقت اپنی دھیمی رفتار سے گزر رہا تھا اور اس گزرتے وقت کا ہر لمحہ تمکین اور اشعر کے مابین فاصلوں کی دیوار کھڑی کر رہا تھا۔جسے چاہنے کے باوجود نہ تو تمکین گرا پا رہی تھی اور نہ ہی ایسا کرنا اب اشعر کے بس میں رہا تھا۔

شیزا اب بڑے دھڑلے کے ساتھ آفس ٹائم کے بعد بھی اشعر کے ساتھ اس کے گھر آ جاتی،اور وہ دونوں مل کر اکٹھے چائے پیتے۔یا پھر کوئی نہ کوئی گیم کھیلتے۔اکثر رات زیادہ ہو جاتی تو اشعر اسے گھر ڈراپ بھی کر کے آتا اور اکثر وہ دونوں آفس سے ہی ''حسن ولاج'' چلے جاتے اور پھر اشعر رات گئے ہی گھر واپس لوٹتا تھا۔ایسے میں تمکین جلے پیر کی بلی کی مانند سارے گھر میں چکراتی پھرتی،مصیبت تو یہ تھی کہ وہ شیزا کے خلاف کوئی قدم بھی نہیں اٹھا سکتی تھی۔دوسرا سعید احمد صاحب اور رخسانہ بیگم بھی یہاں نہیں تھے جو اشعر کی لاپرواہیوں پر اسے ڈانٹتے اور تمکین کی سائیڈ لیتے۔

اُس روز وہ حسب معمول کچن میں ناشتہ تیار کر رہی تھی اور اشعر کمرے میں آفس کے لئے تیار ہو رہا تھا کہ شیزا صبح ہی صبح وہاں چلی آئی۔

اس گھر میں اس کی آمد کوئی اچنبھے والی بات نہیں تھی مگر یوں صبح ہی صبح ناشتے سے پہلے اس کا وہاں چلے آنا تمکین کو بالکل بھی اچھا نہیں لگا تھا۔

''ہائے اشعر، تم تیار نہیں ہوئے ابھی تک......؟''

تمکین سے مختصر سی ہیلو ہائے کے بعد وہ سیدھی اشعر کے پاس چلی آئی تھی جو آئینے کے سامنے کھڑا کوئی شوخ سا گیت گنگناتے ہوئے اپنے بال بنا رہا تھا۔

''او تھینک گاڈ، شیزا کہ تم آگئیں ورنہ میری طرف سے تو آج پارٹی میں شمولیت ایک دم مس تھی......''

آئینے سے ہٹ کر اس نے مسکراتے ہوئے شیزا کا استقبال کیا تھا۔ جب وہ قدرے اٹھلا کر بولی۔

''کیوں آج ٹائم پر نہیں اٹھے کیا......؟''

''نہیں یار، نمی کو تو تم جانتی ہو کتنی بے خبر عورت ہے اوپر سے یہ شرٹ دیکھو۔ ہزار مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ میرے کپڑے پریس کرنے سے قبل تھوڑا دیکھ لیا کرے مگر مجال ہے جو اس کے کان پر جوں تک رینگ جائے۔''

قدرے آف موڈ کے ساتھ جھنجھلا کر نائی اس نے قریبی بیڈ پر پھینکی تھی جب شیزا مسحور کن مسکراہٹ لبوں پر سجائے اس کے قریب چلی آئی۔

''اوکم آن اشعر، گھر کے کام کاج کی مصروفیت میں اکثر ایسا ہو جاتا ہے۔ اینی ویز لاؤ میں بٹن ٹانک دیتی ہوں۔''

کتنا فریبی انداز تھا اس کا مگر افسوس کہ اشعر اس کے ارادوں کو نہیں سمجھ سکا، تب ہی سوئی لا کر اس کے ہاتھوں میں تھما دی اور خود سوئی میں دھاگہ پرونے لگا۔ اس وقت شیزا یوں دیوانگی سے اشعر کی طرف دیکھ رہی تھی گویا اسے آنکھوں ہی آنکھوں سے دل میں اتار لینا چاہتی ہو۔

تمکین انہیں ناشتے کا کہنے کے لئے گرم گرم چائے کا کپ ہاتھ میں لئے کمرے کے اندر آئی تو شیزا اشعر کے بالکل ساتھ لگی۔ اس کی شرٹ سے دھاگہ کاٹ رہی تھی۔ اشعر کی گرم گرم سانسوں نے اس کے دلکش چہرے پر عجیب سے رنگ بکھیر دیئے تھے۔ ایک لمحے کے لئے تو اس کا دل جیسے ڈوب سا گیا۔ ہاتھوں میں تھامے گرم کپ کی ابلتی چائے، چھلک کر اس کے ہاتھوں پر آن گری مگر اسے تکلیف کا احساس تک نہ ہو سکا۔

دل کے ساتھ ساتھ پورا بدن بھی جیسے سن ہو کر رہ گیا تھا۔

اشعر کی نظر جونہی اس کی جانب اٹھی وہ شیزا کو پرے دھکیلتے ہوئے لپک کر اس کے قریب آیا پھر انتہائی تفکر کے عالم میں اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر لبوں سے لگا لیا۔

''او پاگل لڑکی، کن خیالوں میں گم ہو، گرم چائے چھلک کر تمہارا ہاتھ جلا گئی اور تمہیں ہوش تک نہیں......'' وہی اپنائیت و محبت بھرا اس کا انداز کہ جس کے مفقود ہونے پر تمکین بری طرح سے بکھر رہی تھی۔ اس وقت اسے دیکھنے کو ملا تھا اور وہ اشعر کی اس قدر توجہ پر بلاوجہ ہی اپنا اختیار کھو کر اس کے سینے سے جا لگی۔

''نمی کیا ہوا ہے جان، پلیز ٹیل می......''

انتہائی آہستگی سے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے اس نے پوچھا تھا جب تمکین نے بھرائی آنکھوں سے ایک بھرپور نظر اس کی مقناطیسی

آنکھوں میں ڈالتے ہوئے دھیرے سے نفی میں سر ہلا دیا۔

''سلی گرل......''

محبت سے مسکرا کر اس کی نم آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دھیمے سے اس نے کہا اور اگلے ہی پل شیزا کے ہمراہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس روز بھی موسم خاصے جارحانہ تیور اپنائے ہوئے تھا۔ تمکین پورا دن ''حسن ولاج'' میں آسیہ بیگم اور عائشہ بیگم کے ساتھ رہی تھی، لیکن دوپہر میں لنچ کے بعد اشعر اسے واپس گھر ڈراپ کر گیا تھا۔ رم جھم برستی پھوار کا سلسلہ تو صبح ہی سے جاری تھا، لیکن اب بادلوں کی گرج اور بجلی کی چمک نے اسے خاصا خوف زدہ کر دیا تھا۔ بارش کی شدت میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ اوپر سے اشعر کا کہیں کچھ پتہ نہیں تھا۔ وہ اسے گھر ڈراپ کرنے کے بعد آفس روانہ ہو گیا تھا۔ جہاں شام میں اسے ایک انتہائی اہم میٹنگ اٹینڈ کرنا تھی، لیکن اب رات کے گیارہ بج رہے تھے اور اسکی کہیں کوئی خبر نہیں تھی۔

تمکین نے بار بار اس کا موبائل نمبر بھی ٹرائی کیا تھا اور آفس کے نمبر پر بھی دو تین مرتبہ رنگ کیے تھے لیکن اشعر کا موبائل نمبر تو ہر بار آف ملا اور آفس سے ہر بار یہی پتہ چلا کہ صاحب آفس میں نہیں ہیں اور نہ ہی کچھ بتا کر گئے ہیں۔

وہ چاہتی تو حسن ولاج فون کر کے دادا جی سے اشعر کی شکایت کر سکتی تھی لیکن وہ انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کیونکہ اشعر کی یہ لاپروائیاں تو اب ایک معمول بنتی جا رہی تھیں۔ پھر بھلا وہ کب تک اسے سمجھاتے۔

شب کے ساڑھے گیارہ ہو رہے تھے اوپر سے بارش کی شدت اور بجلی کی کڑک نے اسے مزید سہما دیا تھا۔ محل جیسا وسیع گھر اور وہ اکیلی جان اوپر سے لائٹ بھی چلی گئی تھی۔

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا اس کے خوف میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ آج تک کبھی ایسے موسم میں اکیلی نہیں رہی تھی۔ تب ہی یہ خوفناک موسم اور رات کی تاریکی اسے کسی خشک پتے کی مانند کانپنے پر مجبور کر رہی تھی۔ ہر طرف سے ہار مان کر اس نے بالآخر اریج احمر کا موبائل نمبر پریس کر ڈالا تھا تاکہ اس سے اشعر کے بارے میں کچھ معلوم ہو سکے۔ کیونکہ وہ اشعر کا بزنس پارٹنر تھا اور اسے لازمی طور پر اشعر کی مصروفیت کے بارے میں پتہ ہونا چاہئے تھا۔

اریج آفس سے نکل کر ابھی مین روڈ پر آیا ہی تھا۔ جب اس کے موبائل پر بیپ ہوئی اور اس نے خاصی بے زاری کے عالم میں موبائل اٹھا کر اس کی اسکرین پر نگاہ ڈالی جہاں تمکین کا موبائل نمبر اور اس کا نام واضح حروف میں جگمگا رہا تھا۔ تب انتہائی حیرانگی کے عالم میں اس نے گاڑی کی رفتار سلو کر کے موبائل کان سے لگا لیا۔

''ہیلو اریج، دیکھیے میں تمکین بول رہی ہوں، پلیز بتایئے ناں کہ اشعر کہاں ہیں؟ اور وہ ابھی تک گھر کیوں نہیں پہنچے۔''

اس کے کال ریسیو کرتے ہی تمکین نے خاصی بے تابی سے پوچھا تھا۔ جس سے وہ اس کی گھبراہٹ کا بخوبی اندازہ لگا سکتا تھا۔ مگر حیرانگی کی بات تو یہ تھی کہ اشعر پچھلے ایک گھنٹے سے آفس سے غائب تھا اور آفس سے نکلتے ہوئے اریج کے استفسار پر اس نے یہی بتایا تھا کہ وہ گھر جا رہا ہے مگر تمکین بتا رہی تھی کہ وہ گھر پر نہیں ہے، تو پھر وہ کہاں گیا؟

یہی سوال اس وقت اسے الجھا رہا تھا لیکن وہ تمکین سے اپنی الجھن کا اظہار کر کے اسے مزید پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ سو خود کو ریلیکس رکھتے ہوئے بولا۔

''پلیز ڈونٹ وری تمکین، اشعر آفس سے گھر کے لئے نکل چکا ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ خراب موسم کے باعث اسے گھر پہنچنے میں کوئی دشواری ہو رہی ہو۔ بہر حال آپ گھبرایئے نہیں، میں ابھی اس کا پتہ لگا کر اسے گھر روانہ کرتا ہوں، اوکے......''

نہایت اپنائیت کے ساتھ اس نے کہا اور تمکین کے موبائل آف کرنے پر خود بھی اپنا موبائل سامنے اسکرین پر ڈالتے ہوئے اشعر کے متعلق سوچنے لگا۔ شیزا اور اشعر کی موجودہ سرگرمیاں اس سے ہرگز پوشیدہ نہیں تھیں لیکن وہ اپنی آوارگی میں تمکین کے وجود سے اس حد تک غافل ہو جائے گا اس کا گمان بھی نہیں تھا اسے۔ تب ہی وہ بری طرح سے الجھ کر رہ گیا تھا۔

اس کے آفس سے اشعر کے گھر کا راستہ بمشکل پندرہ بیس منٹ پر محیط تھا اور جس وقت اشعر آفس سے نکلا تھا اس وقت تو موسم بھی اتنا خراب نہیں تھا کہ اس کو گھر پہنچنے میں کسی قسم کی کوئی دشواری پیش آتی، لیکن اس کے باوجود وہ گھر نہیں پہنچا تھا، آخر کیوں؟

اتنے خراب موسم میں تمکین کی تنہائی کا احساس اس کی جان پر بنا رہا تھا تب ہی تو وہ انتہائی خطرناک موسم کی پرواہ کیے بغیر تیز ڈرائیونگ کے ساتھ جگہ جگہ اسے تلاش کرتا رہا۔

شب کے بارہ بج رہے تھے اور وہ شدید تھکن محسوس کر رہا تھا کہ جب اچانک اس کی نظر ایک شاندار سے ریسٹورنٹ کے شیشوں کے پار بیٹھے اشعر احمد اور شیزا پر پڑی جو دنیا جہاں سے بے خبر اپنی ہی خوش گپیوں میں مصروف گرم گرم چائے کا لطف اٹھا رہے تھے۔

اریج کی آنکھیں جہاں اشعر کی اس درجہ غیر ذمہ داری پر سلگی تھیں وہیں اس کا دماغ شیزا کی کھلی بے حیائی پر کھول اٹھا تھا۔

تمکین کتنا اعتبار کرتی تھی اس پر؟ مگر وہ کتنی بے رحمی کے ساتھ اس کے حق پر ڈاکہ ڈال رہی تھی۔ تب ایک جھٹکے سے اپنی گاڑی سڑک کے کنارے پارک کرتے ہوئے وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ریسٹورنٹ کے اندر چلا آیا۔ جہاں اب اشعر شیزا کی کسی بات پر کھلکھلا کر ہنس رہا تھا۔ ہنسنے کے دوران ہی اس کی نظر غصے سے سرخ اریج احمر پر پڑی تھی اور ہنسی سمیٹ کر خاصی حیرانگی سے اس کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

''ہیلو مسٹر اریج، آپ اس وقت یہاں کیسے......؟''

قطعی نارمل لہجے میں دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے پوچھا تھا۔ جب اریج ایک سلگتی ہوئی نگاہ اس کی مقناطیسی نگاہوں پر جما کر خاصی درشتی سے بولا۔

''آپ غالباً بھول رہے ہیں مسٹر اشعر کہ آپ ایک شادی شدہ مرد ہیں اور اس وقت انتہائی خراب موسم میں آپ کی وائف آپ کے گھر پر اکیلی آپ کا انتظار کر رہی ہے......''

''اوہ...... آپ کو بڑی فکر ہے ان کی وائف کی......''

اس کے سرد لہجے پر اشعر کے کچھ کہنے سے قبل ہی اس کے پہلو میں بیٹھی شیزا احمد نے کن اکھیوں سے اشعر کے قدرے شرمندہ چہرے پر

اچٹتی سی نگاہ ڈالتے ہوئے قدرے ہوشیاری سے کہا تو وہ چاہنے کے باوجود اپنے جلال پر قابو نہ رکھ سکا اور پلٹ کر ایک زبردست طمانچہ اس کے بائیں گال پر رسید کر دیا جس پر وہ بلبلا کر رہ گئی۔

ریسٹورنٹ کے پُرسکون ماحول میں اس طمانچے کی گونج نے اچانک ہی ایک عجیب سا ارتعاش برپا کر دیا تھا۔ کیسی چٹانوں سی سختی تھی اس کے چہرے پر تب ہی اشعر جیسے ٹرانس کی سی کیفیت سے باہر نکلا اور لپک کر اریج احمر کا گریبان اپنی گرفت میں لے لیا۔

''یو اسٹوپڈ' تمہاری ہمت کیسے ہوئی کہ تم میرے ہی سامنے، میری کزن پر ہاتھ اٹھاؤ......''

''شٹ اپ، کزن کی فکر ہے تمہیں، لیکن اپنی بیوی کی کوئی فکر نہیں جو نہ جانے کب سے پل پل تمہاری راہ دیکھتے ہوئے تمہارے گھر لوٹنے کا انتظار کر رہی ہے اور تم یہاں اس آوارہ لڑکی کے ساتھ رات کے بارہ بجے موسم کو انجوائے کر رہے ہو، شرم آنی چاہئے تمہیں اشعر احمد۔''

ایک جھٹکے سے اپنا گریبان اس کی گرفت سے چھڑاتے ہوئے وہ بلند آواز میں چلایا تھا۔ جس پر ارد گرد بیٹھے لوگ ان دونوں کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ تاہم اس سے پہلے کہ اشعر اس کے جواب میں مزید کچھ کہتا، وہ اسے شعلہ بار نگاہوں سے گھورتے ہوئے پھر اگلے ہی پل تیز تیز قدم اٹھاتا ریستوران سے باہر نکل گیا تھا۔ اس کے ریستوران سے باہر نکلتے ہی اشعر نے شدید غصے کے عالم میں اپنے سامنے پڑی میز کو زبردست ٹھوکر رسید کی تھی۔

نہ جانے کیوں گزرتے ہر دن کے ساتھ اس کے شک کو تقویت مل رہی تھی۔ ثیزا نے ابھی حال میں اریج اور تمکین کے خفیہ تعلقات کی جو گرہ اس پر کھولی تھی۔ اب ہر گزرتے لمحے کے ساتھ یہ گرہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ ان چکروں میں الجھنا نہیں چاہتا تھا مگر الجھتا چلا جا رہا تھا۔

''پلیز بی ریلیکس اشعر، ایکچولی سارا قصور تو میرا ہی ہے، نہ میں تمہیں اصرار کر کے اپنے ساتھ یہاں لاتی اور نہ وہ دو ٹکے کا انسان یوں سرِ عام تمہاری بے عزتی کرتا، لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اسے تمکین کی تنہائی کا کیسے معلوم ہوا جبکہ آفس سے نکلتے وقت تم نے اسے گھر لوٹنے کا کہا تھا۔ خیر لگتا ہے کہ تمکین نے خود اس سے تمہاری شکایت کی ہے یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تمکین کی تنہائی کا فائدہ اٹھا کر خود ہی تمہارے گھر پہنچ گیا ہو، تب ہی تو بار بار تمکین کے اکیلے پن کا ذکر کر رہا تھا ورنہ اسے کوئی خواب تو نہیں آیا ہوگا کہ تم اس وقت گھر پر تمکین کے ساتھ نہیں ہو......''

وہ ریسٹورنٹ سے باہر نکل کر اپنے دونوں ہاتھ گاڑی پر ٹکائے کھڑا تھا جب ثیزا نے اس کے کان بھرے۔

''اشعر...... اریج تمکین سے بہت پیار کرتا ہے۔ تم سے بھی زیادہ اور یہ بات میں اچھی طرح سے جانتی ہوں۔ مگر میں تمہارے اور تمکین کے رشتے کے مابین دراڑ ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔ سو یہ بات تم سے چھپائی، مگر اب پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے اشعر اب تمہیں اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھ کر حالات کا خود جائزہ لینا ہوگا، بصورت دیگر وہ تمکین کو تم سے چھین لے گا اور تم یونہی جلتے کڑھتے اکیلے رہ جاؤ گے......''

کتنی چالاکی سے اس نے اشعر کی سماعتوں میں زہر انڈیلنے کی کوشش کی تھی، لیکن اشعر نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا، اور چپ چاپ فرنٹ ڈور کھول کر اپنی سیٹ سنبھال لی کہ اس وقت اس کے دل و دماغ میں بہت خطرناک آندھیاں چل رہی تھیں اور وہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ

جذبات یا غصے کی رو میں بہہ کر وہ اپنا سب کچھ ان آندھیوں کی نذر کردے، سو ہاتھ بڑھا کر اپنا پسندیدہ والیم آن کیا اور اپنے ڈسٹرب ذہن کو ریلیکس کرنے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔

بن تمہارے ہے شہر اتنا اداس
تا سحر میں دیے جلاتا ہوں
سرمئی شام جب بھی آتی ہے
میں اداسی کے گیت گاتا ہوں

خوف کے بیاباں میں
کون یہ بتائے گا؟
عمر بھر کی محرومی
ہولناک رستوں پر
موت کیوں دکھائی دیتی ہے

''مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے اریشہ.....''

اذہان حسن شاہ نے اسے اپنے کمرے میں لاتے ہی اپنی سنجیدہ نگاہیں اس کے اداس سراپے پر جماتے ہوئے کہا تھا جس پر وہ قدرے چونک کر اس کا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔

''اریشہ' پلیز سچ بتانا' کیا تم......؟ کیا تم واقعی از میر شاہ میں انٹرسٹڈ ہو؟ یا موم جو کہہ رہی ہیں وہ محض ان کا قیاس ہے......؟''

اس وقت اس کا دل کتنا مضطرب تھا یہ اریشہ نہیں سمجھ سکی تھی۔ تب ہی اس غیر متوقع سوال پر قدرے دھیمے لہجے میں بولی۔

''تم یہ سوال مجھ سے کیوں کر رہے ہو اذہان......؟''

''کیونکہ میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں اریشہ اور یہ چاہتا ہوں کہ تم ہمیشہ میری محبت بن کر میرے آنگن میں آباد رہو۔ مگر مما ایسا نہیں چاہتیں۔ ان کے بقول تم از میر شاہ میں انٹرسٹڈ ہو اور ان سے بچھڑنے کا دکھ اندر ہی اندر تمہیں کمزور کر رہا ہے۔ کیا یہ سچ ہے اریشہ' پلیز ٹیل می......''

اذہان کے قطعی غیر متوقع سوال نے اسے خاصی پریشانی میں ڈال دیا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اذہان کبھی اس سے یہ سوال بھی کر سکتا ہے۔

اپنی محبت کی داستان تو اس نے خود اپنے آپ سے بھی چھپائی تھی تو پھر فرزانہ بیگم تک اس کی تپش کیسے پہنچ گئی......؟

''پلیز جواب دو اریشہ' تمہاری خاموشی میرے ضبط کا امتحان لے رہی ہے......''

ایک مرتبہ پھر اس نے عاجزی سے درخواست کی تھی جبکہ نیچے ہال میں ابھی ابھی ازمیر شاہ سائلہ خان کے پاس سے اٹھ کر اوپر آیا تھا۔ نیچے ابھی کچھ دیر پہلے۔ اس نے الگ تھلگ ایک کونے میں کھڑی اریشہ خان کو چپکے چپکے روتے ہوئے دیکھا تھا، اور وہ تب سے ہی بے قرار ہو گیا تھا۔ آج وہ ہر قیمت پر اریشہ کی مرضی جان لینا چاہتا تھا کہ اذہان کے کمرے سے آتے اسکے سوال نے 'وہیں کمرے کی دہلیز کے پار' اس کے تیزی سے اٹھتے قدم روک دیئے' جو سوال وہ خود اریشہ سے پوچھنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ وہی سوال اذہان' اس سے کر رہا تھا اور ادھر کمرے کی دہلیز کے پار اسکے جسم کا ایک ایک عضو گویا کان بن گیا تھا۔ اریشہ کی صرف ایک ہاں یا ناں پر اس کی پوری زندگی داؤ پر لگی تھی۔ تب ہی اس نے اریشہ کو کہتے ہوئے سنا۔

''میں ازمیر شاہ میں انٹریسٹڈ نہیں ہوں اذہان' فرزانہ آنٹی کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے......''

''لیکن تمہاری آنکھوں کا یہ دکھ' یہ تمہاری شخصیت پر چھائی بے کلی' کچھ اور ہی کہانی سنا رہی ہے اریشہ' تم کسے فریب دے رہی ہو' مجھے ازمیر شاہ یا پھر اپنے آپ کو......؟''

وہ فوراً اسے کھوجنا چاہتا تھا۔ اس کے اندر اتر کر حقیقت کا پتہ لگانا چاہتا تھا۔ مگر اریشہ مسلسل چکنی مچھلی کی طرح بار بار ہاتھ سے پھسل رہی تھی۔

''تم مجھ پر بہتان لگانے کی کوشش کر رہے ہو اذہان' ورنہ حقیقت یہی ہے کہ مجھے ازمیر حسن شاہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور نہ ہی اسے میری ذات سے کوئی لگاؤ ہے۔ وہ پہلے شہرین خان کو چاہتا تھا اور اب اس سے بچھڑنے کے بعد سائلہ خان کو چاہنے لگا ہے۔ اس کی زندگی میں میری جگہ کہیں نہیں ہے اذہان اور جس شخص کی زندگی میں آپ کے لیے کوئی جگہ ہی نہ ہو۔ آپ اس کے حوالے سے کوئی بھی خواب اپنی آنکھوں کے سپرد کیسے کر سکتے ہیں......''

کس قدر بکھرا ہوا لہجہ تھا اس کا' لیکن اس سے بھی کہیں تکلیف میں تو اس وقت ازمیر حسن شاہ تھا کہ جو اس کی واضح ناپسندیدگی کے بعد ایک دم سے جیسے بکھر کر رہ گیا تھا۔

''تھینک یو سویچ۔ تم نے مما کے گمان کو باطل ٹھہرا کر میری محبت کو زندگی عطا کر دی ہے اریشہ! میں تمہیں کھو دینے کا تصور بھی نہیں رکھتا......''

اس وقت' اس کے نم چہرے سے نگاہ چرائے۔ اذہان حسن شاہ جو کچھ بھی کہہ رہا تھا وہ بالکل سچ تھا۔ تب ہی اریشہ نے بمشکل مسکراتے ہوئے سرسری سی اک نگاہ اس کے ریلیکس چہرے پر ڈالی، اور ہتھیلی کی پشت سے اپنی بھیگی پلکیں صاف کر کے اس کے کمرے سے باہر نکل آئی جہاں اس وقت ازمیر شاہ کا وجود مفقود ہو چکا تھا۔

وہ رات ''شاہ ولاج'' کے مکینوں کے لیے خوشیوں کی تھی لیکن اسی رات اریشہ اور ازمیر کی اشک آلود آنکھوں نے ہزاروں کے حساب سے اشکوں کے انمول موتی بے رحمی سے لٹائے تھے۔

ازمیر جانتا تھا کہ اریشہ کی خوشی صرف اور صرف اذہان شاہ کی وابستگی میں ہے اور اس کی دل سے خواہش تھی کہ وہ اپنے پیار کو پا کر زندگی بھر شاد و آباد رہے' اس کے پاکیزہ دامن پر کبھی اس کی ذات کی وجہ سے کوئی داغ نہ لگے۔ سو اس نے دل کے زخموں کی پروا کیے بغیر' سب کی خوشی کے لیے

سائلہ خان کو اپنا لیا تھا۔ مگر یہ قرار نہ جانے کس بلا کا نام تھا کہ اب تک وہ اس کے حصول کے لیے تڑپ رہا تھا اور وہ اسے حاصل ہی نہیں ہو رہا تھا۔

اگلی صبح رات بھر جاگنے کے باعث وہ صبح دیر سے بیدار ہوا۔ کچھ دیر یونہی کسلمندی سے بستر پر پڑے رہنے کے بعد اس نے باتھ لیا اور فریش ہو کر نیچے ہال میں چلا آیا۔ جہاں خلاف توقع سبھی گھر والوں کے ساتھ سائلہ خان بھی ناشتے کی ٹیبل پر براجمان تھی۔

''ارے تمہاری آنکھوں کو کیا ہوا ازمیر' یہ اتنی سرخ کیوں ہو رہی ہیں......؟''

سب سے پہلے' اسی کی نگاہ......ازمیر کی آنکھوں سے ٹکرائی تھی۔ لہٰذا وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی جبکہ اس کی نشاندہی پر گھونٹ گھونٹ چائے حلق میں انڈیلتی اریشہ خان نے بھی فوراً اس کی سمت دیکھا تھا۔ تب ازمیر کے کچھ کہنے سے قبل ہی سمیہ شاہ چہک اٹھی۔

''بھابھی! بھیا رات بھر آپ کے تصور سے بے چین سو نہیں پائے۔ یہ سرخی اسی کا نتیجہ ہے......''

اس کے الفاظ پر سبھی لوگوں نے بلند قہقہے لگائے تھے۔ ماسوائے فرزانہ بیگم اور اریشہ خان کے' کہ جس کا دل اب درد سے یکسر نڈھال ہو چکا تھا۔

''اذہان' مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے......''

آہستگی سے کپ ٹیبل پر رکھ کر اس نے اذہان سے براہ راست کہا تھا اور سب حیرانگی سے اس کی سمت متوجہ ہو گئے تھے۔

☆☆☆

رؤف حسین صاحب کا چالیسواں ہو چکا تھا اور انجشاء نے یہ دن جیسے کسی قید میں بسر کیے تھے۔

ہر روز عدنان رؤف کا سامنا کرنا اور اس کی باتوں کا جواب دینا۔ اس کے لیے ہرگز کسی مصیبت سے کم نہیں تھا۔ تب ہی رؤف حسین صاحب کے چالیسویں کے بعد وہ احمد رؤف صاحب کی طبیعت کسی حد تک سنبھل جانے پر ایک روز ڈنر کے دوران ان سے کہہ بیٹھی۔

''مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے انکل......''

ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی اس کا لہجہ انتہائی خشک تھا۔ تب ہی احمد رؤف صاحب کے ساتھ ساتھ' سیال بیگم اور عدنان رؤف کے ہاتھ بھی کھانے سے رک گئے تھے۔

''کہو بیٹے' میں سن رہا ہوں۔''

احمد رؤف صاحب نے انتہائی شفقت سے اپنا ہاتھ اس کے سر پر دھرتے ہوئے کہا تھا' جواب میں وہ تھوڑی دیر خاموشی سے اپنے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولی۔

''میرے دادا جی کی وفات کے بعد میری تنہائیوں کا خیال کرتے ہوئے آپ نے اب تک مجھے اپنے گھر میں اپنے ساتھ رکھا' میں اس کے لیے آپ سب کی شکرگزار ہوں انکل' لیکن اب میں نے اپنے آپ کو مکمل طور پر سنبھال لیا ہے۔ اب میں یہ سمجھ چکی ہوں کہ میں کتنے بھی آنسو بہالوں میرے دادا جی اب واپس اس دنیا میں آنے والے نہیں۔ سو اس روگ کا چوغہ میں اپنی ذات سے اتار کر اب بہادری سے جینا چاہتی ہوں اور یہ امید

کرتی ہوں کہ آپ میری خوشیوں کی راہ میں ہرگز رکاوٹ نہیں بنیں گے......"

عدنان کو جس بات کا ڈر تھا' وہ بالآخر ہونے جارہی تھی۔تب ہی اس نے اشارے سے انجشاء کو اس کے خطرناک ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔مگر وہ قطعی اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔لہٰذا اپنے فیصلے پر ڈٹی رہی۔

''انجو بیٹی۔تم کھل کر کہو ناں کہ کیا کہنا چاہتی ہو؟''

احمد رؤف صاحب' اس کی مبہم تمہید سے تھوڑا سا پریشان ہوئے تھے جب وہ سرسری سی ایک نظر ان کے بائیں طرف بیٹھی سیال بیگم پر ڈالتے ہوئے بولی۔

''میں اب آپ لوگوں کے ساتھ مزید نہیں رہنا چاہتی انکل،اور دوسری بات کہ آج سے چند سال قبل میرے اور آپ کے بیٹے کے مابین زبردستی کا جو بندھن میرے بابا اور میرے دادا جی نے باندھا تھا۔میں اب ان کی رحلت کے بعد یہ بندھن ہمیشہ کے لیے توڑ دینا چاہتی ہوں لہٰذا بہتر ہوگا کہ آپ آسانی سے مجھے اپنے بیٹے سے چھٹکارہ دلا دیں۔بصورت دیگر میں آپ لوگوں کو عدالت میں گھسیٹنے پر مجبور ہوں۔'' وہ اس وقت کسی بھی ادب ولحاظ سے قطعی ماورا تھی۔

''انجو یہ...... یہ تم کیا کہہ رہی ہو بیٹے......''

احمد رؤف صاحب کے ہاتھوں سے چمچ چھوٹ کر پلیٹ میں جا گرا تھا۔جب وہ دوبارہ سے دل مضبوط کرتے ہوئے بولی۔

''میں آپ لوگوں کا گھر اور ساتھ چھوڑ کر جارہی ہوں انکل' آپ کے اس شاندار بنگلے کی اونچی دیواروں میں میرا سانس اب گھٹنے لگا ہے۔گو اب میرے پاس میری ماں' میرے بابا اور میرے دادا جی کی بے لوث محبتوں کا سہارا نہیں رہا لیکن اس کے باوجود مجھے آپ کا سہارا قبول نہیں ہے۔سو اپنے بیٹے سے کہیے کہ یہ جلد مجھے فارغ کردے۔وگرنہ مجبوراً مجھے دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔''

چٹانوں سے سخت لہجے میں بولتی اس لڑکی پر عدنان کو کتنا غصہ آیا تھا۔یہ صرف اس کا دل جانتا تھا۔مگر وہ بے بس تھا اسے کچھ بھی کہنے کا اختیار نہیں رکھتا تھا۔

''انجشاء' تم ہوش میں تو ہو بیٹی' ہم تمہارے اپنے ہیں' تمہارا بھلا چاہتے ہیں اور تم ہمیں ہی عدالتوں میں گھسیٹنے کا کہہ رہی ہو......؟''

سیال بیگم کو اس کے الفاظ خاصے ناگوار گزرے تھے۔تب ہی وہ خاموش نہ رہ سکی تھیں۔

''میرا بھلا' کیسا بھلا آنٹی' کیسا اپنا پن......؟''

ان کے الفاظ نے ایک استہزائیہ سی مسکراہٹ اس کے ترشیدہ لبوں پر بکھیر دی تھی۔

''آپ لوگ اگر میرے اپنے ہوتے تو کبھی میری ذات پر داغ لگا کر مجھے یوں دربدر تنہا بھٹکنے پر مجبور نہ کرتے' آپ جانتی ہیں آپ کی اس بے رحمی پر میری پیاری ماں خون تھوک تھوک کر مرگئی۔میرے جان سے پیارے بابا' زندگی کے آخری لمحے تک آپ لوگوں سے ملنے کے لیے ترستے رہے۔زندگی بھر ان کی آنکھیں آپ کی دید کی پیاسی رہیں۔آپ نہیں جانتیں آنٹی لیکن میں جانتی ہوں کیونکہ میں نے اپنے بابا کی دم توڑتی آنکھوں

میں ٹوٹی امیدوں کی کرچیاں بکھرتے دیکھی ہیں' حویلی کے دروازے کی آہٹ سے لگی ان کی ساعتوں کا تڑپنا دیکھا ہے میں نے، لیکن ان کے جیتے جی آپ لوگوں نے کبھی حویلی کا رخ نہیں کیا۔ آپ کا یہ بیٹا جب بھی وہاں آیا ہماری آنکھوں کو آنسوؤں سے بھر گیا اور پھر جب میں اپنے دادا جی کے ساتھ بے سروسامان ہو کر یہاں آپ کے اس شہر میں آئی' تب در بدر کی ٹھوکریں ہمارا نصیب بنیں، لیکن آپ کا اپنا پن اس وقت بھی سویا رہا یہاں تک کہ میں نے خود ہی اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر جینے کا ہنر سیکھ لیا اور جب ہمیں آپ لوگوں کے بغیر زندہ رہنے کی عادت ہو گئی تو آپ ایک مرتبہ پھر ہماری خوشیوں میں آگ لگانے کے لیے چلے آئے آپ نے ایک مرتبہ پھر' میرے دادا جی کو مجھ سے چھین کر' بے سہارا کر دیا مجھے' کیا یہی ہے میرا بھلا......؟ یہی اپنا پن ہے آپ کا......؟''

وہ رو کر ان لوگوں کے سامنے کمزور پڑنا نہیں چاہتی تھی لیکن آنسوؤں نے اس کا ساتھ نہیں دیا اور پھسل کر گالوں پر لڑھک آئے۔

''انجشاء...... دیکھو بیٹی میں مانتی ہوں کہ ہم سے کچھ کوتاہیاں ہوئی ہیں لیکن اب ہم ان کا ازالہ کرنا چاہتے ہیں بیٹی' پلیز ہمیں معاف کر دو......''

اس کے الفاظ پر سیال بیگم کا سر ندامت سے جھکا تھا۔ مگر وہ کمزور نہیں پڑی۔ تب ہی چیختے ہوئے بولی۔

''آپ کی معافی مجھے میرا گزرا ہوا وقت واپس نہیں دلا سکتی۔ آپ کے شرمندہ ہونے سے میری وہ خوشیاں' وہ رشتے جو آپ نے مجھ سے زبردستی چھین لیے مجھے واپس نہیں مل سکتے......''

''تو پھر کیا چاہتی ہو تم کہ ہم تمہارے پاؤں پڑ کر تم سے معافی مانگیں؟ ہم کیا ہتھیار لے کر گئے تھے تمہارے گھر' جو تم بار بار ہمیں بابا جی کا قاتل ٹھہرا رہی ہو؟ دیکھو لڑکی بیکار کی ضد سے کام مت لو۔ ماضی میں جو کچھ ہوا اسے بھلا دو تم ہماری عزت ہو' اور ہم اپنی عزت پر داغ لگتا ہوا نہیں دیکھ سکتے۔''

انجشاء کی ہٹ دھرمی پر وہ قدرے غصے سے بولی تھیں۔ جب وہ زخمی سی ایک مسکراہٹ لبوں پر پھیلاتے ہوئے بولی۔

''اچھا' بہت جلدی خیال آ گیا آپ کو اپنی عزت کا لیکن کان کھول کر سن لیں آنٹی' میرے دل میں اب آپ لوگوں کے لیے قطعی کوئی جگہ نہیں ہے' لہٰذا میں آپ کے ساتھ ایک پل بھی اس گھر میں نہیں رہ سکتی، اور نہ ہی آپ لوگ مجھ پر کسی قسم کا کوئی رعب جما سکتے ہیں کیونکہ میں اب وہ انجشاء نہیں رہی۔ جس کا آپ کے ساتھ کوئی تعلق تھا......''

''تم سراسر حماقت سے کام لے رہی ہو لڑکی' بڑوں سے بات کرنے کی یہی تمیز سکھائی ہے تمہارے والدین نے تمہیں......''

سیال بیگم کو ایک مرتبہ پھر اس کے الفاظ چبھے تھے۔ جب وہ قطعی بیگانگی سے بولی۔

''میرے والدین نے نہیں' آپ کی بے رحمیوں نے سکھائی ہے یہ ادا' قاتل ہیں آپ لوگ میرے ارمانوں کے۔ نوچا ہے میرے خوشیوں کا چہرہ' اب کس منہ سے ادب کی بات کر رہے ہیں آپ لوگ' بولیے' جواب دیجیے' لیکن آپ کیا جواب دیں گی آپ کے پاس تو کہنے کے لیے کچھ ہے ہی نہیں......''

وہ بھلا کہاں رعب میں آنے والی تھی۔ مگر اسی پل خاموش بیٹھے عدنان کا ضبط جواب دے گیا، اور وہ خاصے غصے سے بولا۔

''تم اپنی حد سے بڑھ رہی ہو انجشاء' مت بھولو کہ تم اس وقت میری مما سے بات کر رہی ہو۔''

''مسٹر عدنان......! آپ کی مما سے بات کر رہی ہوں تو کیا ہوا آپ نے بھی تو کبھی میرے ممی پاپا سے بات کرنے کا لحاظ نہیں رکھا۔ پھر اب مرچیں کیوں لگ رہی ہیں آپ کو......''

''او گاڈ' یہ لڑکی تو پاگل ہو گئی ہے عدنان کیا کریں اس کا......''

سیال بیگم نے اس کی دو بدو محاذ آرائی پر پریشان ہو کر اپنا سر تھاما ہوا تھا۔ جب وہ ان کی حالت پر ہنستے ہوئے بولی۔

''آپ کو کیا کرنا ہے آنٹی اب تو جو بھی کرنا ہے وہ میں ہی کروں گی......''

انتہائی ریلیکسڈ انداز میں کہنے کے ساتھ ہی' وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی جب مسلسل خاموش بیٹھے احمد رؤف صاحب نے کپکپاتے لہجے میں اسے پکارا تھا۔

''انجو' ہمیں معاف کر دو بیٹی' پلیز......''

بوڑھی آنکھوں میں آنسو در آئے تھے' جب وہ ایک لمحے کے لیے بغور ان کی طرف دیکھنے کے بعد مضبوط لہجے میں بولی۔

''میرے دل میں آپ کے لیے' کوئی رنجش نہیں ہے انکل' لیکن اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں خوش رہوں تو خدا کے لیے مجھے یہاں سے جانے کی اجازت دے دیجئے' پلیز......''

ان کے کپکپاتے ہاتھ تھام کر اس نے کچھ ایسے انداز میں ریکویسٹ کی تھی کہ وہ کچھ بول نہ سکے۔ نتیجتاً اگلے ہی پل وہ اپنا ضروری سامان سمیٹ کر ایک الوداعی نظر ان سب پر ڈالتے ہوئے عدنان ہاؤس سے باہر نکل آئی۔

''انجشاء' بات سنو پلیز......''

وہ ابھی بمشکل آٹھ سات قدم کا فاصلہ ہی طے کر پائی تھی کہ جب اسے اپنے پیچھے سے عدنان کی پکار سنائی دی اور اسے نہ چاہتے کے باوجود بھی اپنے قدموں کو روکنا پڑا۔

''کہاں جاؤ گی تم......؟'' اس کے قریب پہنچ کر اس نے پوچھا تھا' جب وہ ترچھی نگاہ سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

''کیا تم یہی پوچھنے کے لیے یہاں آئے ہو......؟''

''نہیں' مجھے تم سے اور بھی کچھ کہنا ہے۔''

''کیا......؟''

''وہ میں تمہیں یوں کھڑے کھڑے نہیں بتا سکتا' چلو گاڑی میں بیٹھو راستے میں بات کریں گے۔''

''سوری' میں تم سے لفٹ نہیں لے سکتی......'' وہی اس کا ضدی انداز۔

''انجشاء پلیز' ہر بات میں ضد مت کیا کرو' کم آن بیٹھو گاڑی میں......''

فرنٹ ڈور کھولتے ہوئے اس طرف دیکھ کر وہ قدرے جھنجھلایا تھا۔ تب نہ جانے کیا سوچ کر انجشاء گاڑی میں بیٹھ گئی۔

''تھینک یو۔'' اس کے بیٹھتے ہی عدنان نے مسکرا کر کہا تھا۔ پھر گھوم کر خود بھی اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔

''کہو کیا کہنا چاہتے ہو تم......'' اس کے بیٹھتے ہی وہ پوچھ بیٹھی تھی۔

جواب میں وہ ذرا سا رخ پھیر کر بھرپور نگاہوں سے اس کی سمت تکتے ہوئے بولا۔

''تم میرا گھر چھوڑ کر تو جا رہی ہو انجشاء مگر یاد رکھنا' تم اپنا آپ بیچ بھی دو تب بھی مجھ سے چھٹکارہ نہیں پا سکو گی......''

''وہاٹ......'' انجشاء نے چونک کر کہا مگر اس سے قبل ہی وہ گاڑی کی اسپیڈ بڑھا چکا تھا۔

☆☆☆

میرے اندر کوئی بکھرا ہوا کچھ دنوں سے
تمہیں کیسے بتائیں کیا ہوا ہے کچھ دنوں سے
میں اپنے خواب آنکھوں میں لیے پھرتا ہوں طارق
میرا چہرہ بہت اترا ہوا ہے کچھ دنوں سے

رات میں وہ بہت لیٹ گھر واپس آیا تھا۔ تمکین بہت دیر تک اس کا انتظار کرتی رہی تھی۔ لیکن پھر بالآخر نیند نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا تھا اور اس وقت وہ خاصی بے نیازی سے میٹھی نیند کے مزے لے رہی تھی۔ شب کے اڑھائی بج رہے تھے۔ موسم کی طغیانی میں اب کسی حد تک کمی آ گئی تھی۔ مگر اس کے اعصاب بدستور تنے رہے۔

ایک عجب سی بے سکونی نے اس کے دل کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ جھنجھوڑ کر اسے نیند سے جگائے اور اس سے پوچھے کہ اسے حقیقی پیار کس سے ہے؟ اس سے یا پھر اریج احمر سے...... کہ جسے وہ اب تک اپنا دوست مانتا آیا تھا۔ مگر افسوس کہ وہ اپنی سوچ کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔

آپ ہی آپ آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔ ساری رات کروٹ پہ کروٹ بدلتا رہا تھا۔ مگر دل کو قرار نہیں ملنا تھا سو نہ ملا۔ یہاں تک کہ صبح کا اجالا پھیل گیا اور تب ہی وہ بغیر ناشتہ کیے تمکین کے اٹھنے سے پہلے ہی گھر سے آفس کے لیے نکل آیا۔ شیزا ابھی آفس نہیں پہنچی تھی اور شیزا ہی کیا ابھی تو ماسوائے چپڑاسی کے آفس کا کوئی ورکر بھی نہیں پہنچا تھا۔ سو وہ الجھے دل و دماغ کے ساتھ اپنے کیبن میں آ کر بیٹھ گیا۔ سلگتی سوچوں کا ایک بھنور تھا کہ جس میں وہ الجھ کر رہ گیا تھا۔ نہ جانے کتنا ہی وقت یونہی بیت گیا۔ جب اچانک اس کے موبائل پر بیپ ہوئی مگر وہ انجان بنا بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ موبائل خود ہی چیخ چیخ کر خاموش ہو گیا۔

جنونی اور جذباتی تو وہ بچپن ہی سے تھا لیکن اس وقت تمکین کی بے وفائی کے متعلق جان کر اس کا پورا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ دل میں جیسے

سوئیاں سی چبھ رہی تھیں۔اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔موبائل کی بزر ایک مرتبہ پھر بج اٹھی تھی۔تب نہایت بے دلی سے ہاتھ بڑھا کر اس نے موبائل اٹھایا اور اس کی اسکرین پر نگاہ دوڑائی جہاں اس وقت تمکین کا موبائل نمبر درج تھا۔

یکا یک ہی نفرت کی ایک لہر اس کے دل میں اٹھی، اور اس نے اگلے ہی پل انتہائی کوفت کے عالم میں موبائل آف کر دیا۔

شیزا آج کافی لیٹ آفس پہنچی تھی۔مگر آفس پہنچتے ہی وہ سیدھی اشعر کے کیبن میں چلی آئی تھی۔

''اوہ تھینک گاڈ اشعر کہ تم یہاں آ گئے ورنہ میں تو یہی سوچ رہی تھی کہ کل تمکین کے ہاتھوں کھنچائی کے بعد آج تم بالکل آفس نہیں آ و گے۔''

انتہائی فریش موڈ میں اس کے سامنے والی چیئر پر ٹکتے ہوئے اس نے کہا تھا۔جواب میں اشعر سلگتی سی ایک نگاہ اس کے شاندار سراپے پر ڈال کر رہ گیا۔

''اے ہیلو بھئی' یہ صبح ہی صبح جناب کا موڈ آف کیوں ہے؟''

اس نے اشعر کی سنجیدگی کا کوئی نوٹس نہیں لیا تھا۔جب وہ اپنی سرخ آنکھیں اس کے خوب صورت چہرے پر گاڑھتے ہوئے بولا۔

''سچ سچ بتاؤ' شیزا تم اریج اور تمکین کے متعلق کیا جانتی ہو؟''

''ارے تم ابھی تک اس بات کو دل سے لگا کر بیٹھے ہو ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر نوٹس لینے لگے تو بس ہو گئی زندگی بسر......''

''یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے شیزا' پلیز بتاؤ مجھے کہ تم تمکین اور اریج کے بارے میں کیا جانتی ہو؟''

اسے کہاں قرار تھا اب اور یہ بات شیزا اچھی طرح سے جانتی تھی' تب ہی تو ستا رہی تھی اسے۔

''اشعر! تمکین اچھی لڑکی ہے۔سب سے بڑھ کر تم اسے بہت پیار کرتے ہو لہٰذا ان دونوں کے بیچ جو کچھ بھی ہے پلیز بھلا دو اسے......''

''مجھے اپنے سوال کا جواب چاہیے' شیزا' پلیز......''

اب کے وہ بھرپور غصے کے ساتھ چلایا تھا' تب ہی شیزا نروس ہونے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولی۔

''تمکین میری بہت اچھی دوست ہونے کے ساتھ ساتھ میری کزن بھی ہے اشعر' بچپن کا ساتھ رہا ہے ہمارا' اس کے ایک ایک راز سے واقف ہوں میں' اریج احمر سے پہلی مرتبہ تمکین کا ٹکراؤ' اس روز ہوا تھا کہ جب تم لندن سے واپس پاکستان آئے تھے اس کے بعد تمکین بہانے بہانے سے اریج احمر کے آفس کے چکر لگانے لگی تھی۔اس نے خود بھی مجھ سے کہا کہ اریج احمر تم سے خوب صورت اور دولت مند ہے۔پھر اریج احمر بھی اسے پسند کرنے لگا تھا۔''حسن ولاج'' میں اس کا آنا جانا بھی ہو گیا تھا۔وہ دونوں اکثر لنچ اور ڈنر کے لیے اکٹھے باہر جانے لگے تھے۔تمکین نے اریج سے اور اریج نے تمکین سے ہمیشہ ساتھ نبھانے کے ہزاروں پیمان بھی باندھ ڈالے۔حالانکہ میں نے کتنا سمجھانا چاہا تمکین کو کہ وہ صرف اور صرف تمہاری امانت ہے لیکن اس نے میری ایک نہیں سنی اشعر پھر جب گھر والوں کے دباؤ پر اس نے تمہارے ساتھ شادی کرنے کی حامی بھری تو اریج سے یہ وعدہ کیا کہ وہ شادی کے بعد بھی اس سے ملتی رہے گی، اور جیسے ہی حالات ناسازگار ہوئے وہ تم سے طلاق لے کر اریج کو اپنا لے گی۔تب ہی تو تمہاری شادی والے دن اریج کی آنکھوں سے خون برس رہا تھا۔پھر بھی تمہیں میری باتوں کا یقین نہیں ہے۔تو لو اریج احمر کی پرسنل ڈائری پڑھ لو جو وہ کل بے

دھیانی میں ہی اپنے ٹیبل کی دراز میں بھول گیا۔ اسے پڑھنے کے بعد تم یقیناً سچائی جان جاؤ گے اشعر......"

وہ اچھی طرح سے جانتی تھی کہ اس نے ابھی ابھی جو کچھ بھی اشعر سے کہا تھا وہ سوائے جھوٹ کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ مگر وہ یہ بھی جانتی تھی کہ عشق محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔ سواریج احمر کی پرسنل ڈائری جو اس نے کمال ہوشیاری سے اس کے کیبن سے غالباً تین چار روز قبل چرائی تھی۔ اس وقت بڑی معصومیت سے اشعر احمد کے حوالے کر کے فوراً اس کے کیبن سے باہر نکل آئی۔

آج اسے اپنے ارادوں میں سرخروئی حاصل ہوگئی تھی۔ آج اس کے جشن کا دن تھا۔ جس منزل کو وہ پانا چاہتی تھی وہ اب اسے بہت قریب دکھائی دے رہی تھی۔ سو مسرت سے بے حال وہ فوراً اپنے روم میں چلی آئی کہ اب اسے تنہا بیٹھ کر اپنے مستقبل کے پلان ترتیب دینے تھے جبکہ اشعر احمد خالی خالی سی آنکھوں کے ساتھ سن بیٹھا اریج احمر کی خوب صورت ڈائری دیکھ رہا تھا۔ جہاں جگہ جگہ تمکین کی باتوں اور اس کی تصویروں کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

"تمہیں بھلانے کی نادانیوں کی زد میں ہیں
سنو کہ ہم بھی پریشانیوں کی زد میں ہیں
تمہارے پیار نے دل میں کھلا دیئے تھے کبھی
وہ پھول روح کی ویرانیوں کی زد میں ہیں"

"تمکین میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ تقدیر اک دن مجھے تم سے ہمیشہ کے لیے دور کر دے گی تم خوشبو کا جھونکا بن کر میری ویران زندگی میں آئیں اور خواب بن کر میرا ساتھ چھوڑ گئیں۔ ایسا کیوں کیا تمکین کیوں مجھے پل پل سلگنے کے لیے چھوڑ دیا؟ کیا جرم تھا میرا صرف یہی ناں کہ میں نے تمہیں چاہنے کی جسارت کی تھی مگر دنیا کے کس قانون کس کتاب میں یہ لکھا ہوا ہے کہ جو آپ کو دل سے چاہے اسے تڑپا تڑپا کر مار ڈالو میں تمہارے بغیر نہیں جی سکتا تمکین پلیز میری زندگی میں واپس لوٹ آؤ......"

اریج کی یہ ہینڈ رائٹنگ یہ اس کے سائن تو وہ لاکھوں میں پہچان سکتا تھا پھر اس وقت کیسے حقیقت سے نگاہیں چرا لیتا۔ زندگی نے بہت گہرا نقب لگایا تھا اس کے دل پر اریج کا حال دل اس کے سامنے تھا اور تمکین اپنے جھوٹے پیار سے اب تک اسے بے وقوف بنائے ہوئے تھی۔ اگر شیزا اس کی آنکھیں نہ کھولتی تو نہ جانے وہ کب تک ان دونوں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنا رہتا۔

تمکین اس سے اتنی بڑی حقیقت چھپائے گی وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ آنکھیں تھیں کہ ضبط کی شدت سے سلگ رہی تھیں ہاتھ پاؤں جیسے ایک دم سے بے جان ہو کر رہ گئے تھے۔ تب ڈائری اپنے پرسنل لاکر میں رکھ کر وہ وہیں اپنے کیبن میں صوفے پر لیٹ گیا۔

دماغ اس وقت بالکل سن ہو رہا تھا لہٰذا اس نے سیکرٹری کو سختی سے ہدایت کر دی تھی کہ فی الحال اسے کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔

اُداسیوں کا سبب جو لکھنا

تو یہ بھی لکھنا

کہ چاند چہرے' شہاب آنکھیں بدل گئے ہیں

وہ لمحے جو تیری راہوں میں

میرے آنے کے منتظر تھے' وہ تھک کے سایوں میں ڈھل گئے ہیں

وہ تیری یادیں' خیال تیرے

وہ تیری آنکھیں' سوال تیرے

وہ تم سے میرے تمام رشتے

بچھڑ گئے ہیں اجڑ گئے ہیں

اُداسیوں کا سبب جو لکھنا

تو یہ بھی لکھنا

کہ لڑکھڑاتے سے ہونٹوں پر

لڑکھڑاتے دعا کے سورج

پگھل گئے ہیں

تمام سپنے جل گئے ہیں

''تم نے ایسا کیوں کیا تمکین......؟ میں نے تمہیں دل سے چاہا تھا' پوری عزت اور شان وشوکت کے ساتھ اپنی زندگی میں شامل کیا تھا' پھر کہاں میرے پیار میں کمی رہ گئی تمکین' کہ تم نے میرا ہاتھ چھوڑ کر کسی اور کا دامن پکڑ لیا' کیوں تمکین' کیوں کیا تم نے ایسا......؟ میرے ساتھ ہی فریب کیوں کیا تم نے......کیوں؟''

اپنے ہی آپ بڑبڑاتے ہوئے وہ بری طرح سے رو رہا تھا اور ادھر تمکین کے فرشتوں کو بھی اس حادثے کی خبر نہیں تھی' وہ تو خود الجھ رہی تھی کہ روز بہ روز آخر اشعر کو کیا ہوتا جارہا ہے؟ وہ کیوں ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اپنے اور اس کے مابین فاصلوں کی دیوار کھڑی کررہا ہے؟

اُس روز اشعر نے وہ پورا دن شیزا کے ساتھ آوارگی میں بسر کیا تھا' وہ درد سے اس قدر نڈھال تھا کہ اس کے اندر سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتیں ایک دم جواب دے گئی تھیں۔ اسے اب کوئی پروا نہیں تھی کہ تمکین کس حال میں ہے اور کیسی ہے؟ اور ان فاصلوں کو ابھی گزرتے وقت کے ساتھ مزید بڑھنا تھا۔

☆☆☆

''اذہان شاہ کے ساتھ ساتھ ازمیر شاہ کی بھرپور نگاہیں بھی اس کے خوب صورت چہرے پر جمی تھیں' جب وہ سرسری سی ایک نظر اپنے اردگرد بیٹھے لوگوں پر ڈالتے ہوئے دھیمے لہجے میں آہستگی سے بولی۔

''میں جو بات کرنے جا رہی ہوں' وہ اصولی طور پر تو مجھے اپنے گھر کے بزرگوں سے ہی کرنی چاہیے لیکن آپ چونکہ میرے فیانسی ہیں اور میرے گھر کے بزرگوں نے' میری زندگی کے ہر عمل کا اختیار آپ کے ہاتھوں سونپ دیا ہے۔ تو میں یہ بات براہ راست آپ ہی سے کرنے جا رہی ہوں' مجھے امید ہے کہ آپ ہرگز مجھے مایوس نہیں کریں گے اذہان......''

خوب صورت گہری آنکھوں میں' عجیب سی سنجیدگی ہلکورے لے رہی تھی۔ جب اس کے بالکل سامنے بیٹھے اذہان شاہ نے اپنائیت سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''کہو نا اریشہ' کیا بات ہے؟''

بھرپور خلوص کے ساتھ' وہ اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ جب وہ قدرے ہمت سے کام لیتے ہوئے بولی۔

''اذہان! ابھی کچھ روز کے بعد آپ واپس اپنی جاب پر چلے جائیں گے۔ ارسلان بھائی' ازمیر' سمیہ' ماہم' میمونہ' دانیہ' کاشف' عدیلہ سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو جائیں گے۔ ایسے میں میرے پاس کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہوگا۔ لہٰذا بہت سوچ کر میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ جب تک ہماری شادی نہیں ہو جاتی۔ تب تک' میں کسی معقول ادارے میں جاب کر لیتی ہوں۔ اس طرح میں بور بھی نہیں ہوں گی اور زندگی گزارنے کا بہتر سلیقہ بھی آ جائے گا مجھے......''

بہت روانی کے ساتھ اس نے اپنی بات مکمل کر ڈالی تھی مگر اس کی اس عجیب فرمائش پر جہاں ازمیر شاہ خفا ہو کر اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا' وہیں فرزانہ بیگم بھی جلال میں آ گئی تھیں۔

''تم ابھی اتنی بڑی نہیں ہوئی ہو کہ اپنے فیصلے خود کر سکو' اور نہ ہی اذہان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ گھر کے بزرگوں کے ہوتے ہوئے کوئی بھی قدم اٹھا سکے' سمجھیں تم......''

''موم پلیز' یہ میرا اور اریشہ کا آپس کا معاملہ ہے' آپ خود کو اس سے دور ہی رکھیں تو بہتر ہے۔'' اذہان نے فوراً ان کی بات کاٹ کر انہیں شاکڈ کر ڈالا تھا۔ تاہم اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتیں' وہ بڑے ادب سے اپنے ڈیڈ مسٹر فاروق احمد صاحب سے مخاطب ہوا۔

''پاپا' میرے خیال سے اریشہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے' کیونکہ جب سے اس نے تعلیم مکمل کی ہے تب سے گھر میں قید ہو کر رہ گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اریشہ کی صلاحیتوں کو زنگ نہیں لگانا چاہیے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟'' اس کے بات کرنے کا طریقہ' اتنا مناسب تھا کہ فاروق احمد صاحب چاہ کر بھی انکار نہیں کر پائے۔

''یو آر رائیٹ' اگر تمہاری اور اریشہ کی خوشی اسی میں ہے۔ تو بھلا میں کیا انکار کر سکتا ہوں' ہاں مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ اگر اریشہ بیٹی جاب کرنا ہی چاہتی ہے' تو پھر غیروں کی غلامی کرنے کی کیا ضرورت ہے' ہمارا ماشاءاللہ خود اتنا وسیع بزنس ہے' کیوں نا اریشہ بیٹی اپنا ہی آفس جوائن کر لے......''

اذہان کو فاروق احمد صاحب کی اجازت سے بے حد خوشی ہوئی تھی' تب ہی وہ چہکتے ہوئے بولا' تو اریشہ نے ممنون نگاہوں سے اس کی سمت تکتے ہوئے دھیرے سے سر ہلا دیا۔

''گڈ' اب کل سے پاپا کے ساتھ آفس جانے کی تیاری شروع کر دینا' او کے......''

وہ بے پناہ خوش ہو رہا تھا۔ مگر فرزانہ بیگم کے سینے میں تو گویا آگ لگ گئی۔ اُن کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ سب کے سامنے اذہان کے ایک زبردست طمانچہ رسید کر ڈالیں' تب ہی بے حد آف موڈ کے ساتھ وہ اپنی سیٹ سے اٹھ گئیں تو اذہان کے ساتھ ساتھ فاروق احمد صاحب نے بھی ایک سرد آہ فضا کے سپرد کی۔

اریشہ اذہان کی بے حد مشکور تھی کہ بالآخر اس نے ہر وقت کے جلنے کڑھنے سے اُسے نجات دلا دی تھی۔

اذہان شاہ اپنی جاب پر واپس آ گیا تو اریشہ نے بھی مکمل ذمہ داری کے ساتھ اپنا آفس جوائن کر لیا۔ ازمیر شاہ اور ارسلان احمد شاہ جیسے سمجھدار اور قابل انسان کے ساتھ رہ کر اسے بہت کچھ سیکھنے کا موقع مل رہا تھا اور وہ اسے انجوائے بھی کر رہی تھی۔

اُس روز وہ اپنی سیٹ سے لنچ ٹائم کے لیے اٹھی تو ازمیر شاہ بھی اپنے کیبن سے باہر نکل آیا' دونوں کا ارادہ ہی گھر پر لنچ کرنے کا تھا۔ لہٰذا اریشہ کو ازمیر شاہ کی آفر پر اس کی گاڑی تک آنا پڑا۔ آج بہت طویل عرصے کے بعد وہ اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی تھی تب ہی کچھ عجیب سا لگ رہا تھا جبکہ دوسری جانب خاموشی سے سلو ڈرائیونگ کرتے ازمیر شاہ نے سرسری سی ایک نگاہ اس کے خاموش چہرے پر ڈالتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔

''مجھے تم سے کچھ کہنا تھا اریشہ......''

''کہو' میں سن رہی ہوں۔'' اُسے حیرانگی ضرور ہوئی تھی مگر وہ اب بھی گاڑی سے باہر نگاہ جمائے ہوئے تھی۔ ''میں نے تمہیں کبھی غلط نہیں سمجھا اریشہ' مگر اس کے باوجود بہت کوتاہیاں ہوئی ہیں مجھ سے' بلاوجہ دل دکھایا ہے میں نے تمہارا' اس کے لیے اگر ہو سکے تو پلیز مجھے معاف کر دینا......''

ازمیر کا لہجہ اب بھی پست تھا' تب ہی اریشہ نے نگاہ پھیر کر بڑی اداس سی نظر اس کی مقناطیسی نگاہوں پر ڈالی پھر دھیمے سے مسکراتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولی۔

''بڑی جلدی احساس ہو گیا آپ کو۔''

''پلیز اریشہ' میں اس وقت تمہارے طنز سہنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں' بلکہ میں یہ سب تم سے محض اس لیے کہہ رہا ہوں کیونکہ پرسوں میں ہمیشہ کے لیے انگلینڈ واپس جا رہا ہوں اور جانے سے پہلے میں قطعی نہیں چاہتا کہ تمہارے دل میں میرے لیے بدگمانیاں رہیں' تمہیں مجھ سے جو گلہ ہے پلیز اس کا اظہار کر دو اریشہ' کیونکہ اس کے بعد یہ موقع' وقت ہمیں کبھی نہیں دے گا......''

ازمیر کے الفاظ کیا تھے' کوئی بم تھا جو اریشہ کی سماعتوں کے عین قریب پھٹا اور وہ ایک دم سے سن ہو کر رہ گئی۔

''میں نے ابھی' اپنے جانے کے متعلق' گھر میں کسی کو بھی نہیں بتایا ہے۔ ممی اور سائلہ کو بھی نہیں کیونکہ میں یہ خبر سب سے پہلے تمہیں دینا

چاہتا تھا اریشہ جانتی ہوں کیوں......؟''

بڑے معصوم سے انداز میں اس نے پوچھا تھا۔ جواب میں گم صم سی اریشہ نے دھیرے سے نفی میں سر ہلا دیا۔ تب وہ پھیکی سی مسکراہٹ لبوں پر سجاتے ہوئے دکھی لہجے میں بولا۔

''تم جان بھی کیسے سکتی ہو پاگل لڑکی۔ تم کبھی نہیں سمجھ سکتیں کہ جب میں اپنی تعلیم سے فارغ ہو کر یہاں پاکستان آیا تھا مما کی محبت کے بعد سب سے انمول چیز جو مجھے یہاں ملی تھی وہ تمہاری بے لوث دوستی تھی اریشہ میں چاہ کر بھی وہ دن کبھی نہیں بھلا پایا کہ جب تم میرے قریب تھیں۔ میرا ایک ایک آنسو تمہارے دل پر گرتا تھا۔ وہ میرے ذرا سے بیمار ہو جانے پر تمہاری پریشانی' وہ بھاگ بھاگ کر میرا ہر کام کرنا' وہ بڑے دھڑلے سے میرا بازو پکڑ کر مجھے اپنے ساتھ مارکیٹ لے جانا' وہ صرف میرے لیے تمہارا فلم دیکھنے جانا' اور وہ میری ڈانٹ کھا کر بھی میرے پیچھے بھاگنا' میری فکر کرنا' کبھی نہیں بھولے گا اریشہ وہ دن' وہ ایک ایک لمحہ میں کبھی نہیں بھلا پاؤں گا۔ مگر افسوس' صد افسوس اریشہ کہ ہمارے گھر والوں نے ہماری دوستی پر داغ لگا کر اپنی گھٹیا سازشوں سے ہمیں ایک دوسرے سے دور کر دیا۔ اتنا دور کہ آج نہ تو تمہیں میرے دل کے درد کی کوئی خبر ہے اور نہ ہی میں تمہارے آنسوؤں کا سبب جان سکتا ہوں۔ میں بالکل کنگال ہو گیا ہوں اریشہ اپنی سب سے اچھی انمول دوست کھو کر قلاش ہو گیا ہوں میں۔ اب کس سے کہوں کہ میرے آنسو پونچھے...... بہر حال ہمارے بیچ جو کچھ بھی ہوا۔ میں نے اب اسے نصیب کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیا ہے لیکن جانے سے قبل' میں تم سے صرف ایک وعدہ لینا چاہتا ہوں۔ اریشہ کیا تم یہ وعدہ نبھا سکو گی......؟''

اس کی نظریں سامنے روڈ پر مرکوز تھیں' مگر اس کے باوجود وہ ان آنکھوں میں تیرتی نمی بخوبی دیکھ سکتی تھی' تب ہی آہستگی سے اپنے آنسو پونچھ کر اس نے اثبات میں سر ہلاتے کی جنبش کی تھی۔

''تھینک یو اریشہ' میں جانتا تھا کہ تم مجھے مایوس نہیں کرو گی' پلیز اریشہ' میرے یہاں سے جانے کے بعد میری مما کا بہت خیال رکھنا اور مجھے کبھی بھلانا بھی نہیں۔ ہفتہ نہ سہی' مہینہ نہ سہی سال میں صرف ایک بار خط لکھ کر مجھے پاکستان کے بدلتے موسموں کی خبر لکھتی رہنا اریشہ' تمہارا احسان رہے گا مجھ پر......''

وہ آج ایسی گفتگو کر رہا تھا کہ اریشہ کا دل درد سے ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا' وہ تو اس کا کسی اور کے ساتھ منسوب ہو جانے کا دکھ ہی سہہ نہیں پار ہی تھی کہ اس نے دائمی جدائی کا غم بھی لا دو دیا اس پر۔ ضبط کی انتہا تھی جب اس نے بمشکل اپنے لبوں کی جنبش دی۔

''تم انگلینڈ کیوں جا رہے ہو ازمیر؟ شہرین خان سے ملنے ناں؟ لیکن اب اس سے ملنے کا کیا فائدہ......؟

اپنی منزل تو تم یہیں پا چکے ہو۔ پھر یہ پردیس کی تیاری کیوں......؟ کیوں خود کو تماشہ بنا رہے ہو تم' کیوں ایک ہی وقت میں دو دو لڑکیوں کے جذبات سے کھیلنا چاہ رہے ہو تم' بولو ازمیر' جواب دو......''

ضبط سے سرخ آنکھوں میں ہلکے سے غصے کی آمیزش تھی۔ تب شاکڈ سے ازمیر شاہ نے حیران نگاہوں سے اس کی سمت تکتے ہوئے دھیمے سے سر جھٹک دیا۔

''تمہاری یہ خاموشی' میرے سوال کا جواب نہیں ہے ازمیر' تم یہاں سائمہ خان کو جھوٹی امیدیں تھما کر وہاں شہرین خان کی رفاقت کے مزے لوٹنا چاہتے ہوناں' مگر یاد رکھو ازمیر' میں تمہیں ایسا کرنے نہیں دوں گی۔''

اس کی خاموشی پر وہ قدرے ایموشنل ہوئی تھی جب ازمیر شاہ نے بمشکل لب بھینچتے ہوئے کہا۔

''تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو اریشہ.....''

''اچھا.....تو پھر' صحیح کیا ہے ازمیر' بتاؤ تم مجھے.....''

''نہیں بتا سکتا میں تمہیں' بس اتنا جان لو کہ اب ان فضاؤں میں میرا دل نہیں لگتا اریشہ.....''

اس نے اب بھی اریشہ کی سمت دیکھنے سے گریز برتا تھا۔

''وہاٹ' تم نے جو چاہا وہ حاصل کر لیا' پھر بھی یہاں تمہارا دل نہیں لگتا' کیوں.....؟'' وہ دھیمے سے چلائی تھی' جب ازمیر نے پل دو پل کے لیے سامنے روڈ سے نگاہ ہٹا کر اس کی طرف دیکھا۔

''تم نے بھی تو جو چاہا وہ حاصل کر لیا اریشہ' پھر تم کیوں مصروفیت کے بہانے ڈھونڈتی ہو.....''

''خود کو میرے ساتھ کمپیئر مت کرو ازمیر' میرے دل کا معاملہ اور ہے.....''

بڑی مشکل سے چلا کر اس نے اپنا بھرم بچایا تھا۔ جب وہ پھیکی سی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔

''دلوں کے معاملے بھی ایک جیسے ہوتے ہیں اریشہ' کیا تمہارا دل' اور کیا میرا دل.....''

''لیکن سائمہ تمہارے اس فیصلے کو نہیں مانے گی ازمیر' اسے کس بات کی سزا دے رہے ہو تم.....''

کچھ سمجھ میں نہ آیا تو سائمہ خان کا سہارا ہی لے لیا' مگر یہ تدبیر بھی کارگر ثابت نہ ہو سکی۔ جب اس نے کہا۔

''مجھے سائمہ خان کی پروا نہیں ہے' اور نہ ہی میں اپنے معاملے میں کسی کی مداخلت پسند کرتا ہوں' پھر اس بات کو تم سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے اریشہ.....''

''ہاں جانتی ہوں میں' تمہارا وہ تھپڑ' جو تم نے کمپیوٹر پروگرام خراب ہو جانے پر مجھے مارا تھا' وہ ابھی تک یاد ہے مجھے' لیکن ہر لڑکی' اریشہ خان نہیں ہے ازمیر.....''

''یہی تو دکھ ہے اریشہ' یہی تو قلق ہے کہ ہر لڑکی اریشہ نہیں.....''

بہت آہستگی سے بڑبڑاتے ہوئے اس نے کہا تھا اور پاؤں بریک پر رکھ دیئے تھے۔ کیونکہ ''شاہ ولاج'' کی وسیع عمارت نظر کے بالکل سامنے آ چکی تھی۔

☆☆☆

تمہیں معلوم ہے ہم نے

کسی کے ہجر میں یہ زندگی کیسے گزاری ہے

ہر اک خوشبو کی آہٹ پر

گماں اس کا گزرتا تھا

ہر اک ساعت پہ دل آنکھوں میں آ کے بیٹھ جاتا تھا

کئی پہلو بدلتی خواہشیں ہاتھوں کو پھیلائے

دعائیں مانگتی اور ہانپتی دل سے گزرتی تھیں

مگر جو ہجر لاحق ہے

وہ جسم و جان کی دیواریں گراتا ہے

امید و بیم کی آنکھوں سے بینائی کے سارے منظروں کو خاک کرتا اور مٹاتا ہے

سو ہم بھی خاک ہیں اور خاک کی تقدیر میں لکھا گیا ہے

بے امان رہنا

''عدنان، گاڑی روکو پلیز.....''

اسے انتہائی تیز اسپیڈ میں گاڑی بھگاتے دیکھ کر وہ بھنچے بھنچے سے لہجے میں چلائی تھی مگر عدنان نے اس کے حکم پر کان نہیں دھرے۔

''عدنان! میں تم سے کچھ کہہ رہی ہوں، پلیز گاڑی روکو.....''

اب اس نے سختی سے اپنے ہاتھ عدنان کے مضبوط بازوؤں پر جما دیئے تھے، جواب میں وہ ترچھی نگاہوں سے خوب محظوظ ہو کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''روک دوں گا، مگر اس کے لیے میری ایک شرط ہے.....''

''کیسی شرط؟'' قدرے چونک کر تیکھے چتونوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے انجشاء نے پوچھا۔ جب وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''بڑی آسان شرط ہے، مگر تم مانو گی نہیں۔''

''پلیز بتاؤ عدنان، میں اس وقت مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔''

''تو تم سے مذاق کون کر رہا ہے انجشاء؟ تمہیں شاید احساس نہیں ہے کہ تم میری زندگی اور موت سے کھیل رہی ہو۔''

''اوشٹ اپ عدنان، تم نے آج سے چھ برس قبل، جو کچھ میری جھولی میں ڈالا تھا، وہی میں آج تمہیں سود سمیت واپس لوٹا رہی ہوں، پھر تکرار کس بات کی.....؟''

''میں تکرار نہیں کر رہا تم سے' کبھی تم۔'' اسے تھوڑا تیکھا سا لگا تھا' تب ہی وہ بولے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

''اوکے' تو پھر کیوں الجھ رہے ہو میرے ساتھ' کیوں نہیں جان چھڑا لیتے مجھ سے......''

''یہی تو پرابلم ہے میری جان' کہ میں تم سے جان چھڑانا نہیں چاہتا' لیکن تم ہو کہ میری بات سمجھ ہی نہیں رہی ہو۔''

اس کے اشتعال پر وہ دھیمے سے مسکرایا تھا' جب انجشاء نے سر جھٹک کر گاڑی سے باہر دیکھتے ہوئے قدرے تلخی سے کہا۔

''تم میرے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتے عدنان......''

''کرنے کو تو بہت کچھ کر سکتا ہوں' آخر منکوحہ ہو تم میری حق رکھتا ہوں میں تم پر......''

''حق کی بات مت کرو تم' نہیں اچھی لگتی یہ بات تمہارے منہ سے۔''

وہ گھٹے گھٹے سے انداز میں چلائی تھی۔ جب عدنان احمد اس کے سرخ چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بے ساختہ ہنس پڑا۔

''کیا چیز ہو تم انجشاء' لڑکیوں میں اتنا غصہ زیب نہیں دیتا......''

''تم بیکار میں مجھے غصہ دلا رہے ہو عدنان' جبکہ میں قطعی تمہارے منہ لگنا نہیں چاہتی......''

''اچھا' بڑا غرور ہے تمہیں اپنے حسن پر......''

وہ کہاں باز آنے والا تھا' مگر اب کے انجشاء نے اس سے الجھنا مناسب نہیں سمجھا' سو خاموش رہی۔ ''فار گاڈ سیک انجشاء' پلیز جذبات سے کام مت لو' دیکھو ماضی میں جو کوتاہیاں مجھ سے سرزد ہوئی ہیں' میں ان کے لیے تمہاری ہر سزا سہنے کو تیار ہوں' مگر پلیز اب تم ایسا کوئی بھی قدم مت اٹھانا' جو میرے ساتھ ساتھ تمہیں بھی تکلیف سے دوچار کرے۔ کیونکہ میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں اور میرے ساتھ ساتھ میرے گھر والے بھی' تمہیں بہت عزیز رکھتے ہیں' ان کا تو کوئی قصور نہیں ہے انجشاء' پھر انہیں کس بات کی سزا دے رہی ہو تم' دیکھو تمہارا گنہگار تو میں ہوں ناں' سو جیسے تمہارا دل چاہے تم ویسے ہی بی ہیو کرو میرے ساتھ' لیکن پلیز انجشاء' میرے والدین کو پریشان مت کرو' پلیز......''

اسے خاموش پا کر وہ بھی لائن پر آ گیا تھا مگر انجشاء اتنی جلدی ہتھیار پھینکنے والی نہیں تھی سو کڑک لہجے میں بولی۔

''اپنے والدین کا بہت خیال ہے تمہیں' لیکن جب تم میرے والدین کو دکھ پہنچا رہے تھے' ان کے ساتھ بدتمیزی کر رہے تھے' تب تمہارا احساس کہاں تھا عدنان' تب تو شاید تم یہ احساس بھی نہیں رکھتے تھے کہ تم جن سے مخاطب ہو' ان سے تمہارا کیا رشتہ ہے......؟ تم نے مجھے محض اسی لیے دھتکار دیا تھا ناں کہ میں گاؤں میں پرورش پانے والی ایک سادہ لڑکی تھی جسے تم کسی بھی لحاظ سے اپنے قابل نہیں سمجھتے تھے اور آج میں عین تمہاری پسند کے سانچے میں ڈھل کر تمہارے سامنے آ گئی ہوں' تو تم حق کی بات کرنے لگے ہو' اپنی کوتاہیاں یاد آنے لگی ہیں تمہیں......؟ کتنے خود غرض ہو عدنان' کس قدر خود غرض ہو تم' مگر یاد رکھو' کل تم مجھے اپنے قابل نہیں سمجھتے تھے اور آج میں تمہیں اپنے قابل نہیں سمجھتی' سو بہتر ہے کہ ہم ابھی سے اپنے راستے علیحدہ کر لیں' ورنہ تم سے تعلق تو ہر حال میں مجھے توڑنا ہی ہے' خواہ اس کے لیے مجھے عدالت سے رجوع ہی کیوں نہ کرنا پڑے......''

انجشاء کے خشک لہجے میں اب بھی شعلوں کی سی تپش تھی' تب ہی عدنان نے بے بس ہو کر زور سے اسٹیئرنگ وہیل پر ہاتھ مارا' پھر سرسری سی

ایک نظر اس کے سپاٹ چہرے پر ڈالتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا۔

''میں تمہیں بہت خوش رکھوں گا انجشاء' زندگی میں کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گا' پلیز......''

''سوری عدنان' میں تمہارے معاملے میں اپنا فیصلہ نہیں بدل سکتی......''

''تم پچھتاؤ گی انجشاء......''

''کوئی پروا نہیں......''

''تو پھر ٹھیک ہے' تم سے جو بن پڑتا ہے وہ تم کرو' اور میں جو کر سکتا ہوں' وہ میں کروں گا' پھر اس کے بعد دیکھیں گے کہ اس جنگ میں جیت کس کی ہوتی ہے' میرے پرخلوص پیار کی' یا پھر تمہاری بیکار کی ضد کی......''

اس کے لہجے میں عجب سے چبھن تھی مگر انجشاء نے اس بار بھی اس سے الجھنا مناسب نہیں سمجھا اور خاموش رہی۔

''جانا کہاں ہے تمہیں۔''

تھوڑی دیر خاموشی کے بعد اس نے پوچھا تھا۔ تب انجشاء نے بتایا۔

''فی الحال میں اپنے اسی فلیٹ میں جاؤں گی کہ جہاں میں اپنے دادا جی کے ساتھ رہتی تھی' پھر وہاں سے سامان سمیٹنے کے بعد یہ ڈی سائیڈ کروں گی کہ مجھے کہاں جانا ہے۔''

''اوکے' تو پھر اب عدالت میں ہی تم سے ملاقات ہوگی......''

''بالکل......''

وہ کہاں پیچھے رہنے والی تھی۔ سو فوراً جواب دیا۔ تو تھکے تھکے سے عدنان احمد نے گاڑی سائیڈ والے روڈ پر ڈال دی کیونکہ اسی روڈ پر انجشاء کا پرانا فلیٹ تھا۔

''زندگی میں جب بھی میری ضرورت پڑے' مجھے آواز دے لینا انجشاء' میں جہاں بھی ہوا خوشبو کا جھونکا بن کر تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا......''

اسے اس کے مطلوبہ فلیٹ کے سامنے اتارتے ہوئے نہایت سنجیدگی کے ساتھ اس نے کہا اور اگلے ہی پل تیزی سے گاڑی آگے بڑھا دی۔

☆☆☆

تمہیں جب کبھی ملیں فرصتیں' میرے دل سے بوجھ اتار دو
میں بہت دنوں سے اداس ہوں' مجھے کوئی شام ادھار دو
مجھے اپنے روپ کی دھوپ دو کہ چمک سکیں میرے خدوخال
مجھے اپنے رنگ میں رنگ دو' میرے سارے رنگ اتار دو
کسی اور کو میرے حال سے نہ غرض ہے نہ کوئی واسطہ
میں بکھر گیا ہوں سمیٹ لو' میں بگڑ گیا ہوں سنوار دو
میری وحشتوں کو بڑھا دیا ہے' جدائیوں کے عذاب نے
میرے دل پہ ہاتھ رکھو ذرا' میری دھڑکنوں کو قرار دو

موسم اپنی پچھلی روایت برقرار رکھتے ہوئے خاصا ابر آلود ہو رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی معطر ہواؤں اور سیاہ گدلے بادلوں نے سورج کی کرنوں کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اریج لنچ کے لیے آفس سے اٹھ آیا تھا۔ موسم کی یہ اداسی اس کے اندر کی بے کلی کو مزید بڑھا دیتی تھی۔

اس وقت بھی وہ کچھ ایسی ہی حالت کا شکار تھا کہ اچانک اس کی نظر ایک یوٹیلٹی سٹور پر گھریلو استعمال کی کچھ ضروری اشیاء خریدتی' تمکین رضا پر جا پڑی' جو اس وقت کاٹن کے سادہ سے بلیک سوٹ میں ملبوس میک اپ سے پاک چہرے کے ساتھ خود بھی اداس موسم کا ایک حصہ لگ رہی تھی۔

تیز ہوا کی وجہ سے ریشمی بالوں کی آوارہ لٹیں' چوٹی سے نکل کر گالوں کو چوم رہی تھیں اور وہ بار بار دائیں ہاتھ سے انہیں کانوں کے پیچھے اڑستے ہوئے خریداری میں خاصی مصروف دکھائی دے رہی تھی تب ہی دھیمی سی ایک محظوظ کن مسکراہٹ اریج احمر کے لبوں کو چھوگئی' اور وہ دل کے ہاتھوں مجبور نہ چاہتے ہوئے بھی گاڑی اس کے قریب لے آیا۔

''ارے آپ یہاں......؟''

تمکین کی نظر جونہی اس پر پڑی اس نے چونکتے ہوئے پوچھا' جواب میں وہ دھیرے سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مسکرا اٹھا۔

''کیوں' میں نہیں آ سکتا۔''

''نہیں' ایکچولی میں نے ایک دم سے آپ کو دیکھا تو تھوڑی حیران رہ گئی' ویسے آپ یہاں کیا کر رہے ہیں......''

''کچھ نہیں' بس آفس سے لنچ کے لیے نکلا تھا کہ آپ نظر آ گئیں' سو میں ادھر ہی چلا آیا' ویسے کیا آپ آج میرے ساتھ لنچ کرنا پسند کریں گی......''

''کیوں نہیں' لیکن مجھے بھوک بالکل بھی نہیں ہے......''

''آپ بس کمپنی دے دیجئے گا' میرے لیے یہی بہت ہے......''

انتہائی مسرت کے عالم میں گاڑی کا فرنٹ ڈور کھولتے ہوئے اس نے کہا تو تمکین کو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا دل رکھنا ہی پڑا۔

''تمکین! کیا آپ کو معلوم ہے کہ انجشاء کے دادا جی اچانک وفات پا گئے......''

قریب ہی شاندار سے ریسٹورنٹ میں اپنی سیٹ سنبھالتے ہوئے اس نے تمکین کو باخبر کیا تھا' جب وہ چونک اٹھی۔

''کیا......آپ کو کیسے معلوم ہوا؟''

''مجھے عدنان نے بتایا تھا' عدنان کو تو جانتی ہوں گی آپ' انجشاء کے شوہر ہیں' انہی کی کال پر میں ہسپتال گیا تھا' بہت شاک میں تھی انجشاء ایک دم سے پاگلوں کی طرح ری ایکٹ کر رہی تھی......''

''ہاں' وہ اپنے دادا جی کے ساتھ' بہت کلوز رہی ہے' لیکن عدنان کیسے مل گیا اسے' وہ تو بہت پہلے ہی اس کی زندگی سے نکل چکا تھا۔''

تمکین کی پریشان مگر پرسوچ نگاہیں اریج پر جمی تھیں' جب اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

''پتہ نہیں' لیکن وہ اس وقت بھی' عدنان کو ہی اپنے دادا جی کی موت کا ذمہ دار ٹھہرا رہی تھی' پچھلے پندرہ بیس دنوں سے میرا تو سامنا ہی نہیں ہوا ہے ان سے' اور نہ ہی وہ آفس آ رہی ہیں' وگرنہ میں ضرور پوچھتا ان سے کہ اصل معاملہ کیا ہے......''

اپنی پسند کا مینو آرڈر کرتے ہوئے اس نے کہا تھا جب تمکین اپنے ہی آپ میں بڑبڑاتے ہوئے آہستگی سے بولی۔

''یہ کہانی بہت لمبی ہے مسٹر اریج' لیکن مجھے افسوس اس بات کا ہو رہا ہے کہ میں اس کی اتنی کلوز فرینڈ ہوتے ہوئے بھی اس کے دکھ سے بے خبر رہی' ایک ہی شہر میں ہو کر اس پر ٹوٹنے والی قیامت سے غافل رہی' کیا سوچتی ہو گی وہ میرے بارے میں' کیا کروں میں اب......؟''

وہ بری طرح سے پریشان ہو رہی تھی' جب اریج نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''پلیز یو ڈونٹ وری تمکین' وہ جیسے ہی آفس آئیں گی' میں آپ کو کال کر دوں گا۔

آپ زیادہ پریشان مت ہوں۔ میں تو آل ریڈی آپ کو بہت کمزور دیکھ رہا ہوں' کیا بات ہے؟ کیا آپ اپنا خیال نہیں رکھ رہیں......؟''

''خیال تو رکھ رہی ہوں' لیکن پچھلے ایک دو روز سے بخار آ رہا ہے۔ بس اسی لیے کچھ کمزوری محسوس ہو رہی ہے......''

''بخار کیوں آ رہا ہے' کیا ڈاکٹر کو چیک کروایا آپ نے؟''

پل کے پل میں ہی وہ خاصا بے چین ہو گیا تھا جب تمکین نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''نہیں' مجھ میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ پیدل چل سکوں یا اٹھ کر بیٹھ ہی سکوں اور اشعر کے پاس' میرے لیے آج کل بالکل بھی وقت نہیں ہے' دادا جی' دادی اماں' یا ممی پاپا کو میں پریشان نہیں کرنا چاہتی' سو آج سوچا کہ ڈاکٹر کو بھی چیک کروا لوں گی اور کچھ خریداری بھی کر لوں گی......''

''آپ اپنے آپ پر ظلم کر رہی ہیں تمکین......''

اسے تمکین کی اطلاع سے شدید تکلیف پہنچی تھی تب ہی بول اٹھا تو تمکین دھیمے سے مسکرا کر رہ گئی۔

''ظلم کیا مسٹر اریج' زندگی میں اچھے برے دن تو چلتے ہی رہتے ہیں۔''

''ہاں' مانتا ہوں میں اس بات کو مگر اشعر آپ کے ساتھ جو کچھ کر رہا ہے وہ درست نہیں ہے۔ اگر آپ نے ابھی سے اس کا نوٹس نہیں لیا تو حالات بہت خراب ہو سکتے ہیں تمکین۔ آپ شاید نہیں جانتیں کہ آپ کی کزن' کس قدر بے رحمی سے آپ کے اور اشعر کے مابین' فاصلے پیدا کر رہی ہے' پلیز تمکین اس طرح سے اپنا حق مت لٹائیں' پلیز......''

کس قدر عاجزی سے کہہ رہا تھا وہ اور تمکین خالی خالی سی نگاہوں کے ساتھ بس اسے دیکھے جا رہی تھی' وہ بات کہ جسے وہ محض اپنا شک اپنے دماغ کا فتور سمجھتی تھی' وہ بات اب کسی اور کی نظر میں بھی آ گئی تھی' اور یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ اس کی زندگی میں' کہیں نہ کہیں' کچھ نہ کچھ ضرور غلط ہو رہا تھا۔ مگر کیا......؟

اشعر تو شیزا کے موضوع پر اس سے ایک لفظ بھی کہنا سننا گوارہ نہیں کرتا تھا تو پھر وہ کس سے بات کرتی؟ کس کو سمجھاتی؟

اس روز وہ لنچ کے بعد' اریج احمر کے ساتھ ریسٹورنٹ سے باہر نکلی تو کچھ ہی فاصلے پر گاڑی میں بیٹھے اشعر اور شیزا نے بخوبی یہ منظر دیکھا تھا۔

شیزا کچھ ہی دیر قبل' یہاں سے گزرتے ہوئے اسے اریج کے ساتھ بیٹھا دیکھ گئی تھی' تب ہی نصیب کی یاوری پر شکر بجالاتے ہوئے وہ بہانے سے اشعر کو اس طرف لائی' تاکہ اشعر اسے اریج احمر کے ساتھ بیٹھا دیکھ کر اپنے شک میں مزید بڑھ جائے اور وہ جلد سے جلد اپنی منزل کو پالے۔

''کیا دیکھ رہے ہو اشعر......؟ یہ تو اریج کے روز کا معمول ہے......''

اشعر کی سلگتی آنکھوں میں ناچتی وحشت کو دیکھ کر اس نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا' عین اسی لمحے اریج احمر کے ساتھ قدم بہ قدم چلتی' تمکین رضا کا پاؤں' کمزوری کے باعث ہلکا سا لڑکھڑایا اور لمحے کے ہزارویں حصے سے قبل اریج احمر نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی بانہوں میں سنبھال لیا۔

وہ شکی یا کم ظرف نہیں تھا مگر مشرقی مرد تھا۔ جو خواہ کتنا بھی آوارہ کیوں نہ ہو' اپنی بیوی کے لیے اس کی سوچ محدود ہی ہوتی ہے۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں وحشت ناچ رہی تھی۔ تب ہی وہ بنا ایک پل مزید وہاں ٹھہرے تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

رات کو بارہ بجے کے بعد وہ گھر واپس لوٹا۔ تو تمکین تیز بخار میں جل رہی تھی مگر اسے قطعی پرواہ نہیں تھی کیونکہ اس کا تو اپنا دل بری طرح سے جل رہا تھا اور اس جلن کی تپش لحظہ بہ لحظہ اسے سلگا رہی تھی جلا کر خاک کر رہی تھی۔ تمکین جسے وہ بچپن سے ٹوٹ کر چاہتا آیا تھا۔ پل پل جس کے تصور کو اس نے اپنی خوشی سمجھا تھا' آج وہی تمکین اس کے دل کے ساتھ کھلواڑ کر رہی تھی اور وہ چپ چاپ سلگ رہا تھا' کیوں......؟

وہ کوئی کھلونا تو نہیں تھا کہ جس کے ساتھ کھیلا جاتا' اور نہ ہی اس کا پیار اتنا سستا تھا کہ وہ محض جسم پر اکتفا کر لیتا۔ اس نے تمکین کی روح کے ساتھ پیار کیا تھا۔ اس کے خوب صورت جسم کے ساتھ نہیں کہ اسے خود اپنی آنکھوں سے کسی اور کے ساتھ دیکھ کر بھی وہ انجان بن جاتا' حقیقت سے آنکھیں چرا لیتا۔

اگر تمکین اس کا انتظار نہیں کر سکتی تھی تو پھر وہ سب کیا تھا' جو وہ روزانہ چیٹنگ کے دوران اس سے کہا کرتی تھی۔ وہ روز کے فون' وہ کارڈز' وہ

ای میل پیغام' وہ محبت کی چاشنی میں ڈوبا' اس کا ایک ایک لفظ کیا تھا وہ سب محض ایک فریب' ایک جھوٹ' جو وہ روزانہ بڑے دھڑلے کے ساتھ اس سے بولتی رہی تھی کیوں......؟

آخر کیوں اسے تمکین کی آنکھوں میں دیکھ کر یہ اندازہ نہیں ہوا کہ وہ اس سے پیار نہیں کرتی۔ وہ اس کی خوب صورت آنکھوں میں رقص کرتے محبت کے پیغام جھٹلانے کے لائق تو نہیں تھے پھر کیوں کھلونا بن کر رہ گیا تھا وہ آخر کیوں......؟''

آج اسے یاد آرہا تھا کہ جب وہ اپنا ہنی مون منانے کے لیے شمالی علاقہ جات کی طرف گئے تھے تو اریج احمر وہاں کیوں ملا تھا اسے؟ وہ محض اک اتفاق نہیں تھا' وہ تمکین اور اریج کی محبت کی سچائی تھی' جس سے وہ بے خبر تھا' لیکن اب وہ بے خبر نہیں رہنا چاہتا تھا۔ اگر شیزا یہ سب کچھ ہزار سالوں تک بھی اس سے کہتی رہتی تو وہ کبھی تمکین کے پیار پر شک نہ کرتا لیکن ایک ایک منظر کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بھی اسے تسلیم نہ کرنا سراسر دل کو بہلانے والی بات تھی اور اب تمکین کے جھوٹے پیار سے اپنے دل کو بہلانا نہیں چاہتا تھا۔ سو اندر ہی اندر وہ سنگ کر دائمی جدائی کا فیصلہ کرتے ہوئے وہ بری طرح سے بکھر گیا۔ وہ رات اور اس رات کا ایک ایک لمحہ اس پر کس قدر بھاری تھا۔ یہ محض اس کا دل جانتا تھا۔ تمکین کے پہلو میں بیٹھے وہ کتنی دیر تک آنسو بہاتا رہا تھا۔ وہ پوری رات اس کی آنکھوں میں کٹی تھی۔ تمکین بخار کی شدت سے ساری رات کروٹیں بدلتی رہی تھی مگر وہ بے حس بنا' پتھر کی طرح بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ صبح جب تمکین کی آنکھ کھلی تب بھی وہ اسی پوزیشن میں بیٹھا تھا۔

''اٹھ کر اپنی پیکنگ کر لو تمکین' کیونکہ میں ابھی اور اسی وقت تمہیں ''حسن ولاج'' چھوڑ کر آرہا ہوں......''

پریشان حال' سرخ سوجی ہوئی آنکھیں اور بے ترتیب بکھرے بال وہ تو ٹکر ٹکر اسے دیکھتی ہی رہ گئی تھی کہ جو اس وقت یکسر اجنبی بنا بیٹھا تھا۔

وہ ایک یاد کہ ہر لمحہ ذہن میں جاگی
وہ ایک ذکر کہ لہجہ بھی ہم بدل نہ سکے
وہ ایک نام کہ جس نام کو نہ بھولے کبھی
وہ ایک راہ جگہ جس راہ سے نکل نہ سکے

بہت آسان لفظوں میں سکوں آمیز لہجے میں
تعلق توڑنے کی جانِ جاں تم بات کرتے ہو
بہت نادان ہو تم بھی
تعلق کو فقط اک ریت کی دیوار سمجھتے ہو
تمہیں ہم کیسے سمجھائیں
تعلق ریت کی دیوار تو ہرگز نہیں ہوتا۔
کہ تعلق تو وہ کوہِ جاوداں ہے
کہ جس کو جو بھی توڑنا چاہے
وہ خود صدمات کے شیشوں سے کٹ جائے
کئی ٹکڑوں میں بٹ جائے

پورے کمرے میں خاموشی کا راج تھا اور وہ ٹکر ٹکر خاموش نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اعصاب تو پہلے ہی نڈھال تھے۔ آنکھیں درد اور بخار کی شدت سے جل رہی تھیں۔ پورے بدن میں شدید درد ہو رہا تھا۔ اٹھنے کی سکت نہ رہی تھی اور وہ آنکھیں کھولے بے بسی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جب وہ مزید چراغ پا ہو کر اس پر چلا اٹھا۔

''ایک بار کا کہا سنائی نہیں دیا تمہیں۔ یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میری طرف کیا دیکھ رہی ہو؟ جو کہا ہے اس پر عمل کرو۔''

انتہائی ترشی سے کہنے کے ساتھ ہی وہ بیڈ سے نیچے اتر گیا تھا جبکہ تمکین اب بھی حیرانگی کا مجسمہ بنی اس کے تیکھے لفظوں کی بازگشت پر غور کر رہی تھی۔ اس وقت بستر سے اٹھ کر کہیں بھی جانے کی پیکنگ کرنا اس کے لیے آسان نہیں تھا لیکن وہ اشعر کو مزید چلانے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔ سو جیسے بھی ہو سکا اپنے چند سوٹ بیگ میں ٹھونس کر وہ اپنے کمرے سے باہر نکل آئی۔

اشعر جو اس وقت ٹی وی لاؤنج میں صوفے پر بیٹھا نیوز چینل دیکھ رہا تھا اسے کمرے سے نکلتے دیکھ کر ٹی وی آف کیا پھر بنا اس پر کوئی نظر

ڈالے وہ بیگ اٹھا کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ تمکین کے لیے اس کا یہ انداز قطعی سمجھ سے باہر تھا مگر پھر بھی وہ خاموش تھی۔

اشعر بیگ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر پھینک کر واپس پلٹا پھر اسے بازو سے تھام کر فرنٹ سیٹ پر دھکیلتے ہوئے خود بھی گاڑی میں آ بیٹھا۔

سامنے روڈ قطعی خالی نہیں تھا لیکن اس کے باوجود انتہائی ریش ڈرائیونگ کرتے ہوئے اگلے پندرہ بیس منٹ میں ''حسن ولاج'' پہنچ گیا جہاں اس وقت سب لوگ ناشتے کی ٹیبل کے گرد بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

''ارے تمکین بیٹی! تم اس وقت یہاں......؟''

دادا جی کی نظر سب سے پہلے اس پر پڑی تھی لہٰذا وہ فوراً اپنی سیٹ سے اٹھ کر اس کے قریب چلے آئے ان کے پیچھے ہی رضا احمد' آسیہ بیگم' عائشہ بیگم اور گھر کے دیگر لوگ بھی اپنی اپنی سیٹوں سے اٹھ کر تمکین کے پاس چلے آئے۔

''دادا جی! آئی ایم سوری کہ مجھے ایک ارجنٹ ڈیلنگ کے سلسلے میں فوری بنگلور کے لیے روانہ ہونا ہے لہٰذا میں تمکین کو آپ کے پاس چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ کوشش کروں گا کہ جلد واپسی ہو جائے لیکن پندرہ بیس دن تو لگ ہی جائیں گے۔ اس لیے آپ فکر مت کیجیے گا اوکے......''

تمکین کے پیچھے ہی وسیع لاؤنج میں قدم رکھتے ہوئے عجلت سے اس نے کہا اور پھر سب کے اصرار کے باوجود وہاں ایک پل بھی ٹھہرے بغیر وہ جس تیزی کے ساتھ یہاں آیا تھا اسی تیزی کے ساتھ واپس پلٹ گیا۔ گھر میں سب لوگوں نے خاصے پُرتپاک انداز کے ساتھ اسے ویلکم کہا تھا مگر اس کا ذہن برابر اشعر کے رویے میں رہا۔ تنہائیاں ایک دم سے اس کا مقدر ہو کر رہ گئی تھیں۔

گھر میں سب لوگ اس کا کتنا خیال رکھ رہے تھے مگر اسے قرار نہیں تھا۔ اشعر سے ملے بغیر' اسے دیکھے بغیر وہ جیسے دیوانی ہو رہی تھی۔ کتنے بہت سے دن گزر گئے تھے اسے بنگلور گئے ہوئے مگر تب سے ایک بار بھی اس نے پلٹ کر تمکین کی خبر نہیں لی تھی۔ جس کا دل اندر ہی اندر مختلف اندیشوں' مختلف وسوسوں کے خوف سے ڈوبتا جا رہا تھا۔ فقط چند ہی دنوں میں کتنی کمزور ہو کر رہ گئی تھی وہ......

اشعر کی ناراضگی' اس کا بیگانہ پن لحہ لحہ سلگا رہے تھے اسے۔ مگر مصیبت تو یہ تھی کہ وہ اپنے دل کا یہ حال کسی پر عیاں بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اریج احمر کی معرفت اسے معلوم ہوا تھا کہ شیزا اشعر کے ساتھ ہی بنگلور گئی ہے اور تب سے وہ جلے پیر کی بلی کی مانند تڑپ رہی تھی۔ نجانے کیوں انجانے سے طوفان کا خوف اس کی جان خشک کر رہا تھا۔ اریج احمر کی معرفت ہی یہ بات اس کے علم میں آئی تھی کہ اشعر بنگلور جانے سے قبل اپنا شیئر اس سے الگ کر چکا ہے اس کی تو قطعی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟

اشعر نے اریج احمر سے گہری دوستی کے باوجود اپنا شیئر اس سے الگ کیوں کر لیا ہے؟ وہ جتنا سوچنا چاہتی تھی اتنا ہی اس کا ذہن الجھتا جا رہا تھا۔

عورت خواہ ماں ہو' بیوی ہو یا بیٹی' ٹوٹ کر اس وقت بکھرتی ہے کہ جب مرد سے وابستہ اس کا مان ٹوٹ جاتا ہے اور یہ مان توڑنے والا مرد' خواہ شوہر ہو' باپ ہو یا بیٹا' چوٹ برابر کی لگتی ہے درد ایک جیسا ہوتا ہے۔ اسے بھی اشعر کے پیار پر بہت مان تھا۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ اشعر بھی اس سے نگاہیں پھیر کر کسی اور کی زلفوں کا اسیر ہو سکتا ہے مگر آج حالات جس رو میں بہہ رہے تھے اس نے نجانے کیوں تمکین کو اشعر پہ قائم اپنا ایمان

اور اعتقاد ٹوٹا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

لندن سے اشعر کے ممی پاپا اچانک پھر سے پاکستان واپس چلے آئے تھے اور ان کی یوں چپکے چپکے آمد پر پورے ''حسن ولاج'' میں خوشیوں کے ڈھیروں پھول کھل اٹھے تھے۔

محل جیسے ''حسن ولاج'' میں آنے والے مہمانوں کا پرتپاک استقبال ہو رہا تھا۔ ہر طرف گویا شادیانے بج اٹھے تھے مگر تمکین کا اداس دل ہنوز پریشان تھا۔

سعید احمد اور رخسانہ بیگم کی ہمیشہ کے لیے پاکستان واپسی پر سب ہی بے حد مسرور تھے۔ اسپیشلی دادا جی اور دادی، اماں کی خوشیاں تو دیکھنے لائق تھیں۔ پھر ساتھ والے پورشن سے فاروق انکل' سمیہ بیگم' عاشر بھائی اور ان کی مسز نورینہ بیگم بھی ادھر ہی چلے آئے تھے اور اس وقت ایک دوسرے کی کمپنی کو انجوائے کرتے ہوئے بھرپور قہقہے لگا رہے تھے۔

سعید صاحب اور رخسانہ بیگم' اسے اپنے ساتھ لگائے بہت پیار کر رہے تھے مگر اس کی آنکھوں میں تو درد نے ڈیرہ ڈال لیا تھا۔ کڑے انتظار کی تکلیف دہ گھڑیوں نے نڈھال کر چھوڑا تھا اسے۔ بقول بابا فرید

ہر ویلے تانگاں یاردیاں' میں تے بیٹھی کاگ اوڈاواں
آپ ونجاں کہ میں قاصد بھیجاں' میرا تھی گیا حال نماناں
پردیس گیوں پردیسی ہویوں وے کدی یاد وطناں ول پھیرا
ساون وانگوں روندیاں اکھیاں' ہائے دل نیوں لگدا میرا
یار باجھوں ہن جیون کیڑا' تے میرے اندر درد ہزاراں
غلام فریدا میں تے انج روواں' جیوں وچھڑی کونج قطاراں

اشعر کو گئے پورے بیس روز ہو چکے تھے اور ان بیس روز کا ایک ایک لمحہ اس نے انگلی پر دن گن گن کر گزارا تھا کہ اگلی ہی شام اچانک وہ چلا آیا۔ تھکا تھکا سا نڈھال۔

رخسانہ بیگم اور سعید احمد نے تو اسے دیکھتے ہی خوب ریکارڈ لگایا تھا۔ وہ ان دونوں کے حال کو اس پندرہ بیس روز کی مختصر جدائی سے مشروط کر رہے تھے جو ابھی حال ہی میں اشعر کی بزنس مصروفیت کے باعث ان کے درمیان آئی تھی اور جس کے لیے رخسانہ بیگم نے اشعر کے کان کھینچتے ہوئے اسے خوب ڈانٹ بھی پلائی تھی۔ وہ بھلا کہاں جانتے تھے کہ ان کے بیچ آج کل کیا چل رہا ہے؟

رات دیر تلک' سعید صاحب اور رخسانہ بیگم کے ساتھ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد وہ اپنے کمرے میں آیا تو تمکین اس سے الجھے بغیر نہ رہ سکی۔

''تمہیں کیا ہو گیا ہے اشعر! تم پہلے تو ایسے نہیں تھے......؟''

''ہاں۔تم بھی تو ایسی نہیں تھیں......''

وہ تو جیسے اس سوال کے لیے تیار بیٹھا تھا۔لہٰذا فوراً دو بدو جواب دیا تو تمکین حیرانگی سے اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

''مم......مگر میں نے کیا کیا ہے؟ چھوڑ کر تم مجھے گئے تھے۔کمی تمہاری محبت میں آئی ہے اور الزام تم مجھے دے رہے ہو......''

''ہاں دے رہا ہوں۔میں تمہیں الزام،کیوں کہ تم قصوروار ہو۔تجھی تم......''

اس کے تلخ لہجے پر ضبط کے باوجود وہ اونچی آواز میں چلایا تھا۔جواب میں تمکین حیرانگی سے اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

''مم......مگر میرا قصور کیا ہے......؟''

بہت دھیمی آواز میں وہ بڑبڑائی تھی جب وہ مشتعل ہوتے ہوئے بولا۔

''قصور......قصور پوچھتی ہو تم اپنا......تو سنو تمکین بیگم تمہارا قصور یہ ہے کہ تم نے میرے سچے پیار کے ساتھ کھیل کیا ہے۔دھوکہ دیا ہے مجھے اپنی پُر فریب محبت کا۔تم کیا سمجھیں کہ مجھے کبھی تمہاری اصلیت کا پتہ نہیں لگے گا۔میں ہمیشہ تمہارے ہاتھوں کٹھ پتلی بنا رہوں گا۔نہیں تمکین بیگم......اشعر کوئی مٹی کا کھلونا نہیں ہے۔جس سے تم اپنا دل بہلاؤ اور بعد میں توڑ پھوڑ کر پھینک دو۔نہ ہی میں ابھی اتنا دیوانہ ہوا ہوں کہ تمہاری جھوٹی محبت کا زہر قطرہ قطرہ پی کر ختم ہوتا رہوں۔کان کھول کر سن لو تمکین میرے اور تمہارے راستے اب کبھی ایک نہیں ہو سکتے......''

''یہ......یہ تم کیا کہہ رہے ہو اشعر......میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا......''

اس کے سلگتے لفظوں پر کسی درخت سے کٹی ہوئی ٹہنی کی طرح وہ بیڈ پر بیٹھی اور اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

''پلیز! سٹاپ اٹ تمکین! بہت فریب دے لیا تم نے مجھے۔بہت ہو گئی تمہاری دھوکے بازیاں۔اب مزید بے وقوف نہیں بنوں گا میں لہٰذا بند کرو یہ انجان بننے کا ڈرامہ......''

اسے بیڈ پر گرتے دیکھ کر وہ مزید غصے ہوا تھا تب ہی تمکین بلک بلک کر رو پڑی۔

''کچھ سمجھ نہیں آرہا کہ تم یہ سب کیوں کر رہے ہو اشعر! پلیز مت کرو ایسا۔نہیں برداشت کر سکتی میں یہ سب......''

''میں نے کیا کیا ہے میڈم! جو کچھ بھی کیا ہے وہ تم نے کیا ہے۔میں تو صرف تماشہ بنا ہوں اور وہ بھی خود تمہارے ہاتھوں سے۔تم اپنا قصور جاننا چاہتی ہو ناں......تو لو پڑھو یہ ڈائری اور بتاؤ مجھے کہ ظلم تم نے مجھ پر کیا ہے......یا میں تم پر کر رہا ہوں......''

اپنے سفری بیگ سے اریبہ احمر کی پرسنل ڈائری نکال کر تمکین کی گود میں پھینکتے ہوئے وہ پھر چلایا تھا تب ہی گم صم سی تمکین رضا نے کانپتے ہاتھوں سے ڈائری کھول کر اس کا مطالعہ شروع کر دیا اور جوں جوں وہ صفحے پلٹتی گئی اس پر حقیقتوں کے در وا ہوتے گئے۔

☆☆☆

''از میر بیٹے! یہ اریشہ کیا کہہ رہی ہے......؟''

وہ جاگنگ کے لیے ٹریک سوٹ پہنے لان سے گزر رہا تھا جب حائقہ بیگم کی پکار پر اسے واپس پلٹنا پڑا۔

''کیا کہہ رہی ہیں مما؟''

واپس پلٹ کر چند قدموں کا فاصلہ طے کرتے ہوئے اس نے حائقہ بیگم کے پہلو میں کھڑی اریشہ خان کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

''تم انگلینڈ جا رہے ہو۔ کیا یہ سچ ہے......؟''

''جی مما!''

''لیکن کیوں ازمیر! تم وہاں شہزرین خان کیلئے جا رہے تھے ناں مگر اب تو تم نے سائلہ خان کو پا لیا ہے۔ پھر اب وہاں کیوں جا رہے ہو؟''

انہیں تو جیسے اریشہ کی اطلاع پر یقین ہی نہیں آیا تھا۔ تب ہی وہ نگاہ پھیرتے ہوئے بولا۔

''اس سے آخری بار ملنے کے لیے جا رہا ہوں مما پھر کبھی نہیں جاؤں گا......''

''لیکن کیوں بیٹے! جس منزل کو پانا ہی نہیں اس کا راستہ کیا پوچھنا؟'' وہ خاصی الجھی تھیں جب وہ اسی انداز میں بولا۔

''میں اسے بھلا نہیں سکتا مما! اور جہاں تک سائلہ خان کا سوال ہے تو یہ میں نے صرف آپ کی اور صالحہ بھابھی کی خوشی کے لیے کیا ہے۔ میری اپنی خوشی اس میں شامل نہیں ہے۔''

''جھوٹ...... جھوٹ بول رہے ہو تم...... تم نے خود صالحہ بھابھی سے کہا تھا کہ تم اسے پسند کرتے ہو اور وہ تمہیں اچھی لگتی ہے۔ اب تم اپنی بات سے پھر نہیں سکتے ازمیر......''

اس سے پہلے کہ حائقہ بیگم اس سے کچھ مزید کہتیں۔ اریشہ اس سے الجھ پڑی۔ جواب میں اس نے بھرپور نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے اریشہ۔ میں نے صالحہ بھابھی سے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔''

''تم اپنی بات سے پھر رہے ہو ازمیر! میں نے خود اپنے کانوں سے تمہیں یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ تمہیں سائلہ اچھی لگی ہے......''

''سو وہاٹ اریشہ! اچھا لگنے میں اور محبت کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے مگر تم یہ فرق کبھی نہیں سمجھ سکیں......'' اسے یہ بحث لطف دے رہی تھی تب ہی مسکراتے ہوئے بولا تو اریشہ سر جھٹک کر رہ گئی۔

ازمیر کو خاموش پا کر پھر سے حائقہ بیگم نے سوال کیا تھا۔ جب وہ سر جھٹکتے ہوئے دھیمے سے مسکرا کر بولا۔

''اریشہ تو پاگل ہے مما۔''

''ہاں میں تو پاگل ہی ہوں۔ ساری دنیا میں ایک تم ہی تو عقل مند رہ گئے ہو ناں......''

اچھا خاصا چڑ کر وہ وہاں سے چلی گئی تھی جب ازمیر شاہ نے بے ساختہ ہی بلند قہقہہ لگایا۔

''مجھے دیر ہو رہی ہے مما! انشاء اللہ واپس آ کر آپ سے اس مسئلے پر بات کرتا ہوں۔''

اریشہ کے جاتے ہی وہ بھی جانے کے لیے پر تولنے لگا تو قدرے متفکر سی حائقہ بیگم مشکوک نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے وہاں

سے کچن کی طرف چلی آئیں۔

''او مائی گاڈ اریشہ! تم کیا جانو کہ میں یہ بن باس کیوں کاٹ رہا ہوں؟ کیوں فرار چاہتا ہوں؟ میں ان موسموں سے شہرین خان تو اک بہانہ ہے میرے لیے لیکن میں تمہیں یہ کیسے بتاؤں کہ میں اپنی آنکھوں کے سامنے تمہیں کسی اور کی زندگی میں آتے نہیں دیکھ سکتا۔ تم میرے دل کی کیفیت کبھی نہیں سمجھو گی اریشہ تم نے خود یہ تکلیف جھیلی ہوتی تو تمہیں پتا چلتا کہ دل کا درد کیا ہوتا ہے۔ تم نے کسی کو ٹوٹ کر چاہنے کے بعد اسے کھو دینے کا درد سمیٹا ہوتا تو تم میرے دل کا حال سمجھتیں لیکن تم سے کیا کہوں اریشہ..... تم تو بے خبر ہو انجان ہو میرے پیار سے اور خدا کرے کہ ہمیشہ یوں ہی انجان رہو کیونکہ میں تمہاری آنکھوں میں اپنے لیے حقارت نہیں دیکھ سکتا.....''

لان سے نکل کر سامنے روڈ پر چھوٹے چھوٹے اسٹیپ اٹھاتے ہوئے اس نے سوچا اور ایک سرد آہ خنک فضاؤں کے سپرد کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد وہ واک سے واپس آیا تو اریشہ لان میں پودوں کو پانی دے رہی تھی اور سائرہ خان اس کے قریب ہی کین کی کرسی پر بیٹھی خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔ آج چونکہ سنڈے تھا لہٰذا سب ہی چھٹی انجوائے کر رہے تھے.....

''لو آ گیا تمہارا شہزادہ گلفام.....''

پودوں کو پانی دیتے ہوئے اریشہ کی نگاہ جوں ہی اس پر پڑی۔ اس نے سائرہ خان کو مطلع کر دیا۔ جواب میں سائرہ خان نے ایک دوستانہ سی مسکراہٹ اس کی سمت اچھال دی۔

''السلام علیکم! کیسے ہیں آپ.....؟''

مسکرا کر بڑے فریش انداز میں اس نے پوچھا تھا۔ جبکہ وہ چھوٹے چھوٹے اسٹیپ اٹھاتے ہوئے اس کے مقابل آ بیٹھا۔

''الحمدللہ! آپ سنائیں آج صبح ہی صبح ہماری یاد کیسے آ گئی آپ کو.....؟''

''بس آ ہی گئی..... وہ کیا ہے کہ آج سنڈے تھا تو میں نے سوچا چلو اس چھٹی کو آپ لوگوں کے ساتھ سیلیبریٹ کیا جائے.....''

''شکریہ! بڑی عقل مندی کا مظاہرہ کیا آپ نے.....'' اس کی بات پر وہ زیر لب مسکرایا تھا۔

''ہاں۔ میں ایسے چھوٹے موٹے مظاہرے اکثر کرتی رہتی ہوں.....''

وہ بھی بھرپور زندہ دل لڑکی تھی بھلا کیسے پیچھے رہ جاتی تب ہی وہ تو بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑا تھا۔ ''آپ کی ہنسی بہت خوب صورت ہے ازمیر'' اسے کھلکھلاتے دیکھ کر وہ کہیں کھو گئی تھی۔ جیسا اریشہ نے ایک دم سے چونک کر اس کی سمت دیکھا۔

''تھینک یو۔ دنیا میں آپ واحد لڑکی ہیں جو یوں کھل کر میری تعریف کرتی ہیں۔''

ازمیر کے لب اب بھی مسکرا رہے تھے مگر اریشہ کے چہرے پر مایوسی بکھر گئی۔ نجانے کیوں اسے سائرہ خان کا اس طرح سے ازمیر کی تعریف کر کے اپنا پیار جتانا اچھا نہیں لگا تھا۔

''ازمیر! مجھے کچھ شاپنگ کرنا تھی۔ کیا آپ میرے ساتھ چل سکیں گے؟''

اگلے ہی پل سائلہ خان نے پوچھا تھا۔ جب وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''ایک تو یار یہ تم لڑکیوں کو شاپنگ کے علاوہ اور کوئی کام نہیں۔ خیر جب دل کا سودا آپ سے کر ہی لیا ہے تو پھر ساتھ کیوں نہیں چلیں گے۔ ضرور چلیں گے......''

اریشہ کو محسوس ہوا تھا کہ وہ آج سائلہ خان کی کمپنی میں روز کی نسبت زیادہ فریش تھا۔ تب ہی اس کا دل جیسے ڈوب سا گیا۔

یہ حقیقت تھی کہ وہ اس کا نہیں تھا اور نہ ہی کبھی ہو سکتا تھا لیکن پھر بھی وہ یہ حقیقت برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ اس کے علاوہ کوئی اور اسے محبت بھری نظروں سے دیکھے اس کی تعریف کرے۔ اس پر اپنا حق جتائے یا پھر وہ خود ہی کسی اور کو اس پر اہمیت دے۔ کسی اور کی طرف متوجہ ہو۔

گو یہ حماقت تھی۔ سراسر حماقت...... مگر وہ یہ حماقت کرنے پر دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔

''اریشہ! تم بھی چل رہی ہوناں! ہمارے ساتھ......''

وہ اپنے خیالوں میں کھوئی کھڑی تھی جب ازمیر نے اسے مخاطب کیا۔ جواب میں وہ خالی خالی سی نگاہوں سے چونک کر اس کی سمت دیکھنے لگی۔

''م...... میں کیا کروں گی جا کر؟ تم دونوں ہی چلے جاؤ ناں......''

''نہیں...... تم بھی ہمارے ساتھ چل رہی ہو۔ جاؤ جا کر فٹافٹ تیار ہو جاؤ۔''

اس کے انکار پر ازمیر نے سختی سے کہا تھا۔ جواب میں وہ خالی خالی سے ذہن کے ساتھ پائپ پودوں میں پھینک کر اپنے کمرے کی طرف چلی آئی۔

اندر ہی اندر اسے ازمیر پر غصہ بھی آ رہا تھا کہ اس نے خوامخواہ اسے گھسیٹ کر درمیان میں ہڈی بنانے والی بات کی تھی۔ سائلہ خان اس کے ساتھ وقت گزارنا چاہتی تھی۔ اسے سمجھنے کے لیے کچھ لمحوں کو قید کرنا چاہتی تھی مگر ازمیر نے اس کی فیلنگز کو نہ سمجھتے ہوئے بے کار میں اریشہ کو آفر کر دی جسے وہ چاہ کر بھی جھٹلا نہیں سکتی تھی۔ البتہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اس نے ازمیر کو سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر وہ عقل میں ماسٹرز کہاں سمجھ سکتا تھا ان نزاکتوں کو۔ سو بڑے آرام سے نگاہیں پھیر کر اس کی طرف سے لاپرواہ ہو گیا تو مجبوراً اسے ان دونوں کے ساتھ شاپنگ کے لیے چلنا ہی پڑا۔

اریشہ نے محسوس کیا تھا کہ سائلہ کو اس طرح سے ان دونوں کے بیچ آنا اچھا نہیں لگا تب ہی وہ خاموش سی ہو گئی تھی مگر وہ کیا کرتی۔ ازمیر نے تو جیسے ضد باندھ لی تھی کہ اسے ہر حال میں ساتھ چلنا ہے ورنہ وہ دونوں بھی کہیں نہیں جائیں گے۔

وہ چاہتی تھی کہ گاڑی میں سائلہ ازمیر کے ساتھ ہی بیٹھے مگر سائلہ نے ایسا نہیں کیا تھا۔ وہ اپنی مرضی سے چپ چاپ پیچھے آ کر اس کے برابر بیٹھ گئی تھی۔

''ازمیر! میں نے سنا ہے کہ آپ پرسوں انگلینڈ جا رہے ہیں......''

دوران سفر سائلہ نے سوال کیا تھا۔ جواب میں وہ دھیمے سے مسکراتے ہوئے بولا۔

''کس سے سن لیا آپ نے......؟''

''صالحہ آپی بتا رہی تھیں۔'' ''ہاں کچھ کام ہے وہاں جلد واپس آ جاؤں گا۔''

''لیکن آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔''

''بس یوں ہی۔ میں نے سوچا آپ خواہ مخواہ ٹینس ہو جائیں گی۔ کیا فائدہ......''

اس کی توجہ مکمل طور پر ڈرائیونگ کی طرف مرکوز تھی۔ جب سائلہ خان نے پھر سے کہا۔

''جا کیوں رہے ہیں......؟ کوئی خاص کام ہے کیا......؟''

''ہاں بس یہی سمجھ لو۔ ویسے آپ تو بڑی پنکچوئل گرل ہیں یار...... آپ کہاں ایسی جذباتیت میں الجھ گئیں......''

وہ زیر لب مسکرایا تھا۔ تب ہی ان کی مطلوبہ شاپ آ گئی تو ازمیر نے سائلہ سے مزید کچھ کہے بنا گاڑی روک دی۔

''سائلہ! یہ بریسلٹ دیکھو۔ تم پر بہت اچھا لگے گا۔''

سب سے پہلے وہ لوگ جیولر شاپ کی طرف آئے تھے کیونکہ ازمیر جانے سے قبل سائلہ کو اس کی عنقریب برتھ ڈے کے حوالے سے کچھ گفٹ کرنا چاہتا تھا۔ اسی سلسلے میں وہ قیمتی بریسلٹ چوز کر رہا تھا اور اریشہ ایک طرف تھرڈ پرسن کی طرح گم صم کھڑی اس کی یہ وارفتگیاں دیکھ رہی تھی۔ آپ سے تم کا مرحلہ بڑی جلدی طے ہو گیا تھا تب ہی اس نے سائلہ کے گلابی ہونٹوں پر بڑی مسحور کن سی مسکراہٹ بکھرتے دیکھی۔

''ارے یہ سبز چوڑیاں تو تمہاری کلائی میں بہت ہی جچ رہی ہیں۔ ہے ناں......''

جیولر شاپ سے نکل کر وہ لوگ چوڑیوں کی مارکیٹ کی طرف چلے آئے تھے۔ ایسے لمحات میں ازمیر نے اریشہ کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔ تب ہی وہ خود کو سخت اکورڈ سا محسوس کر رہی تھی۔

''یہ آف وائیٹ ڈریس تو بہت ہی سوٹ کرے گا تم پر...... ہے نا اریشہ......''

انتہائی قیمتی سوٹ سائلہ کے لیے پسند کرتے ہوئے اس نے پہلی مرتبہ اریشہ خان سے رائے لی تھی۔ جواب میں اس نے چپ چاپ سوٹ پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''سنو...... کیا تمہیں بھی کچھ خریدنا ہے......؟''

سائلہ خان کی شاپنگ سے مکمل طور پر فارغ ہونے کے بعد اس نے اریشہ سے پوچھا تھا کہ جس کی آنکھیں ضبط کی شدت سے سرخ ہو رہی تھیں۔ ''نہیں...... مجھے تو کچھ بھی نہیں خریدنا...... میں تو بس یوں ہی تم لوگوں کا ساتھ دینے کے لیے چلی آئی۔''

اس وقت اس سے اپنا بھرم رکھنا بہت دشوار ہو رہا تھا مگر پھر بھی اس نے اپنا ضبط ڈولنے نہیں دیا۔

''اوکے...... تو پھر کیا خیال ہے سائلہ! کسی اچھے سے ریستوران میں چل کر تمہاری پسند کی آئس کریم کے ساتھ آج کا شاندار لنچ نہ کیا

جائے۔''

اس نے فوراً ہی توجہ اریشہ خان سے ہٹا کر سائلہ خان کی طرف مرکوز کر دی تھی جس پر وہ دکھ سے کٹ کر رہ گئی جب کہ اس کے مقابل کھڑی مسرور سی سائلہ خان نے خوشی خوشی فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تم کتنے اچھے ہو ازمیر! تمہیں میری خوشی کا کتنا خیال ہے.....؟''

وہ ازمیر کی اس درجہ توجہ پر خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھی تب ہی وہ کھلکھلا کر ہنس دیا۔

''میں تو اپنی خوشی کے لیے یہ سب کر رہا ہوں کیونکہ تم جیسا حسین ہم سفر ساتھ ہو تو کون کافر ہے جو وقت کے ایک بھی لمحے کو انجوائے کیے بغیر ہاتھ سے پھسلا دے۔''

اریشہ نے آج سے پہلے اسے اتنا خوش کبھی نہیں دیکھا تھا۔

''ازمیر! تم ضرورت سے زیادہ رومینٹک ہونے کی کوشش کر رہے ہو۔''

قدم باقدم ازمیر شاہ کے ساتھ چلتی ہوئی سائلہ خان نے دھیمے سے مسکرا کر اسے گھورا تھا جب وہ پھر سے ہنس دیا۔

''دو دن کی بات ہے۔ پھر اسی رومانس ان ہی لمحات کو یاد کرو گی تم۔''

آج وہ دونوں اپنی اپنی رو میں بہہ کر اریشہ خان کے وجود کو یکسر فراموش کر گئے تھے جو بظاہر ان لوگوں کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی ان کے ساتھ نہیں تھی۔

''چلو بتاؤ سائلہ کیا کھاؤ گی آج......''

اپنی مطلوبہ ٹیبل پر بیٹھتے ہی مسرور سے ازمیر شاہ نے سائلہ خان سے پوچھا تھا۔ جواب میں وہ مینو کارڈ پر نگاہ دوڑاتے ہوئے بولی۔ ''چکن بریانی اور ساتھ میں فش کباب۔''

''لیکن مجھے تو بریانی پسند نہیں ہے......''

اریشہ نے پہلی بار اس کی پسند پر اختلاف کیا تھا۔ جواب میں وہ اپنے عنابی ہونٹ سمیٹ کر خاموشی سے ازمیر شاہ کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

''بریانی تو ہر فرد کی پسندیدہ ڈش ہے پلیز تم ٹیسٹ تو کرو۔''

ازمیر شاہ نے سائلہ خان کا دل رکھنے کے لیے اسے فورس کرنے کی کوشش کی تھی مگر ناکام رہا۔

''سوری...... میں بریانی نہیں کھاتی۔''

وہ آج یکسر بدلے ہوئے ازمیر شاہ کے رویے سے شدید ہرٹ ہوئی بیٹھی تھی۔ تب ہی گلوگیر لہجے کے ساتھ ضد باندھی تو وہ چپ چاپ ایک نظر اسے دیکھ کر رہ گیا۔ تب ہی ہوٹل کا منیجر ان کے قریب چلا آیا۔

''ہیلو! آپ میں اریشہ بی بی کون ہیں......؟''

منیجر کے ان کے پاس چل کر آنے اور یہ سوال پوچھنے پر ازمیر شاہ نے خاصی حیرت سے اس کی طرف دیکھا تھا جب ارشہ نے اپنی پہچان کروائی۔

''ارشہ جی! اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو دو منٹ کے لیے میرے ساتھ آیئے پلیز......''

وہ ہوٹل کا منیجر ہو کر اتنی عاجزی کے ساتھ اس سے بات کر رہا تھا کہ ارشہ سمیت ازمیر اور سائلہ بھی حیرت سے گنگ رہ گئے تھے۔

☆☆☆

تم نے مجھ سے مجھے جدا کر کے
شیشۂ دل کو آئینہ کر کے
عکس اس میں اتار کر اپنا
رکھ دیا بھولی بسری چیزوں میں
وقت کی ان کھلی درازوں میں
کسی بے نام سے گماں کے پاس
اک ادھوری سی داستاں کے پاس
جس جگہ گمشدہ خطوں میں چھپے
یاد کے بے شمار جگنو ہیں
درد کے بے حساب پہلو ہیں
اک دسمبر کی شام کے ہمراہ
کچھ خزاں کے بھی دن پڑے ہیں کہیں
خواب کی دھجیوں سے لپٹے ہوئے
چاندراتوں کے سلسلے ہیں کہیں
سینکڑوں دل زدہ خراشوں میں
کوئی صورت کہاں ابھرتی ہے
سانس کا کیا ہے؟ چلتی رہتی ہے

ہلکے ہلکے گھنگھور بادلوں نے پورے آسمان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ دور آسمان پر مختلف رنگ برنگی پتنگیں بڑی خوب صورتی کے ساتھ لہرا رہی تھیں، اور وہ چپ چاپ بیٹھا پُرشوق نگاہوں سے ان اڑتی پتنگوں کو دیکھتے ہوئے مسلسل انجشاء کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جو اپنی قابلیت، تعلیم

اور ضد کے لحاظ سے اس سے کہیں بھاری ثابت ہو رہی تھی۔

اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ جس معمولی سی لڑکی کو وہ حویلی میں ایک نظر دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ وہی لڑکی یوں زندگی میں اتنے بڑے چیلنج کے ساتھ اس کے سامنے آ کر اس سے اس کا صبر و قرار تک چھین لے گی۔

وہ تو کلی کلی منڈلانے والا بھنورا تھا۔ اس پھول کا رس چوس کر اس پھول کی طرف لیکن اب کتنا عجیب ہو رہا تھا اس کے ساتھ کہ وہ محض ایک ہی محور کے گرد دیوانہ وار چکر لگانے لگا تھا۔

کچھ خاص تو تھا اس میں جو دوسری عام لڑکیوں میں نہیں تھا مگر یہ خاص کیا تھا۔ اسے سوچ سوچ کر بھی سمجھائی نہیں دے رہا تھا۔

انجشاء اپنے پرانے فلیٹ کو چھوڑ کر ارتیج احمر کے بنگلے کے قریب ایک چھوٹے سے فلیٹ میں شفٹ ہوگئی تھی اور اپنے اکیلے پن کے لیے اس نے ایک ادھیڑ عمر ملازمہ رکھ لی تھی جو چوبیس گھنٹے اس کے ساتھ ہی رہتی تھی۔

پچھلے ہفتے اس نے اپنے کہے کے عین مطابق عدالت میں خلع کا کیس دائر کروا دیا تھا۔ جس میں انجشاء کی طرف سے یہ جواز پیش کیا گیا تھا کہ عدنان احمد رؤف نے خود آج سے چھ سات ماہ قبل اس سے علیحدگی کا فیصلہ کیا تھا اور طویل عرصے تک اسے ذہنی اذیت میں مبتلا کر کے بے یار و مددگار چھوڑ دیا تھا۔ لہٰذا اس نے عدالت سے اپیل کی تھی کہ اسے ہر حال میں عدنان احمد رؤف سے چھٹکارہ دلوایا جائے تا کہ وہ اپنی پسند سے اپنی نئی زندگی کی شروعات کر سکے۔

اس کے دلائل چونکہ حقائق پر مبنی تھے لہٰذا اس کا کیس کافی مضبوط تھا اور وہ پر امید تھی کہ اسے بہت جلد عدالت سے انصاف مل جائے گا مگر اس کیس کے لیے عدنان نے بھی اپنا پیسہ پانی کی طرح بہا چھوڑا تھا۔

وہ اس بات کو ماننے سے انکاری تھا کہ اس نے انجشاء کے وجود سے کسی قسم کی کوئی غفلت برتی ہے۔ اسکے بقول انجشاء خود ہی اپنے دادا جی کو لے کر گاؤں سے اچانک غائب ہوگئی اور جب اتفاقاً عدنان نے اسے ڈھونڈ نکالا۔ تو اس نے اسے اپنا مجازی خدا ماننے سے صاف انکار کر دیا لہٰذا اس نے عدالت سے ریکویسٹ کی کہ اسے اس کا حق دلوایا جائے اور انجشاء کو غلط قدم اٹھانے سے باز رکھا جائے۔ اپنی اپنی طرف سے دونوں کے دلائل مضبوط تھے مگر مشکل یہ تھی کہ انجشاء کسی بھی صورت اس سے تعلق قائم رکھنا نہیں چاہتی تھی اور وہ ہر قیمت پر اسے اپنی زندگی کا حصہ بنانا چاہتا تھا۔

اس کشمکش کی وجہ سے عدالت کو کوئی بھی فیصلہ کرنے میں سخت دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ عدنان کسی بھی صورت اس کیس کو اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا جب کہ دوسری طرف انجشاء بھی ہرگز پیچھے قدم ہٹانے والوں میں سے نہیں تھی۔ نتیجتاً دونوں ہی اپنی اپنی جگہ پر اڑے ہوئے تھے۔

انجشاء کے پاس ایڈوانس میں جتنے پیسے بھی جمع تھے۔ وہ سب وکیلوں کی بھاری فیس کی نذر ہو چکے تھے مگر تاحال اسے کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ آج کل بے حد پریشان تھی جب کہ دوسری طرف احمد رؤف صاحب انجشاء کے اس اقدام پر شدید ہرٹ ہو کر بستر سے جا لگے تھے۔

اپنی اکلوتی بھتیجی اور اپنے نام کا عدالتوں میں رلنا انہیں کسی صورت گوارہ نہیں تھا جبکہ انجشاء کے مطالبے کو ماننا بھی ان کے لیے کسی موت سے کم ہرگز نہیں تھا۔ نتیجتاً وہ شدید بیمار پڑ گئے تھے اور یوں عدنان کا پیسہ جو پہلے انجشاء کی طرف سے دائر کیس پر لگ رہا تھا۔ اب احمد رؤف صاحب کے قیمتی علاج پر لگنے لگا۔

اس روز وہ فیصلہ سننے کے لیے آیا تو عدالت کے کوریڈور میں ہی اسے انجشاء دکھائی دے گئی۔

کاٹن کے سادہ سے بلیک سوٹ میں ملبوس اپنے جسم کو چادر میں چھپائے۔ وہ اسے کافی پریشان لگ رہی تھی مگر وہ چاہ کر بھی اس سے اس کا حال دریافت نہیں کر پایا۔ سوجھے اور بے قرار دل کے ساتھ اس کے سراپے سے نگاہیں چرا کر سیدھا عدالتی کمرے میں چلا آیا۔ جہاں آج اس کے کیس کی شنوائی ہونا تھی۔ اس کے وکیل مسٹر شاہ زیب لغاری کافی پُر امید تھے کہ عدالت ان کے حق میں ہی فیصلہ کرے گی مگر اس کے دل کو قرار نہیں تھا۔ ایک عجیب سا خوف ایک انہونا سا وہم مسلسل ڈسٹرب کیے ہوئے تھا اسے۔

انجشاء نے آج بھی عدالت میں اپنے وہی بیانات دہرائے تھے جو وہ پچھلے چار ماہ سے دہراتی آ رہی تھی مگر اس کے باوجود عدالت کوئی بھی حتمی فیصلہ کرنے میں ناکام رہی کیونکہ دوسری طرف عدنان کے وکیل کے دلائل بھی بہت مضبوط تھے۔

عدنان اپنے وکیل کے ساتھ کمرہ عدالت سے باہر آیا تو انجشاء بھی اس کے پیچھے ہی باہر چلی آئی کیونکہ اسے اریج احمر کی معرفت احمد رؤف کی خرابی صحت کا علم ہوا تھا اور وہ لاکھ رنجشوں کے باوجود عدنان سے ان کی خیریت معلوم کرنا چاہتی تھی مگر وہ مکمل طور پر اپنے وکیل کے ساتھ محو گفتگو تھا جو اس سے کہہ رہے تھے۔

''مسٹر عدنان! یہ کیس آپ کے حق میں جا سکتا ہے۔ اگر آپ عدالت میں یہ بیان دے دیں کہ آپ کی منکوحہ ایک آوارہ ٹائپ لڑکی ہے اور وہ اپنی عیاشیوں کے لیے آپ سے زبردستی آزادی حاصل کر کے اپنے غلط ارادوں کو مکمل کرنا چاہتی ہیں......''

''نہیں مسٹر شاہ زیب! مجھے یہ کیس ہارنا منظور ہے مگر میں اس کے پاکیزہ دامن پر کوئی داغ نہیں لگا سکتا۔ آپ نہیں جانتے وہ بہت مضبوط اور بااصول لڑکی ہے اور جتنی بااصول ہے اتنی ہی بلند کردار بھی۔ میں اس کی پاکیزگی کو فرشتوں کی پاکیزگی سے مشروط کرتا ہوں۔ لہٰذا میں ایسی گھٹیا بہتان بازی کے متعلق سوچنا بھی نہیں چاہتا......''

کتنا ایموشنل ہوا تھا وہ اس کے کردار کو لے کر۔ کتنا جداگانہ سا انداز تھا یہ اس کا۔ وہ ایک شخص کہ جس کی نظر میں عورت کی حیثیت محض ایک کھلونے سے بڑھ کر نہیں تھی۔ وہ اس کے کردار پر قسم کھا رہا تھا۔ انجشاء جانتی تھی کہ یہ کیس جیتنا اس نے اپنی زندگی اور موت کا مسئلہ بنا لیا تھا مگر اسی کیس کی اہمیت کو اس نے صرف ایک پل میں محض اس کی عزت کی خاطر پس پشت ڈال دیا کیوں......؟

وہ چاہتا تو اسے نیچا دکھانے کے لیے ایسا کر سکتا تھا۔ اس کیس کو اپنے حق میں مضبوط بنانے کے لیے ایسا کرنے سے اسے کوئی نہیں روک سکتا تھا مگر اس کے باوجود ایسا نہیں کرنا چاہتا تھا آخر کیوں......؟

عدنان کے وکیل مسٹر شاہ زیب لغاری اس کے واضح انکار کے بعد دھیمے سے سر ہلا کر اس سے مصافحہ کرتے ہوئے اپنے چیمبر کی طرف

بڑھ گئے تھے جب وہ چونک کر لپکتے ہوئے اس کی طرف بڑھی۔

''عدنان! رکو پلیز......''

انجشاء نے دیکھا کہ اس کی پکار پر واپس پلٹتے عدنان رؤف کی آنکھوں میں حد درجہ حیرانگی تھی مگر اس نے اپنی نگاہیں اوپر نہیں اٹھائیں۔

''وہ......وہ میں تایا جی سے ملنا چاہ رہی تھی۔ اب کیسی طبیعت ہے ان کی......؟''

اس کے مقابل آ کر بہت دھیمے لہجے میں اس نے کہا تھا۔ جواب میں عدنان رؤف نے اچٹتی سی ایک نظر اس کے رف حلیے پر ڈالتے ہوئے قدم پھر سے آگے بڑھا دیئے۔

''عدنان پلیز! میری بات سنو......''

اس کے اس طرح سے چپ چاپ آگے بڑھ جانے پر وہ پھر اس کی طرف لپکی تھی۔ جب وہ عدالت کے احاطے سے باہر آ کر اپنی گاڑی کا فرنٹ ڈور اس کے لیے کھولتے ہوئے سپاٹ لہجے میں بولا۔

''فی الحال وہ کچھ بہتر ہیں انجشاء! لیکن ہو سکتا ہے کہ تمہیں اپنے سامنے دیکھنے کے بعد ان کی طبیعت پھر سے خراب ہو جائے......''

''لیکن میں انہیں تکلیف دینا نہیں چاہتی عدنان۔''

فرنٹ سیٹ پر اس کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے اس نے گھٹے گھٹے سے لہجے میں اپنی صفائی پیش کرنا چاہی تھی۔ جبکہ وہ پھیکی سی مسکراہٹ لبوں پر بکھیرتے ہوئے بولا۔

''اور کتنی عجیب بات ہے کہ تم اس کے باوجود انہیں تکلیف دے رہی ہو انجشاء......''

قدرے بجھا ہوا لہجہ تھا اس کا جب وہ بے بسی سے ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی۔

''اس کے ذمہ دار تم ہو عدنان! اگر تم آسانی سے مجھے ڈائیورس دے دو تو میں کبھی ان کی عزت کو اس طرح سے عدالتوں میں پامال نہ کروں۔''

''واہ! کیا خوب صورت جواز ہے تمہارا لیکن میرے پاپا تمہاری اس حماقت کی وجہ سے تکلیف میں ہیں انجشاء کیا تمہیں اس بات کا احساس ہے......؟''

قدرے چبھتا ہوا لہجہ تھا اس کا جب انجشاء نے اپنی نگاہ اس کی طرف سے ہٹائی۔

''میں بہت مجبور ہوں عدنان! میرا دل اب تمہاری رفاقت کو قبول نہیں کرتا......''

''او کے۔ اگر تم مجبور ہوناں تو پھر میں بھی مجبور ہوں انجشاء کیونکہ میں اب تم سے الگ ہو کر نہیں جی سکتا......''

نظر سامنے روڈ پر مرکوز رکھتے ہوئے عجیب سپاٹ لہجے میں اس نے کہا تھا جب وہ قدرے زچ ہو کر بولی۔

''تم بے کار کی ضد کر رہے ہو عدنان......''

''تم بھی تو بے کار کی ضد میں الجھی ہوا نجشاء ورگرنہ خود ہی کہو کس چیز کی کمی ہے مجھ میں...... بولو...... صرف ایک تمہیں پانے کے لیے میں کیا سے کیا ہو گیا ہوں انجشاء...... کیا تمہیں میرا حال دکھائی نہیں دیتا...... پھر کیوں الجھی ہو میرے ماضی میں بتاؤ مجھے......؟ میں چاہوں تو کیا نہیں کرسکتا تمہارے ساتھ۔ کتنا روک لو گی تم مجھے' کیا کرلو گی میرا تم......؟ کچھ بھی نہیں زیادہ سے زیادہ یہی کرو گی کہ چند آنسو بہا کر مجھے بددعائیں دے لو گی مگر میں پھر بھی تمہارے ساتھ ایسا نہیں کروں گا انجشاء جانتی ہو کیوں......؟ کیونکہ مجھے اپنی محبت سے زیادہ تمہارا وقار عزیز ہے۔ تم جس چیز پر فخر کرتی ہو میں وہی چیز تم سے چھین کر حاصل نہیں کرنا چاہتا۔''

عجیب کھوئے کھوئے سے لہجے میں وہ کہہ رہا تھا اور انجشاء یک ٹک بے ساختگی کے عالم میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''تم مجھ سے نفرت کرتی ہوناں کیونکہ میں تمہاری نظر میں فلرٹ اور دھوکے باز ہوں مگر بتاؤ انجشاء سوائے چپ چاپ تمہیں دیکھے اور جانے بغیر تم سے دستبردار ہونے کے علاوہ...... میں نے آج تک کیا غلط کیا ہے تمہارے ساتھ...... ہاں میں تمہیں کڈنیپ کرنا چاہتا تھا مگر کسی عیاشی کے لیے نہیں بلکہ صرف اور صرف تمہیں اپنی جنونی محبت کا احساس کروانے کے لیے۔ پلیز انجشاء میں بہت تکلیف میں ہوں۔ راتوں کی نیند دن کا قرار سب لٹ گیا ہے میرا پلیز' پلیز اب تو اس تکلیف سے رہائی دے دو مجھے پلیز......'' نم لہجے کے ساتھ ساتھ اس کی غلافی آنکھوں کے گوشے بھی تر ہو چکے تھے مگر انجشاء کا دل اب بھی نہیں پگھلا' پگھلتا بھی کیسے......؟ جتنے سال وہ روئی تھی۔ جتنے سال اس نے تڑپ کر گزارے تھے۔ زندگی میں جو کچھ اس نے کھویا تھا۔ عدنان تو ابھی اس کے نصف میں بھی نہیں پہنچا تھا پھر وہ کیسے معاف کر دیتی اسے......؟ تب ہی لہجہ مضبوط بناتے ہوئے بولی۔

''مجھے تمہاری اس روداد سے کوئی دلچسپی نہیں ہے عدنان...... یوں سمجھ لو کہ جو انجشاء تمہارے نام سے وابستہ تھی وہ اب مر چکی ہے اور اس کی جگہ یہ لڑکی جسے تم اپنے برابر میں بیٹھا ہوا دیکھ رہے ہو یہ میرے لیے اور تم اس کے لیے قطعی اجنبی ہو۔ لہٰذا بے کار میں اپنے الفاظ اور جذبات ضائع مت کرو عدنان کیونکہ اس لڑکی کو تم اپنا آپ بیچ کر بھی نہیں پا سکتے......''

''او کے۔ نصیحت کے لئے شکریہ لیکن یہ کنگن اور یہ انگوٹھی واپس لے لو انجشاء جو تم نے وکیل کی بھاری فیس بھرنے کے لیے مجبوراً بیچ دیئے تھے۔ میں نے اپنے حصے میں سے۔ تمہارے اکاونٹ میں ایک خطیر رقم ڈپازٹ کروا دی ہے۔ اب دادی ماں کی نشانیوں کو کبھی مت بیچنا پلیز......''

آج وہ اسے شاک پر شاک لگا رہا تھا۔

کیونکہ یہ بھاری کنگن اور انگوٹھی جو اس نے انتہائی مجبور ہو کر اپنے کیس کو جاری رکھنے کے لیے روتی آنکھوں سے فروخت کیے تھے۔ اب انہیں عدنان کے قبضے میں دیکھ کر وہ بھونچکا سی رہ گئی تھی۔

''لے لو انجشاء پلیز......''

اسے شاکڈ دیکھ کر عدنان نے انتہائی اپنائیت سے کہا تھا۔ جب وہ بمشکل اپنے لبوں کو جنبش دیتے ہوئے بولی۔

''یہ...... یہ...... تت...... تمہارے پاس کیسے آئے؟''

''بس آ گئے تم جان کر کیا کرو گی۔ تمہارے لیے صرف اتنا جاننا کافی ہے انجشاء کہ میرے لیے تمہارا یہ قدم بہت تکلیف کا باعث بنا ہے۔

میں تمہیں اتنا بے بس نہیں دیکھ سکتا انجشاء پھر کیوں نہیں یہ جنگ ختم کر دیتی ہو تم......''

''نہیں کر سکتی میں یہ جنگ ختم......سنا تم نے......مت احسان کرو مجھ پر۔ نہیں چاہیے مجھے یہ احسان۔ تم سے چھٹکارا پانے کے لیے مجھے اپنی سانسیں بھی بیچنا پڑیں ناں۔ تب بھی پیچھے نہیں ہٹوں گی میں۔ سمجھے تم......''

بھرپور شدت سے چلاتے ہوئے وہ رو پڑی تھی۔ جب ہونٹ کاٹتے ہوئے عدنان احمد نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا پھر ٹوٹے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا۔

''او کے......اگر یہی تمہاری ضد ہے تو پھر سانسیں تم نہیں بیچو گی انجشاء میں اپنی زندگی ہاروں گا۔'' کہنے کے ساتھ ہی اس نے ایک جھٹکے سے گاڑی روکی پھر گم صم ہراساں بیٹھی انجشاء کو بازو سے پکڑ کر گاڑی سے باہر نکالتے ہوئے اس نے ایک آخری نظر اس کے شاکڈ چہرے اور بکھرے بالوں پر ڈالی اور تیزی سے گھوم کر اپنی سیٹ سنبھالتے ہوئے وہ ہوا سے بھی تیز رفتار میں وہاں سے نکلا اور کچھ ہی فاصلے پر اس کی آنکھوں کے عین سامنے ایک انتہائی تیز ٹرک سے ٹکرا کر کئی فٹ اوپر اچھل گیا۔

☆☆☆

محبت کا انوکھا قافلہ ہے

کہ اس کا ہر مسافر ہی لٹا ہے

تعلق توڑنا کتنا برا ہے

جدائی رعب کا کرب مسلسل

چلو تم نے ہمیں کچھ تو دیا ہے

''میں کچھ نہیں جانتی اشعر خدا کے لیے میرا یقین کرو پلیز......''

ڈائری سے اریج احمر کا حالِ دل جاننے کے بعد وہ مچل کر اشعر کی طرف بڑھی تھی مگر اس نے غصے سے تمکین کو پرے دھکیل دیا۔

''میں بھی آج تک اسی خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ تم معصوم ہو۔ کچھ نہیں چھپا رہی ہو مجھ سے مگر ڈفر تھا میں' بے وقوف تھا جو آنکھوں دیکھ کر بھی تمہاری محبت کی تسبیح پڑھتا رہا۔ تمہارے چہرے کی معصومیت سے فریب کھاتا رہا مگر اب اور نہیں تمکین......اب اور بے وقوف نہیں بنا سکتیں تم مجھے......''

''اشعر! اشعر! کیا تم مجھے اپنی صفائی میں کچھ کہنے کا ایک موقع بھی نہیں دو گے۔ بولو اشعر کیا یہی ہے ہماری اٹھارہ سالہ محبت کا انجام۔ محبت تو اعتبار کا دوسرا نام ہے ناں۔ پھر تم مجھے بے اعتبار کیوں کر رہے ہو؟''

وہ ایک مرتبہ پھر اس کا بازو پکڑ کر سسکی تھی جب وہ زہر خند مسکراہٹ لبوں پر پھیلاتے ہوئے بولا۔

''بے اعتبار تو تم نے میری محبت کو کیا ہے تمکین۔ یقین تو میرا توڑا ہے تم نے......میں جو سمجھتا تھا کہ تم صرف مجھ سے پیار کرتی ہو۔ صرف

مجھ سے تمکین نہیں تم صرف مجھ سے پیار نہیں کرتی تھیں۔ تم نے فریب دیا ہے مجھے تم نے تمکین تم نے فراڈ کیا ہے میرے ساتھ......''

''نہیں...... یہ جھوٹ ہے اشعر! پلیز میرا یقین کرو۔'' وہ پھر روتے ہوئے گڑگڑائی تھی۔

''یقین ہی تو کرتا آیا ہوں تمہارا مگر کیا ملا تمکین۔ تمہارا فریب' تمہارا دُ تمہاری بے وفائی......''

وہ کہاں آج کچھ سننے والا تھا۔ تب ہی وہ بے بسی سے روتے ہوئے اس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

''اشعر! خدا کے لیے میری بے گناہی کا یقین کرو کیونکہ تمہارے یقین کے سوا میرے دامن میں اور کچھ بھی نہیں ہے۔ میں نے تمہیں چاہا ہے اشعر۔ دل کی گہرائیوں سے پرستش کی ہے تمہاری۔ پلیز مجھ سے یوں نظریں نہ پھیرو۔ پلیز اشعر پلیز......''

''سوری تمکین! مجھے اب تمہاری کسی بات کا یقین نہیں ہے کیونکہ میں خود اپنی آنکھوں سے تمہیں ہزار مرتبہ اریج احمر کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہوئے دیکھ چکا ہوں۔ سو جان لو کہ آج کے بعد ہمارے راستے علیحدہ علیحدہ ہیں۔''

''نہیں...... تم ایسا نہیں کر سکتے۔ اشعر نہیں کر سکتے تم ایسا......''

اس کے پاؤں سے لپٹتے ہوئے وہ آنسوؤں بھری نگاہوں سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے چلائی تھی۔

جب وہ لب بھینچ کر نگاہ چراتے ہوئے بولا۔

''آئی ایم سوری ...... میں ایسا کر چکا ہوں تمکین......''

''ک...... کیا کر چکے ہو تم......''

گرم آنسو پلکوں پر ہی اٹک گئے تھے جب اس نے بے ساختہ چہرہ اوپر اٹھا کر اس سے پوچھا۔ جواب میں وہ اپنے پاؤں اس کی گرفت سے چھڑا کر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

''میں نے شیزا سے شادی کر لی ہے تمکین...... اب تمہیں یہ حق حاصل ہے کہ تم چاہو تو اس کے ساتھ ایڈجسٹ کر سکتی ہو اور چاہو تو میں تمہیں ڈائیورس دینے کو بھی تیار ہوں۔''

زندگی میں کچھ لفظ تلوار سے تیکھے ہوتے ہیں۔ یہ اس نے محض سنا تھا مگر آج اشعر کے ہونٹوں سے نکلے ان لفظوں نے حقیقی معنوں میں اس کی پور پور کو گھائل کر چھوڑا تھا۔ اس میں اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ وہ اپنے ہاتھ کو ہی حرکت دے سکے۔ پل دو پل میں ہی گرم گرم سیسہ جیسے کسی نے اس کی سماعتوں میں انڈیل دیا تھا۔ لمحوں میں ہی جیسے اس کے زمین آسمان ایک ہو گئے تھے۔

اشعر غالباً اب بھی اس سے کچھ کہہ رہا تھا مگر اب وہ سن کہاں رہی تھی۔ اب تو اس کی سماعتیں برف ہو چکی تھیں اور وہ خود پتھر کا ایک بے جان ٹکڑا جو اگلے کچھ ہی لمحوں میں اپنا ضبط کھو کر ہوش و حواس کی دنیا سے بے خبر ہو چکا تھا۔

مسلسل بارہ گھنٹے بے ہوش رہنے کے بعد وہ اپنے ہوش میں واپس آئی تو گھر کے سب ہی لوگ متفکر چہروں کے ساتھ اس کے بیڈ کے قریب کھڑے تھے۔ پل دو پل کے لیے ان سب کو دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آئے تھے جب اس کے داداجی جناب حسن احمد صاحب

تیزی سے اس کی طرف بڑھے اور وہ ان کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

''نمی بیٹے! کیا ہوا ہے جان؟ ایسے کیوں رو رہی ہو تم......''

وہ ابھی تک حقیقت سے بے خبر تھے تب ہی الجھتے ہوئے بولے تو تمکین ان سے لپٹ کر اور شدت سے رو پڑی۔

''میں آپ کو اس کی وجہ بتاتا ہوں دادا جی......''

اشعر جو کافی دیر سے خاموش کھڑا یہ تماشہ دیکھ رہا تھا آخر بول اٹھا۔

''دادا جی! آپ کو شاید یہ سن کر اچھا نہ لگے کہ میں نے شیزا سے شادی کر لی ہے مگر سوری اب آپ کے اچھا لگنے یا نہ لگنے سے یہ حقیقت بدل نہیں سکتی......''

وہ بے دھڑک بول رہا تھا اور کمرے میں موجود سب لوگ حیرت سے پلکیں جھپکائے بغیر اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''اشعر! یہ کیا بکواس کر رہے ہو تم......؟''

رخسانہ بیگم سب سے پہلے چلائی تھیں مگر وہ ذرا ان کے رعب میں نہ آیا۔

''یہ بکواس نہیں ہے مما! میں نے سچ مچ شیزا سے شادی کر لی ہے۔''

''لیکن کیوں...... کیوں اٹھایا تم نے یہ احمقانہ قدم۔'' وہ بھرپور غصے سے لرز رہی تھیں۔ جب وہ پُر شکوہ نگاہوں سے تمکین کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اس کی وجہ آپ تمکین سے ہی پوچھیں تو زیادہ مناسب ہے مما۔''

''تمکین! یہ کیا بکواس کر رہا ہے بیٹا۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا......''

وہ شدید پریشانی کے عالم میں اپنا سر تھامتے ہوئے بولی تھیں جب تمکین نے روتے ہوئے انہیں ساری بات سچ سچ بتا دی۔

''مما! پلیز میرا یقین کیجئے۔ میرے تو فرشتوں کو بھی علم نہیں کہ اریج میرے بارے میں کیا سوچتا ہے۔ میں نے کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی مما پلیز میرا یقین کیجئے......''

''بس تمہیں رونے کی زیادہ ضرورت نہیں ہے تمکین! میں جانتی ہوں کہ یہ سب کس کا کیا دھرا ہے۔''

تمکین کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے انتہائی ترش لہجے میں وہ بولیں۔

''کان کھول کر سن لو اشعر تم آج اور اسی وقت شیزا کو طلاق دو گے اور تمکین سے اپنے کیے کی معافی مانگو گے۔ سمجھے تم......''

''سوری مما! میں اب نہ تو شیزا کو چھوڑ سکتا ہوں اور نہ ہی میں نے کچھ ایسا غلط کیا ہے جس کے لیے مجھے اس بے وفا بدکردار لڑکی سے معافی مانگنی پڑے۔'' وہ انتہائی سفاک لہجے میں بولا تھا۔ جب رخسانہ بیگم نے آگے بڑھ کر ایک زبردست طمانچہ اس کے بائیں گال پر رسید کر دیا۔

''بدتمیز! بے لحاظ...... تمہیں یہ حق کس نے دیا کہ تم اس کے کردار پر انگلی اٹھاؤ۔''

شدید مشتعل ہو کر وہ چلائی تھیں مگر اشعر پر ان کے اشتعال کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ ہوتا بھی کیسے اس کے اعصاب تو بری طرح جل رہے

تھے۔جس تقسیم شدہ محبت کا درد تمکین نے اسے دیا تھا۔ اب وہی درد وہ اسے واپس لوٹا کر اپنے سینے میں لگی آگ کو ٹھنڈا کرنا چاہتا تھا۔

گو تمکین کو رلا کر اسے خود سے دور کر کے وہ خوش نہیں تھا مگر خوش ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔اس کا دل جل رہا تھا مگر وہ جلتے دل کی پروا کیے بغیر بے نیازی اور سنگ دلی کا خول اپنے اوپر چڑھائے ہوئے تھا کیونکہ اس نے جتنی شدت سے تمکین کو چاہا تھا۔اب اتنا ہی دل اس کے تصور سے ادب رہا تھا۔بار بار اس کی دھوکہ دہی کا خیال آتا اور بار بار وہ نئے سرے سے زخم زخم ہو جاتا تمکین نے اس کے پیار اس کے اعتماد اور اس کے مان کا خون کر کے جو چوٹ اسے پہنچائی تھی اب اس کی سزا یہی تھی کہ وہ بھی اس کے قرب اور اس کے پیار کو ترسے۔شیزا فی الحال یہاں نہیں تھی۔تب ہی اس جھگڑے کا اسے کوئی علم نہ ہو سکا۔

اشعر کے پاپا مسٹر سعید احمد اسے فوراً ہی اپنی جائیداد اور اپنی زندگی سے بے دخل کرنا چاہتے تھے مگر احسن احمد صاحب نے معاملے کی تہہ تک پہنچے بغیر فی الحال انہیں ایسا کرنے سے روک دیا تھا۔

پورے ''حسن ولاج'' میں موت کی سی خاموشی تھی۔کوئی کسی سے بات نہیں کر رہا تھا۔اشعر کے اس قطعی غیر متوقع قدم نے ذہنی طور پر سب کو ہی سہما دیا تھا۔کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسی صورت حال میں کیا کرنا چاہیے؟اک قیامت تھی جو اچانک ان کے داوں پر ٹوٹ پڑی۔سب بنا کچھ کھائے پیئے ایک دوسرے سے منہ چھپائے پھر رہے تھے جبکہ تمکین نے رو رو کر اپنا بُرا حال کر لیا۔اگلے دو دن بھی اس کشمکش میں گزر رہے تھے۔

اشعر نے ہمیشہ کے لیے ''حسن ولاج'' چھوڑ کر ''شیزا پیلس'' جانے کا ارادہ کر لیا تھا۔اس کے بقول وہ اتنا ڈیپریس تھا کہ اسے تمکین کی شکل دیکھنا بھی گوارہ نہیں تھی۔

مگر تمکین اس پر اپنے کردار کی سچائی ثابت کرنا چاہتی تھی۔سو اگلے ہی روز خود کو سنبھال کر وہ اریج احمر سے ملنے کے لیے ''حسن ولاج'' سے نکل پڑی اور ادھر پنڈی میں بیٹھے ہونے کے باوجود شیزا کو اپنے چیلوں سے ساری صورت حال کا علم ہو گیا۔وہ ''حسن ولاج'' میں اٹھنے والے اس طوفان سے اس قدر خوش تھی کہ اس کی خوشی کا اندازہ کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

عین اس وقت کہ جب تمکین بنا کسی کو بتائے۔اریج احمر سے ملنے کے لیے ''حسن ولاج'' سے نکلی۔شیزا نے راولپنڈی سے اشعر کو فون کھڑکا دیا۔

''ہیلو!اشعر کیسے ہو......؟''

پہلی ہی بیل پر اشعر نے کال ریسیو کر لی تھی۔تب ہی وہ چہکتے لہجے میں بولی۔جواب میں اشعر نے سرد آہ باہر نکالی۔

''ٹھیک ہوں۔تم سناؤ۔''

''میں بہت پریشان ہوں اشعر!نجانے تمہاری شادی کو لے کر ''حسن ولاج'' کے مکین کیا طوفان کھڑا کریں۔''

''ایسا کچھ نہیں ہوگا شیزا۔میں نے انہیں سب کچھ بتا دیا ہے۔''

''وہاٹ......پھر تو سب لوگ بہت ڈیپریس ہوں گے......''

''ہاں...... بٹ آئی ڈونٹ کیئر۔'' اشعر نے دھیمے لہجے سے سر جھٹکا تھا جب وہ دوبارہ متجسس لہجے میں بولی۔

''تمکین کیسی ہے......؟ آئی مین تمہارے اس اقدام پر وہ تو بہت ہرٹ ہوئی ہوگی......''

''مجھے اب اس کی کوئی پروا نہیں ہے......''

اشعر کے لہجے میں جو تنفر تھا اس نے شیزا کو دلی سکون فراہم کیا تھا۔

''لیکن اشعر! تمہیں اتنی جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے تھا۔ ہوسکتا ہے کہ سچائی جاننے کے بعد ''حسن ولاج'' کے مکین میرے ساتھ ساتھ تمہیں بھی اپنی محبتوں سے بھی محروم کردیں اور پھر تم کیا سمجھتے ہو کہ تمکین جیسی زیرک اور ذہین و فطین لڑکی چپ چاپ یہ الزام مان کر خاموش بیٹھی رہے گی۔ نہیں اشعر وہ ہر ممکن طریقے سے ''حسن ولاج'' والوں کی نگاہ میں خود کو بے قصور ثابت کرنے کی کوشش کرے گی تاکہ اس کا جو مقام حسن ولاج اور تمہارے والدین کی نظروں میں ہے۔ وہ بنا رہے اور تم جھوٹے ثابت ہو کر مجبوراً اس کے ساتھ وہی طرز زندگی اپنانے پر مجبور ہو جاؤ کہ جو وہ خود چاہتی ہے دیکھ لینا اشعر اب وہ خاموش نہیں بیٹھے گی وہ ضرور اریج احمر کے ساتھ مل کر کچھ نہ کچھ نیا کرنے کی کوشش کرے گی......''

شیزا سچائی کھلنے کے بعد جو بات اس کے ذہن میں ڈالنا چاہتی تھی۔ وہ اس نے بڑے آرام سے ڈال دی تھی۔ تب ہی اشعر سے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اس نے رابطہ منقطع کردیا۔

ادھر تمکین جب شدید اشتعال کے عالم میں اریج کے شاندار بنگلے کے سامنے پہنچی تو وہ تھری پیس سوٹ میں مکمل تیار ہوئے کہیں جانے کے لیے نکل رہا تھا مگر پھر نظر جوں ہی اس پر پڑی۔ وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔ دل اسے یوں اچانک اپنے گھر میں دیکھ کر بلیوں اچھل پڑا مگر تمکین کے چہرے پر بکھری حد درجہ سنجیدگی اور اشتعال نے اگلے ہی پل اسے خوش فہمیوں کی رنگینی سے نکل کر ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔

''تمکین! خیریت...... آپ آج یوں میرے گھر......؟''

لبوں پر بڑی مسحور کن دھیمی مسکراہٹ پھیلائے وہ اس سے مخاطب ہوا تھا۔ جب وہ شعلہ بار نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پھنکار کر بولی۔

''کیوں......؟ حیرانی ہورہی ہے مجھے اس طرح دیکھ کر...... لیکن آپ کو تو خوش ہونا چاہیے مسٹر اریج کیونکہ آپ اپنے مکروہ ارادوں میں کامیاب ہوگئے ہیں منایئے خوشیاں کہ خدا نے آپ کی سن لی ہے۔ ہوگئے ہیں میرے اور اشعر کے راستے جدا۔ اب تو خوش ہیں ناں آپ......''

''شٹ اپ...... جسٹ شٹ اپ تمکین...... قطعی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں......''

تمکین کی الزام تراشیوں پر اس کے دماغ کی رگیں تن گئی تھیں۔ تب ہی وہ اس کی بات کاٹ کر گرجتے ہوئے بولا تو تمکین کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

''آپ کو برا کیوں لگا مسٹر اریج! آپ یہی تو چاہتے تھے ناں کہ میں اشعر سے الگ ہو جاؤں۔ اسی لیے تو آپ نے اپنا حالِ دل کاغذ کے بے جان ٹکڑوں کے سپرد کرکے انہیں اشعر کو بھجوا دیا تاکہ وہ خود ہی مجھ سے دستبردار ہو جائے۔ میں آپ کو نہیں سمجھ سکی مسٹر اریج۔ دھوکہ کھا گئی میں آپ

کی شرافت سے۔ آپ کے دل میں چھپا چور تو مجھ پر عیاں ہی نہیں ہوا ورگرنہ میں کہاں ہمدردیاں بٹورتی آپ سے......''

''پلیز! سٹاپ اٹ تمکین...... کیا تم اپنے الزام کی وضاحت کرنا پسند کروگی؟ کیا تم مجھے بتاؤ گی کہ میں نے کیا کیا ہے......؟''

بلیک تھری پیس میں بلیک ہی سن گلاسز سر پر جمائے۔ وہ اس وقت جتنا خوب صورت دکھائی دے رہا تھا۔ اتنا ہی اس کا لہجہ الجھا ہوا تھا۔

''وضاحت...... کس بات کی وضاحت مسٹر اریج کیا اس بات کی وضاحت کہ آپ نے جان بوجھ کر میری اور اشعر کی زندگی میں زہر گھولا یا پھر اس بات کی کہ آپ نے میری سادگی سے فائدہ اٹھا کر میرے ہی شوہر کو میرے پیار سے بدظن کر دیا۔ بتائیں مجھے کس کس بات کی وضاحت کروں میں......؟'' وہ بھرپور غصے کے عالم میں چلائی تھی۔ جب اریج احمر نے بے بسی سے اس کی برستی آنکھوں میں دیکھتے۔ ہوئے نگاہ پھیرلی۔

''آپ یقیناً مس انڈرسٹینڈنگ کا شکار ہیں مسز اشعر......''

بہت آہستگی سے رخ پھیرے اس نے کہا تھا۔

''اچھا...... میں غلط فہمی کا شکار ہوں تو پھر کھایئے میرے سر کی قسم اور کہہ دیجیے کہ آپ مجھ سے پیار نہیں کرتے...... کہہ دیجیے کہ آپ نے کبھی مجھے اپنی زندگی میں شامل کرنے کی خواہش نہیں کی۔ کھایئے قسم میرے پیار کی اور کہہ دیجیے کہ آپ نے خود اپنی پرسنل ڈائری اشعر کے حوالے کر کے میری زندگی میں زہر نہیں گھولا......''

ایک مرتبہ پھر وہ چلا کر بولی تھی مگر اس بار زمین اریج احمر کے قدموں تلے سے کھسکی تھی۔ اس بار وہ شاکڈ رہ گیا تھا۔ اپنی ناکام محبت کا 'وہ معصوم سا راز جو اس نے کبھی خود پر بھی پوری طرح عیاں نہیں ہونے دیا تھا۔ تمکین آج اسی راز کو افشا کر رہی تھی۔ وہ حیران نہ ہوتا تو اور کیا کرتا؟ بات ہی ایسی تھی کہ اس کے زمین و آسمان ایک ہو کر رہ گئے تھے۔ بہت سا وقت اسے خود کو سنبھالنے میں لگا۔ تب بمشکل خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے وہ دھیمے لہجے میں بولا۔

''تمکین! میں نہیں جانتا کہ میری رازداں وہ پرسنل ڈائری جو میں کئی سالوں سے لکھ رہا ہوں۔ وہ تمہارے اور اشعر کے ہاتھ کیسے لگی......؟ لیکن میرا یقین کرو تمکین۔ اپنی یکطرفہ محبت کا راز تو میں نے کبھی خود پر بھی عیاں نہیں ہونے دیا پھر اشعر کو کیسے بتا دیتا یہ سب......؟ ہاں یہ سچ ہے کہ میں نے تمہیں چاہا ہے۔ دل کی گہرائیوں سے ٹوٹ کر پیار کیا ہے تمہیں 'خدا سے گڑگڑا کر تمہارے ساتھ کی دعائیں بھی مانگی ہیں میں نے' مگر یہ بھی سچ ہے تمکین کہ میں نے ہمیشہ تمہاری خوشی چاہی ہے۔ ہمیشہ تمہارے لبوں کی مسکراہٹ کو عزیز تر رکھا ہے میں نے۔ میں جانتا ہوں کہ تم اشعر سے پیار کرتی ہو۔ اس کے ساتھ میں ہی تمہاری خوشی ہے پھر میں اتنا خود غرض کیسے ہو سکتا ہوں کہ اپنی خوشی کے لیے تم سے تمہاری خوشیاں چھین لوں......؟ پلیز بلیو می تمکین میرے پاس تمہیں اشعر سے جدا کرنے کا تصور بھی نہیں ہے۔ میں تو خود حیران ہوں کہ اشعر نے مجھ سے اپنا شیئر الگ کیوں کیا؟ پلیز! میرا یقین کرو تمکین پلیز......'' اس کے لہجے میں ایسا کچھ تھا کہ وہ الجھ کر رہ گئی تھی۔ یقین کرنے اور نہ کرنے کے پل صراط پر کھڑی وہ شکست خوردہ سی لڑکی' ٹکر ٹکر اسے بولتے ہوئے سن رہی تھی اور وہ عجیب لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''تمہیں میری بات کا یقین نہیں آتا ہے نا تمکین...... تو چلو۔ آج تمہارے یقین اور خوشی کیلئے اشعر سے بھی روبرو بات ہو ہی جائے......''

اسے ضبط کی حدوں پر سسکتے دیکھ کر وہ آگے بڑھا اور نہایت نرمی سے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا۔

''اشعر نے شیزا سے شادی کر لی ہے اریج! وہ چاہتا ہے کہ میں اس کی زندگی سے نکل جاؤں......''

''وہاٹ......؟''

اب کے اس کے دل کی دیواروں میں شدت سے بھونچال آیا تھا۔ جو بات پہلے شک بن کر اس کے دماغ میں رینگ رہی تھی آج اسی بات نے بالآخر حقیقت کا لباس پہن لیا تھا۔ تب ہی وہ دھواں دھواں سی نگاہوں سے اس کی سرخ آنکھوں کو دیکھتے ہوئے کچھ دیر چپ چاپ کھڑا رہا۔ اس وقت اس سسکتی کومل کے آنسو اس کے دل پر گر رہے تھے۔

کیا حسین خواب دکھایا تھا محبت نے ہمیں
کھل گئی آنکھ تو تعبیر پہ رونا آیا

سرخ نم آنکھوں میں ایسی تڑپ ایسا عجیب سا حزن بکھرا ہوا تھا کہ وہ پل کے پل میں ہی جیسے کسی نتیجے پر پہنچ کر اس کی طرف بڑھا پھر اس کا ہاتھ تھام کر تیزی سے اپنی گاڑی کی طرف آیا اور ''حسن ولاج'' کے لیے روانہ ہو گیا۔

زندگی کے مختلف اور منفرد رنگوں سے سجا سنورا..... نازیہ کنول نازی کا طویل مگر بہت خوبصورت ناول

جو ریگِ دشتِ فراق ہے

(دوسرا حصہ)

مصنفہ : نازیہ کنول نازی

انتساب!

''بے حد عزیز مدیرہ، پیاری فرحت آراء،
شمع زیدی، نزہت اصغر
اور
ریحانہ علی احمد''
کے نام
جن کی اپنائیت اور بے لوث محبتوں نے
میری کامیابیوں میں
ہمیشہ بڑا کردار ادا کیا۔

جو ریگِ دشتِ فراق ہے

بہت پیاری نازیہ کنول نازی کے لیے:

تم نہ مانو مگر حقیقت ہے
عشق انسان کی ضرورت ہے

نازیہ کنول نازی نے اس موضوع پر جب بھی لکھا دل کی گہرائیوں سے لکھا اور جم کر لکھا۔ نازیہ کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس موضوع پر لکھتے ہوئے وہ خود کو اس ماحول کا حصہ بنا لیتی ہیں پھر کرداروں کے ذریعے وہ ڈائیلاگ کہلواتی ہیں جو پڑھنے والے کو براہِ راست متاثر کرتے ہیں، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ انھوں نے کبھی اپنے افسانوں یا ناولٹ کی ہیروئن کو کردار کی سطح سے نیچے نہیں گرنے دیا، اور اگر کبھی کسی منفی رویے کی بنا پر ایسا ہو بھی گیا تو اگلے ہی سین میں اُسے سیدھے راستے پر لے آئیں اور مثبت انداز میں کہانی کا اختتام کیا۔ میری نازیہ سے صرف ٹیلی فون پر گفتگو ہوئی ہے میں ان سے کبھی ملی نہیں، مگر ٹیلی فون پر وہ جیسی ہنستی کھلکھلاتی اور دعائیں دیتی ہیں اس لہجے کی کھنک اور نرماہٹ گھنٹوں کانوں میں رس گھولتی ہے۔ اللہ کرے وہ یوں ہی ہنستی مسکراتی رہیں اور قارئین کو شوخ چنچل تحریریں پڑھنے کو ملتی رہیں۔ جیسا کہ اس ماہ ان کی کتابیں مارکیٹ میں آ رہی ہیں۔ ویری ویل ڈن نازیہ اینڈ کیپ اٹ اَپ۔

شمع زیدی

(مدیرہ ماہنامہ نازنین)

''رنگِ دشت میں کھلتا کنول''

رنگِ دشت میں پھول کھلانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہاں پانی نہیں اشکوں کی روانی، جذبوں میں جولانی، لہو میں جوشِ جوانی درکار ہوتا ہے۔ دل میں ذوق نہ ہو تو لفظ سرد پڑ جاتے ہیں مرجاتے ہیں۔ لفظ وہ نہیں جو زبان سے نکلے لفظ تو وہ ہے جو دل سے نکلے اور سیدھا دل پر جا اُترے۔ دل میں اُترنے والے لفظ اپنے دل کا لہو کیے بغیر سفر نہیں کر سکتے۔ نازیہ کنول نازؔی ایسی ہی دردآشنا لکھاری ہے وہ قلم سے نہیں دل سے لکھتی ہے جبھی تو اس کی تحریر دل پر اثر کرتی ہے، اور وہ اپنے قارئین کے دلوں میں گھر کرتی جاتی ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ کسی دوسرے کی تعریف کرنا اپنے بھاؤ گرانے کے مترادف ہے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ جو دوسروں کی محنت اور صلاحیت کو ان کی کسی خوبی اور کام کی ادائیگی، خوش اسلوبی کو سراہنے کا ظرف رکھتے ہوں وہ اپنی ہی نظروں میں معتبر ہو جاتے ہیں فنونِ اُدب وہ میدان ہے جہاں حسد کے بُول بھی اُگتے ہیں اور رشک وستائش کے پھول بھی کھلتے ہیں۔ کسی کی مدح بیان کرنا گو کہ مشکل کام ہے لیکن کچھ لوگوں کا کام خود بخود اپنی مدح پر اُکساتا ہے۔ نازیہ کنول نازی ایک ایسی ہی قلمکارہ ہیں جو خود بخود اپنی محبت کی تعریف وتوصیف وصول کر لیتی ہیں۔ ''جو رنگِ دشتِ فراق ہے'' نازیہ کنول نازؔی کا ایسا ہی خوبصورت یادگار شاہکار ہے جو'' آنچل ڈائجسٹ'' کے قارئین کی پسندیدگی کی سند حاصل کر چکا ہے اور مجھے یقین ہے کہ کتاب کے قارئین بھی نازیہ کی اس خوبصورت تخلیق کو سراہے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ اس ناول میں چار سہیلیوں کی زندگیوں کے مختلف ادوار کا احاطہ کیا گیا ہے، اور یہ پیغام دیا گیا ہے کے اگر جذبوں میں صداقت ہو، نیت نیک ہو، دل کی لگن سچی ہو، دعاؤں پہ یقین اور دعائیں قبول کرنے والے پر ایمان پختہ ہو تو ''رنگِ دشتِ فراق'' وصل کے پھولوں سے بھر جاتا ہے۔ قلمکارہ نے بڑی عمدگی سے دشتِ فراق میں وصل ووفا اور مہر ورجاء کے کنول کھلائے ہیں۔

یہ کہانی اریشہ، انجشاء، تمکین اور شیزا، کی کہانی ہے۔ وقت اور حالات نے اُن کے ساتھ کیسی آنکھ مچولی کھیلی، دکھوں اور سکھوں کے کیسے کیسے موسم اُن پر اُترے۔ ہجر وفراق کی کیسی کیسی جاں گسل گھڑیاں دلوں پہ بار بنیں، آنکھوں نے کب کب اشکوں کے دریا چڑھتے اور پھر مسکراہٹوں کے بادباں کھلتے دیکھے۔ رت جگوں اور بے قراریوں نے کس کس کی زندگی میں درد وآزمائش کی صلیب گاڑی۔ سچے جذبوں اور دلوں سے نکلی دعاؤں نے کیسے رنگِ دشتِ فراق میں ہر ذرّے کو آفتاب اور ہر بُول کو پھول کر ڈالا۔ کڑی آزمائشوں کے بعد اپنے اپنے حصے کے دکھ سہنے غم جھیلنے اور جدائی کا زہر پینے کے بعد سب کو کیسے محبت کے ملن رُت کے جام میسر آئے ہیں یہ جاننے کے لیے یقیناً آپ بھی بے تاب ہوں گے۔ نازیہ نے اپنے ہر کردار کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ اریشہ، ازمیر، اریج احمر، انجشاء کا ہر دم دل کو بھاتا انداز انگوٹھی میں نگینے کی طرح جڑا لگتا ہے ہر کردار۔ کبھی عدنان تمام تر ہمدردیاں سمیٹنے لگتا ہے تو کبھی اریج احمر بے بس و بے قرار نظر آنے لگتا ہے، کبھی تمکین ستم گزیدہ اور مظلوم لگتی ہے تو کبھی شیزا ظالم اور خودغرض دکھائی دیتی

ہے۔ ناول میں اور بھی بہت سے کردار بہت عمدہ ہیں اریشہ کے باپ کا کردار بھائی فرحان کا کردار، اشعر کا خود غرضانہ اور شکی انداز اور بہت کچھ قارئین کو اس ناول میں پڑھنے کو ملے گا۔ ناول شروع سے آخری حصے تک دلچسپی کا عنصر لیے ہوئے ہے۔ میری دعا ہے کہ نازیہ کنول نازی کی کتابی شکل میں پیش کی جانے والی یہ دوسری نثری کاوش بھی قارئین کے ذوقِ مطالعہ کا حصہ بنے۔ اُن کے شوق کو جلا بخشے اور نازیہ کی کامیابیوں کا سفر اپنے مداحوں کی، قارئین کی پسندیدگی محبتوں اور دعاؤں کے ساتھ ساتھ جاری و ساری رہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔'' آمین!

سُباس گُل

رحیم یار خان

بہادر لڑکی حساس قلمکار

محبت میں کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ زندگی بھر ساتھ نبھانے والے رشتے اچانک کسی موڑ پر، کسی خاص مقام پر اپنی راہ الگ کر لیتے ہیں تو پھر کچھ خدشات انسان کو اندر ہی اندر سے کچوکے لگانے لگتے ہیں تو پھر کچھ لوگ خدائے بزرگ و برتر کے خاص کرم سے قلمکار بن جاتے ہیں۔

نازیہ کنول نازی بھی اردو ادب کی ایک بہادر قلمکار ہے جس نے زندگی کے دکھوں کے سامنے سر جھکانا نہیں سیکھا بلکہ جرأت و بہادری سے ان دکھوں کا مداوا کرنے کی ہمت اپنے اندر پیدا کی ہے، ورنہ چھوٹی سی عمر میں اپنے جذبوں کے ساتھ ساتھ دوسرے لوگوں کے جذبات کی عکاسی کرنا کوئی آسان کام نہیں۔

''جو ریگ دشتِ فراق ہے'' نازیہ کنول نازی کی ذہنی پختگی کا نہ صرف عکاس ناول ہے بلکہ فنی گرفت بھی پوری طرح نظر آتی ہے۔

نازیہ کنول نازی نے اپنے ناول ''جو ریگ دشتِ فراق ہے'' کے موضوع کو جس طرح پڑھا ہے اور کردار کشی کے ساتھ ساتھ نظر نگاری کی ہے وہ اسی تخلیق کار کا خاصہ ہے۔

ہمارے معاشرے کی ان زبانوں کو نازیہ کنول نازی کا لہجہ عطا کیا ہے جو مدتوں سے گنگ تھیں۔ خواتین کے معاشرتی اتار چڑھاؤ، محبت کے عروج و زوال زندگی کی تہہ در تہہ چھپی ہوئی رعنائیوں اور ذہنی حقیقتوں کو نازیہ کنول نے جس طرح صفحہ قرطاس پر بکھیرا ہے عقل دنگ اور بصارت حیران رہ جاتی ہے۔

میری دعا ہے کہ نازیہ کنول نازی بصارت سے بصیرت تک کے اس سفر میں ہمیشہ اپنی منزل پائے آمین۔

دعا گو

منان قدیر منان

نازیہ کنول نازی، اَدبی دنیا کا روشن ستارہ

یہ ہمارا معاشرہ ہے جس میں لوگ صنف نازک کو کسی بھی میدان میں آگے بڑھتے ہوئے دیکھنا گوارہ نہیں کرتا۔ المیہ یہ ہے کہ ہم سے کچھ لوگ عورت کو صرف باندی اور (Show Piece) کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں ایسے لوگ عورت کو آگے بڑھتے ہوئے دیکھنا گوارہ نہیں کرتے اور نہ ہی وہ چاہتے ہیں کہ عورت کسی میدان میں اپنا نام کما سکے، وہ اگر عورت کو دیکھنا چاہتے ہیں تو صرف ان کے چرنوں کی داسی کے روپ میں، لیکن ہمارے معاشرے میں کچھ ایسی باہمت لڑکیاں بھی موجود ہیں جو ایسے حالات میں آگے بڑھ رہی ہیں اور مشکلات کی فلک بوس فصیلیں ان کی ہمت کے سامنے ریت کی چھوٹی چھوٹی دیواریں ثابت ہوتی ہیں ایسی چند باہمت لڑکیوں میں ایک ذات نازیہ کنول نازی کی بھی ہے۔

نازیہ کا پہلا شعری مجموعہ ''بچھڑ جانا ضروری تھا'' شائع ہوا تو بعض لوگوں کے ذہنوں میں موجود نفرتوں کے آتش فشاں پھٹ پڑے اور انہوں نے نفرتوں کا دہکتا ہوا مدفن لاوہ اُگلنا شروع کر دیا، عجیب وغریب سوالات اُٹھائے گئے لیکن نازیہ کے پاؤں میں ذرہ سی بھی لرزش پیدا نہ ہوئی، تمام مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے انہوں نے اپنا ناول ''اے مژگان محبت''، ''خواب نگر کی مسافتیں'' اور شائع کروایا اس پر بھی تنگ ذہنیت کے لوگوں نے اعتراضات اُٹھائے لیکن نازیہ کنول نازی اسی طرح باہمت ہو کر لکھتی رہیں اور اُنہوں نے ادبی خدمت کو عبادت سمجھ کر جاری رکھا اور اب ان کا ناول ''جو ریگ دشت فراق ہے'' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

نازیہ کنول نازی کی تخلیقات میں شعری مجموعہ ''بچھڑ جانا ضروری تھا'' تنہا چاند اور ناول میں ''اے مژگان محبت''، ''خواب نگر کی مسافتیں'' کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا ان کی شاعری محبت کا ایسا سمندر ہے جس میں لازوال سیپیاں اور ہیرے موتی موجود ہیں۔ ان کا انداز تحریر منفرد اسلوب کا حامل ہے ان کے خیالا کی اُڑان بہت اونچی اور ان کے لفظوں کا سنگھار اپنی مثال آپ ہے، دنیا کی بے ثباتی، تصوف، ہجر فراق کے مضامین میں سادگی ان کے ناول کے خاص موضوعات ہیں ان کی شاعری ہو یا ناول ان کے خوبصورت موضوعات ان کی تحریروں کو روایت اور جدت سے سجاتے ہیں۔ ''جو ریگ دشت فراق ہے'' میں معاشرے کے حقیقی رنگوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ''محبت کی دیوی'' نازیہ کنول نازی کے قلم کی روانی میں اور اضافہ کرے۔

خضر حیات مون

چیف ایڈیٹر

ماہنامہ ''نوائے سنگت'' ملتان

وہ ایک شخص جو رہتا ہے خوشبوؤں کی طرح
اسی کو ڈھونڈ رہی ہوں میں پاگلوں کی طرح
میرے قلم نے بڑے پیار سے لکھا ہے تجھے
تو حرف حرف میں شامل ہے خوشبوؤں کی طرح

پت جھڑ کی دہلیز پہ بکھرے
بے چہرہ پتوں کی صورت
ہم کو آج لیے پھرتی ہے
تیرے دھیان کی تیز ہوا

''اریشہ خان' عجیب گم صم سے انداز میں خاموش بیٹھی' ایک نظر ازمیر شاہ اور ایک نظر ہوٹل کے منیجر کو دیکھ رہی تھی کہ جس نے ابھی کچھ دیر قبل' بڑی عجیب سی فرمائش کی تھی اس سے' تب اس نے ازمیر شاہ کو بولتے ہوئے سنا۔

''ایکسکیوز می مسٹر جاوید۔ آپ اریشہ سے اکیلے میں کیوں ملنا چاہتے ہیں؟''

اُس کے سوال نے منیجر کے ہونٹوں پر پل دو پل کے لیے بڑی دھیمی سی مسکان بکھیری تھی' تاہم انہوں نے اپنے لہجے کو سنجیدہ رکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے جناب.....؟ کیونکہ مس اریشہ خان سے میں نہیں' بلکہ اس ہوٹل کے مالک شہریار جاوید صاحب ملنا چاہتے ہیں۔''

''لل.....لیکن وہ مجھ سے ہی کیوں ملنا چاہتے ہیں؟''

خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اریشہ نے دھیمے لہجے میں پوچھا تھا۔ جب انہوں نے بتایا۔

''آئی ڈونٹ نو مس اریشہ' لیکن میرے خیال سے آپ کو ان سے مل کر بات کر لینی چاہئے۔''

منیجر کے مشورے پر اس نے خاصی الجھی ہوئی نگاہوں سے ازمیر شاہ کی طرف دیکھا۔ جس نے تھوڑے سے شش و پنج کے بعد بالآخر آنکھوں ہی آنکھوں میں اُسے منیجر کی بات ماننے کی ہدایت کر دی تھی۔

اریشہ منیجر کی ہم راہی میں ایک شاندار سے پرائیویٹ روم کی طرف آئی تو اُس کی ٹانگیں ایک قطعی انجان اور لینڈ لارڈ شخصیت سے ملنے کا سوچ کر دھیرے سے کپکپا رہی تھیں۔

منیجر صاحب اسے کمرے کی دہلیز تک پہنچا کر واپس پلٹ گئے تھے۔ تب قدرے نروس کنڈیشن میں چھوٹے چھوٹے اسٹیپ اٹھاتی وہ کمرے کے اندر چلی آئی جہاں سامنے ہی ایک گداز صوفے پر بیٹھے باوقار شخص کو دیکھ کر وہ بھونچکا رہ گئی۔

''پپ..... پاپا آپ.....؟''

پھیلی پھیلی حیران نگاہیں مقابل شخصیت کے چہرے پر جمائے اس نے اپنے لبوں کو جنبش دی اور اگلے ہی پل لپک کر اُن کے سینے سے جا لگی۔

''پاپا پاپا کہاں چلے گئے تھے آپ؟ کیوں چھوڑ کر چلے گئے ہمیں بتایئے ناں پلیز پلیز.....''

اُن کے سینے میں منہ چھپائے وہ مچلتے ہوئے بولی تو جناب شہریار جاوید صاحب نے انتہائی نرمی سے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے نم لہجے میں کہا۔

''میں مجبور تھا گڑیا بہت مجبور تھا ورنہ میرا خدا جانتا ہے کہ میں نے زندگی کے یہ بیس سال کیسے تڑپ تڑپ کر گزارے ہیں۔ اریشہ میری بیٹی کیا تمہیں زندگی میں کبھی میری یاد نہیں آئی.....''

''کیسے نہیں آئی پاپا زندگی کے ہر اس پل میں کہ جب جب میری آنکھوں میں آنسو آئے مجھے آپ یاد آئے پاپا بہت یاد آئے.....''

وہ ایک مرتبہ پھر سسکی تھی جب شہریار صاحب نے اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو صاف کر کے اسے اپنے برابر میں صوفے پر بٹھالیا۔

''سنیتا عدیلہ اور آپ کی مما کیسی ہیں بیٹے.....؟''

کچھ دیر خاموشی کے بعد انہوں نے پوچھا تھا تب اریشہ نے انہیں بتایا۔

''سب ٹھیک ہیں پاپا لیکن میں جانتی ہوں کہ مما آپ سے بچھڑ کر خوش نہیں ہیں گو آج بھی ''حسن ولاج'' ان کی مٹھی میں ہے لیکن نانا جی اور نانی اماں کے بعد وہ اکیلی پڑ گئی ہیں پاپا بکھر رہی ہیں وہ زندگی کے ہر گزرتے پل کے ساتھ ان کے مزاج میں چڑچڑاپن بڑھ رہا ہے۔ پلیز پاپا آپ ہی ہتھیار پھینک کر انہیں منا لیجئے ناں۔ پلیز.....''

وہ ان کے ہاتھ تھامے بیٹھی تھی۔ جب ایک پھیکی سی بے جان مسکراہٹ ان کے لبوں کو چھو گئی۔

''اریشہ! تم تو گواہ ہوناں بیٹے کہ میں نے کبھی تمہاری مما کے ساتھ کچھ غلط نہیں ہونے دیا۔ سنیتا اور عدیلہ تو بے خبر ہیں۔ انجان ہیں لیکن تم تو اس وقت باشعور تھیں ناں بیٹے تمہیں تو سب خبر ہے ناں کہ تمہاری مما کس قدر سنگدل ہیں۔ انہوں نے بے کار کی حکمرانی کی ضد میں نہ صرف مجھے اپنی بچیوں کے پیار سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دیا بلکہ پورے خاندان میں مجھے ایک ناپسندیدہ شخصیت ٹھہرا دیا۔ اب تم ہی بتاؤ بیٹے میں کس دل سے اسے اپنی زندگی میں واپس لاؤں جبکہ اب تو میرے پاس کچھ رہا ہی نہیں.....''

اریشہ محسوس کر سکتی تھی کہ ان کے لہجے میں نمی ہے' مگر اس کے باوجود اس نے اپنی ضد نہیں چھوڑی۔

''مجھے سب پتہ ہے پاپا' ہر بات کی خبر ہے مجھے' لیکن آپ دونوں کے بیچ کی اس جنگ میں ہمارا کیا قصور ہے پاپا؟ ہم کیوں باپ کے ہوتے ہوئے بھی ان کے پیار کو ترسیں' بتایئے مجھے۔''

اس کے سوال پر لاجواب ہو کر شہریار صاحب نے نگاہیں چرائی تھیں' جبکہ وہ لوہا گرم دیکھ کر اس پر ایک اور چوٹ لگاتے ہوئے بولی۔

''میں جانتی ہوں پاپا کہ اگر ہم آپ سے الگ رہ کر خوش نہیں رہ سکتے تو آپ بھی ہمارے بغیر حقیقی معنوں میں زندہ نہیں ہیں' تب ہی تو دیکھئے کہ طویل مدت گزر جانے کے باوجود بھی اس وطن کی سحر انگیز ہوائیں آپ کو یہاں کھینچ لائیں' لیکن پاپا آپ کا یہ بڑا نام' یہ دولت' یہ شان و مرتبہ' ہمارے کس کام کا' جو اگر ہم آپ کے ساتھ آپ کے گھر میں نہ رہ سکیں۔ پاپا' ہمارا بھی تو دل چاہتا ہے ناں کہ ہمارا ایک خوبصورت سا گھر ہو جس میں ہم اپنی مرضی سے ہنس بول' کھیل سکیں اپنے والدین کا بھرپور پیار پا سکیں' آپ نے ہمیشہ' ہر ماہ مما کو ساری رقم' ہمارے اچھے مستقبل کے لیے دیتے ہوئے' کیا کبھی یہ نہیں سوچا کہ ہمیں زندگی کی ہر آسائش کے ساتھ ساتھ آپ کا پیار بھی چاہیے ہوگا۔ بولیے ناں پاپا۔ کیا ہمارا یہ حق نہیں کہ ہم دوسروں کے احسانوں تلے رہ کر نہ جئیں' میں بہت دکھی ہوں پاپا۔ رفتہ رفتہ بکھر رہی ہوں' پلیز اب تو ضد چھوڑ دیجئے پاپا' پلیز.....''

اب کے وہ باقاعدہ رو پڑی تھی۔ تب ہی شہریار جاوید صاحب نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی بانہوں میں چھپا لیا۔ اریشہ کی باتوں نے حقیقی معنوں میں انہیں شرمسار کر دیا تھا۔ حالانکہ آج سے کچھ عرصہ قبل جب وہ آخری بار اریشہ سے ملے تھے تو انہیں اس بات کا احساس بھی نہیں تھا کہ وہ ان سے دور ہونے پر دکھی بھی ہو سکتی ہے۔ نورینہ بیگم نے جس طرح سے اپنا ناتا ان سے توڑ کر اریشہ' سنیتا اور عدیلہ کو ان سے دور کیا تھا اس کے بعد وہ بھی جیسے پتھر ہو کر رہ گئے تھے۔

ہر ماہ ایک بھاری رقم' بچوں کے اخراجات کے لیے' نورینہ بیگم کے نام ارسال کرتے ہوئے انہوں نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ ان کے بچے زندگی کی ہر آسائش کے باوجود' ان کے پیار کی کمی کو محسوس کرتے ہوں گے۔ تب ہی تو انہوں نے زندگی کے بیس سال۔ جلاوطنی میں کاٹ دیئے تھے۔ مگر اب وہ تھک گئے تھے۔ اب گزرتے وقت کا ہر پل انہیں اپنے بچوں کی یاد دلا رہا تھا۔ سو دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ پاکستان واپس چلے آئے۔

آج سے سات آٹھ سال قبل انہوں نے کراچی میں' بالکل اتفاقیہ طور پر اریشہ کو دیکھا تھا۔ غالباً کسی کالج میں ایک تقریب کے دوران' لیکن اس وقت وہ چاہ کر بھی اس کے قریب نہیں آئے تھے۔ کیونکہ اریشہ اپنی دوستوں کے درمیان بہت خوش تھی۔ لہٰذا وہ اس کے چہرے سے یہ مسکراہٹ چھیننا نہیں چاہتے تھے۔ سو دل پر ضبط رکھا اور اگلے ہی دن واپس نیویارک چلے آئے۔

لیکن اب کہ جب وہ مستقل پاکستان میں رہنے کے لیے چلے آئے تھے' اور انہوں نے آج اتفاقیہ طور پر اپنی بیٹی کو اپنے ہی ہوٹل میں بیٹھے دیکھ بھی لیا تھا۔ تو اب ان کے لیے اپنے دل کو سمجھانا ممکن نہیں رہا تھا۔ وہ دریا کے قریب ہو کر تشنہ لب نہیں رہنا چاہتے تھے۔ سو انہوں نے ہوٹل کے منیجر سے بات کی اور اپنی بیٹی کو اپنے پاس بلا لیا۔

گو وقت بہت زیادہ بیت گیا تھا۔ گزرتے ماہ و سال نے انہیں جوانی کی دہلیز سے اٹھا کر بڑھاپے کے آنگن میں لا بٹھایا تھا' مگر اس کے

باوجود آج بھی وہ اتنے ہی پرکشش اور وجیہہ تھے کہ اریشہ انہیں پہلی نظر میں دیکھتے ہی پہچان گئی تھی۔

وہ پورا دن اریشہ نے اپنے پاپا کے ساتھ ہی گزارہ تھا۔ حالانکہ ازمیر اس بات کو لے کر کتنا ڈپریس ہوا تھا کہ نہ جانے شہریار صاحب کون ہیں؟ اور اریشہ کو کیسے جانتے ہیں؟ پھر اسے یہ خدشہ بھی تھا کہ کہیں شہریار صاحب کوئی نوجوان لڑکا ہی نہ ہو جو اریشہ کو دیکھ کر اس پر فدا ہو گیا ہو اور اب اس پر اپنی امارت کا رعب جھاڑ کر اسے امپریس کر رہا ہو۔ اریشہ جب سے اٹھ کر منیجر کے ساتھ گئی تھی۔ اس کی جان حلق میں اٹک کر رہ گئی تھی۔ سائلہ خان میں اس کی دلچسپی بھی صفر ہو کر رہ گئی تھی۔ اس پر جب اریشہ نے اسے یہ پیغام دیا کہ وہ اس کے ساتھ نہیں جا سکتی اور ہوٹل میں مزید کچھ دیر ٹھہرے گی۔ تب تو اس کا حال ہی برا تھا۔ حالانکہ وہ اریشہ سے اچھی طرح واقف تھا اور یہ جانتا تھا کہ وہ کسی بھی اجنبی کے ساتھ فری ہونے والی نہیں ہے۔ مگر پھر بھی اس کا دل طرح طرح کے وہموں کا شکار ہو کر دھڑکتا رہا۔

رات کو جب وہ لانگ ڈرائیو کے بعد گھر پہنچا تو اریشہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی اسی کا انتظار کر رہی تھی۔

''ازمیر تم کہاں رہ گئے تھے.....؟''

جونہی اسے لاؤنج میں قدم رکھتے دیکھا وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی مگر ازمیر کا دل چاہا کہ وہ اس سے کہہ دے۔

''میں وہاں رہ گیا ہوں اریشہ جہاں تم میرے ساتھ نہیں ہو۔'' مگر نہیں کہہ سکا۔

''کیا بات ہے ازمیر تم کچھ پریشان لگ رہے ہو.....''

اسے خاموش پا کر اریشہ نے دوبارہ پوچھا تھا۔ تب وہ سرسری سی ایک نظر اس کے سادہ حلیے پر ڈال کر قریبی صوفے پر ڈھ گیا۔

''تمہیں میری اتنی فکر کب سے ہونے لگی اریشہ؟'' ہلکا سا طنز تھا اس کے لہجے میں مگر اریشہ نے محسوس نہیں کیا۔

''ازمیر! کیا تمہیں نہیں لگتا کہ تم ضرورت سے زیادہ زیادتی کر رہے ہو میرے ساتھ.....؟''

''کیوں میں نے کیا کیا ہے؟'' بھنویں اچکا کر اپنی مقناطیسی نگاہیں اس کے چہرے پر جماتے ہوئے وہ بولا تھا۔ جب اریشہ نے کہا۔

''اتنے بے خبر تو نہیں ہو تم' بہرحال آج میں بہت خوش ہوں ازمیر' بے حد' بے حساب' جانتے ہو کیوں' کیونکہ میں نے اپنی زندگی کا مقصد پا لیا ہے۔''

اس کے دھیمے لہجے میں حد درجہ سرشاری تھی' مگر ازمیر کا دل یک لخت ہی تیزی سے دھڑک اٹھا۔ اسے لگا کہ جیسے اس کے تمام خدشات ایک دم درست ہوتے جا رہے ہوں' تب ہی وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر واپس ٹی وی لاؤنج سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

عدنان پچھلے ایک ہفتہ سے آئی سی یو میں تھا اور ڈاکٹرز اس کی زندگی کے بارے میں کچھ خاص پُرامید نہیں تھے۔ احمد رؤف صاحب تو اس حادثے کے بعد جیسے زندہ لاش ہو کر رہ گئے تھے۔ مگر سیال بیگم تڑپ رہی تھیں۔ انجشاء کو بددعائیں دیتے' ان کے لب نہ تھکتے تھے۔

اُس روز وہ عدنان کو دیکھنے کے لیے ہسپتال آئی تو صدمے سے نڈھال سیال بیگم اُس سے الجھ پڑیں۔

''رک جاؤ' خبردار جو میرے بیٹے کی طرف ایک قدم بھی بڑھایا تم نے......''

نہ جانے وہ اچانک ہی کہاں سے نکل کر اس کے عین مقابل آ کھڑی ہوئی تھیں۔

''اب کیا لینے آئی ہو تم یہاں' بولو......؟ کیا یہ دیکھنے آئی ہو کہ میرا بیٹا' ابھی تک مرا کیوں نہیں؟ یہی بات دیکھنے کے لیے آئی ہو ناں تم' مگر یاد رکھو انجشاء! اگر میرے بیٹے کو کچھ ہوا تو میں کبھی تمہیں معاف نہیں کروں گی۔'' ان کی سرخ آنکھیں سوجی ہوئی تھیں بال بھی ان کے حلیے کی طرح بے ترتیب بکھرے تھے۔ مگر انہیں ہوش نہیں تھا۔

''تم بدلہ لینا چاہتی ہو ناں ہم سے تو لو پہلے میرے سینے پر گولی چلاؤ تم' کیونکہ میں اپنی آنکھوں کے سامنے' اپنے بیٹے کو مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔''

دل کے ساتھ ساتھ ان کا لہجہ بھی زخمی تھا' تب ہی انجشاء نے ان کی طرف سے نگاہ پھیر لی۔

''تم کتنی سنگدل ہو لڑکی' کیسا پتھر دل ہے تمہارے سینے میں جو پگھل ہی نہیں رہا' کیا کرو گی اس نفرت کا جو میرے جگر کا ٹکڑا ہی نہ رہا تو اس نے تمہیں چھوڑا تھا انجشاء۔ تم سے تمہاری زندگی نہیں چھینی تھی۔ پھر کیوں موت کے منہ میں دھکیل دیا ہے تم نے اسے؟ بولو جواب دو' کیوں نہیں جینے دے رہی ہو اسے تم......؟''

سیال بیگم کا ضبط ایک مرتبہ پھر ٹوٹ گیا تھا۔ مگر جلد ہی انہوں نے اپنے آنسو رگڑ ڈالے۔

''ادھر آؤ لڑکی اور دیکھو اس کی آنکھوں کے گرد پھیلے حلقوں کو' دیکھو اس دیوانے لڑکے کو' جو تمہاری چاہ کے لیے خود اپنے آپ کو بھول بیٹھا ہے۔ یہ کبھی نہیں رویا انجشاء مگر تم نے خون کے آنسو رلائے ہیں اسے۔ اس نے کبھی ایک پیسہ بھی کمانے کا ہنر نہیں سیکھا تھا مگر دیکھو اب تمہاری طرف سے دائر کیس میں' تمہیں نہ ہارنے کے لیے اس نے اپنے آپ کو داؤ پر رکھ دیا ہے۔ وہ جو کبھی دن میں بھی آفس نہیں جاتا تھا۔ اب رات بھر جاگ کر زیادہ سے زیادہ پیسہ حاصل کرنے کے لیے' گھر نہیں لوٹتا' یہ اس دیوانے لڑکے کو دیکھو انجشاء اور رحم کرو اس پر' خدا کے لیے بخش دو میرے بیٹے کو' پلیز......''

روتے روتے' وہ اس کے قدموں میں بیٹھ گئی تھیں' جب انجشاء نے تڑپ کر ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

''یہ آپ کیا کر رہی ہیں آنٹی' میں نے تو کبھی یہ نہیں چاہا کہ عدنان کو کوئی تکلیف پہنچے' پھر آپ سارا الزام مجھے کیوں دے رہی ہیں......''

''اس لیے کیونکہ میرا بیٹا تم سے بہت پیار کرتا ہے انجشاء۔''

''نہیں' یہ سچ نہیں ہے آنٹی۔ آپ کا بیٹا مجھ سے پیار نہیں کرتا' نہ آج نہ کل۔ اس نے میرے حصول کو فقط اپنی انا کا مسئلہ بنالیا ہے آنٹی اور آپ تو جانتی ہیں ناں کہ بچپن ہی سے کتنا ضدی رہا ہے وہ۔ میرا حصول اس کی ضد بن گئی ہے آنٹی' وہ مجھے پاکر' پھر سے گنوا دے گا۔ پھر سے ریزہ ریزہ کر کے بکھیر دے گا مجھے۔ بہر حال آپ پریشان مت ہوں۔ میں ابھی ڈاکٹرز سے بات کر کے آئی ہوں۔ انہوں نے امید دلائی ہے کہ عدنان بہت جلد ہوش میں آجائے گا' پلیز حوصلہ رکھیے۔''

ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی اس کے لہجے میں انتہائی ٹھہراؤ تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ سیال بیگم نے پھر اس سے کچھ نہیں کہا۔ اس روز انجشاء ہسپتال سے واپس آئی تو اس کا دل بہت بوجھل تھا۔ عدنان کے سر پر بہت زیادہ چوٹ آئی تھی۔ جس کے باعث وہ مسلسل تین دن سے زندگی اور موت کے دوراہے پر کھڑا آکسیجن کے سہارے جی رہا تھا۔ سیال بیگم نے رو' رو کر اپنی آنکھیں سکھا ڈالی تھیں۔ مگر عدنان کی آنکھیں نہیں کھلیں' وہ اب بھی ساکت لیٹا' دنیا جہاں سے بے خبر تھا۔

اس روز بہت دنوں کے بعد انجشاء خالی خالی سا دل لیے آفس آئی تو ایک اور ہی شاک اس کا منتظر تھا اور یہ شاک اسے اس وقت لگا جب اریج کی پرسنل سیکریٹری نے اسے اشعر اور شیزا کی شادی کے ساتھ اسے اشعر اور اریج کے مابین کشیدگیوں کے متعلق بتایا

وہ اپنے ہی دکھوں میں اس قدر الجھی ہوئی تھی کہ اسے تمکین کا تو کوئی خیال ہی نہیں رہا تھا۔ ایک ہی شہر میں ہوتے ہوئے وہ اپنی دوست پر گزرنے والی ہر آفت سے بے خبر تھی۔

حالات بہت بے رحم ہو گئے تھے۔ سکون نامی کوئی چیز تو جیسے کہیں رہی ہی نہیں تھی۔ اس روز وہ فوراً ہی آفس سے گھر واپس چلی آئی تھی۔ گھر آ کر اس نے بار بار تمکین اور اریج کے موبائل نمبر پر ان سے رابطہ کرنا چاہا تھا۔ مگر ہر بار اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

بے قراری سی بے قراری تھی۔ کسی کروٹ قرار نصیب نہیں تھا۔ بستر پر بھی جیسے کانٹے سے اُگ آئے تھے۔ کمرے میں یک دم ہی جیسے اس کا دم گھٹنے لگا' تب بے قراری ہو کر وہ اپنے فلیٹ سے باہر نکل آئی۔ رات خوب چاندنی تھی۔ اس پر معطر ہواؤں کے سحر نے اور بھی دلکشی پیدا کر دی تھی۔ وہ اپنے فلیٹ سے نکل کر رات کا کھانا کھائے بغیر پیدل چلتی ہوئی کافی دور نکل آئی۔ یادوں کے بھنور میں بار بار عدنان اور تمکین کا خیال' اسے پریشان کرتا رہا۔ تب ہی اسے محسوس ہوا کہ جیسے وہ تنہا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہے جو چپکے چپکے' دبے پاؤں' نہ جانے کب سے اس کے پیچھے چل رہا ہے۔ تب اچانک چونک کر اس نے اپنے پیچھے نظر دوڑائی اور یہ دیکھ کر پریشان ہو گئی کہ وہاں' تنہائی اور دور دور تک ویرانی کے اس ماحول میں ایک بے شکل سا' اوباش نوجوان' پراسرار انداز میں دبے پاؤں اس کا پیچھا کر رہا تھا۔

انجشاء کا دل اس ممکنہ خطرے کو بھانپ کر بڑی تیزی سے دھڑکا' اور اس نے اپنے آگے کو اٹھتے پاؤں مزید تیز کر دیے' لیکن جیسے ہی اس کے پاؤں میں پھرتی آئی' اس کے پیچھے آتے اوباش نوجوان کے قدموں میں بھی تیزی آ گئی۔

انجشاء کا دل اب پسلیاں توڑ کر باہر نکلنے کو تیار ہو گیا تھا۔ تب ہی اس نے انجام کی پروا کیے بغیر اندھا دھند بھاگنا شروع کر دیا۔ مگر بھاگ کر جاتی کہاں......؟ ارد گرد دور دور تک کسی انسان کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ نتیجتاً تھوڑی ہی دیر تک بھاگنے کے بعد اس کی سانس بری طرح سے پھول گئی' اور وہ ہانپ کر نیچے زمین پر گر پڑی۔ عین اسی لمحے وہ آوارہ' اوباش نوجوان' خباثت سے مسکراتا ہوا اس کی طرف بڑھا' اور اس نازک سے وجود کو اپنی آہنی گرفت میں قید کرتے ہوئے مکروہ ہنسی کے ساتھ بولا۔

''کیا بات ہے بلبل' گھبرا کیوں رہی ہے ارے کب سے تنہا بھٹکتے دیکھ رہا ہوں تجھے۔ آ' اب تیری تنہائی دور کر دوں۔ زندگی میں شادی کرنے کے لیے کوئی مرد نہیں ملا ناں تجھے' تب ہی تو اکیلی رہتی ہے مگر اب تو اکیلی نہیں رہے گی بلبل' کیونکہ اب اپن تجھے اپنا نام دے گا......''

جتنی مکروہ اس کی شکل تھی اس سے کہیں بڑھ کر پست' اس کا لہجہ تھا۔ انجشاء نے بہت کوشش کی کہ وہ اس کی گرفت سے نکل سکے۔ مگر اسے کامیابی نہ ملی' بھوکے بھیڑیے جیسا وہ شخص اسے نوچنا چاہتا تھا۔ جب اس نے صدق دل سے خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہوئے اس سے اس کی رحمت کی بھیک مانگی اور عین اس وقت کہ جب وہ پامال ہونے جارہی تھی۔ کوئی گاڑی بڑی تیزی سے آکر اس کے قریب رکی اور وہ اوباش نوجوان فوراً اسے چھوڑ کر الٹے پیروں واپس بھاگ گیا۔

☆☆☆

اریج احمر کی شاندار گاڑی جونہی ''حسن ولاج'' کے سامنے آکر رکی۔ اوپر ٹیرس پر بے قراری سے ٹہلتے اشعر نے ناگواری سے اسے دیکھا۔ یہ وہ شخص تھا کہ جس نے اس سے اس کی محبت کے ساتھ ساتھ اس کا چین وقرار اور زندگی کا مقصد بھی چھین لیا تھا۔ وہ اس سے اتنا الرجک تھا کہ اسے اپنی نفرت کے قابل بھی نہیں سمجھتا تھا۔ مگر اگلے ہی پل جب اس کے پہلو سے تمکین رضا گاڑی سے باہر نکلی تو وہ شاکڈ رہ گیا۔

اتنا کچھ ہوجانے کے بعد بھی تمکین اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے گی۔ اسے گمان بھی نہیں تھا، تب ہی اس کے دل میں تمکین کے لیے نفرت کا ایک اُبال اٹھا، اور وہ بمشکل اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے مٹھیاں بھینچ کر ٹیرس سے نیچے لاؤنج میں چلا آیا۔ جہاں سر جھکائے اداس کھڑی تمکین رضا کے پہلو میں اریج احمر کھڑا اس کے دادا جی سے مصافحہ کر رہا تھا۔

''اشعر! اریج تم سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔''

تمکین کی نظر جونہی اشعر پر پڑی۔ وہ لپک کر اس کی طرف بڑھی تھی۔ مگر اشعر نے اس کے قریب آتے ہی جما کر ایک زبردست طمانچہ' اس کے دائیں گال پر رسید کردیا۔ طمانچے کی شدت اس قدر تھی کہ تمکین لڑکھڑا کر رہ گئی' عین اسی پل بالکل بے ساختگی کے عالم میں اریج احمر نے تمکین کو سنبھالا اور اس کے سفید گال پر چھپے' اشعر احمد کی انگلیوں کے نشانات دیکھ کر وہ قطعی غیر ارادی طور پر اشعر کی طرف بڑھا۔ اور اس کا گریبان تھام لیا۔

''یہ کیا بے ہودگی ہے اشعر' تمکین سے پیش آنے کا یہ کون سا طریقہ ہے تمہارا......''

زندگی میں پہلی بار تمکین نے اسے حد درجہ اشتعال میں دیکھا تھا۔

''یو شٹ اپ۔ بیوی ہے وہ میری۔ جیسا چاہوں ویسا سلوک کرسکتا ہوں اس کے ساتھ میں۔ تم ہمارے درمیان آنے والے کون ہو۔''

اشعر کا لہجہ سانپ کی پھنکار جیسا تھا۔ مگر اریج احمر گالی نہ سن سکا۔ لہٰذا ایک زبردست تھپڑ اشعر کے دے مارا۔ تمکین نے یہ صورت حال دیکھی تو وہ لپک کر اریج احمر کی طرف بڑھی اور اس کا چہرہ اپنے تھپڑوں سے سرخ کرڈالا۔

''وہ میرا شوہر ہے' میری جان بھی لے لے' تم درمیان میں آنے والے کون ہو؟ تمہیں جرأت کیسے ہوئی اشعر پر ہاتھ اٹھانے کی۔''

اسے واقعی دل سے تکلیف ہوئی تھی' مگر اشعر نے اسے تمکین اور اریج کا ڈرامہ سمجھا۔ تب ہی وہ اپنے اشتعال کو دبا نہیں سکا۔

''واہ تمکین بیگم جواب نہیں تمہارا' ایک طرف تو اس سے مل کر میری زندگی میں آگ لگاتی ہو اور دوسری طرف یہ ڈرامہ بازی کرکے اپنی وفاداری ثابت کرنا چاہتی ہو' آج مجھے محسوس ہورہا ہے کہ تم جیسی گھٹیا عورت سے شادی کرکے میں نے اپنی زندگی کی بدترین غلطی کی تھی......''

''تم اپنی حد سے بڑھ رہے ہو اشعر' تمہاری آنکھوں پر شیزا کی عیاری کی پٹی بندھی ہے' جس دن یہ پٹی اتری' اسی دن تم جان جاؤ گے کہ تم کتنی بھیانک غلطی کر رہے ہو۔''

اریج احمر اس کے الفاظ پر ایک مرتبہ پھر مچلا تھا' جبکہ گھر کے دیگر لوگ ہراساں کھڑے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔

''شیزا کا نام مت لاؤ اپنی زبان پر اریج' بدکرداری تمکین نے کی ہے' شیزا نے نہیں.....''

اشعر کی آنکھیں انگارے اگل رہی تھیں۔ مگر کم غصے میں اریج احمر بھی نہیں تھا۔

''شیزا بدکردار اور آوارہ ہے' اشعر۔ تم اس کے چنگل میں پھنس کر بلاوجہ تمکین پر تہمت لگا رہے ہو.....''

''اچھا۔ اگر یہی بات ہے' ناں تو تم رکھو اس پاک باز عورت کو اپنے پاس' مجھے یہ منافقت بھری' تقسیم شدہ عورت نہیں چاہیے' سنا تم نے۔''

جتنی بلند آواز میں اریج احمر چلایا تھا۔ لگ بھگ اتنی ہی شدت سے اشعر کی آواز گونجی تھی۔

''تم پاگل پن کی انتہا کو چھو رہے ہو اشعر۔''

''ہاں' میں پاگل ہوں' اور اسی پاگل پن میں میں واشگاف الفاظ میں یہ کہتا ہوں کہ میں نے تمکین رضا کو طلاق دی.....''

نہ کوئی آندھی چلی نہ دھرتی کا سینہ پھٹا مگر حسن ولاج کے در و دیوار ویران ہوگئے' ایک پل کے لیے ایسی گھمبیر خاموشی چھائی کہ ہر کوئی اپنی اپنی جگہ پر ساکت رہ گیا۔ خود اشعر احمد بھی جو ہرگز تمکین کو ڈائیورس دینے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ مگر یہ غصہ ہی تھا کہ جس کی زد میں آ کر وہ یہ احمقانہ قدم اٹھا گیا۔

رخسانہ بیگم' ہونٹوں پر ہاتھ رکھے پھٹی پھٹی نگاہوں کے ساتھ اشعر کو دیکھ رہی تھیں جبکہ تمکین تو ایسے ہوگئی کہ گویا کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔

احسن صاحب' فاطمہ بیگم' سعید صاحب سب اپنی جگہ پتھر بن کر رہ گئے تھے۔ تب ہی اس خاموش جھیل میں شیزا احمد کی کھنک دار آواز ایک پتھر کی طرح گونجی۔

''ارے کیا ہوا بھئی۔ یہ سب لوگ مجسمہ بنے کیوں کھڑے ہیں.....؟''

وہ سب کچھ جان چکی تھی' مگر پھر بھی مزے لے رہی تھی۔ اس کے شفاف چہرے پر طویل سفر کی تھکان کا شائبہ تک نہیں تھا۔

''لگتا ہے' یہاں کوئی ٹریجڈی ہوگئی ہے' کیوں اشعر.....؟''

ذہین آنکھوں میں فتح کی چمک نمایاں تھی۔ مگر اشعر نے اس کی سمت نہیں دیکھا۔

''کمال ہے بھئی' یہاں تو کوئی سیدھے منہ بات ہی نہیں کر رہا..... حالانکہ اس خاندان کی نئی نویلی بہو اتنی دور سے چل کر اپنی سسرال آئی ہے' مگر یہاں تو کسی کو پرواہی نہیں.....''

کندھے اچکا کر وہ ایسے انداز میں بات کر رہی تھی گویا ایک ایک لمحے کا لطف سمیٹ رہی ہو۔

''چچ..... چچ..... چچ تمکین۔ کیا ہوا؟ اشعر نے چھوڑ دیا' اور بڑے افسوس کی بات ہے۔ ویسے دیکھ لی ناں مرد کی محبت' تمہیں تو بڑا ناز تھا

ناں اپنے اشعر کی محبت پر مگر کہاں گئی وہ محبت تمکین۔ یہ تمہارا شوہر ہی ہے ناں' پھر کیوں چھوڑ دیا اس نے تمہیں......؟ پوچھو اس سے......؟''

پورے حسن ولاج میں اس کی پاٹ دار آواز گونج رہی تھی اور وہاں موجود ہر شخص خالی خالی سی آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا۔

''ارے نانا جی' آج آپ کیسے خاموش کھڑے ہیں......؟ بولیے آج سے 24 سال قبل' میری ماں سے بھی یہی ایک خطا ہوئی تھی ناں کہ انہوں نے آپ کی مرضی کے خلاف شادی کر لی تھی اور آپ نے سزا کے طور پر انہیں ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی سے بے دخل کر دیا' پھر اب کیوں خاموش کھڑے ہیں آپ' جواب دیجیے۔ اشعر نے بھی تو آپ کے مان' آپ کے اصولوں کو توڑا ہے' اب اس کا کیا کریں گے آپ......؟''

اس کے لہجے میں گہری کاٹ تھی۔ مگر وہاں کوئی اس کے سوالوں کا جواب دینے والا نہیں تھا۔

''نانی ماں آپ خاموش کیوں کھڑی ہیں؟ آپ نے تو جنم دیا تھا ناں میری ماں کو' پھر دربدر کی ٹھوکروں کے حوالے کر دیا انہیں؟ بولیے......؟ یونہی مان توڑا تھا ناں آپ نے میری ماں کا' یونہی آنسو بھرے تھے ناں ان کی آنکھوں میں۔ یونہی ٹوٹ کر بکھری تھی میری ماں' اور پھر ساری زندگی بکھرتی ہی چلی گئی۔ پوچھیں نانا جی سے کہ کیا قصور تھا ان کا۔ یہی ناں کہ انہوں نے اپنی پسند سے' اپنا جیون ساتھی منتخب کر لیا تھا۔ مگر اس جرم کی سزا میں' انہیں زندگی بھر کے لیے اپنی زندگی سے بے دخل کر دینا' کہاں کا انصاف تھا آپ کا؟ کوئی اپنی سگی اولاد کے ساتھ ایسا کر سکتا ہے جو آپ نے کیا......؟''

وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر چلا رہی تھی اور وہاں موجود سبھی لوگ حیرانگی سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ تب وہ تمکین کی طرف واپس پلٹی۔

''تم نفرت کرتی ہوناں مجھ سے تو کرو' حق ہے تمہیں مجھ سے نفرت کرنے کا' کیونکہ میں نے ہی تم سے تمہاری محبت اور اقرار دونوں کو چھینا ہے۔ دوستی کی آڑ میں دشمنی کی ہے تمہارے ساتھ لیکن تمہاری ماں نے بھی تو میری ماں کے ساتھ ایسا ہی کیا تھا۔ تمکین' پوچھو ان سے یہ بھی تو دوست تھیں نا میری مما کی۔ ''حسن ولاج'' میں بہو بن کر آنے سے قبل' یہ محض میری مما کی کلوز فرینڈ تھیں۔ میری مما ہی اپنی کوششوں سے انہیں ''حسن ولاج'' میں لائیں اور انہیں عزت' محبت' مان سمان سب ملا' لیکن میری مما کو کیا ملا......؟ دکھ' رسوائی' آنسو......؟ پوچھو ان سے تمکین' کیوں فریب کیا انہوں نے میری مما کے ساتھ......؟ یہ تو دوست تھیں ان کی' جانتی تھیں ناں کہ میری مما میرے پاپا سے کتنا پیار کرتی ہیں' یہ تو راز دار تھیں ان کی مگر پھر بھی انہوں نے میری مما پر تہمت لگائی' ان پر بلاوجہ انگلیاں اٹھائیں اور بالآخر انہیں زندگی بھر کے لیے اس گھر اور اس گھر میں رہنے والے ان کے اپنوں کی محبت سے محروم کر ڈالا۔ کیوں تمکین' یہ چاہتیں تو معاملہ سنبھال سکتی تھیں۔ مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ جانتی ہو کیوں......؟ کیونکہ میرے نانا جی' میری مما سے بہت پیار کرتے تھے' اور ان کا یہ پیار تمہاری مما سے برداشت نہیں ہوتا تھا۔ یہ نہیں چاہتی تھیں کہ میری مما کو' نانا جی کی وسیع جائیداد سے کچھ بھی ملے' سو انہوں نے میری مما کی ایک بھول پر' ان کا پتا ہی صاف کر ڈالا۔''

پاٹ دار آواز میں چلاتی شیزا نے ایک لمحے کے لیے رک کر اپنی سانسیں ہموار کیں' پھر قدرے نم نگاہوں سے اشعر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''لیکن میں نے تم سے انتقام نہیں لیا تمکین۔ کیونکہ ماضی میں جو کچھ بھی ہوا۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں تھا' لیکن پھر بھی میں نے

تمہارے حق پر ڈاکہ ڈالا' جانتی ہو کیوں......؟ کیونکہ میں خود اشعر کو بہت چاہنے لگی تھی' ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اشعر کو پانے کی طلب' میری سانسوں میں نمو پا رہی تھی' میں جب اسے تمہارے ساتھ' ہنستے بولتے دیکھتی تھی تو میرے جگر پر آرے چلتے تھے۔ میرا من چاہتا تھا کہ میں تمہارے لبوں کی مسکراہٹ نوچ لوں۔ قدغن لگادوں اشعر سے تمہاری رفاقتوں پر لیکن یہ سب اتنا آسان کہاں تھا تمکین......؟ تب ہی مجھے اشعر تک پہنچنے کا راستہ ڈھونڈنا پڑا، اور اس راستے پر گامزن ہو کر جو پہلا انکشاف مجھ پر ہوا۔ وہ اریج احمر کی تم سے دیوانہ وار محبت تھی تمکین' میں نے بارہا اس کی اداس آنکھوں میں تمہارا عکس بکھرتے دیکھا۔ آفس میں' چوری چوری چپکے چپکے' تمہارے تصور سے باتیں کرتے ہوئے سنا اسے لیکن تم اس کی دیوانگی سے بے خبر تھیں۔ تمکین بالکل ایسے ہی کہ جیسے اشعر میری دیوانگی سے لاعلم تھا۔ تب مجبوراً مجھے یہ قدم اٹھانا پڑا۔ کیونکہ میری اور اریج کی آنکھوں میں ایک سا درد تھا۔ ہاں میں مانتی ہوں کہ اشعر تم سے بہت پیار کرتا تھا اور تم بھی اسے دیکھ دیکھ کر جیتی تھیں۔ مگر وہ محبت ہی کیا تمکین۔ جو یقین کی بنیاد پر نہ کھڑی ہو۔ اشعر کی جگہ اگر اریج ہوتا تو کبھی میری باتوں میں نہ آتا اور تمہاری جگہ اگر میں ہوتی تو کبھی اشعر کو خود سے دور جانے کے مواقع فراہم نہ کرتی کیونکہ جہاں حقیقی محبت ہوتی ہے وہاں جذباتیت سے زیادہ مزید موقع دینے اور ایک دوسرے کی لرزشوں کو نظر انداز کر دینے کی گنجائش ہوتی ہے جو کہ تمہارے اور اشعر کے درمیان نہیں تھی۔ سو تم لوگ زیادہ دیر تک ایک دوسرے کے ساتھ نہیں چل سکے......''

بولتے بولتے اس کی سانس پھول گئی تو اس نے آنکھ سے بہتا آنسو انگلی کی پور پر اتار کر تنفر سے پرے جھٹک دیا' پھر کچھ پل خاموش رہنے کے بعد اس نے اپنا روئے سخن اریج احمر کی طرف پھیر لیا اور دھیمے سے مسکرا کر بولی۔

''کیوں مسٹر اریج' کیسی رہی......؟ اچھی رہی ناں......؟ مل گیا ناں آپ کو اپنے تھپڑ کا جواب' ویسے آپ کو تو میرا شکر گزار ہونا چاہئے کہ جو کام آپ تین سال میں نہیں کر پائے وہ میں نے تین ماہ میں کر کے آپ کا راستہ صاف کر دیا......''

اُس کے لہجے میں اب بھی گہری کاٹ تھی' مگر ضبط سے سرخ آنکھوں کے ساتھ کھڑا اریج احمر جواب میں اس سے ایک لفظ بھی نہیں کہہ پایا' کہتا بھی کیا۔ اب تو کہنے کے لیے کچھ بچا ہی نہیں تھا' سو وہ نفرت بھری اک زہریلی نگاہ اس کے مکروہ چہرے پر ڈالتے ہوئے تیزی سے واپسی کے لیے پلٹا اور فقط ایک پل کے لیے پھر بھی تمکین رضا کے پاس ٹھہر کر اگلے ہی پل لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے حسن ولاج سے باہر نکل گیا۔

''ارے......لگتا ہے اریج صاحب میری باتوں کا برا مان گئے' خیر اس طرح تو ہوتا ہے۔ اس طرح کے کاموں میں، بہر حال میں تم سے معذرت خواہ ہوں اشعر......تمہاری گنہگار ہوں میں کیونکہ میں نے تمہارے ہنستے بستے گھر کو اجاڑا ہے لیکن یقین مانو تمہیں تکلیف میں مبتلا دیکھنے کا تصور بھی نہیں ہے میرے پاس' میں پچھلے چار سال سے تمہاری پرستش کرتی آرہی ہوں اشعر' لیکن کبھی اپنے دل کا حال تم پر نہیں کھولا۔ کیونکہ تم میری رفاقت سے زیادہ' تمکین کی قربت میں خوش رہتے تھے اور میں اتنی خود غرض نہیں تھی کہ اپنی خوشی کے لیے' تمہاری خوشیوں میں آگ لگا دیتی' لیکن جب میں نے اریج اور تمکین کی کہانی جانی' تب یہ لگا کہ تمکین تمہارے سچے پیار کی حق دار نہیں ہے' سو میں نے تمہیں حقیقت کا آئینہ دکھا دیا۔ پلیز میرا یقین کرو اشعر میں ہر گز یہ نہیں چاہتی تھی کہ تم تمکین کو اپنی زندگی سے الگ کرو، لیکن اب جبکہ تم جلد بازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ جذباتی قدم اٹھا ہی چکے ہو تو پلیز میری زندگی میں لوٹ آؤ اشعر' پلیز......''

اس وقت وہ بھرائی ہوئی آنکھوں سے اشعر کے سامنے کھڑی اس سے التجا کر رہی تھی اور وہ جیسے ایک ٹرانس کی کیفیت میں گم صم کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ان کی خوشیوں کا گہوارہ ''حسن ولاج'' اداسیوں کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ڈوب کر رہ گیا تھا۔ شیزا احمد نے سراسر حماقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے جو بھیانک کھیل اشعر اور تمکین کی زندگی کے ساتھ کھیلا تھا اس نے ''حسن ولاج'' کے مضبوط ستونوں کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی تھیں۔ حسن صاحب کو اسی رات دل کا زبردست اٹیک ہوا اور وہ دار فانی سے کوچ کر گئے۔ ایک قیامت تھی جو گھن کی طرح حسن ولاج کے بلند ستونوں کے ساتھ لپٹ کر بیٹھ گئی تھی۔

حسن احمد صاحب کی رحلت کے بعد عائشہ بیگم بھی زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہ سکیں اور ایک روز وہ بھی چپ چاپ اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔

اس طرح سے وہ گھر' جہاں پہلے محض خوشیوں کا دور دورہ تھا۔ اب غم کی تاریکیوں میں ڈوب کر رہ گیا تھا۔ شیزا احمد اپنے گھر واپس جا چکی تھی ۔ جبکہ پچھتاؤں کی آگ میں سلگتا اشعر احمد۔ تمکین کو اپنی آنکھوں کے سامنے چلتا پھرتا دیکھ کر اس سے دور رہنا ہر گز کسی اذیت سے کم نہیں تھا اس کے لیے مگر پھر بھی وہ یہ اذیت سہہ رہا تھا۔

رخسانہ بیگم' آسیہ بیگم' سمیہ بیگم' فاروق صاحب' سعید صاحب' رضا صاحب سب کے لبوں پر جیسے خاموشی کا قفل لگ گیا تھا۔

اُس روز اشعر رات گئے گھر واپس لوٹا تو رخسانہ بیگم وسیع لاؤنج میں بیٹھیں نہ جانے کیا سوچ رہی تھیں۔ تب وہ تھکے تھکے سے قدم اٹھاتا ان کے قریب چلا آیا۔ پھر اپنا چہرہ ان کی گود میں رکھ کر زمین پر ان کے قدموں میں بیٹھتے ہوئے بولا۔

''آئی ایم سوری مما' میں نے بہت بڑی بھول کی۔ شیزا کے بہکاوے میں آ کر اپنی زندگی کے ساتھ ساتھ دادا جی' دادی مما' سب کی زندگی کے ساتھ کھیل گیا میں' میں کیا کروں مما' میرے لیے کہیں سکون نہیں رہا ہے۔ سب نے مجھ سے نگاہیں پھیر لی ہیں مما۔ میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتا۔ پلیز' پلیز مما۔ تمکین سے کہیں ناں کہ وہ مجھے معاف کر دے اور پھر سے میری زندگی میں چلی آئے.....''

اُس کے الفاظ پر سوچوں میں ڈوبی' رخسانہ بیگم نے چونک کر بے ساختہ اس کے چہرے کی طرف دیکھا' اور ان شفاف آنکھوں میں تیرتے درد کی بے کلی کو دیکھتی ہی رہ گئیں۔

☆☆☆

''کیا بات ہے ازمیر' تم اس طرح سے اٹھ کر باہر کیوں چلے آئے.....؟''

اریشہ ازمیر کے چپ چاپ ٹی وی لاؤنج سے اٹھ کر چلے آنے پر شدید مضطرب ہو کر اس کے پیچھے ہی لان میں چلی آئی تھی' جہاں وہ بے قرار سا' گلاب کی کنج کے پاس کھڑا' آسمان پر ستاروں کے جھرمٹ کو دیکھ رہا تھا۔

''ازمیر' ایک سوال پوچھوں.....؟''

اسے قطعی خاموش پا کر وہ ایک مرتبہ پھر استفہامیہ لہجے میں بولی تھی جب ازمیر نے چپ چاپ اپنا چہرہ اس کی جانب موڑتے ہوئے اپنی مقناطیسی نگاہیں اس کے شفاف چہرے پر گاڑ دیں۔

''ازمیر! شہرین خان میں ایسا کیا ہے' جو تم سائمہ خان جیسی حسین لڑکی کو پا کر بھی اسے بھلا نہیں پائے......؟''

اریشہ خان کا سوال قطعی غیر متوقع اور قدرے معصومانہ تھا' تب ہی ایک دھیمی سی مسکراہٹ ازمیر شاہ کے لبوں کو چھو گئی۔

''تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں اسے بھلا نہیں پایا......؟''

جواب دینے کی بجائے اس نے اپنا سوال اریشہ پر لاد دیا تھا۔ تب وہ نگاہ چرا کر دھیمے لہجے میں بولی۔

''تمہاری ان مقناطیسی نگاہوں کی اداسی نے جو ہر پل ہر لمحے چلا چلا کر یہ کہتی ہیں کہ تم خوش نہیں ہو' ہاں ازمیر شاہ نہیں ہو تم خوش۔ تمہاری حسین آنکھوں کے گوشوں میں آج بھی ایک عجیب سا درد' کنڈلی مارے بیٹھا ہے آج بھی ان لبوں پر کھیلنے والی مسکراہٹوں میں پھیکا پن ہے۔ تم آج بھی اپنی محبت کو کھو دینے کا درد سہہ رہے ہو ازمیر......' اور یہ بات بھی' مجھ سے بہتر بھلا کون سمجھ سکتا ہے۔''

وہ جو کچھ بھی کہہ رہی تھی' بلاشبہ وہ 100 فیصد سچ تھا۔ مگر سچائی کا یہ عکس شہرین خان نہیں بلکہ اریشہ خان کی محبت کا آئینہ دار تھا' جسے وہ چاہ کر بھی اریشہ خان پر نہیں کھول سکتا تھا۔ تب ہی دھیمے سے مسکرا کر بات بدلتے ہوئے بولا۔

''میرے بارے میں اتنا مت سوچا کرو اریشہ' خواہ مخواہ مصیبتوں میں الجھ جاؤ گی تم۔''

''شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو ازمیر' لیکن میں بھی کیا کروں جس طرح آج تک کوئی جھرنوں پر بندش نہیں لگا سکا۔ کرن کا راستہ نہیں روک سکا' بالکل اسی طرح' انسان کو اپنی سوچوں پر بھی اختیار نہیں ہے۔ نہ تو آج تک کسی عدالت میں جذبات پر پہرہ لگا ہے اور نہ ہی کسی دل کی' باغی دھڑکن پر کوئی پابندی عائد ہوئی ہے۔ میں تمہاری فکر کے معاملے میں قطعی لاچار ہوں ازمیر' خواہ تم اسے میری ہمدردی سمجھو یا کچھ اور میں اپنی یہ عادت اور فطرت نہیں بدل سکتی......''

ازمیر کے الجھے ہوئے لہجے کا دو بدو جواب دیتے ہوئے وہ قدرے ایموشنل ہوئی تھی جب ازمیر نے پوچھا۔

''اوکے' لیکن تم اپنی کسی خوشی کا ذکر کر رہی تھیں اریشہ' کیا میں جان سکتا ہوں کہ آج لنچ کے دوران جس شہریار نامی شخص سے ملیں وہ کون تھا......''

کب سے دھڑکنوں میں غوطے کھاتا سوال' بالآخر لبوں پر آ ہی گیا۔ تب اریشہ نے دھیمے سے مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے نرم لہجے میں بتایا۔

''ہاں' میں یہی بات تو تمہیں بتانے جا رہی تھی۔ مگر تم پوری بات سنے بغیر ہی اٹھ کر باہر چلے آئے' خیر میں آج لنچ کے دوران جس شہریار نامی شخص سے ملی' پتہ ہے وہ کون تھے ازمیر......؟''

لمحہ بھر کے لیے رک کر اس نے ازمیر شاہ کی آنکھوں میں دیکھا تھا جہاں اس وقت تجسس کے ساتھ ساتھ ایک عجیب سی الجھن نمایاں تھی تب

ہی وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''پاگل' وہ میرے ڈیڈی تھے۔ مسٹر شہریار جاوید صاحب اور پتہ ہے وہ اس پورے ریسٹوران کے مالک ہیں' جہاں تم مجھے میری پسند سے کھانا کھلانے کے لیے بھی تیار نہیں تھے۔''

اریشہ کا انکشاف اسے شاکڈ کر دینے کے لیے کافی تھا' کیونکہ پچھلے بیس پچیس سال سے انہوں نے ''شاہ ولاج'' کے کسی فرد سے کوئی رابطہ نہیں رکھا تھا۔ محض نورینہ بیگم سے کبھی کبھاران کا رابطہ ہوتا تھا' جو صرف اور صرف اپنی بچیوں کی خیریت سے متعلق ہی ہوتا تھا۔ اس طرح سے ازمیر سمیت شاہ ولاج کے دیگر بچے بھی ان کی شخصیت کے بارے میں کچھ نہیں جان پائے تھے۔

پھر ''شاہ ولاج'' میں انہیں کبھی شہریار جاوید صاحب کا کسی قسم کا کوئی ذکر بھی سننے کو نہیں ملا تھا اور نہ ہی ان کے بزرگوں نے اس موضوع پر کبھی کوئی بات آپس میں کی تھی' جس کے باعث ازمیر شاہ کا حیران رہ جانا' قطعی غیر متوقع نہیں تھا۔ مگر اس کے ساتھ ایک عجیب سا اطمینان بھی اس کے دل کو چھو گیا کہ وہ جس شک کو لے کر اب تک شدید ڈپریس رہا تھا۔ وہ شک اب مٹ گیا تھا۔ تب ہی وہ آسودگی سے مسکراتے ہوئے بولا۔

''یہ تو بہت خوشی کی خبر ہے اریشہ' کیا تم نے نورینہ آنٹی کو اس کے متعلق بتایا......؟''

''نہیں' میں ابھی یہ بات کسی سے بھی شیئر نہیں کرنا چاہتی ازمیر' کیونکہ اس گھر میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو بچھڑے دلوں کو ملتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے' سو پہلے میں اس موضوع پر مما کے ساتھ تفصیل سے بات کروں گی پھر پاپا سے کہوں گی کہ وہ آکر ہمیں یہاں سے اپنے گھر لے جائیں......''

''وہاٹ...... آئی مین' کیا تم شاہ ولاج کو چھوڑ کر چلی جاؤ گی......؟''

یہ سوال بالکل بے ساختگی کے عالم میں اس کے لبوں سے پھسلا تھا جس کے جواب میں اریشہ خان قدرے اداسی سے بولی۔

''مجھے کہاں جانا ہے ازمیر۔ سال دو سال کے لیے میں پاپا کے ساتھ اپنے گھر چلی بھی جاؤں تو کیا ہوا؟ واپس لوٹ کر تو مجھے اسی گھر میں آنا ہے ازمیر' یہیں اسی گھر میں اذہان اور فرزانہ آنٹی کے ساتھ زندگی بسر کرنا ہے مجھے......''

اس کا لہجہ قطعی اداس تھا۔ مگر اس کے مقابل کھڑا ازمیر شاہ اس اداسی کو نہیں پہچان پایا۔ تب ہی دل میں اٹھتے درد کو دبا کر لب کاٹتے ہوئے بولا۔

''اذہان اچھا لڑکا ہے اریشہ' یقیناً وہ تمہیں بہت خوش رکھے گا......''

''خدا کرے' ایسا ہی ہو ازمیر' بہرحال میں اب چلتی ہوں' رات بہت ہو گئی ہے' یوں بھی کوئی اس طرف نکل آیا تو نیا اسکینڈل بن جائے گا ہمارا......''

وہ اس تکلیف دہ موضوع پر ازمیر سے زیادہ لمبی بات نہیں کر سکتی تھی' تب ہی گفتگو سمیٹ کر واپسی کے لیے پلٹی تو ازمیر کی صدا نے اس کے آگے کو اٹھتے قدم روک لیے۔

''کیا تم اس اسکینڈل سے ڈرتی ہو اریشہ......؟'' بڑا عجیب سا سوال تھا اس کا۔

''بولو.....ان لوگوں کے جھوٹے بہتانوں کا خوف کھاتی ہو تم.....؟''

ازمیر نے اپنا سوال جاری رکھا تھا۔ مگر اریشہ اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں دے پائی تو وہ لان سے قدرے فاصلے پر ڈرائیووے کے ایک طرف کھڑی اپنی گاڑی کی طرف بڑھا اور اس میں سے ایک بڑا سا پیکٹ نکال کر اریشہ کے قریب چلا آیا۔

''یہ لو اریشہ' تمہاری امانت تھی یہ میرے پاس.....''

''میری امانت.....؟'' اریشہ نے چونک کر بھنویں اچکائی تھیں جب وہ اپنی مقناطیسی نگاہیں اس کے شفاف چہرے پر جماتے ہوئے بولا۔

''ہاں' تمہاری امانت' لو سنبھالو اسے۔''

''مگر یہ ہے کیا.....؟''

عجیب حیرانگی سے پیکٹ کو تھامتے ہوئے اس نے پوچھا تو ازمیر نے اپنی نگاہ اس کے چہرے سے ہٹالی۔

''پتہ نہیں' کھول کر دیکھ لو۔'' کندھے اُچکا کر اس نے قطعی لاعلمی کا اظہار کیا تو مجبوراً اریشہ وہ پیکٹ تھام کر وہیں زمین پر بیٹھ گئی اور اسے چاک کرنے لگی جبکہ ازمیر شاہ اسے اس کام میں منہمک دیکھ کر دلچسپی سے مسکراتے ہوئے وہیں اس کے مقابل زمین پر بیٹھ گیا۔

''ارے' یہ سب کیا ہے ازمیر.....؟''

پیکٹ کو چاک کرنے کے بعد وہ اس میں موجود اشیاء پر ایک بھرپور نظر ڈالنے کے ساتھ مقابل بیٹھے ازمیر شاہ سے مخاطب ہوئی تو وہ دھیمے سے مسکرا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''کیا ہے؟ یہ خوب صورت ہری ہری چوڑیاں ہیں' جو تمہاری ان خوب صورت کلائیوں میں بہت جچیں گی اریشہ اور یہ ایک نفیس سا بریسلٹ ہے۔ ہے تو سونے کا' مگر تم اسے پہنو گی تو اس کی مالیت اور خوب صورتی ہیروں سے بڑھ جائے گی اور اس کے بعد یہ پرپل ڈریس ہے' جو آج شاپنگ کے دوران تمہاری نگاہوں میں خوب جچا تھا۔ مگر تم اس وقت مجھے سائلہ خان میں محو دیکھ کر اس کی خوب صورتی کو نظر انداز کر گئیں۔ حالانکہ یہ اس ڈریس کے ساتھ کھلی زیادتی تھی۔ مگر تم تو اب اس عادت میں پکی ہوگئی ہو اریشہ' تمہیں اب بھلا یہ احساس چھو بھی کیسے سکتا ہے کہ کوئی چیز اگر نظر میں جچ جائے اور دل کو بھا جائے تو اس سے دستبردار نہیں ہوا کرتے.....''

ایک ایک چیز کو ہاتھ میں اٹھا کر اریشہ کے سامنے کرتے ہوئے' وہ خاصے گہرے انداز میں بولا تھا جب اریشہ کی آنکھیں' نمکین پانیوں سے جھلملا گئیں۔

''ارے' یہ آنسو کس خوشی میں بھئی.....؟''

وہ اس کی پلکیں بھیگتے دیکھ کر قدرے چونک گیا تھا۔ تب وہ سرعت سے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے قدرے بوجھل لہجے میں بولی۔

''اس کی کیا ضرورت تھی ازمیر' تم نے بے کار مجھ پر اپنے پیسے ضائع کیے۔''

''ہاں' مگر یہ حماقت تو میں بیشتر مرتبہ کر چکا ہوں' پھر آج ان پلکوں کے بھیگنے کی وجہ؟''

اس کی بھیگی" پلکوں کو بغور دیکھتے ہوئے قدرے تیکھے لہجے میں بولا تو اریشہ چونک کر اسے دیکھتی رہ گئی پھر بمشکل اس کی مقناطیسی نگاہوں سے اپنی نظر چراتے ہوئے بولی۔

"پہلے کی بات اور تھی ازمیر! اب تم پر صرف سائرہ خان کا حق ہے۔"

"اچھا! مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا۔" اس نے بھرپور انجان بننے کی ایکٹنگ کی تھی۔

"تم اتنے معصوم نہیں ہو ازمیر۔" اریشہ جل ہی تو گئی اس کی اس ادا پر تب ہی وہ کھلکھلاتے ہوئے بولا۔

"میں کیا ہوں' کچھ خبر نہیں' مگر تم بہت معصوم ہو اریشہ! اے کاش کہ میں اذہان ہوتا' تو تمہاری آنکھ سے ایک ایک آنسو چن کر تمہیں ہر دکھ کے لیے ترسا دیتا۔"

پتہ نہیں وہ اپنے آپ سے کہہ رہا تھا یا اریشہ سے' مگر اریشہ کو اس کے یہ الفاظ عجیب ضرور لگے

"پاگل لڑکی! میں آج بھی صرف تمہاری وجہ سے شاپنگ کے لیے گیا تھا کیونکہ ہمیشہ کے لیے ان فضاؤں کو الوداع کہنے سے قبل میں اپنی زندگی کا زیادہ سے زیادہ وقت تمہاری رفاقت میں گزارنا چاہتا ہوں اریشہ۔

آج مجھے سائرہ خان کے قریب دیکھ کر' تم نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ میں تمہاری طرف سے غافل ہو سکتا ہوں۔ ہرگز نہیں' میں تو تمہاری آنکھ میں لرزتے آنسوؤں اور چہرے پر پھیلی بے کلی کا لطف لے رہا تھا..... اور تم سمجھ بیٹھیں کہ میں تمہارے وجود کی اہمیت سے لاتعلق ہو گیا۔ کس قدر مضحکہ خیز تصور ہے یہ......"

وہ ہنس رہا تھا اور اریشہ گم صم سے انداز میں اسے کھلکھلاتے ہوئے دیکھ رہی تھی' جب اچانک کسی کے قدموں کی آواز ان کے قریب پہنچی' اور وہ دونوں اپنی جگہ چونک کر لان سے ملحقہ برآمدے کی طرف دیکھنے لگے۔

☆☆☆

گاڑی کی ہیڈ لائٹس جونہی انجشاء کے چہرے پر پڑیں۔ اس نے سرعت سے اپنا منہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ کاش زمین پھٹتی اور وہ اس میں سما جاتی۔ کتنے بھیانک لمحے تھے اس کی زندگی کے' جو بالآخر گزر گئے تھے۔ وہ زندگی میں کبھی کسی لمحے سے خوف زدہ نہیں ہوئی تھی، لیکن ابھی ابھی جو حالات اسے درپیش آئے۔ ان خوفناک لمحات میں یہ عقدہ اس پر اچھی طرح سے کھل گیا تھا کہ عورت خواہ کتنی ہی مضبوط' ویل ایجوکیٹڈ، ذہین، اعلیٰ حسب نسب کی مالک اور قابل کیوں نہ ہو' اگر وہ مردوں کے اس معاشرے میں اکیلی ہے تو اس کی کوئی زندگی' کوئی حفاظت نہیں ہے۔

مرد کے بغیر رہنے والی اکیلی عورت کو ہر پرایا مرد' تر نوالہ سمجھ کر نگلنے کی کوشش کرتا ہے۔ آج سے قبل اس کی نظر میں عدنان رؤف' دنیا کا سب سے قابل نفرت اور اوباش شخص تھا۔ مگر آج ابھی کچھ لمحات پہلے اس نے جس مکروہ انسان کا بھیانک چہرہ دیکھا تھا۔ اس کے بعد اس کے دل میں موجود' عدنان رؤف کے لیے بے تحاشا نفرت میں بہت حد تک کمی آ گئی تھی۔

وہ اب بھی دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے بیٹھی تھی' جب اس کے قریب کھڑی گاڑی میں سے ایک ہینڈسم سا خوبرو اور خوش لباس شخص' نپے تلے قدم اٹھاتا اس کے قریب چلا آیا۔

''ایکسکیوزمی' آر یو آل رائٹ......؟''

انتہائی مدبر لہجے میں اس نے پوچھا تھا۔ مگر انجشاء نے اپنے ہاتھ چہرے سے نہیں ہٹائے۔ تب وہ دوبارہ بولا۔

''ہیلو محترمہ' آپ ٹھیک تو ہیں......؟''

اب کے انجشاء چاہنے کے باوجود اس سے لاتعلق نہیں رہ سکی' تب ہی دھیرے سے ہاتھ ہٹا کر آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

''ہاں میں ٹھیک ہوں......''

''لیکن آپ اتنی رات کو یہاں ویرانے میں کیا کر رہی تھیں' اور وہ شخص کون تھا' جو ابھی یہاں سے بھاگا ہے......؟''

انجشاء نے پل کے پل نگاہ اٹھا کر اپنے مقابل بیٹھے' اس خوبرو سے نوجوان پر ایک نظر ڈالی' پھر دوبارہ سر جھکا کر دھیمے لہجے میں بولی۔

''میں اپنے راستے سے بھٹک گئی تھی' تب ہی وہ آوارہ شخص میرے پیچھے لگ گیا......''

''او آئی سی' لیکن راستے سے بھٹک جانے والے' اکثر منزل کو کھو دیتے ہیں مس شاہ......''

اب کے انجشاء چونک کر اس کی سمت تکنے لگی تھی' تب ہی وہ دھیمے سے مسکراتے ہوئے بولا۔

''آیئے' میں آپ کو آپ کے گھر تک ڈراپ کر دیتا ہوں......''

''نہیں' میں چلی جاؤں گی......''

اس کا دل ابھی تک بری طرح سے دھڑک رہا تھا لہٰذا وہ اس اجنبی پر اتنی جلدی اعتبار نہیں کر سکتی تھی۔ تب وہ سرسری سی ایک نظر' اس کے بے حال حلیے پر ڈالنے کے بعد نگاہ پھیرتے ہوئے بولا۔

''کیا آپ پھر سے خطرہ مول لینا چاہتی ہیں......؟''

اس کے لفظوں میں کچھ ایسا تھا کہ انجشاء چاہ کر بھی اسے ٹال نہیں پائی' نتیجتاً اگلے کچھ ہی لمحوں میں وہ اس کے ساتھ گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی۔

''میرا خیال ہے آپ نے ابھی تک مجھے پہچانا نہیں مس شاہ......''

کچھ پل خاموشی کی نذر کرنے کے بعد وہ انتہائی سلو ڈرائیونگ کرتے ہوئے بولا۔تو انجشاء ایک مرتبہ پھر چونک کر اس کے خوب صورت چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔

کمال ہے' میں تو آپ کو بہت حاضر جواب بہت ذہین سمجھتا تھا' لیکن آپ تو بہت کُند ذہن ثابت ہوئیں۔''

وہ اس کی خاموشی سے لطف اٹھا رہا تھا۔جب انجشاء کے لب دھیرے سے وا ہوئے۔

''آپ کیا کہنے کی کوشش کر رہے ہیں' میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔''

''کیسے آئے گا مس شاہ' آپ ذہن پر زور ڈالیں گی تو کچھ یاد آئے گا ناں......''

''لیکن میں نے آج سے پہلے آپ کو کبھی نہیں دیکھا' پھر آپ مجھے کیسے جانتے ہیں؟''

اُس کے الجھے لہجے پر قریب بیٹھے اس خوبرو سے نوجوان نے بڑا بے ساختہ قہقہہ لگایا تھا۔

''آپ غالباً کچھ بھول رہی ہیں مس شاہ۔ کیونکہ اگر آپ تھوڑا سا ذہن پر زور ڈالیں تو یقیناً آپ کو یاد آ جائے گا کہ آج سے کچھ عرصہ پہلے جب آپ مجتبیٰ احمد صاحب کے ہاں جاب کرتی تھیں تو آپ کے آفس سے باہر ہم چار دوستوں یعنی عدی' مومن' ندیم اور شاہد کا پورا گینگ کھڑا ہوتا تھا۔ ہر روز آپ کی راہ تکنا' آپ کو تنگ کرنا اور آپ پر مختلف کمنٹس پاس کرنا۔ ہمارا محبوب مشغلہ تھا لیکن اب تو پورا نقشہ ہی بدل چکا ہے۔''

اس کے ازحد چونکا دینے والے انکشاف پر' انجشاء احمر انگشت بدنداں رہ گئی۔

''کیوں' حیران رہ گئیں ناں آپ۔ ویسے اب ہم لوگ کافی سدھر چکے ہیں مس شاہ! اس لیے آپ کو مجھ سے لفٹ لینے پر پریشان نہیں ہونا چاہیے۔''

وہ بولنے کا بے حد شوقین معلوم ہوتا تھا۔مگر انجشاء نے آج سے پہلے کبھی اسے اتنی توجہ سے نہیں دیکھا تھا۔تب ہی اس کی حیرانگی بجا تھی۔

''آپ کو ایک انتہائی دلچسپ بات سناؤں مس شاہ......؟''

انتہائی فرینکلی لہجے میں اگلے ہی لمحے اس نے پھر سوال پوچھا تھا۔ جواب میں گم صم بیٹھی' انجشاء احمر نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''آپ کو یاد ہے ہمارے گروپ کا ہیرو عدی' جو آپ کو بہت تیز کرتا تھا' بہت ستاتا تھا' جس کا یہ کہنا تھا کہ دنیا کی ہر لڑکی موم کی گڑیا ہے۔ ذرا ہاتھ میں لو فوراً پگھل جائے گی۔ اس نے آپ کو لے کر ہمارے ساتھ کتنا عجیب کیا......؟''

''کیا کیا......؟''

انجشاء نے فوراً ہی برجستگی سے پوچھا تھا۔ جب وہ دھیمے سے مسکرا کر گہرا سانس فضا کے سپرد کرتے ہوئے بولا۔

''وہ آپ میں بہت انٹریسٹڈ تھا مس شاہ حالانکہ آپ بھی تو ایک عام سی لڑکی ہی تھیں۔ ایک معمولی سی جاب کرنے والی غریب لڑکی اور ایسی لڑکیوں کی اسے ہرگز کوئی کمی نہیں تھی جس طرح لوگ لباس بدلتے ہیں۔ اس طرح سے عدی لڑکیاں بدلتا تھا خود آپ کے بارے میں بھی اس کے نظریات کچھ اچھے نہیں تھے۔ اس کے پاس یہ تصور بھی نہیں تھا کہ کوئی حسین سے حسین تر لڑکی بھی اسے نظر انداز کر سکتی ہے۔ مگر آپ نے جب یہ جرأت مندانہ قدم اٹھایا اور اس کے غرور کو بری طرح سے شکست دی تو وہ جیسے اندر ہی اندر سے ٹوٹ پھوٹ گیا۔ لڑکیاں اس کے لیے کبھی قابل احترام نہیں رہیں وہ ہر لڑکی کو فول بنانے کے بعد ہمارے ساتھ مل کر اس کے جذبات کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ اور اپنے اس کارنامے پر خوش ہوتا تھا۔ مگر آپ کے معاملے میں اس نے ایسا نہیں کیا اور پتہ ہے جب موحم نے آپ کی بے رخی پر عدنان کا دل خوش کرنے کے لیے گھٹیا کمنٹس پیش کیے تو اس نے کیا کیا......؟''

وہ لمحہ بھر کے لیے سانس لینے کو رکا تھا جب شاکڈ بیٹھی انجشاء نے ایک مرتبہ پھر دھیرے سے نفی میں سر ہلا دیا۔

''اس نے آپ کے لئے موحم کو زبردست تھپڑ رسید کر دیا، آپ نہیں جانتیں مس شاہ کہ ہم دوستوں کا آپس میں کتنا پیار ہے۔ ہم ایک دوسرے کو کانٹا چبھنا بھی گوارہ نہیں کرتے تھے، لیکن آپ کی عزت کے لئے موحم کے گال پر پڑنے والے تھپڑ نے ہم پر آسانی سے یہ بھید کھول کر رکھ دیا کہ آپ کے معاملے میں ہمارا دوست فلرٹ نہیں ہے۔ خیر رات گئی بات گئی، لیکن آپ کو یہ جان کر شاید افسوس ہو مس شاہ کہ ہمارا وہی عدی، جو ہمارے گروپ کی جان تھا، آج ہسپتال کے آئی سی یو میں پڑا زندگی اور موت کی کشمکش میں اپنی جان سے ہاتھ دھو رہا ہے......''

اس کا لہجہ یکلخت ہی خاصا نم ہو گیا تھا، جب خاموش بیٹھی انجشاء احمر نے چپ چاپ اپنا چہرہ کھڑکی کی جانب موڑ لیا۔

''لیجیے، آپ کا مطلوبہ روڈ آ گیا۔''

انجشاء کی مسلسل خاموشی پر ایک مرتبہ پھر شاہ دارسلان نے اپنے لب وا کیے تھے، جب وہ گاڑی کی رفتار دھیمی ہونے پر افسردگی سے بولی۔

''بہت بہت شکریہ ارسلان صاحب۔ آج یقیناً آپ میرے لئے رحمت کا فرشتہ بن کر تشریف لائے، میں آپ کا یہ احسان ہمیشہ یاد رکھوں گی......''

''تھینک یو لیکن احسان کرنے والی پاک ذات تو صرف خدائے بزرگ و برتر کی ہے مس شاہ، بہر حال آپ بُرا نہ مانیں، تو آپ سے ایک سوال پوچھوں۔''

اس کا برجستہ لہجہ قدرے اداسی لئے ہوئے تھا۔ تب ہی انجشاء نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اسکی اجازت پر خوبرو سے شاہ دارسلان نے کچھ لمحوں کیلئے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا پھر سامنے روڈ پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے بولا۔

''عدی بہت اچھا اور خوب صورت لڑکا ہے مس شاہ لیکن اس کے باوجود بھی آپ نے اسے ٹھکرا دیا۔ آخر کیوں؟''

اس کا سوال قطعی غیر متوقع تھا۔ تب ہی انجشاء کی پیشانی پر پسینے کے قطرے جھلملا گئے۔ فوری طور پر اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس سے

کیا کہے۔ تاہم کچھ لمحوں کے توقف کے بعد وہ افسردہ لہجے میں بولی۔

''کچھ لوگ کتنے ہی خوب صورت اور اچھے کیوں نہ ہوں۔ دل کو نہیں چھو پاتے مسٹر ارسلان' اور آپ کے دوست مسٹر عدنان رؤف بھی' ایسے ہی چند لوگوں میں سے ایک ہیں.....''

بے حد تھکا ہوا لہجہ تھا اس کا تاہم اسکے بعد شاہد ارسلان نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا اور وہ چپ چاپ اس کی گاڑی سے نیچے اتر آئی۔

''ونس اگین تھینک یو ویری مچ مسٹر ارسلان' خدا آپ کا حامی و ناصر ہو۔''

وہ اس وقت اسے چائے پلانے کے موڈ میں نہیں تھی۔ لہٰذا قطعی حتمی لہجے میں بولی تو خوبرو سا شاہد ارسلان بھی اسے اپنا خیال رکھنے کی تلقین کرتا واپس لوٹ گیا۔

شب کے تقریباً ساڑھے بارہ ہو رہے تھے' جب وہ تھکے تھکے سے قدم اٹھاتی اپنے فلیٹ میں واپس آئی۔ بے بسی اور اکیلے پن کے احساس نے لمحہ بھر میں ہی اس کی پلکیں بھگو ڈالیں۔ آج اسے اپنی ذات سے وابستہ ایک فرد کی بہت یاد آ رہی تھی۔ وہ پوری رات اس نے رو رو کر آنکھوں میں گزاری تھی اور شاید یہی وجہ تھی کہ صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کا پورا بدن بری طرح سے بخار میں دہک رہا تھا۔

☆☆☆

حادثہ خواہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو' رفتہ رفتہ حالات کی گرد اس کی شدت کو کم کر ہی دیا کرتی ہے۔ سو ''حسن ولاج'' کے مکین بھی کسی حد تک سنبھل گئے تھے' تمکین نے اپنے پاپا مسٹر رضا احمد صاحب کی باقاعدہ اجازت کے بعد انہی کا آفس جوائن کر لیا تھا جبکہ اشعر جیسے اپنے آپ سے لاپروا ہو کر گویا ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گیا۔

اس روز رخسانہ بیگم ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھیں سبزی بنا رہی تھیں۔ جب آسیہ بیگم چائے کے دو گرما گرم کپ لے کر ان کے قریب چلی آئیں۔

''لو آپا' گرما گرم چائے پیو.....''

''ارے..... تم نے خواہ مخواہ تکلیف کی آسیہ میں ابھی چائے پی کر بیٹھی تھی.....''

''تو کیا ہوا' چائے تو ہم پاکستانیوں کا مرغوب مشروب ہے' خواہ دن میں کتنی ہی بار پی لیں دل ہی نہیں بھرتا.....''

''ہاں' بات تو تمہاری بالکل صحیح ہے۔''

آسیہ بیگم کے ہاتھ سے کپ تھام کر وہ دھیمے سے مسکرائی تھیں۔ جب وہ قدرے پر سوچ لہجے میں بولیں۔

''آپا میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہ رہی تھی۔''

''ہاں تو پوچھو ناں' سوچ کیا رہی ہو.....''

چائے کی چسکی لیتے ہوئے انہوں نے پھر مسکرانے کی کوشش کی تھی جب آسیہ بیگم نے گھمبیر لہجے میں ان سے پوچھا۔

''آپا اتنے سال بیت گئے کیا آپ کو کبھی اریج بیٹے کی یاد نہیں آئی.....؟''

ان کا سوال کیا تھا' کوئی آتش فشاں تھا جو رخسانہ بیگم کے عین قریب پھٹا اور وہ جیسے پتھر کی ہو کر رہ گئیں۔

وہ ایک زخم' جو پچھلے 27 سالوں سے ناسور بن کر اندر ہی اندر انہیں ختم کر رہا تھا آج اسی زخم کو قطعی غیر متوقع طور پر آسیہ بیگم نے کھرچ ڈالا تھا۔ تب ہی انہوں نے اپنا سر جھکا لیا۔ آنکھوں میں گرم سیال آنسو بکھرنے کے لیے مچل اٹھے۔ حلق میں جیسے غم کا پھندا سا پھنس گیا۔

''بولئے ناں آپا' کیا زندگی میں کبھی آپ کو اریج بیٹے کی یاد نہیں آئی۔''

انہیں خاموش پا کر آسیہ بیگم نے پھر سے پوچھا تھا۔ جب وہ کانپتے ہوئے لہجے میں بولیں۔

''یاد تو انہیں کیا جاتا ہے آسیہ' جنہیں یہ دل بھول جائے' پھر وہ بدنصیب تو میری سانسوں سے جڑا ہے' جس دن یہ سانسیں رکیں گی' اسی دن وہ بھول پائے گا مجھے۔''

اریج کا تصور ہمیشہ یونہی انہیں آبدیدہ کر دیا تھا۔ دل میں ہلکورے لیتا درد کا طوفان' یونہی بے قرار کر دیا کرتا تھا انہیں' تب ہی تو وہ اس موضوع سے چشم پوشی برتتی تھیں' مگر آج آسیہ بیگم نے ان کا یہ درد پھر سے جگا دیا تھا۔

''آپ کو پلٹ کر اس کی خبر تو لینا چاہیے تھی آپا' کتنی بھی مجبوری ہو' کوئی اپنی سگی اولاد کو اس طرح سے نہیں بھلاتا۔'' آسیہ بیگم کے الفاظ نے ایک مرتبہ پھر ان کے جگر کو کاٹ ڈالا اور وہ بے اختیار رو پڑیں۔

''ہاں' سچ کہتی ہو تم' لیکن میں کیسے خبر رکھتی اس کی؟ میرے پاؤں میں تو مجبوریوں کی بیڑیاں تھیں آسیہ۔ والدین کی نصیحتیں' مجازی خدا کی خوشنودی' ان سب نے باندھ رکھا تھا مجھے' پھر کیسے ملتی رہتی میں اس سے' اور اگر ملتی بھی رہتی تو کیا فائدہ آسیہ' پھر میری جدائی اسے زیادہ زخم دیتی' ناسور بن کر نگل جاتی اس کی خوشیوں کو' اسی لئے تو میں نے اسے خود سے دور کر دیا تا کہ وہ مجھے بھول جائے۔ میرے بغیر زندہ رہنا سیکھ لے......''

ٹپ ٹپ ٹپکتے آنسوؤں نے رخسانہ بیگم کا چہرہ بھگو ڈالا تھا' جبکہ ان کے اس انکشاف پر' تیزی سے لاؤنج میں داخل ہوتی تمکین رضا کے پاؤں وہیں دہلیز سے چپک کر رہ گئے تھے۔ رخسانہ بیگم اشعر کے علاوہ کسی اور شخص کی ماں بھی ہوں گی۔ یہ تو گمان بھی نہیں تھا اسے۔ اور نہ ہی ایسی کوئی بات' اس نے ''حسن ولاج'' کے کسی فرد کے منہ سے سنی تھی۔ تو پھر اب یہ اریج نامی شخص اچانک کہاں سے نکل آیا تھا؟ پوری رات وہ اس چکر میں الجھتی رہی اور بالآخر رات کے آخری پہر میں رخسانہ بیگم سے ساری حقیقت جاننے کا سوچ کر وہ نیند کی وادی میں اتر گئی۔

بچھڑے ہوئے یاروں کی صدا کیوں نہیں آتی
اب روزنِ زنداں سے ہوا کیوں نہیں آتی
اے موسم خوشبو کی طرح روٹھنے والے
پیغام تیرا لے کے صبا کیوں نہیں آتی

پاگل آنکھوں والی لڑکی
اتنے مہنگے خواب نہ دیکھو' تھک جاؤ گی
کانچ سے نازک خواب تمہارے
ٹوٹ گئے تو پچھتاؤ گی
سوچ کا سارا اجلا کندن
ضبط کی راکھ میں گھل جائے گا
کچے پکے رشتوں کی' شبنم کا ریشم کھل جائے گا
تم کیا جانو......؟
خواب سفر کی دھوپ کے تیشے
خواب ادھوری' رات کا دوزخ
خواب خیالوں کا پچھتاوا
خوابوں کا حاصل تنہائی
تم کیا جانو......؟
مہنگے خواب خریدنا ہوں تو......
آنکھیں بیچنا پڑتی ہیں یا......رشتے بھولنے پڑتے ہیں
اندیشوں کی ریت نہ پھانکو
پیاس کی اوٹ سراب نہ جھانکو
اتنے مہنگے خواب نہ دیکھو' تھک جاؤ گی!

صبح صادق کا وقت تھا اور دور کسی مسجد میں مؤذن انتہائی پرسحر انداز میں اذان دے رہا تھا۔

تمکین ابھی ابھی گہری نیند سے جاگی تھی۔ اس وقت فضا میں گونجتے اذان کے مقدس الفاظ اس کی روح کو ایک عجیب سا سکون بخش رہے تھے اور وہ خاموش لیٹی انتہائی دلچسپی کے ساتھ انہیں سن رہی تھی۔

صبح صادق' مسجدوں میں گونجتے اذان کے مقدس کلمات' صبح کے وقت کو کتنا سہانا اور پرکیف بنا دیتے ہیں' آج سے پہلے اسے اس بات کا احساس نہیں تھا اور شاید یہی وجہ تھی کہ آج سے قبل وہ کبھی اتنی جلدی بیدار بھی نہیں ہوئی تھی۔

مگر آج سچویشن کچھ اور تھی' ابھی تقریباً ڈیڑھ گھنٹے پہلے اس کی آنکھ لگی تھی لیکن ابھی ابھی وہ پھر سے بیدار ہو گئی تھی۔ تب ہی تو اذان کے پرسحر کلمات سننے کا اعزاز سمیٹ پائی تھی۔

رات بھر سے جاگتی سرخ آنکھوں میں عجیب سی جلن کا احساس ہو رہا تھا۔ سر الگ بھاری بھاری ہو رہا تھا۔ تب تھوڑی سی ہمت کر کے وہ اپنے بستر سے اٹھی اور واش روم کی طرف بڑھ گئی۔ ٹھنڈے یخ پانی سے وضو کرنے کے بعد جائے نماز پر آ کر کھڑی ہوئی تو ایک عجیب سا سکون اس کی روح میں اتر گیا۔ نماز اور قرآن پاک کی تلاوت سے فارغ ہونے کے بعد وہ رخسانہ بیگم کے کمرے کی طرف آئی تو اس کا دل معمول سے کہیں تیز دھڑک رہا تھا۔

سعید صاحب مارننگ واک کے لیے کمرے سے باہر نکل چکے تھے۔ جبکہ رخسانہ بیگم دھیمی آواز میں قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھیں۔ تب وہ خاموشی سے چلتی ہوئی ان کے بالکل قریب جا بیٹھی' خوبصورت چہرے پر نور کے ہالے بکھر رہے تھے' تاہم انہیں جیسے ہی تمکین کے وجود کا احساس ہوا' انہوں نے قرآن پاک سے نگاہ ہٹا کر فقط ایک نظر اس کے بے قرار چہرے پر ڈالی پھر اگلے کچھ ہی لمحوں میں' قرآن پاک لپیٹ کر اوپر الماری میں رکھتے ہوئے وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

''کیا بات ہے تمی بیٹے' آج آپ صبح ہی صبح میرے کمرے میں......؟''

دائیں ہاتھ سے اس کے بکھرے بالوں کو شفقت سے سمیٹتے ہوئے انہوں نے پوچھا تھا۔ ان کے پرنور چہرے کو تکتے ہوئے وہ سرگوشیانہ لہجے میں بلاتمہید بولی۔

''بڑی ماں' یہ اریج احمر کون ہے اور آپ کا اس سے کیا رشتہ ہے؟''

اس کا انداز ایسا تھا گویا وہ ان کی زندگی کے بارے میں سب کچھ جانتی ہو' سرخ متورم آنکھوں میں جہاں حد درجہ اضطراب تھا' وہیں استفہامیہ لہجے میں ایک عجیب سا ضدی پن بھی جھلک رہا تھا۔ تب ہی شاکڈ سی رخسانہ بیگم اس کی طرف سے نگاہ پھیر گئیں۔

''ت......تم کیسے جانتی ہو اریج کو......؟''

انتہائی کمزور لہجے میں انہوں نے پوچھا تھا۔ جب وہ دھیمے لہجے میں آہستگی سے بولی۔

''میں نے کل آپ کے اور مما کے مابین ہونے والی ساری گفتگو سن لی ہے۔ بڑی ماں' پلیز مجھے بتایئے کہ اریج احمر سے آپ کا کیا رشتہ ہے پلیز.......''

اب کے اس کے لہجے میں قطعیت تھی۔ تب ہی وہ اس سے کچھ چھپا نہ سکیں اور نگاہیں جھکا کر دھیمے لہجے میں بولیں۔

''اریج میرا بیٹا ہے تمکین' میرے جگر کا ٹکڑا' جب اس کے پاپا کا انتقال ہوا' تب وہ بمشکل پانچ چھ سال کا تھا' میں اس بدنصیب کو اپنے کلیجے سے لگا کر پالنا چاہتی تھی' مگر میرے والدین نے میری ایک نہ چلنے دی' اور میری آئندہ زندگی میں پیش آنے والی مصیبتوں کے خوف سے' میرے لاکھ احتجاج کے باوجود انہوں نے مجھے' تمہارے بڑے پاپا سے دوسری شادی کرنے پر مجبور کر دیا۔ تمہارے بڑے پاپا میرے والد کے عزیز دوست کے ہونہار بیٹے تھے۔ انہوں نے کسی تقریب میں مجھے دیکھا اور پسند کر لیا۔ یوں جب تمہارے دادا جی' میرا ہاتھ مانگنے میرے والد کے پاس آئے تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا مگر اس کے باوجود میرے اصرار پر انہوں نے تمہارے دادا اور بڑے پاپا کے سامنے میری زندگی کی ساری حقیقت کھول کر رکھ دی' جسے تمہارے بڑے پاپا نے خندہ پیشانی سے قبول کر لیا' اور اس شرط پر کہ ان سے شادی کے بعد میں اپنے پہلے بچے سے کوئی رابطہ نہیں رکھوں گی' انہوں نے مجھے اپنی زندگی میں شامل کر لیا۔ میں بہت روئی تھی' بہت مچلی تھی' مگر میرے پاپا نے میری ایک نہیں سنی اور میرے اریج کو پھولوں کی مانند پالنے کا وعدہ کر کے مجھے سعید صاحب کی زندگی کا حصہ بنا دیا۔ یوں سعید صاحب' مجھے میرے بچے کی طرف سے غافل کرنے کے لیے شادی کے فقط دو تین ماہ کے بعد ہی برطانیہ لے آئے اور یہاں آ کر میں پہلے سے زیادہ لاچار ہو کر رہ گئی بیٹے' رات میں آسمان پر جگمگاتے تاروں اور دن میں چلتی خنک ہواؤں کے ذریعے میں نے کروڑوں پیغام اور اپنے بیٹے کی لمبی عمر اور ڈھیروں خوشیوں کی لاکھوں دعائیں' اپنے وطن بھیجیں' جہاں میرے والدین' میرے بیٹے کو پھولوں کی طرح پروان چڑھا رہے تھے۔ مگر میں زندگی کی بے رحمیوں سے قطعی بے خبر تھی۔ مجھے گمان ہی نہ ہو سکا کہ میرے والدین کی وفات کے بعد میرے بھائی اور بھابیاں میرے بچے کے ساتھ کیسا سلوک کر رہے ہیں؟ وہ جو نازوں میں پلا تھا' مرادوں سے پیدا ہوا تھا' اس کے ساتھ' میرے اپنے کیا کر رہے ہیں؟ میں کچھ نہیں جان پائی تمی' کچھ نہیں جان پائی میں......''

رخسانہ بیگم کی آواز کپکپا رہی تھی' مگر ان کے لب خاموش نہیں ہوئے' تھوڑے سے توقف کے بعد وہ پھر بولیں۔

''سوچا تھا کہ زندگی میں جب بھی پاکستان آنا ہوا' اس کی بدلتی رتوں اور حسین موسموں سے' اپنے بیٹے کی زندگی کے ایک ایک دن کا حساب لوں گی' مگر افسوس، صد افسوس تمی، کہ جب مجھے پاکستان کی سرزمین دیکھنے کا شرف حاصل ہوا تب میرا اریج اس وطن کو چھوڑ کر کہیں دور چلا گیا۔ بہت دور۔ میں نے بہت کوشش کی اسے ڈھونڈنے کی مگر وہ نہ ملا، بھیا وغیرہ بھی تھوڑے ہی عرصے کے بعد، یہاں سے دوبئی شفٹ ہو گئے اور یوں میں نے ہمیشہ کے لیے اپنے اریج کو کھو دیا تمی۔''

رخسانہ بیگم کی آنکھیں لبالب آنسوؤں سے بھر آئی تھیں۔ جب وہ تمکین رضا کے کندھے سے لگ کر سسک پڑیں۔

''میں ہر گزرتے دن کے ساتھ بکھر رہی ہوں بیٹے' تنہائیوں اور اذیتوں کی تاریک قبر میں اتر رہی ہوں۔ اپنے جگر کے ٹکڑے کی صرف ایک جھلک دیکھنے کے لیے مچل رہی ہوں' تم ہی بتاؤ' میں کیا کروں تمی؟ کہاں ڈھونڈوں اسے' نجانے کہاں کھو گیا ہے وہ۔ میں یہ آنکھیں ہمیشہ کے

لیے بند ہونے سے پہلے اسے فقط ایک نظر دیکھنا چاہتی ہوں بیٹے' اسے اپنے سینے سے لگا کر' جی بھر کر آنسو بہانا چاہتی ہوں' مگر کہاں تلاش کروں اسے کہ اس نے تو اپنا کوئی نام و نشان ہی نہیں چھوڑا۔''

رخسانہ بیگم کے لہجے میں گہرا درد تھا اوران کے ہاتھ کپکپا رہے تھے جب تمکین نے تیزی سے ان کے سرد پڑتے ہاتھ اپنے گرم ہاتھوں میں لے لیے' اور عین اسی پل' کمرے کی دہلیز کے باہر کھڑے نڈھال سے اشعر احمد پر گویا ایک اور بجلی گر پڑی۔

وہ سادہ اور پرشفیق عورت کہ جنہیں وہ محض اپنی کل کائنات سمجھتا تھا' وہ اس کے علاوہ کسی اور کی مما بھی ہوسکتی ہیں' یہ تصور بھی نہیں تھا ان کے پاس' محبت کی تقسیم اس کی جذباتی فطرت کے لیے' ایک نہایت تکلیف دہ عذاب سے کم ہرگز نہیں تھی' وہ جس سے بھی امیج تھا' اس کی محبت' اس کی تمام تر توجہ' صرف اور صرف اپنا حق سمجھتا تھا' ایک ایسی جائیداد کی مانند کہ جسے کسی اور کے ساتھ شیئر کرنا' اس کی موت کے مترادف تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ تمکین کو اریج احمر کے ساتھ شیئر نہیں کر پایا تھا' بلکہ انتہائی جذباتی قدم اٹھاتے ہوئے اسے خود سے ہمیشہ کے لیے دور کر دیا تھا۔ حالانکہ یہ بھی کسی قیامت سے کم ہرگز نہیں تھا مگر پھر بھی اس نے یہ کیا' اور اب زندگی ایک مرتبہ پھر اس سے ایسا ہی ایک اور امتحان لینے جارہی تھی اور وہ درد کی شدت سے نڈھال بکھر رہا تھا۔ یہ انکشاف اس کے لیے اتنا حیران کن اور تکلیف دہ تھا کہ پوری رات وہ ٹوٹنے بکھرنے اور تڑپنے کے بعد بالآخر تیز بخار کی لپیٹ میں آ گیا۔ کمزوری تو پہلے ہی بہت تھی' اب اتنے تیز بخار کی شدت نے اسے بالکل ہی لاچار بنا کر رکھ دیا۔ ''حسن ولاج'' کے مکین جواب تک اس سے شدید خفا تھے' اب یوں اچانک ہی اسے خطرے میں پا کر جیسے تڑپ اٹھے تھے۔

رخسانہ بیگم' آسیہ بیگم' سعید صاحب' فاروق صاحب' رضا صاحب' عاشر اور خود تمکین کے لب' اس کی سلامتی اور صحت مندی کی دعائیں مانگتے نہ تھک رہے تھے۔ لاکھ وہ خطاوار تھا' مگر تھا تو ان کا عزیز ان کی زندگی کا ایک حصہ' لہٰذا وہ کیسے اس کے لئے پریشان نہ ہوتے' اور شاید یہ ان کی دعاؤں کا اثر ہی تھا کہ بخار اشعر کے دماغ پر نہیں چڑھا اور اگلے دو تین روز میں اس کی شدت کس حد تک کم ہوگئی۔

تمکین اس روز' اس سے ملنے کے لئے ہسپتال آئی تو وہ سکون سے گہری نیند سو رہا تھا۔ تب ہی اس نے اشعر کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اسے کچھ دیر خاموش نگاہوں سے دیکھنے کے بعد وہ آہستگی سے اٹھ کر اس کے کمرے سے باہر نکل آئی' سامنے طویل راہداری' قدرے سنسان پڑی تھی۔

بالکل اس کے دیوانے دل کی مانند' گو اس نے اپنی زندگی سے سمجھوتہ کر لیا تھا' ہر وقت بہتے آنسوؤں پر بھی اس نے کڑے بند باندھ ڈالے تھے لیکن پھر بھی وہ مضطرب تھی' اشعر کے بغیر جیسے زندگی میں کوئی چارم نہیں رہا تھا۔ وجہ خواہ کچھ بھی رہی ہو' مگر اس کے لیے اشعر کو کھو دینا' ہرگز کسی تکلیف سے کم نہیں تھا' اور اس وقت بھی وہ ایسی ہی تکلیف میں بے حال تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی کہ اچانک ہی سامنے سے آتے ایک خوبرو سے نوجوان لڑکے سے بری طرح ٹکرا گئی۔

''ارے تمکین جی آپ......'' وہ جو کوئی بھی تھا اسے پہچان کر ٹھٹک گیا تھا جبکہ تمکین اب بھی حیرانگی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

''ازمیر' اریشہ تم لوگ یہاں اتنی رات گئے تک کیا کر رہے ہو؟''

وہ دونوں پریشان نگاہوں سے برآمدے کی طرف دیکھ رہے تھے جب صالحہ بھابھی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتیں ان کے بالکل قریب چلی آئیں۔ ازمیر نے صالحہ بھابھی کو دیکھ کر سکون کا سانس لیا تھا' کیونکہ اگر اس وقت فرزانہ بیگم یا ماہم شاہ وہاں چلی آتیں تو ان دونوں کے لیے بہت برا ہوتا۔ تب ہی وہ سکون سے گہری سانس فضا کے سپرد کرتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

''کچھ نہیں بھابھی' کل مجھے انگلینڈ کے لیے فلائی کر جانا ہے تو جانے سے پہلے یونہی کچھ وقت اریشہ کے ساتھ گزارنا چاہ رہا تھا۔ میری بہت اچھی دوست ہے نا۔''

''او کے' لیکن رات بہت ہوگئی ہے' اب تم لوگ اٹھو یہاں سے' ورنہ ابھی مما یا کسی اور کی آنکھ کھل گئی تو خواہ مخواہ ہزار باتیں بن جائیں گی۔''

ازمیر شاہ کے لہجے پر وہ ایک بھرپور نگاہ اریشہ کی گود میں بکھری چیزوں پر ڈالتے ہوئے تیز لہجے میں بولیں تو پریشان سی اریشہ خان فوراً اپنی چیزیں سمیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''او کے اریشہ اپنا خیال رکھنا' اور خوش رہو۔''

مسرور سے ازمیر شاہ نے بھی فوراً ہی کھڑے ہو کر بہت اپنائیت سے اسے کہا تھا جب وہ دھیرے سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی صالحہ بھابھی کے ساتھ ہی اپنے کمرے کی طرف چلی آئی۔

''ٹھہرو اریشہ' مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔''

اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ دروازہ بند کرنا ہی چاہتی تھی جب صالحہ بھابھی کی تیز آواز نے فوراً اس کے ہاتھ وہیں روک دیئے۔

''آیئے' پلیز بیٹھیے۔''

دل میں اودھم مچاتی دھڑکنوں پر بمشکل قابو پاتے اس نے انتہائی مدھم لہجے میں کہا اور دروازے کے ایک طرف ہو کر انہیں اندر آنے کا راستہ دیا۔

''کہیے بھابھی' کیا کہنا چاہتی ہیں آپ......؟''

انہیں کافی دیر تک خاموش پا کر' بالآخر اریشہ نے ہی لب کھولے تھے' جب وہ کھوجتی نگاہوں سے اس کے اداس چہرے کو دیکھتے ہوئے بولیں۔

''مما بہت جلد تمہاری اور اذہان کی شادی ارینج کرنا چاہتی ہیں اریشہ' کیا تم اس کے لیے تیار ہو؟''

''وہاٹ' آپ کیا کہنا چاہتی ہیں بھابھی' میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔''

دل جہاں یک بارگی ہی زور سے دھڑکا تھا وہیں ہاتھ پاؤں بھی کپکپا اٹھے تھے' تب بمشکل اپنا بھرم رکھتی وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی تھی۔

''ارے میں نے ایسا تو کچھ نہیں کہا کہ تم اس طرح سے گھبرا جاؤ' میں تو صرف یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ عنقریب تم اذہان احمد شاہ کی زندگی کا حصہ بننے والی ہو سو اپنے آپ کو اس کے لیے تیار کرنا شروع کر دو' کیونکہ دوسروں کے نصیب پر حاوی ہونے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا اریشہ' از میراب سائلہ کی زندگی کا حصہ ہے' بہتر ہے تم اس کی رفاقت کے خواب نہ ہی دیکھو' کیونکہ سہانے خواب دیکھنے والی آنکھیں' اکثر خون آلود ہو جایا کرتی ہیں' امید ہے تم میری نصیحت کا پاس ضرور رکھو گی۔ اوکے' اب سو جاؤ' رات بہت ہو گئی ہے۔''

اپنی بات مکمل کر کے' وہ دھیرے سے اس کے گال تھپتھپاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں جبکہ کمرے کے عین وسط میں کھڑی گم صم سی اریشہ خان' نڈھال انداز میں وہیں بیڈ کی پٹی سے ٹیک لگا کر سسک پڑی' بے شک صالحہ بھابھی نے جو کچھ بھی کہا تھا' وہ سو فیصد درست تھا' مگر یہ بھی سچ تھا کہ وہ سائلہ کے حق پر ہرگز ڈاکہ ڈالنے کی خواہشمند نہیں تھی' تب ہی تو رات بھر صالحہ بھابھی کے الفاظ اس کے دل میں چبھتے رہے اور وہ بلک بلک کر روتی رہیں۔

☆☆☆

عدنان اب بھی کومے میں تھا اور ڈاکٹرز کے نزدیک اس کی یہ طویل بے ہوشی' از حد خطرناک تھی۔ بہت دن ہوئے انجشاء اسے ملنے ہسپتال نہیں گئی تھی' پچھلے دنوں ہسپتال میں' اچانک ہی تمکین رضا اسے دکھائی دی تھی اور اس نے برستی آنکھوں کے ساتھ' اپنے اوپر گزرے' جن تکلیف دہ لمحات کا تذکرہ کیا تھا انہیں سن کر وہ مزید ڈسٹرب ہو کر رہ گئی تھی۔

کتنی خوبصورت اور خوشحال زندگی تھی ان کی' جب وہ تمکین' شیزا اور اریشہ' رنگین تتلیوں کی مانند کالج اور یونیورسٹیوں کی بہاروں کے مزے لوٹتے تھے' اس وقت تو انہیں گمان بھی نہیں تھا کہ آنے والا وقت' ان سب کے لیے' اپنے دامن میں کتنے طوفان چھپائے لا رہا ہے' لیکن اب زندگی کے اس دوراہے پر' وہ دونوں فرینڈز ہی دکھ سے نڈھال اپنے اپنے حصے کے آنسو پی رہی تھیں۔

اریشہ کہاں اور کس حال میں تھی' وہ دونوں ہی نہیں جانتی تھیں لیکن شیزا نے دوست ہو کر' جتنا بڑا فریب تمکین رضا کے ساتھ کیا تھا' اس کے بعد انجشاء کے دل میں' یہاں سے وہاں تک شیزا کے لیے نفرت ہی نفرت پھیل گئی تھی۔

اس روز وہ دونوں' ڈنر کے لیے اپنے اپنے آفس سے اٹھ آئی تھیں' ارادہ کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر پرانی یادیں تازہ کرنے کا تھا کہ اچانک تمکین کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔

''تمہیں ایک خوشخبری سناؤں......؟''

انجشاء ڈرائیونگ کر رہی تھی جب تمکین نے مسرور سے انداز میں اپنا ہاتھ اس کے بازو پر رکھتے ہوئے پوچھا جواب میں ایک پھیکی سی مسکراہٹ انجشاء کے لبوں پر بکھر گئی۔

''خوشخبری' اور ہمارے لیے' یہ کیسے ممکن ہے تمی؟''

قدرے بجھا ہوا لہجہ تھا اس کا مگر تمکین کے سرور میں قطعی کوئی فرق نہیں آیا تب ہی وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''ممکن ہے انجشاء پتہ ہے' پچھلے دنوں ہسپتال میں اچانک میری اذہان احمد شاہ سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ اذہان احمد شاہ کو تو جانتی ہوں ناں تم' اریشہ کے ماموں کا بیٹا' جو اکثر اسے یونیورسٹی ڈراپ کرنے آتا تھا' اور اسی بہانے ہم سے بھی گپ شپ ہو جاتی تھی اس کی' یاد ہے ناں تمہیں؟''

تمکین کا لہجہ کافی مسرور تھا' تب ہی حیران سی انجشاء نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا کہ اپنی زندگی کے ان قیمتی لمحوں کو وہ کیسے فراموش کر سکتی تھی۔

''کتنا حیران کن ہے انجشاء کہ وہ اتنے سالوں کے بعد بھی مجھے فوراً پہچان گیا' اور پتہ ہے اریشہ نے اسی کے ساتھ منگنی بھی کروالی۔''

''وہاٹ......لیکن وہ تو ازمیر شاہ میں انٹرسٹڈ تھی ناں۔'' انجشا کو قدرے حیرت ہوئی تھی۔

''ہاں......اس کی باتوں سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا' لیکن سچی بات ہے کہ جوڑی تو اس کی اذہان احمد شاہ کے ساتھ ہی جچتی ہے۔ بہت خوش ہوا تھا وہ مجھ سے مل کر' بتا رہا تھا کہ اریشہ نے بھی ہماری طرح اپنے ماموں کا آفس جوائن کر لیا ہے اور بہت خوش ہے' جبکہ ازمیر شاہ بھی کسی سائنہ نامی لڑکی سے شادی کا پروگرام بنا کر انگلینڈ کے لیے فلائی کر رہا ہے' میں نے اس سے اریشہ کا ہوم ایڈریس اور موبائل نمبر لے لیا ہے' کیا تم اس سے بات کرو گی انجشاء؟''

گفتگو کے دوران اچانک ہی تمکین نے اپنا رخ اس کی طرف پھیرتے ہوئے پوچھا تھا' جواب میں انجشاء نے ایک سرد آہ اداس فضاؤں کے سپرد کرتے ہوئے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''سنو عدنان اب کیسا ہے؟''

تھوڑی دیر خاموشی کے بعد تمکین نے پھر اس سے پوچھا تھا' جواب میں ڈرائیونگ کرتے اس کے خوبصورت ہاتھ دھیرے سے کپکپا گئے۔

''پتہ نہیں' میں نے بہت دنوں سے اسے دیکھا نہیں ہے۔'' بہت آہستگی سے وہ بڑبڑائی تھی جب تمکین نے کہا۔

''تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے انجشاء' وہ جیسا بھی ہے' آخر تمہارا اپنا ہے' ہاں ٹھیک ہے کہ اس نے تمہارے ساتھ بہت غلط کیا' لیکن تم بھی اس کے ساتھ اچھا نہیں کرو گی تو اس میں اور تم میں کیا فرق رہ جائے گا انجشاء......؟ معاف کرنا بہت بڑی نیکی ہوتی ہے تم بھی اسے معاف کر دو' پلیز۔''

وہ اسی کی زبانی سارے حالات جان چکی تھی' تب ہی التجائیہ لہجے میں بولی تو انجشاء نے دھیرے سے سر جھٹک دیا۔

''وہ اس قابل نہیں ہے کہ اسے معاف کر دیا جائے۔''

''اچھا......لیکن تم اس کے ساتھ جو کر رہی ہو' کیا تم گمان رکھتی ہو کہ اس کے بعد خدا تمہیں معاف کر دے گا؟''

تمکین کے تیکھے لہجے پر اس نے چونک کر بڑی حیران نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

''مم' مگر میں نے کیا کیا ہے۔'' بمشکل اس کے لب پھڑپھڑائے تھے' جب تمکین کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بولی۔

''تم اس کا دل دکھا رہی ہو انجو' بیکار میں ماضی کی راکھ کرید کر' اپنی آنے والی خوشیوں سے منہ موڑ رکھا ہے تم نے' ذرا سوچو انجشاء' اگر تمہارے دادا جی زندہ ہوتے' تو کیا وہ تمہارا یہ فیصلہ پسند کرتے؟ کبھی نہیں' وہ کبھی تمہیں عدنان سے علیحدہ نہیں ہونے دیتے۔''

تمکین کی باتوں میں وزن تھا مگر انجشاء نے اس کے الفاظ دل پر نقش نہیں ہونے دیے تب ہی بوجھل سے لہجے میں بولی۔

''وہ میرے داداجی کا قاتل ہے تمکین' اسی نے میرے داداجی کی جان لی ہے' پھر کیسے معاف کردوں میں اسے' بولو؟''

''تم غلط سوچ رہی ہو انجشاء' انسان کے نصیب میں جیسا لکھا ہوتا ہے' ویسا ہی ہو کر رہتا ہے' ہم اس کے لیے کسی انسان کو موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتے۔''

''ہوسکتا ہے تمہاری بات درست ہو' مگر میں اس سے شدید نفرت کرتی ہوں تمکین' تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ مجھے اس کی وجہ سے کتنے دکھ سہنا پڑے ہیں۔''

انجشاء کا لہجہ یکلخت ہی بھیگ گیا تھا' تب تمکین نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے بھی اشعر نے پاش پاش کر ڈالا ہے انجشاء' میرا مان' میرا غرور' میرا بھرم' میری محبت' سب کو مٹی میں ملا دیا ہے اس نے' مگر پھر بھی میں اس سے نفرت نہیں کر پائی دوست' نہیں نکال پائی میں اسے اپنے دل سے' کیونکہ جو دل کے مہمان بن جاتے ہیں' انہیں پھر دل سے نکالا نہیں جاتا۔''

''ہاں' درست کہہ رہی ہو تم' مگر میں نے بھی عدنان کو دل سے نہیں نکالا تھا تمکین' وہ خود چھوڑ کر گیا تھا میرے دل کو' پورے بارہ سال یہ دل ویران رہا ہے تمی' بتاؤ اب کیسے کوئی آباد ہوسکتا ہے اس میں' یہ تو اب اجڑ چکا ہے' ویرانوں نے ڈیرے ڈال لئے ہیں یہاں' پھر کیسے رہ سکتا ہے وہ اب اس میں۔''

اب بھی اس کا لہجہ نم تھا' تب ہی تمکین نے چپ سادھ لی' کیونکہ یہ وہ موضوع تھا کہ جسے جتنا شیئر کرتے اتنا ہی دل زخم زخم ہوتا۔

وہ لوگ قریبی ریسٹورنٹ تک پہنچیں تو گاڑی سے نکلتے ہی انجشاء کے موبائل کی بزر بج اٹھی۔

''ہیلو' انجشاء بیٹی' میں سیال آنٹی بات کر رہی ہوں' پلیز فوراً ہسپتال چلی آؤ' پلیز۔''

موبائل آن کرتے ہی اسے سیال بیگم کی التجاء سنائی دی تھی اور اس کے قدم وہیں پر من من بھر کے ہوگئے۔

☆☆☆

موسم اپنی پچھلی روایت برقرار رکھتے ہوئے ہنوز کافی سرد تھا' تاہم اشعر احمد اب ہسپتال سے گھر واپس آ چکا تھا' چند دن کے بخار نے اسے بری طرح سے توڑ کر رکھ دیا تھا' ہنسنا بولنا تو وہ کب سے ہی ترک کر چکا تھا' اب تو اس کے مزاج میں اور بھی ٹھہراؤ آ گیا تھا' وہ جو پہلے' ایک پل بھی سکون سے نچلا نہیں بیٹھتا تھا اب جیسے اس کے لبوں پر قفل پڑ گئے تھے' روشن بادامی آنکھوں میں' جہاں ہر وقت شرارت رقص کرتی تھی اب وہاں ایک عجیب سا درد' کسی خاموش جھیل کی مانند' مستقل ٹھہر گیا تھا۔

تمکین رضا کے ساتھ ساتھ' اب اس نے رخسانہ بیگم سے بھی بات چیت کرنا بند کر دی تھی' سارا سارا دن گم صم' چپ چاپ' اپنے کمرے میں پڑے رہنا' یا پھر لانگ ڈرائیو پر نکل جانا' اب اس نے اپنا معمول بنا لیا تھا۔ وہ گھر جو اس کی اور تمکین کی محبت کا امین تھا' اب وہاں سناٹوں کا راج ہو گیا تھا' کیونکہ تمکین نے کئی ماہ پہلے ہی اپنا سارا سامان وہاں سے سمیٹ لیا تھا اور اب اس کے بغیر اشعر کو وہ درو دیوار خود پر ہنستے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔

اب اس خوبصورت تاج محل میں' اسے اپنی جنونی محبت کا دم گھٹتے ہوئے محسوس ہوتا تھا۔ سو اس نے مستقل طور پر ''حسن ولاج'' میں پڑاؤ ڈال لیا۔

شیزا کا کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ کہاں چلی گئی تھی۔ عرصہ ہوا اس نے اشعر سے کسی قسم کا کوئی رابطہ نہیں کیا تھا' اور اسے اب شیزا کی پرواہ بھی نہیں تھی بلکہ شیزا کی ہی کیا' اسے تو اب اپنی بھی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ ساری ساری رات' آنکھوں میں کاٹ دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دن بہ دن زندگی سے دور ہو رہا تھا اور اس کی اس حالت پر سعید صاحب کے ساتھ ساتھ رخسانہ بیگم بھی زندہ جل رہی تھیں۔ تب ہی اس روز وہ اشعر کے کمرے میں چلی آئی' جو انتہائی رف حلیے کے باوجود نکھرا نکھرا سا' بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ وہ اس وقت کہیں جانے کی تیاری کر رہا تھا کیونکہ اس کے پاؤں میں بند بوٹ تھے' اور وہ ان کے تسمے باندھ رہا تھا۔

تمکین کمرے میں داخل ہوئی تو وہ خفا خفا سی ایک نگاہ اس پر ڈالتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

''پلیز میری بات سنو اشعر۔''

تمکین تیزی سے لپک کر اس کی کلائی تھامتے ہوئے بولی تھی۔ مگر اشعر نے پلٹ کر اس کی آنکھوں میں نہیں دیکھا۔

''تمہیں کیا ہو گیا ہے اشعر' تم ایسے تو نہیں تھے' تم تو ہنسنا کھلکھلانا جانتے تھے' پیار کرنا اور خوشیاں بانٹنا جانتے تھے' پھر اب کیوں اتنے سنگدل ہو گئے ہو کہ تمہیں بڑی ماں کی آنکھوں میں تیرتے آنسو بھی نظر نہیں آتے۔''

اس کے لفظوں میں گہری کاٹ تھی۔ تب اشعر نے پلٹ کر سلگتی سی نگاہ اس کے اداس سراپے پر ڈالتے ہوئے گمبھیر لہجے میں کہا۔

''ماں کی آنکھوں میں وہ آنسو میرے لیے نہیں ہیں' نمی' کسی اریج کے لیے ہیں' سو مجھے سمجھانے سے کہیں بہتر ہے کہ تم اس اریج احمد کو تلاش کرو۔''

اشعر احمد کے الفاظ نے پل دو پل میں اسے شاکڈ کر ڈالا تھا' مگر اس نے خود کو کمزور پڑنے نہیں دیا' تب ہی مضبوط لہجے میں بولی۔

''تو تم یہ حقیقت جان گئے اشعر۔''

''ہاں حقیقتیں کبھی چھپی نہیں رہ سکتیں تمکین۔''

''تم اب بھی مجھ پر چوٹ کر رہے ہو اشعر' اب بھی مورد الزام ٹھہرا رہے ہو مجھے۔'' وہ دھیمے لہجے میں چلائی تھی۔

''نہیں' میں تو صرف اپنی قسمت کو کوس رہا ہوں تمکین' جس نے ایک ایک کر کے ساری محبتیں چھین لیں مجھ سے۔''

حلیے کے ساتھ ساتھ اس کا لہجہ بھی کافی نڈھال تھا' جب تمکین کی آنکھیں پھر سے بھرا گئیں' اور وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔

''قسمت کو دوش مت دو اشعر' کیونکہ اپنی محبتوں کے گھروندے تم نے خود توڑے ہیں۔''

''تو اب کیا لینے آئی ہو تم میرے پاس۔'' رخ پھیر کر روکھے لہجے میں اس نے پوچھا تھا' جب تمکین کے لبوں پر دھیمی سی طنزیہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

''تم مجھے کیا دے سکتے ہو اشعر' زندگی میں ایک محبت ہی تو دی تھی تم نے' اور وہ بھی چھین لی۔ بہر حال میں تم سے فقط اتنا ہی کہنے آئی ہوں کہ پلیز بڑی ماں اور بڑے پاپا کو مزید پریشان مت کرو' کیونکہ تم نے جو درد مجھے دیا ہے وہ تو میں سہہ لوں گی مگر جو تکلیف تم انہیں دے رہے ہو' وہ تکلیف بڑی ماں اور بڑے پاپا زیادہ دیر تک نہیں سہہ پائیں گے اشعر' پھر کیا کرو گے تم؟''

''میں اب بھی کچھ نہیں کر رہا ہوں تمکین' کسی کو تکلیف نہیں دے رہا ہوں میں۔''

تمکین کے روہانسے لہجے پر وہ شدید مضطرب ہوا تھا جب وہ پھر سے سسکتے ہوئے بولی۔

''تم انہیں تکلیف دے رہے ہو اشعر' بھوکا پیاسا رہ کر' سارا سارا دن گھر سے باہر رہ کر' شدید اذیت سے دوچار کر رہے ہو انہیں' پلیز اشعر' بڑی ماں پہلے ہی بہت ڈسٹرب ہیں' انہیں مزید تنگ مت کرو پلیز۔''

''بس یا اور بھی کچھ کہنا ہے تمہیں؟''

ادھر جیسے کوئی اثر ہی نہیں ہوا تھا' تب تمکین نے افسوس بھری ایک نظر اس کے نڈھال سراپے پر ڈالی اور اگلے ہی پل خاموشی سے اس کے کمرے سے باہر نکل آئی۔

اس روز بہت دیر تلک اپنے بستر پر لیٹے' اس نے اشعر اور اریج احمر کے متعلق سوچا تھا' دونوں کی عادتوں اور مزاج کا موازنہ کیا تھا اور تب اچانک ہی اس کی سوچوں کا محور اریج احمر کی اداس آنکھوں میں تیرتا درد بن گیا اور وہ چونک کر بستر پر اٹھ بیٹھی تھی۔

''ہاں' یہ بھی تو ہو سکتا ہے ناں کہ اریج احمر ہی بڑی ماں کا بچھڑا ہوا بیٹا ہو' تب ہی تو اتنا اداس رہتا ہے وہ' ہاں اگر اریج احمر بڑی ماں کا کھویا ہوا بیٹا ہوا تو یقیناً ان کی زندگی خوشیوں سے بھر جائے گی' پھر...... پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''

اپنے ہی تصورات میں کھوئی وہ خوشی سے اچھل پڑی' اور تب طویل عرصہ کے بعد بے ساختہ ہی اس کی انگلیاں اریج احمر کا موبائل نمبر پریس کر بیٹھیں۔

''ہیلو' اریج احمر اسپیکنگ۔''

دوسری ہی بیل پر کال ریسیو کرنے کے بعد' وہ قدرے حیرانگی سے بولا تھا' کیونکہ اتنے دنوں کے بعد تمکین کا اس سے رابطہ کرنا' اس کے

لیے حیران کن ہی تھا' وجہ وہ طوفان تھا جو اس کی وجہ سے اشعر اور تمکین کی زندگی میں آیا تھا اور جس کے بعد اسے ایک فیصد بھی گمان نہیں تھا کہ اب تمکین رضا' زندگی بھر کبھی اس پر ایک نگاہ ڈالنا بھی گوارہ کرے گی۔

''ہیلو اریج' کیسے ہیں آپ؟''

وہ تو ابھی اس کی کال پر ہی حیرت سے گنگ ہو گیا تھا کہ اب اس کا یہ سوال......؟

''ہیلو......آپ ٹھیک تو ہیں ناں اریج؟''

اس کی خاموشی پر تمکین نے پریشانی سے استفسار کیا تھا' جب وہ خود کو سنبھالتے ہوئے گمبھیر لہجے میں بولا۔

''ہاں میں ٹھیک ہوں' آپ کیسی ہیں؟''

''میں بھی ٹھیک ہوں اریج' آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنا تھی۔''

''کہیئے میں سن رہا ہوں۔''

تمکین کا دوستانہ لہجہ اس سے ہضم نہیں ہو رہا تھا' تب ہی قدرے پزل ہو کر رہ گیا تھا۔

''اریج' مجھے آپ سے جو بات کرنی ہے' وہ یوں فون پر نہیں ہو سکتی' آپ اگر آفس کے ضروری امور نمٹا کر فارغ ہو جائیں تو پلیز ''حسن ولاج'' تشریف لے آئیں۔''

''او کے۔''

تمکین کے رابطہ منقطع کرتے ہی اس نے بھی اپنا موبائل آف کر دیا۔

وہ اس وقت ایک بہت اہم میٹنگ کے لیے نکل رہا تھا۔ مگر اتنے دنوں کے بعد تمکین کی یاد آوری قطعی غیر اہم نہیں تھی' تب ہی وہ میٹنگ کینسل کر کے سیدھا ''حسن ولاج'' چلا آیا۔ جہاں وسیع ٹی وی لاؤنج میں براجمان تمکین رضا اپنی گھریلو ملازمہ کے ساتھ گپ شپ لگا رہی تھی۔

''ارے اریج آپ......آپ کی تو غالباً بہت اہم میٹنگ تھی۔''

اس کی نظر جونہی اریج پر پڑی' وہ خوشگوار حیرت کے ساتھ چونک کر اس کی سمت بڑھ آئی۔

''ہاں' مگر آپ نے اتنے دنوں کے بعد رابطہ کیا' تو میں سمجھا کہ کہیں آپ کسی مشکل میں ہی نہ ہوں۔ سو فوراً چلا آیا' ویسے خیریت تو ہے ناں؟''

اس کے سامنے ہی صوفے پر براجمان ہوتے ہوئے اس نے مدہم لہجے میں پوچھا تو دھیمی سی مسکراہٹ تمکین کے لبوں پر بکھر گئی۔

''ہاں خیریت تو ہے' ویسے میں آپ کو کسی سے ملوانا چاہ رہی ہوں۔''

''اچھا' مگر کس سے؟''

وہ خوش گوار حیرت کے ساتھ چونکا تھا۔

تاہم اس سے پہلے کہ تمکین اسے کوئی جواب دیتی' نفیس سے کپڑوں میں ملبوس رخسانہ بیگم چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتیں وہیں ٹی وی لاؤنج میں چلی آئیں۔

''تمکین! تم مجھے اپنے کسی دوست سے ملوانا چاہ رہی تھیں بیٹے۔''

اریج کے مقابل ہی صوفے پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے کہا تو سر جھکائے بیٹھے اریج احمر نے چونک کر ان کی سمت دیکھا اور پل دو پل میں ہی' اس کی دھڑکنیں جیسے مچل اٹھیں' تب فوراً وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا' آج جس پر شفیق چہرے سے وہ اسپیشلی مل رہا تھا' کبھی اس چہرے سے اسے ایک پل کی جدائی بھی گوارہ نہیں تھی' مگر کتنے سال چپ چاپ بیت گئے تھے ان کے بغیر' اور اب تو اس کے احساسات' جذبات' سب پتھر ہو کر رہ گئے تھے۔ خوب صورت کلین شیوڈ چہرے پر کئی رنگ آ آ کر گزر رہے تھے جب کن انکھیوں سے اس کے سرخ چہرے کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے تمکین نے رخسانہ بیگم سے کہا۔

''ان سے ملئے بڑی ماں' یہ اریج احمر ہیں' آپ تو جانتی ہیں ناں انہیں' کیونکہ اشعر نے انہی کے خلوص کا بہانہ بنا کر' مجھے اپنی زندگی سے بے دخل کیا تھا' بہر حال میرے بہت اچھے دوست ہیں یہ.....''

ضبط کی انتہا پر کھڑے اریج احمر نے شکایتی نگاہوں سے اس کی سمت دیکھا اور اس سے پہلے کہ رخسانہ بیگم براہ راست اس سے مخاطب ہوتیں' اس نے اپنے قدم آگے بڑھا دیئے۔

''رکو اریج' پلیز۔''

تمکین نے فوراً اس کی کلائی تھام کر' اس کے بڑھتے قدموں کو روک دیا تھا۔

''میری بڑی ماں سے ملے بغیر ہی جا رہے ہو اریج۔ اتنے غیر مہذب تو کبھی نہیں رہے تم۔''

وہ اس کے دل کی کیفیت بخوبی سمجھ رہی تھی' مگر دلوں کا مطلع تو آنسوؤں کی برسات اور گلے شکوؤں کی بوچھاڑ کے بعد ہی صاف ہوتا ہے' سو اپنے دل میں چھپی حیرت انگیز مسرت کو دباتے ہوئے اس نے قدرے شکایتی انداز میں اریج سے کہا تو اس نے بمشکل رخ پھیر کر' اپنی پلکوں پر لرزتے آنسوؤں کو بکھرنے سے بچایا۔ اسی اثنا میں وہ اپنا روئے سخن پھر سے رخسانہ بیگم کی طرف پھیرتے ہوئے بولی۔

''اریج کی آنکھوں میں غور سے دیکھئے بڑی ماں' اور پہچانیے کہ کہیں ان آنکھوں کے آنسوؤں میں' وہ سات سالہ معصوم سا بچہ تو نہیں بلک رہا کہ جسے آپ نے زندہ جاوید ہوتے ہوئے بھی' اپنی ممتا سے محروم کر دیا تھا۔''

تمکین کے الفاظ پر' حیران کھڑی رخسانہ بیگم نے شاکڈ نگاہوں سے اریج احمر کی طرف دیکھا، اور اس کی آنکھوں میں مچلتے آنسوؤں کو دیکھ کر گم صم رہ گئیں۔

''بڑی ماں' مائیں تو اپنے بچوں کو ان کی خوشبو سے پہچان لیا کرتی ہیں' پھر آپ بار بار اریج سے مل کر بھی' اس کی آنکھوں میں اپنا عکس کیوں نہیں دیکھ پائیں' بولئے ناں بڑی ماں' اریج کو پہچاننے میں' ایسی بے نیازی کیوں دکھائی آپ نے؟''

اس وقت اس کے الفاظ سے جتنی چوٹ رخسانہ بیگم کے دل کو پہنچ رہی تھی اس سے کہیں بڑھ کر اریج احمر کا دل پاش پاش ہوگیا تھا' مگر پھر بھی وہ خود کو سنبھالے کھڑا تھا کہ اسی اثناء میں بھونچکاں کھڑی رخسانہ بیگم ٹپ ٹپ برستے آنسوؤں اور لرزتے قدموں سے اس کی طرف بڑھیں اور نم لہجے میں بولیں۔

''تت......تمہارا مطلب ہے کہ......یہ میرا اریج ہے......مم......میرے جگر کا ٹکڑا۔''

ان کے کمزور لہجے میں کپکپاہٹ نمایاں تھی' جب ضبط کی انتہاء پر کھڑے اریج احمر نے برہمی سے ان کے ہاتھ پرے جھٹک دیئے' پھر قدرے خشک لہجے میں بولا۔

''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے میڈم' میرا آپ سے کوئی واسطہ نہیں۔''

اس وقت جتنا سپاٹ اس کا لہجہ تھا اس سے کہیں بڑھ کر کرخت اس کا چہرہ تھا۔ سرخی مائل آنکھوں میں آنسوؤں کے ساتھ ساتھ ایک عجیب سا الاؤ دہک رہا تھا۔ کس قدر نفرت تھی اس کے لہجے میں کہ رخسانہ بیگم کانپ کر رہ گئیں' تاہم اس کے بعد وہ ایک سیکنڈ کے لیے بھی وہاں نہیں ٹھہرا۔ حالانکہ تمکین نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی' مگر وہ کسی طوفان کی مانند جس طرح سے آیا تھا بالکل اسی انداز میں اسے اپنے سامنے سے ہٹاتے ہوئے واپس چلا گیا اور رخسانہ بیگم' مدت کے بعد اسے اپنے سینے سے لگانے کی شدید حسرت لیے پیاسی کی پیاسی ہی کھڑی رہ گئیں۔

زندگی میں کچھ لمحے' انسانی دلوں پر بڑے کٹھن گزرتے ہیں' اتنے کٹھن کہ سانسیں سینے کے اندر ہی الجھ کر رہ جاتی ہیں۔

انسان رونا چاہتا ہے' چیخنا چلانا چاہتا ہے' مگر اعصاب یوں پتھر بن جاتے ہیں کہ وہ چاہ کر بھی نہ تو رو پاتا ہے اور نہ ہی چیخ چلا سکتا ہے۔

اس وقت رخسانہ بیگم کی کیفیت بھی کچھ ایسی ہی تھی' بالکل کسی پتھر کے مجسمے کی مانند' وہ ساکت بیٹھی تھیں اور آنسو ان کے گالوں پر لڑھک رہے تھے' تب افسردہ سی تمکین رضا' ہونٹوں کو بے بسی سے کاٹتے ہوئے ان کی طرف بڑھی اور اپنا ہاتھ نرمی سے ان کے بائیں کندھے پر رکھ دیا۔

''حوصلہ رکھئے بڑی ماں' اریج کے ساتھ' آپ کی مجبوریوں نے جو برا کیا ہے اس کے جواب میں ایسا ری ایکشن تو دیکھنے کو ملے گا' لیکن آپ اطمینان رکھئے میں اسے سمجھا لوں گی۔''

اس کے الفاظ امید کے پھاہے تھے مگر رخسانہ بیگم اس وقت کچھ بھی سمجھنے سننے کی پوزیشن میں نہیں تھیں سو جیسے ہی تمکین نے انہیں تسلی دینا چاہی' وہ کسی ریت کی دیوار کی مانند ڈھے کر زمین پر گر پڑیں۔

☆☆☆

گرا کر خشک پتے رو رہی ہے
ہوا پاگل نہیں ہے سر پھری ہے
دکھوں کے بوجھ میں تخفیف کرنا
کہ اب دیوار ہمت گر رہی ہے
حوادث سے رہیں محفوظ کیونکر
تعاقب میں ہمارے زندگی ہے
بساتے ہیں جو کنج دوستاں کو
یہاں ان کا مقدر بے گھری ہے!

رات بھر جاگتے اور روتے رہنے کی وجہ سے صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو پورے جسم میں ہلکی سی حرارت کا احساس بخوبی ہو رہا تھا۔ اس وقت اس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ اٹھ کر شاور ہی لے لیتی سو کسلمندی سے بستر پر پڑی رہی۔

کل جس طرح سے ازمیر اور سائکہ کے مابین محبت کے مظاہرے دیکھ کر وہ جلی تھی اور بعد میں مدت کے بعد اپنے پیارے پاپا' مسٹر شہریار احمد جاوید صاحب سے مل کر خوش ہوئی تھی' وہ سارے مناظر ایک ایک کر کے اسے یاد آ رہے تھے' ہاں یہ سچ تھا کہ وہ دل کی گہرائیوں سے ازمیر شاہ پر فریفتہ تھی' اسے اپنا سب سے اچھا دوست اور مخلص ترین کزن مانتی تھی' مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ وہ اسے خوش دیکھنا نہیں چاہتی تھی' یا سائکہ خان کے ساتھ اتنے گہرے مراسم پر اسے کوئی اعتراض تھا۔

وہ ایسی لڑکی نہیں تھی' بچپن ہی سے زندگی کے ہر معاملے میں اس نے کم گوئی سے کام لیا تھا' زیادہ بولنا اور بے مقصد بول کر اپنا وقار گنوانا' اس کی فطرت میں شامل نہیں تھا' لہٰذا ازمیر شاہ کے ساتھ محبت کے معاملے میں بھی' تا حال وہ خاموشی سے ہی کام لے رہی تھی۔

اس کے نزدیک یہ بات قطعی مناسب نہیں تھی کہ وہ خود اس کے سامنے اپنی محبت کا اظہار کر کے اپنے آپ کو بے وقعت کر لیتی' یہ اور بات تھی کہ پہلے وہ شہزین خان کے ذکر پر جل جاتی تھی اور اب سائکہ خان نے درمیان میں ٹانگ اڑا کر اس کے مسلسل سلگنے کا سامان پیدا کر دیا تھا۔

زندگی میں چاہنے اور چاہے جانے کا حق' ہر فرد کو حاصل ہے' عورت ہو یا مرد' دل کے جذبوں پر کبھی کسی کا پہرہ نہیں لگ سکا ہے' سو وہ بھی اس معاملے میں اپنی تمام تر سیاہ بختی کے ساتھ' دکھی بے بس ہو کر رہ گئی تھی۔

صبح کے گیارہ بج رہے تھے' جب اس کے کمرے کا دروازہ ہلکے سے دھکے کے ساتھ کھلا اور اگلے ہی پل قدرے متفکر سا ازمیر شاہ اس کے قریب چلا آیا۔

''کیا بات ہے ارشی' تم ناشتے کے لیے کیوں نہیں آئیں؟''

وہ جب بہت زیادہ موڈ میں ہوتا تو اسے یونہی بہت پیار سے مخاطب کر ڈالتا تھا۔ اس وقت بھی اسی انداز میں اس نے قدرے تفکر سے پوچھا' تو وہ سرسری سا لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولی۔

''بس یونہی دل نہیں چاہ رہا تھا۔''

''دل کیوں نہیں چاہ رہا تھا' خیریت تو ہے ناں؟''

''ہاں خیریت ہی ہے۔'' اس کے تفتیشی انداز پر نگاہیں چراتے ہوئے بمشکل وہ دھیمے سے مسکرا پائی تھی۔

''اچھا..... تم کہتی ہو تو مان لیتا ہوں' ورنہ لگتا تو نہیں ہے کہ خیریت ہے۔''

''کیوں..... تمہیں مجھ پر کوئی شک ہو رہا ہے۔ اس نے قدرے چونکتے ہوئے پوچھا تھا جب وہ سنجیدگی سے بولا۔

''ہاں' تمہاری یہ سوجھی ہوئی سرخ سرخ سی خوبصورت آنکھیں واضح بتا رہی ہیں کہ تم رات بھر جاگتی اور شاید روتی بھی رہی ہو..... ہے ناں؟'' دل کا چور پکڑنے میں تو وہ ماہر تھا۔

ہمیشہ سے یونہی اس کے اندر کا بھید پا کر اسے پریشان کر دیا کرتا تھا۔ تب ہی تو افسردہ سی اریشہ خان نگاہیں چرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی تھی۔

''پلیز بتاؤ ناں اریشہ' جو میں نے کہا وہ درست ہے ناں؟''

اسے بے نیاز پا کر وہ پھر سے مچلا تھا۔ جب پھنسی پھنسی سی آواز میں بمشکل اریشہ نے کہا۔

''ہاں' دراصل وہ رات دیر تک ہم بیٹھے باتیں کرتے رہے' تو نیند پوری نہیں ہوئی میری' بس اسی لیے یہ سرخی آ گئی آنکھوں میں؟''

''آر یو شیور اریشہ؟''

غلافی آنکھوں میں اب بھی بے یقینی تھی' مگر اریشہ نے اس کی سمت نہیں دیکھا اور رخ پھیر کر ہلکے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''او کے اب اٹھو میرا لانگ ڈرائیو کا پروگرام ہے۔''

خلاف توقع ازمیر نے یہ موضوع جلد بدل دیا تھا' مگر اریشہ کے لیے اس کی فرمائش قطعی قابل قبول نہیں تھی۔ سو معذوری ظاہر کرتے ہوئے بولی۔

''سوری ازمیر' میرا اس وقت کہیں بھی جانے کو دل نہیں کر رہا ہے' تم پلیز سائمہ کو کال کر دو۔''

''شکریہ اس نیک مشورے کے لیے۔''

اس کی بات پر فوراً ہی وہ جل کر بولا تو بے ساختہ اریشہ کے لب مسکرا اٹھے۔

''وہ تمہاری منگیتر ہے' تمہیں اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا چاہیے۔''

''او کے' سن لیا' اب جلدی سے اٹھو' میں انکار سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔''

اس کے مفت مشورے پر فوراً اچھلا کر ہاتھ اٹھاتے ہوئے اس نے قطعی لہجے میں کہا تو اریشہ بے بسی سے اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی' تب ہی قدرے زچ ہو کر بولی۔

''تم بات کو سمجھتے کیوں نہیں ہو ازمیر' کیوں لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع دینا چاہتے ہو......؟''

''کن لوگوں کی بات کر رہی ہو' اور کس کی ہمت ہے کہ میرے حوالے سے اب تمہیں کچھ کہے۔''

پل دو پل میں ہی وہ شدید ایموشنل ہوا تھا' پھر کچھ ہی لمحوں کے بعد سر جھکائے بیٹھی گم صم سی اریشہ خان پر ایک بھرپور نگاہ ڈالتے ہوئے بولا۔

''کیا صالحہ بھابھی نے تم سے کچھ کہا ہے؟''

''ہاں۔''

اریشہ کہنا نہیں چاہتی تھی مگر بے ساختگی میں اس کی زبان سے پھسل گیا تو ازمیر شاہ نے کسی قدر حیرانگی سے اس کی سمت دیکھا۔

''وہاٹ' کیا کہا ہے انہوں نے تم سے؟''

وہ اب پہلے سے زیادہ بے چین ہو گیا تھا اور ادھر اریشہ خان اپنی حماقت پر سر پیٹ رہی تھی' کیونکہ صالحہ بھابھی کے الفاظ وہ اگر اس کے سامنے دہرا دیتی تو یقیناً بات بگڑ جانے کا خدشہ ہوتا' اور یہی تو وہ نہیں چاہتی تھی سو بات سنبھالتے ہوئے بولی۔

''انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میری اور اذہان کی شادی جلد ہونے والی ہے' لہٰذا مجھے محتاط رہنا چاہئے۔''

''اوہ تو یہ بات ہے' لیکن ہم دونوں اچھے دوست ہیں یار' اگر ہم کچھ وقت ایک دوسرے کی کمپنی میں گزار لیتے ہیں تو اس میں ہرج ہی کیا ہے۔''

اس کا انداز ایسا تھا گویا وہ یہ بات پہلے سے ہی جانتا ہو' تب ہی اریشہ نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''ہماری دوستی کو لے کر پہلے ہی اس گھر میں بہت بھونچال اٹھ چکے ہیں ازمیر' ہمیں اب کسی کو مزید الزام تراشیوں کا موقع نہیں دینا چاہئے۔''

''او کے' لیکن پہلے کی بات اور تھی اریشہ' پہلے میں ان لوگوں کے منہ لگنا نہیں چاہتا تھا' اکیلا تھا' بے مہار تھا' لیکن اب مجھے منہ توڑ جواب دینا آ گیا ہے اریشہ اور پھر اب تو میں بے مہار بھی نہیں رہا' اب تو میری باگیں' شرعی طریقے سے خود انہی لوگوں نے ایک زندہ جاوید لڑکی کے ہاتھ میں سونپ دی ہیں' پھر جب اسے ہی ہماری دوستی پر کوئی اعتراض نہیں تو ان لوگوں کا کیا حق بنتا ہے ہم پر انگلی اٹھانے کا؟''

وہ اس وقت قطعی کچھ سمجھنے کے موڈ میں نہیں تھا' تب ہی اریشہ خان نے بے بسی سے لب بھینچ لئے۔ کیونکہ جو بات' کچھ ہی روز قبل وہ جان گئی تھی' اسی بات سے ازمیر شاہ تا حال بے خبر تھا' اور وہ اسے بے خبر ہی رکھنا چاہتی تھی' تب ہی پلکیں موند کر بولی۔

''ہماری پوزیشنز بھلے بدل گئی ہوں ازمیر' لیکن اس گھر میں رہنے والوں کے ذہن اب بھی نہیں بدلے۔''

''تو.....؟ کیا اس بات کو لے کر تم مجھ سے کوئی رابطہ نہیں رکھو گی؟''

''لو یہ میں نے کب کہا۔''

ازمیر کے تیکھے لہجے پر اس نے پٹ سے اپنی آنکھیں کھول دی تھیں' جب وہ اس کی روشن آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

''فقط کچھ ہی گھنٹوں کی تو بات ہے اریشہ پھر میں کبھی تمہارے دامن پر چھینٹ آنے کا موقع نہیں دوں گا۔'' اس کے گمبھیر لہجے پر اریشہ نے تڑپ کر اس کی سمت دیکھا' پھر دھیمے لہجے میں بولی۔

''کیا واقعی تم آج چلے جاؤ گے ازمیر؟''

''ہاں اریشہ' تب ہی تو چاہتا ہوں کہ زندگی میں آخری بار کچھ اور یادگار پل تمہاری رفاقتوں کی نذر ہو جائیں۔''

جتنا بوجھل اریشہ خان کا لہجہ تھا اس سے کہیں بڑھ کر اداسی ازمیر شاہ کے لہجے میں تھی' تب ہی تو اریشہ خان کا دل جیسے خون میں ڈوب کر رہ گیا' پلکوں پر یکلخت ہی کچھ نافرمان آنسو دھیرے سے لرزے تھے' تب وہ بوجھل سے لہجے میں بولی۔

''ایسا کیوں کہہ رہے ہو ازمیر' مت جاؤ یہاں سے پلیز۔''

کتنی عاجزی تھی اس کے لہجے میں' مگر ازمیر شاہ نے اس کی سمت نگاہ نہیں کی' بلکہ اس کے قریب سے اٹھ کر قریبی کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔

''ازمیر' میری شادی تک تو رک جاؤ پلیز۔''

پھر وہی ورد' وہی عاجزی' مگر اس بار خود ازمیر شاہ کا جگر پاش پاش ہو گیا' تب ہی وہ اپنے آنسوؤں کو بکھرنے سے روکتے ہوئے بولا۔

''کیوں روکنا چاہتی ہو مجھے تم.....؟''

''پتہ نہیں.....''

''جب کچھ بھی پتہ نہیں ہے تو مت روکو اریشہ' کیونکہ میں.....''

اس سے پہلے کہ زبان گستاخی کا مظاہرہ کرتی' اس نے سرعت سے لب بھینچ کر اپنا بھرم بچا لیا۔ اب وہ کیسے کہتا کہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اسے کسی اور کا ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا' اسی لیے تو یہ بن باس کاٹنا چاہتا تھا وہ' مگر اریشہ یہ بات کبھی نہیں سمجھ سکتی تھی' سو اس نے زخمی سی ایک نگاہ استفہامیہ نظروں سے اپنی طرف دیکھتی گم صم سی اریشہ خان پر ڈالی' اور اگلے ہی پل' تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے وہ اس کے کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

رخسانہ بیگم زبردست ہارٹ اٹیک کا شکار ہوئی تھیں۔

پورے ''حسن ولاج'' میں ایک مرتبہ پھر جیسے بھونچال آ گیا تھا۔ گھر کے تمام مکینوں کی جان گویا لبوں پر آ ٹھہری تھی۔ سعید صاحب بھی تمام صورت حال سے آگاہ ہو گئے تھے۔ لہٰذا اب انہیں ایک عجیب سی پشیمانی نے گھیر لیا تھا۔ برسوں پہلے ایک چھوٹے سے معصوم بچے کو اس کی ماں سے جدا کرنے کا جو ظالمانہ قدم انہوں نے اٹھایا تھا اب اپنے اس فعل پر انہیں شرمندگی ہو رہی تھی۔

وہ چاہ کر بھی گزرے ہوئے دنوں کے ان لحات کو بھلا نہیں سکتے تھے۔ جب بات بے بات رخسانہ بیگم کی آنکھیں بھیگی رہتی تھیں۔ زندگی بھر انہوں نے کبھی کوئی گلہ نہیں کیا تھا' اندر ہی اندر مسمار ہوتی رہی تھیں مگر سعید صاحب سب کچھ جانتے اور دیکھتے ہوئے بھی بے حس بنے ان کے ضبط کا امتحان لیتے رہے تھے۔

وہ رخسانہ بیگم کو صرف اور صرف اپنے اشعر کی ماں کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے' ان کے بیٹے کی محبت یا توجہ تقسیم ہو' انہیں قطعی گوارہ نہیں تھا' لہٰذا اپنے بیٹے کی خوشیوں کے لیے' زندگی بھر وہ رخسانہ بیگم کے' اپنے پہلے بیٹے کے لیے احساسات وجذبات کو کچلتے رہے تھے۔

مگر آج...... آج ضبط کے سارے بند ٹوٹ گئے تھے۔

زندگی سے سانسوں کی بھیک مانگ کر جینے والی رخسانہ بیگم اپنا حوصلہ کھو بیٹھی تھیں۔

زندگی میں پہلی بار آج انہیں اپنی خود غرضی اور سنگدلی پر افسوس ہو رہا تھا' لہٰذا اپنے طور پر وہ بھی رخسانہ بیگم اور اریج کے مابین حائل فاصلوں کو کم کرنے کے خواہاں دکھائی دے رہے تھے۔

تکلیف اور آزمائش کے ان لمحوں میں لاپرواہ سے اشعر احمد کی حالت بھی دیکھنے والی تھی۔ لاکھ وہ اپنی ماں سے خفا تھا' دل ہی دل میں بدگمان ہو گیا تھا' ان سے بات کرنا گوارہ نہیں رہا تھا' مگر اس وقت انہیں' بے حس وحرکت ایمرجنسی وارڈ میں دیکھ کر اسکے اوسان بھی خطا ہو گئے تھے۔

زندگی کا فلسفہ بھی کتنا عجیب ہے' کوئی کتنا ہی عزیز' زندگی کے لیے کتنا ہی ضروری کیوں نہ ہو' ہماری دسترس میں آنکھوں کے سامنے رہے تو ہم اس کی قدر نہیں کرتے' اس کے جذبات واحساسات کی پرواہ بھی نہیں کرتے مگر وہی ہستی' جب ہاتھ سے ہاتھ چھڑا کر' نگاہوں سے اوجھل ہونے لگتی ہے تو ہمیں ایک دم سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ ہستی نہ رہی تو ہماری سانسیں بھی رک جائیں گی' زندگی میں جینے کے لیے پھر کوئی مقصد ہی باقی نہیں رہے گا۔

اسے بھی اس وقت تقریباً ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا۔

بے ترتیب' حلیہ' پیشانی پر بکھرے بال' سوجھی سوجھی سی سرخ آنکھیں' اور سفید لٹھے کی مانند ستا ہوا چہرہ' اس وقت کس قدر بے بسی کے ساتھ وہ خدا سے ان کی زندگی کے لیے دعا کر رہا تھا۔

''اے اللہ...... بے شک تو سننے اور بخشنے والا ہے' بے شک تیری ذات رحیم وکریم ہے' اپنے رحم کے صدقے' پیارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے' میری مما کو بچالے' میری مما کو زندگی دے دے' میں اپنی مما کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا' تمکین کے بعد' مجھ میں مما کو کھو دینے کا حوصلہ نہیں ہے پروردگار' میرے آنسوؤں کی لاج رکھنا۔''

برستی ہوئی نم آنکھوں کے ساتھ دونوں ہاتھوں کی بند مٹھی پر ٹھوڑی ٹکائے' وہ اندر ہی اندر خدا کے حضور گڑگڑا رہا تھا' جب اچانک سعید صاحب نے پیچھے سے آکر اس کے مضبوط کندھے پر اپنا ہاتھ دھر دیا۔

''حوصلہ رکھو بیٹا...... اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

وہ بھی رو رہے تھے' مگر اشعر کی آنکھوں سے بکھرتے آنسو نہیں دیکھ سکتے تھے سو اس سے ناراض ہونے کے باوجود وہ اس کے قریب چلے آئے تھے۔ جواب میں اشعر ان سے لپٹ کر مزید سسک پڑا۔

''پاپا...... پاپا میں مما کو اس حال میں نہیں دیکھ سکتا' میں ان کے بغیر نہیں جی سکتا۔''

بچوں کی طرح بلکتے ہوئے وہ ان سے کہتا رہا اور سعید صاحب اس کا سر تھپتھپاتے ہوئے تسلی دیتے رہے۔

تمکین کی سمجھ میں اور کچھ نہیں آیا تو وہ اریج احمر کی طرف ہی بھاگ کھڑی ہوئی' مگر وہ اسے گھر پر نہیں ملا' چوکیدار کی معرفت اسے معلوم ہوا تھا کہ اریج کل شام سے ہی کسی ضروری کام کے سلسلے میں شہر سے باہر گیا ہوا ہے۔ تمکین جانتی تھی وہ صرف اپنے آپ سے بھاگ رہا ہے' لہٰذا خاموشی سے سر جھکائے واپس چلی آئی' تاہم ہسپتال میں زندگی اور موت کی جنگ لڑتی رخسانہ بیگم کی حالت نے اسے چند ہی گھنٹوں کے بعد پھر سے اریج احمر کے گھر کی طرف گاڑی دوڑانے پر مجبور کر دیا تھا۔

زندگی بھر ماں کی ممتا سے محروم رہنے والے اس بدنصیب شخص کو وہ اپنی ماں سے آخری ملاقات سے محروم رکھنا نہیں چاہتی تھی' لہٰذا پورچ میں اریج احمر کی بلیک شیراڈ کھڑی دیکھ کر وہ تیزی سے اپنی گاڑی سے نکلتے ہوئے لاؤنج کی طرف بڑھ آئی تھی۔

اریج جو ابھی گھر واپس لوٹا تھا' اسے ایک دم سے اپنی طرف آتے دیکھ کر صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''نمی' اگر اس وقت تم اپنی بڑی ماں کی کوئی سفارش لے کر میرے پاس آئی ہو' تو پلیز یہاں سے واپس چلی جاؤ' کیونکہ میں اس موضوع پر تم سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا' نہ آج' نہ کل۔''

وہ اس وقت از حد مضطرب دکھائی دے رہا تھا' مگر اس کے باوجود تمکین اپنے لہجے کی تلخی پر قابو نہیں پا سکی تھی تبھی قدرے تیز لہجے میں بولی۔

''محبت کوئی زبردستی کا سودا نہیں ہے اریج احمر' جو میں تم سے اپنی بڑی ماں کے لیے کوئی سفارش کروں گی نہ ہی مجھے ان کے لیے تمہارے کسی بھی قسم کے رحم کی ضرورت ہے' میں تو بس اس وقت تمہیں محض اتنا بتانے آئی ہوں کہ مجبوریوں کی زنجیروں میں جکڑی وہ عورت جو پچھلے تین روز سے آئی سی یو میں پڑی زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہی ہے' ہر بار ہوش سنبھالنے پر' صرف تمہیں ہی پکار رہی ہے' اس بدنصیب ماں کو صرف ایک نظر دیکھ آؤ اریج' کہیں ایسا نہ ہو کہ تم دل میں ہزاروں گلے شکوے لیے بیٹھے رہ جاؤ اور وہ...... تمہاری نفرت کا داغ اپنے دل پر سجائے' ہمیشہ کے لیے تم سے دور چلی جائیں......''

تلخ لہجے میں اپنی بات مکمل کرنے کے بعد وہ وہاں ٹھہری نہیں تھی جبکہ اریج ڈسٹرب اعصاب کے باوجود' اس کی بات پر مچل کر اس کی طرف دیکھتا رہ گیا تھا۔

ہم نہ اس صف میں تھے اور نہ اس صف میں تھے

راستے میں کھڑے ان کو تکتے رہے

پیچھے مڑ کر جو دیکھا تو پھولوں کا رنگ

جو کبھی سرخ تھا' زردہی زرد ہے

اپنا پہلو ٹٹولا تو ایسا لگا

دل جہاں تھا وہاں' دردہی درد ہے

ٹپ ٹپ ٹپ' کتنے ہی آنسو ایک ساتھ اس کی آنکھوں سے لڑھک کر گالوں پر پھسل آئے تھے مگر اس وقت وہاں اس کے آنسو پونچھنے والا کوئی نہیں تھا۔

''مما......مما......'' آزردگی سے بے اختیار پکارتے ہوئے وہ بچوں کی مانند بلک بلک کر رو پڑا تھا۔

☆☆☆

سڑکوں پر ہلکی ہلکی بوندا باندی کا سلسلہ متواتر جاری تھا۔

تیز ڈرائیونگ کرتے ہوئے اس کے ہاتھ اسٹیرنگ وہیل پر بری طرح سے کپکپا رہے تھے۔ دل کی تمام تر دھڑکنیں یکلخت ہی خاصی منتشر ہوگئی تھیں۔ مضبوط اعصاب بھی اس وقت جیسے چٹخنے لگے تھے۔

تمکین نے پریشانی کے عالم میں اس سے کال کے متعلق پوچھا تھا مگر اس وقت چونکہ اس کے حواس سن ہو رہے تھے لہٰذا وہ اس سے کوئی بھی جواب دیئے بغیر تیزی کے ساتھ وہاں سے نکلتی چلی گئی تھی۔ یہ سچ تھا کہ اسے اب عدنان رؤف سے کسی قسم کی کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی وہ اس کے لیے دکھی ہوکر' خود اپنی روح کو اذیت پہنچانا بھی نہیں چاہتی تھی' پچھلے کئی روز سے وہ اسے دیکھنے ہسپتال بھی نہیں آئی تھی' محض فون کال کے ذریعے سیال بیگم سے ہی اس کا احوال دریافت کرتی رہی تھی' مگر اس وقت اس کا دل بہت بری طرح سے دھڑک رہا تھا۔

لاکھ وہ اس سے بدگمان تھی' اسے اس کے کیے کی سزا دینے کے لیے' اس سے ہر تعلق' ہر واسطہ ختم کر دینا چاہتی تھی مگر یوں بھری جوانی میں اس کی موت' اس کے دل کو گوارہ نہیں تھی۔ وہ اسے شکست دینا چاہتی تھی مگر مار کر نہیں۔

زندگی نے ایک ایک کر کے سارے رشتے اس سے چھین لیے تھے۔ لہٰذا وہ ایک مرتبہ پھر موت کا تماشہ دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔

''میں بھول جاؤں تمہیں اب یہی مناسب ہے

مگر بھلانا بھی چاہوں تو کس طرح بھولوں

کہ تم تو پھر بھی حقیقت ہو کوئی خواب نہیں

یہاں تو دل کا یہ عالم ہے کیا کہوں کم بخت

بھلا سکا نہ وہ اک سلسلہ جو تھا ہی نہیں

وہ اک خیال جو آواز تک گیا ہی نہیں

وہ ایک بات جو میں کہہ نہیں سکی تم سے

وہ ایک رابطہ جو ہم میں کبھی رہا ہی نہیں

اگر یہ حال ہے دل کا تو کوئی سمجھائے

تمہیں بھلانا بھی چاہوں تو کس طرح بھولوں......

کہ تم تو پھر بھی حقیقت ہو کوئی خواب نہیں......

انتہائی تیز ڈرائیونگ' اپنی سلامتی کی پرواکیے بغیر' جس وقت وہ ہسپتال پہنچی' اس کا سانس بہت بری طرح پھول رہا تھا۔

تقریباً بھاگتے ہوئے قدموں کے ساتھ طویل کوریڈور طے کرتے ہوئے وہ سیال بیگم تک پہنچی تھی' جو از حد متفکر چہرے کے ساتھ کھڑی خاصی بدحواس دکھائی دے رہی تھیں۔

''انجشاء' تم آگئیں......عدنان کی حالت بہت سیریس ہے انجشاء' مر رہا ہے وہ۔'' ضبط کے سارے بندا سے دیکھ کر جیسے ٹوٹ پڑے تھے' تبھی وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھیں جبکہ انجشاء احمر' اپنی جگہ کھڑی گویا شاکڈ رہ گئی تھی۔

ابھی تین روز قبل ہی تو کومے سے باہر آیا تھا وہ' تبھی تو اس نے شکر کا کلمہ پڑھتے ہوئے' قدرے لاپرواہی برتی تھی مگر اب......اب سیال بیگم کہہ رہی تھیں کہ وہ مر رہا ہے۔

''نہیں......تم ایسے نہیں مر سکتے عدنان رؤف' میں تمہیں اس طرح سے چپ چاپ مرنے نہیں دوں گی۔''

کپکپاتے سرد ہاتھوں کی انگلیاں اپنے گلابی لبوں پر جما کر اس نے بے ساختہ قریبی دیوار کا سہارا لیا تھا۔ یہ کیا ہو رہا تھا' اس کی نفرت و پلاننگ میں' ایسا ہو جانا تو کہیں شامل نہیں تھا' سیال بیگم کی آنکھ سے گرتے ایک ایک آنسو کا درد وہ اپنے دل میں اترتا محسوس کر رہی تھی۔

گو زندگی نے اس کے ساتھ بہت برا کیا تھا' بہت سی کڑی آزمائشوں میں ڈالا تھا اسے' مگر اس کے باوجود وہ اپنی وجہ سے کسی کو مرتے ہوئے دیکھنا نہیں چاہتی تھی' لاکھ وہ اس کا قصوروار تھا' جواب دہ تھا' مگر زندگی اور موت کی جنگ میں وہ اپنی سانسیں ہار بیٹھے یہ ہرگز گوارہ نہیں تھا اسے۔ تبھی وہ سن سی نیچے زمین پر بیٹھتی چلی گئی تھی۔

جانے کیوں اس وقت اسے اپنی ساری ہٹ دھرمی' ساری نفرت' تمام تر ضد' دھری کی دھری رہ جاتی محسوس ہو رہی تھی۔

اس وقت جو شخص آئی سی یو میں زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا تھا' ڈاکٹرز جس کی زندگی کے بارے میں کچھ بھی کہنے سے قاصر دکھائی دے رہے تھے' کبھی اسی شخص کو اس نے اپنا مجازی خدا مان کر' دل کی تمام تر گہرائیوں سے چاہا تھا' یہی شخص تھا' جس کے راستہ بدل لینے پر وہ موم کی گڑیا سے ایک بے حس پتھر کے مجسمے میں تبدیل ہوئی تھی' اسی شخص نے اس پر خوشیوں اور مسکراہٹوں کے در بند کر دیئے تھے' اسی کی وجہ سے وہ اپنے عزیز ترین ماں باپ اور پیارے دادا جی کے ساتھ سے محروم ہوئی تھی۔ یہی وہ شخص تھا جس نے اس کے آنسوؤں کو پتھر کر ڈالا تھا۔

اور آج......یہی شخص ایک مرتبہ پھر اسے شکست سے دوچار کر رہا تھا۔ وہ اس کے لیے ہرگز رونا نہیں چاہتی تھی مگر پھر بھی نمکین آنسوؤں

کے چند موتی پلکوں سے لڑھک کر گالوں پر پھسل آئے تھے۔

وہ اسے قاتل سمجھتی تھی......

اپنے ارمانوں کے مسمار ہونے کا' اپنے خوبصورت خوابوں کے اجڑنے کا' اپنی ذات سے جڑے تمام عزیز تر رشتوں کے بچھڑ جانے کا' مگر ......غیر دانستگی میں قاتل تو وہ خود بھی ہو گئی تھی' قتل تو اس نے بھی کیا تھا۔

عدنان کی بے لوث اور شدید محبت کا......

اس کے بے پناہ خلوص اور مان کا' اس کی عزت نفس کا۔

اور شاید......اس کے دل و روح کا بھی' تو پھر وہ کہاں سے حق پر رہ گئی تھی؟

کسی نہ کسی طرح بدلا تو اس نے بھی لے لیا تھا' جتنے آنسو خود اس کی اپنی آنکھ سے گرے تھے اس سے کہیں زیادہ ٹکڑے تو وہ عدنان رؤف کے دل کے کر چکی تھی۔ پھر کیا فرق باقی رہ گیا تھا ان دونوں کی محبتوں میں......؟

اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے معاف کر دینا اور اپنا معاملہ خدا کی پاک و بے نیاز ذات کے سپرد کر دینا تو اس نے گوارہ ہی نہیں کیا تھا' پھر کیسے قرار ملتا اس کے دل کو......؟

اس وقت بالکل اچانک ہی اس کے ذہن میں ایک سوال اٹھا تھا۔

''اگر عدنان رؤف اس کی دنیا سے چلا گیا تو وہ کیا کرے گی......؟'' مردوں کے اس معاشرے میں' بیوگی کی چادر اوڑھ کر کیا وہ عزت سے زندہ رہ سکے گی؟

کیا اپنے وجود کی اکیلے حفاظت کر سکے گی......کیا غیر مردوں کی میلی نگاہیں' اپنے چہرے اور بدن کی طرف اٹھتی ہوئی روک سکے گی؟

کیا عدنان رؤف سے بچھڑ کر کسی اور مرد سے وابستہ ہونے کے بعد' اس سے سو فیصد وفاداری اور ایمانداری کی امید رکھ سکے گی؟ شاید نہیں......

مردوں کے اس معاشرے میں' عورت خواہ کتنی ہی ذہین اور ٹیلنٹڈ کیوں نہ ہو' مردوں کے مقابل کبھی نہیں آ سکتی۔ اپنی ہر خوبی کے باوجود' وہ زندگی بھر' اپنے شوہروں کی خامیوں کو گلے لگائے' ان کی خوشنودی کے لیے کٹھ پتلی کی مانند ناچتی ہے' باندی بن کر ان کے ساتھ ہنسی خوشی رہنے پر مجبور ہوتی ہے' کیوں......؟ صرف اور صرف' مرد کے نام کے لیے' اپنے تحفظ اور پہچان کے لیے' عزت سے سر اٹھا کر جینے کے لیے۔ تو پھر وہ اتنی بے حس کیوں بن گئی تھی......؟

کیوں اس قدر اندھی ہو گئی تھی اپنے انتقام میں' کہ اپنے نفع و نقصان کے متعلق بھی نہ سوچ سکی!

وہ سمجھتی تھی کہ اپنے والدین اور دادا دادی کی وفات کے بعد وہ بھری دنیا میں بالکل بے آسرا ہو گئی ہے لیکن اس وقت اسے احساس ہو رہا تھا کہ حقیقی معنوں میں بے آسرا تو وہ عدنان رؤف کے کھو جانے کے بعد ہو جائے گی کیونکہ اب تک عدنان رؤف کا نام اس کے ساتھ جڑا تھا' اس کے

ہوتے ہوئے کسی کی مجال نہیں تھی کہ کوئی میلی نگاہ سے اس کی طرف دیکھ بھی لیتا' لیکن اب اس کے کھو جانے کے احساس کے بعد وہ ایک دم سے جیسے تپتے آسمان تلے ننگے سر آ کھڑی ہوئی تھی۔

عدنان کی حرکتیں' اس کی باتیں' اس کا کہا ایک ایک جملہ' سماعتوں میں گونجنے لگا تھا۔

''میں تمہیں بہت خوش رکھوں گا انجشاء' خدا کے لیے اپنا فیصلہ بدل لو' پلیز۔''

''او کے...... اگر یہی تمہاری ضد ہے تو پھر سانسیں تم نہیں بیچو گی' میں اپنی زندگی ہار دوں گا انجشا۔'' اور اب اس کی سانسیں بچانے کے لیے وہ واقعی اپنی زندگی ہار رہا تھا۔

''بیچ راستے میں بھٹک جانے والے' اکثر اپنی منزل کھو دیتے ہیں' مس شاہ......''

وہ یونہی ساکت بیٹھی تھی' جب عدنان کے دوست شاہد کے الفاظ اس کے ذہن میں گونجے اور وہ چونک اٹھی۔

''آپ کو ایک مزے کی بات بتاؤں مس شاہ' ہمارے گروپ کا ہیرو' عدی'' جو حسین سے حسین تر لڑکی کو محض ایک کھلونا سمجھ کر اس سے کھیلا کرتا تھا' آپ کو پتہ ہے اس نے' آپ کو لے کر ہمارے ساتھ کتنا عجیب کیا......؟ غالباً نہیں' یقیناً وہ آپ ہی میں انٹرسٹیڈ تھا مس شاہ' اس نے پہلی بار بے اختیار ہوتے ہوئے محض آپ کے لیے ہمارے عزیز دوست مومن کو تھپڑ دے مارا تھا' بہت عجیب کیا تھا اس نے......''

شاہد کا لہجہ اس کی سماعتوں میں گونج رہا تھا اور وہ بے آواز رو رہی تھی۔

''تم کتنی سنگدل ہو انجشاء' کیسا پتھر ہے تمہارے سینے میں' جو پگھل ہی نہیں رہا۔ کیا کرو گی اس درجہ نفرت کا' جو میرے جگر کا ٹکڑا ہی نہ رہا۔ اس نے تو فقط تم سے تمہاری خوشیاں ہی چھینی تھیں' مگر تم نے تو اسے موت کے منہ میں دھکیل دیا انجشاء' کیوں......؟ محض اس لیے کہ میرا بیٹا تم سے پیار کرتا ہے' تمہیں تمہاری رضا سے پانا چاہتا ہے۔ تم اسے اس کی محبت کی سزا دینا چاہتی ہو یا شرافت کی' بولو...... کیوں کر رہی ہو تم اس کے ساتھ یہ سب۔''

اب کے سیال بیگم لہو رنگ آنکھوں کے ساتھ شاہد کو پیچھے ہٹا کر اس کے مقابل آ کھڑی ہوئی تھیں۔

''ادھر آؤ لڑکی اور دیکھو اس دیوانے لڑکے کو جو تمہاری چاہ میں خود اپنا آپ بھلا بیٹھا ہے' یہ کبھی نہیں رویا انجشاء' مگر تم نے خون کے آنسو رلا دیا ہے اسے' دیکھو اسے' یہ کبھی ایک روپیہ کمانے کے لیے بھی سنجیدہ نہیں ہوا' مگر تمہاری طرف سے دائر کیس میں' تمہیں نہ ہارنے کے لیے' اس نے اپنے آپ کو داؤ پر لگا دیا ہے' بولو کرتا ہے کوئی لڑکا' کسی لڑکی سے ایسی محبت......؟ ایسے کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں تم میں لڑکی' جو میرے بچے کے آنسو بھی تمہارے دل کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر پا رہے۔ خدا کے لیے ہم پر ترس کھاؤ انجشاء' بھری دنیا میں ہمارے لیے ایک اس کے سوا اور کوئی نہیں۔''

سیال بیگم کا درد سے چور لہجہ اب بھی اس کی سماعتوں میں گونج رہا تھا کہ اچانک اس کے اپنے ہی اندر کی لڑکی اس کے مقابل آ کھڑی ہوئی۔

''بس......مل گیا تمہیں سکون......؟ ہو گئی تمہارے انتقام کی آگ ٹھنڈی' اب اٹھو اور اپنی کامیابیوں کے جشن مناؤ' جا رہا ہے وہ تمہیں چھوڑ کر' ہمیشہ ہمیشہ کے لیے' یہی چاہتی تھیں ناں تم' لو قدرت نے تمہاری ہر تمنا خود ہی پوری کر دی' اب کیوں آنسو بہا رہی ہو تم......جاؤ جا کر ساری دنیا کو بتاؤ کہ تم جیت گئی ہو' اس کی محبت' تمہاری نفرت سے ہار گئی ہے۔ اٹھو انجشاء احمر' اور جا کر اپنی جیت کو سیلیبریٹ کرو۔''

ٹپ ٹپ ٹپ......آنسو اب بھی متواتر اس کی آنکھوں سے پھسل کر گالوں پر لڑھکتے ہوئے گریبان میں جذب ہو رہے تھے۔

اب بھی شاعر رہوں' کس کی خاطر رہوں؟

کون ہے جو میرے لفظ و معنی کی آنکھوں سے بہتے ہوئے

آنسوؤں میں چھپے درد چنتا پھرے

خواب بنتا پھرے

کون ہے جو میرے خون ہوتے ہوئے دل کی آواز پر

اپنی آواز کے ہونٹ رکھتا پھرے

کون آنکھیں میری دیکھ کر یہ کہے

کیا ہوا جانِ جاں' کب سے سوئی نہیں

اس سے پہلے تو تم اتنی روئی نہیں

اب بھلا کس لیے' خوبصورت سی آنکھیں پریشان ہیں

اپنی حالت پر خود اتنی حیران ہیں

کون بے چین ہو' کون بے تاب ہو' موسم ہجر کی شام تنہائی میں

آبلہ پائی میں......کون ہو ہمسفر' گردِ بے راہ گزر

کوئی رستہ نہیں کوئی راہی نہیں

در پہ دستک کی کوئی گواہی نہیں

دل کے ویران و برباد صفحات پر جس قدر لفظ لکھے تھے بیکار ہیں

ایک لمبی جدائی کے آثار ہیں

سوچتی ہوں کہ اب......

ان خیالوں سے خوابوں سے باہر رہوں

کیوں میں شاعر رہوں

''کس'' کی خاطر رہوں

''نہیں...... میں تمہیں اس طرح سے چپ چاپ جانے نہیں دوں گی' میں مانگوں گی خدا سے تمہاری زندگی واپس' ہاں میں نے اب بھی تمہیں معاف نہیں کیا ہے' لیکن پھر بھی تمہیں میرے لیے زندہ رہنا ہوگا عدنان' ابھی اور جینا ہوگا تمہیں۔''

رم جھم آنسوؤں کی برسات میں ایک عزم سے سوچتے ہوئے' اس نے اپنی آنکھوں کو رگڑ ڈالا تھا جب اچانک ہی ایمرجنسی روم کا دروازہ کھلا اور وائٹ پینٹ کوٹ میں ملبوس سوبر سے ڈاکٹر وقار تیز تیز چلتے ان کے قریب آ رکے۔

بڑا کٹھن ہے راستہ' جو آسکو تو ساتھ دو
یہ زندگی کا فیصلہ مٹا سکو تو ساتھ دو
بڑے فریب کھاؤ گے' بڑے ستم اٹھاؤ گے
یہ عمر بھر کا ساتھ ہے' نبھا سکو تو ساتھ دو

کبھی ویران رستوں پر
کوئی انجان سی دستک
اگر تم کو سنائی دے
صدا کی شکل میں آکر کہے' محبت نام ہے میرا
پلٹ کر دیکھنا مت تم
کہ اس کارِ محبت میں......
اذیت ہی اذیت ہے

موسم بے حد خوب صورت ہو رہا تھا۔ ساحل سمندر کے قریب بنا یہ علاقہ تو اپنی خوب صورتی اور ٹھنڈک میں ویسے ہی بے مثال تھا۔ اردگرد چلتے پھرتے لوگ' زندگی کو بھرپور طریقے سے انجوائے کر رہے تھے مگر وہ خوش نہیں تھا' اداسی جیسے اس کے اندر کہیں ٹھہر گئی تھی۔ وہ سوچنا نہ بھی چاہتا' تب بھی اریشہ خان کا تصور اسے چین لینے نہیں دے رہا تھا۔ حالانکہ اپنی طرف سے اس نے ہر ممکن کوشش کر ڈالی تھی اسے بھلانے کی' سر جھٹک جھٹک کر اس نے اریشہ خان کے تصورات سے پیچھا چھڑانے کی ناکام کوشش بھی کر ڈالی تھی مگر......وہ ہر جگہ' ہر چہرے میں نظر آ رہی تھی۔

''ایک سوال پوچھوں ازمیر' سچ سچ جواب دو گے......؟''

اپنی لندن رخصتی سے قبل جب وہ اس کے کمرے میں اسے خدا حافظ کہنے آیا تھا۔ تب اس نے سرخ برستی آنکھوں کے آنسو اپنے دوپٹے سے گالوں پر رگڑتے ہوئے پوچھا تھا۔ جواب میں وہ چپ چاپ بغور اسے دیکھنے لگا تھا۔

''تت......تم نے سائرہ سے منگنی کیوں کی ازمیر' تم تو شہرین خان سے پیار کرتے ہو' اسی کے پاس لوٹ کر واپس جا رہے ہو' پھر سائرہ کے ساتھ یہ فریب کیوں کیا تم نے؟''

ازمیر نے اس کے چہرے سے نگاہ چرائی تھی مگر اس کے باوجود اریشہ کی آنکھوں میں تیرتے آنسو اسے تکلیف پہنچا رہے تھے تب ہی وہ دونوں ہاتھ جینز کی پاکٹس میں گھسا کر رخ پھیرتے ہوئے قدرے بھاری لہجے میں بولا۔

''اس میں بھابھی کی خوشی تھی اریشہ' پھر سائلہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے......''

''اوہاں......میں تو بھول ہی گئی تھی کہ سائلہ آپ سے محبت کرتی ہے ازمیر صاحب' سوری......لیکن......لیکن سب ہی محبت کرنے والے تو بامراد نہیں ٹھہرتے' اس راہ گزر پر کچھ لوگ آبلہ پائی کے باوجود در بدر بھٹکتے پھرتے ہیں پر ان کو ان کی منزل نہیں ملتی' جانتے ہو کیوں......؟''

ازمیر کو اس کا زخمی لہجہ کمزور کر رہا تھا' مگر پھر بھی وہ خود پر ضبط کیے خاموش کھڑا رہا۔ جب وہ سخت اذیت کے عالم میں آنسو پیتے ہوئے بولی۔

''اس خاردار رہگزر پر' کچھ بدنصیب آبلہ پا مسافر' ساری زندگی دربدر بھٹکتے اور مر جاتے ہیں کیونکہ......کیونکہ کسی محبت کی نظر' ان کے اندر تک نہیں اترتی' سچ بتانا ازمیر' کیا سائلہ مجھ سے زیادہ خوب صورت ہے؟ مجھ سے زیادہ خیال رکھتی ہے تمہارا بولو......تمہیں کبھی میں خوب صورت کیوں نہیں لگتی......؟ مجھ سے محبت کیوں نہیں ہوتی تمہیں......؟''

ازمیر شاہ جس اذیت سے بچنا چاہتا تھا وہ بالآخر اریشہ خان نے اسے سونپ دی تھی۔ تب ہی وہ ضبط سے ہونٹ کچلتے ہوئے بولا۔

''تم سے زیادہ خوبصورت' اس دنیا میں میرے لیے کوئی نہیں اریشہ' شاید میں کبھی تمہیں نہ بتا سکوں کہ تم میرے لیے کیا ہو......لیکن......ضروری تو نہیں ہے کہ ہمیشہ زندگی ہمارے اشاروں پر چلے۔ یہ ایسا کھیل ہے' جس میں ہم کبھی نہیں جیت سکتے' برابر بھی نہیں ہوتے اور یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ جاؤ ہم نہیں کھیلتے' اس دل میں تمہارا جو مقام ہے وہ کبھی کم نہیں ہوگا اریشہ' مگر جہاں تک سائلہ کا سوال ہے تو اسے شہرین خان کے متعلق سب معلوم ہے' میں نے اس سے کچھ بھی نہیں چھپایا......وہ مکمل آگاہی کے باوجود میرا ساتھ نبھانے کو تیار ہے......''

اریشہ نے اس بار کچھ نہیں کہا تھا' وہ خاموش کھڑی پلکیں جھپکا جھپکا کر اپنے آنسو پینے کی کوشش کرتی رہی تھی۔

''میں جہاں بھی رہوں' تم ہمیشہ میرے ساتھ رہو گی اریشہ......''

کھل کر محبت کا اظہار کرنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ سو دبے دبے لفظوں میں وہ اپنے دل کا حال اس پر عیاں کر رہا تھا' جب اریشہ کچھ دیر تک اس کی چوڑی پشت کو گھورنے کے بعد بالآخر چپ چاپ اپنے کمرے سے باہر نکل گئی تھی مگر اس کی آنکھوں میں تیرتے آنسو تا حال ازمیر شاہ کو ڈسٹرب کیے ہوئے تھے۔

وہ اریشہ خان کے متعلق اپنے دل کو ٹٹولنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ خود سے یہ پوچھنا بھی نہیں چاہتا تھا کہ اریشہ خان کی اس کی زندگی میں کیا اہمیت ہے؟

کیونکہ وہ اپنے دل کا جواب جانتا تھا۔ ہوا' پانی خوراک سے بڑھ کر اسے اریشہ خان کی طلب تھی۔ اس کی ذات کا پور پور اریشہ خان کی محبتوں کا طلب گار تھا۔ اسے سوچنا' سراہنا' اس سے ٹوٹ کر پیار کرنا' زندگی کے ایک ایک پل کو اس کے ساتھ گزارنا اس کی اولین خواہش' اس کا خواب تھا مگر......اس کا کوئی بھی خواب تعبیر کے مراحل تک پہنچا ہی کب تھا؟ خوشیاں تو رنگین تتلیوں کی مانند ہمیشہ اس کے ہاتھ سے نکلتی رہی تھیں۔ پاکستان سے اسے انگلینڈ آئے ہوئے پورا ایک ماہ ہو گیا تھا مگر اس ایک ماہ کے دوران اریشہ نے پہلے کی طرح اسے کوئی خط یا ای میل ارسال نہیں کی

تھی وہ گھنٹوں کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا بے مقصد انگلیاں چلاتا رہتا مگر جس Mgs جس ای میل کا اسے شدت سے انتظار تھا' وہی نہیں آ رہی تھی۔ ازمیر سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ اس سے خفا ہے یا اس کے کسی اقدام سے' اس قدر شدید ہرٹ ہوئی ہے کہ اب اس سے رابطہ رکھنا بھی گوارہ نہیں کر رہی' وہ یہاں خود کو بہلانے آیا تھا۔ اریشہ خان کے سحر سے نکل کر اپنی ذات کو ہلکا پھلکا کرنے آیا تھا مگر...... کتنی عجیب بات تھی کہ وہ پہلے سے زیادہ الجھ کر رہ گیا تھا۔

یہ کسک' یہ الجھن نجانے ابھی کتنے دنوں پر محیط رہتی کہ کل رات ہی سائلہ خان نے اپنی ای میل میں اسے اریشہ کی جلد شادی کی المناک خبر سنادی۔ اس کے مطابق ''شاہ ولاج'' میں اگلے دو تین ہفتوں کے بعد اریشہ اور اذہان کی شادی کا فیصلہ طے پا گیا تھا' لہٰذا دونوں طرف کی تیاریاں اور جوش و خروش اپنے عروج پر تھا' سائلہ نے اپنی ای میل میں لکھا تھا کہ وہ اس فنکشن میں اس کے ساتھ کی خواہاں ہے مگر ازمیر کی سماعتیں اور بصارتیں تو جیسے سن ہو گئی تھیں۔ کسی ایک پل کا قرار بھی اسے نہیں رہا تھا۔ کل رات سے مسلسل رو رہا تھا جس کی وجہ سے آنکھوں کی جلن مزید بڑھ گئی تھی۔ خود پر ضبط کے کڑے بند باندھے۔ وہ خدا سے صرف اور صرف اریشہ خان کی خوشیوں کی بھیک مانگ رہا تھا۔ اپنے لیے سکون اور صبر کی طلب بھی اب اسے نہیں رہی تھی۔ یہاں ساحلِ سمندر کے قریب زندگی کی گہما گہمی بھی اسے اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکی تھی۔ لہٰذا شدید اکتاہٹ کا شکار ہو کر وہاں سے اٹھ آیا مگر یہ کیا......؟ وقت ایک مرتبہ پھر جیسے گھوم کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا' پھٹی پھٹی نگاہوں کے حصار میں بے ساختہ جو چہرہ اس وقت مقید ہو گیا تھا وہ سوائے شہزرین خان کے اور کسی کا نہیں ہو سکتا تھا تب ہی وہ جیسے ساکت رہ گیا تھا۔

☆☆☆

داغِ دل ہم کو یاد آنے لگے
لوگ اپنے دیئے جلانے لگے
خود فریبی تھی' خود فریبی ہے
دور کے ڈھول بھی سہانے لگے
لوگ اپنے دیئے جلانے لگے
اب تو ہوتا ہے ہر قدم پر گماں
ہم یہ کیسا قدم اٹھانے لگے
لوگ اپنے دیئے جلانے لگے
داغِ دل ہم کو یاد آنے لگے

وہ اپنے اردگرد سے بے نیاز پلکیں موندے ماضی کے گرداب میں الجھا ہوا تھا۔ بار بار بھلانے کی کوشش میں بھی' وہ تلخ ترین دن' اس کی یادوں سے باہر نہیں نکل سکے تھے۔ جب اسے ہر قدم پر' ہر موڑ پر اپنی مما کی ضرورت تھی مگر اس کے پاس اس کی مما نہیں تھی' اس روز سکول میں اس کا رزلٹ ڈے تھا۔ سب ہی بچوں کی مائیں خوشی خوشی تیار ہو کر ان کے ساتھ آئی تھیں مگر وہ ایک کونے میں کھڑا چپ چاپ افسردگی سے' محض اپنی مما کے

متعلق سوچ کر رہ گیا۔ گھر میں سوائے نانا جی کے اور کسی کو بھی اس کے رزلٹ سے دلچسپی نہیں تھی مگر نانا جی' پچھلے کئی روز سے چارپائی پر پڑے بیماری کی زد میں آئے ہوئے تھے لہٰذا اتنے اہم دن پر بھی چاروناچار اسے اکیلے ہی اپنا رزلٹ سننے کے لیے آنا پڑا تھا۔ سامنے خوب بڑے سارے اسٹیج پر اس کے تمام اساتذہ' معزز مہمان اور پرنسپل صاحبہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ سب نہایت خوش دکھائی دے رہے تھے' مگر وہ خوش نہیں تھا۔ اس وقت شدت سے اس کا من چاہ رہا تھا کہ اس کی مما بھی کہیں سے نکل کر اس کے سامنے آجائے اور تب وہ خوشی خوشی انہیں اپنے تمام دوستوں سے متعارف کروائے' بلال' اطہر' طاہر' عماد سب کو بتائے کہ اس دنیا میں کوئی اس کا بھی اپنا ہے جو اس کی کامیابی پر خوش ہو کر اس کا ماتھا چوم سکتا ہے' مسکرا مسکرا کر سب سے مبارک باد وصول کرتے ہوئے اس پر فخر کر سکتا ہے' مگر افسوس' صد افسوس کہ اس کی مما پورے فنکشن کے دوران کہیں سے نکل کر اس کے سامنے نہ آسکیں۔ وہ تہی دست کا تہی دست کھڑا حسرت سے سوچتا رہ گیا۔

سامنے اسٹیج پر نصب مائیک میں فرسٹ پوزیشن حاصل کرنے پر' کئی بار اس کا نام پکارا گیا تھا مگر وہ اپنے خیالات میں کچھ ایسا الجھا کہ اپنے نام کی بازگشت کو سن ہی نہیں پایا' تب پرنسپل صاحبہ کی نگاہ اچانک اس پر پڑی تھی اور انہوں نے وہیں اسٹیج سے اسے پکار لیا تھا۔

''اریج بیٹے! جلدی سے اسٹیج پر آؤ' آپ ہی کا نام پکارا جا رہا ہے۔''

پرنسپل صاحبہ کی پکار پر بری طرح چونکتے ہوئے وہ اسٹیج کی طرف لپکا تھا۔ پورا ہال تالیوں سے گونج رہا تھا۔ اوپر اسٹیج پر بیٹھے اس کے اساتذہ فخریہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے' وہاں موجود معزز مہمانوں کی نگاہوں میں بھی اس کے لیے ستائش تھی' مارے خوشی کے اس کے ہاتھ اور پاؤں کپکپا رہے تھے مگر یہ خوشی اس وقت کافور ہوگئی جب اسے انعام دینے والی مہمان شخصیت نے مہربان لہجے میں پوچھا۔

''آپ کے پیرنٹس کہاں ہیں بیٹے......؟ انہیں بھی اسٹیج پر بلایئے۔''

تب اس کا دل درد کے پاتال میں ڈوب کر ابھرا تھا۔ خشک لبوں پر زبان پھیر کر نگاہیں جھکاتے ہوئے' بمشکل وہ کہہ پایا تھا۔

''میرے ابو نہیں ہیں سر......''

''اوہ ویری سیڈ' لیکن آپ کی مما......؟ کیا وہ بھی نہیں ہیں......؟''

''مما ہیں لیکن وہ میرے ساتھ نہیں آسکیں کیونکہ ان کے پاس میرے لیے ٹائم نہیں ہے۔''

مہمان شخصیت کے سوال پر اس کا دل کٹا تھا' مگر اس نے آنسوؤں کو پلکوں کا بند توڑنے کی اجازت نہیں دی۔

''کمال ہے......ایک ماں کے پاس اپنے بچے کی اتنی بڑی خوشی شیئر کرنے کا ٹائم نہیں......''

مہمان شخصیت نے پہلے اس کی اور پھر اسٹیج پر بیٹھی دیگر معزز شخصیات کی طرف حیرانگی سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ جواب میں وہ اپنا کپ لے کر خاموشی سے اسٹیج سے نیچے اتر آیا۔

گھر میں کسی کو بھی اس کے فرسٹ آنے سے کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی تھی۔ لہٰذا اس نے وہ پورا دن اور پوری رات رو رو کر سخت اذیت کے عالم میں گزاری تھی۔ نتیجتاً اگلے روز اسے سخت بخار ہو گیا تھا مگر وہاں کوئی اس کے سرہانے بیٹھ کر اس کی صحت کے لیے دعا کرنے والا نہیں تھا۔ پورا

دن وہ جلتے وجود کے ساتھ بھوکا پڑا رہا تھا مگر کسی کے پاس اتنی فرصت نہیں تھی کہ ایک لمحے کے لیے ہی سہی کم از کم اس کے کمرے میں جھانک کر اس کا حال ہی پوچھ لے۔

زندگی میں ایسے اور بھی بہت سے تکلیف دہ موڑ آئے تھے جب اسے اپنی مما کی کمی شدت سے محسوس ہوئی تھی۔ شدت سے اس کا دل چاہا تھا کہ وہ کہیں سے نکل کر اس کے سامنے آ جائیں تو وہ ان کی آغوش میں چھپ کر اپنے اندر کے سارے آنسو باہر نکال پھینکے۔ پیرس میں قیام کے دوران ایک بار اس کا بہت زبردست ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ ڈاکٹرز اس کی زندگی کے بارے میں کچھ خاص پُرامید نہیں تھے تب...... تب بھی اسے اپنی مما کی بہت یاد آئی تھی مگر تب بھی وہ اس کے پاس نہیں آ سکی تھیں۔ تو پھر اب جب کہ وہ بہل گیا تھا۔ جب کہ اسے صبر آ گیا تھا' اب کیوں وہ لوگ اسے ایک مرتبہ پھر کانٹوں پر گھسیٹنا چاہ رہے تھے۔ اب تو وہ خود ہی اپنی ذات میں مدفن ہو چکا تھا۔ تمنائیں' خواہشات' حسرتیں' سب سے دامن چھڑا لیا تھا اس نے تو پھر...... وہ کیوں اسے پھر سے درد کے پاتال میں دھکیلنے کے لیے اس کے سامنے آ گئی تھیں۔ کیوں سب اس کا صبر آزمانے پر تلے ہوئے تھے؟

میں بکھر کر سمٹ نہیں سکتا
اب نہ کر پاش پاش مجھے
اب تیرے کام کا نہیں ہوں میں
زندگی جا نہ کر تلاش مجھے

سوچ سوچ کر دماغ کی رگیں جیسے پھٹنے کو تیار تھیں۔ اس میں مزید ضبط کا یارا نہیں تھا۔

''بڑی ماں مر رہی ہیں اریج! بیٹھے رہو تم اپنے گلے شکوے لیے۔ یوں ہی خفا رہو ان سے مگر وہ تمہیں چھوڑ کر چلی جائیں گی' پھر پچھتاتے رہنا تم' وہ تمہارا حال سننے کے لیے لوٹ کر کبھی نہیں آئیں گی......''

تمکین رضا کے سرد لہجے کی بازگشت اسے سخت مضطرب کر رہی تھی۔ لاکھ وہ ان سے خفا تھا بدگمان تھا مگر وہ یوں کچھ کہے سنے بغیر چپ چاپ ہمیشہ کے لیے پلکیں موند لیں' بھلا یہ بھی اسے کہاں گوارہ تھا؟

تب ہی کچھ سوچ کر اس نے آہستہ سے اپنی پلکیں موندیں اور سر کرسی کی پشت سے ٹکا کر جسم کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے سونے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔

☆☆☆

''مم...... میرے اریج کو بلا دو۔ خدا کے لیے مجھے میرے بچے سے ملا دو۔ میں آپ سب کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ مجھے میرے اریج کے پاس لے چلو۔ خدا کے لیے مجھے میرے بچے کے پاس لے چلو پلیز......''

رخسانہ بیگم کی حالت اب خطرے سے باہر تھی۔ لہٰذا انہیں آئی سی یو سے پرائیویٹ روم میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ پچھلے تین دن سے وہ زندگی

اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھیں۔ ''حسن ولاج'' کے تمام افراد جن میں فاروق صاحب اور ان کی بیگم سمیہ احمد کے ساتھ ساتھ ان کا بیٹا عاشر اور بہو نورینہ بیگم بھی شامل تھے اس کے علاوہ تمکین کی مما آسیہ بیگم بھی خلوصِ دل سے ان کی صحت اور لمبی عمر کے لیے دعائیں مانگ رہی تھیں۔ آسیہ بیگم کو اب پشیمانی ہو رہی تھی کہ آخر انہوں نے اتنے سالوں کے بعد رخسانہ بیگم سے اریج کا ذکر کر کے ان کے زخموں کو تازہ کیا ہی کیوں...... جب کہ تمکین دل ہی دل میں خود کو کوس رہی تھی کہ آخر اس نے اریج احمر سے مکمل بات کیے بغیر اسے رخسانہ بیگم سے ملوایا ہی کیوں؟ نہ وہ اریج کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتیں نہ ان کا یہ حال ہوتا۔

ان دونوں سے الگ کوریڈور کے ایک طرف دیوار سے لگا اشعر احمد بھی پچھلے سات گھنٹوں سے سب سے لاتعلق بنا مسلسل روئے جا رہا تھا۔ وہ بھی لاکھ ان سے خفا تھا مگر اس کی دائمی جدائی کا بار جھیلنا خود اس کے لیے بھی ناممکن تھا۔ سو سب سے الگ ہو کر کھڑا اشک بار نگاہوں سے ان کے کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے وہ دل ہی دل میں خدا سے ان کی زندگی اور مکمل صحت یابی کی دعائیں مانگ رہا تھا۔

''مم...... مجھے میرے اریج سے ملا دو۔ خدا کے لیے مجھے میرے بچے کی شکل دکھا دو پلیز۔'' بھل بھل بہتے آنسوؤں سے بے نیاز ہوش سنبھالتے ہی وہ پھر سے بے اختیار ہو گئی تھیں۔ تب ڈاکٹر نے کسی بھی قسم کے خطرے کے پیش نظر انہیں فوراً نیند کا انجکشن دے کر سلا دیا۔

''یہ اریج احمر کون ہیں......؟'' ڈاکٹر احسان زیدی نے پہلی بار براہ راست سعید صاحب سے اریج کے متعلق سوال کیا تھا' جواب میں وہ نظریں چراتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولے۔

''وہ بھی بیٹا ہے ان کا...... ملک سے باہر ہے اس لیے ان کا یہ حال ہے۔''

''جو بھی ہے۔ آپ کو فوراً انہیں پاکستان بلانا ہوگا سعید صاحب کیونکہ ان کے بغیر مریضہ کی موجودہ حالت پر قابو پانا ہمارے لیے بہت دشوار ہے لہٰذا آپ جلد مسٹر اریج کو یہاں بلا لیجیے۔ بصورت دیگر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

ایک مرتبہ پھر اشعر کو اریج احمر کے وجود سے شدید نفرت کا احساس ہوا تھا۔ اس کی پیاری ماں اس پر اپنی بے لوث محبتوں کے خزانے نثار کرنے والی پیاری ماں۔ آج اس کے رقیب کی وجہ سے زندگی اور موت کے درمیان تین دن کی جنگ لڑ کر واپس لوٹی تھیں؟ اس دوران اگر انہیں کچھ ہو جاتا تو......

اس ''تو'' کے بعد وہ کچھ بھی سوچنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ تب ہی ہاتھ سے پھسلتی گیلی ریت کی مانند بکھرتا چلا جا رہا تھا۔

''پاپا! مما...... ٹھیک تو ہو جائیں گی ناں...... انہیں...... انہیں کچھ ہوگا تو نہیں ناں......؟''

ڈاکٹر صاحب کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔ جب وہ بائیں ہاتھ کی پشت سے آنکھیں رگڑتے ہوئے بالآخر سعید صاحب کے پاس چلا آیا۔ جنہوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر فوراً ہی اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

''حوصلہ رکھو بیٹے۔ اللہ نے چاہا تو آپ کی مما ضرور اچھی ہو جائیں گی۔''

ان کا اپنا لہجہ اس وقت خاصا بھیگا ہوا تھا۔ ازدواجی زندگی کے ستائیس سال خوش گوار یادوں کی صورت تصور میں آ رہے تھے۔ آج تک

رخسانہ بیگم نے انہیں اپنے کسی عمل سے کبھی تکلیف نہیں پہنچائی تھی۔ کبھی ان سے کسی قسم کا کوئی گلہ نہیں کیا تھا۔ ہمیشہ ان کی رضا میں راضی رہی تھیں۔ جیسے وہ کہہ دیتے تھے ویسے ہی سر جھکا کر مان لیا کرتی تھیں۔ کوئی خفگی، بحث یا اختلاف انہوں نے نہیں رکھا تھا مگر آج...... آج شاید وہ حوصلے کی تمام پتواریں کھو چکی تھیں۔ کیا کرتیں...... ؟ ایک عورت ہی تو تھیں۔ ایک عورت نہیں ماں...... مامتا تھیں وہ...... پھر حوصلہ نہ ہارتیں تو کیا کرتیں...... ؟ سعید صاحب کو آج حقیقی معنوں میں اپنی خود غرضی پر پشیمانی ہو رہی تھی۔

ان کی حالت اب خطرے سے کافی باہر تھی مگر اس کے باوجود ''حسن ولاج'' کے افراد بہت کم ان سے بات چیت کر رہے تھے۔ خود وہ بھی سارا دن آنکھوں پر بازو دھرے لیٹی رہتی تھیں۔ اس روز بھی شام ڈھلے تمکین انہیں دوا کھلانے کے لیے کئی روز کے بعد ان کے قریب آئی تو ان کا ابتر حال دیکھ کر تڑپ اٹھی۔ وہ غالباً ''نہیں یقیناً'' اپنا دایاں بازو دونوں آنکھوں پر دھرے، بے آواز رو رہی تھیں۔ تب ہی تمکین نے آہستہ سے انہیں پکارا۔ تو وہ پھر سے اپنا ضبط کھو بیٹھیں۔

''تن...... تمی بیٹے...... تم ہی میرے اریج کو بلا لاؤ۔ تمہارا تو دوست ہے ناں وہ۔ خدا کے لیے اسے ایک بار میرے سامنے لے آؤ۔ میں اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر اسے منا لوں گی۔ صرف ایک بار بیٹے پلیز......'' آج کل آنسوؤں پر سے ان کا اختیار اٹھ گیا تھا۔ وقت بے وقت ان کی آنکھیں بھیگی رہتی تھیں۔ ڈاکٹرز نے ان کی زندگی کے لیے خوشی کو لازم قرار دے دیا تھا مگر تمکین اس سلسلے میں خود کو قطعی بے بس تصور کر رہی تھی کیونکہ اریج نے اسے صاف کورا جواب دے کر اپنے گھر سے رخصت کر دیا تھا۔ وہ اس کی کوئی بھی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ پھر بھلا وہ کیسے اسے ہسپتال تک گھسیٹ کر لاتی...... ؟ اس وقت اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے...... ؟

''صرف ایک بار میرے بیٹے کو مجھ سے ملا دو تمی، میں زندگی بھر تمہارا یہ احسان نہیں بھولوں گی......'' نم آنکھوں سے لڑھکتے آنسو بڑی تیزی سے گالوں کو بھگو رہے تھے۔ جب انہوں نے تمکین کے سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیئے۔ عین اسی لمحے نڈھال سے اشعر احمد نے کمرے کی دہلیز پر قدم رکھا تھا۔ لہٰذا قدرے تڑپ کر ان کی طرف آیا۔ پھر ان کے ہاتھوں کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھام کر چومتے ہوئے بولا۔

''کیا میں آپ کا بیٹا نہیں ہوں مما...... ؟ کیا اب آپ صرف اریج کی ممی ہیں؟ مجھ سے کوئی رشتہ نہیں رہا آپ کا...... ؟'' رخسانہ بیگم نے دیکھا کہ وہ رو رہا تھا۔ لہٰذا انہوں نے فوراً اسے اپنی آغوش میں سمیٹتے ہوئے ڈھیر سارا پیار کر ڈالا۔

''تم تو میری جان ہو بیٹے۔ تمہاری ذات میں گم ہو کر ہی تو اتنے عرصے میں اس بدنصیب کے بغیر زندہ رہی ہوں مگر اب میرے صبر کی طنابیں ٹوٹ گئی ہیں اشعر، وہ محبت کا پیاسا ہے۔ بہت دکھ اٹھائے ہیں اس نے...... میں ان دکھوں کا ازالہ کرنا چاہتی ہوں۔ اس کے حصے کی محبت دینا چاہتی ہوں۔''

رندھے ہوئے لہجے میں بولتیں وہ بہت دکھی دکھائی دے رہی تھیں مگر زیادہ رونا اور بولنا دونوں ہی ان کے لیے خطرناک تھا لہٰذا تمکین نے بمشکل انہیں نیند کی گولیاں دے کر سلا دیا۔ اگلے روز وہ ہسپتال سے گھر شفٹ ہو گئیں۔ تمکین کا زیادہ تر وقت اب ان کے ساتھ ہی بسر ہوتا تھا۔ اس وقت بھی وہ انہیں سیب چھیل کر کھلا رہی تھی جب کہ آمنہ بیگم اور آسیہ بیگم ان کے ساتھ باتوں میں مشغول تھیں جب ان کے کمرے کی دہلیز کے پار کسی

کے بھاری بوٹوں کی چاپ ابھری اور رخسانہ بیگم کا دل اچھل کر جیسے حلق میں آ گیا۔ کس درجہ بے قراری کے ساتھ فوراً چونک کر انہوں نے دروازے کی طرف دیکھا تھا۔ جہاں وہ گرے شلوار سوٹ میں ملبوس' نڈھال سراپا لیے دروازے کی اوٹ میں کھڑا ان کی طرف دیکھتے ہوئے آنسو بہا رہا تھا تب وہ دوپٹے سے قطعی بے نیاز ہو کر اپنے بستر سے اٹھیں اور تڑپ کر لڑکھڑاتی دہلیز کی طرف بڑھ گئیں۔

☆☆☆

منزلیں بھی اس کی تھیں

راستہ بھی اس کا تھا

ساتھ ساتھ چلنے کا' فیصلہ بھی اس کا تھا

ایک میں اکیلا تھا' قافلہ بھی اس کا تھا

اور پھر اچانک ہی......

راستہ بدلنے کا فیصلہ بھی اس کا تھا

آج میں اکیلا ہوں

آج میرا دل مجھ سے سوال کرتا ہے

لوگ تو سب اس کے تھے

کیا خدا بھی اس کا تھا......؟

''ڈاکٹر صاحب! ام...... میرا عدنان کیسا ہے......؟ وہ بچ تو جائے گا ناں ڈاکٹر صاحب......؟''

وہ سیال بیگم جو اپنی چالاکی' ہوشیاری' رہن سہن' عقل و فراست اور فیشن میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتی تھیں اس وقت عام سے کپڑوں میں ملبوس' خود سے قطعی بے نیاز ہوئیں' وہ صرف اور صرف اپنے اکلوتے لختِ جگر کے لیے فکر مند دکھائی دے رہی تھیں۔ انجشاء کو ان کے حال پر ترس آ رہا تھا اور شاید خدا کی پاک ذات کو بھی ان پر رحم آ گیا تھا۔ تب ہی ڈاکٹر کی محنت بامراد ٹھہری تھی۔

''محترمہ! عدنان صاحب کی حالت اب پہلے سے کافی بہتر ہے۔ ہمارا آپریشن اللہ کی مہربانی سے کامیاب ہوا ہے مگر جب تک وہ ہوش میں نہیں آ جاتے' ان کے بارے میں کچھ بھی کہنا قبل از وقت ہوگا......''

معمولی سی تسلی ہی سہی' مگر ان کا دل ٹھہر گیا تھا۔ آنسوؤں سے بھری نگاہیں موند کر انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا تھا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہی کافی تھا۔ لہٰذا انہوں نے ڈاکٹر کی نئی اطلاع پر سجدۂ شکر ادا کرتے ہوئے فوراً دس کالے بکروں کے صدقے کا حکم دے دیا تھا۔

مکمل طور پر مشینوں میں جکڑے عدنان رؤف کو محض ایک نظر دیکھ کر ان کی ڈھارس بندھ گئی تھی۔ زندگی میں آج تک وہ کبھی کسی سانحے پر نہیں روئی تھیں۔ بڑی سے بڑی مصیبت پر بھی ان کے حواس کبھی معطل نہیں ہوئے تھے۔ کبھی کسی مجبوری نے ان کا سرنگوں نہیں ہونے دیا تھا مگر آج

......وہ ہار گئی تھیں۔ زندگی اور موت کے بیچ الجھے ان کے اکلوتے لختِ جگر کی حالت نے انہیں رلا دیا۔ قسمت کے اس امتحان پر ان کا سرنگوں ہو کر رہ گیا تھا۔ زندگی میں کبھی کسی مشکل سے نہ گھبرانے والی وہ عورت' یہاں اس موڑ پر ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئی تھی۔ اپنا تمام تر حوصلہ ہار گئی تھی۔

انجشاء احمر اس روز ان سے کچھ بھی نہیں کہہ سکی تھی۔ عدنان رؤف کی زندگی خطرے سے باہر پا کر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی وہ چپ چاپ گھر واپس پلٹ آئی تھی۔

کورٹ سے ان دونوں کی پیشی کے لیے بار بار نوٹس آ رہے تھے۔ انجشاء کو آج کل کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ کورٹ سے آتے' پیشی کے یہ نوٹس تو بالکل نہیں۔ تب ہی اس روز بڑی سوچ وبچار کے بعد بالآخر اس کی کپکپاتی انگلیوں نے اپنے ذاتی وکیل مسٹر احسان رانا کا پرسنل موبائل نمبر پریس کر ڈالا۔

''ہیلو......احسان رانا اسپیکنگ......''

رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔ تب ہی دوسری طرف سے احسان رانا کی آواز نیند میں ڈوبی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک پل کے لیے انجشاء کو اپنی حماقت کا احساس ہوا مگر دوسرے ہی لمحے وہ اپنے احساسات کو پس پشت ڈالتے ہوئے بولی۔

''میں انجشاء......آئی ایم سوری کہ میں نے اتنی رات گئے آپ کو ڈسٹرب کیا......''

اس لمحے سے قبل اسے آدھی رات گزر جانے کی قطعی کوئی خبر نہیں تھی۔ لہٰذا اس کا لہجہ گڑ بڑا گیا تھا جس پر احسان رانا صاحب فوراً سنبھل کر بولے۔

''ڈونٹ وری مس انجشاء! آپ فرمایئے کیا مسئلہ درپیش ہے۔ ان کے سوال پر صرف ایک لمحے کے لئے وہ کنفیوز ہوئی تھی۔ پھر فوراً ہی اپنی ہمت مجتمع کرتے ہوئے بولی۔''

''وہ......ایکچو لی......آج صبح سے ہی میں بہت ڈپریس تھی۔ آپ تو جانتے ہیں عدنان صاحب حادثے کا شکار ہو کر تا حال ہسپتال میں پڑے ہیں۔ ان کے ہوش میں آنے تک یہ کیس آگے نہیں بڑھ سکتا مگر......میں نے اس وقت آپ کو اس لیے زحمت دی ہے کہ میں......اپنا کیس واپس لینا چاہتی ہوں۔''

''وہاٹ......یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں مس انجشاء......؟ اس میں تو سراسر ہماری شکست ہے۔''

دوسری طرف رانا احسان صاحب جیسے حیرانگی سے چلا اٹھے تھے مگر انجشاء کو اس وقت کسی کی پروا نہیں تھی۔ تب ہی وہ ٹھہرے ہوئے گمبھیر لہجے میں بولی۔

''آئی ڈونٹ کیئر......مجھے اب اپنی ہار جیت سے کوئی دلچسپی نہیں رہی ہے......''

''مگر مس انجشاء......''

''پلیز احسان صاحب! میں اپنا کیس واپس لینا چاہتی ہوں۔ مجھے عدنان صاحب سے طلاق نہیں چاہیے۔''

وہ روہانسی ہوگئی تھی۔ جب دوسری طرف سے احسان رانا صاحب نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''اوکے! مس انجشاء! جیسے آپ کی مرضی۔''

کہنے کے ساتھ ہی انہوں نے رابطہ منقطع کر دیا تو انجشاء اپنے ہی گھٹنوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

اگلے تین چار روز میں عدنان رؤف کی حالت خطرے سے مکمل طور پر باہر آگئی تھی۔ اس کے ہوش میں آنے کے بعد ہی یہ عقدہ کھل سکا تھا کہ اب وہ اپنی ٹانگوں پر شاید زندگی بھر دوبارہ نہ چل سکے۔ ایکسیڈنٹ میں سب سے زیادہ اس کی ٹانگیں اور پشت متاثر ہوئی تھی۔ لہٰذا ڈاکٹرز کے مطابق وہ دو تین سال تک تو بستر سے نیچے بھی نہیں اتر سکتا تھا۔

انجشاء اسے دیکھنے کے لیے ہسپتال میں گئی تھی مگر اس وقت وہ مکمل ہوش میں تھا اور اپنے والدین کے ساتھ محو گفتگو تھا۔ لہٰذا وہ اس کے کمرے سے باہر ہی سے چپ چاپ واپس پلٹ آئی تھی۔ اگلے روز آفس سے اٹھنے کے بعد وہ سیدھی ہسپتال چلی آئی تھی جہاں کئی دنوں سے ''ماما'' کے فرائض سرانجام دیتی سیال بیگم عدنان کے کمرے میں بیٹھی غالباً اونگھ رہی تھیں۔

''آنٹی......''

بہت آہستہ سے اس نے پکارا تھا مگر انہوں نے فوراً ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دی تھیں۔

''آپ...... بہت دنوں سے بے آرام ہیں۔ پلیز گھر چلی جائیے۔ عدنان کے پاس میں رک جاتی ہوں۔''

''نہیں...... میں ٹھیک ہوں۔ عدنان کے بغیر گھر میں بھی میرے لیے کچھ نہیں ہے۔''

ان کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں جبکہ لہجہ بھاری ہو رہا تھا۔ تب ہی انجشاء نے نرمی سے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

''آنٹی......عدنان کے ساتھ ساتھ احمد انکل کو بھی آپ کی ضرورت ہے جب کہ ان کی طبیعت بھی آج کل ٹھیک نہیں رہتی پھر ملازمین ان کا خیال آپ کی طرح تو نہیں رکھ سکتے ناں۔ ایسے میں اگر خدانخواستہ آپ بیمار پڑ گئیں تو کتنی مشکل ہو جائے گی......؟''

سیال بیگم ٹکر ٹکر اس کے منہ کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ یہ وہ لڑکی تھی جس کا دل پتھر کا تھا۔ جس کے احساسات منجمد تھے' جس پر کوئی موسم اثر نہیں کرتا تھا' مگر آج وہ اپنی لگ رہی تھی۔ دل کے بے حد قریب......تب ہی وہ اپنائیت سے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے تقریباً ایک ہفتے کے بعد اپنے گھر واپس چلی گئیں۔

انجشاء ان کے جانے کے بعد عدنان کے قریب آ کر بیٹھی تو وہ نشہ آور دواؤں کے زیر اثر سو رہا تھا۔ ہلکے آسمانی شلوار سوٹ میں ملبوس وہ جیسے ساری دنیا سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ بھرا بھرا صحت مند جسم پچھلے کچھ ہی دنوں میں بہت بری طرح متاثر ہو کر رہ گیا تھا۔ خوب صورت چہرے پر اس کی جاذبیت کو بڑھا دا دیتیں دو موٹی موٹی سیاہ' غلافی آنکھیں اندر کو دھنس کر رہ گئی تھیں۔ بلاشبہ وہ بہت خوب صورت تھا مگر...... انجشا نے کبھی اس کی خوبصورتی کی وجہ سے تو اسے نہیں چاہا تھا۔ اسے تو اپنے نام کے ساتھ جڑا اس کا نام اچھا لگتا تھا۔

اسی نام کی وجہ سے اس نے خود کو دیہاتی ماحول سے نکالنے کی جدوجہد کی تھی۔ زندگی کی راہ گزر پر اس کے شانہ بشانہ چلنے کے لیے اس نے خود کو تعلیم یافتہ بنایا تھا مگر جو خواب جس انداز میں اس نے دیکھے تھے ان خوابوں کو اس انداز میں تعبیر نہیں مل سکتی تھی۔

عدنان رؤف کی کشادہ پیشانی پر بکھرے بال' بہت اپنائیت سے سمیٹتے ہوئے' آپ ہی آپ اس کی آنکھوں میں آنسو در آئے تھے۔ کپکپاتے سرد ہاتھوں کا لمس پا کر وہ ہلکے سے کسمایا تھا۔ جب انجشاء نے فوراً اپنا ہاتھ اس کی پیشانی سے پیچھے ہٹا لیا۔

اگلے کچھ ہی لمحوں میں وہ آنکھیں کھول چکا تھا۔ تاہم آج سیال بیگم کی جگہ انجشاء احمر کو اپنے قریب بیٹھے دیکھ کر اس کی آنکھیں گویا پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔

''تت......تم......یہاں......؟''

''ہاں......کیوں......؟ میں یہاں نہیں آ سکتی......؟''

اپنے بھونچکا انداز کے جواب میں اس کے مطمئن لہجے نے اسے خاصا لاجواب کر دیا تھا۔ تب ہی وہ رخ پھیرتے ہوئے بولا۔

''تمہیں......یہاں نہیں آنا چاہیے تھا......''

''کیوں......یہاں کرفیو لگ گیا ہے کیا......؟'' وہ دھیمے سے مسکرائی تھی۔

''میں تمہارا سامنا کرنے کی ہمت نہیں رکھتا انجشاء آئی ایم سوری......''

''سوری......فار وہاٹ......'' عدنان کے شرمندہ لہجے نے اسے از حد حیران کیا تھا کیونکہ شرمندہ تو وہ اس سے تھی۔

''اپنی طرف سے میں نے پوری کوشش کی تھی کہ زندگی کا ساتھ چھوڑ جاؤں مگر...... پتہ نہیں کس کی دعائیں مجھے پھر سے زندگی کی طرف کھینچ لائیں......بہر حال میں مزید تمہیں خوار کرنا نہیں چاہتا لہٰذا تمہاری خوشی کے لیے آج بقائمی ہوش و حواس میں' میں تمہیں طلاق......''

اس سے پہلے کہ وہ اپنا جملہ مکمل کرتا' قطعی بدحواسی کے عالم میں انجشاء احمر نے تیزی سے لپک کر اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''نہیں......خدا کے لیے زندگی میں دوبارہ ایسا کبھی مت سوچنا......''

وہ یک لخت ہی دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔ تب ہی وہ جیسے شاکڈ رہ گیا تھا۔

''میں تم سے الگ ہو کر جینا نہیں چاہتی عدنان۔ میں نے مانگی ہیں خدا سے تمہاری سانسیں واپس' گنہگار میں ہوں۔ معافی مجھے تم سے مانگنی چاہیے' شرمندہ میں ہوں تم سے اسی لیے میں نے اپنا کیس بھی واپس لے لیا ہے۔ ہاں میں اب بھی تم سے پیار نہیں کرتی مگر میں تم سے منسوب رہ کر ہی مرنا چاہتی ہوں عدنان' خدا کے لیے مجھے خود سے کبھی دور مت کرنا پلیز......''

بلک بلک کر کہتے ہوئے وہ فوراً ہی اس کے کمرے سے نکل گئی تو ساکت بیٹھا عدنان رؤف اسے آواز دے کر روک بھی نہیں پایا۔ یہ کیا کہہ گئی تھی وہ...... بھلا یہ معجزہ کیونکر ہو سکتا تھا۔ آپ ہی آپ کچھ سوچ کر ایک پھیکی سی مسکان اس کے لبوں پر بکھری اور وہ سر جھٹک کر پھر بستر پر لیٹ گیا۔

☆☆☆

محبت کب سمجھتی ہے کہ کوئی دشت وحشت ہے
جو خوابوں میں بسی آنکھوں کو جانے کب کہاں' جھنجھوڑ ڈالے گا
محبت کب سمجھتی ہے......؟
کہ یہ جو سانپ سا اندر ہی اندر ہانپتا ہے
سانس لیتا ہے
نجانے کب کہاں یہ کون سی معصوم خواہش کو
یوں ہی جھنجھوڑ ڈالے گا
محبت کب سمجھتی ہے کہ جو شفاف رہتے ہیں۔
درِ منزل پہ رکتے ہیں' تھکن تحفہ نہیں دیں گے
کہیں بھٹکا نہیں دیں گے
محبت کب سمجھتی ہے کہ ان شفاف رستوں سے
کوئی دکھ درد کی جانب اسے نہ موڑ ڈالے گا
محبت کب سمجھتی ہے کہ کوئی توڑ ڈالے گا

وہ اب بھی ساکت کھڑا شہرین خان کے زرد چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا' جب اچانک اس کی نگاہوں کا عکس خود پر مرکوز پا کر وہ خود ہی اس کی طرف لپک کر آئی۔ خوب صورت بلو آنکھوں میں عجیب سی خوشی کا تاثر لپکا تھا۔

''ہیلو...... مانی کیسے ہو......؟''

وہ اس کے نک نیم ''مانی'' سے ہی اسے پکارتی تھی۔لہٰذا ازمیر شاہ اس کی پکار پر فوراً چونک کر اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔کتنی حیران کن بات تھی کہ وہ اسے یاد رہا تھا۔

''ٹھیک ہوں' آپ کیسی ہو......؟'' غالباً ''نہیں یقیناً'' ۔اس نے فارمیلٹی نبھائی تھی۔

''تمہیں کیسی لگ رہی ہوں......؟'' وہ جس کی مسکراہٹ پھولوں کی شگفتگی' جس کی کھلکھلاہٹ میں نقرئی گھنٹیاں بجنے کا احساس ہوتا تھا۔

اس وقت اسی شہرین خان کی کھلکھلاہٹ اسے نہایت کھوکھلی محسوس ہوئی تھی۔تب ہی ازمیر نے اپنی رائے محفوظ رکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا تھا۔

''آپ بہت بدل گئی ہیں شہرین......''

''اچھا...... مگر کیسے......؟ یہ دیکھو اب بھی میرے دو ہاتھ' دو پاؤں ہیں' چہرے پر دو آنکھیں' دو کان' ایک ناک سب ویسے ہی ہے لیکن تم واقعی پہلے جیسے نہیں رہے۔''

گو وہ بہت بدل چکی تھیں' گلاب چہرے پر خزاں کا پڑاؤ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ابھی ازمیر نے اسے جس اداس موڈ میں دنیا جہاں سے بے خبر جانے کن یادوں میں کھوئے ہوئے بیٹھے دیکھا تھا۔وہ اب بہت ممکن حد تک دکھ اور اداسی کے اس حصار سے باہر نکل آئی تھی۔اس کا لہجہ اب بھی اتنا ہی شگفتہ تھا جتنا کبھی تین چار سال پہلے۔ازمیر شاہ نے دیکھا تھا۔

''میرا خیال ہے ہمیں کہیں بیٹھ کر بات کرنی چاہیے۔ویسے تمہیں اتنے عرصے کے بعد اپنے مقابل دیکھ کر یقین کرو مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔''

ٹھہرے ہوئے سمندر جیسی بلو مقناطیسی نگاہیں ازمیر شاہ کے اداس چہرے پر جمائے اس نے پھر متبسم لہجے میں لب کشائی کی تھی۔جواب میں ازمیر نے خاموشی سے اپنے قدم اس کی ہمراہی میں آگے بڑھا دیئے۔

''تھینک گاڈ کہ تم دوبارہ مجھے مل گئے ازمیر' ورنہ پتہ نہیں میں کب تک اندر ہی اندر سلگتی رہتی......'' شہرین خان نے اس وقت بلو جینز پر لائٹ پرپل کلر کی شرٹ زیب تن کی ہوئی تھی۔ہمیشہ کی طرح اس کے سیاہ ریشمی شولڈر کٹ بال اس کے شانوں پر پڑے ہوا سے اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔کچھ شرارتی لٹیں بار بار اس کے گلابی گالوں کے بوسے لے رہی تھیں۔ازمیر شاہ کی نگاہوں نے آج بھی اسے اتنا ہی حسین پایا تھا جتنا کہ تین چار سال پہلے اس کی نگاہوں کو لگی تھی۔وہ ہنوز خاموشی سے قدم بہ قدم اس کے ہمراہ چلتے ہوئے سامنے گہرے سمندر کی پرسکون موجوں پر نگاہ جمائے ہوئے تھا۔

''تم کچھ بول کیوں نہیں رہے ہو ازمیر......؟''

اچانک اپنے قدم روک کر اس نے ازمیر شاہ کی طرف دیکھا تھا۔جب وہ گہری سانس خنک فضا کے سپرد کرتے ہوئے بولا۔

''مجھے ہمیشہ سے آپ کو سننا اچھا لگتا ہے شہرین اور یہ بات آپ بہت اچھی طرح سے جانتی ہیں۔''

''ہاں معلوم ہے مجھے......لیکن...... پہلے تم اس قدر سنجیدہ نہیں ہوا کرتے تھے۔ خیر تم نے مجھ سے پوچھا ہی نہیں کہ میں دوبارہ تم سے ملنا کیوں چاہتی تھی......''

دائیں ہاتھ سے بار بار اپنے ریشمی بالوں کو کانوں کے پیچھے اڑستے ہوئے اس نے پھر چلنا شروع کر دیا۔

''کیوں دوبارہ مجھ سے ملنا چاہتی تھیں آپ......؟''

اب کے ازمیر نے بغور اس کے خوب صورت چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ جواب میں وہ اپنی مقناطیسی نگاہیں جھکاتے ہوئے مدہم لہجے میں بولی۔

''لاسٹ ٹائم میں نے تمہیں بہت ہرٹ کیا تھا۔ حقیقتاً میں ایسی نہیں ہوں۔ یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتے ہو مگر پھر بھی مجھے بہت شاک لگا جب تم نے مجھ سے اپنی والہانہ محبت کا اظہار کیا تھا۔ آئی ایم سوری مائی لیکن مجھے اس وقت تم پر بہت غصہ آیا تھا۔ تمہاری ظاہری شکل و صورت کو پیش نظر رکھ کر مجھے اپنی ذات سے تمہارے لگاؤ نے تپا دیا تھا۔ ایک طرح سے اپنے حسن کی انسلٹ محسوس ہوئی تھی مجھے......'' وہ دھیمے لہجے میں بول رہی تھی اور ازمیر ساکت کھڑا خاموشی سے سانس روکے ہوئے اسے سن رہا تھا۔

''اس وقت میرے نظریات بہت مختلف تھے۔ ظاہری خوب صورتی ہی سب کچھ تھی میرے لیے۔ اسی لیے میں نے تمہاری انسلٹ کی مگر دیکھو مائی...... قدرت نے تمہارا دل دکھانے کی، مجھے کتنی کڑی سزا دی......''

یوں لگتا تھا جیسے وہ پچھلے تین چار سال کا غبار اسی ایک ملاقات میں نکال دینا چاہ رہی ہو۔ ازمیر نے اسے کھل کر بولنے دیا تھا۔ درمیان میں ٹوکا نہیں تھا لیکن پھر بھی شہرین خان کی آنکھوں میں بکھرتے آنسو اس کا دل تڑپا رہے تھے۔

''میں بھی کتنی پاگل ہوں۔ تم سے ملتے ہی نان اسٹاپ شروع ہو گئی۔ تم سے تو کچھ پوچھا ہی نہیں۔ خیر پاکستان میں سب لوگ کیسے ہیں......؟''

ایک دم سے اس نے اپنی بات بدلی تھی۔ جواب میں وہ اس کے چہرے سے نگاہ ہٹا کر پھر سے سمندر کی پُرسکون لہروں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''سب ٹھیک ہیں......''

''لیکن...... تم مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے ہو......'' وہ پھر مسکرائی تھی۔

''کیوں مجھے کیا ہوا......؟'' بڑی پھیکی پھیکی سی مسکراہٹ ازمیر شاہ کے لبوں پر بھی بکھری تھی۔

''تمہیں...... تمہیں یقیناً کسی سے پیار ہو گیا ہے۔''

بلو مقناطیسی نگاہوں میں عجیب سی شرارت رقص کر رہی تھی۔ جب وہ بمشکل مسکرا کر اپنا بھرم رکھتے ہوئے بولا۔

''پیار تو بس ایک آپ سے ہی ہوا تھا شہرین......''

''ویل..... لیکن مجھ سے بچھڑ کر پاکستان میں اتنے سال تم نے محض میری یاد کے سہارے مجھے سوچتے ہوئے بتا دیئے ہوں گے یہ میں نہیں مان سکتی کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو اتنے سالوں کے بعد مجھے اپنے سامنے دیکھ کر تمہارے تاثرات ہی کچھ اور ہوتے لیکن ایسا نہیں ہوا جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ میری محبت کی منزل سے پہلے درمیان میں کہیں کوئی پڑاؤ ضرور آ گیا ہے۔ ٹیل می پلیز کیا نام ہے اس کا.....؟'' شہرین خان کے سوال پر صرف ایک لمحے کے لیے چونکتے ہوئے اس کی آنکھوں میں روتی ہوئی اریشہ خان کا سرخ چہرہ گھوم گیا تھا۔ تب ہی جیسے وہ شدید نڈھال ہوتے ہوئے لب بھینچ کر بولا۔

''میں اس سے پیار نہیں کرتا شہرین! میرا یقین کرو۔ میں اس سے محبت نہیں کرتا مگر..... وہ روتی ہے تو میرا دل کٹ جاتا ہے۔ کوئی اسے تکلیف پہنچاتا ہے تو اس کی اذیت میں اپنے دل میں محسوس کرتا ہوں۔'' وہ شہرین خان کی زیرک نگاہوں سے چاہ کر بھی کچھ نہیں چھپا سکتا تھا۔ سو فوراً کھل گیا تھا۔ جواب میں ایک بڑی محظوظ سی مسکراہٹ اس کے مقابل کھڑی شہرین خان کے خوب صورت لبوں پر بکھر کر رہ گئی۔

''اس خود فریبی کے حصار سے باہر نکل آؤ مائی کہ تم اس سے محبت نہیں کرتے' یہ جو محبت ہے ناں' بڑی ظالم چیز ہے۔ ہم کتنا ہی اس سے بچنے کی تدبیر کرلیں یہ چپکے سے دبے قدم وادیٔ دل میں داخل ہو کر اپنا مقام بنا ہی لیا کرتی ہے۔ خیر..... اس وقت میرا بیٹا یقیناً گھر واپس آ چکا ہو گا لہٰذا میں چلتی ہوں مگر کل' یہیں اسی مقام پر اسی وقت دوبارہ ملاقات ہوگی' آؤ گے ناں.....؟'' اس وقت شہرین خان کی آنکھوں میں جو درد تھا۔ ازمیر چاہ کر بھی اس کا مفہوم سمجھ نہیں پایا تھا۔ تب ہی قدرے حیرانگی سے بولا۔

''آ..... آپ نے شادی کرلی.....؟''

''ہاں..... دو سال پہلے ہی یہ معرکہ انجام دیا ہے۔ خیر کل پھر ملاقات ہوگی۔ خدا حافظ۔''

خوشبو کے معطر جھونکے کی مانند وہ اس کے قریب آئی اور واپس چلی گئی جب کہ ازمیر نجانے کتنی ہی دیر تک وہیں کھڑا اسے تھکے تھکے قدموں سے پلٹتے ہوئے دیکھتا رہا تھا۔

اسی شام وہ نڈھال سا اپنے فلیٹ میں واپس آیا تو گویا اک اور قیامت اس کی منتظر کھڑی تھی۔ شل اعصاب کے ساتھ اپنے معمول کی مانند جوں ہی وہ کمپیوٹر کھول کر بیٹھا۔ سب سے پہلی ای میل پاکستان سے اریشہ خان کی تھی اور اس نے جانے کس ضبط کے عالم میں لکھا تھا۔

''ازمیر! میں جانتی ہوں تم وہاں بہت خوش ہو۔ بھلا محبت کی آب و ہوا ملے تو کون کافر ہے جو خوش نہیں ہوگا' شاید شہرین خان تمہیں پھر سے مل گئی ہو' شاید اب اس کے قدم تمہاری طرف واپس پلٹ آئے ہوں' شاید اب تمہاری دیوانگی دیکھ کر اسے بھی تم سے محبت ہو گئی ہو' کچھ بھی ہوسکتا ہے اسی لیے میں نے اتنے دنوں تک تمہیں ڈسٹرب نہیں کیا۔ ویسے بھی ہم سب لوگ پچھلے دنوں شدید اذیت کے حصار میں قید رہے ہیں۔ کسی کو کان وکان خبر نہیں ہوئی کہ ہم سب پر پچھلے ہفتے کیا قیامت ٹوٹی..... تم تو اسی شاہ ولاج کا ایک حصہ ہو ازمیر لہٰذا تم سے کیا چھپانا.....؟ لاسٹ سنڈے ماہم اپنے کسی بوائے فرینڈ کے ساتھ رات کے اندھیرے میں گھر سے بھاگ گئی تھی۔ وہ تو صالحہ بھابھی کی بروقت آنکھ کھل گئی۔ لہٰذا انہوں نے سب کو بتا دیا کہ ماہم اپنے کمرے سے نکل کر ابھی کچھ دیر قبل باہر گیٹ کی طرف گئی ہے لہٰذا اذہان اور ارسلان بھائی فوراً اس کے پیچھے پہنچ گئے اور شدید خواری کے

بعد بالآخر اسے پلیٹ فارم سے پکڑ کر گھر واپس لے آئے۔ پچھلے ایک ہفتے میں وہ دو بار خودکشی کرنے کی کوشش بھی کر چکی ہے لہٰذا اس کے جذباتی پن کو دیکھتے ہوئے گھر کے بزرگوں نے اسی لڑکے کے ساتھ ماہم کی شادی طے کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اگلے ہفتے ماہم اور میں اکٹھی رخصت ہو رہی ہیں۔ تم آؤ گے ناں ازمیر......؟ ایک زندہ لاش سج سنور کر کیسی لگتی ہے۔ یہ تو دیکھ لینا پلیز۔ میں واقعی تمہارا انتظار کروں گی......''

آگے اسکرین خالی تھی مگر ازمیر شاہ کو اس لمحے اپنا ذہن اور دل بھی خالی محسوس ہو رہے تھے۔ وہ اس سے محبت کا دعوے دار نہیں تھا مگر پھر بھی اس کے پرائے ہو جانے کا احساس اس کی جان پر بنا رہا تھا۔ سینے میں ایک دم سے سانس جیسے گھٹنے لگی تھی تب اس نے فوراً کمپیوٹر آف کر کے اپنے فلیٹ کی واحد ونڈو فوراً کھول دی۔ باہر سے آتی ٹھنڈی ہوا کے سرد جھونکے اس کے ریشمی بالوں کے ساتھ مستیاں کرنے لگے تھے مگر وہ جیسے دیر تک ہر چیز سے بے نیاز کھڑا اریشہ خان کی باتوں میں کھویا رہا تھا۔ دل شدت سے چاہ رہا تھا کہ اڑ کر پاکستان جائے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کسی ایسے جہاں میں لے جائے جہاں کوئی اسے اس سے چھیننے والا نہ ہو مگر...... رات بھر دل کے زخم رستے رہے اور وہ کروٹ پہ کروٹ بدل کر خون کے آنسو روتا رہا۔

☆☆☆

ایسا لگتا ہے ہر امتحان کے لیے
زندگی کو ہمارا پتہ یاد ہے

وہ جو چوکھٹ پر کھڑا نم آنکھوں سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ آگے بڑھ کر ان کی آغوش میں سمٹ جاتا۔ اب جو رخسانہ بیگم کو بے تابی سے اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تو خود بھی لپک کر ان سے لپٹتے ہوئے سسک پڑا۔

''مما! کہاں چلی گئی تھیں آپ......؟ میرے لیے کیوں نہیں سوچا آپ نے...... پاپا کے بعد آپ کے سوا میرا کون تھا؟ جو مجھے اکیلا چھوڑ کر کہیں گم ہو گئی آپ......''

برسوں کے رکے آنسو شدت سے گالوں پر بہہ نکلے تھے۔ بالکل کسی چھوٹے سے بچے کی مانند رو رو کر شکایت کرتا وہ انہیں اپنے دل کے بے حد قریب لگا۔ تب ہی وہ دیوانہ وار اسے ٹوٹ کر پیار کرتے ہوئے خاصے نڈھال لہجے میں بولیں۔

''مما مجبور تھی بیٹے...... آپ کی مما کو اس کے اپنوں نے ان دیکھی زنجیروں میں جکڑ کر لاچار کر چھوڑا تھا ورنہ کوئی اپنی جان گنوا کر سانسوں کا بوجھ اٹھاتا ہے......؟''

ان کے تواتر سے گرتے آنسو ان کی سچائی و بے بسی کا منہ بولتا ثبوت تھے۔ تب ہی اریج نے مزید کوئی گلہ شکوہ کیے بغیر خاموشی سے ان کے ہاتھ تھام کر چوم لیے۔ تمکین بھیگی آنکھوں کے ساتھ اطمینان سے مسکراتے ہوئے بڑی دلچسپی سے ان دونوں ماں بیٹے کے ملاپ کو دیکھ رہی تھی۔ کمرے کے وسط میں کھڑی آمنہ بیگم اور آسیہ بیگم کے چہروں پر بھی خوشی کا عکس جھلک رہا تھا۔ تب ہی اریج نے بہت مان کے ساتھ نظریں جھکا کر دھیمے لہجے میں ان سے کہا۔

''مما! کیا آج کا دن آپ میرے ساتھ میرے گھر چل کر رہ سکتی ہیں؟ صرف ایک دن پلیز......''

اس کی آنکھوں میں کچھ ایسا تھا کہ وہ انکار نہیں کر پائی تھیں۔ اس لمحے انہیں جیسے کسی کی کوئی پروا نہیں رہی تھی یہاں تک کہ اپنی طبیعت کی بھی نہیں۔ نم آنکھوں میں ابھی تک بے یقینی کے سائے رقص کر رہے تھے۔ تب ہی وہ خوشی خوشی آسیہ بیگم اور آمنہ بیگم کو بتا کر بنا ان کی کوئی بات سنے اریج احمر کے ساتھ اس کے چھوٹے سے گھر میں چلی آئیں۔

''پتہ ہے مما! زندگی کے پورے ستائیس سال بعد پلٹ کر میری طرف واپس آئی ہیں۔ یہ کمرہ دیکھئے...... آپ کے جانے کے بعد میں گھنٹوں یہاں اکیلا بیٹھا رو یا کرتا تھا۔ میرے پاس آپ کی کوئی تصویر بھی نہیں تھی کہ جسے دیکھ کر میں اپنا دل بہلا لیتا۔ ممانی دن بھر کولہو کے بیل کی مانند مجھے گھر کے کاموں میں مصروف رکھتی تھیں۔ بہت مارتی تھیں مگر...... اس مار کے زخم میرے بدن کی بجائے دل پر لگتے تھے۔ یہ...... یہ میز دیکھئے آپ' یہاں اکثر اندھیرے میں بیٹھ کر آپ کو بہت لمبے لمبے خط لکھا کرتا تھا۔ آج بھی وہ سب خط کہ جن کو کبھی میں آنسوؤں سے تحریر کیا کرتا تھا میرے پاس محفوظ ہیں۔ مما اور...... یہ ٹرافی دیکھئے یہ مڈل کا امتحان پاس کرتے پر'...... ضلعی ناظم صاحب نے مجھے دی تھی مما پورا اسکول میری قابلیت کو سراہ رہا تھا۔ میرے تمام اساتذہ مسرور تھے۔ ہر کسی کے آگے فخر سے میرا ذکر کر رہے تھے پر...... اس وقت بھی آپ میرے پاس نہیں تھیں مما۔ میری یہ ڈائری دیکھئے اس میں میرا ایک ایک زخم درج ہے پر...... آپ کے پاس کہاں فرصت ہوگی میرے زخموں کو دیکھنے کی......''

رخسانہ بیگم کا ہاتھ تھام کر بھرپور جوش و خروش سے انہیں اپنے گھر کی ایک ایک جگہ دکھاتا وہ بہت جذباتی دکھائی دے رہا تھا۔ خوب صورت غلافی آنکھوں میں تیرتے آنسو اس کے دلی کرب کی عکاسی کر رہے تھے۔ تب ہی وہ بکھرے اور بھرائے لہجے میں بولا۔

''سچ بتایئے مما! قدرت جن بچوں کے سر سے باپ کی شفقت کا سایہ چھین لیتی ہے کیا ان سب بچوں کی مائیں' محض اپنی زندگی سنوارنے کے لیے اپنے جگر کے ٹکڑوں کو یوں ہی بے آسرا چھوڑ دیتی ہیں۔ جیسے آپ مجھے چھوڑ کر چلی گئی تھیں......؟''

اس کے دل کا ایک ایک زخم تا حال رس رہا تھا۔ جانے کس ضبط سے اپنے آنسو روکے وہ تاک تاک کر ان کے دل پر نشانے لگا رہا تھا۔ برسوں سے دل پر جما غبار بھلا اتنی جلدی کیسے صاف ہو سکتا تھا۔ تب ہی رخسانہ بیگم قطعی نڈھال انداز میں اسے منانے کا کوئی حل نہ جانتے ہوئے بالآخر اس کے قدموں میں بیٹھ کر سسک اٹھیں۔

''مجھے معاف کر دو اریج۔ خدا کے لیے اپنی مما کو معاف کر دو پلیز......''

وہ ابھی ان کے دل پر مزید نشانے لگانے کا خواہاں تھا مگر...... وہ یک لخت ہی ٹوٹ کر اس کے قدموں میں آ بیٹھیں تو جیسے وہ تڑپ کر پیچھے ہٹ گیا۔ پھر اگلے ہی پل وہ جوان کے سینے میں منہ چھپا کر رویا تو جیسے برسوں سے رکے آنسو بہہ نکلے۔ اس دوران رخسانہ بیگم خود بھی روتے ہوئے کبھی اس کا منہ چومتی رہیں' تو کبھی اپنی گداز انگلیاں اس کے گھنے بالوں میں پھیر کر اس کے تمام گلے شکوے سنتی رہیں۔

''آپ بالکل اچھی ماں نہیں ہیں مما...... آپ نے بہت رلایا ہے مجھے......''

وہ تو اب بھی کسی چھوٹے بچے کی مانند ان کے سینے سے لگا قدرے خفگی سے کہہ رہا تھا۔ جواب میں وہ اس کی پیشانی چومتے ہوئے بولیں۔

''ٹھیک کہہ رہے ہو تم کاش میرے اختیار میں ہوتا تو کب کی خاک اوڑھ کے سو چکی ہوتی۔''

''مما! پلیز ایسا مت کہیں۔ میں تو یوں ہی اپنا غصہ نکال رہا ہوں۔ ڈانٹ دیں ناں......''

خاصا تڑپ کر خفگی سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے ہلکا سا احتجاج کیا تو رخسانہ بیگم بے ساختہ مسکرا دیں۔

''ضرور ڈانٹوں گی۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تمکین کے معاملے میں کس حد تک سیریس ہو تم......'' ان کے قطعی غیر متوقع سوال پر وہ خاصا گڑبڑا گیا تھا۔ تب ہی نگاہیں چراتے ہوئے بولا۔

''چھوڑیں ناں مما! آج میں آپ سے صرف آپ کی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ یہ تمکین وکمین کو درمیان میں مت لائیں آپ......''

''مما کو ٹال رہے ہو ناں۔ پلیز بیٹے اپنا دکھ ماں سے نہیں کہو گے تو اور کس سے کہو گے......؟'' انہوں نے مشکوک نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تھا جواب میں وہ آنکھیں جھکا کر ان کی آغوش میں لیٹتے ہوئے بولا۔

''وہ محض میری دوست ہے مما۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں اور ہاں اپنی مما کے مل جانے کی خوشی میں میں اپنے دوستوں اور آفس کے اسٹاف کو ایک شان دار سی پارٹی دینا چاہتا ہوں۔ کیا آپ مجھے اجازت دیں گی مما......''

وہ ہر ممکن حد تک تمکین رضا کے ذکر سے بچنا چاہتا تھا۔ تب ہی بات گھماتے ہوئے بولا تو رخسانہ بیگم نے ایک طویل سانس بھر کر آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اگلے کچھ ہی دنوں میں ''احمر پیلس'' ایک شان دار تقریب کے سلسلے میں کسی دلہن کی مانند جگمگا رہا تھا۔ رخسانہ بیگم کے ساتھ ساتھ اریج احمر کی بھی خوشی دیدنی تھی۔ مارے خوشی کے آج اس کے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے کیونکہ رخسانہ بیگم کے علاوہ سعید احمد صاحب نے بھی اسے اپنے بیٹے کی حیثیت سے قبول کر لیا تھا۔ اشعر احمد ابھی پرسوں ہی پھر سے اسلام آباد فلائی کر گیا تھا۔ تب ہی انہوں نے اریج سے معافی مانگتے ہوئے اس سے یہ ریکوسٹ کی تھی کہ وہ اپنے ماضی کے سارے غم بھلا کر انہیں ایک باپ کی حیثیت سے قبول کر لے۔ حسن ولاج کے دیگر افراد نے بھی اسے بہت پیار دیا تھا۔ نتیجتاً ان سب کے لیے اس کی کدورت بھی جاتی رہی۔ بلیک ڈنر سوٹ میں نفاست سے تیار ہوئے وہ کسی دیس کا شہزادہ ہی دکھائی دے رہا تھا۔ رخسانہ بیگم کی پیاسی نگاہیں تو جیسے سیراب ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔

اریج کے برعکس تمکین آج سفید ریشمی سوٹ میں ملبوس تھی۔ جس پر جگمگاتے ہوئے سفید نگوں کا کام بہت نفاست سے کیا ہوا تھا۔ باوجود ہلکی پھلکی تیاری کے وہ سچ مچ ایک پری دکھائی دے رہی تھی۔ اریج احمر خود پر سخت کنٹرول رکھے ہوئے تھا مگر اس کے باوجود اس کی نگاہ بار بار بھٹک کر اس کے سراپے سے الجھ رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں لائٹ پرپل کلر کے نہایت نفیس سوٹ میں ملبوس خوب صورت سی انجشاء احمر وہاں چلی آئی تو جیسے تمکین کی خوشی مزید بڑھ گئی۔

لپک کر اس کی طرف بڑھتے ہوئے وہ اس سے گلہ کرنا ہرگز نہیں بھولی تھی۔

''مل گیا ٹائم! آ گئی تمہیں فرصت میسر۔ شرم کرو کچھ تقریب اپنے عروج پر ہے اور محترمہ کا کچھ پتہ ہی نہیں۔''

''بس...... جہاں موقع ملے ناں اسٹاپ شروع ہو جایا کرو۔''

وہ قطعی برا مانے بغیر دھیمے سے مسکرا کر اسے چڑاتے ہوئے بولی تو تمکین نے اسے ایک زبردست دھموکا جڑ دیا۔

''تم ایسا موقع دیتی ہی کیوں ہو......؟''

''مزہ آتا ہے ناں یار...... ایمان سے تمہیں غصے میں دیکھ کر دل اتھل پتھل ہونے لگتا ہے میرا۔''

''سدھر جاؤ انجشا ضائع ہو جاؤ گی کسی دن میرے ہاتھوں......''

تمکین نے دانت کچکچائے تھے۔ جب وہ بے ساختہ کھلکھلاتے ہوئے بولی۔

''تم میں اتنا دم خم کہاں کہ انجشاء احمر کو ضائع کر سکو۔ خیر آج کے اس فنکشن میں تمہارے لیے بڑا دھماکہ خیز سرپرائز ہے۔''

''اچھا......؟ کیا سرپرائز ہے' کہیں وہ تمہارا عدنان رؤف رخصتی تو نہیں کروا رہا......؟''

اس نے محض مذاق میں یہ بات کہی تھی۔ مگر انجشا کے مسکراتے لب سمٹ گئے' عین اسی پل کسی نے نہایت مترنم انداز میں ان دونوں کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔

''ایکسکیوز می......''

قدرے شناسا پکار پر تمکین اور انجشاء نے فوراً پلٹ کر اپنے پیچھے دیکھا تھا اور پھر جیسے دیکھتی ہی رہ گئی تھیں۔

نیوی بلیو کلر کے نہایت دیدہ زیب سوٹ میں ملبوس وہ یقیناً اریشہ خان ہی تھی تب ہی تمکین ٹرانس کی کیفیت سے نکلتے ہوئے فوراً لپک کر اس کے گلے لگ گئی۔

''کیسی ہو بے وفا' بے مروت لڑکی۔ میں تو جمعرات کی جمعرات باقاعدہ نفل پڑھ کر تمہاری روح کو ثواب پہنچانے کی دعا کرتی رہی ہوں مگر تم تو زندہ ہو......''

خوب زور سے اسے اپنی بانہوں میں دباتے ہوئے اس نے گلہ کیا تو اریشہ خان بھی خاموش نہ رہ سکی تھی۔ وہ انجشاء سے گلے مل کر ایک زبردست دھموکا اس کی پیٹھ پر جڑتے ہوئے بولی۔

''کچھ ایسا ہی حال ادھر تھا۔ پچھلے چار سال سے میں مختلف پیپرز میں تم دونوں کی گمشدگی کے کوئی درجنوں اشتہارات شائع کروا چکی ہوں۔ تم لوگوں نے پڑھا نہیں کیا......؟''

''پڑھ لیے تھے تب ہی تو رابطہ کر لیا تم سے ورنہ تم یہاں بازیاب ہونے والی تھیں......؟''

انجشاء نے چونکہ اذہان شاہ سے اس کا نمبر لے کر اریشہ کو یہاں بلوایا تھا لہٰذا وہی اس پر چوٹ کرتے ہوئے پٹ سے بولی تو اریشہ بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''کتنا سارا وقت بیت گیا نمی...... کیسے کیسے زخم لگ گیا دل پر مگر ہم ایک دوسرے سے مل ہی نہیں سکے......''

کھلکھلانے کے باوجود اریشہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ تب ہی ایک پھیکی سی مسکان تمکین رضا کے لبوں پر بکھر کر رہ گئی۔

''آؤ..... میں تمہیں اپنے گھر والوں سے ملواتی ہوں.....''

اس سے پہلے کہ دل کے زخم رستے' وہ فوراً اریشہ کا ہاتھ تھام کر بولی تو انجشا بھی ان کے ساتھ ہی آگے بڑھ آئی۔

''بڑی اماں! یہ اریشہ ہے۔ ہمارے گروپ کی تیسری ممبر پورے چار سال کے بعد آج ملی ہے مجھ سے۔'' رخسانہ بیگم اریج کے ساتھ کھڑی باتوں میں مشغول تھیں۔ جب تمکین نے انہیں اپنی جانب متوجہ کرلیا۔ جواب میں وہ اریشہ کے ساتھ ساتھ انجشاء کو بھی خوب پیار کرتے ہوئے مسکرا کر بولیں۔

''بہت پیاری بچی ہے۔ چلو آج پھر سے تمہارا گروپ مکمل ہوگیا۔ یقیناً آج کے دن کو ''ملن ڈے'' کے طور پر منانا چاہیے۔''

''بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ لیکن ابھی ہمارا گروپ مکمل کہاں ہوا ہے' شیزا کی جگہ ابھی بھی خالی ہے وہ کہاں ہے تمی.....؟''

''وہ..... وہ آج کے اس فنکشن میں شامل نہیں ہے۔ آؤ میں تمہیں اپنی مما سے ملواتی ہوں۔''

اریج اس کے چہرے پر یک لخت بکھر جانے والی زردی دیکھ چکا تھا۔ تب ہی سر جھٹک کر اپنے ایک دوست کی طرف بڑھ گیا تو حیران حیران سی اریشہ خان، تمکین اور انجشاء کو محض ایک نظر دیکھ کر رہ گئی۔

شام میں اس تقریب سے فراغت پا کر ایک مدت کے بعد وہ تینوں دوستیں شاندار سے ریسٹورنٹ میں اکٹھی بیٹھی تھیں۔ ایک لمبے عرصے کے بعد وقت انہیں ایک دوسرے کے مقابل لایا تھا۔ تینوں کے لبوں پر جامد خاموشی تھی۔ تینوں کی آنکھوں میں اپنے اپنے دکھ کی پرچھائیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں تب ہی اریشہ خان نے کھوئے کھوئے سے مدہم لہجے میں کہا۔

''تم لوگوں کو یاد ہے جب ہم یونیورسٹی میں الوداعی پارٹی سے فارغ ہوئے تھے۔ تو ہم نے ایک دوسرے سے کیا پرامس کیا تھا.....؟''

اس کے سوال پر انجشاء اور تمکین دونوں نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں اس کی طرف دیکھا تھا۔

''تمہیں یاد ہے انجو! ہمارا گروپ پوری یونیورسٹی کا اسٹار گروپ تھا۔ لوگ ہمیں پتھر دل حسیناؤں کے لقب سے پکارا کرتے تھے۔ وہ...... عماد یاد ہے تمہیں جو تمہاری محبت میں دوبار خودکشی کی کوشش کر چکا تھا مگر پھر بھی تم نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی اور تمی تم..... تمہیں وہ زوہیب حسن یاد ہے جو پہروں ٹکٹکی باندھے' چپ چاپ تمہاری طرف دیکھتا رہتا تھا۔ ایک دن بھی اگر تم یونیورسٹی نہیں آتی تھیں تو اس کی جان پر بن آتی تھی۔ ہماری پوری کلاس اسے تمہارے مجنوں کے نام سے پکارتی تھی مگر..... تم نے بھی اسے کبھی لفٹ نہیں کروائی۔ صرف اس لیے ناں کہ ہم اپنے والدین کے ساتھ دھوکہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ہم محبت کے فریب میں الجھ کر اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنا نہیں چاہتے تھے۔ ہم تاعمر وہ عہد نبھانا چاہتے تھے جو ہم سب نے ایک دوسرے سے اپنی دوستی کے پہلے ہی دن کیا تھا۔''

صرف ایک لمحے کے لیے وہ سانس لینے کو رکی تھی۔ پھر دوبارہ اپنا سانس بحال کرتے ہوئے بولی۔

''ہم محبت کو شکست دینا چاہتے تھے۔ اس کے فریب سے بچ کر خوشحال زندگی گزارنا چاہتے تھے۔ یہی عہد ہوا تھا ہمارے بیچ کہ ہم چاروں کبھی زندگی کے کسی موڑ پر اپنا کوئی فیصلہ ایک دوسرے کی مرضی کے خلاف نہیں کریں گی۔ کبھی کسی کی محبت' ہماری دوستی کے درمیان نہیں آئے گی'

ہم کبھی حالات کو خود پر حاوی نہیں ہونے دیں گی' کبھی وقت سے شکست تسلیم نہیں کریں گی۔ مگر...... محبت ہماری دوستی کے بیچ آ گئی۔ نمی وقت نے ہرا ڈالا ہمیں۔ منکر ہو گئی میں اس عہد سے' مجھے معاف کر دو تمی' انجو کہ میں یہ عہد نہیں نبھا سکی۔''

کہنے کے ساتھ ہی وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تو انجشاء اور تمکین دونوں نے اپنے ہاتھ اس کے کمزور شانوں پر دھر دیئے۔ اس وقت دونوں کے اپنے دل بھی درد کی شدت سے پھٹ رہے تھے۔ تب ہی اریشہ پھر آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

''یونیورسٹی سے فارغ ہونے کے بعد پہلے پہل میں نے تم تینوں سے رابطہ کرنے کی بہت کوشش کی' مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ شیزا سے دو تین بار بات ہوئی تو اس نے بھی تمہارا رابطہ نمبر نہیں دیا۔ انجو کے بارے پتا چلا کہ یہ اپنی حویلی چھوڑ کر شہر چلی گئی ہے۔ کہاں چلی گئی ہے یہ کسی کو معلوم نہیں تھا' پھر...... میں بھی اذمیر کی شخصیت میں جیسے گم ہوتی چلی گئی۔ میرا یقین کرو میں نے کبھی اس سے محبت کرنے کی پلاننگ نہیں کی مگر پھر بھی مجھے اس سے محبت ہو گئی۔ اس بے حس پتھر سے' جو میری طرف اس نظر سے کبھی دیکھتا بھی نہیں۔ کتنے عجیب ہیں یہ محبتوں کے سلسلے کہ جس سے وہ محبت کرتا ہے۔ وہ لڑکی اس سے محبت نہیں کرتی' مگر پھر بھی وہ اس کے پیچھے بھاگتا ہے۔ انجو' تمی میں اس کے بغیر یہ زندگی کا طویل سفر طے نہیں کر سکتی۔ خدارا بتاؤ مجھے کہ میں کیا کروں......؟''

اس کا نڈھال وجود' خشک ہونٹ اور ویران نگاہیں اس کے لفظوں کی سچائی کا منہ بولتا ثبوت تھیں مگر تمکین اور انجشاء کو اس کے الفاظ سے شدید دھچکا لگا تھا۔ ان کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اریشہ خان اذہان شاہ کے علاوہ بھی کسی میں انٹرسٹڈ ہو سکتی ہے۔ تب ہی اریشہ خان نے الف سے لے کر ے تک اپنی مکمل کہانی ان کے گوش گزار دی۔

''میں حقیقت سے نگاہیں چرانے والی لڑکی نہیں ہوں مگر میں کسی صورت اذہان شاہ کی زندگی کا حصہ بننا نہیں چاہتی۔'' اپنی کہانی کے اختتام پر نظریں چراتے ہوئے اس نے واضح کیا تھا۔ جب ایک سرد آہ بھر کر تمکین نے انجشاء کی طرف دیکھتے ہوئے مدھم لہجے میں کہا۔

''تمہاری کہانی بہت پیچیدہ ہے اریشہ' پھر بھی شاید انجشاء تمہیں کوئی بہتر حل بتا سکے کیونکہ ہمارے گروپ میں مسائل کے حل کی ڈیوٹی انجشاء صاحبہ کے ذمے ہی ہے۔''

اس کے الفاظ پر انجشاء بھی دھیمے سے مسکرا اٹھی تھی۔ تب ہی وہ گہری نگاہوں سے اریشہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''تو ہماری سسی صاحبہ' میاں پنوں کے عشق میں پور پور ڈوب چکی ہیں۔''

''ہاں......'' انجشاء کے متبسم لہجے کے جواب میں اریشہ نے محض آہستہ سے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

''تو ٹھیک ہے بی بی! دیکھنے کے لیے میاں اذہان شاہ آپ میں کس حد تک انوالو ہیں اور ان کی ماما دل سے کتنی فریفتہ ہیں آپ پر......؟ ہم آپ کا زبردست ایکسیڈنٹ کروا دیتے ہیں بالکل ویسا ہی جو ہمارے ہیرو صاحب اپنا کروا چکے ہیں۔''

''شٹ اپ...... میں تمہیں اپنی ٹانگوں پر چلتی ہوئی اچھی نہیں لگتی کیا جو میرا ایکسیڈنٹ کروانے کا سوچ رہی ہو' اور یہ بی بی کسے کہا تم نے......؟''

انجشاء کی توقع کے عین مطابق وہ اچھی خاصی تپ گئی تھی۔ تب ہی تمکین اور وہ ایک ساتھ کھلکھلا اٹھیں۔

''بے وقوف لڑکی! میں سچ مچ ایکسیڈنٹ کی بات نہیں کر رہی۔ صرف دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے کے لیے یہ سب ڈرامہ کرنے کا کہہ رہی ہوں۔ مقصد محض اتنا ہے کہ اگر اذہان صاحب کی والدہ محترمہ واقعی تم سے پیار کرتی ہیں تو وہ ہر حال میں تمہیں قبول کرلیں گی۔ پھر تم بھی ازمیر صاحب کا خیال ذہن سے جھٹک دینا' بصورت دیگر تمہاری ممانی صاحبہ پیچھے ہٹ جائیں تو ''خس کم جہاں پاک'' سارا مسئلہ ہی ختم ہو جائے گا۔ تم اپنی مرضی سے اپنی زندگی کا فیصلہ کر سکو گی۔ اپنے پرائے کی پہچان بھی ہو جائے گی اور اس طرح ہو سکتا ہے تمہارے ممی پاپا کے درمیان قائم فاصلے بھی ختم ہو جائیں۔''

انجشاء کی ذہانت اور قابلیت ہمیشہ سے قابلِ رشک ثابت ہوئی تھی' مگر اس وقت تو اریشہ کو اس کے سنہرے آئیڈیے نے اتنی خوشی دی کہ اس نے فوراً لپک کر اس کا منہ چوم لیا۔

''تم بہت گریٹ ہو انجو! ایمان سے آج مجھے فخر محسوس ہو رہا ہے کہ میں تمہاری قریبی دوست ہوں۔''

''چلو.... گویا تم بھی مطلب کی یار ہی نکلیں۔'' اس کا انداز صاف چڑانے والا تھا۔

''شٹ اپ.... ایک تو فضول بہت بولتی ہو تم۔ پتہ نہیں ہمارے عدنان صاحب کیسے جھیلتے ہوں گے تمہیں....''

اریشہ نے دیکھا کہ اس کے الفاظ پر انجشاء کے چہرے کی مسکراہٹ فوراً معدوم ہو گئی تھی۔

''انجو! آر یو اوکے جان....؟''

''ہاں.... میں بالکل ٹھیک ہوں۔ کچھ نہیں ہو سکتا مجھے۔ دیکھو میری آنکھوں کے سامنے میری جان سے پیارے میرے ممی پاپا چلے گئے مجھے کچھ ہوا....؟ وہ گھر' وہ حویلی جو پیارا گھر ہمیشہ کے لیے چھوڑنا پڑ گیا مجھے مگر پھر بھی مجھے کچھ نہیں ہوا۔ وہ ایک شخص کہ جس کا تصور مجھے زندگی کا احساس دلاتا تھا۔ جس کے خواب میرے کل اثاثہ تھے۔ اس شخص نے مجھ سے اپنا ہر ناتا توڑ لیا' پر دیکھو پھر بھی میں زندہ ہوں۔ کچھ نہیں ہوا مجھے' اپنی جان سے قریب تر دادا جی کو بھی کھو دیا میں نے' وہ آخری سہارا تھے میری زندگی کا مگر.... دیکھو لو اریشہ ان کے نہ ہونے پر بھی میں مرتو نہیں گئی۔ آج بھی زبردستی جی رہی ہوں۔''

انجشاء احمر کے ایک ایک لفظ سے تلخی ٹپک رہی تھی۔ تب ہی اس کی آنکھیں یک لخت بھیگ گئی اور وہ خود پر ضبط کا یارا نہ رکھتے ہوئے ان دونوں کو اپنی زندگی کے ایک ایک موڑ سے آگاہ کر گئی۔

''کتنی عجیب بات ہے کہ ہر مشکل کو چٹکیوں میں اڑا دینے والی انجشاء احمر.... اپنی زندگی کی مشکلات کا کوئی حل نہیں تلاش سکی۔ شاید اسی کو نصیب کہتے ہیں۔ کوئی کتنا ہی عقل مند کیوں نہ ہو۔ اپنا نصیب کبھی نہیں بدل سکتا۔'' اب کے اس کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔ جواب میں خاموش بیٹھی تمکین رضا نے اپنا گرم ہاتھ اس کے دونوں سرد ہاتھوں پر دھر دیا۔

''پلیز بی ریلیکس انجو! بے شک ہمیں محبت کے ہاتھوں شکست ہوگئی۔ بے شک ہمیں نصیب نے ہرا ڈالا مگر.... ہمارے حوصلے ابھی

نوٹے نہیں ہیں انجشاء۔ اب بھی وقت کی لگا میں ہمارے ہاتھ میں ہیں۔

بھلے ہم میں تمہارے جیسی سوجھ بوجھ نہیں مگر پھر بھی ہم تمہیں یہی مشورہ دیں گے تم عدنان بھائی کو معاف کر کے ان کے ساتھ زندگی گزارنا شروع کر دو۔ خدا بہتر صلہ دینے والا ہے انجو کیا خبر تمہاری یہی نیکی تمہاری بخشش کا وسیلہ بن جائے۔''

''ہاں انجشاء! کل تمہیں عدنان بھائی کی ضرورت تھی مگر انہوں نے تمہارا ساتھ نہ دے کر خود کو کم تر ثابت کر دیا پر آج قدرت نے وقت کا پہیہ گھما کر انہیں تمہارا مقروض کر دیا ہے۔ آج وقت تمہاری گرفت میں ہے انجشاء تمہیں ثابت کرنا ہے تم ایک عظیم اور بہادر لڑکی ہو۔ تمہاری تربیت ایک نیک عورت نے کی ہے۔ بے شک اللہ تمہاری اس نیکی کا اجر تمہیں ضرور دے گا۔''

تمکین کے ساتھ ساتھ اریشہ نے بھی اس کی ہمت بڑھائی تو انجشاء ایک دم سے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگی۔

''او..... کتنا وقت ہو گیا مگر ہمیں ایک دوسرے کی باتوں میں الجھ کر اس کا احساس ہی نہیں ہو سکا چلو بیبیو ورنہ ہمارے گھر والے مسجدوں میں ہماری گمشدگی کا اعلان کروا دیں گے۔''

تمکین کی نظر اچانک اپنی کلائی پر بندھی واچ پر گئی تو اس نے گہری سانس بھرتے ہوئے ان دونوں کو بھی گہری ہوتی رات کی تاریکی سے باخبر کر دیا۔ نتیجتاً اریشہ اور انجشاء دونوں ہی اپنے مشروب خالی کر کے فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں تو تمکین پے منٹ کر کے ان کے ساتھ ہی ریسٹورنٹ سے باہر نکل آئی۔

''تمی! تم اور اریشہ چلو مجھے ابھی ہسپتال جانا ہے۔ میں کل تم سے دوبارہ ملتی ہوں او کے۔''

تمکین رضا اپنی گاڑی کے قریب پہنچی تو انجشاء نے واپس ان کے ساتھ چلنے پر معذرت کر لی۔ لہٰذا اس کی معذرت قبول کرتے ہوئے تمکین اور اریشہ دونوں گاڑی میں آ بیٹھیں جب کہ انجشاء قریبی ہسپتال کی طرف بڑھ گئی۔ گاڑی خاصے پرسکون انداز میں پختہ سڑک پر بھاگ رہی تھی۔ جب اچانک اریشہ نے تمکین سے پوچھ لیا۔

''تم نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تمی' شیزا کا بھی کہیں کچھ پتا نہیں' کیا ہوا ہے؟ پلیز بتاؤ ناں.....'' اریشہ کے سوال پر تمکین کی آنکھیں پھر سے بھر آئی تھیں مگر اس نے اپنا ضبط نہیں کھونے دیا۔

''پچھلے سال اشعر اور میں شادی کے بندھن میں بندھ گئے تھے اریشہ! ہم دونوں میں بے حد پیار تھا مگر اچانک...... ہمارے پیار کو شیزا کی نظر لگ گئی' پتہ نہیں کیوں کیسے اور کب اسے اشعر سے محبت ہو گئی۔ نتیجتاً اس نے میرے اور اشعر کے بیچ روز بہ روز اپنی کوششوں سے فاصلے بڑھا دیے۔ بڑھتے بڑھتے یہ تلخی اتنی پھیل گئی کہ بالآخر ہمیں ایک دوسرے سے دور ہونا پڑا۔ سنا ہے آج کل شیزا دوبئی میں ہے مگر مجھے اب اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ آسان لفظوں میں اگر میں یہ کہوں کہ میری زندگی میں اب اشعر اور شیزا دونوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے تو قطعی غلط نہیں ہوگا۔''

بہت مختصر لفظوں میں اس نے اپنی کہانی کو سمیٹا تھا مگر اس کے باوجود اریشہ شیزا کی بے وفائی اور مکاری پر دنگ رہ گئی تھی۔ اسے آج بھی یاد تھا کہ وہ چاروں یونیورسٹی میں ہر غم سے بے فکر و بے نیاز رنگین اڑتی ہوئی تتلیوں کی مانند تھیں جب وقت کی لگام تھام کر اسے اپنی مرضی کے مطابق

چلانا انہیں بہت لطف دیا کرتا تھا مگر آج وہ چاروں ہی وقت کے گرداب تلے دب کر رہ گئی تھیں۔

''اب آگے تم نے کیا سوچا ہے تمی! پہاڑ جیسی طویل یہ زندگی یوں ہی تنہا تو بسر نہیں کی جا سکتی۔''

بہت دھیمے لہجے میں اریشہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تھا جب وہ سرد آہ بھرتے ہوئے بولی۔

''اب جو قدرت کو منظور ہوگا وہی ہوگا اریشہ! میں نے اپنی زندگی اپنے حقیقی مالک کو سونپ دی ہے وہ جو بہتر سمجھے گا میرے لیے کرے گا۔''

رات واقعی کافی گہری ہوگئی تھی۔ تمکین اریشہ کو لے کر جس وقت واپس ''حسن ولاج'' پہنچی شب کے تقریباً دو بج رہے تھے۔ تب ہی وہ اریشہ کو اپنے بیڈ روم میں پہنچا کر جوں ہی رخسانہ بیگم کے کمرے کی طرف آئی گویا ٹھٹھک کر رک گئی۔ کمرے کے اندر سے ابھرتی آواز یقیناً اس کی بڑی ماں کی تھی۔ جو دبے دبے لہجے میں غالباً انہیں یقیناً اشعر احمد سے پوچھ رہی تھیں۔

''بیٹے! کیا اب تم اپنی مما سے بھی چھپاؤ گے کہ تمہیں کون سی چیز مسلسل ڈسٹرب کر رہی ہے؟''

''ایسی بات نہیں ہے مما! مگر اب پاکستان میں میرا دل نہیں لگتا۔ آپ تصور بھی نہیں کر سکتیں مما کہ میں تمکین کو کتنا ٹوٹ کر چاہتا ہوں۔ مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی ہے مما مگر اس غلطی کی پاداش میں میں تاعمر تمکین سے الگ رہ کر نہیں جی سکتا۔ میں اسے پرایا بن کر اپنی آنکھوں کے سامنے چلتے پھرتے نہیں دیکھ سکتا اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ اب ہمیشہ کے لیے پاکستان چھوڑ دوں نہ آپ اور وہ میری آنکھوں کے سامنے رہیں گی نہ میرا دل تڑپے گا......''

اشعر احمد کا بکھرا بکھرا سا لہجہ اسے زخم زخم کر گیا تھا۔ اسلام آباد سے اس کی واپسی کب ہوئی تمکین کو مطلق خبر نہیں ہو سکی تھی۔

''یہ سب تم نے خود کیا ہے اشعر! تمہاری خوشی کے لیے ہم نے تمکین کو تمہارے لیے مانگا۔ خود سے دور یہاں رہنے کے لیے بھیجا۔ اس کے باوجود تم نے کسی کا لحاظ کیے بغیر ایک پل میں اس بچی کی قسمت کا فیصلہ کر دیا' اوپر سے پھر ہمیں چھوڑ کر جانے کا کہہ رہے ہو' ہم تمہاری جدائی کیسے سہیں گے بیٹا......؟ ہمیں کس بات کی سزا دے رہے ہو تم......؟'' اب کے رخسانہ بیگم سسک اٹھی تھیں۔ تب وہ قدرے بیزاری سے بولا۔

''فار گاڈ سیک موم! آپ کو اب میری پروا نہیں کرنی چاہیے۔ اب آپ صرف اریج کے متعلق سوچا کیجیے۔ اس کی فکر کیا کریں آپ...... میں اپنے آپ کو خود ہی سنبھال لوں گا۔''

''اچھا...... ایک دم سے اتنے بڑے ہوگئے ہو تم......؟ اور اریج کو درمیان میں کیوں لا رہے ہو تم......؟ اس بدنصیب کے حصے میں تو سوائے محرومیوں کے اور کچھ بھی نہیں آیا......''

تمکین کے قدم من من کے بھاری ہوگئے تھے۔ سینے میں سانس جیسے الجھنے لگی تھی۔ وہ پلٹنا ہی چاہتی تھی جب اس نے اشعر کو بلند آواز میں کہتے ہوئے سنا۔

''میں سوائے اس کے اور کچھ نہیں جانتا موم کہ وہ میری خوشیوں کا قاتل ہے' نہ وہ میرے اور تمکین کے درمیان آتا نہ مجھ سے یہ حماقت سرزد ہوتی۔''

''چلو.....تم نے یہ تو مانا کہ حماقت تم سے سرزد ہوئی تھی۔ بہر حال میں تمہیں ''حسن ولاج'' سے کہیں بھی جانے کی اجازت نہیں دے سکتی۔''

اس بار رخسانہ بیگم کا لہجہ بھی قدرے سخت تھا۔ تاہم کچھ لمحوں کے بعد اس نے پھر اشعر کو کہتے ہوئے سنا تھا۔

''اوکے! اگر آپ اجازت نہیں دیں گی تو میں کہیں نہیں جاؤں گا مگر اس کے لیے آپ سب کو میری ایک فرمائش پوری کرنا ہوگی۔''

اس کے لفظوں نے اچانک جہاں رخسانہ بیگم چونکایا تھا وہیں تمکین کا ایک ایک عضو بھی جیسے کان بن کر رہ گیا۔

''کیسی فرمائش.....؟''

''بہت زیادہ مشکل نہیں ہے مما۔ صرف ایک رات کی بات ہے۔ آپ ہی کہتی ہیں ناں کہ اریج آپ سے بہت پیار کرتا ہے اور آپ کی خوشی کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے تو کہیے اسے کہ صرف ایک رات کے لیے وہ ٹمی کو اپنے عقد میں لے کر اگلے ہی روز اسے ڈائیوارس دے دے تا کہ میں پھر سے اسے حاصل کر سکوں۔ آئی پرامس پھر میں کہیں نہیں جاؤں گا اپنے ساتھ کچھ غلط نہیں کروں گا۔ بصورت دیگر میں کسی بھی وقت خود اپنی جان لے سکتا ہوں مما یہ یاد رکھیے گا آپ.....''

اس لمحے زمین صرف رخسانہ بیگم کے پاؤں تک سے ہی نہیں نکلی تھی بلکہ آسمان کمرے سے باہر کھڑی تمکین رضا کے سر پر بھی گر پڑا تھا۔ اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے وہ اس حد تک گر سکتا ہے۔ تمکین کبھی خواب میں بھی اس کا تصور نہیں کر پائی تھی۔ تب ہی وہ فوراً اپنا پسینہ پسینہ وجود لیے وہاں سے ہٹ کر باہر لاؤنج کی طرف نکل آئی مگر یہ کیا.....؟ جوں ہی وہ لاؤنج میں داخل ہوئی کسی کے فولادی وجود سے بری طرح ٹکرا کر اپنا توازن کھو بیٹھی۔

''آ.....آپ.....؟''

ٹکرانے والے نے فوراً اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں سنبھال کر گرنے سے بچا لیا تھا۔ تب ہی اس نے سنبھل کر اوپر دیکھا تو اریج احمر کو اپنے سامنے پا کر ششدر رہ گئی۔

تو کہیں بھی رہے' تجھ پر میرا الزام تو ہے
تیرے ہاتھوں کی لکیروں میں میرا نام تو ہے
تو مجھے اپنا بنا یا نہ بنا' تیری خوشی
تو زمانے میں میرے نام سے بدنام تو ہے

اس سے پہلے کہ دشتِ امکاں کو
وصلِ جاناں کی آرزو نہ رہے
اس سے پہلے کہ بارِ غم سے' کہیں
تجھ کو پانے کی جستجو نہ رہے
اس سے پہلے کہ دشتِ کاہش سے
فرشِ افسردگی بچھے سرِ راہ
لوٹ آؤ کہ منتظر ہے نگاہ
اس سے پہلے کہ لوحِ قسمت پر
بابِ الفت تمام ہو جائے
اس سے پہلے کہ شام ہو جائے۔

''شاہ ولاج'' ان دنوں پھر سے مسائل کی زد میں آیا ہوا تھا۔

ایک تو ماہم شاہ نے نہایت ہی غلط قدم اٹھا کر گھر کے تمام مکینوں کی ناک کٹوا دی تھی۔ اوپر سے اریشہ خان کے ایکسیڈنٹ نے ایک نئی ہی مصیبت کھڑی کر دی' وہ تو گھر سے صحیح سلامت اپنی فرینڈز سے ملنے کا کہہ کر نکلی تھی مگر اب اس کی کوئی دوست فون کر کے بتا رہی تھی کہ اریشہ کا بہت زبردست ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے لہٰذا جتنی جلدی ممکن ہو سکتا ہے وہ لوگ کراچی چلے آئیں۔

خبر کیا تھی کوئی طوفان تھا جو نورینہ بیگم کے ساتھ ساتھ فرزانہ بیگم' صالحہ بھابھی' اذہان شاہ' ارسلان شاہ' فرزانہ بیگم کے شوہر آفاق شاہ' آمنہ بیگم اور اُن کے شوہر بلاول شاہ کے علاوہ گھر کی نوجوان پارٹی کے اعصاب بھی معطل کر گئی تھی کیونکہ اریشہ سب کی فیورٹ تھی۔

شام کے سائے قدرے گہرے ہو رہے تھے۔ جب وہ سب لوگ اریشہ کے پاس' مطلوبہ ہوسپٹل پہنچے۔ سب کے چہروں پر پریشانی

جھلک رہی تھی۔ نورینہ بیگم کے ساتھ دانیہ اور عدیلہ اپنی سگی بہن کے لئے از حد متفکر دکھائی دے رہی تھیں۔

جانے کس عالم میں وہ سب لوگ اریشہ کے کمرے تک پہنچے تو اس کے پاس بیٹھے شہریار جاوید صاحب کو دیکھ کر نورینہ بیگم تو جیسے وہیں پتھر کی ہوگئیں۔ ایک طویل مدت کے بعد نگاہیں اس چہرے کو دیکھ رہی تھیں کہ جس چہرے سے کبھی وہ ٹوٹ کر پیار کیا کرتی تھیں۔

شہریار جاوید صاحب کی نگاہ بھی ان پر پڑ چکی تھی۔ انہیں ایک مدت کے بعد نگاہوں کے سامنے دیکھ کر اپنی نگاہیں ان کے چہرے سے ہٹا نہیں پائے تھے کیونکہ چاہنے کی خطا تو بہر حال ان سے بھی سرزد ہوئی تھی۔ تاہم اس وقت وہ موضوع گفتگو بننا نہیں چاہتے تھے۔ لہٰذا ساکت کھڑی نورینہ بیگم کے چہرے سے نگاہ ہٹا کر وہ فوراً اریشہ کے پاس سے اٹھ گئے۔

''اوکے بیٹا! اب میں چلتا ہوں۔ شام کو پھر آؤں گا.....'' کہنے کے ساتھ ہی وہ دہلیز کی طرف بڑھ گئے تو اریشہ نے فوراً صدا دے کر انہیں روک لیا۔

''پاپا.....'' اس کی آواز پر وہ فوراً واپس پلٹ آئے تھے۔ تب ہی ان کا ہاتھ تھام کر محبت سے چومتے ہوئے بولی۔

''پاپا! میں ان لوگوں کے ساتھ اس زندان میں جانا نہیں چاہتی' پلیز پاپا مجھ سے اب بھی غافل مت ہویئے گا۔ میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں پاپا پلیز..... یہاں سے ڈسچارج کروا کے مجھے اپنے ساتھ لے جایئے گا پاپا پلیز.....''

کہنے کے ساتھ ہی وہ آہستہ سے رو پڑی تو شہریار جاوید صاحب نے ذرا سا جھک کر فوراً اس کی پیشانی چوم لی۔

''اوکے گڑیا..... اب جیسا آپ چاہو گی ویسا ہی ہوگا.....''

ان کے الفاظ پر جہاں نورینہ بیگم کا سکوت ٹوٹا تھا وہیں دانیہ اور عدیلہ بھی لپک کر ان کے قریب چلی آئی تھیں۔

''پاپا..... پاپا! آپ آگئے..... ہم نے آپ کو کتنا مس کیا پاپا ہم ساری عمر آپ سے ملنے کے لئے اپنے ذاتی گھر میں اپنی مرضی سے رہنے کے لئے کتنا ترسے ہیں پاپا۔ کیا آپ کو کبھی ہماری یاد نہیں آئی.....؟''

دانیہ دلگرفتی کے انداز میں ان سے گلہ کر رہی تھی جبکہ خاموش کھڑی عدیلہ نے چپکے سے ان کا بازو تھام لیا تھا۔ اس وقت سب اریشہ کو قطعی فراموش کیے صرف ان کی طرف متوجہ ہوگئے تھے۔ جو ایک دم سے جیسے بہت بڑی ہوگئی تھیں۔

''چپ کیوں کھڑے ہیں پاپا! مما سے آپ کی ناراضگی تھی۔ آپ ان سے دور رہتے' ہمیں اپنی شفقت سے کیوں محروم کیا آپ نے' ہمارا کیا قصور تھا؟'' اب کے عدیلہ یہ کہتے ہوئے ان کے کندھے پر سر رکھ کر رو پڑی تو انہوں نے یک لخت خوشی سے بے حال ہوتے ہوئے ان دونوں کو ایک ساتھ اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ شفقت و محبت کا در کھلا تو پھر وہ جیسے خود پر قابو رکھنا بھول گئے اور ان کی بیٹیاں اس برسات میں پور پور سیراب ہوتی گئیں۔

نورینہ بیگم بھی ساکت نگاہوں سے ان باپ بیٹیوں کا ملاپ دیکھ رہی تھیں۔ یہ حقیقت تھی کہ وہ وقت سے ہار گئی تھیں۔ محض ایک غلط قدم اٹھا کر زندگی بھر کے لئے سکون کو خود پر حرام کر لیا تھا مگر اب بھی وہ ٹوٹ کر بکھرنا نہیں چاہتی تھیں۔ وہ ایک شخص کہ جس سے آج بھی ٹوٹ کر محبت کرتی

تھیں۔انہی سے ہار جانا آج بھی انہیں گوارہ نہیں تھا۔لہٰذا خاموش کھڑی بے نیازی سے ان کی طرف دیکھتی رہیں جواب اپنی بیٹیوں کو بانہوں کے حلقے میں لیے بہت پیار سے کہہ رہے تھے۔

''میں شام کو پھر آؤں گا بیٹے فی الحال مجھے ایک میٹنگ اٹینڈ کرنی ہے تب تک آپ اپنی اپیا کا حال احوال پوچھیں۔ٹھیک ہے......''

نورینہ بیگم کے ساتھ ساتھ وہ بھی شاہ ولاج کے سب ہی مکینوں سے خفا تھے کہ جنہوں نے نورینہ بیگم کو سمجھا کر واپس بھیجنے کے بجائے انہیں اپنے ہاں رکھ لیا تھا۔لہٰذا اپنی بیٹیوں سے الگ ہو کر وہ ایک سرسری سی اجنبی نگاہ ان سب پر ڈالتے ہوئے کمرے سے نکل گئے تو آفاق شاہ کے ساتھ ساتھ بلال شاہ آمنہ بیگم اور دیگر لوگ بھی محض دکھ سے گردن جھکا کر رہ گئے۔

انجشاء بھی اس وقت وہیں موجود تھی۔اسی نے فون کر کے اریشہ کی خواہش پر شہریار جاوید صاحب کو یہاں بلا کر تمام صورت حال ان کے گوش گزار کر دی تھی۔نورینہ بیگم کی آنکھوں پر بندھی' اپنوں کی خود غرض اندھی محبت کی پٹی اتارنے کے لئے وہ بھی اریشہ کے پلان میں اس کے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔فرزانہ بیگم اور ماہم شاہ کو جوں ہی انجشاء نے بتایا کہ اریشہ اس ایکسیڈنٹ میں' اپنے دونوں پاؤں کھو چکی ہے تو ان کے چہرے فوراً اتر گئے۔سارے خواب جیسے پل میں مٹی کا ڈھیر ہو کر رہ گئے تھے۔

''مما! اریشہ اب کسی صورت میری بھابھی نہیں بن سکتی۔بہتر ہے آپ صالحہ بھابھی کی بہن سائرہ کو ہاتھ میں کرنے کی کوشش کریں۔''

وہیں کھڑے کھڑے ماہم شاہ نے فرزانہ بیگم کے کان میں سرگوشی کی تو انہوں نے بھی کچھ سوچتے ہوئے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ایکسکیوزمی......''

وہ سب لوگ اریشہ کے بیڈ کے گرد کھڑے اس سے اپنی محبت جتا رہے تھے جب سفید کورٹ پہنے کچھ ڈاکٹری آلات کے ساتھ ڈاکٹر فرحان خان آہستہ سے دروازہ دھکیل کر کمرے کے اندر چلے آئے۔

''مس انجشاء! میں نے پہلے بھی آپ سے کہا تھا کہ مریضہ کو زیادہ سے زیادہ آرام کی ضرورت ہے۔پھر یہ سب لوگ انہیں ڈسٹرب کیوں کر رہے ہیں......؟''

ان کا لہجہ خشک تھا۔تب ہی آفاق شاہ کے ساتھ ساتھ بلال شاہ اور ارسلان شاہ بھی فوراً ان کی طرف لپکے تھے۔

''ڈاکٹر صاحب! ہم اریشہ بیٹی کے سرپرست ہیں۔ہمیں ابھی اس المناک سانحے کی بابت علم ہوا ہے پلیز بتائیے کیا ہماری اریشہ بیٹی اب کبھی اپنی ٹانگوں پر نہیں چل سکے گی......؟''

آفاق شاہ نے نہایت پریشان کن لہجے میں ڈاکٹر فرحان سے دریافت کیا تھا جواب میں وہ ایک نظر اریشہ کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولے۔

''ابھی فی الحال کچھ بھی کہنا قبل از وقت ہوگا آفاق صاحب۔اریشہ صاحبہ کے کچھ ٹیسٹ ابھی باقی ہیں اس کے بعد ہی حتمی طور پر کچھ بتایا جا سکتا ہے لیکن حادثے کی نوعیت چونکہ شدید تھی اور بقول مس انجشاء کے اریشہ کی گاڑی بہت تیزی کے ساتھ سامنے آتے بھاری ٹرک سے ٹکرائی تھی لہٰذا

خدا کا شکر ادا کیجئے کہ ان کی زندگی بچ گئی وگرنہ جتنی شدید نوعیت کا حادثہ تھا اس کے بعد ان کا زندہ بچ جانا ایک معجزہ ہی ہے......''

ان کے الفاظ پر آفاق صاحب کے ساتھ ساتھ باقی افراد کے دل بھی جیسے لرز کر رہ گئے تھے۔ یہی نہیں بلکہ ہمیشہ ماتھے پر تیوریاں ڈالے رکھنے والی نورینہ بیگم بھی بے ساختہ سسک کر رو پڑی تھیں۔ دل تو جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر مسل ڈالا تھا تب ہی فوراً انہوں نے آنسو پونچھتے ہوئے اپنے پرس سے ہزار ہزار کے کئی نوٹ نکالے اور انہیں اریشہ پر سے وار کر غریبوں میں تقسیم کرنے کے لئے ارسلان شاہ کے حوالے کر دیا۔

''ایکسکیوزمی...... مریضہ کو آرام کی سخت ضرورت ہے۔ فی الحال آپ انہیں اکیلا چھوڑ دیجئے تاکہ یہ کچھ دیر آرام کر سکیں۔''

ڈاکٹر فرحان کی ہدایت پر وہ سب مضطرب دل لئے برستی آنکھوں کے ساتھ اریشہ کے کمرے سے باہر نکل آئے۔ فرزانہ بیگم اور ماہم شاہ کے چہروں پر سخت اضطراب دکھائی دے رہا تھا۔ یہ سب معلوم ہوتا تو شاید وہ لوگ اریشہ کو گھر سے باہر نکلنے ہی نہ دیتے۔

روشنیوں کے شہر کراچی میں فی الحال ان کا کوئی جاننے والا نہیں تھا لہٰذا اریشہ کے ڈسچارج ہونے تک ان کا ارادہ کسی اچھے سے ہوٹل میں ٹھہرنے کا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ لوگ کسی ہوٹل کا رخ کرتے ایک نہایت شاندار چمچاتی ہوئی بلیک کرولا عین ہوسپٹل کے سامنے آ کر ان کے قریب رک گئی۔ اندر سے باوردی ڈرائیور خاصی سرعت سے باہر نکلا تھا۔

''صاحب! آپ لوگ اریشہ بی بی کے گھر والے ہی ہیں ناں......؟''

''جی ہاں۔ پر آپ یہ سب کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

ارسلان شاہ نے قدرے حیرانگی سے باوردی ڈرائیور پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا تھا۔ جب وہ نہایت تابعداری سے ہاتھ باندھتے ہوئے سر جھکا کر بولا۔

''آپ سب اس وقت میرے ساتھ چلئے۔ صاحب نے مجھے آپ سب کو لانے کا حکم دیا ہے۔''

''کس صاحب نے......؟''

نورینہ بیگم نے فوراً آگے بڑھ کر کرخت دار لہجے میں پوچھا تھا۔ جب ڈرائیور نے پھر سے تابعدار لہجے میں بتایا۔

''اریشہ بی بی کے والد شہریار جاوید صاحب نے......''

''اوکے...... لیکن جا کر اپنے صاحب سے کہہ دو کہ اس شہر میں اچھے ہوٹلوں کی کمی نہیں ہے جو ہم ان کے در کے فقیر بن جائیں۔''

نورینہ بیگم پھر سے بلاوجہ غصے میں آ گئی تھیں جب آفاق شاہ تیزی سے ان کی بات کاٹتے ہوئے بولے۔

''ہر بات میں جذبات سے کام مت لیا کرو نور...... کچھ باتوں میں مصلحت آمیزی کو بھی مدنظر رکھ لیا کرو۔ زندگی بھر تم بے وقوفیاں کرتی آ رہی ہو۔ کم از کم اس نازک موقع پر تو عقل سے کام لے لو۔''

زندگی میں شاید پہلی بار انہوں نے نورینہ بیگم کو سرزنش کی تھی۔ تب ہی بلال شاہ بھی ان کے قریب چلے آئے۔

''دیکھو نور! یہ ٹھیک ہے کہ اس شہر میں اچھے ہوٹلوں کی کمی نہیں اور الحمدللہ ہمیں روپے پیسے کی بھی کوئی پرابلم نہیں لیکن...... ہم سب سے خفگی

کے باوجود اگر شہریار بھائی نے ہمارے آرام کا سوچا ہے تو ہم پھر سے فضول کی اکڑ دکھا کر انہیں مزید بددل کیوں کریں۔ پہلے ہی تمہاری وجہ سے ہم ان سے نظر ملانے کے قابل نہیں رہے۔ اب اگر وقت نے ہمیں اپنی کوتاہیوں کی تلافی کرنے کا ایک موقع دیا ہے تو کیوں ناں اس سے فائدہ اٹھائیں۔ پھر اتنے سارے لوگ ہوٹل کے ایک کمرے میں تو نہیں ٹھہر سکتے۔ ہمیں کم از کم چار پانچ روم درکار ہیں۔ وقت بے وقت آنے جانے کی مصیبت الگ ہوگی۔ لہٰذا بہتری اسی میں ہے کہ ہم سب شہریار بھائی کے گھر چلیں۔"

آفاق شاہ کی نسبت بلال شاہ کا لہجہ خاصا نرم تھا مگر اس کے باوجود نورینہ بیگم کا دل دکھ سے کٹ کر رہ گیا۔ آج تک صرف بھابیاں ہی زخموں پر نمک پاشی کرتی آئی تھیں۔ بھائیوں نے اپنی زبان سے کچھ نہیں کہا تھا مگر آج یوں سب کے سامنے بھائیوں نے ان کا وقار دو کوڑی کا کر کے رکھ دیا تو گویا وہ دکھ کی شدت سے کچھ بول ہی نہ سکیں۔ کسی سے کیا کہتیں ان کی اپنی اولاد ان کے ساتھ نہیں رہی تھی۔

وہ کسی بھی قیمت پر شہریار جاوید صاحب سے ہارنا نہیں چاہتی تھیں مگر ہار گئی تھیں۔

جگمگاتی بلیک کرولا جوں ہی "بے مثال کاٹیج" کے باہر رکی۔ بڑوں کے ساتھ ساتھ بچوں کی آنکھیں بھی ستائش سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"اتنا شاندار گھر..... میں نے تو اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھا۔ سچ دانیہ یہ تو میرے ڈریم لینڈ سے بھی بڑھ کر ہے۔"

عدیلہ کی خوشی واقعی دیدنی تھی۔ تب ہی نورینہ بیگم کا دل جیسے مزید درد میں ڈوب کر رہ گیا۔ بالکل اچانک ہی وہ خود کو اپنی بچیوں کا مجرم تصور کرنے لگی تھیں۔ اسی پل شہریار صاحب خود چل کر گیٹ پر انہیں ریسیو کرنے کے لیے آئے تو دانیہ عدیلہ دونوں بھاگ کر ان کے گلے لگ گئیں جب کہ گاڑی کے قریب کھڑی نورینہ بیگم اپنی بیٹیوں کی اس درجہ بے وفائی پر دکھ سے کٹ کر رہ گئی تھیں۔

"بے مثال کاٹیج" میں ان سب کی یوں آؤ بھگت کی گئی گویا وہ کسی دوسرے سیارے سے زمین پر آئے ہوں۔ باقی سب کے ساتھ ساتھ فرزانہ بیگم اور ماہم شاہ کی بھی آنکھیں چار ہو گئی تھیں۔ "بے مثال کاٹیج" کے سامنے تو ان کا "شاہ ولاج" صفر بھی نہیں تھا۔ اریشہ کے ہاتھ سے نکل جانے پر ایک مرتبہ انہیں پھر افسوس ہونے لگا تھا۔ اس رات باقی سب لوگ تو مخملی بستروں میں دبک کر سکون کی نیند سو گئے تھے مگر نورینہ بیگم کو کوشش کے باوجود بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔

کروٹ پہ کروٹ بدلتے تھک گئیں تو خاموشی سے اٹھ کر باہر لان کی طرف چلی آئیں۔ آنکھوں کے ساتھ ساتھ اس وقت دل بھی بہت بری طرح جل رہا تھا حالانکہ سردی کی شدت اپنے عروج پر تھی۔ تب ہی وہ شال لینے کے لیے پلٹیں تو اچانک اپنے پیچھے کھڑے شہریار جاوید صاحب سے بری طرح ٹکرا گئیں۔

☆☆☆

میرے ہمسفر ہاں تیری نظر

میرے جذبہ دل کی شدتیں میرے خواب میری بصارتیں

میری دھڑکنیں میری چاہتیں

جو تیرے قدم میرے گھر چلیں میرے ساتھ شمس وقمر چلیں

تیری قربتوں میں سمیٹ لوں راہِ زندگی کی مسافتیں

یارِ دائے جاں تجھے سونپ دوں کہ نہ دھوپ تجھ کو کڑی لگے

کہیں دکھ نہ تجھ کو عطا کریں

سرِ دشت غم کی تمازتیں

تیرے نام سے میری صبح ہو تیری یاد سے میری شام ہو

تیرے روبرو رہیں سرخرو

میرے شام و دن کی عبارتیں

تیرا پیار میری دعا رہے

یہی فکر مجھ کو سدا رہے

''آ......آپ یہاں کیا کر رہے ہیں......؟''

اریج احمر کو اپنے مدمقابل دیکھ کر وہ ذرا سی گھبرائی تھی تب ہی وہ اسے اپنی بانہوں کی قید سے آزاد کرتے ہوئے ذرا سا رخ پھیر کر بولا۔

''میں......مما کو یہاں چھوڑنے آیا تھا پھر اشعر سے ملاقات ہوگئی تو یہیں ٹھہر گیا......نیند نہیں آ رہی تھی سو کمرے سے نکل کر یہاں لاؤنج میں چلا آیا۔ بہر حال......تم اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو......؟''

''او صد شکر کہ انہوں نے کچھ سنا نہیں......''

گہری سانس بھر کر اوپر کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے دل ہی دل میں خود سے کہا پھر اس کی طرف سرسری سے انداز میں دیکھتے ہوئے قدرے مدہم لہجے میں بولی۔

''میں اور انجو ابھی یہاں آئے تھے۔ وہ میرے بیڈ روم میں ہے مگر مجھے کچھ پیاس سی محسوس ہو رہی تھی لہٰذا میں اس طرف نکل آئی۔ چلتی ہوں اب......آپ بھی سو جایئے......'' کہنے کے ساتھ ہی وہ واپسی کے لئے پلٹ گئی تھی لیکن پھر اچانک ہی اس کے قدم جیسے ٹھٹھک کر رک گئے تھے۔ قطعی حیران و پریشان چہرے کے ساتھ ایڑیوں کے بل گھوم کر وہ اس کے مقابل آئی تھی۔

''یہ...... یہ آپ کا ہاتھ...... کتنا زخمی ہو رہا ہے...... کیا ہوا ہے بتائیے ناں پلیز......''

پریشانی اس کے چہرے سے چھلک رہی تھی۔ اریج جو ہر ممکن حد تک اپنے زخم اس سے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس لمحے بہت بے بس دکھائی دے رہا تھا تب ہی سرسری سے لہجے میں بولا۔

''آپ پریشان نہ ہوں تمکین یوں ہی معمولی سا زخم ہے۔ میں ابھی پٹی کر لیتا ہوں۔''

''معمولی زخم......؟ یہ خون دیکھا ہے آپ نے......؟ کتنا بہہ گیا ہے۔ پر آپ نے بھلا پہلے کب اپنی پروا کی ہے جواب کریں گے......؟''

اس کا مضبوط بھاری ہاتھ تمکین کے سرد ہاتھ میں تھا اور اب وہ گہری نگاہ سے اس کے ہاتھ پر لگے زخم کا جائزہ لے رہی تھی۔

''آپ بہت ہی لاپروا اور اذیت پسند شخص ہیں۔ بالکل پروا نہیں کرتے اپنی' ابھی اگر آپ کی جگہ اشعر ہوتا ناں تو سارے گھر کو گھما کر رکھ دیتا۔''

بے ساختگی میں وہ پھر اسے اشعر احمد کے ساتھ کمپیئر کر گئی تھی۔ مگر جلد ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تو وہ زبردستی اسے بازو سے تھام کر اسی کے روم میں لے آئی جہاں وہ سونے کے لئے ٹھہرا تھا۔

''تمکین! رات کافی ہو رہی ہے۔ ایسے ہی کسی نے تمہیں یہاں دیکھ لیا تو سو باتیں بن جائیں گی۔ میں خود کر لوں گا کچھ...... تم جاؤ ناں پلیز۔''

''ہرگز نہیں...... لوگوں کی پروا نہ میں نے کبھی پہلے کی تھی اور نہ ہی اب کروں گی۔ آپ بس خاموشی سے اپنے بستر پر لیٹ جایئے۔''

ضدی تو وہ بچپن سے تھی۔ اریج احمر کو بھی مجبوراً اس کی ہدایت پر عمل کرنا پڑا۔

''زخموں سے کبھی لاپروائی نہیں برتنی چاہیے ورنہ یہ ناسور بن کر سارے جسم کو چاٹ لیا کرتے ہیں۔'' کچھ ہی لمحوں میں فرسٹ ایڈ بکس اٹھائے وہ اس کی انفارمیشن میں اضافہ کرنے چلی آئی تھی۔ مقصد کسی حد تک اپنے ذہن و دل کو بہلانا تھا کہ جن میں بار بار اشعر احمد کے زہریلے جملوں کی بازگشت مسلسل ہو رہی تھی۔ اریج اب خاموشی سے بستر پر لیٹا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''آپ سے ایک سوال پوچھوں۔ سچ سچ جواب دیں گے......؟''

صاف کاٹن کو ڈیٹول میں بھگو کر زخم صاف کرتے ہوئے اچانک ہی اس نے پوچھا تھا۔ جواب میں اریج نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا کر گویا اسے سوال پوچھنے کی اجازت دے ڈالی۔

''مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں ناں آپ......؟ میں ہی آپ کی زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی ہوں ناں......؟''

اریج کو اس سے اس قسم کے سوال کی توقع نہیں تھی تب ہی وہ چونک کر حیرانگی سے اس کی طرف دیکھنے لگا تھا جب کہ وہ اس کا جواب سنے بغیر اپنے کام میں مشغول' ذرا سے توقف کے بعد دوبارہ بولی۔

''فرض کریں میں کسی مہلک مرض میں مبتلا ہو جاتی ہوں۔ ڈاکٹرز کے مطابق میری زندگی کے محض کچھ روز باقی ہوں۔ ایسے میں اپنی آخری

خواہش کے اظہار کے طور پر میں فرمائش کروں کہ میری شادی آپ سے ہو جائے تو کیا آپ مجھ سے شادی کر لیں گے......؟''

اس کا گرم مضبوط ہاتھ اب بھی اس کے نازک سے سرد ہاتھوں میں مقید تھا مگر کچھ کہنے نہ کہنے کی کشمکش میں مبتلا وہ گم صم سی کیفیت میں یک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا۔

''بتایئے ناں اریج...... کیا تھوڑے سے دنوں کے لئے آپ مجھ سے شادی کر لیں گے......؟''

اب کے اس نے اصرار کیا تھا۔ تب ہی وہ اپنے آنسو پیتے ہوئے ذرا سا رخ پھیر کر بولا۔

''ہاں......''

''کیوں......؟'' اتنی ہی تیزی سے اس نے پھر پوچھا تھا جب وہ پھر سے نگاہیں چراتے ہوئے بولا۔

''اگر تم مجھ سے ایسی کوئی فرمائش کرو گی تو میں تمہارا کہا ٹال نہیں سکوں گا۔''

''پھر...... پھر اس کے بعد کیا کریں گے......؟''

وہ آج اسے گویا پورا پورا ادھیڑنے کا تہیہ کیے بیٹھی تھی۔ تب ہی وہ بمشکل خود پر ضبط رکھتے ہوئے بولا۔

''پھر اس کے بعد میں خدا سے تمہاری لمبی عمر کے لئے دعا کروں گا...... تمہیں زندہ رہنے پر مجبور کروں گا۔''

''او کے...... لیکن فرض کریں اگر آپ کی دعائیں بارگاہِ الٰہی میں قبول نہ ہوئیں تو......؟ تب آپ کیا کریں گے......؟''

''تب بھی خدا سے تمہاری زندگی مانگوں گا کیونکہ دل کی گہرائیوں سے نکلی دعائیں وہ کبھی رد نہیں کرتا......''

دو بدو لہجے میں جواب دیتے ہوئے وہ خاصا بکھر گیا تھا۔ جب وہ پھر سے اپنے مخصوص انداز میں بولی۔

''ایک لمحے کے لئے فرض کریں کہ اگر آپ کی دعائیں قبول نہ ہوئیں تو......؟ تب آپ کیا کریں گے......؟''

''مر جاؤں گا...... تمہاری سانسیں رکنے سے پہلے میں اپنی آنکھیں بند کر لوں گا۔ خود اپنے ہاتھوں سے اپنی جان لے لوں گا۔ سنا تم نے...... کچھ بھی کر سکتا ہوں میں تمہارے لئے...... صرف تمہاری خوشی کے لئے...... اگر مجھے اپنی جان پر بھی کھیلنا پڑا تو ہرگز پیچھے نہیں ہٹوں گا میں۔ بس یہی سننا چاہتی تھیں ناں تم...... سن لیا اب جاؤ یہاں سے۔''

ضبط کی طنابیں ٹوٹ گئی تھیں۔ کب سے رکے آنسوؤں کا سیلاب بالآخر بہہ نکلا تھا تب ہی وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر بمشکل اپنی سسکیاں روکتے ہوئے وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بھاگ آئی تھی۔

☆☆☆

''اتنی سردی میں یہاں کیا کر رہی ہیں آپ؟''

شہریار صاحب کا گمبھیر لہجہ آج بھی سماعتوں میں رس گھولتا محسوس ہوتا تھا مگر نورینہ بیگم مسمار ہونا نہیں چاہتی تھیں تب ہی سرعت سے رخ پھیرتے ہوئے بولیں۔

''مم...... مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔''

''کب سے......؟ میرا مطلب ہے پچھلے بائیس سالوں سے کسی کی نیندیں اُڑا کر اپنوں کے ہاں بڑے چین سے سوتی آ رہی ہیں آپ پھر آج نیند کیوں نہیں آ رہی ہے......؟''

وہ یوں پھیل کر ان کے سامنے کھڑے ہو گئے تھے کہ نورینہ بیگم کے لئے فرار کی ساری راہیں مسدود ہو کر رہ گئی تھیں۔

''سنا ہے عورت کو صنف نازک کہا جاتا ہے۔ تب ہی شاعر لوگ اسے پھول کی پنکھڑیوں سے تشبیہ دیتے ہیں مگر مجھے یہ سب ایک دم بکواس لگتا ہے کیونکہ عورت اگر اپنی ضد پر اُڑ جائے تو پھر بڑی بڑی چٹانیں بھی اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ تم اپنی مثال ہی لے لو پورے بائیس سال ہو گئے۔ تمہیں ایک فضول سی بات پر روٹھے ہوئے مگر ان بائیس سالوں کا کوئی ایک بھی لمحہ تمہیں جھکا نہیں سکا نور' کوئی ایک بھی پل تمہارے دل کو موم نہیں کر سکا......''

دبے دبے گمبھیر لہجے میں انہیں خاموش پا کر انہوں نے پھر سے کہا تھا جب وہ مزید ضبط کا یارا نہ رکھتے ہوئے پھٹ پڑیں۔

''وہ فضول بات نہیں تھی مسٹر شہریار۔ میری زندگی کا یقین' میرا مان' میری محبت' سب اسی ایک بات پر اٹکے ہوئے تھے مگر آپ نے کسی کی پروا نہیں کی' کسی کے متعلق نہیں سوچا آپ نے پروا کی تو صرف اپنے دل کی' پورا کیا تو صرف اپنی خواہش کو......''

''بسمہ میری خواہش نہیں...... مجبوری تھی اور یہ بات میں پہلے ہی روز تمہیں بتا چکا تھا۔''

''آپ کے بتانے سے کیا ہوتا ہے' میں کیا جانتی نہیں کہ آپ کو بیٹے کی کتنی خواہش تھی۔ صرف اور صرف اپنی ہی کروڑوں کی جائیداد کا وارث حاصل کرنے کے لئے آپ نے اس لاوارث لڑکی سے شادی کی تھی ورنہ وہ مجھ سے زیادہ خوب صورت نہ تھی۔

''اسی بات پر بائیس سال پہلے ہمارا جھگڑا ہوا تھا تب بھی میں نے سب کچھ سچ بتانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی مگر تم نے جذبات کی رو میں بہہ کر میری کوئی ایک وضاحت بھی نہیں سنی تھی۔ کیا محبت کرنے والے دل اتنے تنگ ہوا کرتے ہیں نور۔ محبت تو یقین اور ایمان کا دوسرا نام ہے۔ پھر تمہاری محبت کو کیا نام دوں میں......''

اپنے لہجے کی مانند وہ خود بھی خاصے بکھرے ہوئے دکھائی دے رہے تھے مگر نورینہ بیگم نے پلٹ کر محض ایک نظر بھی ان کی طرف دیکھنا گوارہ نہیں کیا تھا۔

''میں محبت کے فلسفے میں الجھنا نہیں چاہتی۔ مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ میں نے آپ سے جو محبت کی تھی اس میں کسی تیسرے فرد کی دخل اندازی کی گنجائش نہیں تھی مگر آپ جان بوجھ کر کسی تیسری شخصیت کو اپنے اور میرے درمیان لائے۔ یہی نہیں بلکہ اپنی محبت' اپنا دل' اپنا بستر سب کچھ شیئر کیا اس کے ساتھ...... میری ناراضگی کے باوجود آپ نے اسے اس گھر سے نہیں جانے دیا اور مجھے یہ گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ آپ نے ہمیشہ اپنے ہر عمل سے یہ ثابت کیا کہ وہ آپ کے لئے سب کچھ تھی مگر میں...... میں شاید کچھ بھی نہیں تھی۔''

بہت ضبط کے باوجود بھی ان کا لہجہ بھرا گیا تھا تب ہی وہ سرعت سے پلٹ کر ان کے پہلو سے گزرنے لگیں تو شہریار صاحب نے فوراً ان کی

چوڑیوں بھری کلائی اپنی مضبوط گرفت میں لے لی۔ کڑک...... کڑک کرکے کئی چوڑیاں ٹوٹیں اور نیچے زمین پر بکھر گئیں۔

''پلیز میرا ہاتھ چھوڑ دیں مجھے نیند آ رہی ہے۔''

شدتِ ضبط سے آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں جب شہریار صاحب نے ان کا بھیگا بھیگا سا چہرہ دونوں ہاتھوں کے پیالے میں تھام کر اوپر اٹھا دیا۔

''او کے...... میرے مضبوط کندھے حاضر ہیں ان پر سر رکھ کر سو جاؤ۔ تمہاری قسم پوری رات کے کسی ایک لمحے میں ذرا سا بھی ہل کر تمہیں ڈسٹرب کروں تو جو چاہے سزا دینا اعتراض نہیں کروں گا۔''

''میں اب آپ کی ان پرفریب باتوں کے چکروں میں الجھنا نہیں چاہتی۔''

ان کے ہاتھ پیچھے جھٹکتے ہوئے انہوں نے پھر تیزی سے اپنا رخ پھیر لیا تھا۔ تب ہی وہ دھیمے سے مسکراتے ہوئے بولے۔

''اچھا...... میں نے جو کیا اور کہا وہ فریب تھا اور تم نے جو کیا وہ سب کیا تھا......؟''

نورینہ بیگم نے اس بار ان کے سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔

''پتہ نہیں...... تمہیں کبھی وہ دن یاد آئیں بھی ہوں یا نہیں کہ جب میں گھنٹوں تیز دھوپ میں صرف تمہاری ایک جھلک دیکھنے کے لئے تمہارے کالج کے باہر سب سے بے نیاز بنا کھڑا رہا کرتا تھا۔ جس دن تمہیں نہ دیکھتا گھر میں سب کے ساتھ بلاوجہ لڑتا۔ امی تو برملا کہا کرتی تھیں کہ مجھ پر کسی چڑیل کا سایہ ہو گیا ہے جب کہ میں ان کے ان الفاظ پر آپ ہی آپ زیر لب مسکرا دیا کرتا تھا۔ تمہیں یاد ہے صرف تمہارے لئے اس روز میں تمہارے کالج کے لڑکوں سے بھی لڑ پڑا تھا جو بلاوجہ تمہیں راستے میں تنگ کر رہے تھے۔ اس واقعے کے بعد ہی تو تمہیں مجھ سے محبت ہوئی تھی۔ تمہیں یاد ہو نہ ہو مگر مجھے کبھی نہیں بھولا کہ میں تم سے محبت کرنے کے بعد کیسے ہواؤں میں اُڑتا پھرتا تھا۔ ہر اچھی سے اچھی چیز لاکر جب تک تمہیں نہ کھلا دیتا مجھے چین نہیں آتا تھا۔ ایک بار جب تمہارے گھر والوں نے تمہیں کچی کیریاں کھانے سے روک دیا تو میں ہی تھا جو اپنی پروا کیے بغیر تمہارے لئے اتنے اونچے پیڑ پر چڑھا اور کچی کیریاں توڑ کر نیچے پھینکنے کے بعد جب خود اترا تو اپنی ٹانگ تڑوا بیٹھا۔ سچ بتانا نور کیا واقعی تمہیں میرے حوالے سے کوئی ایک دن بھی یاد نہیں رہا......؟''

ان کی خوب صورت سیاہ آنکھوں میں گزرے ہوئے وقت کا ایک ایک لمحہ جیسے سلگ رہا تھا گہرا کرب اتر آیا تھا ان کے لہجے میں۔ جواب میں نورینہ بیگم کے آنسو بھی ضبط کی تمام حدیں توڑ کر گالوں پر بہہ نکلے۔

''جو لمحے ناسور بن کر جگر کو کاٹنے لگیں میں اُن لمحوں کو کبھی جان کا روگ نہیں بنایا کرتی۔ آپ کو معلوم تھا کہ میں کبھی محبت میں شراکت داری کی قائل نہیں رہی۔ آپ کی بٹی ہوئی توجہ...... بٹی ہوئی محبت...... بٹا ہوا حق مجھے گوارہ نہیں تھا لہٰذا وہ تعلق جو ہمارے بیچ میری ہی کوششوں سے بنا تھا وہ تعلق میں نے خود ہی ختم کر دیا۔ میں اپنے فیصلے پر آج بھی اسی سختی سے قائم ہوں۔ مجھے آج بھی اپنے کسی عمل پر کوئی شرمندگی نہیں ہے میں نے کبھی آپ کے بھجوائے گئے پیسوں سے ایک روپیہ بھی اپنی ذات پر خرچ نہیں کیا۔ کبھی آپ کی بیٹیوں کو آپ سے متنفر نہیں کیا بلکہ انہیں تو شاید یہ معلوم بھی

نہیں ہے کہ میں نے آپ کا گھر کیوں چھوڑا......؟ میں محبت کو کمزوری بنا کر جینے والوں میں سے نہیں ہوں شہریار اور یہ بات آپ سے بہتر کبھی کوئی نہیں جان سکتا۔"

شہریار صاحب دیکھ سکتے تھے کہ ان کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔ ٹوٹنے اور ٹوٹ کر بکھرنے کے مراحل سے گزرتی اس عورت کو سہارے کی اشد ضرورت تھی۔ جانے کیوں آج بھی ان خوب صورت آنکھوں سے آنسو چھلکتے دیکھ کر ان کے دل کو کچھ ہوا تھا تب ہی شاید وہ سرعت سے لپک کر انہیں اپنی بانہوں میں سمیٹنے کے لئے آگے بڑھے تھے مگر آج پھر نورینہ بیگم محبتوں کے تمام حصار توڑتی چلی گئی تھیں۔ ان کے محبت سے بڑھے ہاتھوں کو جھٹک کر وہ تیزی سے اندر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھیں۔

آج سے پچیس سال قبل جب وہ گریجویشن کر رہی تھیں تو ایک روز خوب صورت سے شہریار جاوید سے ان کا ٹکراؤ ہو گیا تھا۔ وہ شاید اپنی کزن کو کالج سے پک کرنے کے لئے آئے تھے۔ تب ہی نورینہ بیگم نے پہلی بار ان کے درشن کیے تھے۔ نہ صرف درشن کیے تھے بلکہ سخت گرمی کی وجہ سے اپنی دوست کے فورس کرنے پر وہ جناب کی ائرکنڈیشنڈ گاڑی میں آ بیٹھی تھی۔ راستے بھر انہیں اپنا چہرہ شہریار صاحب کی عقابی نظروں کے حصار میں جکڑا ہوا محسوس ہوا تھا۔ نتیجتاً گھر آ کر وہ سخت ڈسٹرب رہی تھیں۔

اگلے روز چھٹی کے بعد جناب پھر سے سامنے کھڑے اس کی راہ دیکھ رہے تھے مگر آج نورینہ بیگم نے انہیں قطعی لفٹ نہیں کروائی تھی کیونکہ وہ پیار محبت کے چکروں میں الجھ کر غلط راستوں پر بھٹک جانے والی لڑکیوں میں سے ہرگز نہیں تھیں بہت سے دن یہی سلسلہ چلتا رہا تھا۔ روز وہ آ کر اپنی نگاہیں ان کے راستے میں بچھاتے اور وہ ہر روز بے نیازی کا مظاہرہ کرتی وین میں سوار ہو جاتیں۔

ان دونوں کے بیچ جو کھچڑی پک رہی تھی فی الحال اس کا علم کسی کو نہیں ہو سکا تھا۔ ان ہی دنوں "شاہ ولاج" میں ان کے بھائیوں آفاق شاہ اور بلال شاہ کی شادیوں کا ہنگامہ شروع ہو گیا تو اس نے کالج سے چھٹیاں لے لیں۔ دن میں کئی بار وہ اپنی غیر حاضری پر اس اجنبی کی بے تابی کے متعلق سوچ کر مسرور ہوا کرتی تھیں پھر جس روز بارات کے ساتھ دلہن والوں کے ہاں گئیں یہ سرور ختم ہو گیا کیونکہ شہریار صاحب دلہن کے بھائیوں کے قریبی دوستوں میں تھے۔ لاکھ وہ چھپیں مگر شہریار صاحب کی نگاہ بالآخر ان پر پڑ گئی۔ تب ہی جیسے ان کا مرجھایا ہوا چہرہ فوراً کھل اٹھا تھا۔ رات کا فنکشن تھا ہر کوئی اپنے آپ میں مگن دکھائی دے رہا تھا لہٰذا اس موقعے سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے کسی بچے کے ذریعے چالاکی سے نورینہ بیگم کو اوپر ٹیرس پر بلا لیا جہاں روشنی ذرا مدہم تھی۔ تب ہی وہ پہلی نظر میں شہریار صاحب کی وہاں موجودگی کو دیکھ نہ سکیں اور آگے بڑھ آئیں۔

"اف...... یہ بانو پتہ نہیں کہاں اٹک گئی۔ محترمہ پہلے بلا لیتی ہیں پھر دل جلانے کے لئے چھپ جاتی ہیں۔" منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے وہ ٹیرس کی گرل سے آ لگی تھیں۔ جب اچانک کسی نے پیچھے سے آ کر ان کی آنکھوں پر مضبوطی سے اپنے ہاتھ دھر لئے۔

تب سخت کشمکش میں مبتلا ہو کر جوں ہی انہوں نے اپنی آنکھوں پر رکھے ہاتھوں کو ٹٹولا۔ ان کا دل دھک سے رہ گیا۔ بھاری مردانہ مضبوط ہاتھوں کو فوراً سے پیشتر اپنی آنکھوں سے ہٹا کر وہ سیدھی ہوئی تو شہریار صاحب ان کے عین مقابل کھڑے تھے۔

"کیسی ہو عزیز از جان! تمہیں تو فقیر کی حالت پر ترس نہیں آیا لیکن میرے مولا نے اس دل کی فریاد سن کر ملن کا کوئی نہ کوئی وسیلہ پیدا کر ہی

دیا۔ بتاؤ اتنے دنوں سے کالج کیوں نہیں آ رہی تم.....؟'' ایک تو جناب کی حد درجہ قربت اوپر سے اتنا فرینک لہجہ ان کا حال تو پل میں ہی دیکھنے کے لائق ہو گیا تھا۔

''ڈونٹ وری ہنی! میں تمہیں کھا تھوڑی رہا ہوں۔ صرف یہ پوچھ رہا ہوں کہ تم اتنے دنوں سے کالج کیوں نہیں آ رہیں؟''

اُن کے چہرے کی متغیر رنگت دیکھ کر انہیں مزید شہ ملی تھی۔ تب ہی ذرا سے اور قریب ہوئے تو کنفیوز کھڑی نورینہ بیگم نے اپنے دونوں ہاتھ ان کے مضبوط سینے پر رکھ کر انہیں اپنے انتہائی قریب ہونے سے روک دیا۔

''میں کالج آؤں یا غیر حاضر رہوں آپ کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہیے۔''

اپنی تمام تر ہمت مجتمع کرتے ہوئے انہوں نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا تھا۔ جواب میں وہ دھیمی سی مسکان لبوں پر سجائے پرشوق نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

''او کے تم کہتی ہو تو دلچسپی نہیں رکھوں گا لیکن اس کے لیے تمہیں مجھ سے ایک پرامس کرنا پڑے گا۔''

''کیسا پرامس.....؟'' لرزتی کانپتی پلکیں اٹھا کر بمشکل اس نے ان کی طرف دیکھنے کی جسارت کی تھی۔

''کچھ خاص نہیں.....بس یہی کہ دن میں ایک بار جب میں چاہوں گا تم فون پر مجھ سے بات کیا کرو گی اور ہفتے میں ایک بار جہاں میں کہوں گا مجھ سے ملا کرو گی۔''

''شٹ اپ آپ غالباً اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہیں ورنہ مجھ سے ایسی بات کہنے کی جسارت نہ کرتے۔'' وہ شدید برہم ہوئی تھیں مگر شہریار صاحب مزے سے مسکراتے ہوئے ان کے عنابی ہونٹوں پر نرمی سے انگلی پھیر کر مدہم لہجے میں بولے۔

''آپ سامنے ہوں تو ہوش کس کافر کے قائم رہتے ہیں پرنسس۔''

''دیکھئے آپ اگر اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے تو میں ابھی چیخ چیخ کر تمام لوگوں کو یہاں اکٹھا کر لوں گی۔'' اپنی طرف سے انہوں نے دھمکی دی تھی مگر وہ اس سے بھی لطف اٹھاتے ہوئے مسکرا کر بولے۔

''ویری گڈ۔ نیک کام میں تاخیر کیسی؟ آخر لوگوں کو بھی تو پتہ چلے کہ ایک دیوانہ لڑکا ایک پتھر دل حسینہ کے عشق میں کیسے حال سے بے حال ہوا پھر رہا ہے۔ ہائے وہ محبت ہی کیا جو خوشبو کی مانند پھیل کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ نہ کرے۔''

ادھر جیسے کسی بات کا کوئی اثر ہی نہیں تھا اور ادھر نورینہ بیگم کا دل گویا ان کی اس درجہ قربت سے پگھلتا جا رہا تھا۔

''دیکھئے.....پلیز مجھے نیچے جانے دیجئے۔ میرے گھر والے اور میری سہیلیاں مجھے تلاش کر رہی ہوں گی۔''

''او کے.....پھر کب ملیں گی.....؟''

خلاف توقع وہ فوراً ہی پیچھے ہٹ گیا تھا۔ تب ہی وہ سکون کا سانس خارج کرتے ہوئے چڑ کر بولیں۔

''جہنم میں.....حشر کے روز ملوں گی آپ سے۔''

''تم ملو ہی یار ہمارے لئے جہنم بھی آپ کی ہمراہی میں کسی جنت سے کم نہیں۔''

پیچھے سے ان کا شوخ لہجہ ان کی سماعتوں سے ٹکرایا تو وہ پلٹ کر انہیں منہ چڑاتے ہوئے تیزی سے نیچے بھاگ آئیں۔ چہرے کے ساتھ ساتھ کانوں کی لوئیں ابھی تک سرخ ہو رہی تھیں۔

اس روز کے بعد اگلی پوری تقریب میں شہریار صاحب نے اپنی رومینٹک حرکتوں کے باعث انہیں خاصا زچ کیے رکھا تھا۔ دل میں ان کے لئے ہلچل تو کب کی مچ چکی تھی مگر کچھ ہی روز کے بعد وہ واقعہ بھی ہو گیا کہ جس کے بعد وہ پرت در پرت ان کے سامنے کھل کر رہ گئیں۔

اس روز وین والا آیا نہیں تھا لہٰذا وہ اکیلی پیدل ہی گھر کے راستوں پر گامزن تھیں کہ اچانک ان ہی کے کالج کے اوباش لڑکوں کا ایک گروپ ان کے راستے میں آ گیا۔ نورینہ بیگم نے حتیٰ الامکان کوشش کی کہ وہ ان لوگوں سے نہ الجھیں مگر وہ بدمعاش کسی طور پر اس کا پیچھا چھوڑنے پر تیار نہیں تھے تب ہی وہ رک کر ان سے اُلجھنے لگی تھیں کہ اسی اثنا میں شہریار صاحب کی گاڑی اس طرف سے نکل آئی اور یوں وہاں اچھا خاصا تماشا لگ گیا۔ بدمعاش لڑکوں سے مار پیٹ کے دوران وہ خاصی بری طرح سے زخمی ہوئے تھے۔ روشن پیشانی سے خون بہہ نکلا تھا تب ہی نورینہ بیگم نے اپنا دوپٹہ پھاڑ کر ان کی پیشانی سے باندھتے ہوئے انہیں اچھا خاصا ڈانٹ کر رکھ دیا۔

''آپ کو کیا ضرورت تھی جلتی آگ میں کودنے کی......؟ اتنا ہی ہیرو بننے کا شوق ہے تو فلموں میں لڑائی کریں بہت پیسے ملیں گے آپ کو......''

''پیسہ تو آل ریڈی بہت ہے میرے پاس پھر بھی تم ہیروئن بننے کا پرامس کرو تو میں کل ہی کسی فلم پروڈیوسر سے بات کر لیتا ہوں۔''

اپنی زخمی حالت سے قطعی بے نیاز وہ قدرے شوخی سے کہہ رہے تھے اور ادھر نورینہ بیگم کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ان کا گلہ دبا دیتیں۔

''فضول بولنا بہت آتا ہے آپ کو۔ چلیں اب جلدی سے کسی ڈاکٹر کے پاس۔ میں پہلے ہی بہت لیٹ ہو رہی ہوں۔''

''اوکے......''

ان کی ہدایت پر وہ فوراً گاڑی میں آ بیٹھے تھے جب کہ نورینہ بیگم بھی خود بخود آ کر ان کے برابر میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی تھیں۔

''پہلے میں تمہیں گھر ڈراپ کر دیتا ہوں پھر اپنی مرہم پٹی بھی کروا لوں گا۔''

گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے انہوں نے بتایا تھا جب وہ فوراً تیز آواز میں بولی۔

''جی نہیں۔ پہلے آپ مرہم پٹی کروائیے میں آپ کو اس حال میں دیکھ کر سکون سے نہیں رہ سکتی۔''

''کیوں......؟'' کس قدر مزے سے انہوں نے پوچھا تھا جب وہ نگاہیں چراتے ہوئے بولیں۔

''مجھے نہیں پتہ......''

''لیکن...... مجھے تو پتہ ہے۔'' شہریار صاحب کے گداز لبوں پر اس وقت بڑی مسحور کن سی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

''کیا پتہ ہے......؟'' انہوں نے بھی مسکراتے ہوئے ان کی طرف نگاہ کی تھی تب ہی وہ مسکرا کر گنگناتے ہوئے بولے۔

"کبھی کہ...... میں جٹ کملا' پگلا' دیوانہ...... اور ذرا تی سی بات نہ جانا کہ...... کہ او مینوں پیار کر دی اے ساڈے او تے او مردی اے......"

وہ اپنی رو میں بہہ کر گنگنا رہے تھے اور ادھر نورینہ بیگم ہنس ہنس کر بے حال ہوئی جا رہی تھیں پھر اس کے بعد تو زندگی جیسے بہار کا عنوان بن گئی۔ ہر روز رات میں جب تک گھنٹوں فون پر ان سے بات نہ کر لیتے انہیں قرار نہیں آتا تھا۔ ہفتے میں ایک بار کسی نہ کسی پارک یا ریستوران میں ملنے کی فرمائش بھی اپنی جگہ قائم تھی۔ نورینہ بیگم نے گریجویشن کیا تو شہریار صاحب کے ہاں سے رشتہ آیا۔ جسے نورینہ بیگم کی کوششوں سے ہی بالآخر قبول کیا گیا تھا۔ نورینہ کو پا کر تو شہریار صاحب کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ بعض اوقات تو وہ ان کی حد درجہ دیوانگی سے بھی اکتا جایا کرتی تھیں۔ بہت بار ایسا ہوتا کہ وہ رومینس کے موڈ میں ہوتے اور ادھر نورینہ بیگم کی آنکھیں نیند سے بند ہو رہی ہوتیں۔ اکثر وہ ان کی بے نیازیوں پر ان سے روٹھ بھی جایا کرتے تھے مگر ہر بار پھر خود ہی مان جایا کرتے کہ نورینہ سے ایک پل بھی الگ رہنا ان کے دل کو گوارہ نہیں تھا۔ حقیقی معنوں میں انہوں نے نورینہ بیگم کے مزاج آسمان سے لگائے تھے۔

زندگی کے ان ہی خوب صورت دنوں میں وہ تین بچیوں کے باپ بنے تو مارے خوشی کے وہ خود ہواؤں میں اڑتا محسوس کرنے لگے تھے۔ نورینہ بیگم جو ان کی والہانہ دیوانگی کی عادی ہو گئی تھیں اس روز کسی کانچ کے برتن کی مانند ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئیں جب وہ ایک سادہ سی اجنبی عورت کو اپنے ہمراہ لئے گھر میں داخل ہوئے اور نورینہ بیگم کے استفسار پر انہیں بتایا کہ وہ ان کی دوسری بیوی "بسمہ" ہے۔ آسمان ٹوٹ کر نورینہ بیگم کے سر پر آ گرا تھا۔ کتنی ہی دیر تک وہ پھٹی پھٹی سی نگاہوں سے ان کے جھکے ہوئے سر کو دیکھتی رہی تھیں۔ وہ بات کہ جس کا انہیں گمان تک نہیں تھا۔ وہ حقیقت بن گئی تھی اور تب وہ کچھ بھی کہے سنے بغیر قطعی طور پر جذبات سے کام لیتے ہوئے اپنی تینوں بیٹیوں کو ساتھ لئے ہمیشہ کے لئے "بے مثال کاٹیج" سے نکل آئیں۔ شہریار صاحب نے انہیں روکنے اور سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر ان کی کوئی بھی کوشش بار آور ثابت نہ ہو سکی اور یوں وقت ان دونوں کے بیچ فاصلے بڑھاتا چلا گیا۔ رات آدھی سے زیادہ بیت گئی تھی جب کروٹ بدلتی نورینہ بیگم کو بالآخر نیند نے اپنی مہربان بانہوں میں سمیٹ لیا اور وہ سکون سے پلکیں موند کر سو گئیں۔

☆☆☆

عدنان رؤف کو ہوسپٹل سے گھر شفٹ کر دیا گیا تھا۔

ڈاکٹر کے مطابق روڈ ایکسیڈنٹ میں اس کی ریڑھ کی ہڈی بری طرح سے متاثر ہوئی تھی۔ جس کے باعث اپنی ٹانگوں پر چلنا اس کے لئے ممکن نہیں رہا تھا۔ ڈاکٹرز کا خیال تھا کہ اگر عدنان کو بھرپور توجہ دی جائے اور اس کے زخم مندمل ہونے کے بعد ہر روز اسے تھوڑا تھوڑا چلانے کی مشق کی جائے تو ہوسکتا ہے کہ کچھ ہی سالوں میں وہ اپنے پاؤں پر چلنے کے قابل ہو جائے۔ بصورت دیگر اب اس کا خود سے چل پانا بہت دشوار تھا۔

سیال بیگم نے یہ سب کچھ عدنان کو نہیں بتایا تھا مگر پھر بھی اپنی کنڈیشن کے متعلق وہ سب کچھ جان چکا تھا۔ سیال بیگم اور ڈاکٹر نوید اسے سوتا سمجھ کر بات کر رہے تھے مگر حقیقت میں وہ جاگ رہا تھا اور قطعی دل گرفتگی کے عالم میں ان کی باتیں سن بھی رہا تھا۔ زندگی سے ایک دم ہی اس کا دل اکتا گیا تھا۔ وہ ہوسپٹل سے ڈسچارج ہو کر گھر آیا تو اس کا حال دیکھنے لائق تھا۔ بڑی بڑی خوب صورت آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ چہرے پر بڑھی ہوئی شیو، ملگجے لباس اور اس پر اس کی جامد خاموشی نے اندر سے سیال بیگم اور احمد رؤف صاحب کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ معذوری کے جس درد سے وہ خود گزر رہے تھے اب وہی درد اپنے بیٹے کے وجود میں منتقل ہوتا دیکھ کر وہ برداشت نہ کر سکے اور شدید بیمار پڑ گئے۔

انجشاء اس روز ہوسپٹل کے بجائے گھر آئی تو سیال بیگم کا حال دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ تھکن زدہ چہرے پر اس قدر نقاہت تھی کہ وہ اسے دیکھ کر مسکرا بھی نہ سکی تھیں۔ تب ایک لمحے میں اس نے وہیں شفٹ ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ سارے گھر کا حال خاصا ابتر ہو رہا تھا۔ ایک طرف میلے کپڑوں کا ڈھیر لگا تھا تو دوسری طرف برتن دھونے والے رکھے تھے۔ کچن کا حال صحن سے بھی بدتر تھا۔ کہیں بھی کوئی چیز اپنے ٹھکانے پر نہیں تھی اوپر سے احمد رؤف صاحب روز بہ روز نڈھال ہو رہے ہیں۔ خود عدنان رؤف تین دن سے بخار میں جل رہا تھا۔ کاروبار بند ہوئے آج تین ماہ ہونے کو آئے تھے۔ خدا کی پاک ذات کے سوا کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ تب ایک لمحے کے لئے اسے اپنی بے حسی پر شدید غصہ آیا مگر اگلے ہی پل وہ کچھ سوچ کر مطمئن ہوگئی۔ سیال بیگم اب اس کے لئے چائے بنانے کی تیاری کر رہی تھیں جب وہ اپنائیت سے اپنا ہاتھ ان کے شانے پر رکھتے ہوئے بولی۔

''سوری آنٹی! کچھ وجوہات ایسی ہوگئی تھیں کہ میں چاہ کر بھی اس طرف نہیں آسکی لیکن اب آپ بالکل بے فکر ہو جایئے اب میں آگئی ہوں نا اب آپ کو کسی بھی قسم کا کام کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

''شکریہ بیٹی! پر مجھے یہ سب پسند نہیں کہ میں اپنی ذمہ داریوں کا بوجھ بلاوجہ تمہارے کندھوں پر لاد دوں۔ تمہاری موجودگی ہی میرے لئے بہت حوصلے کا باعث ہے۔'' کوئی بھی انسان خواہ کتنا ہی قوی کیوں نہ ہو اولاد وہ واحد چیز ہے جو بڑے سے بڑے انسان کو توڑ کر رکھ دیا کرتی ہے۔ ان میں بھی بہت غرور تھا۔ بہت خوددار اور انا پرست تھیں وہ بھی مگر عدنان کے ساتھ پیش آنے والے حادثے نے انہیں توڑ کر رکھ دیا تھا۔ بااعتماد لہجہ آپ ہی آپ پست ہو کر رہ گیا تھا۔ انجشاء کو سچ مچ اس لمحے ان پر بہت ترس آرہا تھا تب ہی وہ زبردستی ان کا ہاتھ تھام کر انہیں کچن سے باہر نکالتے ہوئے بولی۔

''پلیز آنٹی! میں اس گھر کے لئے کوئی غیر نہیں ہوں۔ میرا بھی کچھ حق ہے اس گھر پر۔ آپ نے بہت ہمت سے کام لیا ہے۔ اب آپ کو آرام کی ضرورت ہے آپ پلیز انکل کے پاس چلیں میں آپ دونوں کے لئے چائے لے کر آتی ہوں۔'' وہ لڑکی جسے انہوں نے کبھی اپنی بہو تسلیم نہیں

کیا تھا آج وہی لڑکی مصیبت میں ان کا ساتھ دے رہی تھی۔ یہ اس کا بڑا پن نہیں تو اور کیا تھا۔ یکلخت ان کا دل مچلا اور وہ اس کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔

''انجو! خدا کے لئے مجھے معاف کر دے بیٹی۔ یہ سب میرے بُرے اعمالوں کی سزا ہے۔ میں نے دل سے دل جدا کرنے کا گناہ کیا ہے خدا کے لئے مجھے معاف کر دے پلیز......''

''بس کریں آنٹی خدا گواہ ہے کہ میرے دل میں اب آپ کیلئے کوئی رنجش نہیں ہے۔ آپ بھی سب کچھ ذہن سے جھٹک دیجئے پلیز......''

انہی کے لہجے میں ان کو جواب لوٹا کر وہ انہیں آہستگی سے خود سے الگ کرتے ہوئے خود اپنے ہاتھوں سے آنکھوں کے آنسو پونچھنے لگی تو وہ اسے ڈھیر سارا پیار کرنے کے بعد خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ حسب وعدہ انجشاء نے پہلے انہیں چائے بنا کر دی پھر مکمل تن دہی سے گھر کی صفائی میں جت گئی۔ اس کام سے فارغ ہوئی تو استعمال شدہ برتن دھونے بیٹھ گئی پھر احمد رؤف صاحب کے لئے پرہیزی کھانا بنایا۔ اپنے اور سیال بیگم کے لئے الگ سے کھانا تیار کیا۔ دن ڈھلے تمام کاموں سے فارغ ہوئی تو عدنان کو ہوش آیا جو بخار میں بے سدھ پڑا بے خبر سو رہا تھا۔ سیال بیگم آج صبح ہی اس کا چیک اپ کروا چکی تھیں لہٰذا اس کے لئے دودھ گرم کر کے لے آئی۔

بخار کی شدت سے اس کا پورا وجود جیسے انگارہ بنا ہوا تھا۔ کمزوری پہلے سے بڑھ گئی تھی۔ پچھلے کئی روز سے اس نے شاید کپڑے بھی نہیں بدلے تھے۔ شیو الگ بڑھی ہوئی تھی۔ اسے اس حال میں بے سدھ پڑا دیکھ کر انجشاء کے دل کو جیسے کچھ ہوا تھا لہٰذا اس نے اپنا دایاں ہاتھ آہستہ سے اس کی پیشانی پر رکھا تو عدنان نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔ موٹی موٹی سوجی ہوئی غلافی آنکھوں میں سرخ ڈورے بہت نمایاں ہو رہے تھے تب ہی وہ آہستہ سے اس کے پاس آ کر بیڈ پر آ بیٹھی۔

''اب کیسی طبیعت ہے عدی!'' مدت کے بعد آج اس نے عدنان کو اس نام سے پکارا تھا۔ تب ہی وہ تکئے کے سہارے ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہوں مجھے کیا ہونا ہے.....''

''اتنا کچھ تو ہو چکا ہے اب اور کیا چاہتے ہو تم......؟''

''کچھ نہیں...... کچھ نہیں چاہئے مجھے...... یہاں تک کہ اپنی زندگی بھی نہیں......''

اس کے ایک ایک لفظ سے بیزاری ٹپک رہی تھی تب ہی وہ آہستہ سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔

''زندگی سے اتنی بیزاری اچھی نہیں ہوتی عدی! یاد کرو ایک وقت تھا جب مجھے تمہاری ضرورت تھی۔ دن رات میری آنکھیں تمہاری رفاقت کے خواب دیکھا کرتی تھیں میری سہیلیاں تمہارا تذکرہ کر کے مجھے تنگ کرتیں تو میرے سینے میں دھڑکنوں کا شور بڑھ جاتا تھا خود کو صرف اور صرف تمہارے قابل بنانے کے لئے میں نے دن کا چین اور رات کی نیند دونوں کو خود پر حرام کر لیا تھا مگر...... پھر بھی تم میرے نہیں ہو سکے تھے۔ تم نے مجھے صرف اس لئے دھتکار دیا تھا کہ میں تمہارے بقول شہری زندگی گزارنے کا شعور نہیں رکھتی تھی' تمہیں میرے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے شرمندگی کا احساس ہوتا تھا۔ تم کتنے خود غرض تھے عدنان۔ تم نے ہمیشہ صرف اپنے لیے سوچا صرف اپنا مفاد دیکھا صرف اپنی خوشی کے لئے ہر جائز و ناجائز کام کیا۔ تم نے یہ تو سوچا ہی نہیں کہ جس دل میں تمہارا پیار زندگی کا احساس بن کر دھڑکتا ہے۔ اس دل کو اگر تم اپنے پیار سے محروم کرو گے تو وہ دھڑکے گا کیسے......؟ وہ لڑکی جو خود کو تمہاری پسند کے قالب میں ڈھالنے کے لئے ہر مشکل کی حد پار کر گئی تھی تم اسے خود سے دور کرو گے تو وہ جئے گی کیسے......؟'' سوچا ہی نہیں تم...... عدی' کیا دیہات میں پرورش پانے والے زندگی کا شعور نہیں رکھتے......؟ کیا انہیں کوئی حق نہیں ہوتا کہ وہ اپنی زندگی گزارنے کے محض چند خواب ہی اپنی مرضی سے دیکھ لیں۔ اس ملک میں کتنے عدنان ہوں گے عدی جو کسی نہ کسی انجشاء کا دل محض اس لئے توڑ کر شہر کی رنگینیوں میں کھو جاتے ہوں گے کہ وہ اس کے شانہ بشانہ ہائی سوسائٹی میں موو نہ کر سکے گی' کوئی عدنان ایسا ظلم کرتے ہوئے یہ کیوں نہیں سوچتا عدی کہ محبت کے جذبے میں بڑی طاقت ہوا کرتی ہے۔ یہ جب چاہے جسے چاہے شاہ سے گدا بنا دے' راہ چلتا فقیر کر دے اور جسے چاہے زمین سے اٹھا کر تخت پر بٹھا دے۔ کوئی سوچتا کیوں نہیں ہے عدنان......؟''

آج مدت کے بعد اس کے اندر کا غبار باہر نکلا تھا جب کہ عدنان چپ چاپ خاموشی سے اسے بولتے ہوئے سن رہا تھا۔

''کتنا عجیب لگتا ہے ناں عدی کہ وہ لوگ جو کسی بھی موسم کی پروا کیے بغیر سلگتی دھوپ میں آندھی طوفان میں اپنی جان رول کر زمین کا سینہ چیرتے ہیں بیج بوتے ہیں' فصل کی رکھوالی کرتے ہیں، اور اناج ہمارے گھروں تک پہنچاتے ہیں پر ہم ''پیسے والے'' اُن کا اپنے پاس بیٹھنا بھی گوارہ نہیں کرتے' کچھ گھڑی ان کے پاس کھڑے ہو کر انہیں کام کرتے ہوئے ہی دیکھ لیں یہ تک گوارہ نہیں ہوتا ہمیں کیوں عدنان......؟ ان کے اور ہمارے بیچ فرق کہاں ہے......؟ وہ بھی ویسے ہی جنم لیتے ہیں جیسے ہم لیتے ہیں' وہ بھی ہماری طرح منہ سے کھاتے ہیں ناک سے سونگھتے ہیں' پاؤں سے چلتے ہیں' پھر وہ ہم سے حقیر کیسے ہوئے......؟ ہم سارا دن آرام دہ دفاتر میں بیٹھ کر چند فائلوں پر سائن کر کے گھر لوٹ آنے والے ان سے برتر کیسے ہو

گئے......؟ان کے اور ہمارے بیچ یہ فرق کیسا......؟ یہاں سے وہاں تک ہر شخص ہر ادارہ ہمیں برتر خیال کرتے ہوئے کوریج کیوں دیتا ہے......؟ کیوں ان کی سادگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں لوٹنے کی کوشش کرتے ہیں' ان کی مخلصی کا مذاق بناتے ہیں جان بوجھ کر انہیں تحقیر بھری نگاہوں سے دیکھ کر خود کو 'باشعور' سمجھتے ہیں......؟ یہ کیسی تعلیم ہے عدی؟ کیسی ہائی سوسائٹی ہے یہ......؟''

وہ دلی طور پر ازحد حساس تھی۔ زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے پہلو پر گہری نگاہ رکھنے والی بڑی لڑکی مگر عدنان پر اس کی یہ گہری حساسیت آج کھل رہی تھی تب ہی وہ بالکل خاموش بیٹھا یک ٹک اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

''سچ پوچھو تو آج مجھے تمہاری اس ہائی سوسائٹی کی مومنٹ پر ہنسی آرہی ہے بھلا یہ ہائی سوسائٹی سے تعلق رکھنے والے کیا جانیں کہ بغیر دیواروں کے کشادہ صحن رکھنے والے دیہاتی گھروں کے بچے کتنے ٹیلنٹڈ ہوتے ہیں۔ اپنے زور بازو پر محنت کر کے پیٹ کا دوزخ بھرنے والے بھلے تمہاری طرح بڑی بڑی ڈیلنگز طے نہ کر سکتے ہوں پر زندگی کا شعور وہ تم سے بڑھ کر رکھتے ہیں کیونکہ وہ تمہاری طرح محض سکھ کے موسم کے عادی نہیں ہوتے بلکہ دکھ کے موسموں کو بھی بہادری سے اپنی جانوں پر جھیلتے ہیں......''

''بس......یا ابھی مزید لیکچر دینا باقی ہے......؟''

وہ ایک لمحے کے لئے سانس لینے کو رکی تو عدنان نے ماتھے پر تیوریاں ڈال کر فوراً اسے ٹوک دیا۔ جواب میں وہ کچھ پل اس کے خفا خفا سے چہرے کی طرف دیکھنے کے بعد ایک دم سے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''اور عدنان رؤف! یہی تو المیہ ہے تم ہائی سوسائٹی سے تعلق رکھنے والوں کا کہ خود چاہے کسی کا کتنا ہی مذاق اڑا لو، پر اپنی ذات پر اٹھتی ایک انگلی برداشت نہیں کر سکتے تم لوگ۔''

''پلیز! سٹاپ اٹ انجو......تم اگر میرے زخموں پر نمک پاشی کرنے کے لئے آئی ہو تو برائے مہربانی یہاں سے فوراً چلی جاؤ کیوں کہ میں اس وقت تم سے الجھنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔''

مزید ضبط کا یارا نہ رکھتے ہوئے وہ ایک دم سے چلا اٹھا تھا۔ جب وہ قدرے سنجیدہ ہوتے ہوئے آہستہ سے بولی۔

''سوری......یہ سب کہنے سے میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا ہرگز نہیں تھا۔''

کچھ پل وہ خاموشی سے عدنان کے بولنے کا انتظار کرتی رہی تھی مگر وہ پلکیں موند کر بیڈ کی پٹی سے ٹیک لگا گیا تو مجبوراً اسے عدنان کو دوبارہ اپنی طرف متوجہ کرنا پڑا۔

''تمہاری دوا کا ٹائم ہو گیا ہے عدنان یہ گولی لے لو۔''

''لے لوں گا بعد میں فی الحال تم جاؤ یہاں سے مجھے تمہاری تیمارداری کی ضرورت نہیں ہے۔''

اس نے آنکھیں نہیں کھولی تھیں بیڈ کی پٹی سے ٹیک لگائے بیٹھا' کشادہ سینے پر دونوں بازو باندھے وہ اس سے مکمل خفا دکھائی دے رہا تھا تب ہی وہ دھیمے لہجے سے مسکراتے ہوئے بولی۔

''اچھا.....لیکن جناب آپ کے ممی پاپا کو تو ابھی میری بہت ضرورت ہے۔''

''تو تم اپنی مہربانیاں اُن ہی پر نچھاور کرواو کے.....میں اس وقت تم سے جھگڑنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔''

''وری گڈ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔اچھے بچوں کو جھگڑنا بھی نہیں چاہیے۔''اس بار عدنان نے قطعی زچ ہو کر خاموشی سے اسے گھورنے پر اکتفا کیا تھا۔

''چلو شاباش یہ دوائی لے لو مجھے اور بھی کام کرنے ہیں۔''

وہ اسے دوا کھلائے بغیر وہاں سے ٹلنے والی نہیں تھی لہٰذا عدنان نے چپ چاپ گولیاں اس کے ہاتھ سے لے کر دودھ کے ساتھ نگل لیں۔

''ویسے کتنی عجیب بات ہے کہ جس لڑکی کی فقط ایک جھلک دیکھنے کے لیے تم گھنٹوں بےقرار رہا کرتے تھے۔آج وہ لڑکی تمہارے سامنے اتنی قریب بیٹھی ہے اور جناب ایک نظر ڈالنا بھی گوارہ نہیں کر رہے کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ اس کی کیا وجہ ہے.....؟''

اسکے بستر کی چادر درست کرتے ہوئے اسنے قدرے شگفتہ لہجے میں کہا تھا۔جواب میں وہ پھر سے پلکیں موندتے ہوئے آہستہ سے بولا۔

''میں اب تمہارے قابل نہیں رہا انجو.....خدا کے لئے بار بار میرے سامنے مت آیا کرو تم۔''

اس لمحے وہ اسے بہت نڈھال دکھائی دے رہا تھا تب ہی وہ اپنا ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھ کر بخار کی حدت چیک کرتے ہوئے دھیمے سے مسکرا کر بولی۔

''بالکل غلط.....حقیقت میں اب ہی تو تم مس انجشاء احمر کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کے قابل ہوئے ہو اور سوری مس انجشاء احمر نہیں مسز انجشاء عدنان۔''

''پلیز!اسٹاپ اٹ انجو۔نہیں چل سکتا میں تمہارے قدم سے قدم ملا کر.....''

اب کے وہ واقعی سسک پڑا تھا مگر انجشاء نے اس کے الفاظ کو سنا ان سنا کر دیا۔

''اف.....کتنا تیز بخار ہے تمہیں.....مجھے پہلے معلوم ہوتا تو کہیں جاتی ہی نہیں خیر تم فکر مت کرو ابھی میں ٹھنڈی پٹیاں کروں گی تو بخار یوں چٹکیوں میں بھاگ جائے گا۔'' کہنے کے ساتھ ہی وہ ٹھنڈے پانی کا باؤل لے آئی تو عدنان فقط بےبسی کے عالم میں اسے دیکھتا رہ گیا۔

''پتہ ہے عدی!ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ اگر تم ہمت سے کام لو اور روزانہ تھوڑا تھوڑا چلنے کی پریکٹس کرو تو ہو سکتا ہے کہ کچھ ہی عرصے میں تم خود اپنے پاؤں پر چلنے پھرنے لگو۔یہ زخم تو دیکھنا تھوڑے ہی دنوں ہی مندمل ہو جائیں گے پھر میں تمہیں روزانہ چلنے کی پریکٹس کرواؤں گی ہم دونوں مل کر پھر سے یہاں لان میں نئے نئے پودے لگائیں گے اور ہفتے میں ایک روز کرکٹ کا میچ بھی رکھیں گے اور ہاں.....ایک بہت ہی مزے کی بات بتانا تو میں بھول ہی گئی.....کیا کروں بدھو جو ٹھہری.....ہاں تو میں تمہیں بتا رہی تھی کہ میں نے کل اریج صاحب کی پارٹنرشپ میں کام کرنے سے ایکسکیوز کر لیا ہے اب کل سے میں تمہارا آفس جوائن کر رہی ہوں۔تھوڑے ہی دنوں میں جناب آپ بھی میرے ساتھ آفس جایا کریں گے۔''

وہ اپنی دھن میں بول رہی تھی جب کہ عدنان کب کا پلکیں موند کر گہری نیند سو چکا تھا۔

☆☆☆

بے سبب تو نہیں تیری یادیں
تیری یادوں سے کیا نہیں سیکھا
ضبط کا حوصلہ بندھا لینا' آنسوؤں کو کہیں چھپا لینا
کانپتی ڈولتی صداؤں کو چپ کی چادر سے ڈھانپ کر رکھنا
بے سبب بھی کبھی کبھی ہنسنا
جب بھی ہو بات کوئی تلخی کی
موضوع گفتگو بدل دینا
بے سبب تو نہیں تیری یادیں
تیری یادوں سے کیا نہیں سیکھا

شام کے دھندلکے بہت تیزی سے رات کی تاریکی میں بدل رہے تھے مگر وہ جیسے ساری دنیا سے بے نیاز بنا عجیب آوارگی کے عالم میں پیدل ہی سڑکوں پر ٹہل رہا تھا۔

''زخموں سے لاپروائی نہیں برتنی چاہیے ورنہ یہ ناسور بن کر پورے جسم کو چاٹ لیا کرتے ہیں۔''

تمکین رضا کا مانوس لہجہ سماعتوں کے قریب ہی کہیں سنائی دیا تھا تب ہی اس کے کب کے رکے آنسو یک لخت بہہ نکلے اب وہ اسے کیا بتاتا کہ یہ زخم تو کئی سالوں سے دیمک کی طرح اس کے وجود کو کھوکھلا کر رہے تھے۔

''آپ سے ایک سوال پوچھوں......کیا آپ محض چند دنوں کے لئے مجھ سے شادی کر لیں گے......؟''

آنسوؤں کی روانی میں مزید شدت آگئی تھی جب اچانک تمکین کے لہجے پر اشعر احمد کے الفاظ غالب آگئے۔

مما! آپ ہی کہتی ہیں ناں کہ اریج آپ سے بہت پیار کرتا ہے اور آپ کی خوشی کے لئے وہ کچھ بھی کر سکتا ہے تو کہیے اسے کہ صرف ایک رات کے لئے وہ نمی کو اپنے عقد میں لے کر اگلے ہی روز اسے ڈائیورس دے دے تاکہ میں پھر سے اسے حاصل کر سکوں۔ آئی پرامس مما پھر میں کہیں نہیں جاؤں گا اپنے ساتھ کچھ غلط نہیں کروں گا بصورت دیگر میں کسی بھی وقت خود اپنی جان لے سکتا ہوں مما...... یہ یاد رکھیے گا آپ.....''

اشعر کے لئے یہ سب کچھ کہنا کتنا آسان تھا مگر اریج کو اس لمحے اپنی جان سولی پر لٹکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے وہ رخسانہ بیگم کو اس طرح سے بلیک میل بھی کر سکتا ہے اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا' کل رات سے وہ شدید مضطرب تھا۔

وہ ایک لڑکی کہ جسے اس نے دل کی گہرائیوں سے چاہا تھا ہر پل ہر لمحے جس کے ساتھ کی تمنا کی تھی۔ وہ اس کی زندگی میں صرف ایک رات کی مہمان بن کر آتی بھلا اس سے بڑھ کر اس کے جذبوں کی توہین کیا ہوئی تھی۔ کل رات سے اس کا رواں رواں سلگ رہا تھا۔ رخسانہ بیگم اور اشعر کے

مابین ہونے والی تمام گفتگو اتفاقیہ ہی سہی مگر اس نے سن لی تھی مگر اب اسے پچھتاوا ہو رہا تھا کہ کاش وہ ایک لفظ بھی نہ سنتا کم از کم باخبری کی یہ اذیت تو حصے میں نہ آتی۔

کتنا خودغرض تھا اشعر......؟ اور کس قدر چھوٹی سوچ تھی اس کی کہ محبت کا جو تاج محل اس نے خود اپنے ہاتھوں سے بنا کچھ سوچے سمجھے مسمار کر دیا تھا۔ اب اسی تاج محل کی دوبارہ تعمیر کے لئے اسے اریج احمر کے جگر کا خون درکار تھا۔ وہ جانتا ہی نہیں تھا کہ جس طرح وہ تمکین رضا کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا بالکل اسی طرح وہ بھی اسے پا کر کھونے کے بعد زندہ نہیں رہ سکے گا پھر اسے تو زندگی بھر سب کی محبتیں ملی تھیں۔ ماں کی باپ کی پورے ددھیال اور ننھیال والوں کی مگر...... وہ تو بچپن سے ہی اکیلا تھا۔ ایک دم اکیلا...... نہ اس کی خوشی میں کوئی خوش ہونے والا ہوتا تھا اور نہ اس کے درد پر کسی کو رونے کی فرصت تھی۔ اپنے نصیب کے آنسو اور اپنے حصے کی خوشیاں اس نے ہمیشہ اپنے آپ سے شیئر کی تھیں۔

لیکن جب وہ خوابوں کی دنیا میں آیا کسی کو سوچنے اور چاہنے لگا کسی کو دعاؤں میں خدا سے مانگنے لگا تو تقدیر نے اس کا دامن آنسوؤں سے بھگو دیا۔ اس کی محبت اس کی آنکھوں کے سامنے کسی اور کے بستر کی زینت بن گئی اور وہ چپ چاپ کھڑا محض اپنی بربادی کا تماشہ دیکھتا رہ گیا۔

وقت کے ساتھ ساتھ کتنی مشکل سے اس نے خود کو سنبھالا تھا۔ پھر سے زندگی کی طرف راغب کیا تھا' کتنی مشکل سے اس نے اپنے ایک ایک زخم کا چاک سی کر بہلنا سیکھا تھا' خود پر ضبط کرنا سیکھا تھا' تقدیر کی بے رحمی پر' بالکل اس بچے کی مانند صبر کیا تھا جو اپنی ابتر حالت کے باعث کسی بہت خوب صورت سے قیمتی کھلونے کو محض حسرت بھری نظروں سے دیکھ کر رہ جاتا ہے مگر آج...... ایک ایک کر کے پھر سے اس کے زخم ادھڑنے لگے تھے۔

بدنصیبی نے پھر سے اسے امتحان کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا تھا جہاں ایک مرتبہ اسے قربانی دینی تھی۔ اپنی مما کی زندگی کے لئے اشعر اور تمکین کی خوشی کے لئے...... حالانکہ جو کام اس سے لیا جا رہا تھا وہ ہرگز جائز نہیں تھا بھلے وہ دینی احکام سے زیادہ آگاہی نہیں رکھتا تھا مگر اتنی بات تو اسے بھی معلوم تھی کہ کسی عورت کو پہلے سے طلاق دینے کا پلان کر کے محض ضرورت کے لئے صرف ایک رات اپنے پاس رکھنا اسلام میں جائز نہیں تھا بلاشبہ بہت بڑا گناہ تھا مگر...... اپنی مما کی زندگی اور خوشی کے لئے وہ اس گناہ کا بوجھ بھی خود پر لادنے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔

دھیرے دھیرے گہری ہوتی رات کے سرکتے لمحے اس کے اندر جلتے الاؤ کو مزید دہکا رہے تھے۔ آنسو تھے کہ ساون کی جھڑی کی مانند آنکھوں سے ٹوٹ کر گالوں پر بکھرتے ہوئے گریبان میں جذب ہو رہے تھے جب کہ وہ...... بڑی بہادری کے ساتھ سمٹتے بکھرتے ہوئے خود کو درپیش آنے والی قربانی کے لئے تیار کر رہا تھا۔

اگلے روز شام ڈھلے وہ رخسانہ بیگم سے ملنے گیا۔ ''حسن ولاج'' آیا تو وہ اپنے کمرے میں جائے نماز پر بیٹھیں زاروقطار روئے جا رہی تھیں۔

ماں کی ممتا کیا ہوتی ہے یہ آج تک کوئی نہیں سمجھ پایا۔ ان کی ممتا بھی اس وقت عجیب دوراہے پر کھڑی تھی۔ ایک طرف ان کے اشعر کی زندگی کا سوال تھا تو دوسری طرف بات ان کے اریج کے وقار کی تھی۔ دونوں ہی ان کے لختِ جگر تھے۔ وہ دونوں میں سے کسی کی زندگی بھی داؤ پر لگتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھیں۔

اریج کمرے میں داخل ہوا تو انہوں نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ لئے مگر وہ ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھ چکا تھا تب ہی نڈھال قدموں سے چلتا ان کی آغوش میں سر رکھ کر نیچے زمین پر ہی لیٹ گیا۔

''کیا بات ہے مما...... آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہی ہیں۔''

ان کے ہاتھ تھام کر اس نے اپنے سینے پر دھر لئے تھے تب ہی وہ نگاہیں چراتے ہوئے کمزور لہجے میں بولیں۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں ہے بیٹے...... بس یوں ہی اللہ کا ذکر کروں تو آنکھیں آنسوؤں سے بھر آتی ہیں۔''

''اچھا...... لیکن مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ جیسے آپ مجھ سے کچھ چھپا رہی ہیں......''

وہ بھی انکی ممتا کا امتحان لے رہا تھا تب ہی قدرے بے نیازی سے بولا تو رخسانہ بیگم بے ساختہ روتے ہوئے اسکا منہ چومنے لگی تھیں۔

''پلیز بتایئے ناں مما! کیوں رو رہی ہیں آپ......؟''

مضطرب ہو کر وہ ان کی گود سے اٹھا تھا جب وہ دونوں ہاتھوں کے پیالے میں اس کا چہرہ تھام کر آنسو لٹاتے ہوئے بولیں۔

''مجھے یہ سوچ کر رونا آ رہا ہے کہ تیرے پاپا کی جگہ میں کیوں نہیں مرگئی؟ کاش ان کی جگہ میں مرگئی ہوتی تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتے بیٹا آج تیری زندگی خوشحال ہوتی...... تیرے ان ہونٹوں پر بھی سچی مسکراہٹ کا رقص ہوتا...... تیری یہ بدنصیب ماں تجھے سوائے دکھوں کے اور کچھ بھی نہیں دے سکتی اریج...... کہاں لے جاؤں تجھے...... کہاں چھپا کر رکھ دوں کہ تجھے کوئی غم بھی ستا نہ سکے......''

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو بھی رہی تھیں اور ساتھ میں اسے پیار بھی کیے جا رہی تھیں۔

اریج ان کی ممتا کا یہ روپ دیکھ کر گم صم رہ گیا تھا۔

''پلیز مت روئیں مما...... میں جانتا ہوں کہ اس وقت آپ کی آنکھوں میں آنسو کیوں بہہ رہے ہیں' آپ چاہے اپنے دل کا درد مجھ پر آشکارنہ کریں مگر میں...... میں آپ کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا......''

پلکوں پر اٹکے آنسوؤں کے ساتھ رخسانہ بیگم نے قدرے حیرانگی سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ جب وہ ان کے سرد ہاتھ تھام کر اپنے ہونٹوں تک لے جاتے ہوئے بولا۔

''آئی ایم سوری مما...... لیکن میں آپ کے اور اشعر کے مابین ہونے والی تمام گفتگو سن چکا ہوں......''

بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس نے کہا تھا جواب میں رخسانہ بیگم جہاں تھیں وہاں کھڑی رہ گئی تھیں۔

''مما......'' اریج نے کہا تھا۔ ''میں آپ سے بہت پیار کرتا ہوں اور آپ کی خوشی کے لئے کچھ بھی کر سکتا ہوں...... اس نے بالکل درست کہا تھا مما...... میرے لئے آپ کی خوشی اور محبت سے بڑھ کر اور کچھ بھی نہیں ہے صرف اور صرف آپ کی رضا کے لئے میں ایک رات کے لئے ہی سہی تمکین کو اپنانے کے لئے تیار ہوں۔''

اس لمحے اپنے لہجے کے کھوکھلے پن کا اندازہ وہ بخوبی لگا سکتا تھا مگر رخسانہ بیگم کے تھمے آنسو پھر سے بہہ نکلے تھے۔

''نہیں میں ایک بیٹے کی خوشی کے لئے دوسرے بیٹے کے وقار کی قربانی نہیں دے سکتی۔''

''میں جانتا ہوں مما...... لیکن...... میں یہ بھی بخوبی جانتا ہوں کہ آپ اشعر سے بہت پیار کرتی ہیں۔اس نے اگر جذبات میں آکر خود کو نقصان پہنچالیا تو آپ زندہ نہیں رہ سکیں گی اور...... آپ زندہ نہیں رہیں گی تو میں بھی مر جاؤں گا مما...... اتنی ساری جانوں کو ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ ہم اشعر کی خواہش پوری کر دیں۔'' لہجے کے ساتھ ساتھ اس کی اپنی آنکھیں بھی بھر آئی تھیں تاہم اس سے پہلے کہ رخسانہ بیگم مزید کچھ کہتیں بے حال سے حلیے کے ساتھ تھکا تھکا سا اشعر احمد کمرے کے اندر چلا آیا۔

''تو آپ نے وہ ساری گفتگو سن لی مسٹر اریج......'' جانے کیسا غبار تھا جو کسی طرح سے ڈھل ہی نہیں رہا تھا مگر اس سے پہلے کہ اریج اس کی طرف متوجہ ہوتا رخسانہ بیگم غصے سے دھاڑ اٹھیں۔

''تمیز سے بات کرو اشعر مت بھولو کہ اریج تمہارا بڑا بھائی ہے۔''

''سو واٹ مما! میں نہیں مانتا اپنا بڑا بھائی۔کوئی خون کا رشتہ نہیں ہے ہمارے درمیان......؟'' وہ کبھی بھی اتنا بدتمیز واقع نہیں ہوا تھا تب ہی رخسانہ بیگم نے قدرے صدمے سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا تھا۔

''ہاں...... کوئی خون کا رشتہ نہیں ہے تمہارا اس کے ساتھ مگر پھر بھی...... پھر بھی میں زندگی بھر اس کے حصے کا پیار تمہیں دیتی آئی ہوں مگر اس پگلے نے اف تک نہیں کی' آج بھی صرف تمہاری خوشی کے لئے میرا بیٹا اپنے وقار کی قربانی دینے چلا آیا ہے شک کیا تھا ناں تم نے اس کی نیت پر......؟ دیکھ لو آج بھی یہی شخص تمہاری ماں کی زندگی کے لئے تمہاری ناجائز خواہشات پر خود کو قربان کر رہا ہے۔''

ایک مرتبہ پھر وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی تھیں جب اشعر احمد نے سر جھٹک کر غصے سے پھنکارتے ہوئے کہا۔

''یہ اگر ایک رات کے لئے تمکین کو اپنا رہا ہے تو مجھ پر کوئی احسان نہیں کر رہا ہے مما...... یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ تمکین مجھے چاہتی ہے صرف میری رفاقت میں خوش رہ سکتی ہے اور سب جانتے ہیں کہ میرے ڈائیورس دینے کے بعد بھی وہ صرف مجھ سے محبت کرتی ہے صرف اور صرف میرا ساتھ مطلوب ہے اسے وہ کبھی بھی اس کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی مما کبھی بھی نہیں......''

اس وقت وہ اتنے تیز لہجے میں چلا رہا تھا کہ باہر لاؤنج میں بیٹھی تمکین رضا بھی اس کے زہریلے الفاظ کے اثر سے محفوظ نہیں رہ سکی تھی۔

لحہ بہ لحہ اپنے دل سے گرتا اشعر احمد کی جنونی محبت کا گراف اسے گہرے دکھ سے ہمکنار کر رہا تھا مگر اس کے باوجود وہ ٹوٹ کر نہیں بکھری تھی۔

البتہ سن ہوتی سماعتوں میں اب اریج احمر کا دھیما لہجہ ضرور گونج اٹھا تھا۔

''میں نے کب تم پر احسان جتایا ہے اشعر......؟ کب یہ دعویٰ کیا ہے کہ تمکین مجھ سے محبت کرتی ہے۔میں تو ہر موڑ پر تمہیں یہی احساس دلاتا رہا کہ وہ تم سے پیار کرتی ہے۔تمہاری ہی رفاقت میں خوش رہ سکتی ہے۔مگر تم نے کبھی میری باتوں پر دھیان نہیں دیا اور بلاوجہ شک کا شکار ہو کر اسے اپنی زندگی سے علیحدہ کر دیا بہر حال میں اب بھی اس کے جذبات سے کھیلنا نہیں چاہتا پر صرف اس کی اور تمہاری اور مما کی خوشی کے لئے میں اس کی تمام تر نفرت اور بددعائیں سمیٹنے کو تیار ہوں۔'' کہنے کے ساتھ ہی وہ فوراً کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔

سینے میں الجھتی سانس اور آنکھوں میں تیرتے آنسو اب مزید اس کا بھرم قائم نہیں رکھ سکتے تھے لہٰذا وہ ادھر ادھر دیکھے بغیر تیزی سے وہاں سے نکلتا چلا گیا تھا۔

''حسن ولاج'' میں ایک مرتبہ پھر سرد جنگ چھڑ چکی تھی۔ رخسانہ بیگم اس بار تمکین رضا کو اریج احمر کے لئے مانگ رہی تھیں اسے صرف ایک رات کے لئے اریج کی دلہن بنانے کا راز فی الحال انہوں نے کسی سے شیئر نہیں کیا تھا یہاں تک کہ تمکین رضا سے بھی اپنی دانست میں سب کچھ چھپا رہی تھیں۔

اشعر کی طرح انہوں نے بھی یہ فرض کر لیا تھا کہ تمکین کی دلی خوشی صرف اشعر کے ساتھ میں ہے۔ بچپن سے ان دونوں کی محبت ان کے سامنے تھی۔ لہٰذا اپنے طور پر وہ ان دونوں کے پھر سے ملاپ کے لئے سب صحیح کر رہی تھیں۔

آسیہ بیگم اور رضا صاحب اس بار جلد بازی میں کوئی بھی غلط فیصلہ نہیں کرنا چاہتے تھے لہٰذا انہوں نے اس رشتے پر سوچ بچار کے لئے کچھ وقت مانگا تھا جو رخسانہ بیگم اور سعید صاحب نے بخوشی انہیں دے دیا تھا۔

سعید صاحب اریج سے بہت خوش تھے۔ اس کی ذہانت اور قابلیت کے باعث وہ اپنے حلقہ احباب اور بزنس سرکل میں اسے اپنے بیٹے کی حیثیت سے فخریہ متعارف کروا رہے تھے۔ بزنس کی اہم ڈیلینگز بھی وہ اس کے باقاعدہ مشورے سے طے کر رہے تھے۔ اشعر سے بڑھ کر وہ اسے اہمیت اور پیار دے رہے تھے اور اریج کو یہ سب واقعی بہت اچھا لگ رہا تھا۔

''حسن ولاج'' میں کافی غور وخوض کے بعد بالآخر اریج کے پرپوزل کو قبول کر لیا گیا تھا۔ ایک مرتبہ پھر اس گھر میں خوشی کے شادیانے بج اٹھے تھے۔ فاروق صاحب سعید صاحب اور رضا صاحب کے علاوہ ان کی بیگمات اور بچے بھی اس خوشی کو بھرپور انجوائے کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ اشعر احمر کی خوشی نے بھی سب کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا تھا۔

وہ ہر فنکشن میں نارملی بی ہیو کر رہا تھا کسی بھی قسم کے دکھ یا پچھتاوے کا کوئی معمولی سا تاثر بھی اس کے چہرے پر بکھرا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کی اس زندہ دلی سے تقریب کی رونق مزید بڑھ گئی تھی۔

جب کہ تمکین کے چہرے سے اس کے دل کا حال معلوم کرنا بہت دشوار لگ رہا تھا۔ وہ بالکل خاموش تھی۔ کسی بھی قسم کے دکھ یا خوشی کا اندازہ اس کے چہرے سے نہیں ہو رہا تھا۔ خاموشی سے ہر ہر رسم کو ادا کرتی وہ نہ تو خوش دکھائی دے رہی تھی نہ غمگین...... اس کے برعکس اریج احمر کا حال واقعی قابلِ دید تھا۔

ستے ہوئے نڈھال چہرے پر سوجی ہوئی سرخ آنکھیں بات بے بات نم ہو رہی تھیں اور اس بات نے سب کو ہی خاصا سرپرائز کر دیا تھا۔ آج کی اس تقریب میں من کی مراد پوری ہو جانے پر اسے تو خوشی سے بے حال ہو جانا چاہیے تھا مگر وہ تھا کہ جیسے مجبوراً تمام رسومات ادا کر رہا تھا ہر فنکشن میں اس کی غیر دلچسپی سب نے واضح محسوس کی تھی۔

ضبط کی شدت سے اس کا دل جیسے کٹ کٹ کر خود اسی کے قدموں میں ڈھیر ہو رہا تھا۔ ہر طرف رنگ و نور کا میلہ تھا۔ قہقہوں کی برسات تھی

مگر اریج احمر کو ہر لمحہ اپنا دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ زندہ جلنا کسے کہتے ہیں وہ آج بخوبی محسوس کر رہا تھا۔

ڈارک پرپل کلر کے نہایت دیدہ زیب لہنگا کرتا میں ملبوس' نظر لگ جانے کی حد تک خوب صورت دکھائی دینے والی' تمکین رضا کو اس نے ایک بار بھی نظر بھر کر نہیں دیکھا تھا۔ انجشاء اور اریشہ دونوں اسے بار بار ڈکٹیشن دیتیں اس کے قریب ہی بیٹھی تھیں۔ اریشہ کے پاپا شہر یار جاوید اور دیگر فیملی بھی اس تقریب میں مدعو تھی۔

حقیقت میں ڈاکٹر فرحان جو اریشہ کے بھائی تھے نے خاصی ہوشیاری سے اریشہ کو اس فنکشن میں شرکت کرنے کے لئے ہوسپٹل سے چند روز کی چھٹی دی تھی۔ آج کی اس تقریب میں وہ خود بھی مدعو تھے۔

سب چیزیں اپنی جگہ تھیں۔ کہیں کسی کمی کا احساس نہیں ہو رہا تھا مگر پھر بھی اریج احمر کو اپنا وجود تختہ دار پر لٹکتا محسوس ہو رہا تھا۔

تقریب کے اختتام کے بعد تقریباً اڑھائی بجے وہ اپنے بیڈ روم کی طرف آیا تو دل جیسے پسلیاں توڑ کر باہر نکلنے کو بے تاب ہو رہا تھا۔ اندر کی پیاس ایک دم سے عود آئی تھی۔

دل بغاوت پر اکسانے لگا تھا۔ شوریدہ دھڑکنیں اسے کسی بھی قسم کی قربانی سے دریغ کرنے سے مجبور کر رہی تھیں۔ پسینے سے بے حال وجود ایک دم سے دہکنے لگا تھا۔

اندر کمرے میں اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ بیڈ پر بیٹھی تمکین رضا اس کا ایمان مزید ڈگمگا گئی تھی۔

تب ہی تھکے تھکے سے قدم اٹھاتا وہ اس کی طرف بڑھتے ہوئے واقعی خود کو سزائے موت کا قیدی سمجھ کر تختہ دار کی جانب بڑھ آیا۔

یادیں تیرے خلوص کی ڈستی ہیں آج بھی
ملنے کی آرزو میں ترستی ہیں آج بھی
آنکھیں ہزار صبر کی کوشش کے باوجود
رُک رُک کر بار بار برستی ہیں آج بھی

جیون کے ویران شہر میں
خواہش کے اجڑے رستوں کی تاریکی میں
اکثر ہم سے دیوانوں نے
اپنی آنکھیں کھوئی ہیں......

شب کے تقریباً ڈھائی بج رہے تھے جب تھکے تھکے سے قدموں کو بمشکل گھسیٹتے ہوئے وہ اپنے بیڈروم کی طرف آیا تھا۔
آج خوابوں اور خوشبوؤں کی رات تھی
دلی تمناؤں کے برآنے کی رات تھی
آج وہ حسین رات تھی کہ جس میں اس نے اپنی محبت کو مجسم پالیا تھا۔
مگر......اس کی پلکیں پھر بھی بھیگی ہوئی تھیں۔
سینے کے اندر شوریدہ دھڑکنیں اب بھی اودھم مچارہی تھیں۔
اپنی بدنصیبی پر پھوٹ پھوٹ کر رونے کو دل چاہ رہا تھا۔ محبت کو پا کر پھر سے کھودینے کا احساس اس کی رگیں کاٹ رہا تھا۔
سینے میں سانس جیسے الجھنے لگی تھی۔
شدت سے من چاہ رہا تھا کہ آج کی رات وہ اس خوب صورت دوشیزہ کے وجود سے نگاہ چرا کر کہیں دور نکل جائے۔ اتنی دور کہ جہاں اسے خود سے الگ کردینے کا کوئی احساس، کوئی مجبوری اس کا ذہن نہ الجھائے۔
مگر......آج کی رات بھلا خود سے فرار ممکن کہاں تھا۔ بھرے گھر میں ڈھیروں مہمانوں کے بیچ اسے وہی کرنا تھا کہ جو اس پر ''فرض'' کیا گیا تھا۔
سو شکستہ دل کے ساتھ آہستہ سے دروازہ دھکیل کر وہ کمرے کے اندر چلا گیا تھا۔ جہاں دل فریب گلابوں کی مہک اس کے اندر ایک عجیب

سی آگ کو دہکا گئی تھی۔

نظر سے کچھ ہی فاصلے پر جہازی سائز بیڈ تھا جہاں اس وقت اپنے دوآتشی روپ کے ساتھ تکیے کا سہارا لے کر لیٹی ہوئی تمکین رضا اپنی تمام تر بے خبری کے ساتھ ایک عجیب سی کسک ایک گہرا درد اس کے اندر اتار رہی تھی۔

چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا وہ شکستگی کے ساتھ اس کی طرف بڑھا تھا۔ جو شاید نہیں یقیناً اس کا انتظار کرتے کرتے اب گہری نیند کی بانہوں میں جا سوئی تھی۔

اسے اس لمحے جانے کیوں اپنی آنکھوں کے کنارے بھیگتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ نمی چھلکاتی خوب صورت نگاہیں' عجیب پیاس کے عالم میں' اس کے دلکش سراپے کا طواف کر رہی تھیں۔ دل کی کیفیت اس لمحے بڑی عجیب سی ہو رہی تھی۔

ہاتھ بڑھا کر اسے خود میں سموتے ہوئے بھی ڈر لگ رہا تھا۔

آج کی خوب صورت رات کا' بدصورت انجام' اسے اندر سے خالی کر رہا تھا۔ ضبط کی شدت سے سرخ ہوتی آنکھیں' خیالوں ہی خیالوں میں اپنی بربادی کا تماشہ دیکھنے لگی تھیں۔

تب مضطرب ہو کر اٹھتے ہوئے وہ جیسے گھٹے گھٹے سے انداز میں رو پڑا تھا۔ دل' ہر عہد' ہر وعدے سے منکر ہو کر اکسا رہا تھا جبکہ دماغ' صرف اسے اس کی ماں کی سلامتی اور تمکین کی خوشی کے لئے قربانی دینے پر مجبور کر رہا تھا۔

آخر دنیا میں اور لوگ بھی تو محبت کر کے دکھ اٹھاتے ہیں، اور لوگ بھی تو محبت کا غم دل میں لے کر جیتے ہیں۔ آنکھوں میں اپنے ہی خوابوں کی بربادی کا دکھ چھپائے مسکراتے ہیں۔ پھر اگر وہ بھی اپنے دل کو قربان کر دے گا تو کون سی قیامت آ جائے گی؟

محبت کو مجسم پالینا ہی تو عشق کی معراج نہیں اور پھر جس دل میں آپ کا کوئی مقام ہی نہ ہو وہاں برس ہا برس ٹھہر جانے سے بھی کیا حاصل؟

لاحاصل خوابوں کی تعبیریں ڈھونڈنے والوں کو سوائے درد کے کبھی کچھ نہیں ملا کرتا۔

وہ پوری رات اس کی جس اذیت کے عالم میں بسر ہوئی تھی صرف اس کا خدا جانتا تھا۔

صبح تمکین کی آنکھ کھلی تو وہ بیڈ کے ایک کنارے پر بے سدھ سمٹا پڑا تھا۔ تمکین کے اٹھنے سے پورے کمرے میں چوڑیوں کا جیسے جلترنگ ساز بج اٹھا تھا۔

اریج کی آنکھ اسی مسحور کن ردھم سے کھلی تھی۔

رت جگے کی غماز' خوب صورتی غلافی آنکھوں میں سرخ ڈورے خاصے نمایاں ہو رہے تھے۔ پچھلی شب کے نہ جانے کس پہر اسے نیند کی مہربان دیوی نے اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔ جانے یہ رات والی شدید ڈپریشن کا اثر تھا یا شب بیداری کا کہ اسے اپنے اعصاب بے حد بھاری محسوس ہو رہے تھے۔ جسم الگ جل رہا تھا تمکین اب اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھی قدرے ندامت سے کہہ رہی تھی۔

''سوری...... وہ اصل میں رات تھکن بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ اس لئے پتہ نہیں کب آنکھ لگ گئی۔ آپ نے مائنڈ تو نہیں کیا......''

''نہیں.......''

اب بھی اس کا سراپا اتنا ہی حسین تھا جتنا کہ رات میں دکھائی دے رہا تھا۔ تبھی اس نے دانستہ نگاہ چرائی تھی۔ مگر تمکین اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔

''اریج! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔ میرا مطلب ہے آپ کی آنکھیں بہت سرخ ہو رہی ہیں......'' کتنی پرواہ کر رہی تھی وہ اس کی! اریج کا دل دکھ سے بھر نہ جاتا تو اور کیا کرتا؟

وہ اسے ٹالنا چاہتا تھا۔ کوئی بہانہ بنا کر اسے اپنی طرف متوجہ رہنے سے روکنا چاہتا تھا لیکن تمکین اسے اتنا موقع دیئے بغیر ہی اٹھ کر اس کے قریب چلی آئی اور اپنا سر دہاتھ اس کی کشادہ پیشانی پر رکھ دیا۔

''ارے آپ کو تو بہت تیز بخار ہے۔'' اگلے ہی پل وہ ازحد متفکر ہو کر بولی تھی۔

☆☆☆

''ازمیر! ایک سوال پوچھوں، سچ سچ جواب دو گے......''

آج پھر بہت دنوں کے بعد وہ شہزین خان کے ہاتھ لگا تھا، تبھی وہ ایک ادا سے اپنے سلکی بال گردن کے پیچھے دھکیلتے ہوئے قدرے دھیمے لہجے میں بولی تو گم صم سے ازمیر شاہ نے، آہستہ سے اثبات میں سر ہلا کر اسے کچھ بھی پوچھنے کی اجازت دے دی۔

شہزین خان اس کی اجازت پا کر محض چند لمحوں تک خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر ایک دم سے اپنی نگاہوں کا زاویہ بدل کر اپنے اردگرد موجود لوگوں پر ایک سرسری سی نگاہ ڈالتے ہوئے بولی۔

''تم پورے چھ سال کے بعد پھر سے یہاں کیوں چلے آئے ازمیر، جب پاکستان میں تمہاری محبت، زندہ جاوید ہے تو اس شہر بدنصیب کی طرف کیوں کھنچے چلے آئے......''

ازمیر جانتا تھا کہ وہ یہ سوال ضرور کرے گی لہٰذا کچھ پل خاموشی سے لب بھینچنے کے بعد وہ آہستہ سے بولا تھا۔

''پتہ نہیں...... تاہم اپنے گھر والوں سے میں یہ کہہ کر یہاں آیا تھا کہ میں شہزین خان کو ڈھونڈنے جا رہا ہوں۔ اس شہزین خان کو جس سے میں نے کبھی محبت کرنے کی گستاخی کی تھی......''

''ویل...... لگتا ہے آج تک تمہارے دل سے، میرے لئے خفگی کا غبار نہیں نکلا......''

''ہوں...... یہ کیسے کہہ سکتی ہیں آپ......؟ جنہیں خود سے بڑھ کر چاہا جائے، ان سے کبھی خفا نہیں ہوا جاتا......'' عجیب پھیکے سے انداز میں لبوں پر مسکراہٹ پھیلاتے ہوئے اس نے کہا تھا جب وہ بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''آر یو شیور......؟ کیا تمہیں لگتا ہے کہ تم اب بھی مجھ سے محبت کرتے ہو......؟''

''ہاں......''

ایک لمحے کا توقف کیے بغیر اس نے فوراً اقرار کیا تھا' جواب میں شہرین خان ہنسی تو پھر ہنستی ہی چلی گئی۔

''تم پاگل ہو گئے ہو ازمیر' ایک دم پاگل......''

بمشکل اپنی ہنسی روک کر اس نے کہا تھا۔ مگر ازمیر شاہ نے اپنی سنجیدگی میں قطعی کوئی کمی نہیں آنے دی۔

''آپ کہہ سکتی ہیں زینی...... یہ محبتوں کے معاملے ایسے ہی عجیب ہوتے ہیں۔ کبھی کسی کی سمجھ میں نہ آنے والے......''

کس قدر خالی لہجہ تھا اس کا' شہرین خان کو اس وقت وہ بہت دکھی لگ رہا تھا۔

''او کے...... چلو مان لیتے ہیں کہ تم جو کہہ رہے ہو وہی درست ہے لیکن اسے ثابت بھی تو کرو مانی۔ اگر میں ہی تمہاری تمام تر آرزوؤں کا حاصل ہوں تو مجھے اپنے قریب پا کر پہلے کی طرح خوش کیوں نہیں ہو تم' کیوں میرے پاس ہو کر تم کہیں اور بھٹک رہے ہو۔ بولو مانی' اگر میں ہی تمہارا پیار ہوں' تو ان خوب صورت آنکھوں میں یہ اداسی کیسی......؟ یہ لب اتنے ساکت کیوں ہیں......؟ کیوں تمہارا دل مجھے اپنے سامنے پا کر بھی قرار نہیں پا رہا ہے......''

اس کے تابڑ توڑ سوالوں نے چند لمحوں کے لیے ہی سہی مگر اسے از حد ڈسٹرب کر کے رکھ دیا تھا۔ شدت ضبط سے ہونٹ کاٹتے ہوئے عجیب بے بس سے انداز میں نگاہیں چرا کر شکستہ لہجے میں وہ بولا تھا۔

''آپ چاہے کچھ بھی کہیں' کچھ بھی سوچیں مگر میری زندگی کا سچ یہی ہے کہ میں آپ سے پیار کرتا ہوں۔''

''ویل...... لیکن یہ فریب تم کسے دے رہے ہو مانی......''

خوبصورت بلیو آنکھیں' آج ایک عجیب سی تحقیق پر اتری دکھائی دے رہی تھیں۔

ازمیر شاہ اس لمحے خود کو قطعی بے بس تصور کر رہا تھا۔ تبھی وہ پھر بولی تھی۔

''میں نہیں جانتی کہ تم خود کو یہ اذیت کیوں دے رہے ہو......؟ لیکن...... تمہارا یہ اضطراب مجھے تکلیف سے ہمکنار کر رہا ہے مانی' تم یہ بات شاید کبھی نہ سمجھ سکو کہ تم اس ''خوش قسمت'' لڑکی سے کس قدر ٹوٹ کر محبت کرتے ہو' میری ذات سے جس محبت کا دعویٰ ہے' تم خود کو بہلا رہے ہو' وہ محبت نہیں تھی ازمیر' وہ صرف پسندیدگی تھی' میری خوب صورتی' میرا اچھا اخلاق' اچھی عادات' یقیناً تم وقتی طور پر مجھ سے شدید متاثر ہو گئے تھے' مگر...... وہ محبت نہیں تھی......''

اب کے اس کے الفاظ پر نڈھال بیٹھا ازمیر شاہ دکھ سے بلبلا اٹھا تھا۔

''ایسا مت کہیں پلیز...... اگر وہ سب میرا وقتی جنون ہوتا تو میں اتنے لمبے عرصے کے بعد پلٹ کر دوبارہ یہاں کبھی نہیں آتا' میں نے آپ کے لیے بہت آنسو بہائے ہیں شہرین' بہت تکلیف کا سامنا کیا ہے میں نے......''

پتہ نہیں وہ اسے اپنی شدید محبت کا یقین دلانا چاہ رہا تھا' یا خود اپنے آپ کو' تاہم اس بار شہرین خان نے قدرے افسردگی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

''کیا تم یقین سے کہہ سکتے ہو کہ صرف میرے لئے یہاں دوبارہ پلٹ کر واپس آئے ہو......؟''

ازمیر شاہ کا ضبط' اس کا حوصلہ اس لمحے جواب دے گیا تھا' تبھی شاید وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے چلایا تھا۔

''آپ میرا یقین کیوں نہیں کرتیں......؟ چھ سال پہلے بھی آپ نے میرا یقین نہیں کیا تھا' چھ سال پہلے بھی میں یونہی آپ کو اپنی محبت کا یقین دلانے کی کوشش میں خوار ہوا تھا' اور آج چھ سال کے بعد آپ پھر میرا ضبط آزما رہی ہیں۔ مت کریں ایسا شہرین' پلیز......''

پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ گھسائے اس سے رخ موڑے کھڑا وہ شخص اس لمحے کسی بھی پل مسمار ہو جانے کو تیار کھڑا تھا۔ تبھی وہ سر جھکا کر دھیمے لہجے میں بولی تھی۔

''میں زندگی میں کبھی حقیقت سے نظریں نہیں چراتی مانی' میں جانتی ہوں کہ چھ سال پہلے جب تم نے میری محبت کے لئے اپنا دامن پھیلایا تھا تو تمہاری آنکھوں میں واقعی میرا عکس تھا۔ میری طلب تھی۔ شاید اسی لئے تم سے بچھڑنے کے بعد میں کبھی تمہیں بھلا نہیں سکی۔ شاید اسی لئے زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر تمہارے پھر سے مل جانے کی منتظر رہی' مگر آج...... چھ سال کے بعد گو تمہارے الفاظ وہی ہیں مگر آج ان آنکھوں میں میرا عکس نہیں ہے' اسی لئے میں خدا سے دعا گو ہوں کہ اب مجھ سے بچھڑنے کے بعد خدا کرے یہ زندگی کبھی تمہیں میرے مقابل نہ لائے' خدا کرے اب کبھی تم مجھے یاد نہ آؤ......''

آج بہت دنوں بعد ازمیر شاہ نے پھر اسے روتے دیکھا تھا لہٰذا اک مرتبہ پھر وہ ازحد ڈسٹرب ہو کر رہ گیا تھا۔

''میں آپ کو زبردستی اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوئی کوشش نہیں کر سکتا' لیکن میرا اب بھی یہی کہنا ہے کہ میں صرف اور صرف آپ سے پیار کرتا ہوں اور کسی سے نہیں۔''

دل سے دشمنی نبھانے کی اس آخری کوشش میں وہ پھر سے زخم زخم ہوا تھا جواب میں شہرین خان کے خوب صورت لبوں پر ایک مرتبہ پھر استہزائیہ سی مسکان بکھر کر رہ گئی تھی۔

''او کے...... مجھ سے محبت کرتے ہو ناں...... ٹھیک ہے۔ مان لیتی ہوں' لیکن شادی کرو گے مجھ سے......؟''

دھڑ دھڑ دھڑ...... ایک دم سے جیسے اس کی ذات کا سارا ملبہ اس کے زخمی زخمی سے دل پر آ گرا تھا جبکہ وہ شاکڈ انداز میں چونک کر اپنے مقابل کھڑی خوب صورت سی شہرین خان کی طرف دیکھتا رہ گیا تھا۔

''کیا ہوا......؟ شاکڈ کیوں رہ گئے......؟ میں نے کوئی انہونی فرمائش تو نہیں کی......''

کتنا لطف آ رہا تھا اسے ازمیر شاہ کو لہولہان کر کے۔

اپنی آنکھوں کے سامنے اسے بے بس پا کر' اس کے دل کی بربادی کا تماشہ دیکھتے۔

ازمیر شاہ اس لمحے اپنے حواس گنوا بیٹھا تھا۔

جانے کیوں اس لمحے اسے نہ تو کچھ دکھائی دے رہا تھا اور نہ ہی دل کی دھڑکنوں کے شور کے سوا وہ کچھ سن پا رہا تھا۔

کتنی عجیب بات تھی کہ جس لڑکی کی رفاقت کے خواب دیکھتے وہ خود اپنے آپ سے غافل ہو گیا تھا آج وہی لڑکی اسے اپنی سنگت کی پیشکش کر رہی تھی مگر اس کا دل اس پر آمادہ نہیں تھا۔

''کیوں......؟

کیوں ہو رہا ہے میرے ساتھ ایسا؟ کیوں سکون سے نہیں جی پا رہا ہوں میں' آخر کیوں......؟''

بہت ضبط کی کوشش کے باوجود دو آنسو نکل کر اس کے گریبان میں جذب ہو گئے تھے۔ تبھی اس نے اپنے بائیں کندھے پر' شہزین خان کے ہاتھ کا گداز لمس محسوس کیا تھا۔

''تم واقعی پاگل ہو' ازمیر' ایک دم پاگل......''

اپنے مخصوص انداز میں کہتے ہوئے وہ ایک مرتبہ پھر دھیمے سے مسکرائی تھی۔

''اوکے...... چلو آج باقی کی باتیں' میرے گھر چل کر کرتے ہیں' یہاں تو موسم کے تیور مجھے خاصے خطرناک دکھائی دے رہے ہیں' ابھی کچھ لمحوں میں اگر بارش ہو گئی' تو ہم دونوں بری طرح بھیگ جائیں گے......''

وہ شاید اسے سمجھنے کے لئے کچھ وقت دینا چاہتی تھی' تبھی بات کا رخ بدلتے ہوئے بولی تو ازمیر چپ چاپ اس کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا کہ اس وقت وہ اس کی پیشکش کو ٹھکرانے کے موڈ میں نہیں تھا۔

اگلے دس پندرہ منٹ کی پیدل واک کے بعد وہ اپنی مطلوبہ جگہ پر پہنچ گئے تھے۔

شہزین خان کا چھوٹا سا خوب صورت گھر واقعی اس قابل تھا کہ اسے جی بھر کر سراہا جاتا۔

موسم ان کی توقع سے زیادہ سرد ہو رہا تھا۔ لہٰذا گھر پہنچ کر شہزین نے سب سے پہلے آتش دان روشن کیا۔ پھر اس کام سے فارغ ہو کر وہ گرما گرم چائے کے دو کپ لے کر اس کی طرف چلی آئی۔ جواب بھی خاصے انہماک سے اس گھر میں اس کے سلیقے کا جائزہ لے رہا تھا۔

شہزین نے ہلکے سے کھنکار کر اسے چائے کا کپ تھمایا تو وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

''آپ کا گھر' آپ کی طرح بہت خوب صورت ہے زینی' کیا اکیلی رہتی ہیں آپ یہاں......؟''

''نہیں میرا بیٹا اور اس کی آیا بھی یہاں میرے ساتھ ہی رہتے ہیں......''

بہت مختصر لہجے میں اس نے ازمیر کو اطلاع فراہم کی تھی، جب وہ پھر سے بے چین لہجے میں بولا۔

''اور آپ کے شوہر، کیا وہ آپ کے ساتھ نہیں رہتے؟''

''نہیں......''

''کیوں......'' شہزین خان کی آنکھوں میں اترتی' غم کی دھند دیکھ کر وہ قدرے حیران ہوا تھا جب وہ خود کو سنبھالتے ہوئے قدرے لاپروائی سے بولی۔

''کیونکہ......لاسٹ ایئر ہم دونوں میں علیحدگی ہوگئی تھی......''

''یو مین ڈائیورس......؟'' ازمیر کو از حد اچنبھا ہوا تھا۔ جب وہ آہستہ سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

''ہاں......''

''لیکن کیوں......آپ کو پا کر کھو دینے کا حوصلہ' بھلا کون سمجھدار شخص کر سکتا ہے......؟''

اسے واقعی از حد دکھ ہوا تھا۔ خود شہزین خان کی آنکھیں بھی اس لمحے جیسے جلنے لگی تھیں۔

''اس نے مجھے نہیں چھوڑا مائی' بلکہ میں نے خود اس سے اپنی راہیں علیحدہ کر لی تھیں۔''

''کیا میں اس حماقت کی وجہ پوچھ سکتا ہوں زینی۔''

بہت سافٹ مگر مان بھرے لہجے میں اس نے پوچھا تھا۔ جب شہزین خان کا سر آپ ہی آپ جیسے جھکتا چلا گیا۔ بہت سے پل خاموشیوں کی نذر کرنے کے بعد بالآخر وہ بولی تو اس کے لہجے میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔

''میں اسے بہت چاہتی تھی مائی' بہت کیا بلکہ جتنا زندگی میں' میں نے اسے چاہا تھا آج تک شاید کسی نے کسی کو نہ چاہا ہو بس یوں سمجھ لو ایک طرح سے میں اس کے لئے پاگل ہو کر رہ گئی تھی۔''

شہزین خان کی روداد سے لگ رہا تھا' جیسے اسے اپنا غم شیئر کرنے کے لئے ' جانے کب سے کسی مہربان کندھے کی تلاش ہو اور آج بالآخر یہ کندھا' ازمیر شاہ کی صورت میں اسے میسر آ گیا تھا۔ تبھی شاید وہ ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر اسے اپنی روداد سنانے بیٹھ گئی تھی۔

''یہ ان دنوں کی بات ہے' جب تم میرے رویے سے ہرٹ ہو کر یہاں لندن سے پاکستان واپس چلے گئے تھے۔ ان دنوں مجھے اپنے حسن پر بہت غرور تھا۔ میں سمجھتی تھی دنیا میں کوئی بھی شخص میرے حسن سے متاثر ہو کر میری طرف لپک سکتا ہے' لیکن......''وہ'' ایسا نہیں تھا۔ پہلی بار اس سے میری ملاقات' اپنی دوست کی برتھ ڈے پارٹی میں ہوئی تھی۔ وہ اتنا خوب صورت تھا کہ اسے ایک نظر دیکھنے کے بعد میں اپنے حواس گنوا بیٹھی تھی۔ اس پہلی ملاقات کے بعد اس سے بار بار ملنے کا اشتیاق میرے اندر جیسے بڑھتا جا رہا تھا۔ میں جو اپنے حسن کے زعم میں پاگل تھی اسے فقط ایک نظر دیکھنے کے بعد جیسے اپنا سارا غرور' اپنا وقار' اپنی خودداری' اپنا صبر و قرار سب گنوا بیٹھی تھی۔ بہت دنوں کی شب بیداری کے بعد' میں اس پر اپنا حال دل کھولنے میں کامیاب ہوئی تھی' لیکن......اس بار اس نے ''مجھے'' بے دردی سے ٹھکرا دیا تھا۔ اس وقت میں جان پائی تھی کہ ٹھکرائے جانے کی اذیت کیا ہوتی ہے۔ ہاں......اسی وقت مجھے تمہاری آنکھوں میں تیرتے آنسو یاد آئے تھے' مگر میں کمزور نہیں تھی۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ کسی اور کو چاہتا ہے' اس کے دل اور خوابوں پر کسی اور کا راج ہے' مگر میں اس سے دستبردار ہو کر جینا' اپنی موت کے مترادف سمجھتی تھی' اسی لئے جب مجھ پر یہ حقیقت کھلی کہ وہ پاپا کے کسی قریبی دوست کا بیٹا ہے' تو میں نے پاپا سے کہہ دیا کہ میں صرف اسی سے شادی کروں گی' اگر ایسا نہ ہو سکا تو زندگی بھر کنواری رہ کر مر جاؤں گی۔ پاپا میری محبت اور ضد سے ہار گئے تھے۔ لہٰذا انہوں نے میرے سلسلے میں اپنے دوست سے بات کر لی' ان کے دوست جہانگیر انکل کو رشتہ دل و جان سے پسند تھا' مگر......تفسیر عباس کسی صورت مجھ سے شادی پر آمادہ نہ ہو سکا۔ انکل نے جب اس پر زیادہ دباؤ ڈالا تو وہ براہ راست مجھ سے مل کر

مجھے سمجھانے چلا آیا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں فقط آگ سے کھیل رہی ہوں۔ اگر یہ شادی زبردستی ہو بھی گئی تو وہ کبھی مجھے ایک بیوی کا مقام نہیں دے سکے گا' کبھی دل سے میرا نہیں ہو سکے گا' میں زندگی بھر اس کی فقط ایک محبت بھری نظر کے لئے ترستی رہوں گی۔ اس سے شادی کے بعد میری ہر خوشی' میرا سکون مجھ سے چھن جائے گا۔ لیکن میں...... اس وقت بہت بے وقوف تھی مانی' میں اس کی وارننگ کو فقط اس کا وقتی اشتعال سمجھ بیٹھی تھی' میرا خیال تھا کہ میری بے پایاں محبت اسے موم کر کے میری طرف موڑ دے گی۔ مگر...... ایسا کبھی نہ ہو سکا۔ میری ہر سوچ' ہر خوش فہمی ملیامیٹ ہو گئی از میر......''

اس کا لہجہ خاصا رندھ گیا تھا جبکہ از میر شاہ اب بھی شاکڈ بیٹھا مکمل انہماک سے اس کی روداد سن رہا تھا۔

☆☆☆

عدنان رؤف کے آفس میں انجشاء احمر کا وہ پہلا دن تھا۔

چونکہ اس ادارے کو' کسی بھی مالک کی نگرانی پچھلے دو تین ماہ سے میسر نہیں آ سکی تھی لہٰذا آفس ورکرز خوب موج مستی کر رہے تھے۔ بہت دنوں کے بعد کسی نے عدنان رؤف کی سیٹ سنبھالی تھی لہٰذا اپنی اپنی جگہ پر' جن ورکرز نے آنے کی زحمت گوارہ کر لی تھی' وہ خاصے بدمزہ نظر آ رہے تھے۔ انجشاء نے پہلی ہی فرصت میں عدنان رؤف کے پرسنل سیکرٹری طلحہ عباسی اور آفس منیجر جناب طارق متین صاحب کو اپنے کیبن میں طلب کر لیا تھا۔ دونوں کے چہروں پر اس وقت ہوائیاں اڑتی صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ لہٰذا اس نے ایک کڑی نگاہ باری باری ان دونوں کے چہروں پر ڈالنے کے بعد انہیں بیٹھنے کی پیشکش کر ڈالی تھی۔

''جی مسٹر طارق' سب سے پہلے آپ بتایئے کہ عدنان صاحب کی عدم موجودگی میں آپ نے اپنے فرائض منصبی کس حد تک ایمانداری سے سرانجام دیئے اور یہ بھی کہ پچھلے ایک ماہ سے عدنان صاحب کے گھر' ایک روپیہ بھی آفس سے کیوں نہیں جا رہا......''

اس کی تفتیش اتنی کڑی تھی کہ خاصی عمر والے' شاطر طارق متین صاحب بھی ایک لمحے کو گڑبڑا کر رہ گئے تھے۔ تاہم اگلے ہی پل خود کو سنبھالتے ہوئے وہ اپنی پیشانی پر آیا پسینہ رومال میں جذب کر کے بولے۔

''دیکھئے میڈم' عدنان صاحب کی عدم موجودگی میں آفس کا سارا نظام درہم برہم ہو کر رہ گیا ہے۔ مالک نگرانی کرنے والا نہ ہو تو ورکرز کو من مانی کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ لہٰذا پچھلے تین ماہ سے آفس کا ہر ورکر' اپنی مرضی سے کچھ دیر کے لئے آتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ بلکہ کئی روز تک تو کچھ ورکرز' آفس کا منہ ہی نہیں دیکھتے' دو ایک بار میں نے اپنا اختیار استعمال کرنے کی کوشش کی تو سب میرے خلاف ہو کر گھر بیٹھ گئے۔ یوں مجبوراً مجھے کچھ روز کے لئے آفس Lock کرنا پڑا......''

''کچھ روز کے لئے...... آپ شاید بھول رہے ہیں مسٹر طارق کہ یہ کمپنی پورے ڈیڑھ ماہ بند رہی ہے اور آپ کو اندازہ ہے کہ اس ڈیڑھ ماہ میں ''شاہ انڈسٹریز'' کہاں کی کہاں جا پہنچی ہے' پہلے جس نام کو بزنس کی دنیا میں ٹاپ مقام حاصل تھا' محض آپ لوگوں کی لاپرواہی' آپس کی لوٹ کھسوٹ' آرام طلبی اور بددیانتی کی وجہ سے اب لوگ اس کمپنی کے نام تک کو بھولتے جا رہے ہیں' کیوں......؟'' اس کا غصہ مقابل بیٹھے ان دونوں اشخاص کے حواس معطل کر دینے کو کافی تھا۔

''اور آپ.....مسٹر طلحہ عباسی صاحب.....آپ نے بھی کیا خوب اپنی ڈیوٹی نبھائی ہے'عدنان صاحب نے بیسیوں ٹیلنٹڈ لڑکوں میں سے آپ کا انتخاب کیا تھا' کیونکہ آپ ان کی نظر میں اپنی غربت اور گھریلو ذمہ داریوں کے باعث اس جاب کے سب سے زیادہ ضرورت مند تھے۔مگر آپ نے کیا کیا'ان کا مشکل وقت آتے ہی' آپ نے بھی اپنی اصلیت دکھادی۔ان کی بے بسی اور لاچاری سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ بھی یہاں ''اپنی آزادی'' کا جشن منانے والوں میں شامل ہوگئے'شیم آن یو مسٹر طلحہ مجھے عدنان کے انتخاب پر واقعی بے حد افسوس ہو رہا ہے۔''

انجشاء یوں اچانک آفس آکر اس طرح سے ان کی جھاڑ کرے گی'یہ کسی کے بھی وہم وگمان میں نہیں تھا۔تبھی شاید ان کے پاس اپنی صفائی میں کہنے کے لئے کچھ نہیں بچا تھا۔

''اب جائیے آپ یہاں سے.....مگر ابھی اور اسی وقت تمام آفس ورکرز کے ساتھ میری میٹنگ ارینج کیجئے'میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔''

آفس اور کاروبار کا حال دیکھ کر واقعی'اس کا دماغ گھوم گیا تھا' کچھ وہ غصے کی ویسے بھی تیز تھی۔لہٰذا اس وقت بھی ورکرز کی طبیعت صاف کرنے کا مصمم ارادہ کرتے ہوئے وہ فوراً گھر کا لائن نمبر پریس کرنے لگی تھی۔

طارق متین صاحب اور طلحہ عباسی دونوں خفت سے منہ لٹکا کر اس کے کیبن سے باہر نکلے تھے۔

''ہیلو.....سیال آنٹی'انجو بول رہی ہوں۔''

اُن دونوں کے کمرے سے باہر نکلتے ہی اس نے گھر میں سیال بیگم سے رابطہ کیا تھا۔

''ہاں بول بیٹی.....سب ٹھیک تو ہے ناں.....؟''

دوسری جانب ان کا لہجہ خاصا متفکر تھا'تبھی وہ خود کو ریلیکس کرتے ہوئے بولی۔

''سب ٹھیک نہ بھی ہوا تو اب ہوجائے گا آنٹی' آپ عدنان کا خیال رکھیے گا۔اب کیسی طبیعت ہے ان کی.....؟''

''پہلے سے کافی بہتر ہے'ابھی میں اسے ناشتے کے بعد دوا کھلا کر آئی ہوں'تم اپنا خیال رکھنا.....''

''او کے.....آج ہوسکتا ہے کام کی زیادتی کے باعث میں کچھ لیٹ ہوجاؤں۔آپ پلیز پریشان مت ہوئیے گا.....''

''ٹھیک ہے.....تم بس اپنا خیال رکھنا اور کھانا وقت پر کھالینا.....''

حقیقی ماؤں کی طرح اس کے لئے متفکر ہوتیں وہ کتنی اچھی لگ رہی تھیں۔انجشاء نے اگلے ہی لمحے خدا حافظ کہہ کر ریسیور کریڈل پر ڈال دیا تھا۔

اگلے پندرہ بیس منٹ میں وہ میٹنگ ہال میں بیٹھی سبھی آفس ورکرز پر طائرانہ نگاہ ڈال رہی تھی۔

☆☆☆

اگلے روز ولیمے کا فنکشن تھا۔ مگر اریج احمر کا بخار تھا کہ بجائے کم ہونے کے بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ حقیقی معنوں میں اس وقت وہ کسی کا سامنا بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا ڈھیٹ بنا اپنے بستر میں دبکا رہا۔ اس کی بیماری کے پیش نظر ہی ولیمے کی تقریب کچھ دنوں کے لئے ملتوی کرنے کا سوچا جا رہا تھا۔ مگر اریج احمر نے ایسا نہیں ہونے دیا۔

محض ایک دو گھنٹے کے لئے ہی سہی' وہ سب کی خوشی کی خاطر' بالآخر اپنے کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔ رخسانہ بیگم کی زیرک نگاہوں سے اس کی آنکھوں کی سرخی چھپی نہیں رہ سکی تھی لہٰذا موقع ملتے ہی انہوں نے اریج کو گھیر لیا تھا۔

''اریج...... تم ٹھیک تو ہو ناں بیٹے......؟''

''بالکل ٹھیک ہوں مما...... مجھے بھلا کیا ہونا ہے......؟''

''اللہ نہ کرے کہ تمہیں کچھ ہو......''

اُس کی پھیکی سی مسکان پر فوراً وہ دہل کر بولی تھیں۔

''لیکن...... تمہاری آنکھوں میں دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا ہے' جیسے کوئی بات تمہیں بے حد پریشان کر رہی ہے۔ شاید...... تم رات میں روتے بھی رہے ہو......''

انہی سوالوں سے ڈرتے ہوئے وہ اپنے کمرے میں مقید رہنا چاہتا تھا' مگر اب یہی سوال اسے پھر سے لہولہان کرنے کو' اس کے سامنے آ کھڑے ہوئے تھے۔ اس وقت کتنی مشکل سے اس نے رخسانہ بیگم سے بے ساختہ نگاہیں چرائی تھیں۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے مما' بس تھکن سے بخار ہو گیا اور...... شاید اسی لئے آنکھیں بھی سرخ ہو گئیں' پلیز آپ میرے لئے فکر مند نہ ہوں......''

''چل...... تو کہتا ہے تو مان لیتی ہوں' لیکن میرا دل تیری اس وضاحت پر یقین نہیں کر رہا جانے کیوں ایسا لگ رہا ہے جیسے تو ضرور اپنا کوئی اہم راز اپنی مما سے چھپا رہا ہے......''

''او مائی سویٹ مما' ایسی ہرگز کوئی بات نہیں ہے' آپ کا بیٹا اتنا کمزور نہیں ہے کہ کوئی دکھ کوئی راز اسے رُلا سکے......''

رخسانہ بیگم سے زیادہ اس لمحے جیسے اس نے خود کو یقین دلانا چاہا تھا۔

پھر اس سے پہلے کہ رخسانہ بیگم اس سے کچھ کہتیں' قدرے الجھا الجھا سا اشعر احمد بھی اسی طرف چلا آیا۔

''ہاں...... کہو اریج' رات کیسی گزری......؟''

اریج کو رخسانہ بیگم کے سامنے اس سے ایسے سوال کی توقع نہیں تھی' تبھی اس کا لہجہ ڈگمگا گیا تھا۔

''میں سمجھا نہیں......''

''کمال ہے...... میں آپ کو دودھ پیتا بچہ تو ہرگز نہیں سمجھتا......''

اس کے لبوں پر اس لمحے خاصی زہریلی مسکراہٹ تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ رخسانہ بیگم اس پر برہم ہوئے بغیر نہیں رہ سکی تھیں۔

''تمیز سے بات کرو اشعر' میری تربیت پر مجھے ہی شرمندہ ہونے کا موقع مت دو......''

''آپ درمیان میں مت بولیں مما' میں اس وقت اریج احمر سے مخاطب ہوں......''

اس کا انداز خاصا گستاخانہ تھا۔ لہٰذا رخسانہ بیگم کا غصے میں آ جانا فطری بات تھی۔

''تم شاید بھول رہے ہو کہ اریج میرا بیٹا اور تمہارا بھائی ہے......''

''نو...... نیور مما...... یہ آپ کا بیٹا ہے اس بات کو میں چاہوں بھی تو کبھی نہیں قبول کر سکتا' ہاں بار بار اسے میرا بھائی کہہ کر میری ذات کی توہین مت کیا کریں پلیز......''

خود ساختہ نفرت اور حسد نے اس کا دل مکمل طور پر سیاہ کر دیا تھا۔

جبکہ اریج جو پہلے ہی بخار میں جل رہا تھا اسے اس لمحے اس کے لفظوں کی نمک پاشی سے اپنا وجود مزید سلگتا محسوس ہو رہا تھا' تاہم اشعر احمد کو اس کی پروا نہیں تھی۔

''ہاں...... تو مسٹر اریج احمر...... پھر بتایئے بھئی آپ ممی کو ڈائیورس کب دے رہے ہیں' آخر رات تو ''بخیر و عافیت'' بسر ہو گئی ناں آپ کی......؟''

انتہائی گھٹیا انداز اپناتے ہوئے' وہ اپنی ماں کے احترام کو بھی پس پشت ڈال گیا تھا۔ تاہم اس سے پہلے کہ اریج اسے کوئی جواب دیتا' گہرے پرپل کلر کی نفیس سی قیمتی ساڑھی میں ملبوس' از حد خوب صورت دکھائی دیتی تمکین رضا' چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ان کی طرف چلی آئی۔

''ارے.....آپ سب لوگ یہاں جمع ہیں' اور ہاں میں' اپنی دوستوں کے بیچ بیٹھی' احمقوں کی طرح ادھر ادھر نگاہیں دوڑاتی' آپ لوگوں کو ڈھونڈ رہی تھی' بہر حال بڑی ماں آپ کو ماما بلا رہی ہیں اور اریج' آپ ادھر اسٹیج کی طرف چلیں۔ میری دوستیں آپ سے ملنے کے لئے بے قرار ہیں.....''

اس کا رواں لہجہ' اشعر احمد کے لئے نہایت حیرانگی کا باعث بنا تھا۔

کہاں تو اریج احمر سے شادی کا سن کر دم گم صم سی ہو کر رہ گئی تھی اور کہاں اب یوں خوش دکھائی دے رہی تھی۔ گویا اریج کو پا کر اس کے تمام دکھوں کا مداوا ہو گیا ہو۔ اس لمحے اس نے اشعر کو جس بے دردی کے ساتھ نظر انداز کیا تھا۔ وہ اس پر کٹ کر رہ گیا تھا۔

☆☆☆

آنسو شہزین خان کی آنکھوں میں مچل رہے تھے اور وہ چپ چاپ ساکت سا بیٹھا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''تمہیں ایک نظم سناؤں ماہی.....؟''

بالکل اچانک اس نے اپنے آنسو رگڑتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔ جب ازمیر نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اگلے چند لمحوں تک دونوں کے بیچ خاموشی حائل رہی تھی۔ جب شہزین آہستہ سے اس کے سامنے سے اٹھ کر' آتش دان کے پاس آ بیٹھی۔ اس کا سر اب بھی جھکا ہوا تھا۔

''پتہ نہیں فرحت عباس شاہ صاحب نے یہ نظم کس ٹون میں لکھی ہوگی' مگر..... مجھے تو اس نظم کے ایک ایک لفظ میں اپنا درد بکھرتا دکھائی دیتا ہے' آہ.....

تم تو بس ایک ہی دکھ پوچھتے ہو

کون سے دکھ کی کریں بات ذرا بتلاؤ

موسموں کی سرد ہواؤں کی مسیحائی کا دکھ

راہ کی دھول میں بکھری ہوئی سیاہی کا دکھ

سنگ کے شہر میں خود سے شناسائی کا دکھ

یا کسی بھیگتی برسات میں تنہائی کا دکھ

کون سے دکھ کی کریں بات کہ دل کا دریا

اتنی طغیانی پر ہے کچھ بھی ہمیں یاد نہیں

کب ہمیں بھول گیا کون سے ہرجائی کا دکھ

تم تو بس ایک ہی دکھ پوچھتے ہو

اس بار اس کا لہجہ بہت بری طرح سے رندھ گیا تھا۔

ٹپ ٹپ ٹپ..... آنکھ سے گرتے آنسوؤں کے قطرے زمین میں جذب ہونے لگے تھے۔

آج بہت دنوں کے بعد وہ یوں بے اختیار ہو کر روئی تھی۔

''زینی..... کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ آپ نے اتنی شدید محبت کے باوجود تفسیر سے ڈائیورس کیوں لی.....؟'' اس کا سوال غیر متوقع نہیں تھا' مگر پھر بھی شہزرین خان کو جواب دینے میں کچھ لمحے لگے تھے۔

''ہاں..... میں سمجھتی تھی کہ میری بے لوث محبت بالآخر اسے موم کر دے گی۔ اسے ایک نہ ایک دن میری جنونی محبت کا احساس پگھلا ڈالے گا لیکن..... اس کے موم ہونے کا انتظار کرتے کرتے میں خود پتھر کی ہو گئی مانی۔ میری چار پانچ سالہ رفاقت' محض ایک پل میں ریت کی دیوار ثابت ہو گئی۔ میری تمام تر وفائیں' خدمتیں' سب کچھ پس پشت ڈال کر وہ اس لڑکی سے دوسرا بیاہ رچا بیٹھا جو اس کی محبت تھی۔ گزرے ہوئے ان چار پانچ سالوں میں صرف اس کی ایک نظر کے لئے میں کیا سے کیا ہو کر رہ گئی تھی مانی' مگر اس نے میری قدر نہیں کی' اپنی محبت کو حاصل کرتے ہی وہ مجھ سے یوں لاتعلق ہو گیا' جیسے اس سے کبھی میرا کوئی واسطہ ہی نہ رہا ہو' اب تم ہی بتاؤ' از میر میں اگر اس سے ڈائیورس نہ لیتی تو اور کیا کرتی؟ اس گھر کے اندھیروں میں مجھے سوائے پاگل پن یا موت کے اور کچھ نہیں مل سکتا تھا لہٰذا اگر میں وہاں رہتی تو بتاؤ' میرے بچے کا کیا ہوتا؟.....''

خوب صورت تیکھی ناک مسلسل رونے سے سرخ ہو گئی تھی۔ بڑی بڑی نیلی آنکھوں میں سوائے درد کے اس وقت اسے اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

''آئی ایم سوری مانی' میں سمجھتی ہوں میرے ساتھ جو کچھ بھی ہوا' وہ صرف تمہارا دل دکھانے کے باعث تھا' نہ میں تمہیں ہرٹ کرتی' نہ میرا اپنا دل بے مراد رہتا.....''

سرخ ناک کو صاف کرتی ہوئی وہ آتش دان میں مزید لکڑیاں ڈال کر پھر سے اس کے مقابل چلی آئی تھی۔

''میں نے زندگی میں کبھی آپ کا برا نہیں چاہا زینی' کبھی آپ کے لئے بددعا نہیں کی.....''

اس کا لہجہ دھیما ضرور تھا' مگر خاصا پراثر تھا' تبھی وہ دھیمے سے مسکراتے ہوئے بولی تھی۔

''جانتی ہوں' جو محبت کرتے ہیں وہ پھر کبھی کسی کو بددعا نہیں دیا کرتے' بہر حال اب تو مجھے کافی صبر آ چکا ہے' ویسے بھی کہا جاتا ہے زندگی میں محبت ہمیشہ انہی لوگوں سے کرنی چاہئے جو آپ سے ٹوٹ کر پیار کرتے ہیں آپ کی قدر کرنا اور خیال رکھنا جانتے ہیں۔ آپ کے آنسوؤں کی پروا کرتے ہیں۔ میں واقعی تم سے بہت شرمندہ ہوں مانی.....''

''اب..... آگے کے لئے کیا سوچا ہے آپ نے.....''

بہت سے پل خاموشی کی نذر کرنے کے بعد' اس نے ایک مرتبہ پھر دھیمے لہجے میں پوچھا تھا' جواب میں وہ اپنی ہتھیلیاں مسل کر ان پر بغور

نگاہ ٹکاتے ہوئے بولی۔

''سوچنا کیا ہے' زندگی نے جو گہری چوٹ لگائی ہے' ابھی کئی سالوں تک تو اس کے حصار میں رہنا ہے پھر چھٹکو بڑا ہو جائے گا تو اس کے بارے میں سوچوں گی' مجھے اپنے بارے میں سوچنے کے لئے شاید اب کبھی وقت نہ ملے۔''

''زینی..... آپ پانچ سال اس کی رفاقت میں رہیں' اس کا بچہ بھی پیدا کیا' پھر بھی آپ سے الگ ہوتے ہوئے اسے کوئی تکلیف نہیں ہوئی' یہ کیسے ممکن ہے؟ اتنے عرصے تو اگر کسی جانور کے ساتھ بھی رہا جائے تو اس سے محبت ہو جاتی' پھر آپ تو اتنی خوب صورت ہیں.....''

اس بار ازمیر شاہ کے سوال پر وہ ایک مرتبہ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی' لیکن اس ہنسی میں بھی گہرے درد کی آمیزش شامل تھی۔

''خوب صورت..... آہ..... میں اسے کبھی خوب صورت نہیں لگی ازمیر' پانچ سال تک مجھ سے اپنا ہر انتقام لیتے ہوئے وہ مجھے محض اک کھلونے کی طرح استعمال کرتا رہا' میں اس کے گھر میں تھی مگر دل میں کبھی نہ جا سکی' اگر..... وہ مجبور نہ ہوتا تو شاید مجھ سے شادی سے پہلے ہی اپنی محبت کو اپنا لیتا۔ خیر..... چھٹکو سے ملنے آ جاتا ہے' کبھی کبھی اسے اپنے ساتھ گھمانے پھرانے بھی لے جاتا ہے' لیکن خوش' وہ اب بھی اپنی بیوی اور اس کے بطن سے پیدا ہونے والے بچوں کے ساتھ ہی رہتا ہے۔ اس کا کہنا ہے ہمارے مابین کاغذی رشتہ قائم ہوا تھا۔ وہ میری ہی ضد کی وجہ سے ہوا تھا اور اسے ختم بھی میں نے ہی کیا' لہٰذا وہ تو اس معاملے میں بے قصور ہی ٹھہرا۔

بہر حال..... اس سارے چکر میں صرف ایک بات میری سمجھ میں آ گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ محبتوں کے معاملے بہت عجیب ہوتے ہیں' محبت کی معراج ہر کسی کا نصیب نہیں بنتی۔ یہ وہ ڈھول ہے جو دور سے ہی بجتا بھلا لگتا ہے۔ میرے نزدیک تو محبت وہ انگارہ ہے جو اپنی طرف متوجہ ہونے والوں کو روشنی بھی دیتا ہے اور جلاتا بھی ہے۔ پاس آ کر چھونے والوں کو تو خاکستر کر کے رکھ دیتا ہے۔ تم اس عورت کو دیکھو تو حیران رہ جاؤ ازمیر' میری خوب صورتی کے سامنے اس کا پورا سراپا صفر ہے لیکن..... تفسیر عباس شاہ کو سوائے اس کے دنیا میں اور کوئی نظر ہی نہیں آتا' یہ محبت کے کرشمات نہیں تو اور کیا ہیں.....؟ خیر مجھے چھوڑو تم اپنی سناؤ' تمہاری وہ گل بدن کیسی ہے' جسے چھوڑ کر اتنی دور چلے آئے ہو تم.....''

اس کے اندر دکھ کا غبار خاصا نکل چکا تھا۔ لہٰذا وہ پھر سے ازمیر کے تکلیف دہ موضوع کی طرف آ گئی تو اس نے بھی شہرین خان سے کچھ چھپانا مناسب نہیں سمجھا۔

اور کچھ پل کی خاموشی کے بعد جیسے اپنے آپ کو سناتے ہوئے بولا۔

''میں نہیں جانتا کہ وہ کتنی خوب صورت ہے۔ میرے لئے تو شاید دنیا میں اس سے بڑھ کر حسین کوئی اور ہے بھی نہیں' پانچ چھ برس قبل' جب میں یہاں تم سے ہرٹ ہو کر واپس پاکستان گیا تھا تو اس نے جاتے ہی میرے سارے آنسوؤں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا تھا۔ حالانکہ ہم بچپن سے ایک دوسرے کے ساتھ بے حد اٹیچ تھے لیکن اس سے پہلے میں کبھی اس کی طرف متوجہ نہیں ہو سکا تھا۔ اک طویل عرصہ' گھر سے دور رہنے کے باعث میں شاید کسی کے لئے بھی اہم نہیں تھا۔ پھر تم سے چوٹ کھانے کے بعد اپنی کم مائیگی کا احساس بھی مجھے شدت سے رلاتا رہتا تھا۔ لہٰذا ان دنوں جب وہ میرے قریب آئی اور اس نے اپنائیت سے میرے آنسو پونچھے' تو مجھے لگا' بس وہی پوری کائنات میں ایک ایسی لڑکی ہے' جسے میں اپنا کہہ سکتا ہوں'

دل میں اس کے لئے یہ احساس جاگا تو میں اپنی حیثیت فراموش کر بیٹھا زینی' مجھے ہر پل ہر لمحے اس کے ساتھ کی عادت ہوگئی' وہ میرے لئے بے حد مخلص تھی۔ اپنا ہر چھوٹے سے چھوٹا مسئلہ' مجھ سے ڈسکس کرتی تھی اور میرا بھی ہر دکھ' ہر پریشانی اپنے خلوص سے چٹکیوں میں بھگا دیتی تھی' وہ مجھ پر ایسے حق جماتی تھی جیسے پتہ نہیں وہ اپنے دل میں میرے لئے کتنا گہرا مقام رکھتی ہو' رات گئے تک میں شدید تھکن کے باوجود بھی اس کی اسٹڈی میں اسے ہیلپ دیا کرتا تھا لیکن وہ بجائے کتاب کی طرف دیکھنے کے عجیب دیوانوں کی طرح یک ٹک میرے چہرے کی طرف دیکھتی رہتی تھی' مجھے یہ سب اچھا لگتا تھا زینی' اپنے لئے اس کی مصروفیت مجھے خوشی دیتی تھی' تمام گھر والوں سے ہٹ کر' کسی کی پرواہ کئے بغیر میرا خیال رکھتی تھی' کبھی چائے بناتی' کبھی میرے کپڑے پریس کرتی' کبھی میرے کمرے کو سجاتی سنوارتی' وہ کب میرے دل میں آ بسی' مجھے معلوم ہی نہ ہوسکا۔ میں تو تمہارے غم میں الجھا ہوا تھا لہٰذا اس کی ہنستی بولتی آنکھوں کے پیغام کیسے پڑھتا؟ پتہ ہے زینی..... اگر مجھے کبھی ذرا سا فلو بھی ہوجاتا تھا تو وہ اپنے آرام کی پرواہ کئے بغیر' رات دیر تک بیٹھی میرا سر دباتی رہتی تھی' گھر میں دیگر کزنز ہونے کے باوجود وہ صرف میرے ساتھ شاپنگ' سینما یا واک کے لئے جاتی تھی۔ صرف میرے لئے پتہ نہیں اسے گھر والوں کی کون سی باتیں سننا پڑتی تھیں اور میں..... میں یہ سب کیسے برداشت کرسکتا تھا۔ وہ جو صرف مجھے خوشی دے رہی تھی۔ میں اپنی وجہ سے اسے رسوائی اور اذیت کیوں دیتا۔ لہٰذا میں نے اس سے دوری برتنا شروع کردی' گزرتے وقت کے لمحات نے بہت دیر کے بعد مجھ پر یہ بھید کھولا کہ وہ میری روح میں سرایت کرگئی ہے' اپنی پوری زندگی میں اگر کسی لڑکی کا ساتھ مجھے خوش رکھ سکتا ہے تو وہ صرف اریشہ خان ہے' لیکن یہ بھید' یہ انکشاف' مجھے پہلے سے زیادہ تکلیف دے گیا۔ وہ میری دسترس میں نہیں تھی زینی' اس کی بے تحاشا خوب صورتی اور اچھی عادات کے باعث تائی جان نے اسے اپنے بیٹے کے لئے پھوپھو سے مانگ لیا تھا' وہ اسی کے ساتھ جچتی تھی' اسی کا ساتھ اسے خوش رکھ سکتا تھا' لہٰذا میں نے خاموشی سے اپنے قدم پیچھے ہٹاتے ہوئے اپنے جذبات کو مار کر اپنے ہی اندر دفن کرلیا۔ اس سے بے رخی اور سرد مہری برتنا شروع کردی۔ صرف اسے خود سے دور کرنے کے لئے' میں نے سائکہ خان سے انگیجمنٹ بھی کروالی' لیکن..... میں پھر بھی اسے خود سے دور نہیں کرپایا.....'' نم لہجے میں کہتے ہوئے وہ رو پڑا تھا جب شہرین خان نے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا۔

☆☆☆

یہ سوچا تھا تیری قربت میرے غم دور کردے گی
خبر کیا تھی کہ تیری ذات میں محصور کردے گی
کہا تو تھا کبھی اس نے میرے شانے پر سر رکھ کر
محبت وہ دوا ہے جو کہ ہر دکھ دور کردے گی

میٹنگ ہال میں تمام آفس ورکرز کے روبرو بیٹھی وہ خاصی غصے میں دکھائی دے رہی تھی۔ جس کے باعث تقریباً سبھی ورکرز کے ہوش اڑے ہوئے تھے۔ احتساب کا وقت اتنی جلدی آجائے گا ان میں سے کسی کو بھی اس کا گمان نہیں تھا۔

''جی رحمان صاحب' اب کیسی طبیعت ہے آپ کی......؟''

اس بار سب سے پہلے اس نے اکاؤنٹ آفیسر رحمان یزدانی صاحب کو اپنے گھیرے میں لیا تھا جو آل ریڈی خاصے پریشان دکھائی دے رہے تھے۔

''ٹھیک ہوں میڈم' آپ کی دعائیں ہیں......''

''اچھا......لیکن پچھلے پندرہ دنوں کی رپورٹ کے مطابق تو آپ کی صحت اس حد تک خراب تھی کہ آپ بستر سے اٹھنے کے قابل بھی نہیں تھے' یہ دیکھئے آپ کے اپنے ہاتھوں سے لکھی ہوئی درخواست پچھلے پندرہ دنوں سے آپ مسلسل چھٹی پر ہیں۔ پھر آج اچانک ایک دم سے طبیعت کیسے بحال ہوگئی آپ کی......؟''

انگارے چبا کر مقابل کو پریشان کرنا وہ خوب جانتی تھی۔ تبھی شاید رحمان صاحب کی پیشانی سے پسینہ پھوٹ پڑا تھا۔

''وہ...... دراصل طبیعت تو اب بھی خراب ہے لیکن مجھے بتایا گیا تھا کہ آج آپ آفس آرہی ہیں تو...... میں نے سوچا آفس آجاؤں تا کہ میری غیر حاضری کی وجہ سے آپ کو کوئی مسئلہ نہ ہو......''

''تھینک یو! اس نوازش کے لئے بہت بہت شکریہ۔''

استہزائیہ سی مسکراہٹ لبوں پر پھیلا کر اس نے کچھ ایسے انداز میں کہا تھا کہ رحمان صاحب ندامت سے پانی پانی ہو کر رہ گئے تھے۔

''اینی ہاؤ' مجھے پچھلے تین ماہ کی تفصیلی رپورٹ چاہئے رحمان صاحب' ان تین ماہ میں' کتنی ڈیلنگز ہوئیں' کمپنی کو کتنا نفع' کتنا نقصان ہوا اور ماہانہ تیس پینتیس کروڑ کی آمدن کہاں کہاں خرچ کی گئی' سب کی تفصیلی رپورٹ چاہئے مجھے' یقیناً آپ نے ایک ایک پیسے کا حساب کتاب تو رکھا ہوگا''

''جج......جی میڈم......''

مارے بوکھلاہٹ کے رحمان صاحب اپنے چہرے پر آیا پسینہ بھی صاف نہیں کر پائے تھے۔

''او کے......اب مجھے آپ سب کو ایک امپورٹنٹ اطلاع دینی ہے اور وہ یہ ہے کہ آج کے بعد عدنان صاحب کی سیٹ میں سنبھال رہی ہوں' اور میری زندگی کا ایک اصول ہے' ایماندار اور مخلص انسانوں کو ان کی محنت سے بڑھ کر معاوضہ اور اہمیت دینا جبکہ بد دیانت لوگوں سے فوراً کنارہ کشی کر لینا' ویسے بھی پچھلے تین ماہ میں اس کمپنی کو بہت نقصان ہو چکا ہے۔ لہٰذا اسے دوبارہ مستحکم بنانے کے لئے مجھے اپنے ساتھ محنتی اور ایماندار لوگ چاہئیں' اسی مقصد کے لئے' کل سے میں کمپنی کے لئے' انٹرویوز کا سلسلہ شروع کر رہی ہوں' پچھلے تین ماہ میں' جن لوگوں نے حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی نااہلی اور بد دیانتی ثابت کی ہے' میں انہیں پہلی فرصت میں فارغ کر کے نئے لوگوں کو اپنے ساتھ شامل کر رہی ہوں' اگر آپ لوگوں کو اس سلسلے میں کچھ کہنا ہے تو میں ہمہ تن گوش ہوں......'' وسیع میٹنگ ہال میں اس وقت صرف اسی کی آواز گونج رہی تھی۔ باقی سب سر جھکائے خاموش بیٹھے تھے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ اس کی خوشامد یا بے جا تعریف کر کے تھوڑا نرم کر دیتے' لیکن اس وقت وہ اس قدر شدید خفا دکھائی دے رہی تھی کہ کسی میں بھی اس کے سامنے سر اٹھانے کی ہمت نہیں رہی تھی۔

''افسوس' صد افسوس کہ جس شخص نے آپ سب کو منتخب کر کے بہتر روزگار فراہم کیا' آپ لوگوں کے گھروں کے چولہے جلائے رکھے' آپ لوگوں نے اسی شخص کی بے بسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسی کے منہ سے نوالہ چھین لیا.....''

اب کے اس کا طنطنہ قدرے کم ہو گیا تھا' مگر لہجے کی کاٹ اب بھی باقی تھی۔

''شرم آنی چاہئے آپ سب کو کہ جس مشکل وقت میں آپ سب کو انہیں سہارا دینا چاہئے تھا۔ اسی مشکل کے وقت اس کی بے حالی پر جشن مناتے ہوئے' آپ لوگ یہاں مفت کے مال پر ہاتھ صاف کرنے کی کوششوں میں مگن ہو گئے؟ آپ کے نزدیک کوئی آپ سے پوچھ گچھ کرنے والا نہیں تھا ناں' لہٰذا یہ بھی بھول گئے کہ بددیانتی سے حاصل کیا گیا ایک روپیہ بھی مسلمان پر حرام ہے' لیکن نہیں.....شاید اس میں آپ کا قصور نہیں ہے' انسان ہمیشہ اپنے اردگرد کے ماحول سے سیکھتا ہے اور ہمارے ماحول' ہمارے معاشرے میں سوائے کرپشن کے اور کچھ ہے ہی نہیں' یہ ملک کروڑوں قربانیاں دے کر حاصل کسی نے کیا لیکن یہاں عیش کوئی اور کر رہا ہے۔ دونوں ہاتھوں سے اسے لوٹ لوٹ کر کوئی کھا رہا ہے۔ خوف خدا یا احتساب کا ڈر تو کسی کو رہا ہی نہیں ہے' سب کے سب بے حسی کے حصار میں آئے اپنے اپنے پیٹ آگ سے بھر رہے ہیں' خود اپنے ہی پاؤں تلے کی زمین کو کھوکھلا کر رہے ہیں..... پھر اثر تو آئے گا' بھیڑ چال تو ویسے بھی ہماری پہچان بن چکی ہے۔''

تنفر سے پر اس کا لہجہ سب کو بغلیں جھانکنے پر مجبور کر رہا تھا۔ سب کو اپنی اپنی بددیانتی یاد آ رہی تھی۔

''اور ہاں مسٹر طارق..... مجھے کل ہی پچھلے تین ماہ میں' تمام آفس ورکرز کی حاضری اور غیر حاضری سے متعلق رپورٹ چاہئے۔ جو لوگ یہاں کام کرنا چاہتے ہیں' وہ اپنے رزق کو حلال بنائیں بصورت دیگر کسی اور کمپنی میں جا سکتے ہیں' میری طرف سے آپ سب کو کھلی اجازت ہے.....''

اب کے اپنی بات ختم کرنے کے بعد وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

دن بھر میں اس نے اپنے آپ کو اتنا مصروف رکھا تھا کہ اسے اپنے آفس سے باہر ڈھلتی شام کا بھی احساس نہیں ہو سکا۔

شام ڈھلے سیال بیگم نے فون کر کے اس کی خیریت دریافت کی' تو اسے گھر واپس پلٹنا یاد آیا' پچھلے تین ماہ کے الجھے معاملات صرف ایک دن میں نہیں سلجھ سکتے تھے لہٰذا تھکی تھکی سی آنکھوں کو انگلیوں سے دباتے ہوئے بالآخر وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

موسم خاصا خنک لیکن پیارا ہو رہا تھا لہٰذا کافی سلو ڈرائیونگ کرتی وہ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد گھر واپس پہنچی تو سامنے کا منظر دیکھ کر اس کی بصارتیں بھونچکاں رہ گئیں۔

قدم جیسے وہیں دہلیز سے چپک کر رہ گئے تھے۔

ٹکر ٹکر سامنے دیکھتے ہوئے وہ جیسے اپنے حواس گنوا رہی تھی۔

بے شک سامنے کا نظارہ اس کے گمان کی حد سے بہت دور تھا۔ تبھی وہ بے ساختہ مسکرا اٹھی تھی۔

☆☆☆

جب سے آئینوں نے عکس گنوائے ہیں
ہم کو شہر کے ہمت گر یاد آئے ہیں
تجھ کو کھو کر اب ایسا کیوں لگتا ہے
ہم نے یہ دکھ خود ہی گلے لگائے ہیں

اشعر سلگتی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا جبکہ وہ بڑے آرام سے اریج کا بازو تھام کر اسے اپنی فرینڈز کی طرف لے آئی تھی۔

''السلام علیکم دلہا بھائی' آپ تو تمکین کو پیارے ہو کر یوں منہ چھپائے پھر رہے ہیں جیسے شاید نادانستگی میں کوئی غلطی کر بیٹھے ہوں......''

اریشہ جو اس وقت تن تنہا تمکین کے کمرے میں بیٹھی اپنے پرسنل سیل پر کسی سے بات کر رہی تھی ایک دم سے اریج کو اندر آتے دیکھ کر صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی تو وہ وہیں ٹھٹھک کر دہلیز پر کھڑا ہو گیا۔

''او سوری......وہ کیا ہے کہ فرطِ مسرت میں مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ میں معذور ہوں اور اپنی ٹانگوں پر چلنے سے قاصر ہوں......''

تمکین دیکھ سکتی تھی کہ اریشہ یہاں آ کر خاصی بہل گئی تھی۔

شاید نہیں یقیناً وہ فرزانہ بیگم اور ماہم شاہ کے ناپسندیدہ تبصرے سن کر مسرور ہوئی تھی۔ جان بچی سو لاکھوں پائے کے مصداق وہ اس وقت خود کو خاصا ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔

''یہ......یہ سب کیا چکر ہے بھئی......؟''

شاکڈ سے اریج احمر کو شاید ابھی تک اپنی بصارتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ تبھی وہ مسکرا کر سرعت سے اٹھی پھر کمرے کا دروازہ بند کر کے قدرے دھیمی آواز میں بولی۔

''یہ سب ڈرامہ ہے اریج بھائی'' ''ڈرامہ'' سمجھتے ہیں ناں آپ؟ لوگوں کو بے وقوف بنانے کا کھیل، جسٹ آ ناٹک تو میں بھی ناٹک کر کے اپنے گھر والوں کو بے وقوف بنا رہی ہوں......''

اریج کا سر اس وقت واقعی چکرا گیا تھا۔ تاہم اس کے باوجود اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔

''لیکن کیوں......آپ کو یہ سب کرنے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی......؟''

''کرنا پڑتا ہے اریج بھائی' وہ کیا کہتے ہیں سیانے کہ عشق اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے۔'' اس کا موڈ از حد فریش تھا جبکہ اریج احمر تاحال خاصے الجھے انداز میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''میں سمجھا نہیں......''

''آپ یہ چکر کبھی سمجھ بھی نہیں سکتے' مجھے تو تمکین سے آپ کی محبت ہی مشکوک لگ رہی ہے......'' دوبدو لہجے میں جواب دیتے ہوئے اس نے جوں ہی کہا کب سے خاموش کھڑی تمکین کا ہاتھ اس کی پیٹھ پر جا پڑا۔

''شرم کرو کچھ تم ایک دن کی دلہن ہو لہٰذا ذرا ''بے بی'' بن کر رہو یہ دہشت گردی بعد میں بھی ہو سکتی ہے' اچھا......؟''

تمکین کے دھمو کے پر دہائی دیتے ہوئے اس نے کچھ ایسے شکایتی انداز میں کہا تھا کہ وہ دونوں بے ساختہ ہنس پڑے تھے۔

''سدھر جاؤ ارشی' ضائع ہو جاؤ گی میرے ہاتھوں......''

تمکین نے ہنستے ہوئے دھمکی دی تھی' جب وہ دانستہ منہ بگاڑتے ہوئے بولی۔

''چلو...... دنیا سے کوئی اچھا کام کر کے نہ جانا' خیر چھوڑ و اریج بھائی' مجھے یقین کریں آپ سے اس وقت بڑی ہمدردی محسوس ہو رہی ہے کیونکہ ہمی جیسی بلا کو سنبھالنا کسی دل گردے والے کا کام ہی ہو سکتا ہے۔''

اپنا روئے سخن موڑتے ہوئے وہ فوراً اریج کی طرف متوجہ ہو گئی تھی جو اب اپنا غم یکسر بھلائے اس کی شرارتوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

''بی بی...... آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ بندے کے پاس خاصا مضبوط دل بھی ہے اور گردے بھی' لہٰذا اپنی دوست کی طرف سے آپ بالکل بے فکر رہیں......''

دونوں بازو سینے پر باندھتے ہوئے وہ خوشگوار لہجے میں بولا تھا مگر اریشہ پھڑک اٹھی تھی۔

''بی بی...... وھاٹ بی بی...... میں بی بی نظر آتی ہوں آپ کو......؟ آخر آپ نے مجھے بی بی کہا کیسے......؟''

تمکین جانتی تھی کہ وہ اس لفظ سے بے حد چڑتی ہے' تبھی وہ ہنس ہنس کر دہری ہو رہی تھی جبکہ اریج' اس کے طرز عمل پر حیران رہ گیا تھا۔

''دیکھیے میں نے تو آپ کی تکریم کے لئے یہ لفظ کہا ہے......''

اریشہ کا سرخ تلملایا ہوا چہرہ دیکھ کر اسے وضاحت کرنی خاصی مشکل ہو رہی تھی۔

''واہ...... یہ بھی خوب کہی...... میری تکریم' زہر لگتا ہے مجھے یہ لفظ' توہین محسوس ہوتی ہے اپنی جب مجھے کوئی بی بی کہتا ہے' جایئے میں نہیں بولتی آپ سے......''

تمکین کی ہدایت کے مطابق اسے اریج کا ذہن ہٹانا تھا اور بے شک وہ اس میں خوب کامیاب ہو رہی تھی۔

رات میں کافی دیر سے ولیمے کا فنکشن ختم ہوا تو تمکین نے سکون کی سانس لی۔

اریج کا بخار اب بھی کم نہیں ہوا تھا۔

سرخ سرخ غلافی نگاہیں بری طرح جل رہی تھیں۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے ان کے فیملی ڈاکٹر وقار رانا صاحب اس کا تفصیلی چیک اپ کر کے گئے تھے۔ گھر کے دیگر افراد بھی دیر تک اس کے پاس بیٹھے رہے تھے۔ رخسانہ بیگم کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس کے سرہانے بیٹھ کر ساری رات بتا دیں۔ اریج نے بڑی مشکل سے انہیں مطمئن کر کے سونے کے لئے کمرے میں بھیجا تھا۔ سعید صاحب بھی اس کی بیماری پر خاصے متفکر دکھائی دے رہے تھے۔

بہر حال رات گئے تک اسے تنہائی میسر آئی۔ تو سوچوں میں سوائے درد کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔

مختلف سوچیں اس کا ذہن الجھا رہی تھیں۔ ایک دم سے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر' کہیں دور چلے جانے کی خواہش اس وقت اسے بے حال کر رہی تھی۔ اپنی مما اور تمکین کی خوشی کے لئے وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ کچھ بھی...... لہٰذا ابھی وہ انہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ تمکین اس کے لئے دودھ گرم کر کے لے آئی۔

''اریج...... سونے سے پہلے پلیز یہ دوا کھالیں......''

اس لمحے اس کی آواز نے جیسے اسے کسی گہری کھائی سے اچانک باہر نکالا تھا۔ لائٹ گرے کلر کے سادہ سے سوٹ میں ملبوس' میک اپ سے بے نیاز چہرے کے باوجود وہ آنکھوں کے راستے سیدھی دل میں اتر رہی تھی' تب صرف ایک لمحے کے لئے اس کا ضبط ٹوٹا تھا اور اس نے اپنے شوریدہ جذبات کے تابع ہوتے ہوئے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر اس کا ریشمی آنچل تھام لیا تھا۔ تمکین اس کی اس ''جسارت'' پر قدرے حیرانگی سے اس کی طرف دیکھتی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

''یہ سائلہ خان کون ہے......؟''

ازمیر شاہ کی گفتگو میں پہلی بار کسی تیسری لڑکی کا نام سن کر وہ چونکی تھی۔

''سائلہ فیانسی ہے میری......''

بے تاثر لہجے میں ازمیر نے اسے بتایا تھا۔

''اور اس کا مطلب ہے اریشہ کے منگنی کرواتے ہی' تم بھی فوراً ایک ہو گئے۔''

''ایسی بات نہیں ہے زینی' کاش میں تمہیں بتا سکتا کہ اس کے سوا اب مجھے کسی لڑکی کی رفاقت کی طلب نہیں رہی' حالانکہ وہ اریشہ کے مقابلے میں زیادہ حسین ہے پھر محبت بھی کرتی ہے مجھ سے' عادات بھی اچھی ہیں اس کی' لیکن...... یہ معاملات محبت واقعی بڑے عجیب ہوتے ہیں شہزین' تم نہیں جانتیں' میری وجہ سے وہ شاہ ولاج میں کتنی بدنام ہو رہی تھی' سب اسے مجھ سے ہمدردی جتانے کے جرم میں ڈپٹنے لگے تھے۔ اس کے صاف ستھرے کردار پر شک کرنے لگے تھے۔ اب تم ہی بتاؤ' اگر میں اپنے حوصلے ہار دیتا تو کیا میرے گھر والوں کے ساتھ ساتھ دیگر لوگوں کو بھی ہمارے تعلق پر جو شک تھا وہ یقین میں نہ بدل جاتا؟ میں اس کی بہت عزت کرتا ہوں زینی' بہت زیادہ......''

ازمیر شاہ کے لہجے میں اداسیاں گھلی ہوئی تھیں۔ تبھی شہزین نے پوچھا تھا۔

''کیا اسے کھو کر تم خوش ہو مانی......''

شہزین خان کا یہ سوال اس کے لئے قدرے تکلیف کا باعث بنا ہوا تھا لہٰذا لب بھینچ کر اس کی طرف سے رخ پھیرتے ہوئے بمشکل وہ کہہ پایا تھا۔

''پتہ نہیں......''

''او کے...... لیکن کیا وہ تم سے بچھڑ کر خوش ہے......؟''

آئی ڈونٹ نو......''

''اچھا سائرہ کو تم دونوں کے رشتے سے متعلق کچھ خبر ہے......؟''

''نہیں...... جہاں تک میرا خیال ہے۔ ہمارے بیچ ایسا کوئی تعلق نہیں بنا تھا کہ لوگوں کی نظروں میں آتا' بس دلوں کی کہانی تھی' دلوں میں ہی دفن رہ گئی' لوگ تو ایک طرف اس پاگل لڑکی کو بھی نہیں معلوم کہ میں اپنے دل میں اس کے لئے کیا فیلنگز رکھتا ہوں......؟''

ازمیر شاہ کا لہجہ اب بھی مدہم تھا۔ ایک عجیب سی ٹوٹ پھوٹ ہو رہی تھی اس وقت اس کے اندر۔

''ازمیر...... کیا اب یہاں لندن آنے کے بعد اس نے تم سے کوئی رابطہ کیا......؟''

''ہاں...... ابھی کچھ روز پہلے ای۔میل کیا تھا اس نے لکھا تھا کہ گھر والے جلد ہی اس کی شادی ارینج کر رہے ہیں' بہت ڈسٹرب لگ رہی تھی' مجھے اپنی شادی میں شامل ہونے کی دعوت بھی دے رہی تھی' پاگل لڑکی...... اسے معلوم ہی نہیں ہے کہ میں اس کی رخصتی کا وہ جان لیوا منظر دیکھنے سے پہلے ہی مر جاؤں گا لیکن...... شاید وہ ایسا ہی تو چاہتی ہے' مجھے روتے ہوئے ہی تو دیکھنا چاہتی ہے وہ......''

ایک مرتبہ اس کی آنکھیں پھر آنسوؤں سے بھر آئی تھیں۔

مدہم گمبھیر لہجہ بھی خاصا بھاری ہو رہا تھا۔ شہزرین کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کا دکھ کیسے بٹائے؟

''ازمیر! کیا تمہیں نہیں لگتا کہ تم اپنے اور اس کے ساتھ زیادتی کر رہے ہو......؟''

''زیادتی کیسی......؟ وہ خوب صورت ہے' اسے اپنے جیسا خوب صورت ہم سفر ہی ملنا چاہئے......''

''لیکن...... محبت میں خوب صورتی شرط نہیں ہے۔''

اب کے شہزرین خان' دبی دبی آواز میں چلائی تھی۔

''میری مثال تمہارے سامنے ہے' اگر...... محبت میں خوب صورتی شرط ہوتی تو تفسیر عباس مجھے کبھی بے مول نہ کرتا......''

ناچاہتے ہوئے بھی اس کی آواز بھر آئی تھی۔

''وہ تمہیں چاہتی ہے مانی' اس کے لئے تم سے بڑھ کر خوب صورت اور کوئی نہیں' تم کیوں نہیں سمجھتے کہ خوب صورتی صرف دیکھنے والی آنکھ میں ہوتی ہے' چہرے پر نہیں......''

''لیکن پھر بھی میں خود کو اس کے قابل نہیں سمجھتا' وہ جیسی خود ہے اسے ویسا ہی ہمسفر ملنا چاہئے......'' اس کی اب بھی وہی منطق تھی۔ تبھی شہزرین خان قدرے دل جلے لہجے میں بولی تھی۔

''اچھا...... اور اس کے بعد اگر وہ اس کے محسوسات کو سمجھ نہ سکے۔ اس کی قدر نہ کر سکے' اسے محبوب جیسا پیار نہ دے سکے تو......؟''

''میں اس چکر میں نہیں پڑنا چاہتا زینی' میں بس اتنا جانتا ہوں کہ وہ اب اذہان کی امانت ہے لہٰذا میرے لئے اب اس کے متعلق سوچنا بھی

گناہ کے مترادف ہے......''

''او کے......اس کا مطلب ہے کہ ان دنوں تم اسے بھلانے کے چکر میں ہو اور شاید یہی وجہ تمہیں پاکستان سے یہاں انگلینڈ میں کھینچ لائی ہے لیکن میری ایک بات کان کھول کر سن لو ازمیر' جو لوگ ایک بار دل میں بس جائیں انہیں پھر چاہ کر بھی دل سے نکالا نہیں جاتا......''

شہرین خان کے الفاظ نے ایک مرتبہ پھر اسے گہرے دکھ سے دوچار کیا تھا۔ مگر اس بار وہ بس پلکیں موندے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے خاموش بیٹھا رہا تھا۔

''پتہ ہے زینی' جب میں لندن آ رہا تھا تو اس نے مجھے روک کر کپکپاتے لہجے میں کیا کہا تھا......'' کچھ دیر کے بعد یونہی پلکیں موندے موندے وہ اس سے مخاطب ہو کر بولا تھا۔

شہرین خان اس بار چپ چاپ خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی تھی۔ تبھی وہ کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد قدرے دھیمے لہجے میں بولا تھا۔

''عجیب پاگل لڑکی ہے وہ' کچھ سمجھتی ہی نہیں' کبھی تمہیں لے کر دکھی ہو جاتی ہے تو کبھی سائکہ کو لے کر' پتہ ہے زینی' وقت رخصت وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی' تمہیں میں کبھی خوبصورت کیوں نہیں لگتی ازمیر' کبھی مجھ سے محبت کیوں نہیں ہوتی تمہیں......؟''

آپ ہی آپ کہتے ہوئے وہ ہنس پڑا تھا۔

''تم پچھتاؤ گے ازمیر' میرا دل کہتا ہے کہ تم اسے کھو کر پچھتاؤ گے......''

اس بار شہرین خان کے خفا خفا سے لہجے پر اس نے فوراً اپنی آنکھیں کھول دی تھیں۔

''بددعا دے رہی ہو......؟''

''نہیں......سمجھانے کی بیکار کوشش کر رہی ہوں' ایک پتھر سے سر پھوڑ رہی ہوں اپنا......''

ازمیر شاہ اس لمحے خود کو کھلکھلا کر ہنسنے سے باز نہیں رکھ پایا تھا۔

''او کے' میرے خیال سے کافی وقت ہو گیا ہے' ابھی اجازت دو' انشاءاللہ جلد ہی دوبارہ ملاقات ہو گی......''

یکلخت ہی اپنی ریسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے اس نے گفتگو کا سلسلہ سمیٹا اور اس سے اجازت لے کر گھر واپس چلا آیا۔

☆☆☆

میں اکثر سوچتی ہوں کہ......

فلک کی وسعتوں میں بسنے والے یہ ستارے کیوں سسکتے ہیں؟

ہوا کیوں درد سے لبریز نوحے گنگناتی ہے؟

میرے پیڑوں کی قسمت میں یہ کس نے دکھ بھری خاموشیوں کا رزق لکھا ہے؟

گلوں کی تتلیوں کی شوخیوں کا کون...... قاتل ہے؟

یہ کس نے بہتے دریا کے لبوں کو پیاس بخشی ہے؟

سنو! اس کائناتی حسن و فطرت کو اداسی کی ردائیں بخشنے والے

کہاں کے ہیں؟

میرے اندر سے اک آواز اٹھتی ہے

کوئی چپکے سے سرگوشی کی صورت بولتا ہے

انوکھا لاڈلہ انسان باعث ہے

جہاں کے اس خرابے کا

یہ ظالم اس خدا کے خلق کردہ خود میں اتنا گم ہوا ہے کہ

''خدا کو بھول بیٹھا ہے''

وہ اب بھی چوکھٹ میں کھڑی سامنے صحن کے نظارے کو دیکھ رہی تھی۔

حیرانی سی حیرانی تھی۔

چھوٹے سے صحن کے وسط میں پیڑھے پر بیٹھی سیال بیگم اب اس کی حیرانگی پر قدرے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

احمد رؤف صاحب اور عدنان کی نگاہیں بھی فوراً اس کے طواف کے لئے اٹھی تھیں۔

تب اس نے آہستہ سے اپنے قدم مزید آگے بڑھائے تھے۔نظر کے سامنے اس وقت قطعی ناقابل یقین قسم کا نظارہ تھا۔

قدرے خشک موسم کے باوجود باہر صحن میں چولہے کے پاس بیٹھی سیال بیگم خوشی خوشی رات کا کھانا تیار کر رہی تھیں جبکہ ان کے قریب ہی چٹائی پر بیٹھے احمد رؤف صاحب اور عدنان بڑی رغبت سے گرم گرم پھلکوں اور دال کے ساتھ انصاف کر رہے تھے۔

شاید نہیں یقیناً' بہت سالوں کے بعد اسے یہ نظارہ دیکھنے کو ملا تھا۔ بہت پہلے اس کی دادی ماں اور پھر اس کی مما فائزہ بیگم یوں سادگی سے کھانا تیار کرتی تھیں اور گھر کے سب لوگ نیچے زمین پر چٹائی بچھا کر ان کے قریب ہی گرم گرم کھانے سے خوب انصاف کرتے رہتے تھے۔

سیال بیگم چونکہ امیر گھرانے سے آئی تھیں لہٰذا انہوں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی زمین پر بیٹھ کر کھانا نہیں کھایا تھا۔

کھانا بنانے سے تو ویسے بھی ان کا دور کا تعلق بھی نہیں تھا۔

کبھی کبھار موڈ میں ہوتیں تو صرف عدنان کی فرمائش پر کوئی ایک قیمتی سی ڈش تیار کر لیتی تھیں ورنہ زیادہ تر یہ کام آج تک باورچی ہی سر انجام دیتا آیا تھا۔

از حد حیرانگی اسے عدنان پر بھی ہو رہی تھی۔ جو نہ صرف اپنے بستر سے نکل آیا تھا بلکہ اب بخار اور تکلیف کے باوجود وہاں بیٹھا کتنی رغبت کے ساتھ کھانے سے انصاف کر رہا تھا۔ تبھی شاید وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

''یہ سب...... کیا ہے آنٹی......؟''

''سرپرائز...... میں نے سوچا' میری بیٹی آج تھکی ہاری گھر واپس آئے گی لہٰذا اسے فریش کرنے کے لئے چھوٹا سا سرپرائز دے دوں......''

موسم کی طرح ان کا لہجہ بھی خاصا خوشگوار تھا لہٰذا وہ منہ ہاتھ دھو کر وہیں بیٹھ گئی تھی۔

''اٹس ویری امیزنگ آنٹی' یقین کیجئے مجھے یہ سب بہت اچھا لگ رہا ہے......''

وہ اس وقت واقعی دل سے بے حد خوش تھی۔ مگر عدنان اس لمحے اس پر چوٹ کرنے سے باز نہیں آیا تھا۔

''شرم کرو کچھ' تم جیسی بے حس اور خود غرض لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی......''

''آں' لیکن میں نے کیا کیا ہے......؟''

نوالہ منہ تک لے جاتے ہوئے وہ از حد حیران ہو کر اس کی طرف پلٹی تھی۔ احمد رؤف صاحب اور سیال بیگم بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ جواب لبوں پر دھیمی سی مسکان پھیلائے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''امی تمہاری بزرگ ہیں' بجائے اسکے کہ تم انہیں کام کرنے سے روکو' الٹا انکے کام کرنے پر خوش ہو رہی ہو' شرم تو نہیں آتی تمہیں' ہے ناں''

پہلی بار وہ انجشاء کے ساتھ ایسے انداز میں مخاطب ہوا تھا لہٰذا وہ چند لمحوں تک تو ٹھٹک کر اس کا چہرہ ہی دیکھتی رہی تھی جبکہ احمد رؤف صاحب اور سیال بیگم اب مسکرا رہے تھے۔

''شرم میں نے کسی کو ادھار دی ہوئی ہے اور ویسے بھی یہ میرا اور آنٹی کا پرسنل معاملہ ہے' تمہیں یہاں درمیان میں ٹانگ اڑانے کی اجازت کسی نے نہیں دی......''

اس کا انداز کچھ ایسا تپا ہوا تھا کہ بے ساختہ ہی عدنان کے ساتھ ساتھ' سیال بیگم اور احمد رؤف صاحب بھی کھلکھلا کر ہنس پڑے تھے۔

''دیکھا پاپا...... کیسے کتر کتر بولتی ہے یہ' اوپر سے آپ کہتے ہیں معصوم ہیں......''

''چلو میں معصوم نہ سہی' لیکن تم بے وقوف ضرور ہو' پتہ ہے سیال آنٹی' جناب نے اپنے آفس میں سارے کے سارے بے ایمان لوگوں کو بھرتی کیا ہوا ہے' منیجر سے لے کر چپڑاسی تک کوئی بھی ان کے ساتھ مخلص نہیں ہے......''

بات سے بات نکلی تھی' مگر عدنان کے مسکراتے لب فوراً سمٹ گئے تھے۔

''یہاں سردی بڑھ رہی ہے مما! میں اب اپنے کمرے میں چلوں گا......''

وہ کھانا کھا چکا تھا۔ تب ہی قدرے اداسی سے بولا تو انجشاء کو بے ساختہ ڈھیر ساری ندامت نے گھیر لیا پھر جس وقت وہ کھانے سے فارغ

ہو کر اسے کمرے میں اس کے بستر تک لائی۔ عدنان نے چپکے سے اس کے آنچل کا پلو اپنی گرفت میں لے لیا۔

''یہاں سے واپس کب جا رہی ہو تم......؟''

خوب صورت نگاہوں میں اس سے سوائے خشونت کے اور کچھ بھی نہیں تھا...... تبھی وہ ڈول گئی تھی۔

''تم یہ سوال کیوں کر رہے ہو......؟''

''مجھے صرف اپنے سوال کا جواب چاہئے۔ انجو' کیوں' کس سے کب مت پوچھو تم......''

وہ اس لمحے از حد بیزار دکھائی دے رہا تھا' تاہم انجشاء اب خود کو سنبھال چکی تھی لہٰذا پُرسکون لہجے میں بولی۔

''میں یہاں سے کہیں نہیں جا رہی' کم از کم تمہارے مکمل تندرست ہونے تک تو بالکل نہیں......؟''

''میرے تندرست ہونے کے بعد چلی جاؤ گی......؟''

کیسی عجیب سی حسرتیں گھل رہی تھیں اس لمحے اس کے لہجے میں انجشاء بس یک ٹک سنجیدگی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتی رہ گئی تھی۔

مسافر تو بچھڑتے ہیں رفاقت کب بدلتی ہے
محبت زندہ رہتی ہے' محبت کم بدلتی ہے
تمہی کو چاہتے ہیں اور تمہی سے پیار کرتے ہیں
یہ ہے برسوں کی عادت اور عادت کب بدلتی ہے

شام ہی شام ہے
آنسوؤں کا چھلکتا ہوا جام ہے
شام ہی شام ہے
اپنے بہتے ہوئے آنسوؤں کی قسم
ان گزرتے ہوئے موسموں کی قسم
زندگی کا سفر اب تیرے نام ہے
شام ہی شام ہے
اک تیری یاد ہے
اک تیرا نام ہے
شام غم بھی تو تیرا ہی انعام ہے
شام ہی شام ہے
زندگی کا سفر اب تیرے نام ہے

اگلی صبح نورینہ بیگم کی آنکھ کھلی' تو وہ خاصی لیٹ ہو چکی تھیں۔
ان کے سب ہی گھر والے اریشہ سے ملنے ہسپتال روانہ ہو گئے تھے جو چاولا کی سے تمکین کی شادی کا فنکشن اٹینڈ کر کے فرحان کی ہدایت پر رات ہی دوبارہ ہسپتال آ گئی تھی۔
اب تک جتنے سال بھی نورینہ بیگم نے ''شاہ ولاج'' میں گزارے تھے بلاشبہ آج پہلی بار وہ اتنی گہری پرسکون نیند سوئی تھیں حالانکہ انہیں اجنبی جگہ پر نیند نہیں آتی تھی۔ بہت کم وہ شاہ ولاج سے کہیں باہر نکلتی تھیں مگر نیند انہیں اپنے بستر پر ہی آتی تھی۔ آج سالوں بعد جو معجزہ ہوا تھا۔ وہ اس

پر خود بھی ازحد حیران تھیں۔

اسی حیرانی کے حصار میں اپنے بستر سے نکل کر وہ واش روم کی طرف بڑھی تھیں۔ اگلے بیس پچیس منٹ میں اچھی طرح فریش ہونے کے بعد وہ باہر وسیع لاؤنج میں آئیں تو شہریار صاحب ٹی وی کے سامنے بیٹھے نیوز دیکھنے میں مگن دکھائی دیئے تھے۔

بے شک پچھلے پندرہ سال انہیں چھوئے بغیر گزر گئے تھے۔

وہ آج بھی اتنے ہی سمارٹ' گڈ لوکنگ اور ینگ تھے۔

نورینہ بیگم بے ساختگی کے عالم میں چور نگاہوں سے کچھ لمحوں تک ان کی طرف دیکھتی رہی تھیں تب ہی وہ ان کی چوری پکڑتے ہوئے اچانک مسکرا کر ان کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

''السلام علیکم! صبح بخیر۔''

ان کے شوخ لہجے پر وہ خود کو کوستی' خاموشی سے قریبی صوفے پر ٹک گئی تھیں۔

''سب گھر والے کہاں ہیں......؟''

خاموش نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کچھ لمحوں کے بعد انہوں نے پوچھا تھا تب وہ زیر لب مسکرا کر بغور ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

''بری بات نور! کوئی سلام کرے تو اس کا جواب دینا ایک مسلمان پر واجب ہے۔''

''وعلیکم السلام۔''

فوراً جیسے مگر لٹھ مار لہجے میں کہتے ہوئے انہوں نے نگاہیں پھیر لی تھیں۔

''پہلے سے بہت کمزور ہوگئی ہو نور! اپنا خیال ٹھیک سے نہیں رکھتی ناں۔''

وہی پندرہ سال پہلے والا ان کا متفکر انداز۔

نورینہ بیگم نے اس لمحے بڑی مشکل سے اپنی پلکوں کو بھیگنے سے روکا تھا۔

''اتنی خاموش کیوں رہنے لگی ہو؟ بقول تمہارے تم محبت کو روگ بنا کر جینے والوں میں سے نہیں ہو پھر یہ اداسی......؟''

انہیں مسلسل خاموش پا کر وہ خود ہی بولے جا رہے تھے مگر اس بار نورینہ بیگم خاموش نہیں رہ سکی تھیں۔

''مجھے آپ کی محبت میں بے وفائی کا قطعی کوئی غم نہیں سنا آپ نے......؟''

خوب صورت چہرے پر چھلکتی غصے کی سرخی شہریار صاحب کو خاصا لطف دے گئی تھی۔ تب ہی وہ مسکرا کر بولے تھے۔

''ہاں...... یہ تو آپ کے چہرے سے صاف نظر آ رہا ہے۔''

کچھ پل دونوں کے درمیان خاموشی رہی لیکن پھر اس خاموشی کا گلا بھی شہریار صاحب نے ہی گھونٹا تھا۔

''آپ کہیں تو ناشتہ لگوا دوں کیونکہ ابھی تک میں بھی آپ کے انتظار میں بھوکا بیٹھا ہوں۔ رات بھی خوشی کے مارے بھوک مرگئی تھی۔''

وہ ان کی ''خوشی'' کا مفہوم خوب اچھی طرح سمجھتی تھیں لہٰذا فوراً ناراضی سے بولیں۔

''مجھے آپ کے خوش ہونے یا بھوکے رہنے سے کوئی مطلب نہیں ہے اور نہ ہی میں یہاں آپ کے یہ فضول قصیدے سننے کے لئے آئی ہوں۔''

''تمہیں مطلب ہے کس سے نور......؟'' اس بار ان کا لہجہ بجھ گیا تھا۔ خوب صورت سیاہ آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی تھی مگر نورینہ بیگم کو اس سے دلچسپی نہیں تھی۔ لہٰذا اس بار وہ قطعی خاموش بیٹھی رہیں۔

''عبدالقیوم جلدی سے بیگم صاحبہ کے لئے چائے لے کر آؤ۔''

اسے خاموش بیٹھے دیکھ کر انہوں نے بلند آواز میں اپنے باورچی کو حکم دیا تھا جواب میں فوراً ہی گرما گرم چائے کے دو کپ حاضر ہو گئے تھے۔

''لو چائے پیو نور! میرے لئے نہ سہی اپنے بچوں کی خوشی کے لئے ہی پی لو پلیز.....''

وہ کہ جن سے چند لمحوں کی ملاقات کے لئے بھی بڑے بڑے لوگ ترستے رہتے تھے۔ بزنس کی دنیا میں جن کا نام ہمیشہ فخر سے لیا جاتا تھا وہ ساری دنیا کو اپنے سامنے جھکانے والے صرف اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہمیشہ ہی اس ہستی کے سامنے کمزور پڑ جاتے تھے جو آج بھی ان کے دل و دماغ، یادوں اور سوچوں میں اپنے پورے رعب اور شان کے ساتھ براجمان تھیں۔

''تمہیں پتہ ہے نور! پورے پندرہ سال کے بعد تمہیں اس گھر میں اپنے مقابل بیٹھے دیکھ کر مجھے یہ احساس ہو رہا ہے جیسے میں بھی زندہ ہوں۔ سانسیں ابھی مجھ سے روٹھی نہیں ہیں جیسے وقت اب بھی میری مٹھی میں ہے۔ سچ کہتا ہوں نور۔ پورے پندرہ سال کے بعد مجھے یہ کائنات رنگین دکھائی دے رہی ہے۔ اڑتے پنچھی، چلتی ہوائیں، کھلتے پھول اور بدلتے موسم مجھے یہ احساس دلا رہے ہیں کہ کائنات کا حسن ابھی باقی ہے ابھی نظام قدرت چل رہا ہے ورنہ تم سے بچھڑنے کے بعد تو لگتا تھا جیسے میرے ساتھ ساتھ یہ کائناتی نظام بھی فنا ہو کر رہ گیا ہے۔''

وہ ابھی جانے اور کیا کہہ رہے تھے مگر نورینہ بیگم مزید ضبط کا یارا نہ رکھتے ہوئے ایک جھٹکے سے وہاں سے اٹھ آئی تھیں۔

☆☆☆

صدائیں میری، سمندروں کا سکوت میرا

سفینے میرے، یہ ساحلوں کی ہوائیں میری

فلک پہ منڈلاتی بادلوں کی گھرتی گھٹائیں میری

یہ خواب میرے

بکھرتے کھلتے گلاب میرے

اداس چہروں کے ہجر کے سب عذاب میرے

گمان میرا، یقین کی سرزمین میری

یہ فکرِ فردا کا نیلگوں آسمان میرا

میں آبِ گل ہوں یہ آبِ گل کا جہاں میرا

جو کھو گئے ہیں

جو سو گئے ہیں تمام میرے

چمن بھی میرا، قفس بھی میرا

یہ دام میرے

جہاں میں جتنے غم و خوشی کے گزر گئے

سب مقام میرے

باہر لان کے قریب برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی وہ کرامت بخاری کی یہ نظم دہرا رہی تھی جب کہ اس کا ذہن جیسے سن ہو کر رہ گیا تھا۔

اب تک جو کچھ بھی اس کے ساتھ ہوا تھا وہ قطعی سمجھ نہیں سکی تھی۔ بچپن سے لے کر جوانی تک اس نے محض ایک ہی خواب دیکھا تھا۔ اشعر کی رفاقت کا خواب۔ اس کی زندگی کا ایک ہی مقصد تھا۔ اشعر احمد کو خوش رکھنا، اس پر اپنی بے لوث محبتیں نچھاور کرنا اور بدلے میں اس کی بے تحاشا محبتیں سمیٹنا۔

اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ کبھی حالات کی آندھی ایسے رخ بھی چلے گی جس پر اس کا اشعر اس سے بچھڑ جائے گا۔ دوسروں کی باتوں میں آکر اسے گنہگار ٹھہرا دے گا۔ ایک سیکنڈ سے قبل جذبات اور اشتعال کا شکار ہو کر اس کے ماتھے پر طلاق کا کلنک لگا دے گا۔ اسے سب کے درمیان رسوا کر کے رکھ دے گا۔

اس کی محبت، مان اور خلوص کو اپنے جھوٹے شک کی بھینٹ چڑھا دے گا۔ ایسا کچھ بھی نہیں سوچا تھا اس نے مگر...... پھر بھی یہ سب کچھ ہو کر رہ گیا تھا۔

پچھلے سات ماہ سے جیسے وہ خود کو سمیٹے ہوئے تھی۔ صرف اسی کا دل جانتا تھا۔ خود اپنی ہی لاش پر بین کرنا کیسا لگتا ہے وہ بخوبی محسوس کر سکتی تھی۔

اشعر کو کھونے کے بعد اس کی زندگی میں جینے کا کوئی مقصد باقی نہیں رہا تھا۔

عدت کے سوا چار ماہ اس نے اپنی موت پر آنسو بہاتے ہوئے بسر کیے تھے۔ اشعر کو کبھی اندازہ ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ اسے کتنا ٹوٹ

کر چاہتی ہے۔

اس کے جذبات' احساسات وہ آج تک کبھی سمجھ ہی نہیں پایا تھا۔

کبھی کبھی اسے لگتا تھا جیسے اس کا وجود اشعر احمد کے لئے محض اک کھلونا ہو جسے ہاتھ بڑھا کر جب چاہا اس نے اپنے قریب کر لیا اور پھر جب دل چاہا توڑ کر پھینک دیا۔

زندگی میں پہلی بار اسے اشعر احمد سے اپنی محبت پر افسوس ہوا تھا۔ پچھلے سات ماہ سے وہ صرف اپنے گھر والوں کے لئے ہنس ہنس کر جی رہی تھی کیونکہ اشعر سے اس کی طلاق کے بعد اس کے پیارے پاپا بستر سے لگ کر رہ گئے تھے۔ ان کے کندھے ایک دم سے جھک گئے تھے۔

پورے ''حسن ولاج'' میں جیسے سناٹوں کا راج ہو گیا۔ ہر فرد اپنے آپ میں سمٹ کر رہ گیا تھا۔ کتنی ہی بار وہ اپنی ماں کو چھپ چھپ کر روتے ہوئے دیکھ چکی تھی۔ یہ سب دیکھنے اور محسوس کرنے کے بعد ہی اس نے خود پر سے غم کا لبادہ اتار پھینکا تھا۔

اشعر کو یہ جتانے کے لئے کہ وہ اس کی بے وفائی کو روگ بنا کر جینے والوں میں سے نہیں ہے۔ اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ بات بے بات مسکرانا سیکھ لیا تھا۔ سلگتی آنکھوں کے آنسو پیچھے دھکیل کر وہ پھر سے اپنی پرانی روٹین میں واپس لوٹ آئی تھی مگر اس تمام جدوجہد میں وہ تمکین رضا بے موت مر گئی تھی جسے اشعر احمد سے بچھڑنے کا شدید دکھ تھا۔

وہ اسے کھو دینے کے احساس سے' لمحہ بہ لمحہ بکھر رہی تھی۔

عظیم نقصان کے بعد خود کو سنبھال کر جینا شاید اتنا دشوار بھی نہیں ہوتا جتنا وہ سمجھ رہی تھی اور اب...... جب کہ وہ واقعی خود میں مگن ہو گئی تھی۔ قدرت نے اسے ایک نئی آزمائش میں مبتلا کر دیا تھا۔

وہ کسی صورت اریج احمر کی زندگی کا حصہ بننا نہیں چاہتی تھی۔ اپنے خالی وجود کو وہ اب کسی مرد کے قابل بھی نہیں سمجھتی تھی مگر......اب کے رخسانہ بیگم کے آنسوؤں نے' اس کے ارادے کمزور کر دیے تھے۔ اشعر اور اریج کے مابین جو ڈیل ہوئی تھی اس کے بعد اس کا وجود جیسے تنکا تنکا ہو کر فضا میں بکھر گیا تھا۔

خود اپنے آپ سے اسے گھن آنے لگی تھی۔ کسی کو بھی تو اس کی مرضی' اس کی خوشی' اس کے جذبات کا احساس نہیں رہا تھا۔ مروتاً بھی کسی نے یہ پوچھنے کی زحمت گوارہ نہیں کی تھی کہ وہ کیا چاہتی ہے؟ فٹ بال کی طرح وہ کبھی اشعر کی ٹھوکروں میں آ رہی تھی تو کبھی اریج کی۔ اپنے آپ کو بہت سنبھالتے سنبھالتے بھی وہ آج جیسے سارا ضبط ہار بیٹھی تھی۔

رات اس کے اور اریج کے مابین جو کچھ ہوا تھا۔ وہ آسانی سے بھلائے جانے کے قابل نہیں تھا حالانکہ اس نے اپنے آپ کو بچانے کی بہت کوشش کی تھی مگر......ایک مرتبہ پھر وہ ہار گئی تھی۔

اریج احمر کے شوریدہ جذبات نے اسے ہرا ڈالا تھا۔

سارے بھرم جیسے چند لمحوں میں زمین بوس ہو کر رہ گئے تھے۔

گرم گرم آنسوؤں کا قافلہ جو روانہ ہوا تو پھر جیسے قطاریں لگ گئیں۔ بے شک اس کے اور اریج کے مابین جو کچھ بھی ہوا تھا وہ ایسا نہیں چاہتی تھی۔

اریج نے یہ سب دانستہ کیا تھا یا غیر دانستہ اسے خبر نہیں تھی مگر اسے...... یوں محض ایک غرض کے لئے پامال ہونا' اسے اندر سے توڑ چھوڑ گیا تھا۔ ابھی اتنی جلدی وہ دوبارہ کسی سانحے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی مگر ایسا ہو گیا تھا۔

اس کے اندر کی تپش اتنی بڑھ گئی تھی کہ باہر کا سرد ٹھٹھرتا موسم بھی اسے اپنا احساس نہیں دلا سکا تھا۔ تب ہی اس نے اپنے پیچھے بھاری بوٹوں کی چاپ سنی تھی۔

''سردی خاصی بڑھ رہی ہے تمکین! بہتر ہو گا اس وقت آپ یہاں سے اٹھ کر اندر کمرے میں چلی جائیں۔''

اس کے لہجے سے بالکل پتہ نہیں لگ رہا تھا کہ اس وقت اس کے احساسات کیا ہیں؟ تمکین نے صرف ایک لمحے کے لئے نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا جو بلیک تھری پیس سوٹ میں بِک سِک سا تیار کھڑا جانے کہاں جانے کو پر تول رہا تھا۔

وہ اسے روکنا چاہتی تھی کیونکہ وہ اب بھی تیز بخار کے حصار میں تھا لیکن اس وقت وہ اسے روکنے کی پوزیشن میں نہیں تھی لہٰذا اس کی ہدایت پر چپ چاپ سر جھکائے اندر کمرے میں چلی گئی۔

☆☆☆

شجر نہ بیچ کوئی سائبان رہنے دے
گئے زمانے کا کوئی نشان رہنے دے
تجھے نہیں ہے ضرورت تو کیوں گراتا ہے
میرے لئے تو میرا آستان رہنے دے
بسی ہوئی ہیں جو کب سے بستیاں نہ اجاڑ
یہ خواہشوں کی نمو کے نشان رہنے دے
تیرا تو تیر بھی بھاری ہے اس پرندے سے
نہ کھینچ زور سے اتنی کمان رہنے دے
خمار آخرِ شب کا مزاج جو بھی ہو
دل و دماغ کو اس کا دھیان رہنے دے
میں اب کی بار کسی سے مدد نہ مانگوں گا
بھنور کے رخ پہ میرا بادبان رہنے دے

کمرے میں ملگجا سا اندھیرا بکھرا ہوا تھا جب کہ وہ بڑے سکون سے پلکیں موندے، سر کرسی کی پشت سے ٹکائے مغنیہ کے لفظوں کے سحر میں کھویا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

انجشاء نے آگے بڑھ کر لائٹ آن کی تو اس کی سرخ سرخ سی خمار آلود نگاہیں فوراً کھل گئیں۔

''کمرے میں اندھیرا کیے کیوں بیٹھے ہو عدی......؟ دیکھو باہر موسم کتنا پیارا ہو رہا ہے چلو باہر لان میں چلتے ہیں۔''

اس کا انداز انتہائی دوستانہ تھا مگر عدنان نے سنی ان سنی کرتے ہوئے پھر سے پلکیں موند لیں۔

''میں تم سے کچھ کہہ رہی ہوں عدنان۔''

اس بار وہ اچھی خاصی زچ ہوئی تھی مگر عدنان اسے مزید تنگ کرنے کی غرض سے اس بار بھی خاموش بیٹھا رہا۔

''تم بہرے ہو گئے ہو یا جان بوجھ کر مجھے نظر انداز کر رہے ہو......؟''

شدید چڑتے ہوئے اس بار وہ عدنان کو جھنجھوڑ بیٹھی تھی۔ جواب میں وہ فوراً آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''ہاں بولو کیا تکلیف ہے، میں سن رہا ہوں......؟''

''مجھے کوئی تکلیف نہیں لیکن تمہارے ساتھ لگتا ہے ضرور کوئی مسئلہ ہے جو سارا جوش اور پیار جو میرے لئے تھا وہ صابن کی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا ہے۔''

اس بار اس کے شدید تپے ہوئے لہجے پر وہ دل کھول کر ہنس پڑا تھا۔

''بس کرو، بتیسی نکل کر زمین پر گر پڑے گی۔''

وہ ہنستے ہوئے اتنا حسین لگتا تھا کہ انجشا فوراً نگاہ چرانے پر مجبور ہو گئی۔

''اف انجو! پتہ نہیں کیا بنے گا تمہارا......؟قسم سے میں تو اب تم سے ڈرنے لگا ہوں۔ بیوی کم اور تھانے دارنی زیادہ لگتی ہو۔''

وہ اس کے الفاظ پر مسکرانا چاہتی تھی لیکن صرف اسے رعب دکھانے کے لئے گھورتے ہوئے بولی۔

''یہ بیوی کسے کہا ہے تم نے......؟میں تمہاری بیوی نہیں ہوں۔''

''چلو بیوی نہ سہی منکوحہ تو ہو۔''

وہ بھی کہاں چپ رہنے والا تھا تاہم اس بار انجشاء نے فوراً بات بدل دی تھی۔ ابھی دل کو اس نہج پر سوچنے کے لئے اسے وقت دینا تھا۔ ابھی اسے اپنی دھڑکنوں کو اس کی سرگوشیوں پر دھڑکنا سکھانا تھا۔

اسے بھی اس کے حصار میں مکمل اطمینان سے جانے کے لئے اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھانا تھا لہٰذا اس بار وہ فوراً بات بدلتے ہوئے بولی تھی۔

''اب تمہاری طبیعت کافی بہتر ہے عدی لہٰذا کل سے تم میرے ساتھ آفس جاؤ گے۔''

''کیوں......اتنی جلدی اکیلے تھک گئی تم......؟'' عدنان نے اس پر چوٹ کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ بھول گیا تھا کہ مقابل کھڑی لڑکی کوئی عام سی لڑکی نہیں بلکہ انجشاء احمر ہے جو کسی کو کسی بھی وقت اپنی حاضر جوابی سے چاروں شانے چت کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

''انجشاء احمر کبھی مصائب سے ہار نہیں مانتی عدنان اور نہ ہی اپنی ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے تھکتی ہے لیکن تم یہ بات شاید کبھی نہیں سمجھو گے بہر حال وہاں کچھ ایسے پیچیدہ مسائل پیدا ہو گئے ہیں جنہیں میں تمہاری موجودگی میں زیادہ بہتر طریقے سے حل کر سکتی ہوں۔ لہٰذا کل تم ہر صورت میرے ساتھ آفس جاؤ گے۔''

اس کے مضبوط لہجے میں کوئی لچک نہیں تھی تاہم پھر وہ دھیمے سے مسکرا اٹھا۔

''کوئی زبردستی ہے......؟''

''ہاں بالکل ہے۔'' اب کے وہ بھی آہستہ سے مسکرا دی تھی۔

''چلو فرض کر لو اگر میں نہ جاؤں تو......؟'' وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔

''تو......تو میں زبردستی لے جاؤں گی۔''

''کیسے لے جاؤ گی......؟تمہاری یہ نازک بانہیں میرا بوجھ نہیں سہار سکیں گی۔''

اس نے بات ہی ایسی کہہ دی تھی کہ وہ پل میں سرخ ہو کر رُخ پھیرنے پر مجبور ہوگئی۔

''لگتا ہے تم کبھی نہیں سدھرو گے۔''

''نہ......اس قدر مایوسی اچھی نہیں ہوتی۔تم سدھارنے کی کوشش تو کرو۔میں بہت شریف ہوں۔''

''دیکھی ہے تمہاری شرافت میں نے'ایک وقت میں پانچ پانچ لڑکیوں کے پیچھے گھومتے تھے۔''

دونوں کا موڈ اس وقت از حد خوشگوار دکھائی دے رہا تھا۔

''تمہاری جان کی قسم ہے انجو!تم تک یہ اطلاعات جس کسی نے بھی پہنچائی ہیں ایک دم غلط ہیں کیونکہ میں لڑکیوں کے پیچھے نہیں بلکہ خود لڑکیاں میرے پیچھے بھاگتی تھیں۔''

''ایک ہی بات ہے۔''اب کے وہ کندھے اچکاتے ہوئے قدرے لاپروائی سے بولی تو عدنان چڑ گیا۔

''ایک ہی بات کیسے ہوگئی۔عزت اور کردار کا معاملہ ہے یار......''

اس سے پہلے کہ وہ اس کے احتجاج پر کان دھرتی'اس کے ہاتھ میں موجود اس کا پرسنل سیل تیز ٹیون کے ساتھ بج اٹھا تھا۔ابھی ابھی اس نے تمکین اور اریشہ سے بات کی تھی لیکن اب اسکرین پر ابھرنے والا نمبر قطعی اجنبی تھا تب ہی اس نے قدرے الجھتے ہوئے کال اوکے کی تھی۔

''ہیلو انجشاء احمر......؟''دوسری طرف کسی نسوانی آواز نے کال پک ہوتے اس سے پوچھا تھا۔

''جی......میں انجشاء بول رہی ہوں آپ کون......؟''وہ اب بھی الجھی ہوئی تھی کیونکہ اس کا نمبر نہایت پرسنل تھا۔

''ہاں انجو!میں شیزا بول رہی ہوں یار۔یہیں تمہارے شہر سے ملنے آسکتی ہوں اس وقت......؟''

دوسری طرف موجود شخصیت نے یک لخت اسے ساکت کر ڈالا تھا۔

☆☆☆

موسم بے حد خوب صورت ہو رہا تھا۔

شہرین خان سے ملے اسے کافی دن ہو گئے تھے۔لہٰذا آج اس کا ارادہ پہلی فرصت میں اس سے ملنے کا تھا۔

صبح دس بجے کے قریب اٹھنے کے بعد اس نے ناشتے میں صرف چائے کا ایک کپ لیا تھا اور پھر خوب دل لگا کر تیار ہونے کے بعد وہ ابھی گھر سے نکلنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اسی پل اس کے پرسنل موبائل نمبر پر پاکستان سے احسن صاحب کی کال آ گئی۔

''السلام علیکم کیسے ہو بیٹا......؟''

اس کے ہیلو کے جواب میں انہوں نے بہت پیار سے کہا تھا۔جواب میں وہ قدرے شرمندہ ہوتے ہوئے بولا۔

''وعلیکم السلام!ٹھیک ہوں پاپا آپ سنائیں گھر میں سب کیسے ہیں؟اسپیشلی مما کی طبیعت اب کیسی ہے......؟''

''سب ٹھیک ہیں میں تو ابھی ایک پارٹی میں شرکت کے لئے نکل رہا تھا کہ تمہاری ماما تم سے بات کئے بغیر شدید بے چین ہو رہی تھیں۔لو تم ان سے بات کرو۔واپس آ کر پھر ہم باپ بیٹا گپ شپ لگاتے ہیں۔

ہمیشہ کی طرف ان کا لہجہ خوشگوار تھا مگر اس بار ازمیر شاہ کو ان کے لہجے سے مخصوص کھنک مفقود لگی تھی تاہم اس کے باوجود اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''شیور۔''

موبائل پر دوسری جانب اب حائقہ بیگم تھیں۔

''السلام علیکم مما!کیسی ہیں آپ......؟''

اس بار اس نے پہلی والی غلطی نہیں دہرائی تھی۔

''ٹھیک ہوں تم کیسے ہو......؟اپنا خیال رکھ رہے ہو کہ نہیں......؟''

ان کے لہجے میں ممتا کا پیار ہی پیار تھا جس نے ایک مرتبہ پھر اسے سرشاری کی کیفیت میں ڈبو دیا تھا۔

''میں یہاں بالکل ٹھیک ہوں مما' آپ بس اپنا خیال رکھا کریں۔''

''اچھا...... یہ بتاؤ واپس کب آ رہا ہے؟''

جلد ہی وہ اپنے اصل مقصد کی طرف آ گئی تھیں۔ازمیر اسی سوال سے بچنے کے لئے پاکستان اپنے گھر والوں سے بہت کم رابطہ کرتا تھا۔ اس وقت بھی ان کے اس سوال نے اسے خاصا دسٹرب کر کے رکھ دیا تھا۔

''آ جاؤں گا مما' جلدی بھی کیا ہے؟''

ہمیشہ کی طرح قطعی لاپروا لہجے میں کہتے ہوئے اس نے اپنا دفاع کرنا چاہا تھا جب وہ مغموم لہجے میں بولیں۔

''میرا دل بہت اُداس ہے ازمیر' سارا گھر تمہارے بغیر سونا سونا لگتا ہے۔قدرت نے دو بچے دیئے دونوں ہی آنکھوں سے دور ہیں۔بتاؤ

میرا دل کیسے بہلے گا......''

وہ واقعی ٹوٹ رہی تھیں تب ہی وہ بات سنبھالتے ہوئے بولا۔

''سمیہ کو کچھ دنوں کے لئے اپنے پاس بلالیں ناں ما' آخر ایسی بھی کیا پڑھائی جو گھر والوں سے ملنے کی فرصت بھی میسر نہ آئے۔''

''آئی ہوئی ہے......مگر میرے لئے نہیں۔''

اس بار از میران کے سوال پر دل سے کڑھ کر رہ گیا تھا مگر کہتا بھی تو کیا کہ ابھی چند ماہ قبل وہ خود بھی تو ایسا ہی کر رہا تھا۔ لہٰذا خاموش رہ گیا۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بالآخر حائقہ بیگم ہی خود کو سنبھالتے ہوئے بولی تھیں۔

''اچھا تو سنا۔ وہ شہرین خان نامی لڑکی ملی کہ نہیں؟''

''مل گئی ہے۔ بات کرواؤں آپ سے۔ آپ سنائیں وہ آپ کی اریشہ کیسی ہے؟ ابھی پچھلے دنوں اس نے بتایا تھا کہ ''شاہ ولاج'' میں ماہم کی وجہ سے کافی بڑا طوفان آیا ہے۔''

''ہاں بیٹے! فرزانہ بھابھی کی ضرورت سے زیادہ چھوٹ نے ان کے بچوں کے دامن خاصے خراب کر ڈالے ہیں۔ چار پانچ ماہ قبل موبائل پر کسی لڑکے سے دوستی ہوئی تھی جو بڑھتے بڑھتے محبت میں تبدیل ہو گئی۔ روز بن سنور کر' گھر سے نکلنا اور گھنٹوں فون سے چپکے رہنا۔ اس لڑکی نے اپنا معمول بنالیا تھا مگر فرزانہ بھابھی کی پشت پناہی کی وجہ سے کوئی اس پر انگلی نہیں اٹھا سکا۔ کچھ روز پہلے اس نے علی الاعلان سب سے کہہ دیا تھا کہ وہ اپنی پسند کے لڑکے کے ساتھ شادی کرے گی۔ لڑکا آیا بھی تھا اپنے والدین کے ساتھ مگر فاروق بھائی کو وہ لوگ پسند نہیں آئے پھر اس لڑکے کے غلط کردار کے متعلق بھی وہ باخبر تھے لہٰذا انہوں نے اس رشتے سے انکار کر دیا جس سے دل برداشتہ ہوتے ہوئے ماہم نے رات کے اندھیرے میں گھر سے بھاگنے کا منصوبہ بنالیا۔ وہ تو اللہ بھلا کرے صالحہ کا' جس کی عین ٹائم پر آنکھ کھل گئی اور اس نے تمام گھر والوں کو باخبر کر دیا ورنہ خدا جانے ہم سب کے ساتھ کیا ہوتا......؟ بہرحال دوبارہ ایسا نہ ہو۔ یہ سوچ کر بھائی صاحب اور تمہارے پاپا نے اسی لڑکے کے ساتھ ماہم کی نسبت طے کر دی ہے۔''

حائقہ بیگم کی زبانی تمام حالات کی روداد سننے کے بعد وہ خاصا افسردہ ہو گیا تھا پھر بھی خود کو بہلاتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔

''ماہم اور اریشہ کی شادی کی ڈیٹ میں کوئی ردوبدل ہوا کہ نہیں......؟''

''ردوبدل کیا ہونا تھا۔ شادی تو اپنے وقت پر ہی ہوگی مگر صرف ماہم کی' اریشہ بیٹی کی نہیں۔''

''کیوں......اریشہ نے شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے کیا......؟''

ایک لمحے میں اس کا دل جیسے اچھل پتھل ہو کر رہ گیا تھا جبکہ دوسری جانب حائقہ بیگم کا لہجہ ہنوز اداس تھا۔

''نہیں بیٹے! وہ اگر انکار کر بھی دے تو اس کی یہاں کون سننے والا ہے؟ یہ تو قدرت کا فیصلہ ہے شاید اسے ہی ایسا منظور نہیں تھا۔''

''وہاٹ......کیا منظور نہیں تھا؟ کیا ہوا ہے ما پلیز بتائیں مجھے۔''

سینے میں ادھم مچاتا دل' اب از حد بے قرار ہوا تھا مگر حائقہ بیگم پردیس میں بیٹھے بیٹے کو پریشان کرنا نہیں چاہتی تھیں تب ہی بات بناتے

ہوئے بولیں۔

''کچھ نہیں ہوا ہے اسے۔تم بس اپنا خیال رکھنا۔میں اب فون رکھ رہی ہوں۔''

''نہیں مما! پلیز مجھے بتایئے کہ اریشہ کو کیا ہوا ہے' ورنہ میں یہاں اضطراب سے مر جاؤں گا۔''اس لمحے اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ وہ ششدر رہ گئی تھیں۔

صرف ایک لمحے کے لئے بے اختیار ہوتے ہوئے ازمیر شاہ کے الفاظ نے ان کی سماعتیں جیسے سن کر ڈالی تھیں۔وہ اسے اریشہ کے متعلق سب کچھ بتانا چاہتی تھیں لیکن......زبان جیسے ان کا ساتھ دینے سے ہی انکاری ہوگئی تھی۔کس درجہ شاک کے عالم میں لائن کاٹ کر وہ قریبی صوفے پر آ بیٹھی تھیں۔

☆☆☆

کوئی دیوار سے لگ کر بیٹھا رہا' اور بھرتا رہا سسکیاں رات بھر

آج کی رات بھی نیند نہیں' راہ تکتی رہیں کھڑکیاں رات بھر

غم جلاتا کسے کوئی بستی نہ تھی، میرے چاروں طرف میرے دل کے سوا

میرے ہی دل پہ آ، آ کے گرتی رہیں، میرے احساس کی بجلیاں رات بھر

نہایت دلگیر انداز میں' گنگناتے ہوئے درد بھری آواز اس کے اندر ایک عجیب سا فسوں خیز سحر پھونک رہی تھی جب کہ اسٹیئرنگ پر جمے اس کے ہاتھ تیز بخار کے باعث' دھیرے دھیرے کپکپا رہے تھے۔رات بھر جاگنے کے باعث' خوب صورت آنکھوں میں بھی گہری سرخی اتر آئی تھی۔

کوئی چہرہ کوئی روپ کوئی آنچل' سوچ کی وادیوں سے گزرتا رہا

میرے احساس کو گدگداتی رہیں رنگ اور نور کی تتلیاں رات بھر

غزل کا ایک ایک بول جیسے اس کے اندر تک سرایت کر رہا تھا اور وہ عجیب بے خودی کی کیفیت میں ڈرائیونگ کرتے ہوئے' جیسے اردگرد سے مکمل بے نیاز ہو رہا تھا۔

دائرے شوخ رنگوں کے بنتے رہے' یاد آتی رہی وہ کلائی ہمیں!!!

دل کے سنسان آنگن میں بجتی رہیں' ریشمی شبنمی چوڑیاں رات بھر

محبت کے تختہ دار پر خود کو قربان کرنے کی ہمت کمزور پڑ رہی تھی۔

بہت سلو ڈرائیونگ کے باوجود وہ تقریباً بیس پچیس منٹ میں اس جگہ پہنچ گیا تھا جہاں آنے کے لئے اشعر احمد نے اسے مجبور کیا تھا۔

گاڑی سے نکل کر تھکے تھکے قدموں کو زبردستی گھسیٹتا بمشکل وہ اس کے مقابل جا بیٹھا تھا۔

سفاری پارک میں اس وقت بمشکل چند لوگ بیٹھے ہوا خوری کر رہے تھے جب کہ اشعر اس سے پہلے ہی داخلی دروازے سے قدرے فاصلے پر وہاں بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

''کہو...... کیوں بلایا ہے مجھے......؟''

اس کے مقابل بیٹھتے ہی اس نے قدرے خشک لہجے میں پوچھا تھا جب وہ زہریلی سی مسکراہٹ لبوں پر پھیلاتے ہوئے بولا۔

''جس مقصد کے لئے بلایا ہے تم اس سے انجان تو نہیں ہو بہر حال کب فارغ کر رہے ہو نمی کو......؟'' سفاکی میں یقیناً اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ اریج احمر کے لئے اس وقت کچھ بھی کہنا جیسے ایک امتحان بن گیا تھا۔ تاہم پھر بھی اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے نرم لہجے میں کہا تھا۔

''ابھی تمہاری خواہش پر عمل کرنا میرے لئے ممکن نہیں ہے اشعر تمکین پہلے ہی تمہاری وجہ سے بہت دکھی رہ چکی ہے۔ میں اتنی جلدی اسے پھر سے اسی دکھ کی دلدل میں نہیں دھکیل سکتا۔''

''یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے اریج! میں جلد از جلد نمی کو پھر سے پانا چاہتا ہوں اس کی خوشی اور غم کے متعلق سوچنا میرا مسئلہ ہے تم نے جو عہد کیا تھا اسے پورا کرو۔''

وہ قدرے جذباتی ہوا تھا مگر اریج احمر کی نگاہیں بدستور جھکی ہوئی تھیں۔

''میں اپنے وعدے سے مکر نہیں رہا۔ بس تھوڑا سا ٹائم لے رہا ہوں۔''

''ٹائم...... لیکن کیوں......؟'' ایک مرتبہ پھر وہ گھٹی گھٹی آواز میں چلایا تھا جب اریج نے ہنوز دھیمے لہجے میں اس سے کہا۔

''میں اسے ہر قسم کی تحقیر اور درد سے بچانا چاہتا ہوں۔ پہلے ہی تمہاری وجہ سے اس نے نجانے لوگوں کی کون کون سی باتیں برداشت کی ہیں۔ میں ایک مرتبہ پھر اسے اسی تکلیف سے گزارنا نہیں چاہتا۔''

''شٹ اپ' میں یہ بہانے بازیاں ہرگز برداشت نہیں کروں گا۔''

اریج ابھی مزید کچھ کہتا مگر اشعر اس سے پہلے ہی شدت سے چلا اٹھا تھا۔

کچھ پل دونوں کے درمیان خاموشی رہی تھی پھر اس خاموشی کو اریج نے ہی پاٹا تھا۔

''میں کوئی بہانہ نہیں کر رہا ہوں اشعر! تمکین میرے پاس تمہاری امانت ہے اور میں اس امانت میں خیانت کرنے سے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا۔''

اس کا لہجہ اب بھی مدھم تھا۔

محبتیں انسان کو کتنا کمزور کر دیتی ہیں۔ زندگی میں آج تک کبھی اس نے خود کو اتنا بے بس تصور نہیں کیا تھا حالانکہ اس وقت بھی نہیں جب اس کی مما کو اس سے چھین لیا گیا تھا۔

خوب صورت بادامی آنکھوں کے کنارے اب بھی بدستور بھیگے ہوئے دکھائی دے رہے تھے تب ہی شاید اشعر احمد ڈھیلا پڑا تھا۔

''او کے...... میں صرف ایک ہفتے کا ٹائم دے رہا ہوں تمہیں۔ ایک ہفتے کے اندر اندر تمہیں جو کرنا ہے کرلو ایک ہفتے کے بعد اگر تم نے مزید کوئی ٹال مٹول کی تو یہ میں ہرگز برداشت نہیں کروں گا سمجھے تم۔'' درشت لہجے میں اپنی بات کہنے کے بعد وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا جب اریج نے آہستہ سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

''ایک ہفتہ بہت کم ہے اشعر! خود کو تمکین اور دیگر خاندان والوں کی نظر میں گرانے کے لئے مجھے کم از کم ایک ماہ کی مدت درکار ہے۔ اس کے بعد سب کچھ ویسا ہی ہوگا جیسا تم چاہو گے پلیز......''

بخار سے سرخ چہرے پر شکستگی کی داستان رقم تھی۔ تاہم اشعر اس وقت عجلت میں تھا۔ تب ہی ایک نظر اپنی کلائی پر بندھی رسٹ واچ کی طرف ڈالتے ہوئے بولا۔

''ایک ماہ بہت زیادہ ہے بہرحال ابھی میں جلدی میں ہوں۔ تم سے اس مسئلے پر بعد میں بات ہوگی بائے۔''

کہنے کے ساتھ ہی وہ تیز تیز چلتا پارک سے نکل گیا۔ تاہم اریج پھر سے اپنے نڈھال وجود کو سنبھالتے ہوئے وہیں سنگی بینچ پر بیٹھ گیا۔

پارک میں لوگوں کی آمد و رفت اب بڑھ گئی تھی۔

رفتہ رفتہ ابھرتے ہوئے سورج کی تیز شعاعوں نے اردگرد ہر چیز کو جیسے زندگی کا احساس بخش دیا تھا مگر وہ مسمسا ہو رہا تھا۔ اندر ہی اندر سلگتے ہوئے ختم ہو رہا تھا۔

اس روز وہاں پارک میں کتنی ہی دیر بیٹھا وہ روتا رہا۔ زندگی اس سے کبھی ایسا امتحان بھی لے گی آج تک اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

کیسی عجیب بدنصیبی تھی کہ جب اسے اپنی پیاس پر صبر آنے لگا تھا۔ درد برداشت کرتے کرتے اس نے خود اپنا دل پتھر کر لیا تھا۔ زندگی کے اسی موڑ پر ''آبِ حیات اس سے چھینا جا رہا تھا۔ کیوں......؟ دیر تک وہ انہی چکروں میں الجھے رہنے کے بعد تقریباً دوپہر کے وقت گھر واپس لوٹا تو تمکین کچن میں گھسی شاید دوپہر کا کھانا بنا رہی تھی اس لمحے جانے کس سوچ کے زیرِ اثر اس نے بیڈ روم میں پہنچ کر تمکین کو آواز لگائی تھی جو اگلے ہی لمحے اس کے روبرو پیش تھی۔

☆☆☆

ہسپتال میں اریشہ کا آخری دن تھا۔

ڈاکٹر فرحان اب اسے ڈسچارج کرنے پر متفق ہو گئے تھے۔نورینہ بیگم اور شاہ ولاج کے تمام مکینوں کے ساتھ ساتھ شہریار احمد خان بھی وہیں موجود تھے۔

فرزانہ بیگم پیچھے گھر کی دیکھ بھال کے لئے اپنی فیملی کے ساتھ گھر واپس پلٹنا چاہتی تھیں جب کہ فائقہ بیگم اور احسن صاحب ابھی مزید وہاں رکنے کے خواہش مند تھے۔

وقت رخصت فرزانہ بیگم نے نورینہ بیگم کو تنہائی میں جا کر صاف صاف کہہ دیا تھا۔

''معاف کرنا نور آپا! میری تو دلی خواہش تھی کہ میں اریشہ کو اپنی بہو بناؤں مگر شاید قدرت کو یہ سب منظور نہیں تھا۔اذہان میرا لاڈلا بیٹا ہے لہٰذا ہر ماں کی طرح میری بھی یہ خواہش ہے کہ میں اپنے بیٹے کے لئے چاند سی دلہن لاؤں۔اس لئے مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں اب اریشہ کو اپنی بہو نہیں بنا سکتی اس رشتے کو ہماری طرف سے آپ ختم ہی سمجھئے۔''

''یہ......یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں بھابھی؟ اریشہ اور اذہان بیٹے کی نسبت تو طے ہے پھر ڈاکٹرز نے اریشہ کے معاملے میں مکمل مایوسی نہیں دکھائی ہے۔آج نہیں تو کل وہ اپنے پاؤں پر ضرور چلنے کے قابل ہو جائے گی ابھی پلیز ایسا کوئی فیصلہ مت کیجئے۔''

نورینہ بیگم کا دل جیسے کسی نے مسل ہی تو ڈالا تھا مگر مقابل بھی فرزانہ بیگم تھیں جنہیں اپنے ہر فیصلے پر مکمل اختیار حاصل تھا سو وہ خاصی نخوت سے منہ بگاڑتے ہوئے بولیں۔

''معاف کرنا نور آپا! میں سال دو سال تک اریشہ کے ٹھیک ہونے یا نہ ہونے تک سولی پر لٹکی نہیں رہ سکتی۔ مجھے اپنے بیٹے کے سر پر جلدی سہرا سجانا ہے لہٰذا میں تو اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی ہوں کہ اس نے شادی سے پہلے ہی یہ سب دکھا دیا بعد میں اگر کچھ ہو جاتا تو خواہ مخواہ متعدد مسائل پیدا ہو جاتے' بہر حال اس بات کو اب ختم ہی سمجھئے۔امید ہے ہمارے درمیان اب آئندہ اس موضوع پر بات نہیں ہو گی۔''

ان کے حتمی لہجے سے لگ رہا تھا کہ وہ اپنے شوہر اور بیٹے سے اس مسئلے پر بحث کر چکی ہیں۔صالحہ ان دنوں چونکہ ڈلیوری کیس سے گزر رہی تھی لہٰذا اس کے اور ارسلان شاہ کے علم سے یہ بات ابھی تک باہر تھی کیونکہ ارسلان شاہ بھی ان دنوں اپنے سسرال میں ہی مقیم تھا۔

فرزانہ بیگم اپنی فیملی کے ساتھ وہاں سے جا چکی تھیں مگر نورینہ بیگم کے اندر تک جیسے اندھیروں کے سوا اور کچھ بھی نہیں رہا تھا۔

گھنی گھنی دراز پلکوں سے آنسو ٹوٹ کر گالوں پر پھسل آئے۔انہیں معلوم ہی نہ ہو سکا۔پتہ تو اس وقت چلا جب کسی کے مضبوط ہاتھ کا لمس انہیں اپنے دائیں کندھے پر محسوس ہوا اور انہوں نے فوراً چونک کر پیچھے پلٹتے ہوئے شہریار احمد خان صاحب کا مہربان چہرہ دیکھا۔

وہ ان سے اپنے آنسو چھپانا چاہتی تھیں تب ہی سرعت سے ہاتھ اٹھا کر اپنی آنکھیں رگڑنے کی کوشش کی تو انہوں نے فوراً ان کے ہاتھ کو اپنی گرفت میں لیتے ہوئے خود اپنی انگلی کی پور پر ان کی آنکھوں سے گرنے والے شفاف موتی سمیٹ لئے۔

''بس......؟اتنی سی بات پر اتنے قیمتی آنسو بکھرا دیئے تم نے......؟میں تمہیں اتنا کمزور نہیں سمجھتا تھا نور......''

اس لمحے وہ اندر سے ٹوٹ رہی تھیں۔ اپنی عزیز از جان بیٹی کی بدنصیبی پر دکھ سے نڈھال ہو رہی تھیں مگر شہریار صاحب کے مضبوط سہارے نے انہیں ٹوٹ کر بکھرنے نہیں دیا تھا۔

فرحان' حائقہ بیگم اور احسن صاحب کے ہمراہ' اریشہ کو اس کے روم سے باہر لا رہا تھا جب کہ شہریار صاحب نہایت محبت سے نورینہ بیگم کو اپنے حصار میں لئے گاڑی تک آ پہنچے تھے۔

''بے مثال کا میچ'' پہنچ کر یہ بات حائقہ بیگم اور احسن صاحب کی سماعتوں تک بھی پہنچ گئی لہٰذا اپنے طور پر ان دونوں نے ہی انہیں تسلی دینا اور سمجھانا شروع کر دیا۔

بے شک قدرت کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور پوشیدہ ہوتی ہے۔

جیسے تیسے کر کے وہ دن گزر گیا تھا۔

نورینہ بیگم نے صبح ناشتے میں ماسوائے ایک کپ چائے کے اور کچھ بھی نہیں لیا تھا اب بھی وہ دن بھر سے بھوکی تھیں مگر کھانے سے مکمل بے نیاز بنیں اپنے کمرے میں مقید ہو کر رہ گئی تھیں۔

وہ جب بھی از حد پریشان ہوتی تھیں کسی کی نہیں سنتی تھیں لہٰذا حائقہ بیگم اور احسن صاحب نے انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر اپنے کمرے کا رخ کیا تھا۔ اریشہ' دانیہ اور عدیلہ' فرحان کے ساتھ گپ شپ لگانے میں مشغول تھیں تب ہی شہریار صاحب ایک ٹرے میں تھوڑی سی بریانی' قورمہ اور سلاد رکھ کر نورینہ بیگم کے کمرے کی طرف چلے آئے۔ جو اپنے بیڈ پر دونوں گھٹنوں میں منہ چھپائے بیٹھی غالباً نہیں یقیناً رو رہی تھیں۔ فرزانہ بیگم سے انہیں اس درجہ سفاکی کی امید نہیں تھی لہٰذا نہ چاہتے ہوئے بھی وہ خود پر قابو نہیں پا رہی تھیں۔

شہریار صاحب کے لئے یہ چوئیشن خاصی تکلیف دہ تھی۔ نورینہ بیگم کے معمولی سے دکھ پر ان کا دل ہمیشہ مچل اٹھتا تھا۔ زندگی کے پچھلے پندرہ سال اپنی تنہائی سے لڑتے ہوئے جیسے انہوں نے گزارے تھے یہ محض وہی جانتے تھے۔ تب ہی کھانے کی ٹرے سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے وہ عین نورینہ بیگم کے مقابل آ بیٹھے تھے۔

''ایسا کب تک چلے گا نور......؟ دیکھو تم خود کو دکھ کے اس حصار سے باہر نہیں نکالو گی تو ہمارے بچوں کا کیا ہو گا؟ آپ بتلی اریشہ کے دل پر کیا گزرے گی' کیا تم نہیں جانتیں کہ وہ خوش رہے اس سانحے کے بعد بھی اس کے لبوں سے ہنسی کا سلسلہ نہ ٹوٹے......؟''

ان کے مدھم لہجے پر نورینہ بیگم نے آہستگی سے سر اٹھاتے ہوئے فوراً اپنے آنسو پونچھ ڈالے تھے۔

''بچے یہاں آ کر بہت خوش ہیں نور کم از کم ان سے یہ خوشی تو نہ چھینو.....'' وہ نہایت اپنائیت کے ساتھ کہہ رہے تھے تاہم نورینہ بیگم اس بار بھی خاموش رہی تھیں۔

''چلو شاباش۔ دل تھوڑا سا بڑا کرو اور کھانا کھا لو۔''

''مجھے بھوک نہیں ہے۔''

اب کی بار بھیگے لہجے میں کہتے ہوئے بالآخر وہ بول پڑی تھیں۔

''لیکن مجھے تو ہے۔صبح سے قسم لے لو جو سوائے پانی اور چائے کے کوئی چیز حلق سے اتاری ہو۔''

''کیوں نہیں اتاری...... میں نے تو منع نہیں کیا تھا۔''

گھنی پلکیں اٹھا کر، روئی روئی سی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے وہ دوبدو لہجے میں بولیں تو ایک دھیمی سی مسکان شہریار احمد صاحب کے گداز ہونٹوں پر بکھیر گئی۔

''یہ میں نے کب کہا......؟''

''تو پھر صبح سے بھوکے کیوں پھر رہے ہیں آپ......؟''

ان کی توقع کے عین مطابق وہ بھبل گئی تھیں۔

''تم بھی تو صبح سے بھوکی ہو لہٰذا جب تک تم کچھ نہیں کھاؤ گی کوئی نوالہ میرے حلق سے کیسے نیچے اتر سکتا ہے۔''

''بس کیجیے شہریار صاحب! زندگی کے پندرہ سال تک جیسے آپ کی بھوک میری بھوک سے ہی تو مشروط رہی ہے ناں۔''

وہ تلخ ہونا نہیں چاہتی تھیں مگر ہو گئی تھیں جواب میں شہریار صاحب کی مسکراہٹ جیسے سمٹ کر رہ گئی۔

''کیا جانتی ہو تم پچھلے پندرہ سالوں کے بارے میں......؟ بولو......؟''

ان کا لہجہ اب بھی تلخ نہیں تھا۔

''میں نے صرف محبت کا تاج محل بنایا تھا نور اس میں نفرت اور بدگمانی کی دیوار تو تم نے کھڑی کی تھی۔کیا کیا قیامتیں نہیں ٹوٹیں مجھ پر' تم سے دور ہو کر مما کی اچانک موت کا زخم جھیلا' بڑی آپا کی روڈ ایکسیڈنٹ میں ڈیتھ کا صدمہ بھی اکیلے سہا اور پھر بسمہ کی بے موت' قبر کے اندھیروں میں اتارنے کا ذمے دار بھی میں ہی ٹھہرا' ایک ایک کر کے میرے سارے رشتے مجھ سے بچھڑتے گئے۔زندگی کے ہر موڑ پر' جب جب میں ٹوٹ کر بکھرا یہ گمان کیا کہ تم ساری رنجشیں بھلا کر میرے پاس آؤ گی۔مجھے اپنی مہربان بانہوں کا سہارا دے کر میرے آنسو پونچھو گی میرے زخموں پر مرہم لگاؤ گی لیکن...... میں ہمیشہ خوش فہمی کے حصار میں مقید تمہارا انتظار ہی کرتا رہا نور۔اگر تم نے اپنی جان دینے کی دھمکی نہ دی ہوتی تو میں ایک دن بھی تمہیں خود سے الگ رہنے نہیں دیتا مگر...... تمہاری زندگی بہر حال مجھے آج بھی اپنی سانسوں سے بڑھ کر عزیز ہے لہٰذا آج بھی زندگی کے ہر فیصلے کا اختیار صرف تمہارے ہاتھ میں ہے۔میرا کیا ہے؟ جیسے تیسے پندرہ سال بیت گئے۔دو چار سال مزید یوں ہی اور بیت جائیں گے پھر موت اپنی بانہوں میں سمیٹ لے گی تو شاید مرنے کے بعد تمہارے دل میں میری محبت زندہ ہو جائے' شاید میں مر......''

''بس...... خدا کے لیے بس کیجیے اب......''

ان میں مزید ضبط کا یارا نہ رہا تو بالآخر چلا اٹھیں۔

''بہت شوق ہے آپ کو مرنے مرانے کا ہے ناں۔''

''نہیں......شوق تو نہیں ہے البتہ یہ خواہش ضرور ہے کہ تمہیں کبھی اپنے لئے بھی یوں روتے دیکھوں۔''

اس باران کے ہونٹوں کے کناروں میں دبی مسکراہٹ نہایت دلفریب تھی۔

''بس......زندگی میں سوائے فضول بولنے کے اور کچھ نہیں آتا آپ کو۔''

نورینہ بیگم اب بھی برہم تھیں تب ہی وہ کھلکھلا کر ہنس دیئے تھے۔

''آتا تو بہت کچھ ہے لیکن پچھلے پندرہ سالوں میں کچھ بھی کر گزرنے کا کوئی ایک موقع ہی نہیں ملا۔'' ان کی جگہ کوئی اور ہوتی تو شرم سے سرخ ہو جاتی مگر وہ ہنوز بارعب انداز میں ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔

''مجھے نیند آرہی ہے۔ پلیز اب آپ یہاں سے جائیں۔''

''اوکے چلا جاؤں گا لیکن پلیز...... یہ کھانا تو کھالیں۔''

ان کی سوئی پھر کھانے پر اٹک گئی تھی لہٰذا اس بار نورینہ بیگم کو نا چاہتے ہوئے بھی ان کے ساتھ چند لقمے زہر مار کرنے پڑے تھے۔

''میں صبح شاہ ولاج واپس جانا چاہتی ہوں۔''

ابھی وہ ان کا شکریہ ادا کرنے سے متعلق سوچ ہی رہے تھے کہ نورینہ بیگم کے الفاظ نے ایک مرتبہ پھر انہیں درد کی اتھاہ گہرائیوں میں لا پھینکا تھا۔

☆☆☆

ہر زخم کا ہر درد کا درمان ہونا چاہیے
موت کو کچھ اور بھی آسان ہونا چاہیے
دل میں ہی کیوں مستقل اس کا ٹھکانہ ہونا چاہیے
دکھ کو بس ایک دو گھڑی مہمان ہونا چاہیے

شام کے سائے قدرے گہرے ہو رہے تھے۔

ٹھنڈی ٹھنڈی معطر ہوا کے جھونکوں نے اس کے تھکے ہوئے اعصاب کو قدرے سکون بخشا تھا۔ پچھلے پندرہ منٹ سے وہ ساحل سمندر کے قریب میکڈونلڈ میں بیٹھی شیزا کا انتظار کر رہی تھی جس نے ابھی تھوڑی دیر پہلے فون کر کے اسے ازحد پریشان کر ڈالا تھا۔

تمکین جیسی اچھی دوست اور کزن کے ساتھ نہایت برا کرنے کے بعد ایک مرتبہ پھر اس کا اسی شہر میں قیام کرنا اسے ازحد حیران کر گیا تھا۔

دلی طور پر وہ اس کی صورت تک دیکھنے کی روادار نہیں تھی لیکن ذہنی طور پر وہ اس سے مل کر یہ ضرور پوچھنا چاہتی تھی کہ اس نے ایک دوست ہوتے ہوئے اپنی ہی عزیز از جان دوست کے حق پر ڈاکہ کیوں ڈالا۔

اپنے اسی مقصد کے تحت اس نے شیزا کو یہاں میکڈونلڈ میں بلایا تھا تاکہ پُرسکون ماحول میں کھل کر ہر بات کر سکے۔

اگلے بیس منٹ میں وہ اس کے مقابل تھی۔ مکمل بلیک ٹراؤزر سوٹ میں ملبوس، پرس جھلاتی وہ دور سے ہی اسے دیکھ کر ہاتھ ہلانے لگی تھی۔

''السلام علیکم! کیسی ہو انجو؟ مدت کے بعد تجھے دیکھنا نصیب ہو رہا ہے۔ سچ مجھ سے تو اپنی خوشی سنبھالی نہیں جا رہی۔''

انجشاء کے مقابل کرسی سنبھال کر بیٹھتے ہوئے اس نے اپنے مخصوص فاسٹ لہجے میں کہا تو انجشاء محض خلوص سے اس کے سلام کا جواب دے کر دھیمے سے مسکرا اٹھی۔

''ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ کن ہواؤں میں اڑ رہی ہو آج کل......؟''

شیزا اس کا طنز پہچان گئی تھی پھر بھی مسکراتے ہوئے بولی۔

''فی الحال تو یہی ہوائیں راس نہیں آ رہیں، کہیں اور کوچ کرنے کا کیسے سوچ سکتے ہیں......؟''

''اچھا...... لیکن میں نے تو سنا تھا کہ تم دوبئی گئی ہوئی ہو۔''

اس بار اس نے مصنوعی حیرانگی کا مظاہرہ کیا تھا جس پر وہ پھیکے سے انداز میں ہنستے ہوئے بولی۔

''یہ سب اشعر کا چلایا ہوا ڈرامہ تھا انجو۔''

''وہاٹ...... تمہیں پتہ ہے کہ تم کیا کہہ رہی ہو......؟''

انجشاء کے اندر تک اس کے انکشاف سے ہل چل مچ گئی تھی مگر شیزا کا انداز ہنوز قائم تھا۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں انجو! تمکین کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا۔ میں اس کی ذمہ دار نہیں۔ مجھ سے محض اتنی سی غلطی ہوگئی تھی کہ میں اشعر کی شادی سے پہلے ہی اس سے محبت کر بیٹھی اور مما نے اس محبت کا راز اس پر کھول دیا۔ میرا یقین کرو انجو بھرے شہر میں کوئی بھی ایسا غم گسار نہیں رہا ہے جو میری فریاد سنے، سچائی جاننے کی کوشش کرے۔ سب مجھے ہی قصوروار گردانتے ہوئے مجھ سے نفرت کر رہے ہیں۔''

بولتے بولتے اس کا لہجہ بھرا گیا تھا۔ لہٰذا انجشاء نے کچھ بھی کہنے سے گریز کرتے ہوئے چپ چاپ رخ پھیر لیا۔

''میں جانتی ہوں کہ تم بھی مجھ سے خفا ہو مگر...... میں کیا کرتی انجو میرے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔''

''شٹ اپ شیزا اپنی معصوم دوست کی خوشیاں لوٹ کر، اسے تباہ و برباد کر کے، ساری دنیا کے سامنے رسوا کر کے تم سمجھتی ہو کہ تم نے کچھ نہیں کیا، ایسی کون سی افتاد آن پڑی تھی جو تم نے تمکین سے اس کے اشعر کو چھین لیا...... یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اشعر سے کتنا پیار کرتی ہے۔ ایک لمحے کے لئے بھی اس سے بچھڑ کر خوش نہیں رہ سکتی پھر بھی تم نے اس کی زندگی میں زہر گھولا کیوں......؟''

وہ زیادہ دیر تک اپنے غصے پر کنٹرول نہیں رکھ پائی تھی تب ہی گھٹے گھٹے سے انداز میں چلائی تو شیزا کا سر جھک گیا۔

''میں مجبور تھی انجو......''

''ایسی کون سی مجبوری تھی...... کیا تم مجھے بتاؤ گی......؟''

انجشاء کا لہجہ ہنوز تلخی لئے ہوئے تھا۔ جواب میں وہ سر جھکائے مجرمانہ انداز میں بولی۔

''میرے پیٹ میں اشعر کا بچہ تھا انجو اور میں اسے دنیا والوں سے چھپا نہیں سکتی تھی۔''

''کیا......؟''

انجشاء احمر کی آنکھیں حیرانگی سے پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔

اشعر اور شیزا کے مابین ایسا کوئی تعلق بھی بن سکتا ہے۔ وہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتی تھی کیونکہ تمکین اور اشعر دونوں کے تعلق اور نیچر کے بارے میں وہ بخوبی جانتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ کتنا اٹیچ اور مخلص تھے یہ بھی معلوم تھا اسے۔ اس کے نزدیک اشعر حماقت کر سکتا تھا' بے وفائی کر سکتا تھا مگر اتنا بڑا دھوکہ......؟ ناممکن......

''تم بکواس کر رہی ہو شیزا' میں تمہاری ایسی کسی بات پر یقین نہیں کر سکتی۔''

شدید غصے کے باعث اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

''میں جانتی تھی تم یہی کہو گی لیکن میں اس بات کو ثابت کرنے کے لئے تمہیں اپنے بچے سے ملوا بھی سکتی ہوں۔'' دوسری جانب اس کے لہجے میں قطعی کوئی جھجک یا ہچکچاہٹ نہیں تھی۔

''شاید تمہاری جگہ میں ہوتی تو یہی سب سوچتی جو تم سوچ رہی ہو لیکن......ایک عورت کے لئے اپنی عزت سے بڑھ کر اور کچھ نہیں ہوتا انجو کوئی بھی عورت کسی بھی مفاد کے لئے اپنی عزت کو داؤ پر نہیں لگا سکتی۔''

وہ ہر ممکن طریقے سے اس کا دل اپنی طرف سے صاف کرنا چاہتی تھی لیکن انجشاء احمر جیسی لڑکی کو اتنی جلدی زیر کرنا شاید اس کے لئے بھی ممکن نہیں تھا۔

''میں تمہاری بات سے متفق نہیں ہوں شیزا کیونکہ بہت سی صورتوں کو اپنے معمولی سے فائدے کے لئے عزتوں کا سودا کرتے دیکھا ہے میں نے' یہ بہت بڑی بات نہیں کی ہے اور پھر میرا نہیں خیال کہ یہ سب اشعر کی طرف سے ہوا ہو گا......''

اس کے صاف لہجے کے جواب میں شیزا چند لمحوں تک کچھ بھی بول نہیں سکی تھی۔

''سوری۔ مجھے لگتا ہے میں نے بے کار میں تمہارا قیمتی وقت ضائع کیا ہے۔''

اس بار اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اپنی سیٹ کھسکا کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی تب ہی انجشاء کا دل پسیج گیا تھا۔ حقیقت خواہ کچھ بھی تھی لیکن اس سچ کو بھی جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا کہ وہ اس کی نہایت قریبی دوست تھی اور شاید کوئی ایسی ضروری بات تھی جو اس نے انجشاء کے گوش گزار کرنا ضروری سمجھی تھی۔

اصل صورت حال کیا تھی وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔ اب تک جو کچھ تمکین نے اسے بتایا تھا۔ وہ اسی کی بنیاد پر شیزا سے بے رخی کے ساتھ پیش آ رہی تھی لیکن اب اس کا مایوس چہرہ اور اس کی آنکھوں میں تیرتے آنسو دیکھ کر اس کا لہجہ شیزا کے لئے نرم پڑ گیا تھا۔

''بیٹھو شیزا......پلیز......''

ثیزا کا ہاتھ تھام کر اسے دوبارہ اپنے مقابل بٹھاتے ہوئے اس نے دوستانہ انداز میں کہا تھا۔

''چلو۔اب تفصیل سے بتاؤ پلیز کہ تمہارے اور اشعر کے مابین جو کچھ ہوا اس کی کیا وجہ تھی؟''

اس کا لہجہ اب بھی بے لچک سہی مگر ثیزا کو کافی حوصلہ دے گیا تھا۔تب ہی وہ اپنے آنسو خشک کرتے ہوئے مدہم لہجے میں بولی۔

''میں نے اشعر کے لئے کبھی غلط انداز سے نہیں سوچا تھا انجو۔میں اسے ہمیشہ تمکین کے حوالے سے ہی دیکھتی آئی تھی لیکن پھر ایک روز جب اشعر مجھے کراچی سے پنڈی میرے گھر چھوڑنے جا رہا تھا تو راستے میں خراب موسم کے باعث بجلی کی کڑک اور بادلوں کی گڑگڑاہٹ کے باعث میں اس سے قریب ہوگئی۔اس کے بعد اشعر کئی روز تک ہمارے ہاں ہی ٹھہرا رہا۔قسم سے انجو مجھے خود بھی پتہ نہیں چلا کہ کب اس کی اچھی عادتوں کے باعث اس کی محبت میں گرفتار ہوگئی۔دل کا راز میں نے کسی پر افشا نہیں کیا تھا لیکن نجانے ممی کیسے میری آنکھوں سے یہ بھید پا کر اشعر سے اس بات کا تذکرہ کر بیٹھیں۔اشعر نے اس سلسلے میں مجھ سے بات کی تو میں نے اسے ٹال دیا۔میں تمکین کے حق پر ڈاکہ ڈالنا نہیں چاہتی تھی لہٰذا خاموشی سے دل کا درد سہتی رہی۔اشعر اور تمکین کی شادی ہوئی۔دونوں بے انتہا خوش تھے۔میں بھی اسی میں خوش ہوگئی تھی کہ اریج احمر ان دونوں کے مابین آ گیا۔

اریج ایک لمبے عرصے سے تمکین کو چاہتا آ رہا تھا اور میں اس بات کی گواہ تھی لیکن اشعر سے یہ بات میں نے کبھی نہیں کی۔اریج نے تمکین کی قربت حاصل کرنے کے لئے اشعر سے بزنس پارٹنر شپ کر لی اور دن رات اس کے گھر آنے جانے لگا۔اشعر یہ سب زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اب تمکین بھی اس کے حقوق بھلا کر اریج کی طرف متوجہ ہونے لگی تھی۔میں نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر وہ اشعر کی اندھی محبت اور اندھے اعتماد کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے لاپروائی سے اپنی روش پر چلتی رہی۔''

یہاں تک پہنچ کر وہ چند لمحوں کے لئے رکتے ہوئے انجشاء کے تاثرات کا جائزہ لیتی رہی پھر اسے مکمل انہماک سے اپنی جانب متوجہ دیکھ کر اسی انداز میں اپنا سلسلہ کلام دوبارہ جوڑتے ہوئے بولی۔

''اشعر سے بے پناہ محبت کے باعث تمکین کو اس کا مزاج سمجھنا چاہیے تھا۔ایک غیر شخص کے لئے اپنے گھر میں فساد ڈالنا کہاں کی دانش مندی ہے۔کبھی اس کی حمایت میں اشعر سے کچھ کیوں نہیں کہتی جب کہ اشعر کا اس میں کوئی قصور ہی نہیں تھا۔وہ تمکین کو صرف خود میں مصروف رکھنا چاہتا تھا اور ایک شوہر ہونے کی حیثیت سے اس کی یہ خواہش جائز تھی۔لہٰذا جب تمکین ضد میں آ کر شرافت کی حدود پھلانگنے لگی تو وہ بھی غصیلا اور چڑچڑا ہو گیا۔ایسے وقت میں میں نے اسے سہارا دیا۔اپنی بے لوث محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے اس کے آنسو پونچھے اور شاید یہی میرا جرم تھا۔تمکین کی طرف سے از حد ڈسٹرب اشعر احمد نے میری بے لوث محبت، اپنائیت اور دوستی کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک روز شدت جذبات میں آ کر مجھے اپنے زیر اثر کر لیا۔میں ہرگز، ہرگز یہ سب نہیں چاہتی تھی انجو لیکن وہ اس وقت ہوش میں نہیں تھا۔اب بتاؤ اس سارے قصے میں سوائے اشعر سے ہمدردی کرنے کے میرا کیا قصور ہے؟ میں تو صرف اسے بہلانا چاہتی تھی تمکین کی طرف سے دی گئی ٹینشن سے دور رکھنا چاہتی تھی لیکن......اس ہمدردی کے چکر میں اپنا نقصان کروا بیٹھی اور وہ دونوں بھی ایک نہیں رہے۔اب سنا ہے کہ اشعر پھر سے تمکین کو حاصل کرنے کے لئے بھیانک منصوبے بنا رہا ہے۔اریج احمر کے ساتھ تمکین کی خوشی اس سے برداشت نہیں ہو رہی۔وہ انہیں پھر سے دور کر دینا چاہتا ہے پھر سے تمکین کے چہرے پر کالک مل دینا

چاہتا ہے جب کہ میرا بھی اب اسے کوئی احساس نہیں رہا۔ تم ہی بتاؤ انجواب اگر میں اسے حاصل کرنے کی خواہش کر رہی ہوں تو کیا یہ غلط ہے......؟''

ثیزا احمد کے لہجے میں کہیں کوئی جھول نہیں تھا۔ لہٰذا انجشا کو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے الفاظ کا اعتبار کرنا پڑا تھا۔

''اٹس او کے ثیزا! مجھے نہیں لگتا کہ اس سارے معاملے میں سو فیصد قصور وار صرف تم ہی ہو۔ لہٰذا جہاں تک ممکن ہو سکا میں تمہاری مدد کروں گی۔''

انجشا احمر کا لہجہ اب بھی بے لچک ہی تھا مگر اس کے باوجود وہ اطمینان سے مسکرا اٹھی تھی۔

''تھینکس...... مجھے امید تھی تم اس سلسلے میں میری مدد ضرور کرو گی۔ تھینک یو سو مچ انجشاء۔''

اس بار انجشاء نے اسے کچھ بھی کہنے کی بجائے' اس کے پرمسرت چہرے کی جانب' سرسری سی نگاہ ڈالتے ہوئے چپ چاپ اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

☆☆☆

راستے راستے' اجنبی راستے
رک گئے ہیں کہیں' چل پڑے ہیں کہیں
دھوپ کے راستے' چھاؤں کے راستے
کتنے آباد ہیں' کتنے برباد ہیں۔
حادثے واقعے
سانحے' سلسلے
یاد رکھتے ہیں یہ' راز رکھتے ہیں یہ
کھول سکتے ہیں' بول سکتے ہیں
راستے راستے
اجنبی راستے......

شہرین خان اس وقت خاصے پرسکون انداز میں بستر پر نیم دراز ''کیوں جاگتے ہو......؟'' سے یہ خوب صورت نظم پڑھ رہی تھی۔ جب اچانک ازمیر شاہ دروازے کو ہلکے سے ناک کرنے کے بعد اس کے کمرے میں چلا آیا۔

''ارے مائی! تم اور اس وقت۔ خیریت تو ہے ناں......؟''

صبح ہی صبح اسے اپنے سامنے دیکھ کر وہ واقعی حیران رہ گئی تھی۔

''پتہ نہیں زینی! میرا دل اس وقت بہت گھبرا رہا ہے۔''

شہرین خان کے سوال کا قدرے بے بسی سے جواب دیتے ہوئے وہ قریبی صوفے پر ٹک گیا تھا۔

جب شہرین اپنی نگاہیں بدستور اس کی سرخ سرخ سی نیم خوابیدہ آنکھوں میں ڈالتے ہوئے بولی۔

''ہوا کیا ہے......؟ لگتا ہے رات بھر سے سو بھی نہیں پائے ہو تم، ہے ناں......؟

''ہاں......''

خلاف توقع اس نے بڑے آرام سے اپنی شب بیداری کا اعتراف کر لیا تھا۔

''کیوں......؟'' وہ پہلے سے زیادہ حیران ہوئی تھی۔ تب ہی وہ لب کاٹتے ہوئے مضطرب لہجے میں بولا۔

''آئی ڈونٹ نو زینی! مجھے لگتا ہے پاکستان میں اریشہ کے ساتھ ضرور کوئی حادثہ درپیش آ گیا ہے۔''

''کیا......تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو......؟''

''مما سے بات ہوئی تھی میری۔ انہوں نے ہی بتایا تھا کہ اریشہ کی شادی ملتوی ہو گئی ہے۔ وہ مجھے اس سے متعلق کچھ اور بھی بتانا چاہتی تھیں لیکن ان کی آواز بھیگ گئی تھی۔ مجھے بنا خدا حافظ کہے انہوں نے اچانک رابطہ منقطع کر دیا تھا۔ پاپا نے بھی کھل کر کوئی بات نہیں کی ادھر ''شاہ ولاج'' میں فون کیا تو ملازمین سے پتہ چلا کہ سب لوگ کراچی گئے ہوئے ہیں کیوں گئے ہیں یہ وہ بھی نہیں بتا رہے۔ کوئی مجھ سے اریشہ کے متعلق تفصیلی بات کرنے پر تیار ہی نہیں ہے۔ میں اس وقت بہت پریشان ہوں زینی۔''

پریشانی کا اندازہ اس کے چہرے سے بخوبی ہو رہا تھا۔

''او کے اب آگے اس مسئلے کے لئے کیا سوچا ہے تم نے......؟''

شہرین خان اس معاملے میں فی الحال اس کی کوئی بھی مدد کرنے سے قاصر تھی لہٰذا اسی سے پوچھا تو وہ تھکے تھکے انداز میں اس کی طرف سرسری سی نگاہ ڈالتے ہوئے بولا۔

''میں آج شام کو ہی پاکستان کے لئے فلائی کر رہا ہوں چونکہ تم سرزمین پاکستان سے عقیدت رکھتی ہو۔ وہاں جا کر عام لوگوں کے حالاتِ زندگی کا مشاہدہ کرنا چاہتی ہو لہٰذا میری خواہش ہے کہ اس سفر میں تم میرے ساتھ چلو۔''

اپنا مدعا بیان کرنے میں اس نے ایک لمحہ نہیں لگایا تھا جب کہ شہرین خان اس کے الفاظ پر حیران رہ گئی تھی۔

''یہ......تم کیا کہہ رہے ہو ازمیر؟ م......میں تمہارے ساتھ پاکستان کیسے جا سکتی ہوں...... پتہ نہیں تمہارے گھر والے......''

''اوہ پلیز! اسٹاپ اٹ زینی۔''

ازمیر شاہ نے فوراً سے پیشتر بیزار کن انداز میں چلاتے ہوئے اس کی بات کو درمیان میں ہی کاٹ دیا تھا۔

''فوراً میرے ساتھ پاکستان چلنے کی تیاری کرو۔ میں نے تم دونوں کی سیٹ پہلے سے او کے کروالی ہے۔'' بے چینی اور بے کلی اس کے

انداز سے بخوبی عیاں ہو رہی تھی۔ لہٰذا شہرین خان نے اس سے مزید بحث کا ارادہ ترک کرتے ہوئے چپ چاپ اثبات میں سر ہلا دیا۔

اگلے روز کا روشن سورج طلوع ہوا تو وہ شہرین خان اور اس کے چار سالہ بچے کے ہمراہ بے مثال کا تیج میں موجود تھا۔

حائقہ بیگم تو اسے اپنے سامنے یوں اچانک دیکھتے ہی شاکڈ رہ گئی تھی جب کہ احسن صاحب نے ازحد مسرور ہوتے ہوئے لپک کر اسے سینے سے لگایا تھا۔

''کیسے ہو ینگ مین......؟''

خوشی ان کی آنکھوں سے برس رہی تھی۔

شہرین کو واقعی اس کے نصیب پر رشک آیا تھا۔

''آپ کی دعائیں ہیں پاپا۔ آپ سب کیسے ہیں۔''

ان سے الگ ہو کر حائقہ بیگم کی طرف نگاہ ڈالتے ہوئے اس نے پوچھا تھا جب وہ بھی لپک کر اسے سینے سے لگاتے ہوئے بولیں۔

''آ گیا تجھے ہمارا خیال ..... دیکھ فقط چند ہی ماہ میں صحت کتنی بگاڑ لی ہے تم نے اپنی۔'' ماں تھیں ناں شکوہ کئے بغیر نہیں رہ سکیں۔ جب کہ وہ زندگی بھر اسی تفکر کے لئے ترستا رہا تھا۔

''مما! آپ بھی ناں..... ہمیشہ میرے بارے میں مشکوک ہی رہتی ہیں خیر ان سے ملیں یہ شہرین خان ہے میری دوست شہرین کو پاکستان دیکھنے کا بہت شوق تھا لہٰذا اس کی خواہش پر میں اسے اپنے ساتھ ہی پاکستان لے آیا۔ اچھا کیا ناں......؟''

حائقہ بیگم اور احسن شاہ نے پہلی بار اپنے بیٹے کو یوں پٹر پٹر بولتے ہوئے دیکھا تھا۔ تب ہی دونوں نے بیک وقت مسکراتے ہوئے دھیمے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''السلام علیکم آنٹی اور انکل!''

ازمیر کے تعارف کروانے کے بعد شہرین خان نے سرعت سے آگے بڑھ کر ان دونوں کا پیار لیا تھا۔

''ماشاءاللہ واقعی بہت پیاری بچی ہے۔''

حائقہ بیگم جو پہلے اس کی شخصیت کے متعلق قدرے مشکوک تھیں اب اسے اپنی نگاہوں کے سامنے پا کر دل سے سراہے بغیر نہ رہ سکی تھیں۔ تاہم اس سے پہلے کہ ازمیر ان سے دیگر گھر والوں کے متعلق دریافت کرتا مکمل بلیک سوٹ میں ملبوس خوبصورت سی اریشہ خان اپنی وہیل چیئر دھکیلتے ہوئے وہیں وسیع لاؤنج میں چلی آئی۔

''کون آیا ہے حائقہ آنٹی......؟''

دونوں ایک دوسرے کے مقابل کیا آئے انہیں لگا جیسے وقت کی گردشیں تھم گئی ہوں۔

امیر شاہ کے اندر اسے وہیل چیئر پر بیٹھے دیکھ کر گویا ایک بھونچال آ گیا تھا۔ کس قدر حیرانگی سے پھٹی پھٹی سی نگاہیں اس کے شاکڈ چہرے پر

ڈالتے ہوئے وہ جیسے فنا ہو گیا تھا۔

"یہ..... یہ سب کیا ہے مما.....؟"

معطل حواس کے ساتھ واپس پلٹتے ہوئے اس نے حائقہ بیگم سے پوچھا تھا۔ جواب مکمل طور پر اس سے نگاہیں چرائے احسن صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے بے آواز رو پڑی تھیں۔

جس انہونی سے اس کا دل گھبرا رہا تھا بالآخر وہ انہونی ہو کر رہ گئی تھی۔

عشق حقیقی معنوں میں کسے کہتے ہیں۔ شہرین خان اس وقت ازمیر شاہ کی نم آنکھوں میں بغور دیکھتے ہوئے بخوبی بتا سکتی تھی۔

جب بھی تجھے بھولنا چاہا تو خیال آتا ہے
کبھی دھڑکن بھی کسی دل سے جدا ہوتی ہے
اپنی جانب میں بڑھا ہاتھ کوئی' تھام تو لوں
ایسا کرنے ہی سے توہین دفا ہوتی ہے

وہ پلکیں موندے بیڈ پر نیم دراز پڑا' اسی کی راہ دیکھ رہا تھا۔
جامنی رنگ کے سادہ سے کاٹن کے سوٹ میں ملبوس ہونے کے باوجود وہ اس وقت نہایت دلکش دکھائی دے رہی تھی۔
''جی......آپ نے مجھے بلایا.....''
کچن میں کھانا پکانے کے باعث اس کی پیشانی سے پسینے کے قطرے ٹپک رہے تھے' جنہیں اس نے فوراً دوپٹے کے پلو سے رگڑ ڈالا تھا۔
''بیٹھو تمکین! مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔''
شادی کے بعد جو اجنبی پن اس کے لہجے میں آ گیا تھا' تمکین اس کی وجہ بخوبی جانتی تھی' لہٰذا اس کے حکم پر چپ چاپ بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی۔
''کیا آپ اس شادی سے خوش ہیں......؟''
اس کے سوال پر بے ساختہ وہ دھیمے سے مسکرا اٹھی تھی۔
''میرے خیال میں یہ سوال' آپ کو شادی سے پہلے کرنا چاہئے تھا مسٹر اریج۔''
بہت مدھم لہجے میں دھیمے سے مسکراتے ہوئے اس نے کہا تھا۔
''درست کہہ رہی ہیں آپ' لیکن...... یہ شادی اتنی غیر متوقع طور پر اچانک ہوئی تھی کہ مجھے آپ سے بات کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔''
''اچھا...... چلیے آپ کہتے ہیں تو مان لیتی ہوں۔''
اس بار اس کا لہجہ ہلکے سے طنز سے پر تھا۔
''لیکن مسٹر اریج' شاید آپ بھول رہے ہیں کہ ہماری شادی کو آج پورا ایک ہفتہ ہو گیا ہے۔ اس ایک ہفتے کے دوران بھی میرا خیال ہے آپ کو مجھ سے اس معاملے پر بات کرنے کا موقع نہیں ملا' ہے ناں۔''
''آپ مجھے شرمندہ کرنے کی کوشش کر رہی ہیں تمکین۔''
اریج نے بے ساختہ اپنی نگاہیں چراتے ہوئے کہا تھا۔

''آپ غلط سوچ رہے ہیں مسٹر اریج' میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔''

وہ تو خود اندر سے بھری بیٹھی تھی۔ آج قدرت نے دل کا غبار نکالنے کا موقع دے ہی دیا تھا تو وہ خاموش رہ کر مزید خود کو سلگانے کی حماقت کیوں کرتی۔

''آئی ایم سوری' اگر میں نے دانستہ یا غیر دانستہ آپ کی دل آزاری کی ہے تو میں اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔''

اس کی نگاہیں اب بھی جھکی ہوئی تھیں۔

''اٹس او کے۔''

نرمی سے کہتے ہوئے وہ اس کے قریب سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔''

اسے قریب سے اٹھتے دیکھ کر وہ پھر سے بے قراری سے گویا ہوا تھا۔ جب وہ پلٹ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''اگر یہی سوال میں آپ سے کروں تو......؟''

''یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے تمکین......''

اس نے تمکین کی چالا کی پر ہلکا سا احتجاج کیا تھا۔

''سوری مسٹر اریج' میں آپ کے سوال کا تسلی بخش جواب چاہوں بھی تو نہیں دے سکتی کیونکہ ہم مشرقی لڑکیاں' بھیڑ بکریوں کی مانند بے زبان رہتے ہوئے' ہمیشہ والدین کے فیصلوں پر سر جھکا کر خوش رہنے کی کوشش کرتی ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے آپ اس شادی سے خوش نہیں ہیں۔''

وہ اپنی طرف سے ہی نتیجہ اخذ کرتے ہوئے بولا تھا۔ جب کہ تمکین دھیرے سے رخ پھیرتے ہوئے بولی۔

''شادی ہمیشہ خوش رہنے کے لئے نہیں کی جاتی اریج۔''

''لیکن میں تمہیں ہر حال میں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔''

قطعی بے ساختگی کے عالم میں فوراً وہ کہہ گیا تھا۔

تمکین اس لمحے محض استہزائیہ سے انداز میں مسکرا کر رہ گئی تھی۔

''مجھے تم سے ایک اور بات بھی کرنی تھی۔''

تمکین کو اٹھتے دیکھ کر ایک مرتبہ پھر اس نے دھیمے لہجے میں کہا تھا۔ لہٰذا دوپٹے کا پلو انگلی پر مروڑتے ہوئے وہیں ٹھہر گئی۔

''میں اس شادی سے خوش نہیں ہوں تمکین' کیونکہ......کیونکہ میں تم سے پیار نہیں کرتا۔''

تمکین اگر تمام صورت حال سے باخبر نہ ہوتی تو شاید اس کے اندر تک سناٹے اتر جاتے' مگر اس وقت وہ از حد پر سکون تھی' تبھی ایک پھیکی

سی مسکان لبوں پر پھیلاتے ہوئے بولی۔

''تو......؟''

''تو یہ کہ......تم جب چاہو مجھ سے اپنی آزادی طلب کر سکتی ہو۔''

کس قدر کرب کے انداز میں اپنی بات مکمل کرتے ہوئے اس نے آہستہ سے رخ پھیرا تھا' مگر اس بار تمکین رضا بنا اس سے کچھ کہے' فوراً کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

اریج احمر کا دل اس وقت شدت سے چاہ رہا تھا کہ وہ خود کو شوٹ کرلے۔

تمکین رضا کو گہرے دکھ سے ہمکنار کرنے کے بعد' اب زندہ رہنے کی کوئی خواہش اس کے اندر باقی نہیں رہی تھی۔

کیسے عجیب دوراہے پر گھسیٹ لائی تھی زندگی اسے کہ نہ آگے جانے کا کوئی راستہ اسے دکھائی دے رہا تھا اور نہ ہی اب واپس پلٹنے کی ہمت رہی تھی اس میں۔

☆☆☆

بے مثال کاٹیج میں اس وقت سبھی لوگ موجود تھے۔

حائقہ بیگم' احسن شاہ' بلال شاہ' آمنہ بیگم' ان کے بچے دانیہ' فائقہ اور کاشف' اس کے علاوہ نورینہ بیگم اور شہریار جاوید صاحب۔

اریشہ خان اور ازمیر شاہ اس وقت ان کا مرکز بنے ہوئے تھے۔

زندگی میں پہلی بار ان سب نے ازمیر شاہ کو روتے ہوئے دیکھا تھا۔

گردن جھکائے' چپ چاپ آنسو بہاتا وہ اس وقت ان سب کو تکلیف سے دوچار کر رہا تھا۔

''کیوں کیا آپ سب نے میرے ساتھ ایسا' اتنا پرایا تو نہیں تھا میں۔''

بھیگی پلکوں کی پروا کیے بغیر نم لہجے میں کہتا وہ آج سارے حساب بے باق کردینے پر تلا ہوا تھا۔ احسن صاحب تو اس قدر شرمندہ کھڑے تھے کہ نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنا بھی ان کے اختیار میں نہیں رہا تھا۔ تبھی بلال شاہ صاحب' ہمت کرتے ہوئے اس کی طرف بڑھے تھے۔

''دل خراب مت کرو بیٹے' ہمارا مقصد تمہیں پرایا کرنا ہرگز نہیں تھا۔ بلکہ ہم نے یہ سب تم سے اس لئے چھپایا تاکہ پردیس میں تمہیں کوئی تکلیف نہ ہو۔''

''بس کیجیے انکل......پلیز۔''

اس بار وہ سسک اٹھا تھا۔

''کیسا عجیب مذاق ہے میری زندگی کے ساتھ۔ آپ سب لوگ ہر بار مجھے تکلیف سے بچانے کی کوشش میں میرا پور پور لہولہان کر دیتے ہیں۔ میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوتا ہے۔''

بے بسی سے گھٹے گھٹے انداز میں کہتے ہوئے وہ ایک دم سے چلا اٹھا تھا۔

''برسوں پہلے مما اور پاپا کے بیچ جو جھگڑا ہوا اس کا نقصان کسے اٹھانا پڑا؟ ہمیں' ماں باپ کے ہوتے ہوئے بھی لاوارثوں جیسی زندگی جینے پر مجبور ہو گئے تھے ہم' بہن بھائی' سمیعہ تو پھر بھی آمنہ آنٹی کی شفقت تلے آ کر بہل گئیں' مگر میں...... میرے آنسو پونچھنے کی فرصت تو کسی کے پاس بھی نہیں تھی۔ ایک دم سے سب کے لیے پرایا ہو گیا تھا میں۔ کسی کو اتفاق سے یاد آ تا تو کوئی کھانے کے لیے پوچھ لیتا' ورنہ تین تین دن خالی پیٹ ہی گزر جاتے تھے اور کسی کو احساس بھی نہیں ہوتا تھا' وہ تکلیف سہنے کا ابھی عادی بھی نہیں ہوا تھا کہ آپ لوگوں نے میری مرضی کے خلاف' مجھے خود سے الگ کر کے دیارِ غیر میں پھینک دیا' کسی نے اس وقت نہیں سوچا کہ اگر وہاں میرا دل نہ لگا تو میں کیا کروں گا' کہاں جاؤں گا؟ وہاں کون ہوگا جو بیماری میں میری دیکھ بھال کرے گا۔

دل اس درد کو سہنے کا بھی عادی ہو گیا تو ایک مرتبہ پھر مجھے واپس شاہ ولاج میں طلب کر لیا گیا۔ جہاں اس بار بھی میرے لیے سوائے تحقیر کے اور کچھ نہیں تھا۔ یہ سب لوگ' یہ میرے چچا' تایا' پھوپھو زاد' یہ سب میری کم صورت کا میرے منہ پر مذاق اڑاتے رہے' لیکن میں ڈھیٹ بنا' آنکھیں اور کان بند کیے پھر بھی ان سب کے بیچ ہنسی خوشی رہتا رہا۔ کبھی کسی سے کچھ نہیں کہا۔ ایسے میں اس لڑکی نے' جو دنیا میں واحد میرا درد سمجھنے والی ہستی' اس نے میرے آنسو پونچھنا چاہے تو میرے اپنے ہی گھر والوں نے اس کی بے لوث معصوم ذات پر سو سو بہتان رکھ دیے جس کے نتیجے میں نا صرف مجھے مجبوراً صالحہ بھابھی کی بہن سائلہ کو اپنانا پڑا۔ بلکہ ایک مرتبہ پھر شاہ ولاج سے در بدر ہو کر دیارِ غیر کا رخ کرنا پڑا۔ کیونکہ میں اپنی خوشی کے لیے' اس پیاری سی لڑکی کو کوئی دکھ دینا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن آپ نے مجھے اسی لڑکی کے دکھ سے بے خبر رکھا' کیوں انکل......؟ اس سے تو بہتر تھا میرا ہی ایکسیڈنٹ ہو جاتا' میں ہی مر گیا ہوتا کسی حادثے میں۔''

اس کے ضبط کی ساری طنابیں جیسے ٹوٹ گئی تھیں۔

دل کے ساتھ ساتھ اس کا لہجہ بھی درد سے لبریز ہو گیا تھا۔ تبھی شہریار جاوید صاحب اس کے قریب آئے تھے۔

''ایسا مت کہو بیٹے' بے شک اب تک تمہارے ساتھ جو کچھ بھی ہوا' وہ بھلانے کے لائق نہیں ہے لیکن گزرے ہوئے وقت کی تلخ یادوں سے نظریں چرا کر جینا ہی حقیقی بہادری ہے بیٹے' زیادتیاں تو میرے ساتھ بھی ہوئی ہیں' میں نے بھی بڑا کرب جھیلا ہے' لیکن کیا کریں' کرب کی دلدل میں دھکیلنے والے بھی تو اپنے ہی ہیں۔ بہرحال اب تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اریشہ کل بھی تمہاری دوست تھی اور آج بھی سب سے زیادہ تمہارے ہی قریب ہے۔ اب اگر کسی نے میری بیٹی کے کردار کی طرف انگلی اٹھانے کی کوشش کی تو میں یہ خطا ہرگز برداشت نہیں کروں گی' خواہ مقابل میرے اپنے ہی کیوں نہ ہوں۔''

ازمیر کو تسلی دینے کے بہانے انہیں اپنے دل کا غبار نکالنے کا موقع بھی میسر آ گیا تھا۔ لہٰذا آج سب لوگوں کے بیچ انہوں نے بھی دل کے پھپھولے پھوڑنے میں قطعی کوئی تاخیر نہیں کی تھی۔ احسن شاہ کے ساتھ ساتھ بلال شاہ اور نورینہ بیگم کے سر بھی جھکے ہوئے تھے۔

''میں بہت تھک گیا ہوں انکل' یہ صعوبتیں اب مزید برداشت نہیں ہوتیں مجھ سے......'' صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے اس بار

وہ پلکیں موند گیا تھا۔

حائقہ بیگم اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتی تھیں لہٰذا لپک کر اسے اپنی بانہوں میں لیتے ہوئے وہ خود بھی بلک کر رو پڑی تھیں۔

''آئی ایم سوری بیٹے...... آئی ایم ویری سوری۔''

احسن صاحب بھی اس کی دوسری سائیڈ پر آ کر چپکے سے بیٹھ گئے تھے۔ لہٰذا اسے اپنے آنسو پونچھ کر خود کو سنبھالنا ہی پڑا۔

☆☆☆

بہتے اشکوں کے تسلسل میں روانی کم ہے

ایسا لگتا ہے کہ دریاؤں میں پانی کم ہے

تو نے دامن میں سمیٹے ہیں زمانے کتنے

اے محبت تجھے انسان سا فانی کم ہے

وہ گم صم سی بیٹھی اریج کے لئے سوپ بنا رہی تھی' جب اچانک ڈور بیل کے بجنے کی آواز نے اسے حقیقت کی تلخ ترین دنیا میں لا پٹخا۔

تھکے تھکے سے قدموں کو بمشکل گھسیٹتی وہ داخلی دروازے تک آئی' تو سامنے ہی اریشہ خان کو دیکھ کر اس کی ساری اداسی جیسے اڑن چھو ہو گئی۔

اریشہ گاڑی سے نکل کر تمکین کے سیاہ گیٹ تک بیساکھیوں کے سہارے ہی آئی تھی' لیکن گھر کے اندر داخل ہوتے ہی اس نے بیساکھیاں ایک سائیڈ پر پھینک دیں۔

''کیسی ہے میری عزیز از جان......؟''

تمکین کے گلے لگ کر اس کا گال چومتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔ جب وہ اپنے حصار کا پیار اسے لوٹاتے ہوئے بولی۔

''شکر ہے اللہ کی پاک و بے نیاز ذات کا' تو سنا' تیرے مسائل کس حد تک حل ہوئے؟''

''مسائل تو سمجھو سبھی حل ہو گئے لیکن یہ جو بیساکھیوں کا طوق تم لوگوں نے میرے گلے میں ڈالا ہے ناں' ایمان سے میں اس سے بڑی عاجز آ گئی ہوں۔''

اس کے چہرے کے ایکسپریشنز کچھ ایسے تھے کہ بے ساختہ تمکین مسکرا اٹھی تھی۔

''یہ سب بھی تیرے ہی بھلے کے لئے کیا ہے سویٹ ہارٹ۔''

''ہاں تو میں کب اس سے انکار کر رہی ہوں۔''

سرسری سے لاپروا لہجے میں کہتے ہوئے اس نے بے مقصد ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تھی۔

''اریج بھائی گھر پر ہی ہیں کیا؟''

بیڈروم سے اریج کے کھانسنے کی آواز سن کر بے ساختہ وہ پوچھ بیٹھی تھی۔

''ہاں' پچھلے کئی دنوں سے طبیعت ٹھیک نہیں ہے ان کی۔''

''خیریت...... میرا مطلب ہے ولیمے والے روز بھی تیز بخار میں تھے وہ۔''

''ہاں بس تب سے ہی بخار چپک کر رہ گیا ہے۔ کسی طرح سے کم ہی نہیں ہو رہا۔''

''یہ تو اچھی بات نہیں ہے نمی' تو ان کا بھرپور خیال تو رکھ رہی ہے ناں......''

اریشہ کے لہجے میں ہلکی سی تشویش تھی جس پر وہ دھیمے سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

''ہاں' اپنی سی کوشش تو کر رہی ہوں میں۔''

''ایک بات پوچھوں' سچ سچ بتاؤ گی......؟''

اس بار اریشہ نے بغور اس کا چہرہ پڑھتے ہوئے پوچھا تھا۔ جواب میں اس نے ایک مرتبہ پھر دھیمے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ہاں پوچھ' کیا پوچھنا چاہتی ہے۔''

''تو...... اریج بھائی کے ساتھ خوش تو ہے ناں نمی؟''

پتہ نہیں وہ اس کی اداس نگاہوں سے کون سا راز کھوجنا چاہ رہی تھی۔

تمکین کو اس وقت بے ساختہ اپنی نگاہ چرانی پڑی تھی۔

''ہاں...... بہت خوش ہوں میں' لیکن تو یہ سب کیوں پوچھ رہی ہے؟''

''بس یونہی......''

اریشہ کو شاید اس کے کھوکھلے لہجے پر اعتبار نہیں آیا تھا۔

''اچھا مجھے چھوڑ' تو اپنی سنا' تیرے ممی پاپا کے بیچ صلح ہوئی کہ نہیں؟ اور وہ ہمارے ہیرو از میر صاحب' ان کا کیا حال ہے؟''

اس سے پہلے کہ اریشہ اس سے کوئی اور تکلیف دہ سوال کرتی' اس نے فوراً سوالوں کا رخ اسی کی جانب موڑ دیا جس پر وہ قدرے اداسی سے انگلیاں چٹخاتے ہوئے بولی۔

''پاپا صلح کی کوشش تو کر رہے ہیں نمی' امید ہے اللہ اس بار ضرور ان کا ساتھ دے گا۔ البتہ جہاں تک میر اسوال ہے تو وہ مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا۔ ابھی کل ہی پاکستان واپس لوٹ آیا ہے وہ۔ میں یہی بات تم سے شیئر کرنا چاہ رہی تھی۔''

اتنی بڑی خوشخبری کے باوجود اس کے لہجے میں گھلی ہوئی اداسیاں' تمکین کو ورطۂ حیرت میں ڈال گئی تھیں۔

''پتہ ہے نمی' میرے ایکسیڈنٹ کی خبر نے اسے ایک دم سے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ کل میں نے خود اسے اپنی آنکھوں سے روتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتی نمی' میں اپنی وجہ سے اسے تکلیف میں نہیں ڈال سکتی۔ اسی لئے میں نے یہ طے کر لیا ہے کہ میں اسے اس

ڈھونگ کے متعلق سب کچھ سچ سچ بتا دوں۔''

''نہیں.....فی الحال تو ایسی کوئی حماقت نہیں کرے گی۔''

تمکین نے فوراً درشت لہجے میں اسے ٹوک دیا تھا۔

''مائینڈ یو ارشی' یہی وقت ہے اپنوں کی صحیح پہچان کا' مت بھول کہ اذہان کے جذبے' تجھے معذور دیکھ کر آل ریڈی سرد پڑ چکے ہیں۔اب ازمیر شاہ کی باری ہے۔اسی معذوری سے اس کا پیار جانچ' وہ اگر واقعی تجھ سے مخلص ہوا تو یقین کر' تجھے ہر حال میں اپنائے گا' ابھی نقاب اتارنے کا صحیح وقت نہیں ہے۔''

تمکین کی ہدایت پر وہ پھر سے اپنے کمزور ارادوں کو پیچھے دھکیل گئی۔

اسی وقت تمکین نے کچن کا رخ کیا تو وہ بھی اس کے پیچھے ہی کچن میں چلی آئی۔

''تجھے ایک تازہ ترین بمباسٹک نیوز سناؤں۔''

فریج سے ٹھنڈا سیب نکال کر مزے سے کاٹتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔جواب میں سوپ ٹھنڈا کرتی تمکین رضا محض ایک سرسری سی نگاہ اس پر ڈال کر رہ گئی۔

''سنا' کیا سنانا چاہتی ہے؟''

''خبر بڑی دھماکہ خیز ہے' تیرے ہاتھ سے یہ سوپ والا باؤل چھوٹ بھی سکتا ہے۔''

ہنوز سیب کترتے ہوئے وہ اس کا ضبط آزما رہی تھی۔تبھی تمکین چڑ گئی۔

''بول دے ناں ارشی' کیا سنانا چاہتی ہے تو مجھے۔خواہ مخواہ ٹینشن میں نہ ڈال۔''

''چل سن.....وہ تیری عزیز از جان' ولن نما کزن ہے ناں شیزا' آج کل کراچی میں چلتی پھرتی دکھائی دے رہی ہے۔''

''کیا.....؟''

تمکین واقعی حیرانی سے اس کی طرف دیکھتی رہ گئی تھی۔

''ہاں یار' فرحان بھیا نے خود اسے انجو کے ساتھ میکڈونلڈ میں بیٹھے دیکھا تھا۔''

''کیا کہہ رہی ہے ارشی.....شیزا اور انجو کے ساتھ' ناممکن' انجو تو اس کی اصلیت جانتی ہے' پھر وہ اس کے ساتھ کیسے ہو سکتی ہے.....؟''

تمکین کے لہجے میں اس بار حقیقتاً شاک سمٹ آیا تھا۔

''وہ میں نہیں جانتی' لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ فرحان بھیا مجھ سے غلط نہیں کہہ سکتے۔''

اریشہ خان کی اس زبردست خبر نے واقعی اس کے ہوش اڑا دیئے تھے۔

''ایسا کیسے ممکن ہے یار' انجو کو اچھی طرح جانتی ہوں میں' وہ ایسا کبھی نہیں کر سکتی۔ضرور اس کے پیچھے کوئی اور بات ہوگی۔تو ایسا کر ابھی انجو

کو کال کر کے ہم تینوں کی میٹنگ ارینج کر اب حقیقت کیا ہے' یہ انجو ہی ہمیں بتا سکتی ہے۔''

اریشہ کو تمکین کی تجویز خاصی مناسب لگی تھی۔ لہٰذا اس نے فوراً انجشاء کا پرسنل نمبر پریس کر ڈالا۔

''ہاں بول اریشہ کیسے یاد کیا......؟''

''دوسری طرف چار پانچ بیلز کے بعد اس نے کال پک کرتے ہی عجلت بھرے انداز میں پوچھا تو اریشہ نے فوراً اپنا مدعا بیان کر دیا۔

''او کے ابھی تو میں آفس میں بے حد مصروف ہوں' شام چھ بجے کے ایف سی میں ملتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔''

اس بار اس کا انداز قدرے بدلا ہوا تھا۔ لہٰذا اریشہ نے فوراً سلسلہ منقطع کرتے ہوئے تمام صورت حال تمکین کے گوش گزار کر دی جس پر وہ پہلے سے زیادہ پریشان ہو کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

وفا رسوا نہیں کرنا' سنو ایسا نہیں کرنا
میں پہلے ہی اکیلا ہوں' مجھے تنہا نہیں کرنا
میری ان جھیل آنکھوں کو کبھی صحرا نہیں کرنا
بہت مصروف ہو جاناں مجھے سوچا نہیں کرنا
بھروسہ بھی ضروری ہے مگر سب پر نہیں کرنا
مقدر پھر مقدر ہے کوئی دعویٰ نہیں کرنا
میری تکمیل تم سے ہے
مجھے آدھا نہیں کرنا
جو لکھا ہے وہی ہوگا
کبھی شکوہ نہیں کرنا

انجشاء اس وقت اپنے شاندار آفس میں بیٹھی' عدنان کے آفس پہنچنے کا انتظار کر رہی تھی جب اچانک اس کی پرسنل سیکرٹری نے اسے شیزا احمد نامی لڑکی کی آمد کی اطلاع دی۔ جواباً اس نے کچھ سوچتے ہوئے فوراً شیزا کو اپنے کیبن میں آنے کی اجازت دے ڈالی تھی۔

''السلام علیکم۔''

اندر داخل ہوتے ہی اس نے خاصا زوردار سلام کیا تھا۔

''وعلیکم السلام' آؤ بیٹھو۔''

جواباً انجشاء احمر نے بھی خاصی مروت سے کام لیا تھا۔ نتیجتاً وہ اس کے سامنے ہی کرسی پر ٹک گئی۔

''اب بول' صبح ہی صبح پھر میری یاد کیسے آ گئی تجھے......؟''

''خدا کا نام لے یار......دن کے ساڑھے بارہ ہو رہے ہیں اور تیری ابھی صبح ہی نہیں گئی......''

اس کی نسبت شیزا کا لہجہ خاصا فریش تھا' لہٰذا وہ بس دھیمے سے مسکرا کر رہ گئی تھی۔

''چائے پیو گی یا کافی۔''

شیزا سے اس کا الجھا ہوا انداز مخفی نہیں رہ سکا تھا۔ یقیناً وہ تمکین کو لے کر ڈپریس ہو رہی تھی۔ تاہم وہ اپنے لہجے کو مزید خوشگوار بناتے ہوئے بولی۔

''تو جو مرضی پلا دے' میں انکار نہیں کرنے والی۔''

اس کے جواب کے بعد انجشاء نے انٹرکام پر دو کپ چائے کا آرڈر دیا تھا۔

''چائے آ رہی ہے' اب بتا' میرے آفس تک کیسے آنا ہوا؟''

''تجھ سے کچھ کام تھا انجو......''

''ہاں تو بول نا اب کیا مسئلہ درپیش آ گیا تجھے۔''

''وہ......اصل میں بات یہ ہے کہ میں......تیرے آفس میں' تیرے ساتھ کام کرنا چاہتی ہوں۔''

شیزا اپنا مقصد بیان کرتے ہوئے قدرے ہچکچائی تھی۔ وہ حیرانی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''خیریت۔ یہ اچانک جاب کا بھوت کیوں سوار ہو گیا تیرے سر پر؟''

''بھوت ووت سوار نہیں ہوا ہے یار۔ جاب اب ضرورت بن گئی ہے میری۔ اشعر کی محبت میں جو غلطیاں بھی مجھ سے سرزد ہوئی ہیں' میرے گھر والے ان پر مجھ سے خفا ہیں۔ لہٰذا مالی سپورٹ بھی بند کی ہوئی ہے جبکہ ''حسن ولاج'' کے دروازے بھی اب میرے لئے وا نہیں رہے۔ پچھلے کئی ماہ سے سخت خوار ہو رہی ہوں۔ اسی لئے کل تجھ سے ملنے کے بعد میں نے یہ سوچا کہ کیوں نا اس سلسلے میں بھی تجھ سے مدد کی درخواست کروں۔ آخر دوست ہی تو مصیبت میں کام آتے ہیں۔''

اپنی کوئی بھی بات کسی کے دل میں اتارنے کا فن اسے بخوبی آتا تھا۔ تبھی انجشاء تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

''ہاں کیوں نہیں......آج کل تو ویسے بھی مجھے نیو ورکر کی خاصی ضرورت ہے۔ کچھ کاہل اور بے ایمان لوگوں کو جلد ہی یہاں سے فارغ کر رہی ہوں میں' تم جب چاہو کام اسٹارٹ کر سکتی ہو۔''

حقیقی سرشاری اس کے لہجے سے چھلک رہی تھی۔ لہٰذا انجشاء نے دھیمے سے مسکرا کر محض اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

''نمی اور اریشہ سے بات ہوئی تیری کہ نہیں۔''

اپنا مقصد حاصل ہو جانے کے بعد وہ اس موضوع کی طرف آئی تھی۔ جب کہ انجشاء نے قدرے سپاٹ لہجے میں اسے بتایا۔

''ہاں..... ابھی ارشی سے بات ہو رہی تھی میری۔ کہیں ملنے کا کہہ رہی تھی۔ لہجہ سے قدرے پریشان لگ رہی تھا۔ شام چھ بجے کے ایف سی میں ملنے کا کہہ دیا ہے میں نے۔''

وہ یہ بات شیزا کو بتانا نہیں چاہتی تھی مگر بے ساختگی میں اس سے شیئر کر بیٹھی تھی جس پر وہ دھیمے سے مسکراتے ہوئے بولی۔ ''انہیں یقیناً ہماری ملاقات کی خبر ہو گئی ہو گی۔ اب دیکھ لینا وہ تجھے مجھ سے ملاقات کی اجازت نہیں دیں گی۔''

''ایسا کچھ نہیں ہو گا۔ تم بے فکر رہو۔ انجشاء احمر کانوں کی کچی نہیں ہے۔''

اس کا ذہن کسی گہری سوچ میں ڈوبا تھا۔ جب کہ لہجہ از حد مضبوط تھا۔ لہٰذا شیزا نے ہوشیاری سے فوراً موضوع گفتگو بدل دیا تھا۔

''اچھا انہیں چھوڑ' تو عدنان کا سنا' کیا حال ہے؟ اپنے پاؤں پر چلنے کے قابل ہوا کہ نہیں؟''

وہ دور رہ کر بھی تمام حالات سے باخبر دکھائی دیتی تھی۔ تبھی وہ قدرے یاسیت سے بولی۔

''ابھی کہاں..... اسے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لئے کئی سال درکار ہیں شیزا۔''

''اومائی گاڈ..... اس کا مطلب ہے تو کئی سال تک اس کا بوجھ اٹھائے گی جب کہ تو اس سے محبت بھی نہیں کرتی اور پھر ماضی میں جو کچھ اس نے تیرے ساتھ کیا' اس کے بعد' وہ اب کس منہ سے تیرا احسان لے رہا ہے؟''

''کہیں تو اس پر ترس تو نہیں کھا رہی انجو؟''

شیزا کے لہجے میں عدنان کے لئے گھلا زہر بدقسمتی سے اس کی سماعتوں میں اتر گیا تھا۔ وہ جو از حد خوشگوار موڈ میں انجشاء کی پرسنل سیکریٹری کے ساتھ' اپنی وہیل چیئر دھکیلتے ہوئے اس کے کمرے میں داخل ہوا ہی چاہتا تھا' اب شیزا کی بلند آواز میں گل فشانی پر جیسے ساکت رہ گیا تھا۔ سیکریٹری اسے دہلیز تک چھوڑ کر کب کی جا چکی تھی جب کہ وہ برف ہوتی سماعتوں کے ساتھ سن سا بیٹھا' شیز احمر کے لفظوں کی بازگشت میں ٹوٹتا بکھرتا رہا تھا۔

☆☆☆

ہم ہی نے منکشف اس پر کیے سب شعبدے اسکے
ہم ہی نے سادا سا اک شخص جادوگر بنا ڈالا

وہ اب بھی ساکت سا بیٹھا اندر کمرے میں ابھرنے والی انجشاء احمر کی آواز کو سن رہا تھا۔ جو اس کے دل پر ٹوٹنے والی اچانک قیامت اور اس کی آمد سے یکسر بے نیاز اپنے مقابل بیٹھی شیزا احمر کی طرف دیکھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''اس نے میرے ساتھ جو کیا وہ اس کا ظرف تھا شیزا' لیکن اب میں اس کے ساتھ جو کر رہی ہوں وہ میرا ظرف ہے۔ یہ سچ ہے کہ میں اب بھی اس سے محبت نہیں کرتی' لیکن...... پھر بھی میں اس کا ساتھ نبھانے پر مجبور ہوں شیزا کیونکہ اس وقت وہ واقعی میرے سہارے کا محتاج ہے۔''

''واہ...... تم بہت عظیم لڑکی ہو انجشاء' میں نے واقعی اب تک تم جیسی بڑے دل والی لڑکی نہیں دیکھی۔ تمہاری جگہ اگر میں ہوتی تو خوب گن گن کر بدلے لیتی۔ ایسے خود غرض اور مطلب پرست انسان سے' جس نے اپنی اڑان کے دنوں میں ہمیشہ تمہیں زمین دکھائی' لیکن اب جو خود پر وقت پڑا' تو تجھ سے قربانیاں مانگ لیں۔ یہ مرد واقعی بڑے خود غرض اور سفاک ہوتے ہیں انجو......''

اس وقت اس کے لہجے میں عدنان کے لئے اتنی تحقیر تھی کہ اس کا دل درد کی شدت سے پھٹ جانے کو تیار ہو گیا تھا۔ اس وقت وہ نہ جانے کیسے خود کو سنبھال کر' گھر واپسی کے لئے پلٹا تھا جب کہ انجشاء اس کی آمد سے یکسر بے خبر اندر کمرے میں شیزا سے کہہ رہی تھی۔

''چھوڑ یار...... اب وہ بہت بدل گیا ہے۔ پھر اب...... مجھ سے بھی اس کی تکلیف برداشت نہیں ہوتی۔ آنے والا وقت پتا نہیں ہمارے لئے کیا لے کر آ رہا ہے' لیکن یہ طے ہے کہ اب میں عدنان سے ہٹ کر کسی اور کے سنگ زندگی گزارنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ اب تم اسے میری ہمدردی کہو' یا مجبوری لیکن یہ سچ ہے کہ اب میں اس سے خود بھی بچھڑنا نہیں چاہتی شیزا' جانے کیوں......''

''او...... تو اس کا مطلب ہے کہیں دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔ شرم کرو کچھ...... دل بغاوت پر آمادہ ہے اور تو پھر بھی ڈھٹائی سے ''محبت نہیں ہے'' ''محبت نہیں ہے'' کی گردان دہرا رہی ہے۔ تف ہے تجھ پر۔''

پہلی بار شیزا کے الفاظ اسے اچھے لگے تھے۔ لہٰذا وہ سر جھکا کر دھیمے سے مسکراتے ہوئے جانے کیا سوچنے لگی تھی۔

شیزا کچھ دیر ادھر ادھر کی گپ شپ کے بعد بالآخر رخصت ہو گئی تھی۔ تب اس کی توجہ پھر سے عدنان کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔ خیالوں ہی خیالوں میں پلکیں موند کر' اسے مخاطب کرتے ہوئے وہ دھیمے سے بڑبڑا اٹھی تھی۔

''میں تم سے محبت نہیں کرتی عدنان' مگر پھر بھی تم میری روح میں سرایت کرتے جا رہے ہو' بے ساختہ ہی سہی' مگر تم سے ہنسی مذاق کرنا' تمہارے قریب رہنا' اب میری خوشی بن کر رہ گیا ہے۔ میں ان احساسات کو' کوئی بھی نام دینے سے قاصر ہوں، لیکن یہ سچ ہے کہ اب تم میری ضرورت بن کر رہ گئے ہو۔''

خود سے یہ اعتراف کرنا اسے بے حد اچھا لگا تھا۔ لہٰذا اسی وقت وہ کوئی چوتھی بار پھر سے عدنان کا سیل نمبر پریس کر رہی تھی' مگر اس بار

دوسری جانب سے بجائے عدنان کی خوبصورت آواز کے اسے کمپیوٹر کا مخصوص پیغام سننے کو ملا تھا۔

''معاف کیجئے' آپ کے مطلوبہ نمبر سے اس وقت کوئی جواب موصول نہیں ہو رہا' براہ کرم کچھ دیر بعد کوشش کیجئے۔ شکریہ۔''

''اوگاڈ۔ یہ عدنان کا بچہ بھی ناں' بہت لاپرواہ ہو گیا ہے۔ کرتی ہوں گھر جا کر سیٹ۔''

سیل آف کر کے دوبارہ میز پر رکھنے کے بعد وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے سامنے پڑی فائلز کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

ٹھیک چھ بجے کام سے فارغ ہوئی تو اریشہ کو مطلع کر کے سیدھی کے ایف سی پہنچ گئی جہاں تمکین اور اریشہ پہلے سے موجود اسی کا راستہ دیکھ رہی تھیں۔

''السلام علیکم...... کیسی ہو تم دونوں......؟''

کرسی گھسیٹ کر ان دونوں کے مقابل بیٹھتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔ جب کہ تمکین قدرے گہری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''ہم دونوں تو ٹھیک ہیں' تو اپنی سنا۔ آج کل تیرے حواس کچھ ٹھیک نہیں لگ رہے؟''

''کیوں...... میرے حواسوں کو کیا ہو گیا خدانخواستہ......؟''

دھیمے سے مسکراتے ہوئے اس نے خود کو فریش ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی۔

''سنا ہے شیزا سے ملی تھیں تم' خیریت تو ہے ناں......؟''

اب کے اریشہ نے اس سے پوچھا تھا' تبھی وہ اپنے مخصوص پراعتماد لہجے میں بولی۔

''ہاں' کل ملنے آئی تھی وہ مجھ سے' بہت پریشان ہے آج کل۔ بے روزگار بھی ہے۔ اسی لئے میں نے اپنے آفس میں رکھ لیا ہے اسے۔''

''وہاٹ۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس نے نمی کے ساتھ کتنا برا کیا۔''

اریشہ اس پر گھٹے گھٹے سے انداز میں چلا اٹھی تھی۔ جب کہ تمکین کی آنکھوں میں حد درجہ بے یقینی تھی۔

''ہاں...... سب کچھ جانتے ہوئے بھی میں اس کی مدد کر رہی ہوں کیونکہ نمی کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا اس کی ذمہ دار شیزا نہیں بلکہ یہ خود ہے۔ نہ یہ اریج کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھاتی' نہ اشعر کے دل میں اس کے لئے بدگمانی پیدا ہوتی۔ اسے اپنا گھر خود بچانا چاہیے تھا' اس کی ذمہ داری تھی' شیزا کی نہیں......''

اس کا تیز لہجہ' مکمل طور پر شیزا احمد کی سائیڈ لئے ہوئے تھا۔ تبھی تمکین اور اریشہ اپنی جگہ گویا شاکڈ رہ گئی تھیں۔

''یہ...... تم کہہ رہی ہو انجو......؟''

شدت غم سے آواز تمکین رضا کے حلق میں ہی پھنس کر رہ گئی تھی۔

''ہاں...... میں کہہ رہی ہوں یہ سب...... کیوں......؟ برا لگ رہا ہے تمہیں......؟ مجھے بھی بہت برا لگا ہے۔ خوامخواہ شیزا کو الزام دے رہی

تھی میں جب کہ اصل قصوروار تو تم ہو۔ تبھی قدرت نے تمہیں اشعر کی اولاد سے محروم رکھا۔ جب کہ شیزا اسی کے بچے کی ماں بن مفت میں خوار ہو رہی ہے......''

انجشاء احمر تلخ لہجے میں بول رہی تھی۔ جب کہ تمکین کی آنکھوں کے آگے جیسے اندھیرا چھا گیا تھا۔ فقط چند لمحوں میں اپنے چکراتے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامتی' وہ ہوش و حواس سے بےگانہ ہو چکی تھی۔

مسلسل سات گھنٹے بے ہوش رہنے کے بعد جب تمکین کو ہوش آیا تو رات کے تقریباً تین بج رہے تھے۔

کمرے کے خاموش ماحول میں اپنے بستر پر پڑی وہ ہر قسم کے احساس سے قطعی بے خبر دکھائی دے رہی تھی۔

ذہن ایک دم سے خالی ہو کر رہ گیا تھا۔

یاد کرنے پر بھی جیسے کوئی بات یاد نہیں آ رہی تھی۔ تبھی اریج اسے پلکیں وا کرتے دیکھ کر تیزی سے اس کی طرف بڑھا تھا۔

''اب کیسی طبیعت ہے تمکین؟''

اس کی آنکھوں اور حلیے سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ اس کے لئے کس قدر متفکر رہا ہوگا۔ تبھی وہ خالی خالی سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے رو پڑی تھی۔

''رو کیوں رہی ہو......؟ کوئی مجھے کچھ بتاتا کیوں نہیں ہے؟ پلیز تمکین' بتاؤ ناں کیا ہوا ہے؟'' شدید جھنجلاتے ہوئے وہ اس کے کندھے تھام کر قدرے بے بسی سے چلایا تھا۔ جب کہ وہ ٹوٹ کر اسی کے بازوؤں میں بکھرتے ہوئے مزید پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

دھڑ' دھڑ' دھڑ......

ایک ایک کر کے' انجشاء احمر کے تمام تیر پھر سے اس کے جگر پر حملہ آور ہو گئے تھے۔

اس کا لہجہ زہر بن کر پھر سے اس کی سماعتوں میں اترنے لگا تھا۔

''ہاں...... سب کچھ جانتے ہوئے بھی میں اس کی مدد کر رہی ہوں' کیونکہ نمی کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا اس کی ذمہ دار شیزا نہیں بلکہ یہ خود ہے۔ نہ یہ اریج کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھاتی نہ اشعر کے دل میں اس کے لئے بدگمانی پیدا ہوتی ہے۔ اسے اپنا گھر خود بچانا چاہیے تھا' اس کی ذمہ داری تھی یہ' شیزا کی نہیں۔''

''نمی...... نمی کیا ہو گیا ہے تمہیں......؟''

سخت بے بسی کا شکار وہ اس کے نڈھال سے وجود کو اپنی بانہوں میں سنبھالتے ہوئے' جیسے خود بھی روہانسا ہو رہا تھا جبکہ تمکین' انجشاء احمر کے لفظوں کی بازگشت سے کٹ رہی تھی۔

''ہاں...... میں کہہ رہی ہوں یہ سب......؟ کیوں......؟ برا لگ رہا ہے......؟''

''مجھے بھی بہت برا لگا ہے' بیکار میں شیزا کو الزام دے رہی تھی میں' جبکہ اصل قصوروار تم ہو' تبھی قدرت نے تمہیں' اشعر کی اولاد سے محروم

رکھا' جب کہ وہ شیزا' اسی کے بچے کی ماں بنی' مفت میں خوار ہو رہی ہے۔''

''نہیں......اشعر ایسا نہیں کر سکتا۔ بکواس کرتی ہے شیزا' وہ سب کچھ کر سکتا ہے مگر اتنا نہیں گر سکتا' میں جانتی ہوں اسے۔ وہ اتنے گھٹیا پن کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔''

اریج کی شرٹ کو سختی سے مٹھیوں میں دبوچتے ہوئے وہ قدرے جذباتی انداز میں بربڑائی تھی۔ جب اریج نے لہو ہوتے دل کا درد دبا کر' آہستگی سے اسے خود سے علیحدہ کر دیا۔

''کیا کیا ہے اشعر نے......؟ کیوں اتنا رو رہی ہو تم......؟''

اس وقت اس کی اپنی آنکھیں اور دل جیسے خون میں ڈوبے تھے مگر......اس کے مقابل بیٹھی وہ بے حس دوشیزہ' تا حال اس کے رقیب اشعر احمد کے درد میں بے حال ہو رہی تھی۔

اس کی آنکھوں سے بکھرتے آنسوؤں کا باعث وہ نہیں تھا مگر پھر بھی اس کے دل کو تکلیف ہو رہی تھی۔ اپنی محبت کو بلک بلک کر روتے ہوئے دیکھنا اسے اپنے اختیار سے باہر لگ رہا تھا۔

''تمکین' پلیز چپ ہو جاؤ' نہیں تو میرا دل درد سے پھٹ جائے گا۔''

آنکھوں میں عود آئی نمی کو پیچھے دھکیل کر وہ قدرے التجائیہ لہجے میں بولا تو تمکین نے سسکتے ہوئے اپنا سر اس کے مضبوط شانے پر دھر دیا۔

''اریج......میرا یقین کرو' میں نے کبھی اشعر سے بے وفائی نہیں کی۔ دل سے ٹوٹ کر' تمام تر سچائی کے ساتھ پیار کیا تھا اس سے' بچپن کا ساتھ تھا ہمارا' پھر بھی وہ مجھے نہیں سمجھ سکا۔ بدکرداری کا گھٹیا الزام لگایا اس نے مجھ پر' میں......میں ہمیشہ اس کے ساتھ کی دعائیں مانگتی رہی مگر وہ......وہ سرابوں کے پیچھے بھاگتے بھاگتے مجھ سے دور ہوتا چلا گیا۔ کیا کچھ برداشت نہیں کیا میں نے......کیا کیا کوشش نہیں کی اس سے اپنا تعلق نبھانے کے لئے مگر......پھر بھی وہ سارے گھروندے گرا گیا۔ ایک لمحے میں سارے تعلق ختم کر ڈالے اس نے......''

کسی اور کے درد میں آنسو لٹاتے ہوئے وہ اس کی شرٹ کو تر کر رہی تھی۔

اس لمحے اریج احمر کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس کے ہونٹوں پر اپنا بھاری ہاتھ رکھ کر اسے مزید بولنے سے روک دے' چپ کروا دے' مگر......

اس کا اختیار بھلا تمکین رضا پر کہاں چلتا تھا۔

سو گھائل ہوتے دل کے درد کو سنبھالتے ہوئے چپ چاپ وہ اسے بولتے ہوئے سنتا رہا۔

''اریج......وہ......وہ انجو کہتی ہے کہ اشعر سے اپنا تعلق توڑنے میں' میرا ہاتھ ہے۔ کوئی عورت جان بوجھ کر اپنا گھر خراب کرتی ہے' اپنے شوہر' اپنے محبوب کو گنواتی ہے......مجھے اشعر نے کہا تھا کہ اسے اتنی جلدی بچے نہیں چاہئیں' اس کی خوشی پر سر جھکایا تھا میں نے۔ آپ تو میرا یقین کرتے ہو ناں' آپ کو تو معلوم ہے ناں کہ میں اس سے کتنا پیار کرتی تھی۔ آپ تو گواہ ہیں ناں......پھر کیوں کیا اس نے میرے ساتھ ایسا۔ کیوں میری آنکھوں میں دھول جھونک کر بے وقوف بناتا رہا وہ مجھے' کیوں کہتی ہے انجو کہ سارا قصور میرا ہے......''

ہزار ضبط کی کوششوں کے باوجود بھی اس کی آنکھوں میں پھر سے آنسو امڈ آئے تھے جبکہ اریج سے جیسے اب مزید برداشت کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔

''بس کرو تمکین' پلیز...... میں بات کروں گا انجشاء سے' تم ٹینشن نہ لو' او کے' سو جاؤ اب......''

زبردستی اسے بستر پر لٹا کر وہ خود بھی اس کے برابر میں ہی لیٹ گیا تھا۔

محبتیں انسان کو کتنا کمزور' کس قدر بے بس و بے خود کر دیتی ہیں۔ تمکین رضا کی محبت میں بے حال ہونے سے قبل وہ قطعی نہیں جانتا تھا۔

☆☆☆

دن ڈھل رہا تھا اور شام نسبتاً گہری ہوتی جا رہی تھی۔ جب انجشاء احمر نے گھر کی دہلیز پر قدم رکھا تھا۔ آج جو کچھ بھی ہوا تھا' بے شک وہ درست نہیں تھا۔

اس کی کڑوی کسیلی باتوں کے جواب میں' تمکین کے حواس جیسے ساتھ چھوڑ گئے تھے اور پھر اس کے بعد اس نے اریشہ کے ساتھ مل کر جیسے اسے ہسپتال تک پہنچایا تھا۔ ان لمحوں کی اذیت محض وہی جانتی تھی۔

ہسپتال سے جس وقت اس نے اریج کو کال کر کے وہاں بلوایا تھا۔ اس وقت اس کی ٹانگیں اور ہاتھوں کی انگلیاں بری طرح سے کپکپا رہی تھیں۔ تمکین اس کے منہ سے سچائی سن کر اتنا غیر متوقع ری ایکٹ کرے گی' اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

ذہن عجیب سے احساسات و خیالات کی آماجگاہ بن کر رہ گیا تھا۔

وہ تمکین کو ہرٹ کرنا نہیں چاہتی تھی' نہ ہی اس کے خلاف کوئی میل آیا تھا اس کے دل میں۔ لہٰذا اب گزرتے ہر پل کے ساتھ اس کی ٹینشن جیسے بڑھتی جا رہی تھی۔

شدید تھکن اعصاب پر جیسے غالب آ رہی تھی۔

کل شام سے سیال بیگم کو ہلکا ہلکا بخار تھا لہٰذا ان سے گھر کا کام بھی نہیں ہو سکا تھا۔

انجشاء احمر نے اس وقت بمشکل خود کو سنبھالتے ہوئے' اپنے گھریلو فرائض سر انجام دیئے تھے۔ عدنان کا کمرہ مکمل بند تھا' مگر اس کے باوجود اسے یقین تھا کہ وہ اندر اپنے کمرے میں ہی ہوگا تبھی سیال بیگم اور رؤف صاحب کو گڈ نائٹ کہنے کے بعد وہ کافی کے دو مگ لے کر' اس کے کمرے کی طرف چلی آئی۔ ارادہ اپنی الجھن اس سے شیئر کرنے کا تھا۔ سو آہستہ سے دروازہ ناک کرنے کے بعد' وہ کمرے میں داخل ہو گئی تھی۔ تاہم اندر کمرے کا حال دیکھ کر اسے شدید کوفت محسوس ہوئی۔

عدنان کے سارے کپڑے وارڈ روب سے دربدر ہو کر بیڈ پر بکھرے پڑے تھے۔ اس کے جوتے اور موزے نیچے قالین پر پڑے اپنی بے قدری کا ماتم کر رہے تھے۔ کتابیں آدھی میز پر تھیں اور آدھی کرسی پر' بیڈ کی چادر اور تکیے بھی اپنی جگہ درست حالت میں نہیں تھے جبکہ عدنان' جس نے یہ سب کیا تھا' وہ خاصی بے نیازی کے ساتھ موبائل ہاتھ میں لئے قدرے سنجیدگی کے ساتھ کسی سے باتیں کرنے میں مشغول تھا۔

انجشاء کے اعصاب چونکہ پہلے ہی چٹخے ہوئے تھے لہٰذا وہ اس کی اس درجہ غیر ذمہ داری پر اندر ہی اندر کھولتے ہوئے اس کے کمرے کی حالت سدھارنے لگی۔ منہ ہی منہ میں بڑبڑانے کا سلسلہ بھی ساتھ ساتھ جاری تھا۔

عدنان نے سیل آف کر کے اس کی طرف توجہ کی تو وہ اس سے الجھ پڑی۔

''یہ سب کیا ہے عدنان۔ تم بچے تو نہیں ہو پھر کیوں کیا ہے یہ سب؟''

وہ پہلے بھی اکثر اس سے اسی لہجے میں بات کرتی تھی' مگر تکلیف کا احساس اس کے دل میں پہلی بار ہوا تھا۔ لہٰذا پلکیں موند کر' سر کرسی کی پشت سے ٹکائے ہوئے قدرے شکستہ لہجے میں بولا۔

''سوری...... ڈاکٹر دانیال کا وزٹنگ کارڈ گم ہو گیا تھا' وہی ڈھونڈنے کی کوشش میں یہ سب ہو گیا۔ میں سمیٹ لوں گا سب کچھ' تم جاؤ آرام کرو۔''

آج نہ صرف اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا بلکہ اطوار اور الفاظ بھی مختلف چھب دکھا رہے تھے' تبھی وہ حیرانگی سے اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

''عدنان...... کیا تم ٹھیک تو ہوناں......؟''

''ہاں...... بس کچھ تھکن محسوس ہو رہی ہے لہٰذا اب آرام کرنا چاہوں گا۔''

''ٹھیک ہے...... لیکن خدارا پہلے یہ کافی پی لو' کسی حد تک تھکن کا احساس کم ہو جائے گا۔''

گرما گرم کافی کا مگ اسے تھماتے ہوئے وہ خالص اپنائیت سے بولی تھی۔ مگر عدنان نے چاہتے ہوئے بھی نگاہ اٹھا کر اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

دل جیسے کٹ سا رہا تھا۔

رہ رہ کر شیزا کے زہریلے لفظوں کی بازگشت اس کی سماعتوں میں گونجتے ہوئے اسے اندر سے لہولہان کر رہی تھی۔

''او مائی گاڈ' اس کا مطلب ہے تو ٹئی سال تک اس کا بوجھ اٹھائے گی۔ جب کہ تو اس سے محبت بھی نہیں کرتی' پھر ماضی میں جو کچھ اس نے تیرے ساتھ کیا' اس کے بعد وہ اب کس منہ سے تیرا احسان لے رہا ہے۔ کہیں تو اس پر ترس تو نہیں کھا رہی انجو......''

اپنے کمرے کی دیواروں سے بھی اس لمحے اسے شیزا احمد کی آواز ہی سنائی دے رہی تھی۔ اتنی قربانیوں کے بعد بھی وہ انجشاء احمر کے دل میں اپنی جگہ بنانے میں ناکام رہا تھا۔

اس لمحے عدنان احمر کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اپنا سر دیوار میں دے مارے یا اپنے اردگرد موجود ہر چیز کو فنا کر دے۔

''کیا سوچ رہے ہو......؟ پھر سے کوئی پرابلم ہو گئی ہے کیا؟''

خاموشی سے کافی پیتے ہوئے وہ اس کے تھکے تھکے سے چہرے کا بغور جائزہ لے رہی تھی۔

''نہیں...... سب ٹھیک ہے......''

''بیٹھو پلیز......!''

اسے ٹکر ٹکر اپنی طرف دیکھتے پا کر اس نے کہا تھا۔ جب کہ وہ حیران حیران سی اس کے قریب آ بیٹھی۔

''پرسوں شام کی فلائٹ سے میں لندن جا رہا ہوں۔ واپسی نا جانے کب ہو لہٰذا جانے سے پہلے میں ہم دونوں کے بیچ موجود تمام الجھنیں ختم کر دینا چاہتا ہوں۔ امید ہے اس کوشش میں تم بھی مکمل ایمانداری سے میرا ساتھ دو گی......''

کیسا عجیب سا لہجہ تھا اس کا۔

نہ آنکھوں میں وہ پہلے سی چھلکتی دیوانگی دکھائی دے رہی تھی۔ نہ ہونٹوں پر وہ مخصوص سی مسکراہٹ رہی تھی جو انجشاء کو دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں پر عود آتی تھی۔

جانے کیوں اس وقت وہ اسے از حد ڈسٹرب اور الجھا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

کچھ لمحے یونہی خاموشی کی نذر ہو گئے تھے۔ جب وہ آہستہ سے گلا صاف کرتے ہوئے بولا تھا۔

''میرا ایکسیڈنٹ جن وجوہات کی بنا پر ہوا' تم اس سے غافل نہیں ہو پھر بھی میں تمہیں کوئی الزام نہیں دے رہا۔ تمہیں چاہنے پر میرا کوئی اختیار نہیں رہا۔ انجشا، پھر بھی تم نے جس طرح سے میرا ساتھ نبھایا' میری مدد کی' میں چاہوں بھی تو تمہاری اس نوازش کا صحیح طرح سے شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔ بہر حال زندگی کی آخری سانس تک تمہاری محبت اور احسان مندی کا احساس میرے ساتھ رہے گا۔ لیکن...... میں خود غرض نہیں ہوں انجو' ہاں یہ سچ ہے کہ میں اب بھی تم سے بے انتہا پیار کرتا ہوں' اب بھی صرف تمہاری ہی رفاقت کی طلب ہے مجھے۔ مگر اس کے باوجود میں تمہیں اختیار دیتا ہوں کہ تم اپنی زندگی کا فیصلہ اپنی مرضی سے کرو۔ تم پڑھی لکھی خوبصورت لڑکی ہو' یقیناً کوئی بھی اچھا لڑکا تمہارا ہاتھ تھامنے میں فخر محسوس کرے گا۔ تمہیں یہ حق حاصل ہے کہ تم زندگی سے اپنے حصے کی خوشیاں وصول کرو' ذمہ داریوں اور سوچوں سے مبرا ہو کر اپنی زندگی کے ایک ایک لمحے کو بھرپور انداز میں بسر کرو' میں اپنی محبت اور معذوری کو تمہارے پیروں کی بیڑیاں نہیں بناؤں گا انجو' محض اسی مقصد کے لئے میں آج کھلے دل سے تمہیں یہ حق دیتا ہوں کہ تم جب چاہو مجھ سے طلاق طلب کر سکتی ہو۔ مما اور پاپا دونوں میرے ساتھ ہی لندن جا رہے ہیں۔ تمہارے پاس سوچنے کے لئے کافی ٹائم ہو گا' لہٰذا جو تم چاہو اور سوچو مجھے بتا دینا' میں پوری کوشش کروں گا کہ تمہیں تمہاری تمام تر خوشیاں واپس لوٹا سکوں۔''

اس وقت محض اس کا حلیہ ہی نہیں' بلکہ لہجہ بھی بکھرا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ جب کہ انجشاء احمر کے وجود میں تو جیسے جان ہی نہیں رہی تھی۔

سن' سن' سن کر کے جیسے بہت سے تیر ایک ساتھ اس کے دل میں اتر گئے تھے۔

خالی' خالی سی نگاہوں سے اپنے سامنے بیٹھے' عدنان رؤف کو دیکھتے ہوئے وہ جیسے خود ڈھول ہو رہی تھی۔

زندگی کے کسی موڑ پر اس کے لبوں سے ایسے الفاظ بھی سننے کو ملیں گے' انجشاء احمر نے کبھی اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔

☆☆☆

''آج آفس نہیں آئے تم، میں کتنی ہی دیر تک تمہارا انتظار کرتی رہی تھی۔''

''آفس آیا تھا، مگر تم سے نہیں ملا کیونکہ اچانک ایک بہت ضروری کام یاد آ گیا تھا، اس لیے جلد ہی آفس سے نکلنا پڑا مجھے۔''

اس لمحے عدنان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سے کیسا رویہ اختیار کرے، سو نارمل لہجے میں بات کرتے ہوئے خود ہی بوجھل ہوتے دل کا درد سمیٹتا رہا۔

''ڈاکٹر دانیال کا نمبر کیوں ڈھونڈ رہے تھے؟''

خالی کپ قریب ہی ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس نے پھر پوچھا تھا۔ جب کہ وہ آنکھیں کھول کر سرسری سے انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''اپنے علاج کے سلسلے میں کچھ بات کرنی تھی ان سے، میں زیادہ دیر تک بیکار بیٹھ کر جینا نہیں چاہتا۔''

''مایوسی کی باتیں کیوں کرتے ہو عدنان......؟''

انجشاء کو اس لمحے حقیقتاً اس کے الفاظ سے تکلیف پہنچی تھی۔

''مایوسی کی کیا بات ہے؟ میں خود اپنے پاؤں پر چل کر جینا چاہتا ہوں، کسی پر بوجھ بن کر رہنا گوارہ نہیں ہے مجھے۔''

''بوجھ کون سمجھتا ہے تمہیں؟ خوامخواہ تکلیف دینے والی باتیں نہ کیا کرو۔''

عدنان! اس لمحے کچھ نہیں بولا تھا۔ بس خاموشی سے سر کرسی کی پشت سے ٹکا کر اوپر چھت کی طرف دیکھتا رہا تھا۔

''ڈاکٹر دانیال سے کیا بات ہوئی ہے؟''

بالآخر انجشاء احمر نے ہی پھر سے خاموشی کو توڑا تھا۔

''کچھ نہیں، لندن بلوا رہے ہیں مجھے، کچھ ضروری ٹیسٹ کروانے ہیں۔''

''پھر کب جا رہے ہو لندن؟''

اس کے تھکے تھکے سے لہجے کے جواب میں اس نے پھر پوچھا تھا۔ جب کہ وہ مدھم آواز میں بولا۔

''پرسوں شام کی فلائٹ سے سیٹ بک کروائی ہے میں نے۔ اگر زحمت نہ ہو تو پلیز میرا سامان پیک کر دینا۔''

''زحمت کس بات کی؟ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آج تمہیں آخر ہو کیا گیا ہے۔''

''کچھ نہیں ہوا مجھے...... میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔''

''اوکے...... گڈ نائٹ......'' اسے مزید کریدنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی، جب کہ عدنان بولا۔

''ایک منٹ ٹھہرو انجشاء، مجھے تم سے ہمارے رشتے کے متعلق بہت ضروری بات کرنی ہے۔''

اس لمحے اس کی آنکھوں میں کچھ ایسا تھا کہ انجشاء کا دل اس کی طرف دیکھتے ہوئے خاصی تیزی سے دھڑک اٹھا تھا۔

لمحوں کی مسافتیں جب تھکا جاتی ہیں مجھے

میں اس مہربان سائے کو ڈھونڈتا ہوں

جو پل بھر کے لئے مجھے اپنی آغوش میں لے

اور میں زندگی کی ساری تھکاوٹیں بھول کر

پل بھر کو آرام کی نیند سو جاؤں

موسم خاصا سرد ہو رہا تھا۔

آسمان پر ٹمٹماتے ستاروں کی روشنی' جیسے قرار بن کر اس کے اندر تلک اتر رہی تھی۔

بظاہر سب کچھ ٹھیک ہو رہا تھا مگر پھر بھی اس کی روح بے قرار تھی۔

دل کو جیسے کسی لمحے کا سکون بھی میسر نہیں رہا تھا۔

پہلے اس کی اپنی زندگی کے مسائل ہی کم نہیں تھے کہ اب انجشاء کی وجہ سے تمکین کا جو حال ہوا تھا وہ اسے شدید ڈپریس کر رہا تھا۔

کوئی بھی ایسا نہیں تھا کہ جس کے کندھے پر سر رکھ کر وہ دو آنسو ہی بہا لیتی۔

دل کا بوجھ ہی رو دھو کر ہلکا کر لیتی۔

نہ جانے حالات اس کے اتنے مخالف کیوں جا رہے تھے؟

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتی تھی۔ دل کا غبار نکالنا چاہتی تھی مگر کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے؟

یہ الجھن' یہ بے چینی جانے کب تک قائم رہتی کہ اچانک کوئی دبے پاؤں چپکے سے آ کر اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔

اریشہ نے از حد حیران ہو کر سر گھمایا تو نظر سیدھی قدرے نڈھال سے ازمیر شاہ کے سپاٹ چہرے پر جا پڑی۔

''تت......تم یہاں......اس وقت......؟''

اسے واقعی شاک لگا تھا۔ جب وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولا۔

''مجھے نیند نہیں آ رہی تھی' لہٰذا اٹھ کر یہاں لان میں چلا آیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم بھی یہیں موجود ہو۔''

اس کی آنکھوں کے گوشے اب بھی بھیگے دکھائی دے رہے تھے۔

دل ہی دل میں اریشہ کا دل جیسے کٹ رہا تھا۔

''نیند کیوں نہیں آ رہی؟''

ازمیر شاہ کی مانند اس کا لہجہ بھی سپاٹ تھا مگر ازمیر نے اسے کوئی خاطر خواہ جواب نہیں دیا۔

''پتہ نہیں۔'' کہہ کر اس نے آہستہ سے رخ پھیر لیا تھا۔

''پتہ ہے مائی' میرے ایکسیڈنٹ کے بعد اذہان نے مجھ سے شادی کرنے سے معذرت کر لی۔''

''ہاں...... معلوم ہے مجھے۔''

تھکے تھکے سے انداز میں گہری سانس خنک فضا کے سپرد کرتے ہوئے اس نے اریشہ کو پھر سے چپ کروا دیا تھا۔

''میں سمجھتا تھا شاہ ولاج میں اگر کوئی میرا اپنا ہے تو وہ اریشہ خان ہے' میرے اک اک درد کی رازدار' لیکن...... تم نے ثابت کر دیا کہ میں غلط تھا اریشہ۔''

کچھ پل مزید خاموشی کی نذر کرنے کے بعد وہ درد سے چور لہجے میں بولا تھا۔ جب کہ وہ تڑپ کر مچلتے ہوئے بولی۔

''ایسا کیوں کہہ رہے ہو تم......؟ کب پرایا کیا ہے میں نے تمہیں؟''

وہ اس کے سامنے کمزور پڑنا نہیں چاہتی تھی مگر پھر بھی رو پڑی تھی۔

''آنسو بہانے سے تمہارا قصور معاف نہیں ہو جائے گا اریشہ۔''

پورے دو دن کے بعد وہ اس سے بات کر رہا تھا اور وہ بھی ایسے دل شکن انداز میں کہ اریشہ اپنی صفائی تک بیان کرنے سے قاصر دکھائی دے رہی تھی۔

''سچ بتانا اریشہ۔ اگر تمہاری جگہ میرا ایکسیڈنٹ ہوا ہوتا' مجھے چوٹ لگتی تو کیا تمہیں دکھ نہیں ہوتا۔ اگر میں تمہیں اپنے درد سے جان بوجھ کر بے خبر رکھتا' تو کیا تمہارے دل کو تکلیف نہیں پہنچتی۔'' کیسے تاک تاک کر سنگ باری کر رہا تھا وہ اس پر کہ اریشہ محض تڑپ کر رہ گئی تھی۔

''گھر والوں کے لئے تو میں ہمیشہ سے پرایا تھا' اب بھی پرایا ہوں اور شاید...... ساری زندگی پرایا رہوں گا لیکن...... تم تو میری غمگسار تھیں اریشہ' تم نے تو اپنا کہا تھا مجھے' تم تو اپنے دکھ سکھ شیئر کرتی تھیں مجھ سے' پھر کیوں اپنے درد سے باخبر نہیں کیا مجھے......؟ بولو...... کیوں بے خبر کیا تم نے مجھے۔''

چٹختے ہوئے لہجے میں کہتا وہ از حد ڈسٹرب دکھائی دے رہا تھا۔ تبھی وہ نم آواز میں بولی تھی۔

''مم...... میں تمہیں دکھی کرنا نہیں چاہتی تھی۔''

''ہا...... کتنی عجیب بات ہے کہ مجھے ممکنہ دکھ سے بچانے کی کوشش میں تم نے میرا پور پور لہولہان کر ڈالا اور تمہیں اس کی خبر بھی نہیں ہے۔''

''قدرے استہزاء آمیز دکھی لہجے میں کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا جب اریشہ نے سسکتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام کر اسے روک لیا۔

''مجھے افسوس ہے ازمیر...... میں آپ سے معذرت خواہ ہوں۔''

غم کی شدت سے اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ تبھی وہ بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے پھر سے اس کے پہلو میں ٹک گیا تھا۔

''مجھے تمہاری آنکھوں میں کبھی آنسو اچھے نہیں لگتے' مگر آج...... آج میرا دل تمہیں اتنا رلانے کو چاہ رہا ہے کہ تمہارے تمام آنسو رو رو کر ختم

ہو جائیں اور تم پھر بھی روتی رہو۔''

''سوری مائی' پلیز مجھے معاف کر دو' پلیز۔''

اپنے دونوں سرد ہاتھ اس کی کلائی پر رکھتے ہوئے وہ دکھ سے سسک اٹھی تھی۔ تبھی ازمیر شاہ نے سرسری سے انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے پھر اگلے ہی لمحے ہاتھ بڑھا کر اپنی انگلیوں کی پوروں پر اس کے آنسو چن لئے تھے۔

''اٹس او کے' اب بتاؤ اتنی رات گئے تک یہاں لان میں کیا کر رہی ہو.....؟''

اریشہ کا دل ایک دم سے ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ روح پر قابض تمام بوجھ جیسے لمحوں میں اتر گیا تھا۔ اسی لئے وہ فوراً سرشاری سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

''بس یونہی کچھ ڈپریشن کی وجہ سے نیند نہیں آ رہی تھی۔ تم سناؤ' شہزین خان یہاں آ کر خوش تو ہے ناں۔''

''ہاں..... پاکستان دیکھنے کی بہت خواہش تھی اسے۔ یہ اس کے آباؤ اجداد کا ملک ہے۔ اس کی روٹس ہیں یہاں پر' بہر حال تمہیں کیسی لگی وہ؟''

''بہت اچھی' تم نے اس کے مزاج سے متعلق جو خوفناک قصے سنائے تھے' مجھے تو وہ اپنے کسی عمل سے بھی اتنی بد اخلاق اور سنگدل نہیں لگی جتنی تم نے مشہور کی ہوئی تھی۔''

اب کے ازمیر کے لبوں پر بڑی دھیمی سی مسکان بکھری تھی۔

دل میں موجود کثافتوں کا گلیشئر کسی حد تک پگھل کر مطلع صاف کر چکا تھا۔ تبھی وہ دلچسپی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے متبسم لہجے میں بولا تھا۔

''میں نے اس کی بد اخلاقی اور سنگدلی کے باقاعدہ پوسٹر چھپوا کر دیواروں پر چسپاں کیے تھے کیا.....؟''

''ہاں..... کچھ ایسا ہی تھا' بہر حال مجھے تو وہ بہت اچھی لگی ہے۔ اب پتہ نہیں سائلہ خان کو کیسی لگتی ہے۔''

''یہ سائلہ خان کا ذکر کہاں سے آ گیا درمیان میں۔''

ازمیر شاہ بے ساختہ اسے ٹوک بیٹھا تھا۔ تبھی وہ اس سے کہے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

''جناب' آپ بھول رہے ہیں کہ محترمہ آپ کی ہونے والی زوجہ ہیں۔''

''اچھا..... مجھے یاد ہی نہیں رہا۔''

صاف ظاہر تھا کہ وہ فی الحال سائلہ خان کو ڈسکس کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ تبھی اریشہ نے بھی اسے اس موضوع پر مزید گھسیٹنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

''اریشہ..... میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں' مائنڈ تو نہیں کرو گی ناں۔''

کچھ لمحے پھر سے خاموشی کی نذر کرنے کے بعد اس نے اچانک پوچھا تھا۔ جب اریشہ خان دھڑ دھڑ کرتے دل کو بمشکل سنبھالتے ہوئے قدرے چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

اس کی حسرت ہے جسے دل سے مٹا بھی نہ سکوں
ڈھونڈنے اس کو چلا ہوں جسے پا بھی نہ سکوں
مہرباں ہو کے مجھے بلا لو چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

اس نے یہ کیا' کیا کہ خود اپنا دیا بجھا دیا
بچھڑی ہوا کو اور بھی وحشت زدہ بنا دیا
میری طلب رہی تھی مجھ سے دشمنی میں پیش پیش
ایک دن بساط صبر پہ میں نے اسے ہرا دیا

فضا میں خنکی کا احساس قدرے بڑھ رہا تھا۔
گہری ہوتی شام کے دھند لکے' جسم میں کپکپی دوڑا رہے تھے۔
مگر وہ جیسے خود اپنے آپ سے بے نیازی جانے کن سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھیں۔
فرزانہ بیگم کی بے حسی دیکھنے کے بعد اب وہ "شاہ ولاج" واپس جانا نہیں چاہتی تھیں مگر "بے مثال" کاٹیج میں مزید ٹھہرنا بھی انہیں اپنی انا کے خلاف لگتا تھا سو شہریار صاحب کے درد کی پروا کیے بغیر انہوں نے واپسی کی سیٹ بک کروالی تھی۔
ازمیر شاہ کی پاکستان آمد کے بعد احسن صاحب نے فاروق صاحب سے اپنا حصہ لیتے ہوئے بے مثال کاٹیج کے برابر میں ہی بنگلے کی تعمیر شروع کروی تھی۔ اریشہ' دانیہ اور عدیلہ یہاں آکر بہت خوش تھیں۔ تقریباً روزانہ ہی شہریار صاحب یا ڈاکٹر فرحان انہیں باہر گھمانے کے لئے لے جاتے تھے۔ ازمیر شاہ کے آنے سے اس گھر کی رونقوں میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔
ازمیر کی دوست شہرین خان بھی اپنے مزاج اور عادت کے باعث انہیں کافی اچھی لگی تھیں کہیں کچھ غلط نہیں تھا مگر پھر بھی وہ ڈسٹرب تھیں۔ دل اور دماغ کی جنگ نے اب اندر سے انہیں تھکانا شروع کر دیا تھا۔ خود کو پتھر ثابت کرتے کرتے وہ اب چٹخنے لگی تھیں۔ خدا کے سوا اور کسی کو بھی تو ان کے دل کا حال معلوم نہیں تھا۔ سو اندر ہی اندر مسمار ہوتے ہوئے وہ خاموشی سے جلتی رہیں۔
پچھلے دو تین دن سے ان کی شہریار صاحب سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ ان کی تینوں بیٹیاں پہلے ہی ان سے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے بول چال بند کیے بیٹھی تھیں۔

نوریہ بیگم کو اس وقت بہت رونا آ رہا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھیں جو ٹوٹ جاتے ہیں مگر کبھی جھکنا گوارہ نہیں کرتے۔

سرد موسم میں بھی گرم شال سے بے نیاز بیٹھی وہ خاموشی سے آنسو بہا رہی تھیں جب کوئی تھکے تھکے قدموں سے چلتا ہوا ان کے قریب آیا اور آرام سے نیچے زمین پر بیٹھ کر اپنا سر ان کی گود میں رکھتے ہوئے پلکیں موند گیا۔

نوریہ بیگم اس لمحے بے ساختہ چونکی تھیں۔ کس قدر حیرانگی کے عالم میں چونکتے ہوئے انہوں نے اپنی گود میں لیٹے' ڈاکٹر فرحان خان کا نڈھال سا چہرہ دیکھا تھا۔ وہ رو رہا تھا۔

نوریہ بیگم کو اس سے نفرت نہیں تھی بلکہ زندگی میں شاید وہ کبھی' کسی سے بھی نفرت نہیں کر پائی تھیں پھر بھی ڈاکٹر فرحان سے انہوں نے کبھی بات کرنی گوارہ نہیں کی تھی۔ اپنی تقدیر کے ساتھ ساتھ وہ جیسے سب سے ہی خائف تھیں۔ سب ہی انہیں اپنے مجرم دکھائی دیتے تھے۔

''بے مثال کاٹیج'' میں ایک ہفتہ قیام کے بعد ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ فرحان نے یوں ان کے ساتھ بے تکلفی کا مظاہرہ کیا تھا تب ہی وہ ازحد حیران رہ گئی تھیں۔ ڈاکٹر فرحان نے شاید ان کی آنکھوں میں تیرتی حیرانی کو دیکھتے ہوئے بہت مدھم لہجے میں پوچھا۔

''آپ یہاں سے جا رہی ہیں مما؟''

''ہاں۔''

''کیوں......؟'' قدرے مچل کر سر اٹھاتے ہوئے اس نے پھر پوچھا تھا تب وہ آہستہ سے رخ پھیرتے ہوئے بولیں۔

''کیونکہ یہاں کچھ بھی میرا نہیں ہے۔'' ان کے جواب پر کچھ لمحوں تک فرحان بالکل خاموش رہا تھا۔

''آپ ایسا کیوں سوچتی ہیں مما......؟'' قدرے توقف کے بعد ازحد دکھی لہجے میں اس نے پوچھا تھا۔ جواب میں نوریہ بیگم قطعی خاموش رہی تھیں۔

''پتہ ہے مما! میں نے ایک مدت کے بعد پاپا کو زندگی کی طرف لوٹتے دیکھا ہے۔ ان کے لب جو ہر پل جامد رہتے تھے۔ ان ہی ہونٹوں پر ایک جاندار سی مسکراہٹ رینگتی ہوئی دیکھی ہے۔ آپ کہتی ہیں یہاں آپ کا کوئی نہیں جب کہ حقیقت میں آپ کے بنا یہاں کچھ بھی نہیں۔'' وہ رنجیدہ لہجے میں بول رہا تھا جب کہ نوریہ بیگم سن سی بیٹھی اس کے بھیگے ہوئے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''ایک نظر اٹھا کر اپنے اطراف میں دیکھیے تو سہی مما! آپ کو ہر طرف اپنا ہی عکس جھلملاتا ہوا دکھائی دے گا۔ پلیز یقین کریں مما ایک مدت سے اس گھر میں کسی کی مسکراہٹ کا نور نہیں پھیلا ایک عرصے سے' مجھے اور پاپا کو کسی عورت کے ہاتھ کا بنا' لذیذ کھانا نصیب نہیں ہوا۔ ایک مدت سے ہم دونوں باپ بیٹا دو اجنبیوں کی طرح ایک دوسرے سے نگاہیں چرائے اپنی اپنی زندگی کے مدار کے گرد گھوم رہے ہیں مما یقین کیوں نہیں کرتیں آپ......؟''

نوریہ بیگم کی آنکھیں حیرانی سے پھیل رہی تھیں جب کہ ڈاکٹر فرحان بچوں کی طرح سسک کر روتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

''کیا ہوا جو میں نے آپ کی کوکھ سے جنم نہیں لیا۔ یہ میرا قصور تو نہیں ہے مما۔ آپ کے اور پاپا کے بیچ جو جنگ چل رہی ہے۔ میں اس میں

کتنا قصوروار ہوں؟" اب کے ڈاکٹر فرحان کی آواز خاصی رندھ گئی تھی۔ خوب صورت موٹی موٹی آنکھوں میں تیرتے آنسو چھپانے کے لئے اس نے بے ساختہ اپنا سر جھکایا تھا۔

"میں مانتا ہوں کہ میں آپ کا مجرم ہوں۔ آپ کی سوتن کے بطن سے جنم لینے کا گناہ سرزد ہوا ہے مجھ سے۔ مگر میرا بھی دل چاہتا ہے ما کہ میں کسی کو ماں کہہ کر پکاروں۔ کوئی ہو جو میرے ناز اٹھائے۔ میری پسند کے کھانے بنا کر مجھے پیار سے کھلائے جس کی آغوش میں' میں تھک کر لیٹوں تو ساری تھکن دور ہو جائے۔ کوئی تو ہو جو مجھے بھی پیار کرے' میں سگی سوتیلی کے چکروں کو نہیں سمجھتا' میں تو محض اتنا جانتا ہوں کہ ماں صرف ماں ہوتی ہے جسے اپنے بچوں کی خوشی سے بڑھ کر اور کچھ بھی عزیز نہیں ہوتا۔"

بہت حد تک خود کو سنبھالنے کے باوجود بھی وہ اپنے لہجے کی ٹوٹ پھوٹ کو چھپا نہیں پایا تھا۔ نورینہ بیگم اب بھی ساکت سی' خاموش بیٹھی تھیں۔ تب ہی وہ تھکی تھکی سی اک نگاہ ان پر ڈالتے ہوئے آہستہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"سوری..... جذبات کی رو میں بہہ کر جانے میں آپ سے کیا کیا کہہ گیا۔ ہو سکے تو پلیز مجھے معاف کر دیجئے گا۔" نڈھال لہجے میں کہنے کے ساتھ اس نے اپنے قدم آگے بڑھائے تھے۔ جب اچانک نورینہ بیگم نے ہاتھ بڑھا کر اس کے مضبوط بازو کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

☆☆☆

آج بھی یاد کی بوسیدہ دیوار کے اوپر
حیرت کے اک فریم میں سج کر لگا ہوا ہے
رنج بھری سرخی میں بھیگی
شام کا منظر' قاتل لمحہ
دل کا اک انجانے دکھ کی جھیل میں ڈوبنا' تھاہ نہ پانا
اک ان دیکھے اندیشے کے خوف سے آنکھیں بھر آنا
پھر وقت رخصت ان ہونٹوں کا بے وجہ مسکا دینا

وہ ٹکر ٹکر حیرانگی سے ازمیر شاہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دل کی دھڑکنوں کا ارتعاش گزرتے ہر لمحے کے ساتھ جیسے بڑھتا چلا جا رہا تھا کیا کہنے والا تھا وہ؟ کیا وہی بات جسے سننے کے لئے اس کی سماعتیں جانے کب سے بے قرار تھیں۔

"بولو ازمیر! کیا کہنا چاہتے ہو تم.....؟" قرار کی دنیا میں ہل چل مچی تو وہ خود ہی ڈھیل چیئر گھسیٹتے ہوئے اس کی طرف بڑھ آئی جو اپنے دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں گھسائے' اس سے قدرے رخ پھیرے کھڑا' کچھ کہنے یا نہ کہنے کی الجھن میں گرفتار دکھائی دے رہا تھا۔ اریشہ کی ریکویسٹ پر اس نے قدرے غائب دماغی سے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

''میں خود غرض نہیں ہوں اریشہ! نہ ہی میں نے کبھی محض اپنی خوشیوں کی پرواہ کی ہے۔''

جانے وہ کیا کہنے کی خواہش رکھتا تھا۔

اریشہ کا دل اس لمحے بہت تیز رفتاری سے دھڑک رہا تھا۔

''اب بھی میں محض اپنے دل کی خواہش پر کان نہیں دھر رہا بلکہ بے لوث محبت کو در بدر بھٹکنے سے بچانے کے لئے اپنے دل میں پناہ دینا چاہتا ہوں۔ میں سائلہ خان سے ایکسکیوز کر رہا ہوں۔ اسے یقیناً مجھ سے بہتر کوئی شخص مل جائے گا مگر...... میری محبت کو میرے دل کے سوا اور کہیں پناہ نہیں ملے گی۔ تم ہی بتاؤ اریشہ اگر میں ایسا سوچ رہا ہوں تو کیا غلط ہے......؟''

اریشہ اب بھی اس کے لفظوں کا صحیح مفہوم نہیں سمجھ سکی تھی مگر پھر بھی اس کا دل بجھ گیا تھا۔ پہلا دھیان ہی اس کا شہرین خان کی طرف گیا تھا۔ شہرین خان کا اپنے شوہر سے ڈائیورس لے کر پاکستان آنا۔ اب اسے بہت کچھ سمجھا رہا تھا۔ تب ہی وہ اپنے آنسو پیتے ہوئے قدرے مدھم لہجے میں بولی تھی۔

''تم کچھ بھی کرو ازمیر! میں کبھی تمہیں غلط نہیں سمجھ سکتی۔''

''تھینک یو اریشہ! مجھے معلوم تھا کہ تم ضرور میرا ساتھ دوگی۔ یوں ہی تو ناز نہیں کرتا میں تمہاری دوستی پر۔'' وہ بے طرح خوش ہوا تھا۔ اریشہ اس لمحے محض اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

''پتہ ہے اریشہ! شہرین خان کی محبت میں ناکامی کے بعد میں نے یہ قسم کھائی تھی کہ اب دوبارہ زندگی میں کبھی کسی لڑکی کی طرف پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھوں گا لیکن محبت کب چپکے چپکے میرے دل تک آ پہنچی مجھے خبر ہی نہ ہو سکی......'' اب اسکے چہرے پر پہلے جیسا اضطراب نہیں تھا۔

تاہم اریشہ اب بھی یک ٹک محویت کے عالم میں اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''اک سوال پوچھوں ازمیر! سچ سچ جواب دو گے......؟'' اس سے پہلے کہ ازمیر شاہ اس سے کچھ اور کہتا وہ درمیان میں ہی بول پڑی۔ جواباً ازمیر شاہ اس کے قریب ہی گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

''پوچھو......''

اس کی فوراً اجازت کے بعد کچھ لمحوں تک وہ قطعی نہیں بول پائی تھی۔

''پوچھو اریشہ! کیا پوچھنا چاہتی ہو تم......؟'' اس کے مضطرب چہرے کو بغور تکتے ہوئے اس نے پھر اپنائیت سے پوچھا تھا۔ جب وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

''کیا...... کیا اب بھی شہرین خان سے محبت کرتے ہو تم......؟''

''پتہ نہیں......'' سوال اتنا غیر متوقع تھا کہ ازمیر شاہ کو اس کے سامنے سے اٹھنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگا تھا۔

''اوکے...... لیکن وہ پاکستان تو تمہاری ہی ریکویسٹ پر آئی ہے ناں......؟'' دل میں جو وہم تھا وہ کسی طور سے ختم ہونے والا نہیں تھا۔ تاہم

ازمیر شاہ کے لئے یہ موضوع کسی بھی طرح سے دلچسپی کا باعث نہیں تھا۔ لہٰذا وہ خاصے تھکے تھکے سے انداز میں ایک گہری سانس خنک فضا کے سپرد کرتے ہوئے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا کر اگلے ہی کچھ لمحوں میں وہاں سے چلا آیا تو اریشہ خان کا درد جیسے پہلے سے زیادہ بڑھ کر رہ گیا تھا۔ اپنے شفاف ہاتھوں کی لکیروں پر ایک خالی خالی سی نگاہ ڈالتے ہوئے وہ بے طرح اداس ہو کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

نورینہ بیگم کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے موٹے موٹے آنسو ڈاکٹر فرحان کو خاصا حیران کر گئے تھے۔ وہ بھی جھلملاتی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ یکا یک ان کی آنکھوں سے کئی آنسو ایک ساتھ پھسل کر ان کے گریبان میں جذب ہوئے تھے۔ تب ہی انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر جیسے فرحان کو گود میں سمیٹنا چاہا تھا۔

بے شک وہ آج ہار گئی تھیں۔

زندگی بھر اپنی خود ساختہ انا کے خول میں بند رہنے والی وہ عورت...... زندگی کے اس موڑ پر ہاری بھی تو ایک ایسے رشتے سے جو اس کے لئے سوتیلا تھا۔

ڈاکٹر فرحان کی آنکھیں اب بھی حیرانگی سے پھیلی ہوئی تھیں۔ جب کہ نورینہ بیگم کے اٹھے ہوئے بازو اب بھی اسے خود میں سمیٹ لینے کے لئے بے قرار تھے۔ تب وہ سرشاری سے لپکتے ہوئے ان کی طرف بڑھے اور بے ساختہ اپنا سر ان کی گود میں رکھتے ہوئے سسک اٹھے۔

''آئی لو یو مما!'' جذبات سے بوجھل آواز میں انہوں نے کہا تھا۔ جواب میں نورینہ بیگم بھرپور اپنائیت سے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں اٹھاتے ہوئے اس کی کشادہ پیشانی چوم کر بولیں۔

''سچ مچ......؟''

''جی ہاں......'' نم نم سی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے فوراً اثبات میں سر ہلایا تھا۔

''یو تو میری جان......'' لمحوں میں ماں کا حسین روپ دیکھنے کو ملا تھا جس پر اسے قطعی یقین نہیں آ رہا تھا۔

''سوئے کیوں نہیں ابھی تک......؟ اور یہ چہرہ کیوں گرم ہو رہا ہے تمہارا؟'' خالص ماؤں والا انداز اپناتے ہوئے انہوں نے پوچھا تو ڈاکٹر فرحان محبت سے ان کا ہاتھ تھام کر بے ساختہ نگاہ جھکا گیا۔

''کچھ نہیں مما! بس یوں ہی صبح پاپا نے بتایا کہ آپ لاہور واپس جا رہی ہیں تو عجیب سی اداسی اتر آئی دل میں' دن بھر سے سر میں درد ہو رہا ہے۔ اب بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔ کھڑکی سے آپ کو یہاں بیٹھے دیکھا تو خود کو آپ کے پاس آنے سے روک نہیں پایا۔ مما! اب تو آپ کہیں نہیں جائیں گی ناں......؟'' وہ جو اپنے پورے سرکل میں بے حد مغرور اور خود پسند مشہور تھا اس لمحے کیسے ایک معصوم سے بچے کی مانند سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ تب ہی اک دھیمی سی مسکان نورینہ بیگم کے لبوں پر بکھری تھی۔ اس درجہ اپنائیت وعاجزی کے ساتھ تو ان کی اپنی سگی بیٹیوں نے بھی انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''بتایئے ناں مما.....اب تو آپ یہاں سے نہیں جائیں گی ناں.....؟'' بچوں کا سا انداز اپناتے ہوئے اس نے نورینہ بیگم کا گھٹنا ہلایا تھا۔ جب وہ مسکرا کر اس کے گال پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں۔

''او کے! نہیں جاؤں گی۔ بس خوش.....؟''

''بہت خوش.....'' بھرپور انداز میں کھلکھلاتے ہوئے اس نے کہا تو نورینہ بیگم بھی کھل کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکیں۔

''اب بتاؤ چہرہ کیوں گرم ہو رہا ہے تمہارا؟''

''کچھ خاص نہیں۔ یوں ہی دو روز سے ہلکا ہلکا ٹمپریچر ہو رہا ہے.....''

''شاباش! لوگوں کے مسیحا بنے پھرتے ہو اور اپنا کوئی خیال ہی نہیں۔'' مصنوعی رعب دکھاتے ہوئے انہوں نے ڈاکٹر فرحان کو ڈانٹا تو وہ ازحد سرشاری سے شرارتی موڈ میں مسکراتے ہوئے کان کھجانے لگا۔

''سوری مما! اپنے لئے میں شروع ہی سے لاپرواہ ہوں۔ لہٰذا بہتر ہے کہ اب آپ میرے لئے کوئی اچھی سی خیال رکھنے والی لڑکی ڈھونڈ لیں۔'' اس کے الفاظ نے ایک مرتبہ پھر نورینہ بیگم کو بھرپور انداز میں مسکرانے پر مجبور کر دیا تھا۔

''اچھا.....اس کا مطلب ہے دال میں کہیں کچھ کالا ہے۔''

''نہیں.....ابھی تک تو راوی چین ہی چین لکھ رہا ہے البتہ آگے چل کر ہو سکتا ہے کہیں کچھ گڑبڑ ہو جائے۔'' اس کی آنکھوں میں بھرپور شرارت تھی۔ تب ہی نورینہ بیگم نے پیار سے اسے ایک دھموکا لگایا تھا۔

''چل' کرتی ہوں تیرے پاپا سے بات وہی نکیل ڈالیں گے تجھے۔'' اس بار کھل کر مسکرانے کی باری ڈاکٹر فرحان خان کی تھی۔

''تھینکس مما! تھینک یو سو مچ.....'' جگمگاتی نگاہوں میں ازحد تشکر لئے اس نے پھر سے نورینہ بیگم کے ہاتھ تھامے تھے۔ جب وہ ابھی اپنائیت سے اس کی پیشانی چومتے ہوئے وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

اگلی صبح ناشتے کی میز پر سب کے لئے ہی ایک بہت بڑا سرپرائز تیار تھا۔

شہریار صاحب اپنی مخصوص سیٹ سنبھالے' اخبار کی موٹی موٹی سرخیوں پر نظر دوڑا رہے تھے جب کہ اریشہ' عدیلہ اور دانیہ حسب معمول خاصی رغبت سے اپنی اپنی پسند کا ناشتہ سامنے رکھے پٹاپٹ بول رہی تھیں۔ ہر روز کی طرح آج بھی نورینہ بیگم نے ناشتے کی ٹیبل پر آ کر ان سب کے ساتھ بیٹھنا گوارہ نہیں کیا تھا۔

ڈاکٹر فرحان جو روزانہ ناشتے کے دوران ان سب سے خوب ہلا گلا کیا کرتا تھا آج وہ بھی خاموش بیٹھا تھا۔ تب ہی اریشہ اس سے پوچھے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

''فرحان بھائی! خیر تو ہے آج ناشتہ نہیں کرنا کیا۔''

''نہیں.....آج فرحان بھیا نے چپ شاہ کا روزہ رکھ لیا ہے۔ کیوں فرحان بھیا! میں درست کہہ رہی ہوں ناں.....''

شہریار صاحب نے اس لمحے بے ساختہ اخبار سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

''خیریت تو ہے فرحان بھیا! پھر پاپا سے ڈانٹ پڑ گئی کیا......؟'' دانیہ نے بھی شرارتی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے گفتگو میں حصہ لیا تھا۔ جواب میں وہ بس خاموش بیٹھا نفی میں سر ہلا گیا۔

''کیا بات ہے فرحان......؟ ناشتہ کیوں نہیں کر رہے تم......؟'' شہریار صاحب کو مجبوراً اس کی خاموشی کا نوٹس لینا پڑا تھا۔

''مجھے مما کے ہاتھ سے بنا ناشتہ چاہیے پاپا! آج سے میں بازاری چیزیں نہیں کھاؤں گا۔'' اس کی آواز قطعی اتنی دھیمی نہیں تھی کہ نورینہ بیگم کے کانوں تک نہ پہنچ پاتی۔ تاہم شہریار صاحب کے ساتھ ساتھ اریشہ، عدیلہ اور دانیہ بھی اس کی انہونی فرمائش پر جہاں کی تہاں بیٹھی رہ گئی تھیں بھلا نورینہ بیگم کے سرد مزاج اور غصیلی طبیعت سے کون واقف نہیں تھا۔ سب کو اس کی فرمائش پر حیرانگی ہو رہی تھی۔

شہریار صاحب تو قطعی بے یقینی سے اس کا چہرہ تک رہے تھے۔ جیسے اس کی دماغی حالت پر انہیں کوئی شک ہو۔

''فضول خواہش کرنے سے پہلے یہ سوچ لیا کرو فرحان کہ زندگی مکمل طور پر ہماری خواہشات پر بسر نہیں ہوتی۔'' ان کے چہرے پر ہلکی سی خفگی کے آثار تھے جس کے باعث فرحان کا چہرہ قدرے جھک گیا تھا۔

عین اسی لمحے نورینہ بیگم فریش ہو کر اپنے کمرے سے باہر نکلی تھیں۔

فرحان انہیں دیکھتے ہی تیزی سے ان کی طرف لپکا تھا۔

''مما! کیا آپ میرے لئے اپنے ہاتھوں سے ناشتہ بنائیں گی......؟'' یہ منظر نہ صرف شہریار صاحب بلکہ اریشہ، عدیلہ اور دانیہ کے لئے بھی ازحد حیرانگی کا باعث بنا تھا۔

شہریار صاحب بے ساختہ ہی اپنی سیٹ سے کھڑے ہوئے تھے۔

اریشہ دانیہ اور عدیلہ کے ہاتھ بھی رک گئے تھے۔

تب ہی نورینہ بیگم نے مسکرا کر فرحان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

''کیا چاہیے میرے بیٹے کو ناشتے میں......؟''

شہریار صاحب اور اریشہ وغیرہ کے لئے یہ الفاظ ازحد حیرت کا باعث بنے تھے۔ سب ہی کی آنکھیں یوں حیرانی سے پھیلی ہوئی تھیں گویا انہیں اپنی بصارتوں پر یقین ہی نہ آ رہا ہو۔

''مما! مجھے مزے دار سا پراٹھا بنا کر دیں ناں پلیز......''

''ٹھیک ہے اور کچھ چاہیے تو وہ بھی بتا دو۔''

اب کے سب ہی لوگ بے ہوش ہوتے ہوتے بچے تھے۔ خصوصاً شہریار صاحب کا حال تو دیکھنے کے لائق تھا۔ اتنی حیرانی تو شاید انہیں دریا کے الٹا بہنے پر بھی نہ ہوتی جتنی حیرانگی اس وقت انہیں نورینہ بیگم کا بدلا ہوا روپ دیکھ کر ہو رہی تھی۔

فرحان کچن میں گھسا' فرمائشیں کر کر کے ان سے اپنا ناشتہ بنوار ہا تھا جب کہ اریشہ' دانیہ اور عدیلہ تینوں حیرت سے گنگ کھڑیں بے یقینی سے سوالیہ نگاہوں سے شہریار صاحب کی طرف دیکھ رہی تھیں جنہیں خود ''موجودہ حقیقت'' کا کسی طور سے یقین نہیں آ رہا تھا۔

☆☆☆

اگلی صبح تمکین رضا کی آنکھ کھلی تو اس کا سر خاصا بھاری ہو رہا تھا۔

اریج کمرے میں نہیں تھا لہٰذا وہ دوبارہ پلکیں موند کر لحاف میں منہ چھپا گئی تھی۔ ذہن کے وجدان میں ایک مرتبہ پھر انجشاء احمر کا تلخ لہجہ بازگشت بن کر گونج رہا تھا۔

''ہاں...... میں کہہ رہی ہوں یہ سب کیوں برا لگ رہا ہے؟ مجھے بھی برا لگا ہے بے کار میں شیزا کو الزام دے رہی تھی میں جب کہ اصل قصور وار تو تم ہو۔ تب ہی قدرت نے تمہیں اشعر کی اولاد سے محروم رکھا جب کہ شیزا اسی کے بچے کی ماں بنی مفت میں خوار ہو رہی ہے۔''

اس لمحے اس کا دل جیسے کٹ رہا تھا۔

اشعر کے بارے میں اس نہج پر کچھ بھی غلط سوچنا اس کے لئے محال تھا لہٰذا آنکھوں پر بازو رکھے چپ چاپ لیٹی آنسو بہاتی رہی۔

تھوڑی دیر پہلے ہی رخسانہ بیگم آ کر اس سے کافی پیار کر کے گئی تھیں۔

''حسن ولاج'' کے دیگر لوگوں کو اس نے اپنی طبیعت کے متعلق کچھ بھی بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ لہٰذا وہاں سے ابھی تک کوئی اس کی خبر گیری کے لئے نہیں آیا تھا۔

وہ انہیں اپنی وجہ سے دوبارہ پریشان کرنا بھی نہیں چاہتی تھی لہٰذا ابھی تک خاموش تھی۔ تھوڑی دیر میں اریج فریش ہو کر کمرے میں آیا تو وہ رخ موڑے لیٹی ہنوز سوں سوں کر رہی تھی لہٰذا وہ سست روی سے چلتا اس کے قریب ہی بیڈ پر آ کر بیٹھ گیا۔

''تمکین!''

''جی......''

اریج کی نرم پکار پر فوراً آنسو رگڑتے ہوئے وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

''بس کرو ناں اور کتنا روؤ گی تم......؟'' اب وہ اسے کیا بتاتا کہ اس کے رونے سے وہ خود کتنی تکلیف میں تھا۔

''سوری۔'' خوبصورت آنکھیں مسلسل رگڑنے سے سرخ ہو رہی تھیں جب اس نے نگاہیں جھکا کر رخ پھیرتے ہوئے آہستگی سے کہا تھا۔

''اٹس او کے اس میں سوری کرنے والی کیا بات ہے......'' نگاہیں چرا کر سائیڈ ٹیبل پر رکھی دواؤں کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

''تمکین! آج شام کی فلائیٹ سے میں یو کے جا رہا ہوں بہت ضروری میٹنگ ہے۔ شاید واپسی میں ایک ہفتہ لگ جائے۔ تب تک تم ''حسن ولاج'' میں رہنا اور اپنا بہت خیال رکھنا۔'' دواؤں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔ جواب میں تمکین محض خاموشی سے اس کی

طرف دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلا گئی۔

''اچانک پروگرام بنا ہے؟ کل تک تو آپ کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا.....'' اس کی آواز خاصی دھیمی تھی۔

''ہاں اچانک میٹنگ ارینج ہوئی ہے لیکن میں وہاں جا کر بھی پل پل تم سے رابطے میں رہوں گا ٹھیک ہے۔''

''ٹھیک ہے جیسے آپ چاہیں۔'' اس بار تمکین نے نگاہیں پھیرنے کے ساتھ ساتھ رخ بھی پھیر لیا تھا۔ اس کا سر جیسے درد کی شدت سے پھٹ رہا تھا۔ کیا تھی وہ اور فقط ایک شخص کی محبت میں کیا ہو کر رہ گئی تھی۔ صاف ستھری پاکیزہ محبت کر کے بھی اسے بدلے میں سوائے آنسوؤں کے اور کچھ نہیں ملا تھا۔ عشق' محبت' دوستی ان تمام جذبوں کا حسن اور لطف صرف مردوں کے لئے ہوتا ہے۔ عورت کو تو کسی بھی رشتے سے' سوائے درد اور آزمائشوں کے اور کچھ بھی نہیں ملتا۔ اسے کوئی اختیار نہیں ہوتا کہ وہ اپنی آنکھوں میں پنپتے سنہری خوابوں کی تعبیریں ڈھونڈے۔ وہ اپنی مرضی سے من چاہے خواب دیکھ سکتی ہے مگر ان خوابوں کی تعبیر نہیں پا سکتی۔ کوئی بھی مرد' کسی بھی عورت کو' صرف خواب دیتا ہے' تعبیریں نہیں کوئی بھی عورت اگر اپنی آنکھوں میں پلتے سنہری خوابوں کی تعبیر ڈھونڈنے نکل پڑے۔ تو بدلے میں سوائے آنسوؤں اور خواری کے اس کے ہاتھ میں اور کچھ نہیں آتا۔ وہ بھی اس کی کوشش میں خود کو گنوا بیٹھی تھی۔ لہٰذا اپنے ہی کھو جانے پر آنسو بہا رہی تھی۔ بیتے ہوئے لمحوں میں اپنا عکس تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اریج اب اٹھ کر بیگ میں' اپنی ضرورت کا سامان پیک کر رہا تھا۔ کتنا فرق تھا اس میں اور اشعر میں...... وہ جو اس سے جنونی محبت کا دعویدار تھا۔ کبھی اس کا درد محسوس نہیں کر سکا تھا جب کہ اریج جسے وہ محض ''ضرورت'' کے لئے ملی تھی اس کا کتنا خیال رکھ رہا تھا۔ اپنی طرف سے کوئی ایک دکھ بھی وہ اس کی طرف نہیں آنے دے رہا تھا۔ نہ جانے آنے والا وقت اپنے دامن میں ان کے لئے کیا سمیٹ کر لانے والا تھا۔

اپنا بیگ تیار کرنے کے بعد اریج نے اس کے ضروری سامان اور کپڑوں کی پیکنگ بھی کی تھی۔

دوپہر کے قریب وہ اسے ''حسن ولاج'' چھوڑ کر کچھ دیر وہیں ٹھہرنے کے بعد وہاں سے رخصت ہو گیا تھا۔ تاہم جاتے ہوئے بھی وہ اسے اپنا خیال رکھنے کی تاکید کرنا نہیں بھولا تھا۔

☆☆☆

شام کے دھندلکے کافی گہرے ہو رہے تھے۔

اردگرد ہر چیز جیسے اداسی کے حصار میں لپٹی دکھائی دے رہی تھی۔

اسے سوچ سوچ کر بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر ایک دم سے عدنان رؤف کو ہو کیا گیا ہے؟ وہ جو اس کا دیوانہ تھا اب ایک دم سے جدائی کی باتیں کیوں کرنے لگا تھا؟ اب جبکہ وہ اس کے وجود کی عادی ہو رہی تھی اس کا ساتھ اسے اچھا لگ رہا تھا۔ زندگی میں رنگینی در آئی تھی یہاں اس موڑ پر پہنچ کر وہ اس سے ہاتھ چھڑا رہا تھا۔

''کیوں......؟''

سوچ سوچ کر بھی اس کیوں کی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

کچن میں روٹیاں بناتے ہوئے مسلسل اس کا ذہن فقط عدنان رؤف کے تصور میں الجھا ہوا تھا۔ ہاں وہ گناہ گار تھی۔ بہت دل دکھایا تھا اس نے اپنے محبوب کا محبت کی کسوٹی پر بہت امتحان لئے تھے اس نے وہ اپنا قصور مانتی تھی مگر اس قصور اس جرم کی سزا اس سے جدائی کی صورت میں ملے یہ بات اب اسے گوارہ نہیں تھی۔ لہٰذا دل ہی سکون میں رہا تھا نہ دماغ۔

سیال بیگم اس وقت احمد رؤف صاحب کے پاس تھیں لہٰذا وہ انہیں کھانا دینے کے بعد عدنان کے کمرے کی طرف آئی تو کمرے کی دہلیز پر ہی ٹھٹھک کر رک گئی۔ اندر وہ اپنی وہیل چیئر پر بیٹھا پلکیں موندے کسی کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھا۔ انجشاء کی سماعتوں میں اس کا شکستہ لہجہ نشتر بن کر اترا تھا۔ کتنے پرسکون انداز میں وہ کسی سے کہہ رہا تھا۔

''میں بہت بکھر گیا ہوں نور! کوئی نہیں ہے جس کے کندھے پر سر رکھ کر دو آنسو بہالوں بہت تھک گیا ہوں میں۔ اب مزید اپنا بوجھ اٹھانا میرے بس میں نہیں رہا ہے۔ اسی لئے لندن جانے کی تیاری کر رہا ہوں۔''

''نور......؟ یہ نور کہاں سے ٹپک پڑی؟'' بے حد حیران ہوتے ہوئے اس نے سوچا تھا کیونکہ پچھلے لمبے عرصے سے اس کا کسی لڑکی سے کوئی رابطہ نہیں رہا تھا۔ اس کی طلب' اس کا نشہ اس کی ہر دعا کا محور محض انجشاء کی ذات بن گئی تھی۔ صرف اسے پانے کے لئے اپنا آپ داؤ پر لگا بیٹھا تھا وہ۔ زندگی جیسی قیمتی چیز کو ٹھوکر پر رکھ دیا تھا اس نے تو پھر...... یہ نور کی گنجائش کہاں سے نکل آئی تھی درمیان میں......؟ اس وقت مکمل طور پر اپنا اختیار کھوتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی جب کہ عدنان اب سرد آہیں بھرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''میں بہت ٹوٹ چکا ہوں نور کچھ نہیں دے پاؤں گا تمہیں کیوں میرے مفلوج وجود کو گھسیٹنا چاہتی ہو تم...... کچھ نہیں ملے گا تمہیں...... کچھ بھی نہیں......''

کوئی اس لمحے انجشاء احمر سے پوچھتا کہ دل اجڑنے کی تکلیف کیا ہوتی ہے؟

وہ جو اک مضبوط چٹان کی مانند تھی۔

جس کے مضبوط اعصاب اسے کسی کے سامنے جھکنے نہیں دیتے تھے۔

جو لڑکوں کے لئے ایک چیلنج تھی۔ جسے اپنے دل اور دماغ کی مضبوطی میں کنٹرول حاصل تھا۔ وہی انجشاء احراس ایک پل میں ٹوٹ کر بکھر گئی تھی۔

کیا اس کی محبت کا حصار اتنا کمزور تھا کہ عدنان کو کسی تھرڈ پرسن کے سہارے کی ضرورت پیش آ گئی تھی؟ اس ایک لمحے میں اس کا دل بری طرح سے ٹوٹ کر پاش پاش ہوا تھا۔ خود اپنی ذات کا غرور' اپنی بے لوث محبت کا مان' سب بکھرتا دکھائی دے رہا تھا اسے۔ مختلف سوچیں دماغ سے نکل نکل کر بھٹک رہی تھیں۔ مضبوط دل ودماغ کے باوجود اس لمحے اس کا اپنے پاؤں پر کھڑا رہنا محال ہو رہا تھا۔ لہٰذا وہیں دہلیز سے پلٹ کر وہ پھر سے کچن میں چلی آئی تھی۔

''کیا ہو گیا ہے عدنان کو؟ کیوں ایک دم سے اتنا مایوس لگ رہا ہے وہ' میری محبت' میرا ساتھ ہی کافی کیوں نہیں رہا ہے اس کے لئے......''

وہ جتنا سوچتی جا رہی تھی اتنا ہی ذہن الجھ رہا تھا۔ خود کو سنبھالنے میں کافی وقت لگا تھا اسے۔ دوبارہ چائے لے کر وہ اس کے کمرے میں آئی تو عدنان اپنا دایاں بازو آنکھوں پر دھرے بیڈ پر چت لیٹا تھا۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے آنکھوں سے ہاتھ ہٹا کر اس کی طرف دیکھا پھر دوبارہ پہلی پوزیشن میں لیٹ گیا۔

''چائے پی لو عدنان.....'' بیڈ کی سائیڈ پر پڑے ٹیبل پر کپ رکھتے ہوئے اس نے نارمل لہجے میں کہا تھا جواب میں اس نے فوراً اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کپ تھام لیا۔

''تھینکس.....'' پہلا سپ لیتے ہی اس نے ممنونیت سے کہا تھا تب انجشاء قدرے ہرٹ ہوتے ہوئے بولی۔

''بہت فارمل ہو رہے ہو عدنان خیریت تو ہے ناں......''

''ہاں خیریت ہی ہے۔ کوئی آپ پر احسان کرے۔ آپ کو سہارا دے تو اس کا شکریہ ادا کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہے۔ اس میں فارمل ہونے کی کیا بات ہے......'' اس کا لہجہ قدرے تلخی لئے ہوئے تھا۔ لہٰذا وہ تڑپ کر رہ گئی تھی۔

''تمہیں کیا ہو گیا ہے عدنان! ایک دم سے غیر کیوں لگنے لگی ہوں میں تمہیں......؟''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے......'' کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے عدنان نے بے ساختہ نگاہیں چرائی تھیں۔

''جو بات دل میں ہے وہ کہہ کیوں نہیں دیتے......؟ صاف بول دو کہ مجھ سے اکتاہٹ محسوس ہونے لگی ہے تمہیں' مزید میرے ساتھ کے حامی نہیں رہے ہو تم' کہہ دو عدنان میں کھلے دل ودماغ کی لڑکی ہوں ہرگز برا نہیں مناؤں گی۔'' دل کا غبار باہر نکالنے میں اس نے ایک لمحہ نہیں لگایا تھا۔

''ایسا کچھ نہیں ہے۔ فضول سوچوں کو ذہن میں جگہ مت دو......''

''فضول سوچیں تم ڈال رہے ہو میرے ذہن میں' یہ مت بھولو......''

''میں تمہاری خوشی چاہتا ہوں انجو۔'' اب کے وہ قدرے مضطرب دکھائی دیا تھا۔ تب ہی انجشاء کہے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

''اچھا......؟ بہت دیر سے خیال آیا ہے تمہیں میری خوشی کا' یہ سوچ اس وقت کہاں تھی' جب میں خود تم سے دور جانا چاہ رہی تھی مگر تم مجھے خود سے الگ نہیں ہونے دے رہے تھے۔ اس وقت ہی اگر یہ نیکی کر لی ہوتی تو حالات ایسے نہ ہوتے......''

اس کا جلا لہجہ عدنان کے گداز لبوں پر دھیمی سی اداس مسکان بکھیر گیا تھا۔

''تب کی بات اور تھی انجو! تب میں تمہاری ذمہ داری اٹھا سکتا تھا مگر اب مفلوج ہو کر رہ گیا ہوں میں۔ بوجھ بن گیا ہوں تم پر' بہت بے بسی در آئی ہے زندگی میں۔ اب تمہارے کسی کام کا نہیں رہا میں۔ اسی لئے واشگاف الفاظ میں کہہ رہا ہوں۔ تم مجھ سے میری ذمہ داری سے جا ہو تو دامن بچا لو انجو تمہارے معاملے میں' میں خود غرض بننا نہیں چاہتا......''

وہ ایک دم سے اتنا بدل گیا تھا۔ انجشاء چاہ کر بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ شیزا کے جن لفظوں نے اسے لہولہان کیا تھا۔ وہ لفظ تو انجشاء کو یاد ہی نہیں رہے تھے۔ وہ ہر پہلو پر سوچ رہی تھی۔ اپنی ہر خطا اسے یاد آ رہی تھی مگر اس کے مایوس ہونے کی اصل وجہ کیا تھی۔ وہ یہ جاہتی بھی تو نہیں جان سکتی تھی۔ تب ہی قدرے اداس لہجے میں بولی تھی۔

''مجھے نہیں لگتا کہ میں تم پر کوئی احسان کر رہی ہوں پھر تم نے کیوں ایسا سوچنا شروع کر دیا ہے عدنان۔''

''میرے سوچنے سے کیا ہوتا ہے حقیقت تو حقیقت ہے انجو! کل میں تمہارے پیچھے بھاگتا تھا کیونکہ مجھے تمہاری ضرورت تھی۔ تم سے محبت تھی۔ تمہیں زندگی کی ہر خوشی' ہر آسائش مہیا کر سکتا تھا میں لیکن اب......اب میری حیثیت بدل گئی ہے انجو اب تمہیں سہارا دینے کی بجائے میں تمہارے سہارے کا محتاج ہو گیا ہوں۔ اپنا وجود بوجھ محسوس ہونے لگا ہے مجھے۔ سو میں اپنی شکستہ ذات کے اس بوجھ کو تم پر لادنا نہیں چاہتا۔ تمہیں حق ہے کہ تم اپنی زندگی اپنی مرضی کے مطابق اپنے ہی جیسے کسی اچھے لڑکے کے ساتھ گزارو جو تمہیں زندگی کی تمام خوشیاں تمام راحتیں دے سکے۔ چلی جاؤ انجو پھر سے تنہا کر دو مجھے' میں مان لوں گا کہ میرے نصیب میں خدا نے تمہارا ساتھ لکھا ہی نہیں تھا......'' اس لمحے وہ جملے بولتے ہوئے عدنان کو کتنی تکلیف ہو رہی تھی۔ یہ محض اس کا دل ہی جانتا تھا۔ تاہم اس نے اپنی یہ تکلیف انجشاء احمر پر ظاہر نہیں ہونے دی تھی۔

''عدنان! مت کرو ایسی باتیں خدا کا واسطہ ہے تمہیں......'' اس وقت اس کی اپنی آنکھیں کیوں بھر آئی تھیں وہ نہیں جانتی تھی۔ اگر کچھ معلوم تھا تو محض اتنا کہ عدنان کے اجنبی الفاظ اور بدلا ہوا لہجہ اسے تکلیف پہنچا رہا تھا۔ تب ہی وہ اس کے قریب سے اٹھی تھی اور پھر مزید ایک لفظ بھی کہے بغیر باہر نکل گئی تھی۔ عدنان اس لمحے اس کی کیفیت سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں تھا تب ہی اس کے جانے کے بعد پھر سے پلکیں موند کر آنے والے دنوں کے منصوبے بنانے لگا تھا۔

☆☆☆

وہ گم صم سی ٹیرس پر کھڑی اوپر نیلے آسمان پر بے فکری سے اڑتے ہوئے پرندوں کو دیکھ رہی تھی۔ جب بلیک ٹراؤزر اور نیلی شرٹ میں ملبوس' اداس اداس سا اشعر احمد چپکے سے اس کے پیچھے چلا آیا۔

''کیسی ہو نمی؟''

بہت دنوں کے بعد آج تنہائی میں اس سے بات کرنے کا موقع ملا تھا۔ لہٰذا اس کے لئے اس موقع کو ہاتھ سے گنوا دینا نری حماقت تھی۔

تمکین نے اس کی پکار پر فوراً پلٹ کر پیچھے نگاہ کی تھی۔ رف رف سے حلیے میں ملبوس اس وقت وہ بہت نڈھال دکھائی دے رہا تھا۔ تب ہی وہ ایک سرسری سی نگاہ اس پر ڈالنے کے بعد فوراً ہی رخ پھیرتے ہوئے بولی۔

''ٹھیک ہوں۔''

''مجھ سے نہیں پوچھو گی کہ میں کیسا ہوں......؟'' مدھم لہجے میں کہتا وہ اس کے پہلو میں آ کھڑا ہوا تھا۔ جواب میں تمکین رضا کا ضبط جیسے پھر سے جواب دینے لگا۔ اپنی خوب صورت آنکھوں میں مچلتے آنسوؤں کو بڑی مشکل سے اس نے بکھرنے سے روکا تھا۔

''نہیں......''

''کیوں......؟'' فوراً مضطرب ہو کر اس نے پوچھا تھا۔ تب وہ اپنے آنسو پیتے ہوئے بولی۔

''کیوں کہ اب ایسا کوئی اختیار میرے پاس نہیں رہا ہے۔ سب کچھ چھین لیا ہے تم نے مجھ سے سب کچھ......''

''وہ سب کچھ جلدی تمہیں واپس بھی مل جائے گا نمی......'' اس کے شانے پر اپنائیت سے ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے بتایا تھا جب وہ تنفر سے اس کا ہاتھ پرے جھٹکتی ہوئی بولی۔

''ہرگز نہیں۔ اب میں تمہیں اپنے احساسات کے ساتھ کھیلنے نہیں دوں گی اشعر! بہت ذلیل کر لیا تم نے مجھے۔ بہت اڑا لیا مذاق میری بے لوث محبت کا...... بہت بے وقوف بنا لیا مجھے اب اور نہیں......''

''شٹ اپ نمی! تم اب بھی بکواس کے سوا اور کچھ نہیں کر رہی ہو......'' لمحے میں ہی وہ سلگ اٹھا تھا۔ پھر اگلے ہی لمحے تمکین کی خاموشی پر اسے اپنے لہجے کی کرختگی کا احساس ہوا تو وہ گہری سانس خنک فضا کے سپرد کرتے ہوئے بولا۔

''سوری نمی! تمہیں کھو دینے کے بعد میرے حواس کنٹرول میں نہیں رہے ہیں۔''

تمکین کے لب اب بھی خاموش ہی رہے تھے۔ تاہم اس کا دل کٹ رہا تھا۔ لگ بھگ ایسی ہی کیفیت اس وقت اشعر کی تھی۔

''نمی! میں نے اریج سے بات کر لی ہے۔ وہ جلدی ہی تمہیں ڈائیورس دے دے گا۔ پھر ہم دوبارہ ایک ہو جائیں گے۔'' وہ بات جو اس کے اندر تک دراڑ ڈال گئی تھی۔ وہی بات اشعر احمد پھر سے دہرا رہا تھا اور کتنے فخر کے ساتھ دہرا رہا تھا۔ اس لمحے تمکین رضا کا شدت سے دل چاہا تھا کہ وہ اس کا خوب صورت چہرہ تھپڑوں سے سرخ کر دے تاہم وہ خود پر کنٹرول کیے اپنے آنسوؤں اور غصے کو پیتی رہی تھی۔

''تم بھی یہی چاہتی ہو ناں نمی......؟'' مقناطیسی نگاہوں میں عجیب سی آس لئے اس بار اس نے پوچھا تھا جواب میں وہ جیسے پھٹ پڑی۔

''نہیں...... میں ایسا کچھ نہیں چاہتی جو تم چاہتے ہو۔ سنا تم نے......؟ اور کتنا تماشا بناؤ گے میرا...... کتنی بار ذلیل و خوار کرو گے مجھے......؟ تم سمجھتے کیا ہو مجھے......؟ میں کوئی کھلونا ہوں جس سے تم بار بار کھیلو گے اور توڑ دو گے۔ نہیں اشعر...... میں کھلونا نہیں ہوں۔'' وہ اس کے سامنے کمزور پڑنا نہیں چاہتی تھی مگر رو پڑی تھی۔ ''اور کتنا ادھیڑو گے مجھے......؟ کیوں ہر بار صرف اپنے لئے ہی سوچتے ہو تم' میری عزت' میری خودداری کوئی معنی

نہیں رکھتی تمہارے لئے......؟ بولو...... جواب دو مجھے...... کیا سمجھتے ہو تم' یہ سب بہت آسان ہے۔ تم جب چاہو گے بنا میرے کسی قصور کے' بھری محفل میں بے آبرو کر دو گے مجھے اور جب چاہو گے پھر سے حاصل کر لو گے...... کبھی نہیں اشعر احمد صاحب...... تمکین رضا اتنی سستی نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ میں نے تم سے پیار کیا ہے' تا عمر تمہارے ہی سنگ جینے کے خواب دیکھے ہیں مگر...... ان خوابوں کی بہت بڑی قیمت چکا چکی ہوں میں۔ تم سے محبت کرنے کی بہت بھیانک سزا مل گئی ہے' خدارا اب میری زندگی میں مداخلت مت کرو سکون سے جینے دو مجھے پلیز......''

اس وقت روتی ہوئی تمکین اس کا چین و قرار درہم برہم کر گئی تھی۔ تب ہی وہ اس کے ہاتھ تھامتے ہوئے خود بھی نم لہجے میں بولا تھا۔

''آئی ایم سوری تمی! جذبات میں آ کر جو قدم میں اٹھا چکا ہوں اس پر بہت پشیمانی ہے مجھے...... میں اس حقیقت کو تسلیم نہیں کر پا رہا ہوں کہ تم میرے علاوہ بھی کسی کی ہو سکتی ہو' تم صرف میری ہو تمی! اپنی زندگی میں میں تمہیں کسی اور کے ساتھ جیتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا......''

''یہ سب تمہیں پہلے سوچنا چاہیے تھا اشعر! اب پانی پل کے نیچے سے گزر چکا ہے۔ لہٰذا بہتر ہے کہ تم اب شیزا کے متعلق ہی سوچو۔''

''مجھے اس فسادی لڑکی کے متعلق کچھ بھی نہیں سوچنا......'' شیزا کے ذکر پر اس نے بدمزہ ہوتے ہوئے رخ پھیرا تھا۔

''واہ۔ تمہارا ابھی جواب نہیں اشعر! ابھی جس لڑکی کے متعلق تم سوچنا بھی گوارہ نہیں کرتے اسی لڑکی کے ساتھ تم نے اس وقت غلط تعلق قائم کیا تھا۔ جب وہ تمہارے نکاح میں نہیں تھی تم نے کسی کو نہیں بتایا مگر میں جانتی ہوں کہ تم نے اپنا گناہ چھپانے کے لئے اس سے شادی کا ڈھونگ رچایا۔ مجھے بدکردار کہتے ہوئے ذرا ایک نظر اپنے گریبان میں بھی ڈال لیتے تو شاید نوبت یہاں تک نہ آتی مگر نہیں تم تو مرد ہونا' تمہیں تو ہر عیاشی کی کھلی اجازت ہے۔ کون پوچھنے والا ہے تمہیں......؟ کوئی بھی تو نہیں بہر حال محض تمہاری وجہ سے بہت ذلیل ہوئی ہوں میں...... قصوروار نہ ہوتے ہوئے بھی کسی سے نگاہ ملانے کے قابل نہیں رہی میں...... میری اپنی دوستوں نے زمین بوس کر دیا مجھے...... تار تار کر دیا میرے دل کو اب بس کرو اشعر پلیز......'' اس میں مزید ضبط کا یارا نہیں رہا تو وہیں دیوار سے ٹیک لگا کر زمین پر بیٹھ گئی۔

اشعر کو اس کا حال بہت تکلیف سے ہم کنار کر رہا تھا۔ الجھی الجھی سی اداس نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے وہ خود بھی اس کے مقابل بیٹھ گیا تھا۔

''آئی ایم سوری تمی! میں کچھ نہیں جانتا کہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ مجھے صرف اتنا پتہ ہے کہ تم میری محبت ہو' میں تمہیں کھو کر زندہ نہیں رہ سکتا......''

''اب ان باتوں کا کوئی مطلب نہیں اشعر......''

''کیوں کوئی مطلب نہیں ہے ان باتوں کا......؟ تم کیا سمجھتی ہو میں کوئی بکواس کر رہا ہوں۔ کان کھول کر سن لو تمی اگر میں نے تمہیں پھر سے حاصل نہیں کیا تو میں زندہ بھی نہیں رہوں گا سنا تم نے......؟ یاد رکھنا میری اس بات کو تم اچھی طرح جانتی ہو کہ اشعر احمد جو کہہ دیتا ہے وہ ہر حال میں کر کے دکھاتا ہے......'' اس کی بات اچکتے ہوئے وہ پل میں تپ اٹھا تھا۔ شیزا احمد کے موضوع سے یکسر نگاہ چراتے ہوئے وہ فوراً اس کے قریب سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ پھر چلتے ہوئے ایک دم سے رک کر پلٹتے ہوئے بولا۔

''موسم سرد ہو رہا ہے۔ پلیز نیچے چلو......''

جفا کر کے بھی وہ پشیمان نہیں تھا۔ جن باتوں کو سوچ سوچ کر تمکین کا دماغ پھٹنے کو تیار ہو رہا تھا۔ وہی باتیں اشعر کے رویوں سے سچ ثابت ہو گئی تھیں۔

اس وقت تمکین کو محض تنہائی مطلوب تھی۔ اشعر کا چہرہ دیکھنا بھی گوارہ نہیں ہو رہا تھا اس لئے اس کی نصیحت کو سنی ان سنی کرتے ہوئے وہ وہیں گھٹنوں میں منہ چھپا کر بیٹھ گئی۔

حالات نے عجیب دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا اسے......کیسی عجیب بے بسی تھی کہ وہ اشعر احمد کو پھر سے پانا بھی نہیں چاہتی تھی اور اسے ہمیشہ کے لئے کھو دینے کا حوصلہ بھی نہیں تھا اس کے پاس۔

☆☆☆

شہریار صاحب اور ان کی تینوں بیٹیاں نورینہ بیگم کی تبدیلی پر حد درجہ حیران و مسرور تھیں۔ خاص طور پر اریشہ کی خوشی تو دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔

شہریار صاحب کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ ڈاکٹر فرحان کو قبول کر چکی ہیں۔ اسے اپنا بیٹا مان کر دل سے اپنا چکی ہیں۔ نورینہ بیگم نے نہ صرف اپنے ہاتھوں سے اس کے لئے ناشتہ تیار کیا تھا بلکہ اب پاس بیٹھ کر اسے کھلا بھی رہی ہیں۔

کتنا دل فریب نظارہ تھا یہ؟

بالکل ایک خواب جیسا......

اس وقت وہ کتنے مسرور تھے۔ کوئی نہیں جان سکتا تھا۔ انہیں محویت سے کچن کی طرف دیکھتے پا کر عدیلہ چپکے سے اپنی سیٹ سے اٹھ کر ان کے پاس آئی تھی۔

''پاپا! دیکھیے مما فرحان بھیا پر کتنا پیار لٹا رہی ہیں۔ جب وہ انہیں اپنا سکتی ہیں تو آپ کو معاف کیوں نہیں کر سکتیں......'' اس کی آواز بہت زیادہ بلند نہیں تھی۔

''جی پاپا! عدیلہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔ مما کو آپ سے ناراضی بھی ختم کرنی پڑے گی......'' دانیہ بھی عدیلہ کی بات سن کر فوراً ان کے قریب کھسک آئی تھی۔ تب ہی شہریار صاحب کے لبوں پر بڑی آسودہ سی مسکراہٹ بکھری تھی۔ خوب صورت آنکھوں میں جانے کیسی کیسی تمنائیں ہلکورے لے رہی تھیں۔ وہ اچھی طرح سے جانتے تھے نورینہ بیگم کی ضد کو۔ وہ عورت جو جھک جانے پر ٹوٹ جانے کو ترجیح دیتی تھی۔ اس عورت کے دل سے برسوں کی جمی ہوئی بدگمانیوں کی گرد کو صاف کرنا آسان نہیں تھا۔

بہت مشکل جنگ تھی یہ جسے وہ پچھلے سترہ اٹھارہ سال سے لڑ رہے تھے اور مسلسل ہار رہے تھے......محبت انسان کو کیسے بے بس کر کے زمین چٹاتی ہے۔ یہ کوئی شہریار جاوید صاحب سے پوچھتا۔ ان کی جگہ اگر کوئی بھی عام سا مرد ہوتا تو کب سے اپنی ناراض محبت کو بھلا کر دوبارہ اپنا گھر اور دل

آباد کر چکا ہوتا۔مگر ان کے لئے یہ ممکن نہیں تھا۔

جس دل کو وہ نورینہ بیگم کا مسکن بنا چکے تھے۔وہاں کسی اور کو آباد کرنا انہیں گوارہ نہیں تھا سو وہ اب تک اپنی ہار کے حصار میں مقید تھے۔ تاحال ملول رہنا ان کی عادت بن چکا تھا۔

اریشہ کن اکھیوں سے ان کے اداس چہرے کو دیکھتے ہوئے دھیمے سے مسکرائی تھی۔

''پاپا! اگر آپ اجازت دیں تو میں مما کے دل میں پھر سے آپ کی محبت جگانے کے لئے ایک قیمتی آئیڈیا پیش کر سکتی ہوں۔'' اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

شہریار صاحب اس لمحے بے ساختہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے چونکے تھے۔اپنی اس بیٹی کی ذہانت پر انہیں شروع سے ہی بہت فخر تھا۔لہٰذا اب بھی دھیمے سے مسکرا کر امید افزا نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے پوچھا تھا۔

''اچھا......؟ وہ کیسے......؟''

''وہ ایسے پاپا! کہ آپ مما کی توجہ اپنی جانب مبذول کروانے کے لئے جھوٹ موٹ بیمار ہونے کا ڈرامہ کریں گے۔اس ڈرامے میں ہم لوگ بھرپور طریقے سے آپ کا ساتھ دیں گے۔ہم سب جانتے ہیں پاپا کہ مما بھی آپ سے بہت پیار کرتی ہیں۔بس اپنی بے نیاز طبیعت کے باعث یوں ہی ستا رہی ہیں آپ کو......لہٰذا جب آپ کو بیمار دیکھیں گی تو فوراً ان کا دل پگھل جائے گا اور یوں آپ انہیں پچھلی تمام کہانی سنا کر ان کی بدگمانیاں دور کر سکیں گے......کیسا......؟''

''زبردست......'' اس کے نایاب آئیڈیے پر دانیہ اور عدیلہ دونوں خوشی سے اچھلی تھیں جب کہ شہریار صاحب نے اسے توصیفی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اس کی ذہانت کی تعریف کی تھی۔

''اچھا آئیڈیا ہے لیکن تمہارے اچھے دماغ میں بڑی دیر سے آیا ہے۔'' وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولے تھے۔جب وہ کھلکھلاتے ہوئے بولی۔

''خیر ہے پاپا! دیر آید درست آید......''

''یہ تو ہے لیکن اتنا اچھا آئیڈیا تمہارے چھوٹے سے دماغ میں آیا کیسے......؟'' وہ اب بھی مسکرا رہے تھے۔تب ہی اس نے فخریہ انداز میں کہا تھا۔

''آپ بھول رہے ہیں پاپا! میں شہریار جاوید خان کی بیٹی ہوں۔جن کی ذہانت و فراست کا بزنس کی دنیا میں کوئی ثانی نہیں۔ویسے بھی کسی کے دل میں اپنے پیار کا صحیح مقام جانچنے کیلئے ایسے الٹے سیدھے تجربات بہت ضروری ہیں......'' اسکے الفاظ پر شہریار صاحب کھل کر مسکرائے تھے۔

''بالکل درست۔انسان جس سے پیار کرتا ہے اسے کبھی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا خواہ وہ کتنا ہی خطاوار کیوں نہ ہو۔بیٹی مجھے تم پر فخر ہے۔'' ان کا بھاری ہاتھ اریشہ خان کے سر پر ٹکا تو وہ بھی طمانیت سے مسکرا دی۔

عین اسی لمحے ڈاکٹر فرحان ناشتے سے فارغ ہو کر ان کی طرف آئے تھے۔

''ہاں بھئی لڑکیو! تم ساؤ ناشتہ کر لیا کہ نہیں......؟''

''نہیں......اسے دیکھتے ہی اریشہ نے فوراً منہ لٹکا کر کہا تھا۔ جس پر فرحان کے ساتھ ساتھ خود شہریار صاحب بھی چونک کر اس کے اداس چہرے کو دیکھنے لگے تھے۔

''کیوں......؟ آج ہمارا شاہانہ ناشتہ آپ سے برداشت نہیں ہوا کیا......؟''

اریشہ کے ساتھ ساتھ انہوں نے دانیہ اور عدیلہ پر بھی ایک سرسری نگاہ ڈالی تھی۔ تب ہی اریشہ کن اکھیوں سے اپنے پیچھے کھڑی نورینہ بیگم کو چور نگاہوں سے دیکھتے ہوئے افسردہ لہجے میں بولی۔

''وہ بات نہیں ہے۔ اصل میں پاپا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''وہاٹ......کیا ہوا پاپا کو......؟'' پل کے پل میں وہ متفکر ہوا تھا جب کہ شہریار صاحب اس کی اس درجہ جلد بازی پر دل ہی دل میں مسکرا دیے تھے۔

ایک لمحے میں ہی خاموش کھڑی نورینہ بیگم کے دل کو بھی کچھ ہوا تھا۔ سرعت سے خم دار پلکیں اٹھا کر ایک نظر اپنے سامنے بیٹھے شہریار صاحب پر ڈالتے ہوئے انہوں نے فوراً سر جھکا لیا تھا۔

''پاپا کو ٹمپریچر ہو رہا ہے بھیا! ناشتہ نہیں کر رہے ہیں۔ رات بھی کچھ نہیں کھایا تھا انہوں نے......'' ہوشیاری سے ڈاکٹر فرحان کو آنکھ مارتے ہوئے وہ آہستہ سے مسکرائی تھی۔ جواباً وہ قدرے الجھ کر اس کا مقصد سمجھتے ہوئے خود بھی سر جھکاتے ہوئے مسکرا دیا تھا۔

''چلئے روم میں پاپا! میں آپ کا چیک اپ کرتا ہوں۔'' ناٹک کرنے میں تو وہ خود ماسٹر تھا۔ اریشہ کے معاملے میں بھی اسی کی ہوشیاری اور دانش مندی نے اہم کردار ادا کیا تھا۔

نورینہ بیگم ان کے پیچھے کھڑی ہونے کے سبب اس وقت ان کی چالاکی سمجھ نہیں سکی تھیں۔ تب ہی قدرے متفکر ہو کر انہوں نے بغور شہریار صاحب کے چہرے کو دیکھا تھا۔ جو خود مظلوم بنے بیٹھے ان سے بے نیاز دکھائی دینے کی کوشش کر رہے تھے۔

کہا اس نے' مجھے گرداب سے باہر نکالو تم
کہا میں نے' کرو کچھ حوصلہ خود کو سنبھالو تم
کہا اس نے' کوئی ایسا نہیں اپنا جسے مانوں
کہا میں نے' میرے شانوں پہ سب آنسو بہا لو تم

میرے صبر کا نہ لے امتحاں' میری خاموشیوں کو صدا نہ دے
جو تیرے بغیر نہ جی سکے' اسے زندگی کی دعا نہ دے
تو عزیز دل و نظر سے ہے' تو قریب رگ و جان سے ہے
میرے جسم و جاں کا یہ فاصلہ' کہیں وقت اور بڑھا نہ دے
تجھے بھول کے بھی نہ بھلا سکوں' تجھے چاہ کے بھی نہ پا سکوں
میری حسرتوں کو شمار کر' میری چاہتوں کا صلہ نہ دے
وہ تڑپ جو شعلہ جاں میں تھی' میرے تن بدن سے لپٹ گئی
جو بجھا سکے تو بجھا اسے' نہ بجھا سکے تو ہوا نہ دے

اشعر اور شیزا کا تعلق کس نہج پر جا رہا تھا' فی الحال کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ تمکین کو ڈائیورس دینے کے بعد وہ شیزا سے بھی بے نیاز ہو گیا تھا۔ اپنے اور تمکین کے بیچ فاصلوں کا ذمہ دار وہ صرف اور صرف شیزا احمد کو ہی گردانتا تھا۔ اس کی سازشیں بے نقاب ہونے کے بعد وہ کسی کے منہ سے اس کا نام سننا بھی گوارہ نہیں کرتا تھا۔

ابھی تک کوئی بھی ٹھیک سے نہیں جان پایا تھا کہ اس کے تمکین کے ہوتے ہوئے شیزا احمد سے شادی کرنے کی حماقت کیوں کی؟ اس نے خود سے بھی کسی کو کچھ بتانے کی زحمت گوارہ نہیں کی تھی۔

تمکین کا سب سے بڑا دکھ یہی تھا۔ اپنے ماں کے بکھر جانے کا دکھ اشعر کی غیر متوقع بے وفائی کا دکھ..... اس میں اشعر سے پوچھنے کی ہمت ہی نہیں رہی تھی کہ اس نے اس دعویٰ محبت کے باوجود بے وفائی کا گناہ کیوں کیا؟ اس کا حق' اس کی محبت' کسی اور کے ساتھ کیوں شیئر کی؟ اس پر بدکرداری کا الزام لگا کر اسے اپنی زندگی سے بے دخل کرنے والا وہ شخص اپنے گریبان میں جھانکنا کیوں بھول گیا تھا؟ وہ اس کے بارے میں کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتی تھی مگر ذہن مسلسل اسی کے تصور میں الجھا ہوا تھا۔

حسن ولاج آ کر وہ مزید ڈسٹرب ہو کر رہ گئی تھی۔ ہر وقت اشعر کا سامنا کرنا اس کے لئے کسی امتحان سے کم نہیں تھا۔ اس روز بھی وہ اپنی مما کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھی مٹر چھیل رہی تھی جب فاروق صاحب کی بیگم نے بہت توجہ کے ساتھ اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔

''نمی بیٹے! تم اریج کے ساتھ خوش تو ہو ناں؟''

''جی بڑی ماں!''

وہ شاید ان سے کسی بھی وقت ایسے ہی سوال کی توقع کر رہی تھی سو سر جھکائے جھکائے انہیں اطمینان دلایا تھا۔ آسیہ بیگم البتہ خاموش ہی رہی تھیں۔

''خیال تو رکھتا ہے ناں وہ تمہارا......؟''

اس کے چہرے پر کچھ ایسا تھا کہ وہ اس کی طرف سے مطمئن نہیں ہو رہی تھیں، تب ہی دوسرا سوال کیا تو وہ سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''وہ اپنے آپ سے زیادہ میرا خیال رکھتے ہیں بڑی ماں! میرا یقین کریں آپ' بہت اچھے ہیں وہ۔ بس مجھے ہی خوش رہنا نہیں آتا۔'' اس کے الفاظ سن کر چند لمحوں کے لئے سمیہ بیگم بھی خاموش رہ گئی تھیں۔ تاہم کچھ ہی دیر کے بعد وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولی تھیں۔

''میں جانتی ہوں نمی بیٹے! کہ دل بسانا' گھر بسانے سے زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ بعض اوقات زندگی میں بہت سے امتحان ایسے بھی آتے ہیں کہ انسان بوکھلا کر رہ جاتا ہے۔ اسے صحیح اور غلط کی پہچان نہیں رہتی مگر...... کامیاب انسان وہی ہے جو اپنی غلطیوں سے سبق سیکھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ تمہارا اور اشعر کا بچپن کا ساتھ تھا ابھی اتنی جلدی اسے بھلا دینا شاید تمہارے لئے ممکن نہ ہو مگر...... اسے بھلا دینے میں ہی تمہاری بھلائی ہے بیٹے۔ بس یہی سمجھ لو کہ اس کا ساتھ ہمیشہ کے لئے تمہارا نصیب نہیں تھا لہٰذا تم اپنی مکمل توجہ اریج بیٹے پر مرکوز کرو۔ اب وہی تمہارے دکھ سکھ کا ساتھی ہے۔ اسے اپنی طرف سے کبھی کسی شکایت کا موقع نہ دینا۔''

وہی نصیحتیں جو عموماً مائیں اپنے بچوں کو کرتی رہتی ہیں اس وقت وہی نصیحت سمیہ بیگم بھی بہت سلیقے کے ساتھ اسے کر رہی تھیں مگر اس کا ذہن ان کی طرف نہیں تھا۔ عجیب پتھر سے حواس ہو کر رہ گئے تھے اس کے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے؟ آنکھیں ہر وقت جیسے آنسو چھلکانے کو بے تاب رہتی تھیں۔ یہ سچ تھا کہ اشعر احمد نے اس کے مان کی دھجیاں بکھیر کر اسے کرچی کرچی کیا تھا۔ اس نے وہ کردار ادا کیا تھا جسے سوچتے ہوئے بھی وہ لہولہان ہو جاتی تھی مگر اس کے باوجود وہ اس سے نفرت نہیں کر پائی تھی۔ دل میں بسنے والے خواہ کتنے ہی گناہ گار خطاوار کیوں نہ ہوں ان سے نفرت نہیں ہوتی۔ وہ بھی اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے اپنے قریب دیکھنا نہیں چاہتی تھی مگر...... وہ خود کو کسی بھی قسم کا کوئی نقصان پہنچائے یہ اسے گوارہ نہیں تھا۔ اس کا ذہن اب بھی مسلسل اسی کی باتوں میں الجھ رہا تھا۔

''کان کھول کر سن لو نمی اگر میں نے تمہیں پھر سے حاصل نہ کیا تو میں زندہ بھی نہیں رہوں گا۔ یاد رکھنا اشعر احمد جو کہتا ہے وہ ہر حال میں کر کے دکھاتا ہے۔''

بار بار اس کے یہی الفاظ اس کے ذہن میں گونج رہے تھے اور وہ ڈسٹرب ہو رہی تھی۔ اشعر خود ہی راستے سے جدا کرنے کے بعد اسے یوں جذباتی بلیک میل کرے گا تمکین تا حال نہیں سوچ پائی تھی۔

سمیہ بیگم اب اس سے توجہ ہٹا کر آسیہ بیگم کے ساتھ محو گفتگو ہو گئی تھیں لہٰذا وہ ان کے درمیان سے اٹھ کر چپکے سے اشعر احمد کے کمرے کی طرف چلی آئی۔ ذہن میں بہت سے الفاظ کھلبلی مچا رہے تھے وہ اس پر واضح کر دینا چاہتی تھی کہ وہ اس کے ہاتھوں مزید کھلونا نہیں بنے گی مگر......

کمرے میں پہنچتے ہی اسے بستر میں بے ترتیب پڑا دیکھ کر وہیں ٹھٹھک گئی۔ آج کل اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی سو وہ آفس نہیں جا رہا تھا۔ کل شام بارش میں بھیگنے کے باعث اس وقت بھی وہ فلو اور بخار کی لپیٹ میں تھا لہٰذا تمکین نے اسے جگا کر ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا اور ان ہی قدموں واپس پلٹنے کے لئے رخ موڑا ہی تھا کہ اشعر کی پکار نے اس کے بڑھتے ہوئے قدموں کو وہیں روک دیا۔

''تمکین......''

وہ پلٹ کر اس کے قریب آئی تھی۔

''اب کیسی طبیعت ہے اشعر......؟''

''پتہ نہیں......'' خرابی طبیعت کے باعث اس کا چہرہ ستا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ تمکین اس لمحے اس کے تمام قصور بھلا کر اس کے لئے فکر مند ہو گئی تھی۔

''تم اپنا خیال کیوں نہیں رکھتے اشعر......؟'' اس کی آنکھوں میں اس لمحے عجیب سی بے بسی تھی جس سے اشعر کو مزید حوصلہ ملا تھا۔

''مجھے اپنا خیال رکھنا نہیں آتا نمی! تم جانتی تو ہو پھر کیوں کہتی ہو ایسا......؟''

''تم پاگل ہو گئے ہو اشعر! زندگی کھیل لگتی ہے تمہیں، مگر زندگی کھیل نہیں ہے۔ تمہیں اب اپنا خیال خود ہی رکھنا ہو گا۔''

اشعر کے سامنے اسے بھی اپنے ضبط پر کنٹرول رکھنا بہت مشکل ہوتا تھا تب ہی نم لہجے میں بولی تو وہ سسک کر رہ گیا۔

''خود اپنا خیال کیسے رکھتے ہیں نمی......؟ کب سکھایا ہے تم نے مجھے خود اپنا خیال رکھنا......؟ میں نہیں جی سکتا تمہارے بغیر نہیں مانتا میں اریج سے تمہاری شادی کو......تم صرف میری ہو نمی تمہیں مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔''

لمحے میں جذباتی ہو کر اس نے تمکین کا ہاتھ تھاما تھا جب وہ روتے ہوئے بولی۔

''مت کرو ایسا اشعر! مت کمزور کرو مجھے......پلیز......''

''آئی ایم سوری نمی! مجھ سے برداشت نہیں ہوتا......''

اس کی آنکھوں میں بھی نمی چھلکی تھی۔ خوب صورت گھمبیر لہجہ مزید بھاری ہو گیا تھا۔

وہ سنگین غلطی جو اس سے سرزد ہو چکی تھی۔ اب اسی غلطی کا سدھار اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ تمکین کے بغیر ایک ایک لمحہ گزارنا اس کے لئے نہایت دشوار ہو رہا تھا۔ اس کا یہ روپ بھی تمکین کے لئے قطعی اجنبی تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ اسے اس درجہ بے بس و شکستہ دیکھ رہی تھی۔ لہٰذا اس کا

سادہ سا دل فوراً پگھل کر موم ہو گیا تھا۔ اس لمحے اگر اسے کچھ یاد تھا تو محض یہی کہ وہ اب بھی اشعر احمد سے والہانہ پیار کرتی ہے۔ اب بھی اس کی تکلیف برداشت کرنا اس کے لئے ممکن نہیں۔ تب ہی اپنے ہاتھ نہایت آہستگی سے اس کے ہاتھوں سے نکالتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

''مجھے بھول جاؤ اشعر! پلیز......''

''صاف کیوں نہیں کہتیں کہ جینا چھوڑ دو۔''

''خدا کا واسطہ ہے اشعر! مت کرو ایسی باتیں اب ان باتوں کا کوئی مطلب نہیں ہے۔ تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ تم شیزا کو اپنا لو اس کے پاس تمہارا بچہ ہے۔ تمہارے لئے ساری دنیا کو تیاگ آئی ہے وہ لہٰذا اب اسے تمہارے سہارے کی ضرورت ہے۔''

''مگر مجھے تمہارے سہارے کی ضرورت ہے تمی......''

تمکین رضا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کیسے سمجھائے؟ دل اس لمحے دو متضاد کیفیات کا شکار ہو رہا تھا۔

اسے اشعر کا دیا ہوا پیار بھی یاد آ رہا تھا اور اس کے ہاتھوں ہونے والی اپنی تذلیل بھی۔ وہ اس کے آنسو پونچھنا بھی چاہتی تھی اور اسے اس کے کیے کی سزا دینا بھی چاہتی تھی جو غلطی وہ کر چکا تھا اب اس کی تلافی کسی صورت ممکن نہیں تھی لہٰذا وہ اپنے دل کو کچلتے ہوئے ایک جھٹکے سے اٹھی۔

پھر تھوڑی دیر اس کے پاس ٹھہرتے ہوئے بولی۔

''تمکین رضا کو پھر سے تماشہ مت بناؤ اشعر کیونکہ جن لوگوں سے پیار کیا جاتا ہے انہیں بار بار ذلیل ورسوا نہیں کیا جاتا۔ میری خوشیاں اب اریج سے ہی وابستہ ہیں کیونکہ وہ شخص مجھ سے بے پناہ پیار کرتا ہے چاہے اظہار نہ کرے مگر تم سے بڑھ کر میرا خیال رکھتا ہے۔ یقیناً وہ مجھے خوش رہنا بھی سکھا دے گا۔ لہٰذا تم بھی اب اس خواہش کو دل سے نکال دو تو بہتر ہے کہ میں اب دوبارہ کبھی تمہاری زندگی میں واپس نہیں آؤں گی۔ چلتی ہوں میں اپنا خیال رکھا کرو......''

اشعر جواب میں اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر وہ اس کی کوئی بھی بات سنے بغیر اس کے کمرے سے نکل آئی تھی۔

اشعر کے کمرے سے نکل کر اس کا ارادہ اپنے کمرے میں جانے کا تھا کہ اچانک اسے لاؤنج میں ہی ٹھٹھک کر رک جانا پڑا۔ نگاہوں کے سامنے اس وقت جس شخصیت کا چہرہ آیا تھا اسے دیکھ کر وہ واقعی پتھرا گئی تھی۔

☆☆☆

سائلہ خان پچھلے ایک ماہ سے شہر میں نہیں تھی لہٰذا ازمیر شاہ سے اس کا سامنا بھی نہیں ہوتا تھا۔ وہ اس سے اس کی بے نیازی پر پُر شکوہ کناں تھی۔

ازمیر بمشکل چند روز کے لئے احسن صاحب اور حائقہ بیگم کے ساتھ ''شاہ ولاج'' آیا تھا۔ شہریار صاحب کے برابر میں تعمیر ہونے والا ان کا بنگلہ ابھی رہائش کے قابل نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا ابھی کچھ روز انہیں شاہ ولاج میں ہی بسر کرنے تھے۔ پھر احسن صاحب اور ازمیر کو ابھی کچھ کاروباری امور بھی نمٹانے تھے۔ لہٰذا شاہ ولاج میں ان کا قیام ضروری تھا۔

سائلہ اس روز اس کی آمد کی اطلاع پاتے ہی وہاں چلی آئی تھی۔

ازمیر اس وقت تھکن سے بے حال اپنے کمرے میں آرام کر رہا تھا لہٰذا وہ اسے ڈسٹرب کیے بغیر ماہم شاہ کے پاس آ بیٹھی تھی جو اس وقت ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی اپنے کیوٹکس لگے ناخنوں کو صاف کر رہی تھی۔

رسمی دعا سلام کے بعد اس نے سائلہ خان سے پوچھا تھا۔

''اور سناؤ' آج ہمارے غریب خانے کی یاد کیسے آ گئی آپ کو......؟''

''بس آ ہی گئی صالحہ آپی تو یہاں ہوتی نہیں ہیں۔ اس لئے ادھر کا چکر ذرا مشکل ہی لگتا ہے خیر ازمیر کی سناؤ کیسا ہے......؟ انگلینڈ سے کب آیا......؟''

اس کے پوچھے گئے سوال کو ٹالتے ہوئے اس نے بڑے پرجوش انداز میں ازمیر کے متعلق پوچھا تھا جب وہ نخوت سے ناک چڑھاتے ہوئے بولی۔

''مجھے کیا پتہ کیسا ہے؟ میں موصوف کے منہ ذرا کم ہی لگتی ہوں۔''

''کیوں......؟ میرا مطلب ہے وہ تو اتنے نائیس ہیں۔''

سائلہ خان کو اس کی ناگواری قطعی اچھی نہیں لگی تھی۔

''ہا......نائیس......اذہان بھائی کے سامنے تو وہ کچھ بھی نہیں تمہیں پتہ نہیں کہاں سے نائیس لگتے ہیں......؟''

''یہ اذہان کا ذکر کہاں سے آ گیا درمیان میں......؟'' اب کے وہ قدرے حیران ہوئی تھی۔ تب ہی ماہم شاہ نے موقع کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے کان بھرنے شروع کیے تھے۔

''تم کچھ نہیں جانتیں سائلہ! صد افسوس کہ تمہیں کچھ خبر نہیں ہے۔''

اس کا یہ جملہ پہلے جملے سے بھی زیادہ حیران کن تھا۔

''کیا......تم کہنا کیا چاہتی ہو پلیز صاف صاف کہو ناں......'' حیران ہونے کے ساتھ ساتھ وہ قدرے پریشان بھی ہوئی تھی۔ جب ماہم شاہ نے لہجے کو سسپنس بناتے ہوئے اسے بتانا شروع کیا تھا۔

''تم بہت معصوم ہو سائلہ! بہت سادہ دل کی مالک ہو تم، مگر لوگ تمہارے جیسے نہیں ہیں۔ میں نے پہلے بھی بہت بار کوشش کی کہ تمہیں سچائی سے آگاہ کر دوں لیکن جانے کیا سوچ کر ہر بار خاموش رہ گئی......''

پل دو پل کے لئے رک کر اس نے سائلہ خان کا خوب صورت متجسس چہرہ دیکھا تھا۔

''پتہ ہے سائلہ! ازمیر بھائی بہت لوز کریکٹر کے آدمی ہیں۔ اصل میں ان کے بچپن میں ہی حاقہ آنٹی انہیں چھوڑ کر اپنے میکے جا بیٹھی تھیں۔ احسن انکل کو ویسے ہی اپنے کاروبار سے فرصت نہیں تھی سو ماں باپ کی عدم توجہ کے باعث وہ بگڑتے چلے گئے سونے پہ سہاگہ دیارِ غیر میں جا

بسے جہاں سے بے حیائی کے چلتے پھرتے اشتہار سڑکوں پر ہی دکھائی دیتے ہیں خیر وہاں جا کر وہ کسی شہزین نامی لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو گئے مگر اس لڑکی نے ان کے لوز کریکٹر کی وجہ سے انہیں نہ صرف ٹھکرا دیا بلکہ ان کی خوب انسلٹ بھی کی' وہاں سے خوب خوار ہو کر وہ یہاں پاکستان چلے آئے اور اریشہ کو اپنے چکر میں گھیرنا شروع کر دیا۔ وہ بھی تمہاری طرح کی سادہ تھی لہٰذا ان کے چکر میں آ گئی مگر نورینہ پھوپھو ہوشیار تھیں انہوں نے بات بڑھنے سے قبل ہی مما سے اریشہ کی بات اذہان بھیا سے پکی کر دی۔ ہم بھی چپ تھے کہ چلو گھر کی بات گھر میں ہی رہ جائے تو بہتر ہے خیر اریشہ کے ہاتھ سے نکل جانے پر ازمیر بھائی نے تم سے ناطہ جوڑ لیا مگر حقیقت میں ان کے نزدیک تمہاری کوئی عزت نہیں رہی کتنی ہی بار وہ برملا سب سے یہ کہہ چکے ہیں کہ تم سے ان کا رشتہ زبردستی کا ہے وگرنہ وہ تو آج بھی صرف اور صرف شہزین خان کو ہی چاہتے ہیں اور اب اس بات کا ثبوت پیش کرنے کے لئے وہ شہزین خان کو انگلینڈ سے بھگا کر یہاں پاکستان لے آئے ہیں۔ محترمہ طلاق یافتہ اور ایک بچے کی ماں بھی ہے۔ اب تم خود ہی بتاؤ سائلہ کیا تم ایک بگڑے ہوئے انسان کے ساتھ تا عمر چلنا پسند کرو گی آخر تم میں کس چیز کی کمی ہے؟"

جو بات وہ اس کے کان میں ڈالنا چاہتی تھی' بہت اچھے طریقے سے ڈال چکی تھی۔

سائلہ خان کے چہرے کا رنگ اس لمحے دیکھنے والا تھا۔ دھواں دھواں ہوتی نگاہوں میں جیسے دھول اڑ رہی تھی۔ ماہم شاہ کی کسی بھی بات پر یقین کرنے کو اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ تب ہی وہ کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئی بولی تھی۔

"مجھے معلوم ہے ابھی تم میری کسی بھی بات پر یقین نہیں کرو گی۔ آخر کو ازمیر بھائی بہت نائیس جو ہیں تمہارے لئے لیکن میں نے تمہیں جو کچھ بھی بتایا ہے وہ سب سچ ہے سائلہ تم چاہو تو صالحہ بھابھی سے ساری سچائی جان سکتی ہو۔ انہیں بھی سب کچھ پتہ ہے۔"

سائلہ خان کے لئے یہ ایک اور انکشاف تھا تب ہی وہ اپنے منتشر حواس کو کنٹرول کرتی ایک لمحے میں وہاں سے اٹھی تھی اور پھر بنا ماہم شاہ سے ایک لفظ بھی کہے تیزی سے چلتی ہوئی وہاں سے نکل آئی تھی جس پر ماہم شاہ کے لب بے ساختہ اطمینان سے مسکرا دیے تھے۔

☆☆☆

شہر یار صاحب ڈاکٹر فرحان کی ہدایت پر آفس سے چھٹی کر کے اپنے روم میں قید ہو گئے تھے۔ اریشہ' دانیہ اور عدیلہ کے ساتھ ساتھ شہزین خان بھی ان کے ناٹک میں ان کا بھرپور ساتھ نبھانے کا عہد کر چکی تھیں۔ اس وقت بھی وہ سب ان کے روم میں ہی موجود اپنے اپنے خیالات پیش کر رہے تھے جب ڈاکٹر فرحان ہلکے سے دروازہ ناک کر کے ان کے روم میں چلے آئے۔

''بھیا! مما کیا کر رہی ہیں......؟ باہر کے حالات سازگار تو ہیں ناں......؟'' عدیلہ دیکھتے ہی تیزی سے اس کی طرف لپکی تھی۔

''نہیں۔'' مختصر جواب دیتے ہوئے وہ وہیں شہر یار صاحب کے پاس بیٹھ گیا تھا۔

''کیوں......نور ٹھیک تو ہے ناں......؟'' شہر یار صاحب فوراً متفکر ہو کر اٹھ بیٹھے تھے۔

''جی پاپا! وہ ٹھیک تو ہیں لیکن رو رہی ہیں۔'' مر جھکا کر اس نے یوں اطلاع فراہم کی تھی گویا اس سارے قصے کا اصل قصور وار وہی ہو۔ شہر یار صاحب کا حال اس ایک لمحے میں دیکھنے کے لائق ہوا تھا۔

''او مائی گاڈ! رو کیوں رہی ہے وہ......؟ تم لوگ بھی ناں......فضول پلان بناتے رہتے ہو۔ نہیں حاصل کرنی مجھے اس کی توجہ' پیار بھی نہیں چاہیے مجھے اس کا......'' آپ ہی آپ دھیمے لہجے میں بڑبڑاتے ہوئے وہ سلیپر پہن کر کمرے سے باہر نکل آئے تھے۔

''پاپا آج بھی مما سے کتنا پیار کرتے ہیں۔ ہے نا فرحان بھیا......'' ان کے کمرے سے نکلتے ہی دانیہ نے اپنے پرجوش کمنٹس پاس کیے تھے جس پر ڈاکٹر فرحان نے فوراً تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

''ہاں دانیہ! پیار کا اصل مفہوم سمجھنا ہو تو کوئی پاپا کی زندگی کی تاریخ جان لے۔ پچھلے بیس بائیس برس میں انہوں نے ایک بار بھی اپنے لئے نہیں سوچا۔ سارا دن یا تو کمرے میں بند رہتے۔ نہیں تو دنیا کی سیر پر نکل جاتے اور مہینوں گھر واپسی کا نام نہ لیتے۔ اکثر راتوں میں مما کی تصویر سے باتیں کرتے ہوئے رو پڑتے تھے۔ میرے خیال میں بیس بائیس برس میں ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا جب انہوں نے مما کو یاد نہ کیا ہو۔ پاپا کے پیار کی گہرائی کو سمجھنا بہت مشکل ہے' بہت زیادہ مشکل۔''

''میں پاپا سے بہت زیادہ متاثر ہوں۔'' اریشہ نے بھی فوراً اپنے خیالات کا اظہار کرنا ضروری سمجھا تھا۔ اس وقت وہاں کمرے میں موجود سب ہی لوگ شہر یار صاحب کی محبت کو سلام پیش کر رہے تھے۔

شہزین خان محبتوں کے اتنے خالص اور گہرے رنگ دیکھ کر واقعی بہت متاثر ہوئی تھی۔

''نور! تم رو کیوں رہی ہو......؟''

اپنے کمرے میں بیڈ پر بیٹھی وہ سوں سوں کر رہی تھیں جب شہر یار صاحب آہستہ سے دروازہ بھیر کر ان کے قریب چلے آئے۔

ایک لمحے میں نورینہ بیگم نے آنسو صاف کر کے ان کی طرف سے رخ پھیرا تھا۔ ان کی خاموشی شہر یار صاحب سے ان کی بھرپور ناراضگی کا ثبوت تھا۔

''کیوں کر رہی ہو یہ سب......؟ اگر زندہ نہیں دیکھ سکتیں تو صاف کہہ دو مر جاؤں۔ یوں لمحے لمحے کی اذیت تو مت دو جان......'' وہ بیڈ پر

ان کے پہلو میں ہی ٹک گئے تھے۔ نورینہ بیگم نے اس لمحے مچل کر نگاہ اٹھاتے ہوئے ان کی طرف دیکھا تھا۔

''بہت فضول بولنا آتا ہے آپ کو...... میں نے کیا کہا ہے......؟''

''آہ......ابھی تو آپ نے کچھ کہا ہی نہیں جو کہنا چاہتی ہیں کہہ لیں مگر پلیز مجھے اس اذیت سے باہر نکال لیں پلیز نور۔'' ان کا یہی انداز نورینہ بیگم کو کمزور کرتا تھا۔

فرحان شاہ کی معرفت انہیں شہریار صاحب کے گزرے بیس سالوں کے ایک ایک لمحوں کا حساب مل چکا تھا۔ تاہم پھر بھی ان کا دل کسی طور شہریار صاحب کو معاف کر دینے پر تیار نہیں ہو رہا تھا۔ وہ لمحے جوان کی بے وفائی کا تصور کر کے سلگتے ہوئے انہوں نے بتائے تھے۔ ان لمحوں کی اذیت کا اندازہ صرف وہی کر سکتی تھیں۔

ایک شخص جسے آپ خود اپنے آپ سے بڑھ کر چاہتے ہوں جس پر اندھا یقین کرتے ہوں۔ وہی اگر آپ کے مقابل کسی اور ہستی کو لے آئے تو مان یوں ہی ٹوٹ کر بکھر جایا کرتا ہے۔ جس طرح نورینہ بیگم کا مان اور دل ٹوٹ کر بکھرا تھا۔ یہ اذیت اس قدر تھی کہ گزرے ہوئے پچھلے بیس سال بھی اس درد کی شدت کو کم نہیں کر سکے تھے۔ یہ سچ تھا کہ وہ بھی ان سے ٹوٹ کر پیار کرتی تھیں۔ ان کی فکر کرتی تھیں مگر مان ٹوٹ جانے سے دل میں دراڑ آ گئی تھی اور اسی دراڑ کے آ جانے سے شہریار صاحب کا عکس بھی دھندلا کر رہ گیا تھا۔

اس وقت بھی وہ ان کے پہلو میں سر جھکائے بیٹھی اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو کھوج رہی تھیں جب شہریار صاحب نے اپنا مضبوط بازو اچانک ان کے کمزور شانوں کے گرد پھیلا کر انہیں اپنے ساتھ لگا لیا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے......؟'' فوراً خفا ہو کر انہوں نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی تھی جب وہ مزید سختی سے انہیں اپنی گرفت میں جکڑتے ہوئے بولے۔

''یہ بدتمیزی نہیں میرا پیار ہے نور! وہ سامنے آئینے میں دیکھو۔ وقت ہم دونوں کو چھوئے بغیر گزر گیا ہے۔ لوگ اب بھی مجھے ینگ اور ہینڈسم مانتے ہیں جب کہ تم بھی کسی طور سے چار جوان بچوں کی ماں نہیں لگتی ہو۔''

''چھوڑیں مجھے۔'' ان کے چہرے کا رنگ ایک لمحے میں سرخ ہو گیا تھا۔ دل کی دھڑکنیں جیسے لمحوں میں پسلیاں توڑ کر باہر نکلنے کو بے تاب ہو گئی تھیں۔

شہریار صاحب کو ان کی یہ حالت خاصا لطف دے گئی تھی۔ تب ہی وہ دل سے مسکراتے ہوئے بولے تھے۔

''ہرگز نہیں۔ جب تک میری بے بسی کی پوری داستان نہیں سنو گی یوں ہی میری گرفت میں رہو گی۔'' آج ان کے تیور جداگانہ تھے۔ شاید نہیں یقیناً انہیں نورینہ بیگم کی ذرا سی کمزوری نے حوصلہ دیا تھا۔

''کچھ نہیں سننا مجھے کوئی وضاحت' کوئی صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے آپ کو۔'' ان کا حال اس لمحے حقیقتاً برا ہو رہا تھا مگر وہ اپنے ہی لطف میں مسرور کہہ رہے تھے۔

''اوکے۔اس کا مطلب ہے کہ تم یوں میرے حصار میں مقید رہنا چاہتی ہو۔''

نورینہ بیگم اب کے سست پڑتے ہوئے رو پڑی تھیں۔

''پلیز مت پریشان کریں مجھے پلیز......''

ان کے آنسوؤں نے پھر سے شہریار صاحب کی جان پر بنادی تھی۔تب ہی وہ انہیں اپنی گرفت سے آزاد کرتے ہوئے سنجیدگی سے بولے تھے۔

''رومت نور! میں سب کچھ برداشت کرسکتا ہوں مگر......تمہارے آنسو نہیں۔تم ایک موقع تو دو مجھے اپنی صفائی پیش کرنے کا پھر اس کے بعد بھی اگر تمہارا دل میری رفاقت کو قبول نہ کرے تو جو چاہو سزا سنا دینا میں اف تک نہیں کروں گا۔'' کتنے مخلص اور شدت پسند تھے وہ اپنی محبت کے معاملے میں۔

نورینہ بیگم کی جگہ اگر کوئی اور عورت ہوتی تو یقیناً اتنے اچھے انسان کی رفاقت پر ناز کرتی۔تاہم وہ اس وقت بدگمانیوں کے جال میں الجھی ہوئی تھیں۔تب ہی دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپتے ہوئے بے بس لہجے میں بولی تھیں۔

''پلیز مجھے اکیلا چھوڑ دیں شہریار! ابھی آپ کی کوئی وضاحت 'کوئی صفائی' میرے دل پر اثر نہیں کرسکتی۔وقت کے ساتھ ساتھ ہوسکتا ہے یہ دل ٹھہر جائے تب پلٹ کر میں آپ کی طرف ہی آؤں گی کہ اس کے علاوہ میرے پاس اور کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔''

ان کے لفظوں نے ایک مرتبہ پھر شہریار صاحب کو ہرٹ کیا تھا۔تاہم اس بار ایک مرتبہ وہ ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کے پہلو سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

''او کے نور! میں کوشش کروں گا کہ اب تمہیں کبھی مجبور نہ کروں تم اپنے لئے جو بہتر سمجھو ہی کرنا میں اپنے تمام تر خلوص کے ساتھ تمہارے ساتھ ہوں۔'' ٹھہرے ہوئے سنجیدہ لہجے میں کہتے ہی وہ ان کے کمرے سے باہر نکل گئے تھے جب کہ نورینہ بیگم کے اندر ایک مرتبہ پھر جیسے گہری تھکن اتر آئی تھی۔

ان کے کمرے کے باہر قدرے فاصلے پر کھڑے ڈاکٹر فرحان اور اریشہ نے شہریار صاحب کے چہرے پر شکستگی کے واضح آثار دیکھ کر سخت دل گرفتگی محسوس کی تھی۔اپنے اپنے طور پر وہ دونوں ہی اب سنجیدگی سے اس مسئلے کا حل ڈھونڈنے پر مجبور ہوگئے تھے۔

☆☆☆

انجشاء پریشان سی سیڑھیوں پر بیٹھی مسلسل عدنان کے بدلے ہوئے رویے کے متعلق سوچ رہی تھی جب اچانک آہنی گیٹ پر ہلکی سی دستک کے بعد ایک نہایت خوب صورت دوشیزہ ہلکے سے گیٹ دھکیل کر خود ہی گھر کے اندر چلی آئی۔

''السلام علیکم! مجھے نورالعین کہتے ہیں۔عدنان کی بہت اچھی دوست ہوں میں۔کہاں ہے وہ......؟'' آنے والی جتنی حسین تھی اتنی ہی پر اعتماد بھی تھی تب ہی وہ ٹکر ٹکر اس کی طرف دیکھتی رہ گئی تھی۔''پلیز بتایئے ناں عدنان کا کمرہ کون سا ہے۔مجھے اس نے خود فون کر کے بلوایا ہے۔''

انجشاء کی مسلسل خاموشی پر وہ پھر قدرے رعب سے بولی تھی۔ جواب میں انجشاء کے پاس اسے عدنان کے کمرے تک پہنچانے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔

اندر کمرے میں عدنان پہلو کے بل لیٹا شاید کسی کتاب کے مطالعے میں دماغ کھپا رہا تھا۔ ہلکی سی آہٹ پر اس نے فوراً پلٹ کر پیچھے دیکھا تھا جہاں نور العین کے پہلو میں کھڑی انجشاء احمر خاصی شاکی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''ارے نورا! آؤ یار میں کب سے تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔'' کہنیوں کے بل اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اس نے انجشاء کو قطعی نظر انداز کر دیا تھا جس پر وہ مزید کُڑھ کر رہ گئی تھی۔

''اب کیسی طبیعت ہے عدی! اور تم نے مجھے پہلے انفارم کیوں نہیں کیا.....؟'' جدید تراش خراش کے چست سوٹ میں ملبوس فارنر لک رکھنے والی نور العین نامی لڑکی بے تکلفی سے بیڈ کے دوسری سائیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولی تھی جب عدنان دھیمے سے مسکراتے ہوئے وضاحتی لہجے میں بولا۔

''سوری یار! اصل میں مجھے معلوم نہیں تھا کہ لندن سے پاکستان شفٹ ہوگئی ہو ورنہ ضرور انفارم کر دیتا۔ خیر..... یہ میری کزن ہیں انجشاء احمر بہت خیال رکھتی ہیں میرا اور انجو یہ نور ہے۔ نور العین، لندن میں ایک ساتھ تعلیمی مدارج طے کیے ہیں ہم نے۔ بہت اچھی دوست ہے میری۔''

انجشاء کو اس کے تعارفی انداز نے بھی ہرٹ کیا تھا۔ تاہم گم صم سے انداز میں اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے اس نے نور العین سے مصافحے کی ذمہ داری ضرور نبھائی تھی۔

''نائس ٹو میٹ یو۔''

''می ٹو۔''

نور العین نے بھی خاصی گرم جوشی سے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے اپنا کردار نبھایا تھا۔

''میں چائے لاتی ہوں آپ کے لیے۔''

بمشکل اپنے بھڑ بھڑ جلتے ہوئے دل کو سنبھالتی وہ عدنان کے کمرے سے نکل کر کچن کی طرف آئی تھی۔ اس وقت چائے کے پانی کے ساتھ ساتھ اس کا اپنا دماغ بھی کھول رہا تھا۔ دل شدت سے رونے کو چاہ رہا تھا اور ایسا کیوں ہو رہا تھا وہ خود بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

اگلے دس پندرہ منٹ میں وہ چائے لے کر دوبارہ عدنان کے کمرے میں آئی تو اس کا ہاتھ نور العین کے موی ہاتھوں میں دیکھ کر نئے سرے سے جل اٹھی۔ کسی قدر حلاوت کے ساتھ وہ عدنان کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے اس سے کہہ رہی تھی۔

''میں ہوں ناں عدی! تم کیوں پریشان ہو رہے ہو۔ میں سب سنبھال لوں گی۔ تمہارا گھر بھی اور آفس بھی۔ بس تم اپنا خیال رکھو اور فی الحال لندن جانے کا پروگرام کینسل کر دو کیونکہ ڈاکٹر دانیال جلد ہی پاکستان کا وزٹ کر رہے ہیں۔''

''تھینکس نورا! میں جانتا تھا تم آ کر میری تمام پریشانیاں حل کر دو گی۔''

کتنے اطمینان سے بھرپور لگاوٹ کے ساتھ وہ کہہ رہا تھا اور ادھر انجشاء احمر کے وجود کا سارا خون جیسے نچڑ کر رہ گیا تھا۔ سن اعصاب کے

ساتھ مرے مرے سے قدم اٹھاتی وہ آگے بڑھی تھی اور ٹرے چپ چاپ عدنان کے قریب ٹیبل پر رکھنے کے بعد خاموشی سے واپس پلٹ گئی تھی۔

عدنان نے اسے پیچھے سے آواز دے کر شکریہ تک کہنے کی زحمت گوارہ نہیں کی تھی۔

اس روز وہ بہت روئی تھی۔ کیا کیا نہیں کیا تھا اس نے عدنان کے لئے' اس کی لاکھ بے وفائی کے باوجود وہ خود کو اس سے الگ نہیں کر پائی تھی۔ اپنا آپ بھلا کر اس کا گھر آفس دونوں سنبھال رہی تھی اور وہ تھا کہ بجائے اس کا مشکور ہونے کے پھر سے پرانی راہوں پر چل پڑا تھا۔ اسے نظر انداز کر کے کسی اور سے مدد مانگ رہا تھا کسی اور سے دل کا حال شیئر کر کے اطمینان سمیٹ رہا تھا۔ وہ روتی نہ تو اور کیا کرتی......؟

عین اسی لمحے سیال بیگم کی انٹری اس کے کمرے میں ہوئی تھی اور وہ اسے روتے ہوئے دیکھ کر حیران رہ گئی تھیں۔

''انجو! خیریت تو ہے بیٹی رو کیوں رہی ہو تم......؟''

وہ شاید ابھی اپنے کمرے سے باہر نکلی تھیں تب ہی انہیں کسی قسم کی صورت حال کا اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔

انجشاء احمر کا دل اس لمحے اتنا بھرا ہوا تھا کہ وہ ان کے سامنے بھی خود پر کنٹرول نہیں رکھ سکی تھی۔

''انجو! کچھ بتاؤ تو سہی آخر ہوا کیا ہے' کیا عدنان نے کچھ کہا ہے......؟'' وہ خود بھی از حد متفکر ہو گئی تھیں۔ تب ہی وہ آنسوؤں سے لبریز آنکھیں اٹھا کر ان کی طرف دیکھتے ہوئے نم لہجے میں بولی تھی۔

آنٹی! میں مانتی ہوں کہ میں نے آپ لوگوں کا دل بہت دکھایا ہے۔ بہت بدتمیزی کی ہے عدنان کے موجودہ حال کی ذمہ دار بھی میں ہوں مگر میں اپنی غلطیوں کا ازالہ کرنے کی کوشش تو کر رہی ہوں آنٹی پھر...... پھر وہ کیوں دوسروں کو مجھ پر ترجیح دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ کیوں اپنے آپ کو بوجھ سمجھنے لگا ہے وہ......؟ کیا میں نے اپنی کسی بھی بات یا عمل سے یہ شو کرنے کی کوشش کی ہے کہ میں اس کا خیال نہیں رکھ سکتی یا مجھے آپ سب لوگوں کے ساتھ رہنا گوارا گزر رہا ہے بولیے آنٹی! کیا ایسا کچھ بھی ظاہر کیا ہے میں نے......؟'' جذباتی تو وہ اکثر ہو جاتی تھی تاہم اس وقت اس کا عدنان کے لئے جذباتی ہو جانا سیال بیگم کو حیران ضرور کر گیا تھا۔

''کیا کیا ہے عدی نے......؟'' از حد حیرانگی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے پوچھا تھا تب وہ چہرے پر آئے بالوں کو کانوں کے پیچھے اڑستے ہوئے آنسو صاف خشک کرتے ہوئے بولی۔

''وہ مجھ سے تعلق توڑنا چاہتا ہے آنٹی! مجھ سے کہتا ہے کہ میں اس کا ساتھ چھوڑ کر اپنے لئے کسی اور لڑکے کا انتخاب کر لوں جب کہ خود اپنے لئے اس نے ایک لڑکی ڈھونڈ بھی لی ہے جو اسے یہ تسلی دے رہی ہے کہ وہ اس کا گھر اور آفس دونوں سنبھال لے گی جب وہ ایسا کر سکتی ہے تو میں کیوں نہیں......''

ہمیشہ مضبوط رہنے والی انجشاء احمر اس لمحے بہت کمزور ثابت ہو رہی تھی۔ کبھی کسی سے ہار نہ ماننے والی لڑکی اگر ہاری بھی تو اپنے دل سے۔ اسے خبر ہی نہ ہو سکی کہ کب اس کا اپنا دل اس کے اختیار سے باہر ہو کر عدنان رؤف کی مٹھی میں چلا گیا۔ پتھر کو کب جونک لگی وہ ہرگز نہ جان پائی تھی۔

سیال بیگم کا دل اسے روتے ہوئے دیکھ کر مچلا تھا۔ تب ہی وہ اسے اپنے ساتھ لگا کر تسلی دیتے ہوئے بولی تھیں۔

''تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے انجو! میں اچھی طرح جانتی ہوں عدنان کو۔ وہ سانس لئے بغیر تو رہ سکتا ہے مگر تجھے خود سے الگ کر کے ہرگز نہیں جی سکتا وہ ضرور کوئی اور بات ہوگی تو فکر نہ کر میں معلوم کرتی ہوں اس سے کہ کیا بات ہے......؟''

جس عورت سے وہ اب تک بدگمان رہی تھی۔ اس لمحے وہی عورت اپنے سینے سے لگائے اسے تسلی دے رہی تھیں۔ بالکل ایک ماں کا کردار نبھا رہی تھیں لہٰذا انجشاء احمر کے دل کو بھی قرار آ گیا تھا۔

''آنٹی......''

وہ اسے تسلی دے کر آگے بڑھی ہی تھیں کہ اس نے پھر ان کی ساڑھی کا پلو پکڑتے ہوئے انہیں پکار لیا۔

''آنٹی! میں عدی کے بغیر نہیں رہ سکتی۔'' بھرائے ہوئے نم لہجے میں کہتی وہ ایک مرتبہ پھر انہیں شاک لگا گئی تھی۔ گنگا الٹی بہنے لگی تھی۔ وہ لفظ جو عدنان کی زبان سے ادا ہوتے تھے اس وقت وہی الفاظ انجشاء اپنے منہ سے نکال رہی تھی۔ اس سے بڑھ کر بھلا محبت کی کرشمہ سازیاں اور کیا ہو سکتی تھیں؟

سیال بیگم ایک مرتبہ پھر گنگ حواس کے ساتھ اسے تسلی دے کر پھر فوراً ہی اس کے کمرے سے باہر نکل گئی تھیں۔

☆☆☆

ازمیر ابھی آفس سے نکلا ہی تھا جب اس کے سیل پر سائلہ خان کی کال آ گئی تھی۔ بہت دن ہوئے وہ چاہنے کے باوجود بھی اس پیاری سی لڑکی سے بات نہیں کر سکا تھا جو اس کے نام سے منسوب تھی۔ جی کی خوشی کے لئے اپنے دل کی ہٹ دھرمی سے ہار مانتے ہوئے وہ اسے اپنے نام کے حصار سے آزاد کر رہا تھا۔

سائلہ خان کا مقام اس کے دل میں بہت باعزت تھا چنانچہ تیسری ہی بیل پر اس نے اس سائلہ خان کی کال پک کر لی تھیں۔

''السلام علیکم!''

''وعلیکم السلام! سائلہ بات کر رہی ہوں۔''

دوسری طرف سائلہ خان کا لہجہ بشاش نہیں تھا۔

''ہاں۔آپ کی آواز پہچانتا ہوں میں۔ کہیے کیسی ہیں آپ؟'' اس کے لہجے کی حلاوت بدستور قائم تھی۔ تاہم سائلہ خان نے روکھے لہجے میں ہی جواب دیا تھا۔

''ٹھیک ہوں۔ آپ سے کچھ ضروری بات کرنی تھی اسی لئے ڈسٹرب کرنے کی جسارت کی۔''

''سائلہ!'' اس کے خفا خفا سے انداز پر دھیمے سے مسکراتے ہوئے بہت پیار سے اس نے پکارا تھا جب وہ سرد آہ بھرتے ہوئے بولی تھی۔

''جی فرمایئے......''

''کیوں اتنی فارمل ہو رہی ہو سائلہ! اگر میری کسی حرکت پر خفا ہو تو کھل کر کہو یہ اجنبیوں سے رویے برداشت نہیں ہوتے مجھ سے۔''

اس کی ریکویسٹ پر کچھ لمحوں کے لئے وہ بالکل خاموش رہی تھی۔

''میں ابھی اور اسی وقت کے۔ایف۔سی میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں کیا ابھی آپ وہاں مجھ سے ملنے کے لئے آسکتے ہیں؟''

''اوکے میں پہنچ رہا ہوں۔ ٹیک کیئر۔'' اب کے اس کا انداز قدرے الجھا ہوا تھا۔ تاہم سائلہ خان نے فوراً خدا حافظ کہہ کر سیل فون بند کر دیا تھا۔

اگلے کچھ ہی لمحوں میں وہ اس کے مقابل تھا۔ لائٹ گرے کلر کے سادہ شلوار قمیص میں بھی وہ خاصا پرکشش دکھائی دے رہا تھا جب کہ سائلہ خان مکمل بلیک کلر کے ہلکے پھلکے کام والے کپڑوں میں ملبوس بہت چارمنگ دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا حسن پہلے سے بھی زیادہ نکھر گیا تھا۔

موسم چونکہ تھوڑا خشک تھا لہٰذا ازمیر نے اپنا فیورٹ آئس کریم فلیور آرڈر کر دیا تھا۔

''ہاں اب کہو کہ کیا بات ہے......کوئی ناراضگی ہے مجھ سے......؟'' سائلہ خان کے مقابل بیٹھتے ہی خاصے پرشوق انداز میں اس نے پوچھا تھا۔ جب وہ آہستہ سے چہرے کا رخ پھیرتے ہوئے بولی تھی۔

''نہیں۔''

''تو پھر موڈ کیوں آف ہے تمہارا؟''

''میرا موڈ آف نہیں ہے مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔''

اس کا موڈ سنجیدہ تھا تب ہی وہ بھی سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا تھا۔

''پوچھو......''

اس کی اجازت پر سائلہ خان نے پھر سے کچھ لمحے خاموشی کی نذر کیے تھے۔

''شہرین خان سے کیا تعلق ہے آپ کا......؟''

کچھ پل خاموش رہنے کے بعد اس نے پوچھا تھا جواب میں ازمیر شاہ کی خوب صورت بادامی نگاہوں میں کچھ لمحوں کے لئے حیرانگی در آئی تھی تاہم اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا تھا تب ہی پرسکون انداز میں جواب دیا تھا۔

''دوست ہے میری۔ کلاس فیلو بھی رہی ہے مگر تم کیسے جانتی ہو اسے؟''

''یہ سوال اہم نہیں ہے کہ میں اسے کیسے جانتی ہوں البتہ یہ جاننا ضرور اہم ہے کہ آپ اسے کس حد تک جانتے ہیں؟'' اس کے انداز سے جھلکتی خفگی ازمیر سے ہرگز پوشیدہ نہیں رہ سکی تھی۔ تب ہی وہ الجھتے ہوئے بولا تھا۔

''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟ کھل کر صاف صاف کیوں نہیں کہتیں؟''

''صاف صاف ہی کہنا چاہتی ہوں۔ جب آپ اس سے محبت کرتے تھے اسے ہی اپنی زندگی کا حصہ بنانا چاہتے تھے تو پھر مجھ سے تعلق کیوں قائم کیا؟ ایسی کون سی مجبوری درپیش آگئی تھی آپ کو کہ زبردستی آپ کو مجھ سے رشتہ قائم کرنا پڑا......؟'' اب کے خفگی کے ساتھ ساتھ اس کے لہجے میں ہلکی سی نمی بھی در آئی تھی۔

ازمیر کے لئے اس کے الفاظ بہت زیادہ حیرانگی کا باعث بنے تھے۔

کون تھا جس نے سائرہ خان کے دل کو بھی اس کی طرف سے آلودہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ صرف ایک لمحے کے لئے اس نے سوچا تھا اور پھر اگلے ہی لمحے اس کے تصور میں ماہم شاہ کا تنفر سے اٹا چہرہ در آیا تھا۔ تب ہی وہ سرد آہ بھرتے ہوئے بہت سنجیدہ لہجے میں بولا تھا۔

''میں جانتا ہوں جو زہر تم اس وقت اگل رہی ہو وہ زہر کس نے تمہاری سماعتوں میں انڈیلا ہے۔'' ابھی وہ محض اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ اس کے سیل پر اریشہ کی کال آگئی جسے اس وقت بہت آف موڈ کے ساتھ اس نے پک کیا تھا۔

''ہیلو......''

''السلام علیکم ہانی! میں کب سے ٹرائی کر رہی ہوں تمہارا نمبر نہیں مل رہا تھا۔ مجھے بہت ضروری بات کرنی تھی تم سے......''

ہمیشہ کی طرح اس کا لہجہ بہت پرخلوص اور فریش تھا تاہم ازمیر شاہ اس وقت ذہنی طور پر اتنا ڈسٹرب تھا کہ اریشہ کی کال بھی اسے پرسکون نہیں کر سکی تھی۔ تب ہی وہ قدرے خشک لہجے میں اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا تھا۔

''میں اس وقت سائرہ کے ساتھ بات چیت میں بزی ہوں اریشہ فری ہو کر کال بیک کرتا ہوں تمہیں۔'' کہنے کے ساتھ اس نے نہ صرف کال ڈس کنکٹ کر دی بلکہ سیل ہی آف کر کے رکھ دیا تھا۔ سائرہ خان اس دوران چپ چاپ نگاہیں جھکائے اپنے لمبے ناخنوں سے ٹیبل کی سطح کو کھرچتی رہی تھی۔

''ہوں تو میں آپ سے کہہ رہا تھا مس سائرہ خان صاحبہ! کہ شہرین خان سے میرا جو بھی تعلق تھا وہ کسی سے بھی پوشیدہ نہیں تھا۔ بہت پہلے اسٹوڈنٹ لائف میں اچھی لگی تھی وہ مجھے اور وہ عمر ایسی ہی ہوتی ہے ہر چیز اچھی لگتی ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ اگر شہرین خان میری زندگی کا حصہ نہ بنی تو

میں مرجاؤں گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ مرنا تو دور کی بات، بعد کے حالات نے مجھ پر یہ انکشاف بھی کر دیا کہ میں اس کی محبت میں نہیں بلکہ اس کے جنون میں گرفتار تھا جو وقت کے ساتھ ساتھ کسی کی بے لوث ریاضتوں سے ختم ہوتا چلا گیا تھا۔ میرے جنوں کی یہ کہانی آپ کی بہن کو بخوبی معلوم تھی اس کے باوجود انہوں نے مجھ سے امید باندھی کہ میں آپ کا ہاتھ تھام لوں۔ صرف ان ہی کی خوشی کے لئے میں نے آپ کو خود سے منسوب کیا تھا سائلہ میری کوئی ذاتی غرض پوشیدہ نہیں تھی اس میں۔'' سائلہ خان کا سر اس کی وضاحت پر مزید جھک گیا تھا۔

ازمیر سے پہلے ہی وہ اپنی بہن صالحہ کے ساتھ جھگڑی تھی۔ اسی سے گلہ کیا تھا کہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس نے ازمیر کے ساتھ اس کا رشتہ قائم کیوں کیا؟ جواب میں صالحہ نے بہت تحمل اور سلیقے کے ساتھ اس کی برین واشنگ کرتے ہوئے نہ صرف ازمیر کی صفائی پیش کی تھی بلکہ اسے اچھے مستقبل کے بہت سہانے خواب بھی دکھائے تھے تاہم اس کے دل کو کسی طور قرار نصیب نہیں ہوا تو وہ ازمیر سے بھی الجھنے چلی آئی۔ رقابتوں کے معاملات ہی ایسے ہوتے ہیں۔

عورت خواہ کتنی ہی مجبور اور مضبوط کیوں نہ ہو اپنے حق کی تقسیم برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ بھی نہیں کر سکی تھی تب ہی اسے شرمندہ کرنے کا عزم لئے چلی آئی تھی مگر اب اس کی وضاحت کے بعد وہ خود شرمندہ ہو کر بیٹھ گئی تھی۔

''میں شہزین خان سے محبت کا دعوے دار ہوتا تو اب تک وہ میری زندگی کا حصہ بن چکی ہوتی سائلہ کیونکہ اس وقت اسے ایک ہمدرد ہمسفر کی اشد ضرورت ہے۔''

اس کے لہجے میں اب بھی ٹھہراؤ تھا۔ تب ہی وہ شرمندہ لہجے میں بولی تھی۔

''آئی ایم سوری ازمیر! مجھے آپ کے کردار پر شک نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

''اس میں سوری کی کیا بات ہے؟ یہ معاملات ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ستا دینے والے الجھا دینے والے بہر حال آپ کا الزام غلط نہیں ہے۔ محبت تو میں واقعی کرتا ہوں کسی اور سے.....''

اب کے سائلہ خان نے بے ساختہ چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

''ہاں سائلہ! بتانے والے نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ حقیقی سچائی کیا ہے؟ مجھ پر بھی بہت دیر میں یہ بھید کھلا ہے کہ شعور سنبھالنے سے لے کر اب تک میری محبت کا محور فقط ایک ہی ہستی رہی ہے اور وہ ہستی اریشہ خان کی ہے جس سے دور ہونے کا سوچتے ہوئے بھی میرا دل کٹتا ہے۔ آپ کو خود سے منسوب کرنے کی ایک بڑی وجہ اریشہ سے محبت بھی تھی کیونکہ میں اپنی حماقتوں کی وجہ سے اس کے کردار پر حرف آتے ہوئے برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ میں اس جیسی انمول لڑکی سے محبت کرنے کے قابل نہیں ہوں، اسی لئے میں نے کبھی اپنے جذبوں کو اس پر آشکار نہیں کیا لیکن اب صورت حال بہت مختلف ہے۔ اب میری محبت کو میرے سہارے کی ضرورت ہے جو پیار جو خوشیاں اسے میں دے سکتا ہوں وہ کوئی اور اسے کبھی نہیں دے پائے گا۔ آپ بہت اچھی ہیں خدا جانتا ہے کہ میرے دل میں آپ کے لئے بہت عزت و احترام ہے آپ اس قابل ہیں کہ دنیا کا کوئی بھی خوب صورت باکردار اور امیر کبیر لڑکا آپ کا ہاتھ تھامنے کو اپنے لئے اعزاز سمجھے مگر میری اریشہ کو میرے علاوہ سنبھالنے والا شاید بہت مشکل سے سامنے

آئے۔اسی لئے میں نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ جذباتیت کا شکار ہو کر بنا آپکے احساسات کی پروا کیے جو رشتہ میں نے آپ سے جوڑا تھا اس رشتے کو ابھی اور اسی وقت یہیں ختم کر دوں تا کہ آپ بھی اپنی مرضی اور خوشی سے خود اپنے لئے کوئی اچھا سا ہم سفر ڈھونڈ سکیں اور میں بھی اپنی محبت کے کام آ سکوں۔ امید ہے آپ میرے اس فیصلے کا احترام کریں گی اور ہم دونوں ہمیشہ اچھے دوستوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ تعلق قائم رکھیں گے۔''

وہ بات جو پچھلے کتنے ہی دنوں سے وہ سائمہ خان کی سماعتوں کے سپرد کرنا چاہ رہا تھا اس وقت وہی بات بڑے آرام سے اس کے دماغ میں انڈیل کر وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

دونوں کے سامنے رکھے آئس کریم کپ پگھل کر پانی بن چکے تھے۔

از میر بل ادا کرنے کے بعد پھر ایک لمحے کے لئے بھی وہاں ٹھہرا نہیں تھا جب کہ سائمہ خان ہکا بکا سی کتنی ہی دیر وہیں بیٹھی اسے تیز تیز قدموں سے جاتے ہوئے دیکھتی رہی تھی۔

☆☆☆

تمکین لاؤنج میں ساکت کھڑی اپنے سامنے موجود منزہ ترمذی کو دیکھ رہی تھی جب کہ ان کی آنکھوں سے گویا غصے کے شعلے نکل رہے تھے۔ برسوں بعد ''حسن ولاج'' میں ان کی آمد نے گھر کی تقریباً تمام خواتین کو ششدر کر ڈالا تھا۔مرد حضرات اس وقت تک اپنے اپنے دفتروں کو روانہ ہو چکے تھے۔صرف اشعر نا سازی طبیعت کی بنا پر گھر میں تھا۔منزہ ترمذی کو دیکھ کر سب سے پہلے سمیہ بیگم آگے بڑھی تھیں۔

''بدتمیز! فلرٹ انسان تم کیا سمجھتے ہو تمہارا جب جس لڑکی کے لئے دل چاہے گا تم اس سے کھیلو گے.....؟ ہرگز نہیں۔ترمذی کی بیٹی زمین پر پڑا کوئی حقیر پتھر نہیں ہے جسے تم جب دل چاہے گا ٹھوکر مار کر راستے سے ہٹا دو گے۔'' وہ جو غصے میں خود ہی شیزا سے اپنے تمام تعلق توڑ چکی تھی اس وقت اسی کے لئے شدید اشتعال میں لڑ رہی تھیں۔

''بڑے پارسا بنتے ہو تم لوگ۔بڑا اونچا نام ہے تمہارا۔اپنے معاملات میں تمہاری پارسائی کہاں چلی جاتی ہے.....؟'' سفر کی تھکن ان کے چہرے سے خوب ظاہر ہو رہی تھی۔

سمیہ بیگم' آسیہ بیگم' تمکین' اشعر سب ہی بھونچکاں کھڑے ان کے غصے کا نظارہ کر رہے تھے۔کسی میں ان کے سامنے بولنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔سب کے حیران و پریشان چہروں پر اک تنفر بھری نگاہ ڈالتے ہوئے وہ خود بھی کچھ لمحوں کے لئے سانس لینے کو ٹھہر گئی تھیں۔

''کیا قصور تھا میرا.....؟'' کچھ ہی لمحوں کے بعد انہوں نے پھر سے بولنا شروع کیا تھا۔

''یہی ناں کہ میں نے اپنی زندگی کے لئے خود اپنی پسند سے اپنا ہمسفر ڈھونڈنے کی سنگین جسارت کی تھی جس کی سزا میں' خود میرے ہی گھر والوں نے' تم سب لوگوں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میرا دامن اپنی محبتوں سے خالی کر دیا۔ماں جی اور بابا جی کی رحلت پر بھی اس گھر میں آنے کی اجازت نہیں ملی مجھے۔ٹھیک ہے اپنی پوری زندگی اس گھر کے اصولوں کی بھینٹ چڑھتے ہوئے جلتے سلگتے بیتا دی میں نے لیکن.....ایک مرتبہ پھر تم لوگ وہی کہانی دہرا رہے ہو جو سزا میرا نصیب بنی اسی سزا کو میری بیٹی کے نصیب میں بھی درج کر رہے ہو تم لوگ کیوں.....؟''

وہ خود کو مضبوط ظاہر کرتے کرتے بالآخر کمزور پڑ گئی تھیں۔

''میں نے سہا ہے زندگی کے تمام موسموں کے گرم مزاجوں کو' کبھی گلہ نہیں کیا' جس حال میں تم لوگوں نے بے سروسامان چھوڑا اسی حال میں صبر وشکر کے ساتھ زندگی کے پچیس سال بسر کیے ہیں میں نے لیکن...... میری بیٹی کو تمہارے ہاتھوں کوئی دکھ ملے وہ میری طرح تا عمر تنہائیوں کی سزا جھیلے یہ برداشت نہیں کروں گی سن لو تم لوگ اپنی شیزا کے ساتھ کوئی بے انصافی نہیں ہونے دوں گی میں......''

ہر ماں اپنی اولاد کے معاملے میں شاید یوں ہی جذباتی ہو جاتی ہے۔ جس چوکھٹ پر وہ اپنے والدین کی رحلت کے وقت بھی قدم نہ رکھ پائی تھیں اسی چوکھٹ پر آج اپنی بیٹی کے لئے سر جھکا دیا تھا انہوں نے۔

سمیہ بیگم' آسیہ بیگم' تمکین' اشعر سب کے سر اس وقت ندامت سے جھکے ہوئے تھے جب کہ وہ اب رو رہی تھیں۔

''میں مانتی ہوں میری بیٹی نے وہی جرم کیا ہے جو مجھ سے سرزد ہوا تھا لیکن وہ اس جرم میں اکیلی شریک نہیں ہے۔ اشعر برابر کا قصوروار ہے۔ پوچھو اس سے جب اسے تمکین کے ساتھ ہی زندگی بسر کرنی تھی تو میری بیٹی کو سبز باغ کیوں دکھائے اس نے؟ کیوں شادی سے پہلے اس کی عزت خراب کر کے تماشہ بناڈالا اسے' کس طرح کے دل ہیں تمہارے؟ بجائے اپنے بیٹے کو سرزنش کرنے کے اسے برا بھلا کہنے کے' تم لوگوں نے بھی میری بیٹی پر سارے الزام دھر کر اسے دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب جب کہ وہ اشعر کے نام سے منسوب بھی ہے اور اس کے پاس اسی اشعر کا بچہ بھی ہے پھر بھی تم لوگ اسے اپنانے کو تیار نہیں کیوں......؟'' وہ پھر روتے ہوئے چلا اٹھی تھیں۔

عین اسی لمحے رخسانہ بیگم نے لاؤنج میں قدم رکھا تھا۔ وہ شاور لے کر ابھی ابھی آئی تھیں اور تمام صورت حال سے باخبر ہوئی تھیں۔ تب ہی بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں بنا دعا سلام کے بولی تھیں۔

''کیونکہ...... اس نے انتہائی غلط طریقہ اپناتے ہوئے اشعر اور تمکین کے بیچ فاصلے بڑھانے کی گھٹیا پلاننگ کی تھی۔''

ان کی آواز پر منزہ بیگم کے ساتھ ساتھ سب ہی نے پیچھے پلٹ کر دیکھا تھا۔

''اچھا...... اس نے جو کیا وہ غلط تھا اور آپ کے بیٹے نے جو کیا وہ سب اچھا تھا۔'' ان کا لہجہ اب بھی تپا ہوا تھا۔ اشعر نے اس موقع پر لب کھولنے کی جسارت کی تھی مگر منزہ بیگم نے فوراً ہاتھ اٹھا کر اسے کچھ بھی کہنے سے روک دیا تھا۔

''بہت عجیب اصول ہیں تمہارے۔ اپنے بیٹے کا کوئی قصور نظر ہی نہیں آتا تمہیں۔ کس قدر مطمئن ہو کر بیٹھے ہو تم لوگ میری بیٹی کو قصوروار مانتے ہوئے۔ میں پوچھتی ہوں اگر یہ اپنی بیوی کے ساتھ مخلص ہوتا تو شیزا کی باتوں میں آکر کیوں اس کے سہارے کی ضرورت محسوس کرتا۔ اپنی زندگی میں زہر گھولنے والا یہ خود ہے۔ خود بے معنی شک کا شکار ہو کر تمکین سے اپنے راستے علیحدہ کیے ہیں اس نے۔ کوئی جب تک خود اپنا برا نہ کرے کوئی اور اس کا برا نہیں چاہ سکتا۔'' ان کا ہر لفظ حقیقت پر مبنی تھا تاہم حسن ولاج کے مکین ابھی تک اس حقیقت سے نگاہیں چراتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

''بہرحال...... میں یہاں تم لوگوں سے اپنے یا اپنی بیٹی کے لئے بے کار کی محبت کی بھیک مانگنے نہیں آئی ہوں بلکہ تمہیں تنبیہ کرنے آئی

ہوں کہ اگر جلد ہی تم لوگوں نے میری بیٹی کو اس کا حق نہیں دیا تو میں عدالت میں یہ کیس دائر کر دوں گی اور اب تم لوگ دیکھو گے کہ یہ ماں جس نے اپنی ذات کے لئے کبھی تم لوگوں سے ایک تنکا تک نہیں مانگا وہ اپنی بیٹی کے لئے کیسے تمہارے اس شاندار گھر کے درو دیوار ہلا کر رکھتی ہے۔"

ان کا لہجہ اب بھی بے لچک ہی تھا۔

حسن ولاج کے تمام مکین اپنی جگہ پر چپ چاپ کھڑے رہ گئے تھے جب کہ وہ اپنا مدعا بیان کرنے کے بعد پھر ایک لمحے کے لئے بھی وہاں نہیں ٹھہری تھیں۔

"مما! منزہ پھوپھو جو چاہتی ہیں۔ وہ میں ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔ میں دیکھتا ہوں اب شیزا احمد کو میرے ہاتھوں جہنم واصل ہونے سے کون روکتا ہے......؟"

اشعر جو کب سے خاموش کھڑا منزہ ترمذی کے ہر الزام کو سن رہا تھا اب ان کے جاتے ہی ایک دم سے جذباتی ہوتے ہوئے بولا اور پھر اگلے ہی پل تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے گھر سے باہر نکل گیا۔

جشنِ فرقت بھی گئی رات منایا ہو گا
اس کی یادوں نے پھر اک شہر سجایا ہو گا
پوچھا ہو گا جو کسی نے ''کہو! اچھے ہو؟''
ہنستی آنکھوں میں سمندر اُتر آیا ہوگا

عدنان کب سے کھڑکی کے پاس بیٹھا باہر تیزی سے برستی بارش کو دیکھ رہا تھا۔ انجشاء کمرے میں آئی تو اس نے بے ساختہ سرد آہ بھرتے ہوئے آہستہ سے پلکیں موندلیں۔

کمرے کا حال اس وقت خاصا ابتر ہو رہا تھا۔ کوئی بھی چیز سلیقے سے اپنی جگہ پر پڑی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ پچھلے دو تین روز سے انجشاء کے دل کی حالت بہت خراب تھی۔ تبھی اس وقت وہ اس کا کمبل سمیٹتے ہوئے بے ساختہ پوچھ بیٹھی تھی۔

''نورالعین سے کافی گہرے مراسم معلوم ہوتے ہیں تمہارے۔''

''ہاں بہت اچھی دوست رہی ہے میری۔'' عدنان نے اقرار میں قطعی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی تھی۔

''اچھا لیکن اس کے انداز سے تو نہیں لگتا کہ وہ محض تمہاری اچھی دوست رہی ہوگی۔''

اس کا لفظ لفظ جل رہا تھا۔ تبھی عدنان نے ذرا سی گردن موڑ کر خاصے اچنبھے سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

''اچھا اور کیا کیا لگتا ہے اس کے انداز سے۔''

انجشا جیسی مضبوط لڑکی کا اس معاملے میں جلنا عدنان کے لئے حیران کن ہی تھا۔

''آئی ڈونٹ نو، میں محض اتنا جانتی ہوں کہ وہ میری جگہ کبھی نہیں لے سکتی۔''

''بالکل! اس دنیا میں ہر انسان کا اپنا الگ مقام ہے۔ کوئی شخص کسی دوسرے کی جگہ نہیں لے سکتا۔'' اس کا جواب اسے پھر سلگا گیا تھا۔ تبھی وہ تکیہ بیڈ پر پٹختے ہوئے بولی تھی۔

''میں صرف اپنی بات کر رہی ہوں۔ میرے ہوتے ہوئے وہ تمہاری ذمہ داری نہیں سنبھال سکتی۔''

''سوری انجو، میں اسے تمہارے مقابل نہیں لا رہا لیکن وہ میری بہت اچھے دنوں کی دوست ہے۔ بہت انڈر اسٹینڈنگ ہے ہماری ایک دوسرے کے ساتھ۔ بہت سمجھتی ہے وہ مجھے، پتہ ہے یونیورسٹی پریڈ میں ایک بار ہمارے مخالف گروپ کی کسی لڑکی نے جل کر نور اور میرے ریلیشن پر چوٹ کر دی تھی۔ تب اس سر پھری لڑکی نے، صرف میرے لئے اس لڑکی کو بری طرح پیٹ کر پورے کالج میں اپنا امیج خراب کر لیا تھا۔ میں رشتوں کی گہرائی کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ جو ہستی آپ کے لئے کچھ بھی کر گزرنے کا عزم رکھتی ہو، اس کے خلوص پر کبھی شک

نہیں کرنا چاہیے۔"

صرف ایک لمحے کے لئے وہ سانس لینے کو رکا تھا۔ پھر دوبارہ سے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"بہت سی لڑکیاں آئی ہیں میری زندگی میں مگر...... بہت کم لڑکیاں میری نگاہ میں اپنا وقار ثابت رکھ پائی ہیں۔ نور العین بھی ان میں سے ایک ہے جو محض سکھ کے موسم میں ہی نہیں دکھ کے موسم میں بھی میرا ساتھ نبھا سکتی ہے۔"

"نبھا سکتی ہوگی لیکن میرے ہوتے ہوئے کسی اور کے ساتھ کی ضرورت کیوں پیش آئی تمہیں؟ کب میں نے کہا ہے کہ میں تمہارا ساتھ نہیں نبھا سکتی۔"

وہ شدید ہرٹ ہوئی تھی۔

تبھی عدنان پھر سے رخ پھیر کر باہر برستی بوندوں کی طرف دلچسپی سے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

"ہر بات زبان سے کہنے کی نہیں ہوتی، کچھ باتیں صرف محسوس کی جاتی ہیں۔ بہر حال میں اپنی وجہ سے تمہیں کسی مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ ماضی میں اپنی حماقتوں کے سبب جو کچھ میں تمہارے ساتھ کر چکا ہوں اس کے بعد کس منہ سے تمہارا احسان اٹھاؤں۔ میں تم پر بوجھ بن کر جینا نہیں چاہتا انجو میں......"

"بس کرو، خدا کے لئے یہ احسان احسان کی گردان دہرانا بند کرو" ضبط کی آخری حد کو کراس کرتے ہوئے بے ساختہ وہ چلا اٹھی تھی۔

"پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ کیوں اس درجہ ذہن خراب ہو گیا ہے تمہارا۔"

نہ چاہتے ہوئے بھی وہ رو پڑی تھی۔

عدنان نے اس لمحے بمشکل پلکیں موند کر اپنا کرب ضبط کرنے کی کوشش کی تھی۔ تبھی وہ آنسوؤں سے لبریز نگاہیں لئے اس کے قریب چلی آئی تھی۔

"خدا کے لئے میرا یقین کرو عدنان، میں نے ایک لمحے کے لئے بھی تمہیں خود پر بوجھ نہیں سمجھا۔ کبھی ماضی کی کسی بات کو ذہن میں رکھ کر، اپنے کسی عمل کو تم پر احسان نہیں سمجھا کیوں میرے خلوص کو داغ دار کرنے پر تل گئے ہو تم؟......"

عدنان اس کی وضاحت پر خاموش ہی رہا تھا۔

"انجشاء نے بھی اس کے بعد پھر اس سے کچھ بھی کہنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ چپ چاپ اس کے کمرے کی ہر چیز کو سلیقے سے، ترتیب دینے کے بعد اس نے وارڈ روب کھولی اور عدنان کے استعمال شدہ کپڑے علیحدہ کر کے اپنے ساتھ دھونے کے لئے لے آئی۔ ابھی وہ اس کے کمرے سے نکل ہی رہی تھی کہ شیزا اچانک وہاں چلی آئی۔ انجشاء اسے دیکھ کر زبردستی اپنے لبوں پر مسکراہٹ لے آئی تھی۔ بھری دنیا میں اس وقت شیزا سے زیادہ مخلص اسے کوئی اور دکھائی بھی نہیں دے رہا تھا۔

☆☆☆

''بے مثال کا نیج''میں آج کل بڑے عجیب سے حالات در آئے تھے۔

پچھلے دو ہفتوں سے شہر یار صاحب بزنس ٹور کے سلسلے میں ملک سے باہر گئے ہوئے تھے۔اریشہ نے ویسے ہی خود کو کمرے میں مقید کیا ہوا تھا۔دانیہ اور عدیلہ ڈاکٹر فرحان اور شہرین خان کے ساتھ شمالی علاقہ جات کی سیر کے لئے نکل گئی تھیں۔ پیچھے محل سا وسیع گھر تھا اور نورینہ بیگم کی ذات تھی۔ڈاکٹر فرحان نے انہیں اور اریشہ کو بھی ساتھ چلنے کے لئے فورس کیا تھا مگر نہ نورینہ بیگم ان لوگوں کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہوئی تھیں اور نہ ہی اریشہ نے اپنی طبیعت کی وجہ سے ان کا ساتھ دیا تھا۔تاہم اب وسیع درودیوار کی تنہائی میں ان کا دم گھٹنے لگا تھا۔

ہروقت ماضی کی تلخ یادوں میں ڈوبے رہنا،انہوں نے اپنا مشغلہ بنالیا تھا۔اریشہ کو ان کے حال کی کوئی پروا نہیں رہی تھی۔صبح ناشتے کے بعد وہ خود کو کمرے میں مقید کر لیتی، یا پھر کسی دوست سے ملنے کے لئے نکل کھڑی ہوتی۔نورینہ بیگم کو اپنا یوں اس طرح سے نظرانداز ہونا اندر سے کاٹ رہا تھا۔ان کی اپنی سگی اولاد کو ہی ان کی کوئی پروا نہیں رہی تھی۔ سبھی اپنی اپنی دلچسپیوں میں محو ہو کر ان کی قربانیوں کو فراموش کر چکے تھے۔کسی کو ان کے بارے میں سوچنا تک گوارہ نہیں رہا تھا۔

پچھلے تین ہفتوں میں شہر یار صاحب نے بھی بمشکل دو یا تین بار ان سے مختصر بات کر کے حال پوچھنے کی زحمت گوارہ کی تھی۔سارا دن فارغ رہتے رہتے اکتا جاتیں تو''شاہ ولاج''کا نمبر ڈائل کر کے حائقہ بیگم یا دیگر لوگوں سے بات چیت میں وقت پاس کرنے کی ناکام کوشش کرتیں مگر اس معاملے میں بھی وہ دردہی سمیٹتی تھیں۔کیونکہ وہاں شاہ ولاج میں سوائے حائقہ بیگم کے اور کسی کے پاس بھی ان سے تفصیلاً گپ شپ لگانے کی فرصت نہیں ہوتی تھی اور اس بات کو بہت جلد انہوں نے اپنے رویوں سے ظاہر بھی کر دیا تھا۔اس روز وہ ماہم شاہ سے بات کر رہی تھیں۔جب اس نے ابتدائی دعا وسلام کے بعد خاصے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا تھا۔

''پھوپھو آپ روز یہاں دو دو گھنٹے کی کال کرتی ہیں۔کیا بات ہے آپ کی طرف بل نہیں آتا؟ بھئی مانا آپ کو بہت امیر کبیر آدمی کی وائف ہونے کا اعزاز حاصل ہے لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ آپ ان کی حق حلال کی کمائی ،کو یوں دونوں ہاتھوں سے خرچ کر کے،ان کے بھرے خزانے خالی کرنے پر تل جائیں۔مائنڈ مت کیجئے گا پلیز اپنا دل اپنے گھر میں ہی لگانے کی کوشش کیجئے۔کیونکہ یہاں سب کی اپنی اپنی مصروفیات ہیں،محض آپ کا دل بہلانے کے لئے اپنی مصروفیات کو پس پشت نہیں ڈال سکتے۔خیر گھر میں اس وقت میرے سوا اور کوئی بھی نہیں ہے۔آپ بعد میں فون کر لیجئے گا خدا حافظ۔''

کیسے زہر میں بجھے ہوئے تیر سے لفظ تھے جو ان کے جگر کو لمحوں میں ٹکڑے ٹکڑے کر گئے تھے۔وہ اس انسلٹ سے اس قدر ہرٹ ہوئیں کہ بیمار پڑ گئی تھیں۔اس پر بھی کوئی ان کا پرسان حال نہیں تھا۔

تین دن ہو گئے تھے۔وہ ایک ہی سوٹ میں ملبوس پھر رہی تھیں۔چہرہ تک نہیں دھویا تھا انہوں نے۔صبح سے تیز بخار کی لپیٹ میں ہونے کی وجہ سے کچھ کھایا بھی نہیں تھا۔صبح سے اریشہ صرف ایک بار ملنے آئی تھی انہیں،تب ان کی طبیعت زیادہ خراب نہیں تھی مگر اس وقت وہ خود کو بہت کمزور محسوس کر رہی تھیں۔رو رو کر انہوں نے اپنا برا حال کر لیا تھا۔

کیا شہریار صاحب انہیں اس حال میں یوں تنہا چھوڑ سکتے تھے؟

شاید کبھی نہیں۔

یہی وجہ تھی کہ اس وقت انہیں صرف انہی کی یاد آ رہی تھی۔

سسک سسک کر روتے ہوئے ان کے لب صرف انہیں ہی پکار رہے تھے۔ ایک طرح سے ہار گئی تھیں وہ، ان کی انا کے سارے بت ان چند دنوں میں گر گر کر پاش پاش ہو گئے تھے۔ اس وقت انہیں اس بات کے سوا اور کچھ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ وہ شہریار صاحب کو آج بھی دل سے چاہتی ہیں۔ ان کی زندگی کا ہر لمحہ آج بھی ان کی محبت کے بغیر ادھورا ہے۔ انہیں اذیت پہنچا کر وہ خود بھی کبھی سکون سے خوش نہیں رہ سکیں گی۔ جب زندگی میں ان کے بغیر سکون اور عزت ہی نہیں تھی تو پھر بیکار کی انا کے حصار میں رہنا کہاں کی دانشمندی تھی۔ اسی سوچ نے ان کے حوصلے بڑھائے تھے اور وہ پہلی بار خود اپنے لئے ان سے رابطہ کرنے پر مجبور ہو گئی تھیں۔ کپکپاتی، لمبی انگلیوں سے ان کا موبائل نمبر پریس کرتے ہوئے ان کا دل بہت بری طرح سے دھڑک کا تھا۔

شہریار صاحب! اس وقت بہت امپورٹنٹ میٹنگ میں بزی تھے۔ تبھی ان کی کال پر سیل پاکٹ سے نکال کر کال کرنے والے کا نمبر تک دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی اور اس بات نے نورینہ بیگم کو اور بھی ہرٹ کیا تھا۔ ان کی طبیعت ایک دم سے بگڑی تھی اور پھر کچھ ہی لمحوں کے بعد ان کے ذہن پر اس درجہ دباؤ بڑھا کہ وہ اپنے ہوش و حواس سے ہی بیگانہ ہوتی چلی گئی تھیں۔

شہریار صاحب نے میٹنگ ختم ہونے کے بعد جب اپنا سیل دیکھا تو نورینہ بیگم کے پرسنل نمبر سے کال دیکھ کر حیران رہ گئے تھے مگر اس وقت تک شاید بہت دیر ہو گئی تھی۔

☆☆☆

اشعر ہر صورت تمکین کو پھر سے اپنی زندگی کا حصہ بنانا چاہتا تھا۔ اس کے نزدیک اس نے جو حماقت کی تھی وہ اتنی بڑی نہیں تھی کہ تمکین کو سزا کے طور پر ہمیشہ کے لئے اس سے الگ کر دیا جاتا۔ تمکین کے پھر سے حصول کو اس نے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ سبھی گھر والے اس کی اس جنوں خیزی سے از حد پریشان تھے۔ پچھلے کئی دنوں سے اس کی سرگرمیاں خاصی مشکوک ہو رہی تھیں۔ وہ نہ آفس میں پایا جاتا تھا نہ گھر میں۔

اس روز وہ رات کو بہت دیر سے گھر واپس لوٹا تو سبھی لوگوں کو لاؤنج میں جمع دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ پچھلے کئی دنوں کی شب خوابی کے باعث اس کی آنکھیں بھی خوب سرخ ہو رہی تھیں۔ بے ترتیب حلیے میں تھکے تھکے سے قدم اٹھاتا وہ وہیں ان سب لوگوں کے قریب چلا آیا تھا۔

''خیریت.....آپ سب لوگ یہاں یوں اس طرح سے جمع ہو کر کس کا انتظار کر رہے ہیں؟''

''تمہارا۔'' اس کے سوال کا جواب فاروق صاحب نے دیا تھا۔

''آؤ بیٹھو ہمیں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔''

ان کے الفاظ پر وہ قدرے الجھتے ہوئے وہیں صوفے پر ایک طرف ٹک گیا تھا۔

''بولیے۔''

''کچھ پوچھنا ہے تم سے، کیا یہ سچ ہے کہ تمکین سے شادی کرنے کے بعد تم شیزا میں انٹرسٹڈ ہو گئے تھے اور بنا کسی شرعی رشتے کے تم نے اسے ایک بچے کی ماں بھی بنا ڈالا تھا۔'' ان کا انداز قدرے تفتیشی تھا۔ تبھی وہ جیسے بوکھلا کر بولا تھا۔

''آئی ڈونٹ نو بڑے پاپا، میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ ان دنوں میں ذہنی طور پر بہت ڈسٹرب تھا۔ مجھے خود کو سنبھالنے کے لئے کسی کے سہارے کی اشد ضرورت تھی۔ یہ سہارا شیزا نے مجھے فراہم کیا تو پتہ نہیں کب میں بہک گیا۔'' اس وقت اشعر کے منہ سے اس اعتراف نے وہاں موجود سبھی لوگوں کو ششدر کر ڈالا تھا۔ وہ تو اب تک اس بات کو محض بکواس ہی سمجھ رہے تھے۔

سعید صاحب کا سر اس موقع پر حقیقی معنوں میں جھک گیا تھا۔ اپنے جس بیٹے پر وہ فخر کرتے نہیں تھکتے تھے۔ وہ اندر سے اتنا گھٹیا ہو گا ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ تبھی وہ سرعت سے اپنی جگہ سے اٹھے تھے اور ایک زوردار تھپڑ اس کے بائیں گال پر جڑ دیا تھا۔

''پاپا۔''

اشعر ان کے تھپڑ سے حقیقی معنوں میں ہل گیا تھا۔ تبھی حیرانگی سے ان کی طرف دیکھا تو وہ چلا اٹھے۔

''شٹ اپ، مر گیا آج تمہارا پاپا، نا ہنجار نالائق اولاد ایسے گھٹیا کرتوت کرنے سے بہتر تھا تو مر جاتا۔'' رخسانہ بیگم کا دل ان کے الفاظ پر مچلا تھا مگر اس وقت کسی میں بھی سعید صاحب کے سامنے کچھ بھی کہنے کی ہمت نہیں تھی۔

وہ تو منزہ ترمذی کی آمد سے انہیں بے خبر ہی رکھنا چاہتی تھی مگر سمیہ بیگم اور آسیہ بیگم نے ایسا نہیں ہونے دیا تھا۔

''بدکردار، بدتمیز انسان، کھوٹ تمہارے کردار میں تھی اور الزام تم تمکین کے دامن پر لگاتے رہے۔ کیوں نہیں خیال آیا تمہیں اپنے باپ کی عزت کا، سمجھتے کیا ہو تم اپنے آپ کو؟ نواب ہو کسی ریاست کے، جو دل میں آئے گا کرو گے؟ ہرگز نہیں، اس چاردیواری میں رہنے والوں کو عیاشی کی

اجازت نہیں ہے۔ یہاں عزت دار شریف لوگ بستے ہیں۔ لہٰذا تمہاری بھلائی بھی اب اسی میں ہے کہ تم شیزا کو رخصت کروا کر اس گھر میں لاؤ اور اسے بیوی کے مکمل حقوق دو۔''

اس لمحے ان کا غصہ آسمان کو چھو رہا تھا مگر اشعر اپنے ارادے سے باز رہنے والا نہیں تھا۔ تبھی رخ پھیرتے ہوئے اٹل لہجے میں بولا تھا۔

''سوری پاپا! میں ایک چھوٹی سی غلطی کی اتنی بڑی سزا بھگتنے کو تیار نہیں ہوں۔ میری زندگی میں اگر پھر سے کوئی لڑکی میری بیوی بن کر رہ سکتی ہے تو وہ صرف اور صرف نمی ہی ہو سکتی ہے اور کوئی نہیں۔'' یہ ایک اور بڑا انکشاف تھا ان لوگوں کے لئے۔ اتنا کچھ ہو جانے کے بعد بھی وہ ایسا کوئی ارادہ رکھتا ہوگا، ان میں سے کسی کے بھی گمان میں نہیں تھا۔

رخسانہ بیگم نے اس لمحے بے ساختہ رخ پھیر کر اپنا بھرم قائم رکھنے کی کوشش کی تھی۔

سعید صاحب کا ہاتھ پھر اٹھا تھا اور اشعر کے گال پر ایک اور نشان ڈال گیا تھا۔

''اسٹاپ اٹ! خبردار جو تمہاری گندی زبان پر اب کبھی تمکین بیٹی کا نام بھی آیا تو......''

''میں آپ کا لحاظ کر رہا ہوں پاپا! ورنہ میں اب کوئی کمزور سال دو سال کا بچہ نہیں رہا ہوں جو چپ چاپ آپ کی مار کھاتا رہوں، دوبارہ مجھ پر ہاتھ اٹھانے سے پہلے سو بار یہ سوچ لیجئے گا کہ میرا قد اب آپ سے بھی بڑا ہو گیا ہے۔ میں اپنی لائف کے معاملے میں کسی کے اصولوں کا لحاظ نہیں کروں گا۔ میں اب بھی تمکین سے پیار کرتا ہوں اور ہمیشہ کرتا رہوں گا۔ نمی خود بھی مجھ سے پیار کرتی ہے۔ میں نے اریج سے بات کر لی ہے۔ وہ جلد ہی نمی کو طلاق دے دے گا، پھر ہم دونوں کو ملنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔''

سعید صاحب کے ساتھ ساتھ گھر کے باقی افراد بھی اس کی اس درجہ پلاننگ پر حیرت سے گنگ کھڑے رہ گئے تھے۔ ابھی نجانے اسے اور کون کون سے طوفان اگلنے تھے۔

تمکین رضا نے اس وقت اپنے دل میں سخت بے چینی محسوس کی تھی۔ عین اسی لمحے اشعر نے اس کا ہاتھ تھام کر اس سے کہا تھا۔

''تم چپ کیوں کھڑی ہو نمی، بتاتی کیوں نہیں ہو کہ تم اب بھی صرف مجھ سے پیار کرتی ہو، صرف میں ہی خوشیاں دے سکتا ہوں تمہیں، پلیز بتاؤ ان لوگوں کو۔'' محبت کیسے انسان کے ہوش و حواس چھین کر اسے خود اپنے آپ سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ تمکین دیکھ سکتی تھی مگر اس وقت اس کے اپنے دل میں ایسی کوئی ہلچل نہیں مچی تھی۔ اس نے صرف ایک نظر اپنے ماں باپ کے پریشان چہروں کی طرف دیکھا تھا پھر اگلے ہی پل دل کے ہر تقاضے کو کچلتے ہوئے بظاہر مضبوط لہجے میں بولی تھی۔

''میں ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتی اشعر! یہ سچ ہے کہ میں نے اپنی خوشیاں اور خواب تم سے وابستہ کئے تھے مگر تم نے خود وہ سب خواب میری آنکھوں سے نوچ ڈالے تم نے مجھے ماں بننے سے محروم رکھا مگر شیزا کو یہی دولت خود عطا کر دی۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ میں اپنی قسمت کے لکھے پر شاکر ہوں اور اپنے والدین کی عزت کو اپنی زندگی سے بھی بڑھ کر اہمیت دیتی ہوں۔ اس لئے سوری، میں کسی بھی غلط فیصلے میں اب کبھی تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ تم بھی مجھے بھلا کر اب شیزا کا ہاتھ تھام لو کیونکہ محبت کبھی کسی انسان کی ایک چھوٹی سی بھول بھی

معاف نہیں کرتی۔''

اپنا مدعا بیان کرنے کے بعد وہ وہاں ٹھہری نہیں تھی۔ فوراً اپنے کمرے میں جا کر مقید ہوگئی تھی۔ جب کہ اشعر یوں ساکت انداز میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا تھا گویا اس پر کتنی ہی قیامتیں گزر گئی ہوں۔

☆☆☆

شہریار صاحب اپنا ہر ضروری کام چھوڑ کر دوحہ سے ایمرجنسی پاکستان واپس پہنچے تھے۔ ان کی یوں اچانک آمد پر اریشہ بے حد خوش ہوگئی تھی۔ شہریار صاحب نے اس سے نورینہ بیگم کی بابت دریافت کیا تو وہ قدرے لاپروائی سے بولی۔

''آپ کے جانے کے بعد مما زیادہ تر اپنے کمرے میں مقید رہنا پسند کرتی ہیں۔ ہم سب نے انہیں آپ کی اہمیت کا احساس دلانے کے لئے دانستہ تنہا چھوڑ دیا ہے۔ آئی تھنک پاپا، وہ آپ کی کمی کو بہت زیادہ محسوس کرنے لگی ہیں۔''

شہریار صاحب نے قدرے عدم دلچسپی سے اس کی بات سن کر ہلکا سا اس کا سر تھپتھپایا تھا۔ پھر فوراً ہی اسے اپنا خیال رکھنے کی تاکید کرتے ہوئے وہ نورینہ بیگم کے کمرے کی طرف بڑھ گئے تھے۔ دروازہ لاکڈ نہیں تھا۔ لہٰذا ہلکا سا پش کرنے کے بعد وہ اندر داخل ہوئے تو سامنے پڑی نورینہ بیگم کا حال دیکھ کر گویا زمین ان کے قدموں تلے سے کھسک گئی۔ بیڈ پر بے ترتیب پڑی وہ ہوش وحواس سے بیگانہ دکھائی دے رہی تھیں۔ تبھی وہ لپک کر ان کی طرف بڑھے تھے۔

''نور.....نور آر یو او کے۔؟''

ان کی تو گویا جان پر بن گئی تھی۔ اپنے گرم ہاتھوں میں ان کے سرد برفیلے ہاتھ دباتے ہوئے وہ حقیقی معنوں میں پریشان ہو کر رہ گئے تھے۔

دن اچھا خاصا چڑھ گیا تھا۔ جانے وہ کب سے اس حال میں بے ہوش پڑی تھیں۔ تب چلا کر اریشہ کو آواز دیتے ہوئے انہوں نے بے ہوش پڑی نورینہ بیگم کو اپنی بانہوں میں اٹھا لیا تھا۔

''کیا ہوا پاپا؟'' وہ کمرے میں داخل ہوئی تو اس کے حواس بھی معطل تھے۔

''جلدی سے گاڑی نکالو اریشہ، تمہاری مما کو نجانے کیا ہو گیا ہے؟''

اریشہ اس اچانک صورت حال پر اچھی خاصی بوکھلا کر رہ گئی تھی۔ تاہم پھر بھی وہ اگلے پانچ منٹ میں گاڑی پورچ سے نکال کر باہر روڈ پر لے آئی تھی۔

شہریار صاحب کا حال اس وقت دیکھنے کے لائق تھا۔ انہیں لگ رہا تھا جیسے وہ اس وقت اپنی کل متاع کھونے جا رہے ہوں۔ اعصاب ایک دم سے بوجھل ہوگئے تھے۔ ان کی حالت کے پیش نظر اریشہ نے ہی ڈرائیونگ کے فرائض سنبھالے تھے۔ اگلے پندرہ بیس منٹ میں ہسپتال پہنچتے ہی ڈاکٹرز نے نورینہ بیگم کو ایمرجنسی وارڈ میں ایڈمٹ کر لیا تھا۔

ڈاکٹرز کے مطابق وہ زبردست ہارٹ اٹیک کا شکار ہوئی تھیں۔ خدا کی پاک ذات کو شاید ابھی ان کی مزید زندگی مطلوب تھی۔ لہٰذا وہ زندہ

بچ گئی تھیں۔ وگرنہ جتنا شدید اٹیک تھا اس میں کسی کے بھی زندہ بچ جانے کو خدا کا معجزہ قرار دیا جا سکتا تھا۔

ہارٹ پرابلم کے ساتھ ساتھ انہیں نروس بریک ڈاؤن ہو جانے کا بھی شدید خطرہ تھا۔ تاہم اب وہ پرسکون تھیں اور نشہ آور دوائیوں کے زیر اثر سو رہی تھیں۔

شہریار صاحب کے دل کی دھڑکنیں ابھی تک اعتدال پر نہیں آئی تھیں۔ نورینہ بیگم کے ساتھ اپنے دل کے تعلق کو وہ کبھی خود بھی سمجھ نہیں پائے تھے۔ انہیں یہ سوچ کر ہی کچھ ہو رہا تھا کہ اگر نورینہ بیگم کے ساتھ کچھ ہو جاتا تو وہ کیا کرتے؟ کیسے زندہ رہتے؟ وہ تو اس وقت بھی ان سے لاپروائی نہیں برت پائے تھے جب وہ ان کا مان، ان کی محبت عیش و عشرت سب کو ٹھوکر مار کر ان کی زندگی سے نکل آئی تھیں۔ نہ صرف خود نکل آئی تھیں بلکہ آتے ہوئے نہایت سنگدلی کے ساتھ یہ دھمکی بھی دے دی تھی کہ اگر انہوں نے ان سے بے مقصد رابطہ کر کے انہیں کمزور کرنے کی کوشش کی تو وہ اپنی جان سے کھیل جائیں گی۔ گزرے ہوئے پچیس سال بھلانا، بہت تکلیف دہ تھا ان کے لئے مگر پھر بھی وہ سب کچھ بھلا کر صرف اور صرف یہی بات یاد رکھے ہوئے تھے کہ وہ نورینہ بیگم کو چاہتے ہیں۔ زندگی جہاں سے اپنا راستہ بدل گئی تھی وہ اسے پھر سے اسی راستے پر لانا چاہتے تھے مگر نورینہ بیگم ہر موڑ پر ان کے حوصلے توڑ کر انہیں کمزور کر رہی تھیں۔

مسلسل آٹھ گھنٹے بے ہوش رہنے کے بعد انہوں نے آنکھیں کھولیں تو سب سے پہلی نظر ہی شہریار صاحب کے ستے ہوئے چہرے پر پڑی تھی۔ تب پھر سے پلکیں موندتے ہوئے وہ بے ساختہ رو پڑیں۔

☆☆☆

انجشاء شیزا کو سامنے دیکھ کر بمشکل مسکرائی تھی۔

''وعلیکم السلام، آؤ شیزا آج میرے گھر کا راستہ کیسے بھول پڑیں تم......؟'' صحن میں ہی بچھی چارپائی پر ٹکتے ہوئے اس نے شیزا سے پوچھا تھا۔ جب وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''کچھ خاص نہیں، تمہاری یاد ستا رہی تھی تو ملنے چلی آئی۔''

''چلو اچھا کیا، میں خود بھی اس وقت کسی اچھی سی دوست کی کمپنی کو شدت سے محسوس کر رہی تھی۔''

شیزا اس کے الفاظ پر محض خوش دلی سے مسکرا کر رہ گئی تھی۔

''کیا پیو گی گرم یا ٹھنڈا؟''

''فی الحال کچھ نہیں، تم یہ بتاؤ سیال آنٹی کہاں ہیں۔ دکھائی نہیں دے رہیں۔''

''وہ انکل کو لے کر یہاں قریب ہی ڈاکٹر کے پاس گئی ہیں۔ کچھ چیک اپ کروانا تھا ان کا۔''

''آئی سی۔'' مختصر کہنے کے بعد اس نے طویل سانس بھر کر خود کو فریش کیا۔ پھر انجشاء کے قدرے پریشان چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''یہ نورالعین کون ہے انجو؟ تم نے آفس میں اپنی سیٹ اس کے حوالے کیوں کر دی؟''

انجشاء کے لئے اس کا سوال تکلیف دہ تھا۔ تاہم پھر بھی وہ اپنا بھرم قائم رکھتے ہوئے بولی تھی۔

''عدنان کی بہت اچھی دوست ہے وہ، اسی کی فرمائش پر ہماری ہیلپ کرنے آئی ہے۔ کیونکہ میں اکیلی گھر اور آفس کی ذمہ داریاں نہیں سنبھال سکتی۔''

''ہاں یہ تو ہے لیکن آفس کی وہ کرسی تو صرف تمہارے لئے موزوں ہے انجو، وہاں تمہاری جگہ پر اور کوئی نہیں جچتا، یقین مانو، آج سارا دن لڑکی کو تمہاری سیٹ پر بیٹھے دیکھ کر دل خراب ہوتا رہا ہے میرا۔ عدنان کو تمہارے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

چھوڑو یار، تم ان مسئلوں کو اپنے لئے ٹینشن مت بناؤ اور یہ بتاؤ کہ تمہاری اسٹوری کا کیا ہوا۔ اشعر اپنی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار ہے یا نہیں۔''

انجشاء چونکہ آج کل بہت حساس ہو گئی تھی۔ تبھی فوراً موضوع بدلتے ہوئے بولی تو شیزا کے لبوں سے پھر ایک طویل سرد آہ خارج ہو گئی۔

''پتہ نہیں انجو، میری مما سے بات ہوئی تھی میں نے ان سے اپنے گناہ کی معافی مانگ لی ہے اور انہوں نے نہ صرف مجھے معاف کر دیا ہے۔ بلکہ پھر سے اپنی محبتوں کے دروازے میرے لئے کھول دیئے ہیں۔ سچ انجو، ہم لڑکیاں بڑی نادان ہوتی ہیں۔ ہمیشہ دل کے کہے پر چل کر اپنا نقصان کرتی ہیں کبھی دماغ سے کام ہی نہیں لیتیں۔ حالانکہ اگر ہم دماغ سے کام لے کر اپنے والدین کی عزت کا سوچیں تو میرا نہیں خیال کہ زندگی میں کبھی بھی ہم اوندھے منہ گر پائیں، پتہ نہیں جذباتیت میں کیا ہو جاتا ہے ہمیں؟''

وہ اپنے اعمال پر اس لمحے قدرے پشیمان دکھائی دے رہی تھی۔ تبھی انجشاء نے اس سے کہا تھا۔

''اب پچھتانے سے کیا فائدہ شیزا؟ وقت جو غلطیاں ہم سے کروا چکا ہے۔ اب کسی طور سے ان کا ازالہ نہیں ہونے والا، لہٰذا بہتر ہے کہ ہم آئندہ ایسی غلطیوں سے بچیں، جو ہمیں خود ہمارے ہی نقصان کی طرف لے کر جائیں۔''

''بالکل صحیح، میں پچھلے کئی دنوں سے سوچ رہی ہوں کہ تمکین اور اشعر سے معافی مانگ لوں کیونکہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے دور کرنے کی کوشش میں، میں خود سب سے دور ہو کر رہ گئی ہوں انجو، کسی پل کسی گھڑی کہیں بھی سکون میسر نہیں رہا ہے میرے لئے۔ جانے کیوں اب یہ احساس شدت سے ستانے لگا ہے کہ میں نے کچھ بھی اچھا نہیں کیا۔''

اس لمحے اس کا سر جھکا ہوا تھا اور انجشاء اس کی آنکھوں میں تیرتی ہوئی نمی کو دیکھ رہی تھی۔

''میں نے اپنی دوست کے حق پر ڈاکہ ڈالا ہے انجو، اندھی محبت کے خمار میں خود بھی اندھی ہو کر وہ گھٹیا فعل سرانجام دیئے ہیں جن کے لئے شاید میرا خدا بھی کبھی مجھے معاف نہ کرے، سوچتی ہوں اگر اسی حال میں مجھے موت آ گئی تو میرا کیا بنے گا؟ بے شک اللہ چاہے تو اپنے حقوق کی خلاف ورزی معاف کر سکتا ہے مگر اپنے بندوں کی بلاوجہ بے قصور دل آزاری، ان کے حقوق، تو وہ بھی معاف نہیں کرے گا۔ یہی سوچ روز بروز مجھے کمزور کر رہی ہے انجو، میری پرسکون نیند تباہ کر رہی ہے۔''

آج نجانے وہ کس رو میں بہہ کر خود ہی اپنا محاسبہ کرنے کو تیار ہوگئی تھی۔اس وقت قطعی غائب دماغی کا شکار ہو کر جو انکشافات وہ کر رہی تھی۔وہ انجشاء کے لئے بہت حیران کن تھے۔تبھی اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں مگر شیزا اس کے چہرے پر پھیلی حیرانی سے بے نیاز،اپنی ہی رو میں مست کہہ رہی تھی۔

''زندگی مکافات عمل سے خالی نہیں ہے انجو، میں نہیں چاہتی کہ جو گناہ میں نے کیے ہیں ان کی سزا میرے بچے کو ملے۔اسی لئے میں نے یہ طے کرلیا ہے کہ فرداً فرداً، حسن ولاج کے تمام مکینوں سے معافی مانگ کر میں اس ملک سے ہی دور چلی جاؤں تاکہ میرے بداعمال کی سزا کا اثر میرے بچے پر نہ پڑ سکے۔تم بتاؤ انجو کیا مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔''

اب اس کے آنسو پھسل کر گالوں پر لڑھک آئے تھے۔انجشاء نے آج سے پہلے اسے اتنا شکستہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔وہ تو زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینے والی لڑکی تھی مگر اب مخالف حالات کے طوفان کی نذر ہو کر ایک تنکے سے بھی ہلکی ہوگئی تھی۔

''بے شک تمہیں ایسا ہی کرنا چاہیے تھا شیزا، کیونکہ دنیا میں انسان کے لئے محبت سے بڑھ کر انمول دولت اور کوئی نہیں ہوتی، ہم چاروں دوستوں کا یہ دعویٰ تھا کہ ہم کبھی محبت کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکیں گے۔کبھی زندگی کے مخالف حالات سے شکست تسلیم نہیں کریں گے مگر دیکھو شیزا، حالات کی مخالف آندھی نے ہم چاروں کو ہی توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے۔محبت، جس سے ہم دامن بچا کر جینا چاہتے تھے یہی محبت ہمارے اندر پڑاؤ ڈال کر ہمیں کھوکھلا کر چکی ہے۔''

شیزا کے ساتھ ساتھ خود اس کا اپنا لہجہ بھی بھیگ گیا تھا۔تاہم ایک لمبے عرصے کے بعد کچھ سوچ کر وہ دونوں ہی اپنے آپ کو قدرے پرسکون محسوس کر رہی تھیں۔

☆☆☆

اریشہ اس وقت گم صم سی بیٹھی، اوپر نیلے آسمان پر اڑتے ہوئے پرندوں کو دیکھ رہی تھی۔ جب ازمیر دبے پاؤں چپکے سے آ کر اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔

''السلام علیکم!''

اریشہ قطعی غیر متوقع طور پر اس کی آواز سن کر اپنی جگہ سے اچھل پڑی تھی۔ کتنی عجیب بات تھی کہ ابھی وہ شدت سے اسے ہی یاد کر رہی تھی اور وہ آ موجود ہوا تھا۔

''وعلیکم السلام، تم یہاں......؟''

''بالکل...... کیوں میں یہاں نہیں آ سکتا کیا؟''

''یہاں'' پر اسپیشلی زور دیتے ہوئے وہ دھیمے سے مسکرایا تھا۔ جب اریشہ پر شوق نگاہوں سے اس کے اسٹائلش سراپے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا ازمیر۔''

''تو تمہارے کہنے کا کیا مطلب تھا سویٹ اریشہ۔''

اریشہ کے لئے اس کا یہ شوخ موڈ یقیناً حیرانگی کا باعث بنا تھا۔ تاہم وہ خاموش رہی تھی۔

''اب چپ کیوں ہو گئیں؟ اصل میں آج صبح ہی شہریار انکل سے میری بات ہوئی تھی۔ انہوں نے آنٹی کے بارے میں بتایا تو میں رک نہیں پایا۔ ابھی ہسپتال میں ان سے مل کر ہی آ رہا ہوں۔ تم سناؤ کیسی ہو؟ اتنے دن مجھے مس کیا کہ نہیں۔''

''نہیں۔'' اس کی لمبی چوڑی وضاحت کے جواب میں بڑے آرام سے اس نے کہا تھا۔ جواب میں ازمیر احتجاجاً مچل اٹھا۔

''کیا؟ تمہیں معلوم ہے کہ تم کیا کہہ رہی ہو؟''

''بالکل معلوم ہے لیکن اس میں غلط کیا ہے، تم وہاں مصروف رہ کر میری کمی محسوس نہیں کرو گے تو میں یہاں رہ کر تمہاری کمی کیوں محسوس کروں گی۔''

اس کے چہرے پر برہمی کے آثار اس لمحے ازمیر کو خاصا لطف دے گئے تھے۔ تبھی وہ پھر سے مسکرایا تھا۔

''تم، یہ کیسے فرض کر سکتی ہو کہ میں نے تمہیں وہاں یاد نہیں کیا ہوگا؟''

''پتہ ہے مجھے اتنی خوبصورت منگیتر کی سنگت میں، بھلا میں تمہیں کیسے یاد آ سکتی ہوں۔'' وہ اپنی کال کا ڈس کنکٹ کیا جانا ابھی تک نہیں بھولی تھی۔ ازمیر کو ایک مرتبہ پھر اس کے الفاظ لطف دے گئے تھے۔

''او کچھ جلنے کی بو آ رہی ہے۔''

''جلتی ہے میری جوتی، مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے کسی سے جیلس ہونے کی۔'' حقیقی معنوں میں اسکا خون اس لمحے خشک ہو کر رہ گیا تھا۔

ازمیر نے اس کے چہرے پر خفگی کے اتنے خوبصورت رنگ بھلا پہلے کہاں دیکھے تھے تبھی کھلکھلاتے ہوئے وہ اس کے مقابل آ گیا تھا۔

''قسم اٹھاؤ۔''

''کس بات کے لئے؟''

ازمیر کی سنگت میں پہلی بار اس کی دھڑکنیں انتشار کا شکار ہوئی تھیں۔ خوبصورت لمبی پلکیں، لرزتے ہوئے بالآخر جھک گئی تھیں۔ تبھی وہ اس کے مزید قریب ہو کر گمبھیر لہجے میں بولا تھا۔

''اس بات کے لئے کہ تم نے مجھے مس نہیں کیا۔

''مجھے کیا ضرورت ہے تمہیں مس کرنے کی، اتنی فارغ نہیں رہتی میں۔''

اریشہ کو اس لمحے اس پر غصہ کیوں آ رہا تھا۔ وہ خود بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔

''تمہیں برا لگا ناں اریشہ کہ میں نے سائلہ کے ساتھ بزی ہوتے ہوئے تمہاری کال ڈس کنکٹ کیوں کر دی۔'' وہ فوراً اسکی ناراضگی کا بھید پا گیا تھا۔

اریشہ نے اس لمحے چپ چاپ محض رخ پھیرنے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

''اریشہ! اتنی سی بات کو دل پر لے لیا تم نے؟'' اب وہ حقیقی معنوں میں پریشان ہوا تھا۔ تاہم اریشہ کا لہجہ کافی سرد تھا۔

''تمہارے لئے یہ اتنی سی بات ہوگی۔ میرے لئے نہیں۔''

''میں سمجھ سکتا ہوں مگر اس وقت ہم دونوں بہت سیریس میٹر پر ڈسکس کر رہے تھے اسی لئے۔''

''اٹس او کے۔'' فوراً اس کی بات کاٹتے ہوئے اس نے خود کو جیسے جلنے سے بچایا تھا۔

''تمہیں کیا ہو جاتا ہے اریشہ، کبھی کبھی تم بالکل بیگانوں کا سا بی ہیو کرنے لگتی ہو۔'' اب کے وہ ہرٹ ہوا تھا تاہم اریشہ خاموش ہی رہی تھی۔ ''اتنی دور سے آیا ہوں چائے پانی کا بھی نہیں پوچھو گی اور یہ باقی لوگ کہاں ہیں، دکھائی نہیں دے رہے۔''

''دکھائی کیسے دے سکتے ہیں، شہرین سمیت سب لوگ فرحان بھائی کے ساتھ شمالی علاقہ جات کی طرف گئے ہیں۔ آج کل میں واپسی ہو جائے گی ان کی، چلو اندر تمہیں چائے پلواتی ہوں۔'' وہ سرعت سے افسردہ لہجے میں کہنے کے بعد اٹھ ہی رہی تھی کہ اچانک یاد آ جانے پر فوراً بیٹھ گئی۔

''پلیز اندر سے میری بیساکھیاں لا دو ازمیر۔''

''او کے لیکن بیساکھیوں کے بغیر تم باہر کیسے آئیں۔'' وہ قدرے الجھا تھا جب وہ بوکھلا کر فوراً بہانہ بناتے ہوئے بولی۔

''بیساکھیوں کے سہارے ہی آئی تھی ابھی کچھ دیر پہلے ملازمہ نے لان کی صفائی کرتے ہوئے اٹھا کر اندر رکھ دیں پلیز لا دو۔'' اپنا یہ ڈھونگ اب اسے خود ہی بور کرنے لگا تھا۔ جس منزل تک پہنچنے کے لئے اس نے یہ روپ اپنایا تھا۔ وہ منزل تو اس کی تھی ہی نہیں پھر بیکار کی اس مشقت سے کیا فائدہ، ازمیر اس کی بیساکھیاں لینے اندر لاؤنج کی طرف بڑھا تو اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب جلد وہ اپنی اس اداکاری کا پول خود ہی سب پر کھول کر رکھ دے گی۔

☆☆☆

جب اچانک اس کا سیل مخصوص دھن کے ساتھ بج اٹھا۔ شب آدھی سے زیادہ ڈھل گئی تھی مگر وہ جاگ رہا تھا۔ تبھی پاکٹ سے سیل نکال کر سرسری سی نظر اسکرین پر تمکین کے جگمگاتے نام پر ڈالتے ہوئے اس نے فوراً کال پک کر لی۔ پچھلے بیس دنوں میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ تمکین نے خود اسے کال کی تھی وگرنہ اب تک یہ فرائض وہ خود ہی سرانجام دیتا آیا تھا۔

''ہیلو۔''

''السلام علیکم!'' اس کی ہیلو کے جواب میں تمکین کا السلام علیکم اسے قدرے شرمندہ کر گیا تھا۔

وہ ہر کال پر یہ ارادہ کرتا تھا کہ وہ ہیلو کی بجائے السلام علیکم کا استعمال کرے گا لیکن ہر کال پر یہ بات اس کے ذہن سے نکل جاتی تھی۔

''وعلیکم السلام، کیسی ہیں آپ؟''

''میں ٹھیک ہوں آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں۔'' اس کی آواز بہت مدھم آ رہی تھی۔ تاہم ارتج نے اس کے سوال پر سرد آہ بھرتے ہوئے کہا تھا۔

''ہاں یار، دیارِ غیر میں سکون سے نیند کہاں آتی ہے بھلا۔''

تمکین اس کے جواب پر خاموش ہی رہی تھی۔

''کیا کر رہی تھیں آپ؟ اور آج میری یاد کیسے آ گئی آپ کو؟'' وہ واقعی حیران ہو رہا تھا تبھی وہ نم سے مدہم لہجے میں اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے بولی تھی۔

''آپ واپس کب آ رہے ہیں ارتج۔''

وہ تو ابھی اس کا خود سے کال کرنا ہی ہضم نہیں کر پایا کہ اس پر یہ سوال بھی۔ دل پاگل اس لمحے بے ساختہ دھڑکا تھا۔

''جلد ہی، کیوں خیریت تو ہے، مما تو ٹھیک ہیں ناں۔''

''سب ٹھیک ہیں بس آپ جلدی سے واپس پاکستان آ جائیے، مجھے بہت سی باتیں کرنی ہیں آپ کے ساتھ۔''

آج غالباً وہ اسے شاک پر شاک لگا کر مارنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ ارتج اس لمحے قطعی بے ساختگی کے ساتھ اپنی جگہ سے کھڑا ہوا تھا۔

''اوکے میں کل کی فلائٹ سے ہی واپس پاکستان آ رہا ہوں۔ ڈونٹ وری۔''

''تھینک یو۔'' اس کے بے تاب لہجے کے جواب میں تمکین نے دھیرے سے کہہ کر لائن ڈس کنکٹ کر دی تھی۔

ارتج اس روز پوری رات جاگتا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ تمکین اس سے کون سی باتیں کرنا چاہتی تھی۔ یقیناً وہ اس سے ڈائیورس کے موضوع پر ہی بات کرنا چاہ رہی تھی مگر وہ خود میں اس اقدام کا حوصلہ نہیں پا رہا تھا۔ بیس پچیس روز گزر جانے کے باوجود وہ خود کو سمجھا نہیں پایا تھا کہ تمکین اس کی نہیں ہے۔ اسے وہ محض کسی کی ضد پر استعمال کے لئے ملی ہے۔ وہ اسے پیار نہیں کر سکتی۔ رات کو دیر تک جاگ کر اس کا انتظار بھی نہیں کر سکتی۔ وہ اس سے اپنے من پسند کھانے پکوانے کا حق نہیں رکھتا۔ نہ ہی اس سے دل کی باتیں شیئر کرنے کا کوئی اختیار تھا اس کے پاس۔ وہ اس کے لئے جسٹ خوشبو

تھی۔ جسے محسوس کیا جاسکتا تھا مگر اپنے حصار میں قید نہیں کیا جاسکتا تھا۔

اس رات اپنی بدنصیبی پر مکمل جاگ کر آنکھوں میں کاٹتے ہوئے اس نے حقیقت سے فرار چاہا تھا۔ کبھی تلخ حقیقتیں دامن نہیں چھوڑا کرتیں۔ سو لاکھ دل کے نہ چاہتے ہوئے بھی اگلے روز شام ڈھلنے کے بعد وہ حسن ولاج میں سب لوگوں کے بیچ موجود تھا۔

ایک بات جو اس نے محسوس کی تھی وہ حسن ولاج کے مکینوں کی خاموشی تھی۔ سب لوگ بظاہر پہلے کی طرح ہی محبت سے اسے مل رہے تھے مگر اس کے باوجود کہیں کچھ تھا جو اسے محسوس ہو رہا تھا۔ تمکین پہلے سے کافی کمزور دکھائی دے رہی تھی۔ جب کہ رخسانہ بیگم کی آنکھوں کی نمی بھی اس سے پوشیدہ نہ رہ سکی تھی۔

رات کو بہت دیر سے اسے اپنے کمرے میں آنا نصیب ہوا تھا۔ تمکین اس سے بات کرنے کے لئے ابھی تک جاگ رہی تھی۔ اریج کے دل میں اس وقت عجیب بے سکونی سی پھیلی ہوئی تھی۔ تبھی دروازہ لاک کرنے کے بعد وہ بیڈ پر آ کر بیٹھا۔

''آپ سنائیں حسن ولاج میں کیا چل رہا ہے آج کل۔؟''

''کچھ نہیں چل رہا، آپ کے اور اشعر کے بیچ میرے معاملے میں جو ڈیل ہوئی تھی اسی کو لے کر سب لوگ پریشان ہیں۔''

تمکین کے لبوں سے نکلنے والے یہ الفاظ اریج کے لئے اس وقت کسی اچنبھے سے کم نہیں تھے۔ ازحد شاکڈ انداز میں وہ بیڈ سے کھڑا ہوا تھا۔ تمکین بھی اس حقیقت سے اس قدر باخبر ہوگی اسے گمان نہیں تھا۔

''کیا بکواس کر رہی ہو تم؟''

''یہ بکواس نہیں، حقیقت ہے۔ کیا اشعر نے آپ سے یہ ڈیل نہیں کی تھی کہ وہ مجھے دوبارہ اپنی زندگی کا حصہ بنانے کے لئے صرف چند روز کے لئے آپ کے عقد میں دے گا اور بعد میں جب آپ اس کے کہنے پر مجھے ڈائیورس دے دیں گے تو پھر سے مجھے اپنی زندگی کا حصہ بنا لے گا۔''

کئی دنوں کا غبار جمع تھا اس کے اندر جو اس وقت نکل رہا تھا۔ اریج کے چہرے کی رنگت اس لمحے دیکھنے لائق تھی۔

''میں کسی بھی بات سے بے خبر نہیں ہوں اریج میں چاہتی تو شادی سے پہلے ہی یہ فساد کھڑا کر سکتی تھی مگر آپ کی طرح میں بھی بڑی ماں کی وجہ سے مجبور ہوگئی تھی۔ قفل ڈال لئے تھے میں نے اپنے لبوں پر، وگرنہ تمکین رضا اتنی حقیر اتنی سستی ہو کر کبھی نہ بکتی، بہر حال میں آپ سے کوئی گلہ نہیں کرنا چاہتی۔ آپ کا اور میرا تعلق ایسی بنیاد پر قائم ہی نہیں ہوا کہ میں آپ سے کوئی شکایت کر سکوں۔ میں تو اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ اب جب کہ یہ بات سب کے کانوں میں پڑ چکی ہے تو آپ بھی اس بے نام سے رشتے کو مزید مت گھسیٹیں، مجھے ابھی اور اسی وقت آپ سے ڈائیورس چاہیے۔''

کیسا پہاڑ سا مضبوط لہجہ تھا اس کا، اریج احمر پر ساتوں آسمان جیسے ایک ساتھ گرے تھے۔ اسے کبھی ایسی صورت حال اس انداز میں بھی پیش آسکتی ہے آج سے پہلے وہ کبھی سوچ بھی نہیں پایا تھا۔

☆☆☆

''نور اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟''

نورینہ بیگم کو آنکھیں کھولتے دیکھ کر شہریار صاحب فوراً لپک کر ان کے قریب آئے تھے مگر انہوں نے چہرے کا رخ پھیر لیا تھا۔

''ٹھیک ہوں مجھے کیا ہونا ہے؟''

''نور! کب یہ بچپنا چھوڑو گی تم؟ تمہیں معلوم ہے اگر میں بروقت نہ پہنچتا تو تمہارے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔''

وہ واقعی از حد پریشان دکھائی دے رہے تھے مگر نورینہ بیگم کو اس وقت بھی ان پر ترس نہیں آرہا تھا۔ تبھی وہ غصے سے بولی تھیں۔

''تو کیا ہوتا' کوئی پہاڑ تو نہیں گر جاتا ناں، آپ کے لئے تو اچھا ہی ہوتا، مفت کی خواری سے جان چھوٹ جاتی۔'' ان کے منہ میں جو آتا تھا وہ شہریار صاحب سے کہہ دیتی تھیں۔ تاہم ان کے علاوہ اور کسی کی جرأت نہیں تھی کہ وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ بھی سکے۔ نورینہ بیگم کی بات پر اس لمحے انہوں نے کڑے ضبط سے کام لیا تھا۔

''کیوں الٹا سیدھا سوچتی رہتی ہو نور، مجھ پر نہیں تو کم از کم خود پر ہی ترس کھا لیا کرو، دیکھو پچھلے کچھ ہی دنوں میں صحت کتنی ڈاؤن ہوگئی ہے تمہاری۔'' وہ اب بھی ان کے لئے متفکر تھے۔

اگلے تین چار روز میں انہیں ہسپتال سے گھر شفٹ کر دیا گیا تھا۔ ان دنوں میں شہریار صاحب نے اپنی تمام اندرونی و بیرونی مصروفیات ترک کر ڈالی تھیں۔ ایسا وہم پڑا تھا ان کے دل میں کہ وہ ایک پل کے لئے بھی نورینہ بیگم کے پاس سے ہٹنا گوارہ نہیں کر رہے تھے۔ گو اب ڈاکٹر فرحان کے ساتھ دیگر لوگ بھی گھر واپس آچکے تھے۔ اریشہ بھی مکمل ذمہ داری کے ساتھ اپنے فرائض سرانجام دے رہی تھی۔ ازمیر بھی فی الحال یہیں رکا ہوا تھا۔ شاہ ولاج سے دیگر لوگ بھی آکر ان کی خیریت دریافت کر گئے تھے مگر پھر بھی وہ خود اسپیشلی ان کا خیال رکھ رہے تھے اور نورینہ بیگم یہ سب دل سے محسوس کر رہی تھیں۔

گزرتے ہر دن کے ساتھ ان کے دل پر پڑی گرد صاف ہوتی جا رہی تھی اور وہ پشیمانیوں کی نذر ہو رہی تھیں۔ اس روز رات میں شہریار صاحب انہیں خود اپنے ہاتھوں سے دوا کھلانے کے بعد اپنی جگہ پر آئے تو انہوں نے بے ساختہ ان کا ہاتھ تھام لیا۔

''شہری آئی ایم سو سوری۔'' آنسوؤں سے لبالب آنکھیں بھرے وہ ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھیں اور شہریار صاحب عجیب شاکڈ انداز میں ان کی طرف دیکھتے ہوئے جیسے ان لمحوں کی حقیقت پر بے یقین ہو رہے تھے۔

''سوری فار وہاٹ۔'' انہوں نے الجھے ہوئے پوچھا تھا۔ جب وہ اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے بولیں۔

''میں نے زندگی بھر آپ کو سوائے درد اور آزمائشوں کے اور کچھ بھی نہیں دیا۔ ہمیشہ آپ کو اپنی جاگیر سمجھتے ہوئے آپ کے ایک ایک عمل پر شک کیا۔ میں بہت بری ہوں شہری۔''

ایک مدت کے بعد ان کے لہجے میں اپنائیت آئی تھی، اور انہوں نے انہیں شہری کہہ کر پکارا تھا۔ وہ بہت مضبوط تھے۔ کبھی کسی مقام پر اپنے حوصلے نہیں کھوئے تھے مگر اس لمحے پتھر کو موم ہوتے دیکھ کر ان کی آنکھیں بھی نم ہو گئی تھیں۔

وقت پیچھے پلٹ گیا تھا۔ انہیں محسوس ہو رہا تھا جیسے بہار نے پھر سے ان کی ویران زندگی کے دروازے پر دستک دے ڈالی ہو۔ عجیب خواب سے انداز میں انہوں نے ہاتھ بڑھا کر نورینہ بیگم کو خود میں سمیٹا تھا۔

''آئی ایم سوری شہری، میں نے کبھی آپ کے پیار کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اپنی ہی سوچ کی آگ میں خود بھی جلتی رہی اور آپ کو بھی جلاتی رہی۔ بہت روئی ہوں میں آپ کے لئے۔'' ایک کے بعد ایک اعتراف کرتے ہوئے وہ رو رہی تھیں اور شہریار صاحب کا دل جیسے پسلیاں توڑ کر باہر آ رہا تھا۔

زندگی اس لمحے ان کی بانہوں میں تھی۔

نورینہ بیگم کی پر شور دھڑکنیں، ان کے اندر بے قراری کی داستان رقم کر رہی تھیں۔ جب کہ وہ انہیں یوں خود میں سموئے ہوئے تھے گویا ایک مدت کے بعد ان کا سب سے قیمتی سرمایہ دوبارہ ان کی تحویل میں آ گیا ہو۔

''بس کرو نور! اب مزید ان قیمتی موتیوں کا زیاں برداشت نہیں کروں گا میں۔'' خود اپنے دل کے تقاضوں سے بے حال وہ اپنے ہاتھوں سے ان کے آنسو پونچھتے ہوئے بولے تو نورینہ بیگم نے جیسے تھک کر انہی کے مضبوط شانے پر سر ٹکا دیا۔

''کیوں کیا ایسا شہری..... جب آپ کو صرف مجھ سے محبت تھی صرف میں کل کائنات تھی آپ کے لئے تو پھر وہ..... وہ دوسری عورت کیوں آئی آپ کی زندگی میں۔'' شدت غم سے ان کا گلا رندھ گیا تھا۔ شہریار صاحب نے اس لمحے سخت دل گرفتگی محسوس کرتے ہوئے ایک نظر ان کی پرنم متورم آنکھوں پر ڈالی۔ پھر نہایت پیار سے ان کے بالوں کو سہلاتے ہوئے مدھم لہجے میں بولے تھے۔

''میں مجبور تھا نور..... خدا گواہ ہے کہ میرے دل اور زندگی میں جو مقام تمہارا ہے کوئی دوسری عورت کبھی اس مقام کے آدھ تک بھی نہیں پہنچ سکی۔ تمہیں کھو دینا، موت کے مترادف تھا میرے لئے اسی لئے میں نے کبھی تمہیں نہیں بتایا کہ میں کن کن آزمائشوں سے گزر کر تم سے اپنے تعلق کو مضبوط رکھنے کے لئے جدوجہد کر رہا ہوں۔'' ان کی پلکوں میں بھی نمی تھی تاہم نورینہ بیگم کا دل اس لمحے جیسے قرار پا گیا تھا۔ ایک مدت کے بعد شہریار صاحب کی پناہوں میں آ کر وہ گہرا سکون محسوس کر رہی تھیں جب کہ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں ان سے کہہ رہے تھے۔

''نور! ان دنوں میں ابھی یونیورسٹی سے فارغ بھی نہیں ہوا تھا۔ جب اچانک ایک روز ماں جی اور بابا نے مجھے دادا جی کی حویلی میں طلب کر لیا۔ میں ان کے یوں اچانک حکم پر بوکھلا کر گاؤں پہنچا تو قطعی غیر متوقع صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ دادا جی کی طبیعت بہت خراب تھی۔ ڈاکٹرز زیادہ دن تک ان کی زندگی کے بارے میں پر امید نہیں تھے۔ لہٰذا مرنے سے پہلے ان کی یہ خواہش تھی کہ وہ میرے مرحوم چچا کی اکلوتی بیٹی بسمہ کو میری زندگی کا حصہ بنا دیں۔ میں چونکہ تم سے انگیج تھا۔ لہٰذا میں نے اس فیصلے کو ماننے سے انکار کر دیا جس سے گھر میں انتشار برپا ہوا اور میرے تعلقات گھر والوں سے کشیدہ ہو گئے۔ امی جی کے دل پر اس بات کا گہرا اثر ہوا تھا۔ منتیں کی تھیں انہوں نے میری مگر میں تمہیں کھو دینے کے خوف سے ہر بار ان کی منت کو بھی رد کرتا رہا اور بالآخر میری اس ہٹ دھرمی نے ہارٹ اٹیک کی صورت میں میرے ابو جی کی جان لے لی۔ میرے لئے یہ بہت بڑا دھچکا تھا۔ اسی لئے پورے ایک ماہ تک یونیورسٹی سے بھی غیر حاضر رہا تھا۔ بعد ازاں دادا جی کی کمزور حالت اور اپنی امی جی کے آنسوؤں سے ہار مان کر میں نے

بسمہ کو اپنی زندگی میں شامل کر لیا مگر......اسے کبھی بھی کوئی خوشی نہیں دے سکا۔ میری زندگی میں اس کی حیثیت ایک ملازمہ سے زیادہ نہیں رہی تھی۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ تمہیں کبھی اپنی زندگی کی اس حقیقت سے باخبر کر کے ہرٹ نہیں ہونے دوں گا۔ لہٰذا خود کو گاؤں میں ایڈجسٹ کرنے کی بجائے میں شہر میں سیٹل ہو گیا اور اپنے گھر والوں کو تمام حقیقت سے باخبر کئے بغیر تم سے شادی کر لی۔ بسمہ جانتی تھی کہ میں تم سے پیار کرتا ہوں اور تمہارے بغیر نہیں جی سکتا۔ لہٰذا اس خدا کی بندی نے اپنے ہونٹ ہی سی لئے۔ میرے کسی معاملے میں کبھی دخل اندازی کرنے کی کوشش نہیں کی اس نے۔ ابھی میری تم سے شادی کو ایک ماہ بھی نہیں ہوا تھا کہ فرحان اس دنیا میں چلا آیا۔ میں باپ تھا اس کا لہٰذا اس کی پیدائش پر خوشی منانا میرا حق تھا مگر میں اس کی پیدائش پر بھی خوش نہیں ہوا۔ پورے چھ ماہ تک تو میں نے اسے نظر بھر کر دیکھا بھی نہیں کہ وہ کیا ہے؟ اور کس پر گیا ہے؟ بسمہ یہ دکھ بھی چپ چاپ اپنے دل پر جھیلتی رہی تھی۔ ماں جی بھی میری حرکتوں کی وجہ سے بہت دکھی رہنے لگی تھیں مگر میں تمہاری رفاقت میں یوں مدہوش ہو گیا تھا کہ مجھے کسی بات کی کوئی پروا نہیں رہی تھی۔ انہی دنوں اریشہ کی پیدائش ہوئی اور ادھر گاؤں میں دادا جی وفات پا گئے۔ میں نے اس بات کو بھی تم سے پوشیدہ رکھا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم کسی بھی صورت میرے اصل سے باخبر ہو کر مجھ سے دور جاؤ کبھی کبھی اپنی اس سوچ اور کیفیت پر میں خود بھی جھنجھلا جاتا تھا۔ صرف تمہیں اپنے قریب رکھنے کے لئے میں نے باقی تمام رشتوں سے منہ موڑ رکھا تھا۔ مجھے اپنی ماں اور بیوی کے ساتھ ساتھ زمانے کی بھی پرواہ نہیں رہی تھی۔ میں اب بھی تمہارے ساتھ تھا اور ادھر گاؤں میں امی اور بسمہ کو ملازمین کے سپرد کر رکھا تھا۔ اریشہ کے بعد دانیہ اور عدیلہ کی پیدائش ہوئی تو میں نے یہ فیصلہ کیا کہ امی اور بسمہ کو بھی شہر ہی لے آؤں کیونکہ میرے بغیر محض ملازموں کے رحم و کرم پر گاؤں میں رہنا اب بہت کٹھن ہو گیا تھا ان کے لئے مگر تقدیر نے مجھے اس کا موقع ہی نہیں دیا اور امی مجھ سے ناراض ہی دنیا سے چلی گئیں۔ یہ سانحہ بہت بڑا تھا میرے لئے ایک طرح سے میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ شاید اسی لئے ان کی رحلت کے بعد دکھ سے بے حال بسمہ کو اپنے ساتھ شہر لے آیا کیونکہ اب اس کا اکیلا گاؤں میں رہنا مناسب نہیں تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ جتنا پیار میں تم سے کرتا ہوں تم بھی مجھ سے اتنا ہی پیار کرتی ہو اگر میں تم سے دور ہو کر نہیں جی سکتا تو تم بھی میرے بغیر نہیں رہ سکو گی اور میری مجبوری سے باخبر ہونے کے بعد کھلے دل سے اس بدنصیب عورت کو قبول کر لو گی۔ جس کا کہیں کوئی مقام طے نہیں ہو سکا تھا مگر تم نے ایسا نہیں کیا، تم نے میری کوئی بات سنے بغیر مجھ سے اپنے راستے علیحدہ کر لئے اور مجھ پر یہ ثابت کر دیا کہ تم میرے بغیر رہ سکتی ہو۔ کتنی سنگدلی سے جدائی کی صلیب لٹکا ڈالی تھی ہمارے بیچ تم نے، میں بکھر گیا تھا نور! تمہارے فیصلے نے مجھے توڑ پھوڑ ڈالا تھا۔ ان حالات میں بھی بسمہ نے مجھے سنبھالنے کی کوشش کی مگر میں نے ایک مرتبہ پھر اسے اور فرحان کو بے دردی سے نظر انداز کر دیا۔ جو سزا تم نے مجھے دی تھی اپنی سزا میں نے بے قصور بسمہ کی جھولی میں ڈال دی۔ نتیجتاً وہ چپ چاپ میری زندگی سے رخصت ہو گئی۔''

شہریار صاحب کا لہجہ رندھ گیا تھا۔

نورینہ بیگم نے اس لمحے بے ساختہ شرمندگی سے اپنا سر جھکا لیا تھا۔

''کتنی عجیب بات ہے نور، وہ عورت جان دے کر بھی میری زندگی میں اہمیت حاصل نہیں کر سکی۔ وفا کر کے بھی اسے وہ مقام نہیں ملا، جو تم نے جفا کر کے حاصل کر لیا۔ دوسری عورت تم تھیں۔ اس کا حق چھیننے کی جرأت بھی تم نے کی تھی مگر اس کے باوجود سزا صرف اسے ملی۔''

شہریار صاحب اپنی بات مکمل کرنے کے بعد خاموش ہوئے تو نورینہ بیگم دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑیں۔

''آئی ایم سوری شہری، میں ان حقیقتوں سے باخبر نہیں تھی۔''

''اٹس اوکے، میرا مقصد تمہیں شرمندہ کرنا نہیں تھا بلکہ صرف یہ بتانا تھا کہ جو لوگ محبت کرتے ہیں وہ اپنے دل بھی سمندر کی طرح وسیع رکھتے ہیں۔ زندگی کو چھوٹی چھوٹی لغزشوں کی بھینٹ چڑھا کر ضائع کر دینا دانشمندی کا تقاضا نہیں ہے۔''

وہ اور بھی بہت کچھ کہہ رہے تھے تاہم نورینہ بیگم کسی مجرم کی طرح ان کے سامنے سر جھکائے بیٹھی مسلسل معافی مانگ رہی تھیں۔

☆☆☆

''مجھے آپ سے ڈائیورس چاہیے۔''

دو قدم کے فاصلے پر اس کے مقابل کھڑی تمکین رضا اس سے کہہ رہی تھی اور وہ سن سا بیٹھا گم حواس کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''میں آپ کو مینٹلی ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتی، لہٰذا بہتر ہے کہ آپ جلد سے جلد چپ چاپ میری زندگی کا فیصلہ کر دیں۔'' قطعی اٹل لہجے میں کہنے کے بعد وہ فوراً اس کے سامنے سے ہٹ گئی تھی۔

اریج کے ساتھ ساتھ خود اس کے دل کا حال بھی ابتر ہو رہا تھا۔ وہ پھر سے زمانے کی نظروں میں تماشہ بننا نہیں چاہتی تھی مگر اریج کے دل میں اپنا مقام بھی جانچنا تھا۔ ساری زندگی وہ اس کی رفاقت میں سستی ہو کر جینا نہیں چاہتی تھی۔ لہٰذا خود اپنا وقار قائم رکھنے کے لیے اس وقت اس کا یہ مطالبہ کرنا ضروری تھا تاہم اس کے اس مطالبے پر ایک ان دیکھی سی آگ نے اریج کے پورے وجود کو جیسے اپنے حصار میں لے لیا۔ ابھی تھوڑی دیر قبل جب وہ لاؤنج میں بیٹھا تھا فاروق صاحب نے اس سے کہا تھا۔ ''اریج بیٹے ہمیں آپ سے ایک بہت اہم بات ڈسکس کرنی ہے۔'' تب ایک لمحے کے لئے اس کا دل دھڑکا تھا تاہم اگلے ہی پل وہ اپنے حواس پر کنٹرول رکھتے ہوئے متانت سے بولا تھا۔

''جی فرمائیے بڑے پاپا۔'' فاروق صاحب کو اس کی یہ تابعداری اچھی لگی تھی۔

لاؤنج میں اس وقت ماسوائے تمکین اور اشعر کے باقی تقریباً سبھی لوگ موجود تھے۔ تبھی کچھ لمحے سوچنے کے بعد فاروق صاحب نے اس سے پوچھا تھا۔

''کیا یہ درست ہے کہ آپ نے تمکین بیٹی سے اپنی رضا سے نہیں بلکہ اشعر کے کہنے پر مجبوراً شادی کی؟'' اسے ان سے ایسے سوال کی توقع نہیں تھی۔ تبھی وہ ایک نظر قریب بیٹھی رخسانہ بیگم پر ڈالتے ہوئے قدرے مدھم لہجے میں بولا تھا۔

''جی۔''

''کیوں؟ ایسی کون سی مجبوری درپیش تھی آپ کو؟ اشعر سے اتنے بہتر تعلقات تو نہیں ہیں آپ کے کہ محض اس کی رضا کے لئے آپ تمکین بیٹی کی عزت کی بھی پروا نہ کریں؟''

کس قدر تلخ اور تکلیف دہ سوال تھا ان کا۔ اریج اس سوال کے جواب میں کچھ بھی کہنا نہیں چاہتا تھا مگر اس وقت اس کا خاموش رہنا کسی

صورت مناسب نہیں تھا، تبھی اس نے لب کھولے تھے۔

''آپ کا مجھ پر غصہ کرنا جائز ہے بڑے پاپا لیکن یہ سچ ہے کہ میں اپنی مما کے بعد سب سے زیادہ پیار تمکین سے کرتا ہوں۔ میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ وہ میری زندگی کا حصہ بھی بن سکتی ہے اور نہ ہی کبھی یہ تصور کیا تھا کہ اسے محض ضرورت کے لئے اپنی زندگی میں شامل کروں۔''

''مگر اس کے باوجود تم نے ایسا ہی کیا ہے کیوں؟'' اس بار سعید صاحب نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اس سے سوال کیا تھا جواب میں وہ سر جھکاتے ہوئے بولا۔

''اپنی مما کے لئے۔'' کہتے ہی اس نے سر اٹھایا تو اس کی خوب صورت آنکھوں میں نمی بڑی واضح تھی۔

''میں اپنی مما سے بہت پیار کرتا ہوں پاپا، زندگی میں وہ دوبارہ مجھ سے دور ہو جائیں میرے پاس اس بات کا تصور بھی نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ مما اشعر سے بہت پیار کرتی ہیں اور شاید اشعر بھی اس بات سے بخوبی واقف ہے تبھی اس نے مما کو دھمکی دی تھی کہ اگر تمکین دوبارہ اس کی زندگی کا حصہ نہ بن سکی تو وہ خود کو ختم کرلے گا اور اگر وہ ایسا کچھ کر لیتا ہے تو میں جانتا ہوں میری مما کی زندگی پھر سے خطرے میں پڑ جائے گی جو میں کسی صورت افورڈ نہیں کرسکتا۔ میں خود کو مٹا سکتا ہوں پاپا لیکن اپنی زندگی میں اپنی مما کو دکھی نہیں دیکھ سکتا۔'' اس کا لہجہ رندھ گیا تھا۔ گردن جھکا کر دائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے دونوں آنکھوں کے گوشے دباتے ہوئے وہ جیسے ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔ جب سعید صاحب اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آئے تھے۔

''مجھے تم پر فخر ہے میرے بیٹے مگر آپ نہیں جانتے کہ محض اپنی مما کو بچانے کے لئے آپ نے کتنا غلط فیصلہ کیا ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ اس سارے معاملے میں آپ نے ایک بار بھی تمکین بیٹی کے متعلق نہیں سوچا۔''

''سوچا ہے پاپا، بہت زیادہ سوچا ہے تمکین کی عزت اور وقار مجھے اپنی جان سے بھی بڑھ کر عزیز ہے۔ اسی لئے میں نے یہ طے کرلیا تھا کہ اسے کسی صورت طلاق نہیں دوں گا۔ بلکہ اشعر اور اسے پھر سے ملانے کے لئے میں اپنی جان سے ہی گزر جاؤں گا۔ کسی نہ کسی روڈ ایکسیڈنٹ کی نذر کردوں گا خود کو، مگر اس نے مجھے واپس بلا لیا کچھ بھی کرنے نہیں دیتی وہ مجھے۔'' الجھا الجھا سا کتنا پیارا لگ رہا تھا وہ رخسانہ بیگم کا سر اس لمحے بے ساختہ فخر سے بلند ہو گیا تھا۔ تبھی وہ آہستہ سے اٹھ کر اس کے مقابل آئی تھیں اور اس کی کشادہ پیشانی پر اپنے لب ثبت کرتے ہوئے بالآخر رو پڑی تھیں۔

''مجھے معاف کردو اریج، میں واقعی تمہاری اچھی مما نہیں ہوں۔''

''آپ ایسا کیوں کہہ رہی ہیں مما، پلیز روئیں نہیں۔ میں آپ کے آنسو برداشت نہیں کرسکتا۔'' انہیں روتا دیکھ کر وہ جیسے تڑپ ہی تو اٹھا تھا۔ تبھی فاروق صاحب اور سعید صاحب نے اریج کو تسلی دیتے ہوئے کہا تھا۔

''یو ڈونٹ وری بیٹے، نمی بیٹی کو اب آپ کی زندگی سے کوئی الگ نہیں کرسکتا۔ اشعر نے شیزا سے شادی کرنے کا جو قدم اٹھایا ہے وہ اب اسی کی ذمہ داری سنبھالے گا۔ آپ اس کی طرف سے مکمل بے فکر ہو کر اپنی لائف انجوائے کریں۔''

جسم میں روح کا واپس آنا کسے کہتے ہیں۔ یہ اس لمحے کوئی اریج احمر سے پوچھتا۔ وہ لاؤنج سے خوشی خوشی سب کا شکریہ ادا کر کے جب

اپنے کمرے کی طرف آیا تھا تو اس کا دل معمول سے کہیں تیز دھڑک رہا تھا۔ تاہم ابھی تمکین رضا نے اسے پھر سے ڈسٹرب کر کے رکھ دیا تھا۔ رخ پھیرے لیٹی وہ اس سے سخت بدگمان دکھائی دے رہی تھی۔

''نمی۔'' اس کا دل سخت مضطرب ہو رہا تھا۔ تبھی بے قراری سے اسے صدا دے ڈالی مگر تمکین نے اس کی صدا پر کان نہیں دھرے۔ وہ اسی طرح رخ پھیرے لیٹی اس سے سخت خفگی کا اظہار کر رہی تھی۔

''پلیز نمی، تم نے کہا تھا کہ تمہیں مجھ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں، پلیز بتا تو دو تمہیں مجھ سے کون سی باتیں کرنی تھیں؟'' وہ بے کل لہجے میں پوچھ رہا تھا اور ادھر تمکین کے آنسو پلکوں کی باڑ توڑ کر گالوں پر بہہ نکلے تھے۔ اس لمحے وہ رخ پھیر کر اس کی طرف دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ تبھی اریج نے زبردستی اس کا بازو اپنی تحویل میں لے کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

''کم از کم یہ تو بتا دو کہ رو کیوں رہی ہو؟ کیا ان آنسوؤں کی وجہ بھی اشعر ہے؟''

''ہاں۔'' بھڑ بھڑ جلتے دل کی تسکین کے لئے وہ کہہ بیٹھی تھی۔ جب اریج نے شکایتی نگاہوں سے دکھی انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

''تمہیں مجھ سے پیار کیوں نہیں ہوتا نمی؟ ایسا کیا ہے اشعر میں جو مجھ میں نہیں ہے۔''

اس کے سوال نے تمکین کو مزید ہرٹ کیا تھا۔ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹنے والا حساب لگ رہا تھا۔

''مجھے ایک موقع تو دو نمی، میں چیلنج کرتا ہوں تمہیں خود سے پیار کرنے پر مجبور کر دوں گا۔'' دل کی خواہشات اس لمحے اس کے نفس پر حاوی ہو رہی تھیں۔ تمکین کی قربت کی خوشبو اس کے حواس گم کر رہی تھی۔ وہ اس لمحے اس سے زیر ہونا نہیں چاہتی تھی۔ اسے خود پر حاوی ہونے دینا بھی نہیں چاہتی تھی مگر وہ اس پر حاوی ہو گیا تھا۔

اس کے جنون کے سیلاب کے سامنے تمکین کے فرار کی ساری کوششیں محض ریت کی دیوار ثابت ہوئی تھیں۔ لاکھ نہ ہارنے کی کوشش میں بھی وہ اس شخص سے ہار گئی تھی جس نے اس کے ادھورے وجود کو مکمل کرنے کا احسان کیا تھا۔ فسوں خیز لمحوں کے جال میں الجھ کر ایک مرتبہ پھر وہ اس کے رحم و کرم پر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

''کھانا کھا لو عدنان۔''

وہ سیل پر کسی سے بات کر کے ابھی فارغ ہی ہوا تھا۔ جب انجشاء اس کے روم میں چلی آئی تھی۔ جواب میں وہ ایک سرسری سی نظر اس کے دلکش سراپے پر ڈالتے ہوئے بولا۔

''تم کھا لو مجھے بھوک نہیں ہے۔''

''کیوں بھوک نہیں ہے۔ صبح ناشتہ بھی نہیں کیا تھا تم نے، ابھی وہ تمہاری منظور نظر نور العین صاحبہ آ جائیں تو ایکدم سے بھوک جاگ جائے

گی تمہاری لیکن کان کھول کر سن لو عدنان، میں کوئی عام لڑکی نہیں ہوں جو تمہاری ان حرکتوں پر جل جل کر اندر ہی اندر ختم ہوتی رہوں۔ میں انجشاء احمر ہوں اور اپنے حقوق و فرائض خوب اچھی طرح پہچانتی ہوں۔'' غصے کی شدت سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ تبھی وہ اس کی طرف سے نگاہ چراتے ہوئے بولا تھا۔

''فضول بولنے میں تمہارا کوئی ثانی نہیں ہے۔''

''وہاٹ۔ کیا فضول بولا ہے میں نے۔''

جتنی وہ مصالحت کی کوشش کر رہی تھی عدنان اتنا ہی ہاتھ سے نکلتا جا رہا تھا۔

''مما سے کیا الٹی سیدھی شکایتیں کی ہیں تم نے میری؟''

وہ برہم نہیں تھا تاہم انجشاء کو خوشی ہوئی تھی کہ سیال بیگم نے بالآخر اس کے کان کھینچے تھے۔ تبھی وہ مسروری چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس کے قدموں میں آ بیٹھی تھی۔

''کروں گی ان سے تمہاری شکایت، اگر تم میرا مقام کسی اور کو دینے کی کوشش کرو گے تو میں تمہارا چین سے جینا دو بھر کر دوں گی۔''

''ہوں وہ تو پہلے ہی کیا ہوا ہے تم نے۔'' بہت مدھم لہجے میں وہ بڑبڑایا تھا مگر انجشاء کی سماعتوں نے اس کے الفاظ سن لئے تھے تبھی وہ مائنڈ کرتے ہوئے بولی تھی۔

''کیا غضب ڈھائے ہوئے ہیں میں نے تم پر، کیا ہو گیا ہے تمہیں عدنان، جس لڑکی کے لئے تم نے اپنی جان تک کی پرواہ نہیں کی اب اسی کا وجود برا کیوں لگنے لگ گیا ہے تمہیں۔''

اسے کیا ہو گیا تھا وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔ تاہم اس سے پہلے کہ عدنان اس کے سوال کے جواب میں کچھ کہتا۔ ٹٹ کھٹ ہی نور العین ہلکے سے دروازہ ناک کرتے ہوئے کمرے میں چلی آئی۔

''ہیلو عدی، ہائے انجشاء ہاؤ آر یو۔''

''میں ٹھیک ہوں آپ ان سے پوچھ لیجئے ان کا دماغ شاید ٹھیک نہیں ہے۔''

اسے دیکھتے ہی انجشاء کا موڈ بری طرح آف ہو گیا تھا۔

عدنان نے اس بات کو فوراً محسوس کر لیا تھا۔ تاہم وہ اسے نظر انداز کرتے ہوئے نور العین کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

''میں پچھلے تیس منٹ سے تمہارا ویٹ کر رہا ہوں نور کہاں اٹک گئی تھیں؟''

''کہیں نہیں اٹکی تھی۔ تمہارے آفس سے نکلتے نکلتے ہی دیر ہو گئی۔ اف عدنان کیا بتاؤں کہ تمہاری کمپنی کس بری طرح سے ڈوب رہی ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک لٹیرا جمع کیا ہوا ہے تم نے، جو بات انجشاء کسی صورت اس سے ڈسکس کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہی بات نور العین ایک دن کے لئے بھی اس سے نہیں چھپا سکی تھی۔

جواب میں عدنان کے چہرے پر شکستگی کے تاثرات مزید گہرے ہو گئے تھے۔ انجشاء اسے دکھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ تبھی اپنے زخمی دل کی پروا کیے بغیر بولی۔

''میں نے انکوائری شروع کر رکھی ہے عدنان، جلد ہی حالات کنٹرول میں آجائیں گے۔''

''آپ کہہ سکتی ہیں مگر مجھے نہیں لگتا کہ ایسا کچھ ہوگا۔ میرا دن میں ہی دماغ گھوم کر رہ گیا ہے۔'' انجشاء کی بات پر فوراً اس نے اپنے کمنٹس جاری کیے تھے۔ جواب میں عدنان آہستہ سے پلکیں موند گیا۔

''چلو عدی، میں نے کل ہی ڈاکٹر دانیال سے اپائنمنٹ لے لیا تھا۔ ان سے ملاقات کا ٹائم ہو رہا ہے۔'' عدنان کے اندر کی توڑ پھوڑ سے بے خبر وہ ایک نظر اپنی کلائی پر بندھی قیمتی رسٹ واچ پر ڈالتے ہوئے بولی تو عدنان آنکھیں کھول کر دھیرے سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے وہیل چیئر کو دھکیلتا اس کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

انجشاء کے دل میں عجیب سی اتھل پتھل مچ گئی تھی۔ عدنان کی شکستگی پر اسے اپنا دل جیسے کٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے جانے کے بعد کتنی ہی دیر تک وہ اس کے کمرے میں بیٹھی آنسو بہاتی رہی تھی۔ عورت خواہ کتنی ہی مضبوط اور میچور کیوں نہ ہو اپنے دل سے کبھی نہیں جیت سکتی۔ وہ بھی ہر مقام پر سرخرو ہونے کے بعد بالآخر دل کے مقام پر ہار گئی تھی۔

اس روز عدنان چیک اپ کے بعد گھر واپس لوٹا تو دن شام کے دھندلکوں میں چھپ گیا تھا۔ نورالعین تھوڑی دیر اس کے پاس بیٹھنے کے بعد واپس چلی گئی تھی۔ عدنان رات کا کھانا کھانے کے بعد کمرے میں آیا تو انجشاء بھی اس کے پیچھے ہی اٹھ کر کمرے میں چلی آئی تھی کیونکہ عدنان، رؤف صاحب اور سیال بیگم کے سامنے اپنے ٹیسٹ سے متعلق کوئی بات کھل کر نہیں کہہ سکا تھا۔

''عدنان! ڈاکٹر نے کیا کہا ہے؟'' وہ چیئر سے بیڈ پر منتقل ہوا تھا۔ جب اس کے سوال پر متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

''کچھ خاص نہیں، جلد ری کوری کی امید دلائی ہے اس نے۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' بے طرح خوش ہوتے ہوئے وہ اس کے قریب ہی چلی آئی تھی۔

''عدنان آج میں سلاؤں تمہیں۔'' ایک دم سے وہ اتنی چینج ہو گئی تھی کہ عدنان چاہنے کے باوجود اسے سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ وہ پتھر ہونے جا رہا تھا اور ادھر انجشاء نے جیسے قسم کھائی تھی کہ اسے پتھر ہونے نہیں دینا۔

''نہیں میں سو جاؤں گا۔'' کتنا دشوار ہوتا ہے خود اپنی ہی خواہشوں سے فرار چاہنا۔ اس نے بیڈ پر چت لیٹ کر آنکھوں پر بازو دھرا تھا۔ جب انجشاء چپکے سے آکر اس کے سرہانے بیٹھ گئی۔

''تم روز بروز زیادہ ہی سر نہیں چڑھتی جا رہی میرے۔'' اس کے انکار کے باوجود وہ اپنے ہاتھوں سے اس کے بال سہلانے لگی تھی۔

''انجو پلیز، مت کمزور کرو مجھے پلیز چھوڑ دو مجھے میرے حال پر۔'' احتجاجاً وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ بیٹھا تھا۔ جب وہ سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں تیرتی بے بسی کو دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

''او کے چھوڑ دوں گی، لیکن اس کے لئے تم ابھی میرے سر پر ہاتھ رکھ کر یہ قسم کھاؤ کہ تمہیں اب میری ضرورت نہیں رہی ہے۔ میرے وجود سے میری ذات سے تمہارا محبت کا تعلق ختم ہو چکا ہے کھاؤ قسم۔''

''کیا بکواس ہے یہ؟'' شدید بے کل ہوتے ہوئے اس نے انجشاء کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑوا لیا تھا۔ تبھی اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

''تم کس سے بھاگ رہے ہو عدنان؟ کیوں میرے ساتھ خود اپنے دل سے بھی دشمنی کرنے پر تل گئے ہو تم؟''

اس بار عدنان نے خاموش رہنے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

''میرے ساتھ ایسا مت کرو عدنان، صرف تمہاری محبت سے ہار مان کر، میں نے خود کو سرتا پیر بدل ڈالا ہے پتھر کی مورت سے موم کا پتلا ہو گئی ہوں میں۔ یہ سب تم پر احسان یا ہمدردی نہیں ہے عدنان، میں محض اپنے پچھلے اعمال کی تلافی نہیں کر رہی بلکہ..... بلکہ مجھے تم سے اچانک محبت ہو گئی ہے اور یہ اسی محبت کا نتیجہ ہے کہ میں تمہارے چہرے پر دکھ کی ایک ہلکی سی پرچھائی بھی نہیں دیکھ سکتی۔'' رندھے لہجے میں کہتی وہ عدنان کے کندھے پر اپنا سر ٹکا گئی تھی جب کہ عدنان اس کے منہ سے قطعی غیر متوقع انکشاف سن کر جیسے حیران رہ گیا تھا۔

''میں تمہاری ذمہ داری اٹھا سکتی ہوں عدنان، تمہارے منہ سے نکلے پیار کے دو بولوں کے عوض، میں خوشی خوشی تمہارا گھر اور آفس دونوں سنبھال سکتی ہوں پلیز مجھ پر اعتبار کرو۔ دانستہ یا نادانستہ اگر میرے کسی عمل یا بات سے تمہارے دل کو ٹھیس پہنچی ہے تو پلیز اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے معاف کر دو۔ پلیز عدنان۔'' اس لمحے اس کا ہاتھ تھامے روتی ہوئی انجشاء احمر اس انجشاء سے قطعی الگ دکھائی دے رہی تھی جو پتھر کا مجسمہ تھی جسے اس سے محض ہمدردی کا دعویٰ تھا۔ تبھی شاید اس کے دل کا غبار بھی دھل گیا تھا۔ اپنی محبت کو سسکیاں بھرتے دیکھ کر اس کا دل پھر سے مچلا تھا۔ لہٰذا اس نے ہر منفی سوچ کو پس پشت ڈالتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی محفوظ پناہوں میں سمیٹ لیا تھا۔

زندگی میں پہلی بار انجشاء احمر کو محسوس ہوا تھا کہ سرخروئی اس کا نصیب بن گئی ہے۔

☆☆☆

''شاہ ولاج'' آج کل مختلف سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اریشہ سے منسوب اذہان شاہ کی پاکستان واپسی پر فرزانہ بیگم نے اسے تمام تر حقیقت سے باخبر کرتے ہوئے اریشہ کی بجائے سائلہ خان سے منسوب کرنے کا فیصلہ سنا دیا تھا۔ جواب میں وہ مضطرب سا بس ان کی طرف دیکھتا رہ گیا تھا۔

''اریشہ کو اس حال میں میری ضرورت ہے مما۔'' بہت کمزور سا احتجاج کیا تھا اس نے، جواب میں چیونگم چباتی ماہم شاہ فوراً نخوت سے سر جھٹکتے ہوئے بولی تھی۔

''یہ سراسر آپ کی خوش فہمی ہے بھائی، اسے کبھی بھی آپ کی ضرورت نہیں رہی۔ اس کی آنکھوں میں ہمیشہ ازمیر بھائی کے لئے ہی محبت کے دیپ جلتے دیکھے ہیں میں نے۔''

''اوکے اگر تم اس حقیقت سے باخبر تھیں تو پھر کیوں کر یہ الزام لگا کر بیکار میں پریشان کرتی رہیں اسے اور مما آپ کو بھی تو معلوم تھا ناں کہ وہ ازمیر بھائی میں انٹرسٹیڈ ہے۔ اس کے باوجود آپ نے زبردستی اس کا رشتہ مجھ سے جوڑا اور جب میں نے اپنے دل میں اس کے لئے جگہ بنالی تو آپ نے خود اپنے ہی ہاتھوں سے طے کیا ہوا یہ معصوم سا بندھن توڑ بھی ڈالا، کیا اسی لئے اسٹیٹس بھیجا تھا مجھے کہ پیچھے آپ لوگ جو دل چاہے وہ رول لے کر سکیں۔ ایم سوری مما لیکن میں ایک انسان ہوں کوئی چابی کا کھلونا نہیں ہوں جسے آپ اپنی مرضی کے مطابق جیسے چاہیں چلا سکتی ہیں میں اگر اریشہ کا ہاتھ نہیں تھام سکا تو پھر سائلہ خان بھی میری زندگی کا حصہ نہیں بن سکے گی۔''

زندگی میں پہلی بار اس نے فرزانہ بیگم کے سامنے سر اٹھانے کی جرأت کی تھی۔ اپنا نقطہ نظر واضح کرنے کے بعد وہ ایک سیکنڈ کے لئے بھی وہاں نہیں ٹھہرا تھا۔ فرزانہ بیگم اور ماہم شاہ ایک دوسرے کا منہ دیکھتی ہی رہ گئی تھیں۔

اذہان اسی روز شام کو بے مثال کا میج پہنچ گیا تھا۔

اریشہ اپنے کمرے میں بیڈ پر لیٹی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ جبکہ باقی سب لوگ لاؤنج میں جمع شہرین خان اور ڈاکٹر فرحان کی لڈو گیم کو انجوائے کر رہے تھے۔ نورینہ بیگم، شہریار صاحب کے پہلو میں بیٹھی مسکرا رہی تھیں۔ تاہم جیسے ہی ان کی نظر اذہان کے چہرے پر پڑی ان کے مسکراتے لب سمٹ گئے تھے۔

''السلام علیکم انکل اینڈ پھوپھو۔''

''وعلیکم السلام ینگ مین، آؤ بیٹھو آج ہمارے غریب خانے کا راستہ کیسے بھول بیٹھے آپ؟''

شہریار صاحب فوراً اس کی طرف متوجہ ہو کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ باقی سب لوگ بھی اپنا مشغلہ چھوڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ اذہان کو شہریار صاحب کے رویئے سے کافی حوصلہ ملا تھا۔ تبھی وہ اپنا اعتماد بحال کرتے ہوئے نورینہ بیگم کے ہاتھ تھام کر بولا تھا۔

''میں آپ سے سخت شرمندہ ہوں پھوپھو۔ خدا گواہ ہے کہ اریشہ کے ساتھ درپیش آنے والے حادثے سے باخبر ہونے کے باوجود میں اس رشتے کو ختم کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ مجھے نہیں پتہ کہ مما نے یہ سب کیسے اور کیوں کیا لیکن اس کے باوجود میں آپ سے شرمندہ ہوں پھوپھو،

پلیز بی لیومی اس سارے چکر میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔''

نورینہ بیگم شاہ ولاج والوں کے رویئے کو لے کر شدید ہرٹ تھیں تاہم اس کے باوجود انہوں نے اذہان کے ایکسکیوز کو قبول کرتے ہوئے تحمل سے کہا تھا۔

''میں اس بات کو بھلا چکی ہوں۔''

''تھینک یو پھوپھو، لیکن مجھے ہمیشہ اریشہ جیسی اچھی اور سمجھدار لڑکی کو کھو دینے کا دکھ رہے گا۔''

وہ واقعی دل سے شرمندہ تھا۔ نورینہ بیگم نے فی الحال خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی تھی۔ ان کی خاموشی کے پیش نظر شہریار صاحب نے اذہان کو ادھر ادھر کی روزمرہ باتوں میں مصروف کر لیا۔

ایک دن مزید بے مثال کاٹیج میں قیام کرنے کے بعد وہ اریشہ سے بھی معافی مانگ کر واپس چلا گیا تو نورینہ بیگم اریشہ کے مستقبل کے متعلق سوچ کر پھر سے آزردگی میں گھر گئیں۔

اس روز بھی وہ اداس سی لان میں بیٹھی جانے کن سوچوں میں گم تھیں۔ جب اچانک ازمیر کچھ سوچ کر ان کے قریب چلا آیا۔

''السلام علیکم پھوپھو، کیا بات ہے یوں اداس اداس سی تنہا کیوں بیٹھی ہیں؟'' وہ ان کے سامنے ہی کیبن کی چیئر پر ٹک گیا تھا۔ تبھی وہ افسردگی سے، سرد آہ بھرتے ہوئے بولی تھیں۔

''کچھ نہیں بیٹے، بس اریشہ کی وجہ سے پریشان ہوں۔ بھری جوانی میں روگ لگ گیا ہے میری بیٹی کو، پہاڑ سی زندگی، آگے کیسے بسر کرے گی وہ یہی سوچ کر دل ہولتا رہتا ہے۔''

ازمیر کے ساتھ ان کا رویہ پہلے سے بہت زیادہ بہتر ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی پریشانی بھی اس سے شیئر کر گئی تھیں اور یہی وہ موقع تھا جس کا ازمیر کو انتظار تھا۔ پل دو پل کے لئے کچھ سوچنے کے بعد وہ نظریں جھکاتے ہوئے بولا تھا۔

''آپ کو اریشہ کے لئے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے پھوپھو' کیونکہ بہت جلد ممی پاپا میرے لئے آپ سے اریشہ کا ہاتھ مانگنے والے ہیں۔'' بظاہر اس کی اس سادہ سی بات پر نور بیگم بے ساختہ چونک اٹھی تھیں۔

''وہاٹ یہ تم کیا کہہ رہے ہو ازمیر۔''

''میں سچ کہہ رہا ہوں پھوپھو۔'' سرسری سی ایک نظر ان کے حیران چہرے پر ڈالتے ہوئے وہ بہت ادب سے بولا تھا۔

''میں جانتا ہوں کہ آپ مجھے اچھا نہیں سمجھتیں' آپ کی نظر میں میں ایک لوز کیریکٹر لڑکا ہوں، لیکن خدا گواہ ہے پھوپھو، حقیقت میں ایسا کچھ نہیں ہے۔ ہاں میں مانتا ہوں کہ یونیورسٹی پریڈ کے دوران شہرین خان مجھے اچھی لگی تھی مگر جب میں مما کی ریکوسٹ پر پاکستان آیا تو پورے شاہ ولاج میں اریشہ واحد لڑکی تھی جس نے خود سے بڑھ کر میرا خیال رکھا۔ میں بکھرا ہوا تھا۔ اس نے اپنی بے لوث محبت سے مجھے سمیٹا اور اس طرح سمیٹا پھوپھو کہ میں شہرین خان کے تصور کو بھی بھولتا چلا گیا۔ خدا گواہ ہے کہ ہمارا رشتہ ہمیشہ بے حد پاکیزہ رہا ہے۔ میں لاکھ برا، بدشکل سہی مگر وہ ایسی لڑکی

ہے پھوپھو کہ جس کے کردار پر اس کا کوئی دشمن بھی شک نہیں کر سکتا۔ وہ چاہے تو کسی پتھر کو بھی خود سے پیار کرنے پر مجبور کر سکتی ہے۔ میں بھی مجبور ہو گیا ہوں پھوپھو اگر وہ میری زندگی کا حصہ نہ بنی تو شاید میں کبھی زندگی کے حقیقی حسن کو محسوس نہ کر سکوں۔''

وہ بات جو وہ بہت پہلے ہی ان سے کر لینا چاہتا تھا بالآخر آج ہو گئی تھی۔ نورینہ بیگم من سی بیٹھی اسے بولتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔

''مجھے اندازہ ہے پھوپھو کہ ماہم اور فرزانہ آنٹی نے، یقیناً میرے بارے میں آپ کا دل بہت خراب کر رکھا ہوگا، لیکن میں اپنی مما کی قسم کھا کر کہتا ہوں پھوپھو، میں اریشہ کو اپنی جان سے بڑھ کر پیار کروں گا۔ میری وجہ سے کبھی اس کی آنکھ میں ایک آنسو بھی نہیں آئے گا۔''

وہ اس کی آنکھوں میں تیرتے سچے جذبوں کے رنگ کو پہچان گئی تھیں مگر اس کے الفاظ نے انہیں شرمندگی کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا تھا۔

بہت سی تلخ حقیقتیں واضح ہونے کے بعد کم از کم وہ اپنے پرائے کی پہچان تو کر ہی چکی تھیں۔ تاہم اس لمحے اپنی پوزیشن کلیئر کرنا ان کے لئے بہت مشکل ہو رہا تھا۔ ذاتی طور پر انہوں نے کبھی ازمیر شاہ میں کوئی برائی نہیں دیکھی تھی۔ لہٰذا اس وقت ان کا سر جھک گیا تھا۔ کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ بہت کمزور سے لہجے میں بولی تھیں۔

''تم بہت اچھے لڑکے ہو ازمیر میں دل سے تمہاری اچھائیوں کا اعتراف کرتی ہوں۔ لل...... لیکن اریشہ تمہاری نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ ایک اپاہج لڑکی ہے۔'' کہنے کے ساتھ ہی وہ رو پڑیں تو ازمیر نے سرعت سے ان کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

''پھوپھو! وہ اپاہج ہے تو کیا ہوا، میرے پاس تو اپنی ٹانگیں ہیں ناں، میں اسے سنبھال سکتا ہوں۔ میں جانتا ہوں جو حادثہ بدقسمتی سے اس کے ساتھ پیش آیا ہے اگر وہ میرے ساتھ پیش آیا ہوتا تو اریشہ سب سے پہلے مجھے سمیٹنے کے لئے آگے بڑھتی۔ میں اپنے والدین سے بات کر چکا ہوں پھوپھو، سائرہ خان سے بھی ایکسکیوز کر چکا ہوں۔ اسے اپنانے والے بہت مل جائیں گے مگر میری اریشہ کو میرے سوا اور کوئی خوش نہیں رکھ سکے گا۔ میرے لئے نہ سہی پلیز اپنی بیٹی کی خوشیوں کے لئے ہی، اسے میری زندگی کا حصہ بنا دیجئے پھوپھو، پلیز۔''

اس کے انداز میں عاجزی سمٹ آئی تھی۔ تاہم نورینہ بیگم اب بھی کوئی فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھیں۔ تبھی اس کے ہاتھوں پر اپنائیت سے اپنے ہاتھ رکھتے ہوئے وہ اثبات میں سر ہلا کر وہاں سے اٹھ گئیں تو ازمیر بے ساختہ خوشی سے جھوم اٹھا۔

''تم میرا خواب ہو اریشہ اور میں اس خواب کی تعبیر بہت جلد حاصل کر کے رہوں گا۔'' دھیرے سے پلکیں موند کر اس نے جیسے اریشہ کے تصور سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا تھا جب کہ وہ حقیقت میں اس انکشاف سے باخبر ہو کر خوشی سے گنگ لان سے ملحقہ برآمدے میں کھڑی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

تمکین کے منہ سے صاف انکار سننے کے بعد اشعر جیسے حقیقی معنوں میں بکھر کر رہ گیا تھا۔ اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ زندگی اتنی بے رحم بھی ہو سکتی ہے۔ محض جذبات میں اٹھایا ہوا ایک غلط قدم اسے یوں تاعمر کڑی سزا کی طرف بھی دھکیل سکتا ہے۔ وہ شدید دل برداشتہ ہوا تھا اور اسی پوزیشن میں اس نے سیف سائیڈ کرنے کی کوشش بھی کی تھی جسے سعید صاحب کی بروقت آمد نے ناکام بنا دیا تھا۔ وہ نہ صرف اسے غلط اقدام سے روکنے میں کامیاب ہو گئے تھے بلکہ جی بھر کر ذلیل بھی کیا تھا۔ رخسانہ بیگم کی تیزی سی ڈاؤن ہوتی صحت کا حوالہ دے کر اسے اسی کی نظروں میں گرانے کی کوشش

بھی کی تھی تبھی اس نے بیرون ملک کے لئے رخت سفر باندھ لیا تھا۔ مزید حسن ولاج میں رہ کر زندہ رہنا اب اس کے لئے بہت دشوار تھا۔ لہٰذا اس نے چپ چاپ پھر سے امریکہ روانگی کی تیاری شروع کر دی۔

اس وقت وہ گھر کے بھی افراد کے درمیان بیٹھا نہ صرف انہیں اپنی روانگی کی اطلاع دے رہا تھا بلکہ سب سے اپنے غلط افعال کی معافی بھی مانگ رہا تھا۔ اریج اور تمکین وہاں نہیں تھے تاہم رخسانہ بیگم کا دل اور آنکھیں ضرور آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ وہ ان کے پہلو میں ہی جڑ کر بیٹھا تھا اور اپنے ہاتھوں میں ان کے ہاتھ بھی تھام رکھے تھے۔

''مما..... خدا جانتا ہے کہ میں آپ سے بہت پیار کرتا ہوں۔ ایک پل بھی آپ کے بغیر جینے کا تصور نہیں کر سکتا، شاید یہ میری جنوں خیز محبت کا اثر ہی ہے کہ میں آپ کی ممتا کو اریج کے ساتھ شیئر کرنے کی ہمت خود میں نہیں پا رہا۔ میں نمی کو بھی اس سے پیار کرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا اسی لئے میں نے یہ طے کر لیا ہے کہ یہاں سے کوچ کر جاؤں۔ کچھ سالوں کے بعد ہو سکتا ہے کہ میں خود کو سنبھال لوں، تب پھر سے لوٹ کر آپ کے پاس آ جاؤں گا۔ یہ وعدہ ہے آپ سے پلیز اب تو مجھے جانے کی اجازت دے دیں مما۔''

کتنا اچھا لگ رہا تھا اس وقت وہ اجازت طلب کرتے ہوئے۔ رخسانہ بیگم نے بے اختیار اس کے لمبے چوڑے وجود کو اپنی کمزور بانہوں میں چھپایا تھا۔

''تو میری جان ہے اشعر، میری زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے تو کیوں مجھ سے دور جانے کی بات کرتا ہے۔ میں نہیں رہ سکتی تیرے بغیر۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی وہ رو پڑی تھیں۔ اشعر نے اس موقع پر بے ساختہ اپنے لب کاٹے تھے۔ تبھی آمنہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی تھیں۔

''اشعر ٹھیک کہہ رہا ہے آپا، فی الحال اس کا پاکستان سے چلے جانا ہی مناسب ہے وگرنہ یونہی کشیدگیاں بڑھتی رہیں گی۔ حالات کو معمول پر لانے کے لئے آپ کو تھوڑی سی ہمت تو دکھانا ہی پڑے گی۔''

رخسانہ بیگم خود بھی اس بات کو سمجھتی تھیں مگر ان کا دل کسی طور اشعر کو نظروں سے دور کرنے کے لئے نہیں مان رہا تھا۔ تاہم اس کے باوجود وہ خاموش ہو گئی تھیں۔

اشعر نے دوبارہ تمکین کا سامنا نہیں کیا تھا۔ وہ اس سے مزید کچھ بھی کہنا سننا نہیں چاہتا تھا۔ اپنا سامان خود ہی پیک کرنے کے بعد جس وقت وہ گھر سے روانہ ہو رہا تھا۔ عین اسی لمحے شیزا اپنے دو سالہ بیٹے کو گود میں اٹھائے، سست روی سے چلتی ہوئی وہاں آ پہنچی تھی۔

''تم.....؟ تمہاری ہمت کیسے ہوئی اس گھر میں قدم رکھنے کی؟'' اسے دیکھتے ہوئے بیگ چھوڑ کر غصے سے اس کی طرف لپکا تھا۔ جب وہ اداس نگاہوں سے اس کا غصیلا چہرہ دیکھتے ہوئے مدھم لہجے میں بولی۔

''تمہاری امانت تمہیں واپس کرنے آئی ہوں اشعر، تم ہر سچائی سے منہ موڑ کر جی سکتے ہو مگر اس سچائی کو جھٹلا نہیں سکتے کہ یہ بچہ تمہارا ہے اور اسے تمہاری شفقت کی ضرورت ہے۔''

''شٹ اپ، مجھے تم سے وابستہ کوئی چیز نہیں چاہیے۔'' بچے پر ایک سرسری سی نگاہ بھی ڈالے بغیر اس نے کہا تھا جب کہ وہ سسک اٹھی تھی۔

''ایسا مت کہو اشعر، میرے گناہوں کی سزا میرے بچے کو مت دو۔ یہ بے قصور ہے، میں اپنے لئے تم سے کچھ نہیں مانگتی، میں نے مما کو کیس کرنے سے بھی روک دیا ہے مگر میں اپنے بچے کے لئے خود کو تمہارے پاس آنے سے نہیں روک سکی۔ میں اس کے لئے تم سے تمہارے نام کی بھیک مانگتی ہوں خدا کے لئے اسے میرے ساتھ بے نامی کے اندھیروں میں مت دھکیلو اشعر، پلیز۔''

ہر عورت خواہ وہ کتنی ہی عیار اور مضبوط کیوں نہ ہو، ممتا کے مقام پر شاید یونہی ہار جاتی ہے۔ اس وقت وہاں موجود سبھی لوگوں کے دل میں شیزا کے لئے نرم گوشہ پیدا ہو گیا تھا تاہم اشعراب بھی اسے بے دردی سے سائیڈ پر دھکیلتے ہوئے تیز تیز قدم اٹھاتا وہاں سے نکلتا چلا گیا تھا۔

☆☆☆

وہ بیڈ پر بے خبر لیٹی پرسکون نیند کے مزے لوٹ رہی تھی۔ جب اریج چند لمحوں تک والہانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے کے بعد بیڈ سے اٹھ کر واش روم میں منتقل ہو گیا۔ رات ایک مدت کے بعد اسے سکون کی نیند نصیب ہوئی تھی۔ لہٰذا اس کا موڈ بھی بے حد فریش تھا وہ شاور لے کر روم میں واپس آیا تو تمکین بھی بیدار ہو چکی تھی۔ جھکی جھکی سی نگاہوں میں رقص کرتی حیا، کی سرخی اریج کو لطف بخش رہی تھی۔ تبھی وہ بالوں میں برش پھیرتے ہوئے بار بار ترچھی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

تمکین جب شاور لے کر فارغ ہوئی وہ روم سے نکل چکا تھا۔ پچھلے کچھ ہی روز میں اس کی صحت بہت زیادہ ڈاؤن ہو چکی تھی۔ وہ اس کے لئے متفکر نہیں تھی۔ تاہم رات میں محبت کے جو بادل اس نے تمکین کی ذات پر برسائے تھے وہ اسے اندر باہر سے سیراب کر گئے تھے۔ اشعر کو اس سے جنوں خیز محبت کا دعویٰ تھا مگر اس کے باوجود وہ کبھی اس کے احساسات کو سمجھ نہیں پایا تھا۔ جب کہ اریج کو تو اس نے کبھی اس کا جائز حق بھی دینے کی کوشش نہیں کی تھی مگر اس کے باوجود وہ اس کی روح کو قربت کے فقط چند لمحوں میں ہی سحر انگیز خوشبو سے مہکا گیا تھا۔ وہ دل جو اشعر نے اجاڑ کر کھنڈر کر ڈالا تھا اسی دل کی دھڑکنیں، اب نئی آہٹوں پر سر دھننے لگی تھیں۔ لاکھ سر جھٹکنے پر بھی وہ خود کو اریج کے بارے میں سوچنے سے باز نہیں رکھ پا رہی تھی۔ ذہن جیسے الجھ سا گیا تھا۔ وہ اس سے بدگمان بھی تھی اور اب علیحدہ ہونا بھی نہیں چاہتی تھی۔ گو ابھی تک اس کے دل میں اریج کی محبت کا چراغ نہیں جلا تھا۔ تاہم پھر بھی وہ اسی کے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔ اندر ہی اندر دعا گو تھی کہ اریج اس کے کہنے پر بھی اسے ہرگز خود سے الگ نہ کرے۔

اس روز اس کا ذہن اس قدر ڈسٹرب تھا کہ وہ اریشہ کو فون کر کے بلانے سے باز نہ رہ سکی۔ اگلے پچیس تیس منٹ تک اریشہ اس کے پاس آئی تو اس کا چہرہ بھی انوکھی ہی داستان پیش کر رہا تھا۔

''السلام علیکم میری سوہنی شہزادی بول کیسے یاد کیا کنیز کو؟'' اس کا چہرہ کسی گلاب کی مانند کھلا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ جب کہ وہ ابھی کچھ روز قبل مایوسیوں کے بادل میں گھری ہوئی تھی۔ تمکین سے گلے ملتے وقت بھی اس نے اسے اتنی زور سے بھینچا تھا کہ بے ساختہ وہ اسے ایک دھمو کا جڑنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

''پاگل ہو گئی ہے کیا، آج تو ہوا کے دوش پر اڑتی ہوئی پہنچی ہے۔ ضرور دال میں کہیں کالا ہے۔''

''ہائے مائی سوسویٹ نمی ڈیئر، اب تو ساری دال رنگین ہو گئی ہے۔'' آہستہ سے سرد آہ بھر کر وہ مسکرائی تھی جب تمکین مشکوک انداز میں اس

کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''کھل کر بکواس کر، کون سا قارون کا خزانہ مل گیا ہے تجھے؟''تمکین کے سوال پر وہ خود کو کھلکھلانے سے باز نہیں رکھ سکی تھی۔

''جل کیوں رہی ہے مجھے خوش دیکھ کر، سانس تو لینے دے بتا دیتی ہوں سب کچھ۔''

''جلدی بتا تو جانتی ہے، مجھ میں برداشت کا مادہ بالکل نہیں ہے۔''اس سے واقعی اریشہ کا سسپنس برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ تبھی وہ پھر سے مسکرائی تھی۔

''نمی پتہ ہے، ازمیر مجھ سے یعنی اریشہ شہریار احمد خان سے محبت کرتا ہے اور......اور وہ مجھے اپاہج کے روپ میں بھی اپنانے کو تیار ہے۔''
محبت کی سرمستی اور بےخودی اس لمحے وہ اریشہ کے چہرے پر بخوبی دیکھ سکتی تھی۔ لہٰذا خود بھی اس کی خوشی میں خوش ہوتے ہوئے بولی۔

''مبارک ہو، تم نے تو واقعی میدان مار لیا ہے۔ ویسے تیرا ازمیر ہے بڑھا گھنہ، مجال ہے جو ذرا بھی اندر کے حال کی ہوا لگنے دی ہو۔''

اس کی بات پر وہ ہنسی تھی۔ تاہم اگلے ہی پل سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی تھی۔

''سچی محبت کرنے والے ایسے ہوتے ہیں تمکین، ہر جذبہ سنبھال کر رکھنے والے دیکھ لو گھنے کو، اب بھی مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ مما کے سامنے دل کھول کر بیٹھ گئے جناب، وہ تو اتفاق سے میں نے سن لیا ورنہ ابھی چند روز میں، میں اپنی اداکاری کا بھانڈا پھوڑنے والی تھی اور سچی تمکین اگر تب ازمیر مجھے اپنانے کی بات کرتا ناں تو میرے دل کو ایک فیصد بھی خوشی نہیں ہوئی تھی۔''

''کیوں؟''، تمکین نے قدرے حیران ہوتے ہوئے پوچھا تھا۔ جواب میں وہ اپنی خوب صورت نگاہیں گلابی ہتھیلیوں پر جماتے ہوئے بولی۔

''آئی ڈونٹ نو، بس میں چاہتی تھی کہ اسی حال میں اس کی محبت کا بھید مجھ پر کھلے' وہ میرے ہر عیب کے ساتھ مجھے اپنانے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ جب کسی میں میرا ہاتھ تھامنے کی ہمت نہ ہو تب وہ اپنا ہاتھ میری طرف بڑھائے اور اس نے میری خواہشوں کا مان رکھ لیا نمی، وہ بہت اچھا ہے۔''
ہمیشہ اداس رہنے والی اریشہ خان کو محبت نے مسکرانا سکھا دیا تھا اور یہ مسکراہٹ اس کے خوب صورت لبوں پر سچ بھی خوب رہی تھی۔

''اب دیکھنا میں بھی اسے ستاؤں گی۔ عین رخصتی کے وقت ہی میری اداکاری کا بھانڈا پھوٹے گا۔'' کتنی اچھی لگ رہی تھی وہ اپنے حال میں مست ہوئی۔

وہ تمکین چاہ کر بھی زیادہ دیر تک اس کے چہرے پر نگاہ نہیں جما سکی تھی کہ کہیں اسے اسی کی نظر نہ لگ جائے۔

''اوکے بابا، جیسا تم مناسب سمجھو لیکن یہ تو بتاؤ وہ تمہاری ان دوستوں کا کیا بنا؟ وہ کیا نام تھا ان کا ہاں اور سائلہ خان۔''

وہ اسے لے کر کچن میں چلی آئی تھی اور اب باتوں کے ساتھ ساتھ اپنے اور اس کے لئے کافی بنا رہی تھی۔ اریشہ بڑے آرام سے وہیں رکھے ٹیبل پر دھرنا دے کر بیٹھ چکی تھی۔

''کچھ نہیں یار، ازمیر کے بقول میں نے اسے شہزین خان کے سحر سے نکال لیا تھا جب کہ سائلہ خان کو وہ خود ایکسکیوز کر چکا ہے۔ بتایا بھی

اس نے مجھے مگر میں عقل میں ماسٹر اس کی بات کے حقیقی مفہوم کو سمجھ ہی نہیں سکی۔ ویسے ایک بات ہے نمی وہ گھنہ ہونے کے ساتھ ساتھ جھوٹا بھی ہے۔''

''اچھا وہ کیسے بھئی۔'' تمکین اس کی الف لیلہ میں محو ہو کر اپنا چکر بھول ہی گئی تھی۔ تبھی اسے کپ پکڑاتے ہوئے پوچھا تو وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔

''دیکھو ناں نمی اس نے مجھ سے کہا تھا کہ سائلہ خان اسکے اور شہرین کے رشتے کے متعلق سب کچھ جانتی ہے جب کہ ایسا نہیں تھا سائلہ مجھ سے فون کر کے شہرین اور راز میر کے رشتے سے متعلق پوچھ رہی تھی اسے تو کسی بات کی کوئی خبر ہی نہیں تھی۔ ورنہ شاید وہ کبھی ہم دونوں کے بیچ نہ آتی۔''

''ہاں یہ بھی ہے۔''

''تمہیں کیا بات کرنی تھی؟ کیا پھر سے اشعر نے کوئی مسئلہ کھڑا کر دیا ہے؟'' اریشہ کو ہی خیال آیا تو اس نے پوچھ لیا۔ جواب میں وہ پھر سے اداس ہو کر رہ گئی۔

''پتہ نہیں اریشہ میری زندگی تو عجیب سا عنوان بن کر رہ گئی ہے۔ وہ ایک شخص جسے میں نے اپنی روح کی تمام تر سچائیوں کے ساتھ چاہا اسی نے پل میں راکھ کر ڈھیر بنا ڈالا مجھے۔ جو ذلت و رسوائی اس کی وجہ سے میرا نصیب بنی اس کے بعد شاید مجھے اس کی طرف دیکھنا بھی نہیں چاہیے تھا مگر میں ایسا نہیں کر پائی اریشہ، اشعر سے نفرت کرنا، بیتے ہوئے خوب صورت دنوں کو بھلا کر جینا، میرے اختیار میں نہیں ہے۔ سب کو عجیب لگتا ہے کہ میں اس کے ڈائیورس دینے کے بعد بھی اس سے دوستانہ سلوک کیوں روا رکھے ہوئے ہوں میں کسی کو نہیں بتا سکتی اریشہ، اپنی ہر زیادتی اور ظلم کے باوجود وہ مجھے پیارا ہے۔ چھوٹے سے ضدی بچے کی مانند ہے وہ میرے لئے جو میری ذرا سی نفرت پر بکھر کر ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔ جس شخص کو برسوں میرے دل نے ٹوٹ کر چاہا ہے کیا میں اسے خود موت کے منہ میں دھکیل سکتی ہوں اریشہ مگر کوئی مجھے سمجھ نہیں پا رہا۔ جو کھیل تقدیر ہمارے ساتھ کھیل چکی ہے اسے میں نے بالآخر تسلیم کر لیا ہے اسی لئے میں نے اشعر کو مایوس لوٹا کر اریج کو یہاں بلوا لیا ہے۔ وہ بہت اچھا ہے۔ بالکل کسی کانچ کی گڑیا کی طرح میرا خیال رکھتا ہے۔ اس نے مجھے مکمل کیا ہے اریشہ، میری ہر خامی کے باوجود مجھ سے محبت کرتا ہے مگر میں خود کو اس کی محبت کے قابل نہیں سمجھتی۔ وہ میرے قریب آتا ہے تو میں بالکل بے بس ہو کر رہ جاتی ہوں جب کہ میں اس کے سامنے بے بس ہونا ہی تو نہیں چاہتی اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟''

وہ واقعی خاصی پریشان دکھائی دے رہی تھی۔ اریشہ اپنی خوشی بھول کر اس کی ٹینشن میں الجھ گئی تھی۔ کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولی تھی۔

''نمی! تم نے پہلے بھی حماقتیں کی تھیں اور تم اب بھی نری حماقت کر رہی ہو۔ دیکھو میں مانتی ہوں کہ اشعر کو یکسر بھلا دینا فی الحال تمہارے بس میں نہیں ہے مگر تم اریج کو کس بات کی سزا دے رہی ہو اس نے آج تک جو بھی کیا ہے صرف اور صرف تمہارے پیار میں کیا ہے۔ پہلے اریج کی وجہ سے اشعر تم سے دور ہو گیا اور اب تم اشعر کی وجہ سے اریج کو خود سے دور کر دینا چاہتی ہو...... کیوں؟''

''آئی ڈونٹ نو اریشہ، مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی کہ میں کیا کروں۔'' بے بسی سے لب کاٹتے ہوئے وہ اپنا ہاتھ اریشہ سے چھڑا گئی تھی۔ اریشہ کو اس پر غصہ آ رہا تھا۔ تاہم وہ پیار سے بولی تھی۔

''پاگل پن کے مظاہرے مت کرو نمی، ایک عورت کے لئے اپنے شوہر کے پیار اور اپنے گھر کے سکون سے بڑھ کر اور کوئی چیز نہیں ہوتی۔ تمہارا مستقبل بھی اب اریج سے وابستہ ہے۔ لہٰذا تم صرف اسی کے متعلق سوچو اسے کیا اچھا لگتا ہے کیا نہیں لگتا اس چیز کی فکر کرو۔ اشعر اب تمہاری زندگی میں کہیں نہیں ہے اور نہ ہی ہو سکتا ہے۔ پھر اس کے لئے خوامخواہ خود کو کیوں ڈسٹرب کر رہی ہو۔ یاد رکھنا نمی، زندگی میں انسان ہر قدم محض اپنی خوشی کے لئے نہیں اٹھاتا بعض اوقات اسے خود سے وابستہ لوگوں کے لئے بھی جینا پڑتا ہے ان کی خوشیوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔''

سنجیدگی کے ساتھ کہتے ہوئے وہ اسے سمجھا رہی تھی اور تمکین کے اندر کی گھٹن جیسے ختم ہوتی جا رہی تھی۔

''نمی! دل آباد کرنا، گھر بسانے سے زیادہ مشکل ہوتا ہے لیکن ہماری ذرا سی حماقت یا لاپروائی سے اسی دل کو اجڑنے میں فقط ایک لمحہ لگتا ہے۔ کیا تم چاہتی ہو کہ مسکراہٹیں کبھی تمہارے ہونٹوں پر نہ کھلیں، وہ ایک شخص جس نے تمہیں عزت، مان، محبت سب کچھ عطا کیا ہے کیا تم اسے اس کے حصے کی تھوڑی سی خوشیاں بھی نہیں دے سکتیں؟''

کتنے بہتر انداز میں وہ اس کا احتساب کر رہی تھی۔ تمکین کے پاس جواب میں کہنے کے لئے ایک لفظ بھی نہیں رہا تھا۔

''دیکھو نمی! میں تم سے یہ نہیں کہتی کہ تم اریج سے عشق کرو۔ اس کے آگے پیچھے پھرو، ناز اٹھاؤ، لیکن اسے ایک بیوی کا پیار تو دے سکتی ہو ناں؟ تم خود کو ایک اچھی بیوی ثابت کرنے کی کوشش تو کر سکتی ہو ناں۔''

اریشہ کا ایک ایک لفظ اس کے دل میں پیوست ہو رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ تھوڑی ہی دیر میں اس کے واپس جانے کے بعد اس نے سنجیدگی سے خود اپنا احتساب کرنا شروع کر دیا تھا اور کتنی دلچسپ بات تھی کہ ہر موڑ پر وہی قصوروار ثابت ہوئی تھی۔

اسی روز رات میں اریج گھر واپس آیا تو وہ اس سے پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

''اریج میں نے آپ سے کچھ مانگا تھا۔''

اریج جو ٹی وی دیکھنے میں مشغول تھا اس کے سوال پر چونک اٹھا۔ بمشکل دو فٹ کے فاصلے پر بیٹھی بے چینی سے ہتھیلیاں مسلتے ہوئے وہ دل کے کتنی قریب محسوس ہو رہی تھی۔

''کیا؟'' جان بوجھ کر انجان بنتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔

جب وہ اپنی خوب صورت آنکھوں کو لبالب آنسوؤں سے بھرتے ہوئے بولی تھی۔

''ڈائیورس۔''

اس ایک لمحے میں اریج کا دل جیسے پھر سے کسی نے مسل ڈالا تھا۔ کس قدر بے یقینی سے تمکین کو دیکھ رہا تھا وہ جو اپنی خودداری اور پندار قائم رکھنے کے لئے خود بکھر جانے پر تلی ہوئی تھی۔ اریج کو اس لمحے اس پر بہت غصہ آیا تھا۔ تاہم وہ ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے سپاٹ لہجے میں بولا تھا۔

''کیوں چاہیے تمہیں مجھ سے ڈائیورس؟''

تمکین کی گردن اسکے سوال پر مزید جھک گئی تھی۔ آنسو ضبط کرنے کی کوشش کے باوجود اسکا لہجہ رندھ گیا تھا۔ بہت مشکل سے کہہ پائی تھی۔

''کیونکہ...... کیونکہ آپ کے اور اشعر کے بیچ یہی طے ہوا تھا آپ نے محض اسی کی خوشی کے لئے مجھے اپنایا تھا۔ میری محبت، میری عزت،

درمیان میں کہیں نہیں رہی۔'' سب کچھ سمجھنے اور مان لینے کے باوجود وہ بدگمانی سے ہاتھ نہیں چھڑا پا رہی تھی۔

''اوکے اگر آپ کی یہی سوچ اور ضد ہے تو یونہی سہی، میں زبانی طلاق دینے کی ہمت نہیں رکھتا۔ لہٰذا چند روز میں پیپرز تیار کروالوں گا۔ پھر آپ آزاد ہوں گی۔ جیسے چاہیں زندگی کو بسر کیجئے گا مگر پلیز اب دوبارہ اس موضوع پر ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہونی چاہیے۔'' سخت خفا ہوتے ہوئے وہ ٹی وی آف کر کے لیٹ گیا تھا۔

جب کہ تمکین یوں سن سی حیران بیٹھی رہ گئی تھی گویا اسے اپنی سماعتوں پر یقین ہی نہ آیا ہو وہ تو محض اس سے سرخروئی کی طالب تھی۔ اپنے پندار کی سلامتی چاہتی تھی۔ یہ سننا چاہتی تھی کہ اس نے اشعر کے لئے نہیں بلکہ خود اپنے دل کے لئے اسے اپنایا ہے مگر یہاں تو بازی ہی الٹ ہوگئی تھی۔ ایک دم سے بے قراری جیسے اس کی روح کو چھیدنے لگی تھی۔

☆☆☆

موسم خاصا سرد ہو رہا تھا لیکن وہ خود اپنے آپ سے بے نیاز بیٹھی جانے کن سوچوں میں الجھی ہوئی تھی کہ اسے ڈاکٹر فرحان کے بھاری بوٹوں کی آہٹ بھی سنائی نہ دے سکی۔ بہت دنوں سے وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ اس کی سوچ کے ہر زاویے پر پوری اتر رہی تھی۔ الجھی الجھی سی کم گو مگر زندگی کا بھرپور احساس دلاتی خوبصورت لڑکی۔ وہ چونکہ اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا لہٰذا اس وقت اسے بے حد ملول دیکھ کر وہ وہیں برآمدے کی سیڑھیوں پر اس کے قریب بیٹھ گیا تھا۔

''ہیلو، مانا کہ موسم بہت خوبصورت ہے مگر اتنا بھی نہیں کہ آپ خود اپنے آپ کو ہی فراموش کر بیٹھیں۔'' اس کے بھاری لہجے پر شہزین خان نے بے ساختہ چونک کر اس کی سمت نگاہ کی تھی۔ پھیکی سی مسکراہٹ اداس لبوں پر بکھیرتے ہوئے اس نے جیسے اپنا بھرم رکھنے کی کوشش کی تھی۔

''آپ کب آئے پتہ ہی نہیں چلا۔''

''پتہ کیسے چلتا، آپ یہاں تھیں ہی نہیں۔'' اس کے لب اب بھی مسکرا رہے تھے۔

شہزین خان نے ایک مرتبہ پھر محض مسکرانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

''شہزین! میں آپ کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا لیکن اتنا ضرور پتہ ہے کہ آپ نے اپنی مرضی سے پسند کی شادی کی جو ناکام ٹھہری۔ اب اس کی وجہ خواہ کچھ بھی رہی ہو مگر آپ کی اداسی کو دیکھ کر اکثر یہی محسوس ہوتا ہے کہ آپ اپنے ہسبینڈ کو کھو کر خوش نہیں ہیں کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟''

''نہیں۔'' طویل سرد آہ بھرتے ہوئے اس نے انکار میں ایک لمحہ نہیں لگایا تھا۔ ڈاکٹر فرحان کی آنکھوں میں بے ساختہ حیرانی پھیلی تھی۔

''میں اسے کھو کر ملول نہیں ہوں ڈاکٹر فرحان کیونکہ وہ میرا کبھی تھا ہی نہیں۔ اسے پانے کے لئے میں پاگل ہوئی تھی، وہ نہیں اسے جنونی میں نے بنایا تھا۔ میری محبت تھا وہ، اندھی محبت، اسی لئے خالی ہاتھ رہ گئی میں۔''

ازمیر کے بعد وہ دوسرا شخص تھا جس سے وہ اپنے دل کا حال کہنے کی جرأت کر پائی تھی۔ ڈاکٹر فرحان خاموش بیٹھا تھا اور وہ بتا رہی تھی۔

''وہ دھوکے باز تھا اس نے کبھی مجھے یہ بتانے کی کوشش نہیں کی تھی کہ وہ شادی شدہ ہے۔ دو بچوں کا باپ ہے، بہت بڑا چیٹر تھا وہ، محض میرے حسن اور دولت پر ریجھ گیا۔ میرے خالص جذبوں کے جواب میں اپنی جھوٹی محبت دان کرتا رہا۔ آپ ہی بتائیے کیا ایسے شخص سے الگ ہو کر

کوئی پچھتا سکتا ہے۔''اس سے زیادہ وہ جیسے خود کو سنا رہی تھی۔

''مجھے اس سے الگ ہونے کا کوئی دکھ نہیں ہے مسٹر فرحان کیونکہ میں جھوٹی چیزیں پسند نہیں کرتی تاہم میں اپنے بیٹے کے لئے افسردہ ہو جاتی ہوں اس کے مستقبل اور محرومیوں کا سوچ کر۔ میری نیندیں اڑ جاتی ہیں ابھی وہ بہت چھوٹا ہے، کسی بات کو نہیں سمجھتا لیکن کل کو جب وہ بڑا ہوگا تو کیا میں اسے سب کچھ سچ سچ بتا پاؤں گی؟''

وہ واقعی ڈسٹرب تھی۔

ڈاکٹر فرحان نے اس لمحے بغور اس کا چہرہ دیکھا تھا پھر نگاہ اوپر نیلے آسمان پر اڑتے بادلوں پر جماتے ہوئے بولا تھا۔

''محبت میں ہر انسان سے کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی موڑ پر کوئی نہ کوئی سنگین غلطی ہو ہی جاتی ہے لیکن ان غلطیوں کو سینے سے لگا کر نہیں رکھنا چاہیے شہزین، وگرنہ زندگی اپنا حقیقی حسن کھو دیتی ہے۔ ماضی میں آپ نے جو بھی اچھا برا کیا میں اس پر کچھ نہیں کہوں گا لیکن آپ کے مستقبل میں بھی اداسیوں کے بادل چھائے رہیں، ایسا میں بالکل نہیں چاہوں گی، اسی مقصد کے لئے میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔ امید ہے آپ میرے فیصلے کا مان ضرور رکھیں گی۔''

شہزین اس کے الفاظ پر بے طرح حیران ہوئی تھی۔ وہ غیر سنجیدہ نہیں تھا۔ تبھی وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

''کیسا فیصلہ؟''

''آپ کی شادی کر دینے کا فیصلہ۔'' انتہائی اطمینان سے اپنی بات کہہ کر وہ مسکرا دیا تھا۔ جب وہ اپنی جگہ سے تقریباً اچھلتے ہوئے بولی تھی۔

''وہاٹ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟''

''کچھ انہونی نہیں کہہ رہا۔ وہی بات کہہ رہا ہوں جو آپ کے لئے بہتر ہے۔''

''میں ایسا نہیں سمجھتی، مجھے اب اپنے لئے کچھ بھی نہیں سوچنا۔''

وہ از حد مضطرب ہو کر رہ گئی تھی۔ جب وہ بھی اس کے مقابل کھڑے ہوتے ہوئے بولا تھا۔

''آپ نہ سوچیں کوئی اور تو آپ کے بارے میں سوچ سکتا ہے ناں؟'' کیسے غیر متوقع الفاظ تھے اس کے۔ وہ اسے فقط حیرانگی سے دیکھتی رہ گئی تھی۔

''آپ کو پاکستان اچھا لگتا ہے ناں؟ تو پھر ہمیشہ کے لئے کیوں نہیں ٹھہر جاتیں یہاں؟'' پتہ نہیں وہ کیا سوچے ہوئے تھا۔ شہزین خان اس لمحے جیسے کچھ بھی کہنے کی پوزیشن میں نہیں رہی تھی۔ اسے خاموش پا کر ہی ڈاکٹر فرحان کا حوصلہ مزید بڑھا تھا۔

''شہزین میں آپ سے عشق کا دعوے دار نہیں ہوں لیکن آپ میری زندگی میں آنے والی وہ پہلی لڑکی ہیں جسے دیکھ کر میں نے خودکشی ٹھکانے لگنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں پاپا کا حال دیکھ کر یہ طے کیا تھا کہ کبھی کسی لڑکی کی محبت اور طلب کو اپنی ذات کی کمزوری بننے نہیں دوں گا، لیکن...... جب سے آپ کو دیکھا اور آپ کے بارے میں جانا ہے میرے ارادے کمزور ہو گئے ہیں۔ ایک ہم سفر کے لئے جو خاکہ کبھی میرے ذہن نے تراشا تھا آپ اس پر پوری اترتی ہیں میں آپ کو خوش رکھنے کے بلند و بالا دعوے نہیں کرتا تاہم اتنا ضرور کہوں گا کہ میری وجہ سے کبھی آپ کی

آنکھوں میں آنسو نہیں آئیں گے۔ میں اس باپ کا بیٹا ہوں شہرین جنہوں نے اپنی پوری زندگی محبت پر قربان کر دی۔'' پل دو پل کے لئے وہ سانس لینے کو رکا تھا جب شہرین لب کھولتے ہوئے بولی۔

''مگر میں اپنے بچے کے ساتھ......''

''ابھی میری بات مکمل نہیں ہوئی ہے۔'' سرعت سے اس کی بات کاٹتے ہوئے وہ پھر گویا ہوا تھا۔ شہرین خان اس کے سامنے ایک مرتبہ پھر کچھ نہیں کہہ سکی تھی۔

''میں جانتا ہوں تم اپنے بچے کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کرنا چاہتیں۔ میں خود بھی ایسا نہیں چاہتا شہرین محبت کی محرومی کیا ہوتی ہے یہ بھلا مجھ سے بہتر اور کون جان سکتا ہے جسے ماں باپ کے ہوتے ہوئے بھی کبھی ان کا پیار نہیں ملا۔''

اس کے لہجے میں عجیب سے دکھ کی کسک چھپتی صاف محسوس ہو رہی تھی۔ آپ اور تم کا فرق مٹ گیا تھا۔ اس بار شہرین خان نے بہت توجہ کے ساتھ اس کے افسردہ چہرے پر نگاہ کی تھی۔

''مجھے بچے بہت اچھے لگتے ہیں شہرین، چھٹکو تو ویسے بھی بہت پیارا سلجھا ہوا بچہ ہے۔ میں اس کے متعلق بھی قبل از وقت کوئی دعویٰ نہیں کروں گا۔ ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ اگر کبھی میرا رویہ تمہیں اس کے ساتھ سوتیلے باپ سا لگے تو تم مجھ سے اپنی راہیں الگ کرنے میں ایک سیکنڈ بھی نہ لگانا۔'' دوٹوک بردبار لہجے میں کہتا وہ اس کے ہر اعتراض کا گلہ گھونٹ رہا تھا۔

پچھلے دو ماہ میں اس نے بھی دیکھا تھا کہ وہ اور ازمیر کیسے چھٹکو کو ہتھیلی کا چھالہ بنائے ہوئے تھے۔ یقیناً اس سے بہتر شخص اسے کہیں اور نہیں مل سکتا تھا۔ تاہم اس سے پہلے کہ وہ اسے کوئی جواب دیتی نورینہ بیگم اسے ڈھونڈتے ہوئے وہیں لان کے قریب چلی آئیں۔ انہیں قریب دیکھ کر ہی فرحان نے خوشی سے مسکراتے ہوئے شہرین سے پوچھا تھا۔

''بتاؤ ناں شہرین' کیا آپ میری ظالم، جلاد ماں کی صبر آزما بہو بننا پسند کریں گی؟''

شہرین اس کے الفاظ پر دھیمے سے مسکرا کر سر جھکا گئی تھی۔ جب کہ حیران سی نورینہ بیگم نے فوراً معاملے کی تہہ تک پہنچتے ہوئے اس کا کان اپنی گرفت میں لے لیا۔

''کیا کہا ذرا پھر سے کہو، میں ٹھیک کرتی ہوں تمہیں۔'' ان کے اس انداز میں بھی پیار ہی تھا۔ تبھی ڈاکٹر فرحان کھلکھلا کر انہیں تمام صورت حال سے باخبر کرتے ہوئے پھر لاڈ سے اپنا سر ان کے کندھے پر ٹکا گیا۔ تو وہ بھی اپنے بیٹے کی خوشی پر دل سے مسکراتے ہوئے سامنے کھڑی شہرین سے پیار کرنے لگیں کہ ڈاکٹر فرحان کے لئے انہیں بھی ایسی ہی خوبصورت اور سمجھدار بہو کی ضرورت تھی۔

تو میرا درد جب بڑھاتا ہے
جانے کیا دل سکون پاتا ہے
عشق میں ہر اثاثہ لٹ جائے
تب کہیں جا کے ہوش آتا ہے

جو کسی کے ساتھ اچھا کرتا ہے، اس کے ساتھ بھی اچھا ہوتا ہے اور جو کسی کے ساتھ برا کرتا ہے اس کا اپنا بھلا بھی کبھی نہیں ہوتا۔ ماہم شاہ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ جس لڑکے کے ساتھ گھر سے بھاگ کر اس نے رسوائی مول لینا چاہی تھی؛ جس کی جھوٹی محبت کو پانے کے لئے وہ سارے خاندان کے سامنے ڈٹ گئی تھی، اسی لڑکے نے، شادی سے فقط پندرہ روز قبل اسے اصرار کر کے ہوٹل میں بلوالیا۔ اندھی محبت میں، خود بھی اندھی ہو کر وہ اپنے وقار کے ساتھ ساتھ عزت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی تو پہلی بار اسے اپنا چہرہ دنیا میں سب سے زیادہ بدصورت نظر آیا۔

فرزانہ بیگم، جنہوں نے ہمیشہ دوسروں کے کردار پر کیچڑ اچھالا تھا، ہر کسی کو دلی تکلیف ہی پہنچائی تھی، اس سانحے کے بعد یوں ٹوٹ کر بکھریں کہ انہیں کوئی سمیٹنے والا بھی نہ رہا تھا۔ انہیں کبھی احساس ہی نہیں ہو سکا تھا کہ جو لوگ خود بیٹی جیسی چیز رکھتے ہوں، انہیں کسی دوسرے کی بیٹی کے کردار پر حرف اٹھاتے ہوئے، صرف ایک لمحے کو سوچ لینا چاہیے کہ ان کی اپنی بیٹی کے ساتھ بھی کوئی سانحہ ہو سکتا ہے۔ اس افسوسناک سانحے کی خبر اڑتے اڑتے بے مثال کا میج تک بھی پہنچ گئی تھی، لہٰذا اریشہ کے سوا باقی سب لوگ فوراً ''شاہ ولاج'' چلے آئے تھے۔

ماہم شاہ نے عزت کی پامالی کے بعد خود اپنی ہی نگاہوں میں گرتے ہوئے خود کو آگ لگا کر خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی، تاہم اذہان نے اسے مرنے نہیں دیا تھا۔ بروقت پتہ چل جانے کے باعث وہ بچ تو گئی تھی مگر اس کا پورا چہرہ جھلس کر رہ گیا تھا۔ پورے ایک ہفتے ہسپتال میں ایڈمٹ رہنے کے بعد، وہ گھر واپس آئی تو اس کے اندر کی ماہم شاہ مرگئی تھی۔

ازمیر نے اس تمام صورت حال میں بھی اس کا خیال رکھا تھا، لیکن جب بھی وہ اس کے سامنے آتا، ماہم کرب سے پلکیں موند کر، چہرے پر کپڑا ڈال لیتی، یا پھر رخ موڑ کر لیٹ جاتی، اس کا یہ انداز ازمیر کو مزید ہرٹ کرتا تھا لہٰذا اس نے ماہم کے مقابل آنا ہی چھوڑ دیا۔

فرزانہ بیگم کا ابتر حال دیکھ کر اذہان سائلہ خان کو اپنانے کے لئے رضامند ہو گیا تھا۔ خواہ وہ کیسی ہی تھیں، مگر اس کی ماں تھیں اور ماں کے لئے ہر انسان خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی، پگھل کر موم ہو ہی جاتا ہے۔ ان کی زندگی کے لئے خوش رہنا لازمی تھا۔ لہٰذا اذہان نے خود سائلہ خان اور صالحہ بھابھی سے بات کر کے اسے اپنی زندگی کا ساتھی بنانے کا فیصلہ سنا دیا۔ صالحہ بھابھی ارسلان شاہ اور دیگر تمام گھر والوں کو بھی فرزانہ بیگم کے حال پر ترس آتا تھا۔ سارا سارا دن اپنے کمرے میں بند پڑی، وہ یا تو سوتی رہتی تھیں یا پھر رونے لگتی تھیں۔ انہیں حالات کے پیش نظر صالحہ نے اپنی بہن

سائلہ خان کی شادی اپنے دیور اذہان کے ساتھ کرنے کے لئے اپنے گھر والوں کے ساتھ ساتھ خود سائلہ خان کی بھی منت کی تھی۔ سائلہ خان چونکہ ازمیر کی طرف سے ہرٹ ہوئی تھی، لہٰذا اسے دکھانے کے لئے اس سے بہتر لڑکا بھی اس کی چاہ رکھتا ہے، اذہان کا پرپوزل قبول کر لیا تھا۔

اس روز سائلہ "شاہ ولاج" کی طرف آئی ہوئی تھی۔ ماہم شاہ کے کمرے میں، اس کا حال احوال دریافت کرنے کے بعد اچانک اس نے پوچھا تھا۔

"ماہم! ایک سوال پوچھوں، سچ سچ جواب دو گی؟"

"ہاں پوچھو......" اپنے بدصورت چہرے کو اب بھی اس نے دوپٹے سے ڈھانپ رکھا تھا۔

"ماہم! میں نے آپی سے سنا ہے، ازمیر تمہاری اس حالت کو دیکھ کر بہت ڈسٹرب ہے، وہ بیرونِ ملک لے جا کر تمہارا علاج کروانا چاہتا ہے، تمہارا ابارشن کروانے میں بھی اسی کی کوشش پیش پیش رہی ہے، وہ پھر سے تمہیں، تمہاری ذات کا غرور لوٹانا چاہتا ہے، جبکہ......تم نے ہمیشہ اس سے نفرت کی ہے، دشمنی نبھائی ہے، صرف اسی کی ذات، تمہارے عتاب اور سازشوں کا شکار رہی ہے، کیوں ماہم......؟ ایک طرف اس کی اتنی اچھائی کہ اس نے تمہاری تمام تر سازشوں سے باخبر ہونے کے باوجود کبھی تم سے گلہ تک کرنا گوارہ نہیں کیا، اور دوسری طرف، تمہاری نفرت اور برائی کی کوئی حد ہی نہیں، آخر کیوں؟ محض ازمیر کی کم صورتی تو اس کا سبب ہرگز نہیں ہو سکتی۔" وہ اس سے ایسا سوال بھی کرے گی' ماہم شاہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ آج تک کسی نے اس سے یہ سوال نہیں کیا تھا۔ وہ کسی کو اس کا جواب پہلے دے بھی نہیں سکتی تھی۔ تاہم اب صورت حال مختلف تھی۔ اب اپنے اندر کا غبار' کسی صورت باہر نکال کر سکون پانا، اس کی طلب بن گیا تھا، لہٰذا ایک طویل سرد آہ بھرنے کے بعد وہ بہت شکستہ لہجے میں بولی تھی۔

"میں ازمیر بھائی سے اتنی نفرت کیوں کرتی ہوں' یہ سوال تم سے پہلے کبھی کسی نے مجھ سے پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی؟ کسی نے مجھ سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ میں نے اریشہ کے بعد' تمہیں بھی اس سے الگ کرنے کی کوشش کیوں کی؟ کیوں کسی کے ساتھ اسکی وابستگی مجھے اچھی نہیں لگتی۔ کیوں میں اسے خوش نہیں دیکھ سکتی۔ تم نے پوچھا ہے کہ اس کی تمام تر مہربانیوں کے جواب میں، میں اس سے بری بن کر پیش کیوں آتی ہوں۔ کیوں نفرت کا مظاہرہ کرتی ہوں' اس لئے کیونکہ میں......میں خود بھی اس سے بے پناہ محبت کرتی ہوں۔ سائلہ بہت زیادہ محبت کرتی ہوں' میں اس سے۔"

کتنا عجیب لہجہ تھا اس کا' جس میں کوئی احترام نہیں تھا۔ سائلہ خان اس لمحے بے ساختہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھی۔

"وہاٹ......یہ کیا کہہ رہی ہو تم......؟" وہ شاکڈ ہی تو رہ گئی تھی اس کے اس انکشاف پر۔ تاہم ماہم شاہ نے اس کے حیران چہرے کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ اپنے ہی حال میں مدہوش، وہ اب رو رہی تھی۔

"یہی سچ ہے سائلہ، جتنی محبت ازمیر شاہ سے ماہم شاہ نے کی ہے، اتنی محبت شاید کبھی کوئی لڑکی، کسی لڑکے سے نہ کر سکے۔"

کتنا مدھم لہجہ تھا اس کا، مگر خاموش کھڑی سائلہ خان کے اندر جیسے دھماکے اٹھ رہے تھے۔ نفرت کے لبادے میں لپٹی، محبت کا انکشاف اسے حقیقتاً حیران کر گیا تھا۔ اب ماہم شاہ اسے بتا رہی تھی۔

"یہ بہت پہلے کی بات ہے سائلہ، اس وقت مجھے ٹھیک سے شعور بھی نہیں آیا تھا، جب ایک روز میں یوں ہی کھیلتے کھیلتے گر پڑی تھی، اس

وقت میرے دونوں بھائی پاس ہی کھیل رہے تھے، جبکہ ازمیر کچھ فاصلے پر داداجی کے پاس بیٹھا تھا، میرے گر جانے پر، میرے بھائی ہنسے تھے مگر اس نے دوڑ کر، لپکتے ہوئے نہ صرف مجھے زمین سے اٹھایا تھا، بلکہ اپنے کرتے سے میری چھلی ہوئی کلائی کا زخم صاف کر کے وہ مجھے گھر کے اندر بھی لایا تھا۔ میری تکلیف کو کم کرنے کے لئے اس نے مجھے اپنے کھلونے اور ٹافیاں بھی دی تھیں، اسی روز سے میں اس کی ذات سے اٹیچ ہوگئی تھی، اسے صرف اپنی جاگیر سمجھنے لگی تھی، بہت عجیب ہوتا ہے کچے ذہن کا پیار، دل سے نکلتا ہی نہیں......''

اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئی تھیں۔

سائلہ خان کو اس کا حال بڑا عجیب لگ رہا تھا۔ تاہم اس نے اسے درمیان میں ٹوکا نہیں تھا۔

''وہ صرف میرا تھا سائلہ مگر...... اریشہ خان نے اچانک شاہ ولاج میں آکر اسے مجھ سے چھین لیا۔ پہلے میں اسے برا نہیں سمجھتی تھی، وہ اکثر پھوپھو کے ساتھ ہمارے گھر آکر ازمیر سے کھیلتی رہتی تھی، داداجی اور دادی ماں سے لاڈ اٹھواتی رہتی تھی، مگر پھوپھو جب اپنا گھر چھوڑ کر مستقل ''شاہ ولاج'' میں رہنے کے لئے چلی آئیں تو مجھے اریشہ سے چڑ ہوگئی، کیونکہ ازمیر اب میری نہیں، اس کی پرواہ کرنے لگا تھا۔ انہی دنوں اس کی مما اور پاپا کے درمیان جھگڑا ہوگیا، لہٰذا حائقہ چاچی شاہ ولاج سے چلی گئیں۔ ازمیر نے اس بات کا بہت اثر لیا تھا، وہ از حد حساس اور اذیت پسند ہو رہا تھا، میں ان حالات میں اس کے کام آنا چاہتی تھی، مگر یہاں بھی اریشہ نے مجھے پیچھے دھکیل دیا تھا، کبھی اس کے لئے کھانا لے جاتی، کبھی اس کے پاس بیٹھی اس کا سر دباتی، وہ مجھے سخت زہر لگتی تھی، لہٰذا اپنے اندر کا غصہ نکالنے کے لئے میں نے اریشہ کے ساتھ ساتھ ازمیر کو بھی پریشان کرنا شروع کر دیا، اور یوں میں خود ہی اس سے دور ہوتی چلی گئی، وہ اچھی تعلیم کی غرض سے بیرون ملک چلا گیا، تو میرا دل یہ سوچ کر مطمئن ہوگیا کہ اب اریشہ بھی اس سے دور رہے گی، اسی سوچ کے باعث میں ہر روز اسے کال کرنے کی کوشش کرتی، اور رات میں گھنٹوں اذہان بھائی کی منت کر کے، اس کے کمپیوٹر کو استعمال میں لاتے ہوئے اسے بیسیوں ای میل کرتی مگر وہ کبھی ڈھنگ سے بات کرنا گوارہ نہ کرتا اس کی یہ بے نیازی مجھے تکلیف سے ہمکنار کر رہی تھی لہٰذا ایک روز ای میل کے تھرو، میں نے اپنا دل اس پر کھول کر رکھ دیا۔ مگر اس نے یہاں بھی مجھے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ وہ کبھی میرا نہیں ہوسکتا، نہ ہی مجھ سے پیار کر سکتا ہے، کیونکہ وہ کسی اور کی زلف کا اسیر ہے، میں نہیں جانتی کہ یہ ''کسی اور'' اس نے کس کو کہا تھا، مگر اتنا ضرور جانتی ہوں کہ ازمیر کے ہاتھوں ٹھکرائے جانے کے بعد، میں بہت روئی تھی، میرے اندر اپنے جذبوں کی تذلیل پر ایک عجیب سی آگ لگ گئی تھی، اسی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے اگلے ہی ای میل میں، میں نے اس کا خوب مذاق اڑاتے ہوئے لکھا تھا۔ ''بہت خوب'' کسی خوش فہمی میں مت رہنا، ازمیر صاحب، میں تو صرف آپ کا کریکٹر چیک کر رہی تھی ورنہ کہاں آپ اور کہاں میں...... مائنڈ مت کیجئے گا مگر یہی سچ ہے کہ آپ سے، آپ جیسی کوئی کالی، پیلی شکل کی لڑکی ہی محبت کر سکتی ہے ماہم شاہ جیسی خوبصورت لڑکی نہیں۔'' اس نے میرے ای میل کے جواب میں کچھ نہیں لکھا تھا، لیکن میں جانتی تھی کہ وہ ہرٹ ہوا ہے، اور اس تصور نے، یقین مانو سائلہ مجھے بہت قرار دیا تھا، میں جواب تک جلتی رہی تھی۔ ہرٹ ہوتی رہی تھی اب اسے بھی اسی تکلیف سے ہمکنار کر کے بہت پرسکون ہوگئی تھی۔ اپنے ٹھکرائے جانے کا انتقام لینے کے لئے ہی میں اسے قدم قدم پر ہرٹ کرتی رہی تھی مگر...... اس نے ہمیشہ میری بدتمیزیوں پر چپ رہ کر مجھے مزید سلگایا، میرے علاوہ اس سے کوئی خوبصورت لڑکی محبت کرے، میں یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی،

لہٰذا پہلے اریشہ کو اس سے دور کیا، اور پھر تمہیں، لیکن...... کتنی عجیب بات ہے سائلہ کہ نفرت اور ضد کے اس کھیل میں، ہر لمحہ جل جل کر بھی ہار میرا ہی مقدر بنی، اس پر تو کبھی کوئی آنچ نہیں آئی، لیکن یہاں میں اپنا سب کچھ گنوا بیٹھی۔"

ضبط کے بند ایک دم سے ٹوٹے تھے اور اس نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونا شروع کر دیا تھا۔ سائلہ خان اس لمحے اگر آگے بڑھ کر اسے اپنی بانہوں میں نہ سمیٹتی تو یقیناً وہ سچ مچ بکھر کر رہ جاتی۔

"وہ اتنا اچھا کیوں ہے سائلہ...... کیوں میری نفرت کے جواب میں نفرت نہیں کرتا مجھ سے، کیوں نہیں الجھتا میرے ساتھ، کیوں درگزر سے کام لیتا ہے وہ۔" اس کا ذہنی توازن نارمل نہیں رہا تھا۔ تبھی وہ گھٹی گھٹی آواز میں چلا رہی تھی۔ تاہم اس سے پہلے کہ سائلہ خان اس سے کچھ کہتی، ازمیر دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر اندر چلا آیا۔

"السلام علیکم......"

اسے دیکھتے ہی سائلہ خان اٹھ کھڑی ہوئی تھی، جواب میں اسے سلام کرتا، وہ وہیں ماہم کے بیڈ کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ سائلہ خان اس کے سلام کا جواب دینے کے بعد اگلے ہی لمحے ایکسکیوز کرتی چپ چاپ کمرے سے نکل گئی تھی۔

"مجھے تم سے بات کرنی تھی ماہم، تمہیں میرا یوں اپنے کمرے میں آنا برا تو نہیں لگا۔" سائلہ خان کے جانے کے بعد وہ اس کی طرف متوجہ ہو کر بولا تھا۔ جواب میں ماہم نے سرعت سے اپنی آنکھیں صاف کر ڈالیں۔

☆☆☆

انجشاء صحن میں وائپر پھیر رہی تھی، جب عدنان اپنی وہیل چیئر کو گھسیٹتا ہوا اپنے کمرے سے باہر نکلا تھا۔

''مجھے آفس جانا ہے انجو، تیار ہونے میں مدد دو گی۔''

پچھلے ایک ہفتے سے نور العین اس کی ہیلپ کر رہی تھی، اسے کمپنی دے رہی تھی۔ اسی کے ساتھ وہ لنچ اور ڈنر کرتا تھا، اگر وہ نہیں آتی تھی تو وہ خود بھی بھوکا بیٹھا رہتا تھا۔ سیال بیگم اور احمد رؤف صاحب نے کئی بار اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی، مگر وہ اپنے معاملے میں کسی کی نہیں سن رہا تھا۔ انجشاء اگر اس کا کوئی کام کرنے کی کوشش کرتی تو وہ سہولت سے منع کر دیتا۔ وہ بلا ضرورت اسے اپنے کمرے میں آنے کی اجازت بھی نہیں دے رہا تھا۔ نور العین ہی اس کا کمرہ سنوارتی تھی۔ آفس بھی اسی نے سنبھالا ہوا تھا۔ وہی عدنان کی وہیل چیئر گھسیٹ کر اسے روم سے باہر لاتی تھی۔

انجشاء بہت زیادہ دن تک یہ سب برداشت نہیں کر پائی تھی، لہٰذا کل رات وہ بالآخر اس پر اپنے احساسات آشکارہ کر گئی تھی، جواب میں عدنان صبح ہوتے ہی پھر رات کی طرح مہربان دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بے طرح خوش ہو کر اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

''ہاں......کیوں نہیں ناشتہ کرو گے......؟''

''کر لوں گا......اگر تم کرواؤ گی تو......'' بدلے بدلے تیور اور لہجے کے ساتھ وہ اسے بے حد اچھا لگ رہا تھا۔

اس کی اجازت کے بعد وہ فوراً اس کا ناشتہ ٹرے میں سجا کر لے آئی تھی

''میں نے آج پراٹھا بنایا ہے تمہارے لئے، تمہیں اچھا لگتا ہے ناں پراٹھا؟ یہ آملیٹ بھی بنایا ہے اور دیکھو آج اس میں نمک بالکل تیز نہیں ہے، پھر بھی اچھا نہ لگے تو دہی استعمال کر لینا......میں کچھ بھی تیار کرنا نہیں بھولی۔''

اس لمحے اس کے چہرے پر جو رنگ تھے وہ حقیقی معنوں میں عدنان کو سرشار کر گئے تھے۔ اس کے حصول کے لئے جتنی تکلیفیں اس نے اٹھائی تھیں، اس ایک لمحے میں ہی جیسے ان تمام تکلیفوں کا ازالہ ہو گیا تھا۔

یہ تصور ہی کتنا دل نشین تھا کہ وہ اسے محبت کرتی ہے۔ جس لڑکی کو پانے کے لئے اس نے اپنا آپ داؤ پر لگا دیا تھا، اسی لڑکی کی سچی محبت بالآخر اسے نصیب ہو گئی تھی، لہٰذا وہ سرشار نہ ہوتا تو کیا کرتا؟

انجشاء اس کی فرمائش پر خوشی خوشی لقمے توڑ کر اس کے منہ میں ڈال رہی تھی، جب نور العین کی گاڑی کا مخصوص ہارن بجا اور وہ کچھ ہی لمحوں میں ٹک ٹک کرتی گھر کے اندر چلی آئی۔

''السلام علیکم کیسے، ہو عدنان......؟'' خوبصورت لبوں پر مخصوص دوستانہ مسکراہٹ پھیلائے اس نے پوچھا تھا، جب وہ اطمینان سے بولا۔

''الحمد للہ اینڈ وعلیکم السلام! فی الحال بہت بہتر ہوں آگے کا کچھ پتہ نہیں۔''

انجشاء نور العین کی آمد پر خاموش ہی رہی تھی۔

''لاؤ، میں ناشتہ کروا دیتی ہوں عدی کو، تم کوئی اور کام کر لو۔'' اس بار وہ انجشاء سے مخاطب ہوئی تھی۔ جو اس کے الفاظ پر شدید تپتے ہوئے فوراً ہی سلگ کر بولی تھی۔

''شکریہ......عدنان میری ذمے داری ہیں اور میں اپنی ذمہ داری خود نبھانا زیادہ پسند کرتی ہوں۔''

''ویل......میں نے تو آپ کی ہیلپ کے خیال سے کہا تھا۔'' نور العین اس کے جواب پر قدرے کھسیا کر کنفیوز ہوتے ہوئے بولی تھی، جب اس نے پھر کہا۔

''بہت شکریہ، مگر مجھے آپ کی مزید ہیلپ درکار نہیں ہے۔''

''کوئی بات نہیں' آپ ناشتہ کروائیں، جب تک میں عدی کا کمرہ صاف کر لیتی ہوں۔'' انجشاء کے بدلے ہوئے تیوروں سے خائف ہو کر، اس نے فوراً عدنان کے کمرے کا رخ کرنا چاہا تھا، جب وہ سلیقے سے اسے منع کرتے ہوئے بولی تھی۔

''اس کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے' میں نے کہا ناں، میں اپنے شوہر کی ہر ذمہ داری بخوشی نبھا سکتی ہوں۔'' نور العین کو اس کے الفاظ پر کرنٹ لگا تھا، جبکہ عدنان کا دل اس کے اعتراف پر مزید ہلکا پھلکا ہو گیا۔

''ایم سوری نور، آپ نے ان کے لئے جو کچھ بھی کیا، میں اس کے لئے آپ کی مشکور ہوں، لیکن مجھے مزید آپ کی مدد نہیں چاہئے، آپ کا اپنا وقت بھی بہت قیمتی ہے، لہٰذا آپ اپنا کام کیجئے انہیں میں خود سنبھال سکتی ہوں۔'' خالص بیویوں والے انداز اپنائے وہ کہہ رہی تھی اور عدنان خوش دلی سے مسکرا رہا تھا۔ کتنا اچھا لگ رہا تھا اس کا یہ اپنا پن۔

''او کے' گاڈ بلیس یو عدی، لندن سے کل ہی پاپا کی کال آئی ہے، وہ مجھے واپس بلوانا چاہتے ہیں، صرف تمہاری وجہ سے میں نے انہیں انکار کر دیا تھا، مگر......میرا خیال ہے مجھے واپس چلے جانا چاہئے، کیونکہ تمہاری وائف تمہیں مجھ سے بہتر کمپنی دے سکتی ہے۔'' وہ انجشاء اور عدنان کے بیچ تعلق سے بے خبر تھی، لہٰذا انجشاء کے جتانے پر مائنڈ کئے بغیر اپنا بھرم رکھتے ہوئے بولی اور کچھ دیر مزید ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد واپس چلی گئی۔

''چچ، چچ، چچ تم بہت بدتمیز ہو انجو، وہ بیچاری صرف میری دوستی کی وجہ سے سب کچھ کر رہی تھی۔'' اس کے جاتے ہی عدنان نے قدرے ملامتی لہجے میں کہا تھا، جواب میں وہ اس کے سر ہو گئی۔

''چپ رہو تم، تمہاری لڑکیوں سے دوستی کو خوب اچھی طرح جانتی ہوں میں۔ کان کھول کر سن لو تم، اگر مزید کسی لڑکی سے تمہارا چکر سامنے آیا ناں، تو میں تمہارا سر توڑ دوں گی۔''

''او کے، ٹانگیں تو تم پہلے ہی توڑ چکی ہو اب یہ خواہش بھی پوری کر لینا۔'' قطعی معصومانہ انداز اپناتے ہوئے اس نے کہا تھا جواب میں انجشاء اسے گھور کر دیکھتی ہوئی پھر سے کچن کی طرف بڑھ گئی۔

عدنان کو ناشتہ کروانے کے بعد اس نے سیال بیگم اور احمد رؤف صاحب کو بھی ناشتہ کروا دیا تھا۔

عدنان ناشتے کے بعد آئینے کے سامنے بیٹھا، اپنے بال سنوار رہا تھا، جب وہ اس کے کمرے کی صفائی میں جت گئی۔ اس کی وارڈ روب سیٹ کر کے، بستر جھاڑا، کمبل سمیٹا، پھر رائٹنگ ٹیبل پر بکھری کتابیں سمیٹ کر سلیقے سے رکھیں، تب تک عدنان خود کو تیار کر چکا تھا، لہٰذا وہ ستائشی نگاہوں

سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ ہی منٹ میں خود بھی تیار ہو کر، سیال بیگم کو انفارم کرنے کے بعد اس کے ساتھ ہی آفس کے لئے نکل آئی۔

بہت دنوں کے بعد اسے عدنان کے ساتھ آفس میں دیکھ کر تقریباً تمام ورکرز نے ہی خوشی کا اظہار کیا تھا۔ آفس منیجر کی معرفت عدنان کو پتہ چلا تھا کہ انجشاء نے اس کی ڈوبتی ہوئی کمپنی کو کیسے سنبھالا، کیسے کرپٹ ورکرز کا احتساب کر کے انہیں کمپنی سے باہر کیا، قل ٹائم کھانا پینا، آرام کرنا بھول کر اپنی ذہانت اور محنت سے کیسے اس کے ڈوبے ہوئے بزنس کو دوبارہ اسٹیبلش کیا۔ وہ اس پر جتنا فخر کرتا کم تھا۔ تاہم اس نے اب بھی اپنی زبان کو خاموشی کے قفل ہی لگائے رکھے تھے۔

سیال بیگم اور احمد رؤف صاحب، انجشاء سے بہت خوش تھے کیونکہ وہ ان کی بھرپور خدمت کر رہی تھی۔ اس نے بیک وقت گھر اور آفس دونوں سنبھال کر ثابت کر دیا تھا، کہ وہ کتنی ٹیلنٹڈ لڑکی ہے۔

روزمرہ مصروفیت کے ساتھ ساتھ وہ عدنان کو بھی پورا ٹائم دے رہی تھی۔ اسے صبح نیند سے جگانا، باہر کی سیر کروانا، ناشتہ کرانا، آفس کے لئے تیار ہونے میں مدد دینا، رات کو دیر تلک اس کے پاس بیٹھ کر اس سے ادھر ادھر کی ڈھیروں باتیں کرنا، ڈیلی چیک اپ کروانا، سب اس نے روٹین کا حصہ بنالیا تھا۔

پچھلے کچھ دنوں سے وہ اسے وہیل چیئر سے اٹھا کر، اپنی بانہوں کے سہارے لان میں پیدل واک بھی کروا رہی تھی، عدنان اس کی اس درجہ ریاضت و قربت پر بے حد مسرور تھا۔ اسے ستانے کی خاطر، اکثر وہ چلتے چلتے اپنے بھاری بھرکم وجود کا بوجھ، اس کے نازک سے کندھوں پر ڈال دیتا، اور بے چاری لڑکھڑا کر رہ جاتی۔ گزرتے ہر دن کے ساتھ اس کا دل بے ایمان ہوتا جا رہا تھا۔ لہٰذا اس نے سیال بیگم اور احمد رؤف صاحب پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کہ وہ جلد از جلد انجشاء کی رخصتی کی تقریب ارینج کر کے، اسے مکمل طور پر اس کی دسترس میں دے دیں۔ سیال بیگم نے اس سلسلے میں انجشاء کی رضامندی کے بعد بالآخر شادی کی تقریب کا اعلان کر دیا تھا۔

مارے خوشی کے عدنان کے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ انجشاء خود بھی دل سے بے حد مسرور تھی۔ اس نے تمکین اور اریشہ سے اپنے غلط رویئے کی معافی مانگ کر انہیں بھی اپنی خوشیوں میں شریک کر لیا تھا۔ مگر...... شادی کے فقط تین دن پہلے عدنان نے بیرون ملک رخصتی کا فیصلہ سنا کر اس کے تمام ارمانوں پر پانی پھیر کر رکھ دیا۔ خوشیاں اس کی دہلیز پر دستک دینے سے قبل ہی واپس مڑ گئی تھیں۔

☆☆☆

چھٹی کا دن تھا اور اریج ٹی وی لاؤنج میں بیٹھا تھا۔

کل رات ہی وہ لوگ ''احسن ولاج'' سے ''احمد پیلس'' شفٹ ہوئے تھے۔ پچھلے کئی روز سے اسے تمکین کچھ بدلی بدلی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ جو ہمہ وقت اپنے حال سے بے نیاز، عام سے حلیئے میں رہتی تھی، اب خود پر کافی توجہ دینے لگی تھی۔ گھر کا سارا کام بھی، ملازمہ کی مدد کے بغیر وہ اکیلی سنبھال رہی تھی۔ اریج کے تمام چھوٹے موٹے کام بھی اس نے اپنے ذمے بناء کہے لے لئے تھے۔ وہ آفس میں مصروف ہوتا تو تمکین کھانا بنانے کے بعد، زبردستی اسے فون کر کے گھر بلوا لیتی تھی۔ اریج کو اس کی دہری پالیسی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ایک طرف وہ اس سے ڈائیورس لینے کو

بے چین تھی تو دوسری طرف اسے مزید اپنا عادی بنا رہی تھی۔ دن بہ دن وہ جیسے الجھتا جا رہا تھا۔

اس وقت بھی وہ صفائی میں جتی ہوئی تھی اور اریج کن انکھیوں سے اسے کام کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ زندگی ایک دم سے بامقصد ہوگئی تھی۔ اپنے اور تمکین کے درمیان سے اشعر کے نکل جانے کے بعد وہ ایک دم سے ہلکا پھلکا ہوگیا تھا۔ اب اسے کوئی احساس محرومی نہیں رہا تھا' کیونکہ اللہ نے ماں کی ممتا کے ساتھ ساتھ اس کی محبت بھی اس کی جھولی میں ڈال دی تھی، لہٰذا آج کل وہ پانچوں وقت کی نماز باقاعدگی سے ادا کر رہا تھا۔

''اریج...... یہ کچھ چیزیں ختم ہوگئی ہیں' پلیز ابھی لا دیجئے، مجھے دوپہر کا کھانا بنانا ہے۔''

وہ اسی کے خیالوں میں گم تھا، جب وہ ہاتھ میں ایک چھوٹی سی پرچی لئے اس کے قریب چلی آئی۔ مکمل بلیک کاٹن کے سوٹ میں ملبوس، اپنے گھنے لمبے بالوں کو کلپ میں مقید کیے، وہ سادہ سے حلیے کے باوجود بے حد اچھی لگ رہی تھی۔ وہ اس پر کتنی دیر تک نگاہ جمانے کے باوجود بھی سیر نہیں ہوا تھا۔ تمکین اسے چٹ تھمانے کے بعد واپس پلٹ کر کچن میں گھس گئی تھی۔ تب اس نے سرسری سی ایک نظر اس کی چٹ پر ڈالی تھی۔

''دو کلو آلو، ایک کلو پیاز، آدھا کلو چکن، دو کلو چاول، کسٹرڈ، نوڈلز، اور بھی کئی چھوٹی موٹی چیزیں تحریر تھیں، وہ پرچی پڑھ کر بے ساختہ مسکرایا تھا۔

تقریباً پون گھنٹے کے بعد وہ واپس آیا تمکین آٹا گوندھ رہی تھی۔ تمام چیزیں اچھی طرح اسے چیک کروانے کے بعد وہ وہیں بیٹھ کر خود پیاز کاٹنے لگا تھا۔ تمکین اسے منع کرنا چاہتی تھی لیکن پھر کچھ سوچ کر وہ خود سالن کی تیاری میں مصروف ہوگئی۔ ابھی اس نے چکن صاف کر کے، گیس پر رکھا ہی تھا کہ ایک دم سے اس کا دل خراب ہونے لگا۔

وہ اپنی خراب طبیعت کو نظر انداز کرنا چاہتی تھی مگر اچانک اسے متلی شروع ہوگئی اور وہ اریج کے سامنے ہی منہ پر ہاتھ رکھ کر کچن سے باہر بھاگ گئی تھی۔ اریج اسے یوں بھاگتے دیکھ کر پہلے حیران ہوا تھا، پھر اپنا کام چھوڑ کر فکرمندی سے اس کے پیچھے لپکا۔ وہ واش بیسن پر جھکی، قے کر رہی تھی، تبھی وہ اس کے قریب آیا تھا۔

''نو آر یو او کے۔''

''ہاں۔'' اثبات میں سر ہلاتے ہوئے تمکین نے فوراً اپنا چہرہ دھو ڈالا تھا۔ جو تبدیلی اس کے وجود میں رونما ہو رہی تھی وہ اس سے بے خبر نہیں تھی، تاہم فوری طور پر اریج کو باخبر کرنے کی سوچ بھی نہیں تھی اس کی، جو کریش ان دونوں کے بیچ چل رہا تھا، اس میں ایسی خبر کوئی معنی نہیں رکھتی تھی، لہٰذا وہ بے پناہ مسرور ہو کر بھی خاموش تھی۔

''ڈاکٹر کے پاس چلیں۔'' اریج کا خیال تھا شاید زیادہ کام کی وجہ سے اس کی طبیعت بگڑ گئی ہے۔ تاہم اس نے سہولت سے منع کرتے ہوئے کہہ دیا تھا۔

''نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے، شاید ڈسٹنگ کی وجہ سے دل خراب ہوگیا ہے۔''

اریج نے قطعی بے چارگی سے اس کا عذر قبول کیا تھا۔

''او کے تم جاؤ کمرے میں آرام کرو، میں خود ہی کر لیتا ہوں کچھ۔''

وہ خود بھی دوبارہ کچن میں جانا نہیں چاہ رہی تھی، چکن اور دیگر اشیاء کی خوشبو سے ہی اس کا دل خراب ہو رہا تھا۔ لہٰذا اس کے حکم پر چپ چاپ اپنے بیڈ روم میں چلی آئی۔

بیتے ہوئے کچھ سنہری لمحوں کی یادیں یونہی فراغت میں ذہن کے دریچوں میں آ کھڑی ہوئیں تو وہ بے ساختہ رو پڑی۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ کیسے وہ اور اشعر ایک دوسرے کے لئے بے تاب رہا کرتے تھے، اس کی دیوانگی، اس کی وارفتگی کچھ بھی تو بھلائے جانے کے قابل نہیں تھی، لیکن پھر اچانک ہی جب اس کی بے وفائی اور اپنی بربادی کا لمحہ یاد آیا تو اس کا دل اشعر کے تصور سے بھی بھاگنے لگا تھا۔ وہ سمجھتی تھی شاید زندگی اشعر کے سنگ بیتے لمحوں کا نام ہی ہے، مگر اب جبکہ وہ تخلیق کے مرحلے سے گزر رہی تھی، جب مکمل ہو گئی تھی تو اچانک اس کا پاگل دل، اریج کی آنکھوں میں زندگی تلاشنے لگا تھا۔ وہ جو کانچ کی گڑیا کی طرح اس کا خیال رکھتا تھا، اب اپنے لاپرواہ انداز سے اس کے اندر کا کانچ ہی کانچ بکھیرتا جا رہا تھا۔ مختلف سوچوں کے گرداب میں الجھی وہ کب نیند کی وادی میں اتر گئی اسے خبر ہی نہ ہو سکی۔

دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو شام کے دھندلکے گہرے ہو رہے تھے اور اریج کہیں نہیں تھا۔

سر الگ بھاری بھاری ہو رہا تھا۔ بمشکل اٹھ کر اس نے شاور لیا اور کمرے سے باہر چلی آئی۔ موسم بے حد خوشگوار تھا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ لہٰذا وہ سست روی سے چلتی ہوئی لان میں ہی آ بیٹھی۔ کچھ پودوں کا حال بہت خراب تھا۔ پچھلے کئی دنوں سے وہ لان کی صفائی بھی نہیں کر سکی تھی۔ تبھی کچھ پودے مرجھا کر لٹک گئے تھے۔ آج کل اس کا دل بے حد خراب رہنے لگا تھا۔ دل چاہتا تھا بس ہر وقت سوئی رہے مگر اس کے باوجود، وہ خود کو کسی نہ کسی کام میں لگائے رکھتی تھی۔

اس وقت بھی اس نے پکا ارادہ کیا تھا کہ کل پہلی فرصت میں وہ لان کی صفائی کرے گی۔ جانے کب تک وہ وہیں لان میں بیٹھی رہتی کہ اچانک بارش شدت اختیار کر گئی۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی کی جگہ اب موٹے موٹے قطرے زمین پر گرنے لگے تھے۔ لہٰذا وہ جلدی سے اٹھ کر اندر لاؤنج میں چلی آئی۔

بارش کی شدت کے ساتھ ہی بجلی کی گرج چمک کا سلسلہ شروع ہوا تو ہمیشہ کی طرح وہ سہم کر رہ گئی۔ یہ موسم ہمیشہ ہی اسے خوف زدہ کر کے رکھ دیتا تھا۔ لہٰذا وہ دبک کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے مختلف قرآنی آیات کا ورد کرنے لگی۔ ساتھ ہی ساتھ دل سے اریج کے جلدی واپس آنے کی دعائیں بھی مانگ رہی تھی، مگر ایک ایک منٹ گزرتا چلا گیا۔ نہ ہی موسم کی شدت میں کوئی فرق آیا اور نہ ہی اریج گھر واپس لوٹا، لائٹ بھی اچانک چلی گئی تھی جس کی وجہ سے اس کا خوف مزید بڑھ گیا تھا۔ سیل بھی اس کے پاس نہیں تھا۔ لہٰذا مارے بے بسی کے وہ گھٹنوں میں سر چھپاتے ہوئے رو پڑی تھی۔

تین چار گھنٹے اسی عذاب میں گزر گئے۔ وہ کسی کو فون کر کے بلوا بھی نہیں سکی تھی، گھمبیر اندھیرا اس کی روح کو چھید رہا تھا۔ رو رو کر اس کا حال برا ہو گیا تھا۔ اس وقت اریج کی لاپروائی، اس کی تمام اچھائیوں پر بھاری پڑ کر تمکین کو غصہ دلا رہی تھی۔

خدا خدا کر کے موسم کی شدت میں قدرے کمی آئی تو عین اسی لمحے اریج کی گاڑی کا مخصوص ہارن بھی بج اٹھا، مگر وہ اتنی ناراض اور خوف زدہ

تھی کہ اس نے اٹھ کر گیٹ کھولنے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کی تھی۔ چھٹی کے باعث چوکیدار بھی دستیاب نہیں تھا۔ لہٰذا اریج خود ہی گیٹ کھول کر گاڑی اندر گیراج میں پارک کرنے کے بعد موبائل کی روشنی میں دھیرے دھیرے چلتے ہوئے لاؤنج تک آیا، تو تمکین اس کی آہٹ محسوس کرتے ہی اس پر چلا اٹھی۔

''مل گیا آپ کو ٹائم، یاد آ گیا کہ گھر میں آپ کی کوئی بیوی بھی ہے، جسے اس خوف ناک موسم سے ڈر لگتا ہے، اشعر کی لاپرواہیوں پر تو بڑی ہمدردیاں جتاتے تھے مجھ سے، اب اپنی باری پر آنکھیں کیوں میچ لی ہیں آپ نے؟''

''تمکین میں......''

''شٹ اپ کوئی وضاحت نہیں سننی مجھے آپ کی، ہونہ، محض ایک کھیل کے تحت اپنائی گئی عورت کی بھلا پرواہ بھی کیوں کریں گے آپ؟ مجھے بیوی کا درجہ دیا ہی کب دیا ہے آپ نے، جو میری فکر کریں گے، میں تو آپ کے لئے صرف ایک رکھیل......''

''تڑاخ۔''

اس سے پہلے کہ اس کی زبان مزید کوئی نازیبا لفظ اگلتی، اریج کے جاندار طمانچے نے اسے ساکت کر ڈالا۔

☆☆☆

''تم میرے ساتھ کون سی گیم کھیلنے کی کوشش کر رہے ہو عدنان۔''

وہ مطمئن سا ڈیبل چیئر پر بیٹھا بیڈ پر رکھے ہوئے اپنے بیگ میں ضرورت کی اشیاء رکھ رہا تھا جب وہ چٹختے ہوئے اعصاب کے ساتھ اس کے مقابل آ کھڑی ہوئی تھی۔ عدنان نے اس کے سوال پر بڑے مصروف سے انداز میں نگاہیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

''کون سی گیم......میں کچھ سمجھا نہیں......''

''سب سمجھتے ہو تم، اتنے بچے نہیں ہو جو میرے لفظوں کا مفہوم نہ سمجھ سکو'' وہ اچھی خاصی جلی بیٹھی تھی تبھی وہ دھیمے سے مسکرایا تھا۔

''فارگاڈ سیک انجو، میں ریئلی نہیں سمجھ پا رہا کہ تم کیا کہنا چاہ رہی ہو۔''

''کچھ نہیں کہنا چاہ رہی میں، تمہیں نورالعین کے ساتھ abroud جانا ہے، تم جاؤ، میں تمہاری خوشیوں کی راہ میں رکاوٹ بننا نہیں چاہتی ہاں مگر اتنا ضرور کہوں گی، کہ زندگی میں کبھی تمہیں انجشاء احمر جیسی پر خلوص لڑکی دوبارہ ملے تو بتانا، تمہیں وش کرنے ضرور آؤں گی میں۔'' اس کا دل واقعی جل رہا تھا، جبکہ عدنان کے لبوں پر اب بھی شریر سی مسکراہٹ تھی۔

''ضرور......اور کچھ......'' اسے ستانے کو وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولا تھا۔ جواباً انجشاء جیسے کٹ کر رہ گئی تھی۔

''اور کچھ نہیں، گاڈ بلیس یو۔'' لہجہ بھر آیا تھا لہٰذا وہ فوراً اس کے کمرے سے نکل آئی تھی۔

پل پل روپ بدلتے عدنان رؤف کو سمجھنا، اسے اپنے بس سے باہر لگ رہا تھا۔ اگر وہ ڈسٹرب تھی، تو سیال بیگم اور احمد رؤف صاحب کا حال بھی اس سے الگ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کتنی بار وہ اس سے رک جانے کی ریکوسٹ کر چکے تھے۔ بخیر و عافیت شادی کا مرحلہ گزر جانے کی تمنا کر

رہے تھے۔مگر وہ اپنی ضد پر اڑ گیا تھا۔

''سوری پاپا! میں نہیں رک سکتا، میں جانتا ہوں انجو صرف میری ہے اور اسے میری ہی رہنا ہے، مگر...... وہاں کے جو ڈاکٹرز ہیں وہ میرے نہیں ہیں، میں اپنے علاج کے سلسلے میں کوئی کمپرومائز یا غفلت نہیں کر سکتا، صرف میرے لئے، وہاں چار اسپیشل ڈاکٹرز اکٹھے ہوئے ہیں، دوبارہ ایسا چانس کب ملے، کچھ نہیں کہا جا سکتا، لہٰذا پلیز آپ لوگ...... میرے لئے دعا کیجئے، میں بیساکھیوں کے سہارے جا رہا ہوں، لیکن اللہ نے چاہا تو آپ سب کی دعاؤں سے واپس اپنے پیروں پر چل کر آؤں گا۔'' احمد رؤف صاحب کے بہت زیادہ اصرار پر اس نے ان کے کندھوں کے گرد اپنے مضبوط بازو حمائل کرتے ہوئے کہا تھا۔ جواب میں وہ بھی خاموش رہ گئے تھے۔ جوان بیٹے کی تاعمر معذوری تو انہیں بھی کسی طور سے گوارہ نہیں تھی۔ زندگی کے خوبصورت لمحے، وہیل چیئر کی نذر ہو کر ان کے بیٹے کے اندر سے جینے کی امنگ ختم کر دیں ایسا تو وہ بھی نہیں چاہتے تھے، مگر اسے اتنی دور اکیلے بھیجنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا، ایسی کنڈیشن میں، جس میں وہ اپنا خیال بھی خود نہیں رکھ سکتا تھا۔ لہٰذا اس کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے شکستہ لہجے میں انہوں نے کہا تھا۔

''ٹھیک ہے اگر اسی میں تمہاری خوشی اور بھلائی ہے تو یونہی سہی، مگر میں تمہیں اس حال میں اتنی دور اکیلا نہیں جانے دوں گا۔ انجشا بیٹی بھی تمہارے ساتھ جائے گی۔''

ان کے حکم پر انجشاء نے فوراً جھکا سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ عین اس لمحے اس کی نظریں بھی انجشاء کے ستے ہوئے چہرے کی جانب اٹھی تھیں۔ تبھی وہ دھیمے سے مسکرایا تو انجشاء نے فوراً رخ پھیر لیا۔ اس کا دل اس لمحے بہت عجیب سے انداز میں دھڑک رہا تھا۔

عدنان نے چند سیکنڈز تک اس کی طرف دیکھا تھا پھر دوبارہ احمد رؤف صاحب کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

''سوری پاپا انجو میرے ساتھ وہاں نہیں جا سکتی۔''

''کیوں......؟''

''کیونکہ وہاں سے زیادہ اس کی یہاں آپ لوگوں کو ضرورت ہے، وہاں نور اور ڈاکٹر دانیال ہوں گے میرے ساتھ، پھر یہ یہاں رہے گی تو میں بھی مطمئن ہو کر اپنا علاج کروا سکوں گا۔''

انجشاء اس کے الفاظ پر سرتاپیر جل کر رہ گئی تھی۔ اسے واضح محسوس ہو رہا تھا جیسے عدنان اس سے دامن چھڑانا چاہ رہا ہے۔ لہٰذا وہ کچھ بھی کہے بغیر، وہاں سے چلی آئی تھی۔

اگلے روز شام میں عدنان کی فلائٹ تھی۔ مگر وہ ناراضی کے اظہار کے طور پر اس کی طرف نظر بھر کر دیکھنا بھی گوارہ نہیں کر رہی تھی۔

عدنان یہ سب دیکھ بھی رہا تھا اور سمجھ بھی رہا تھا، مگر خاموش تھا۔

اسی روز شام کو وہ اپنے کمرے سے باہر نکلا تو انجشاء اداس لان میں بیٹھی، اپنے آنسوؤں کو ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ شدت ضبط سے اس کی خوبصورت آنکھوں میں سرخی چھلک آئی تھی۔ لہٰذا وہ بیساکھیوں کے سہارے چلتا سیڑھیوں پر عین اس کے پہلو میں جا بیٹھا تھا۔

''آج موسم بڑا اداس ہے' خوشگوار ہوا بھی نہیں چل رہی، ہے ناں انجو۔'' کن انکھیوں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔ جب وہ سلگ کر بولی۔

''مجھے نہیں پتہ۔''

''کیا نہیں پتہ؟'' اسے انجشاء کا حال لطف دے رہا تھا۔ خفا خفا سی، سرخ چہرہ لئے، وہ پاس بیٹھی سیدھی دل میں اتر رہی تھی۔

تبھی عدنان نے ہاتھ بڑھا کر، اس کی چوڑیوں سے بھری بائیں کلائی اپنی گرفت میں لے لی۔

''ناراض ہو مجھ سے۔''

''مجھے کیا حق ہے تم سے ناراض ہونے کا۔'' خفگی سے کہتے ہی اس نے اپنی کلائی اس کی گرفت سے آزاد کروالی تھی۔ عدنان اس کی اس ادا پر بھی مسکرایا تھا۔

''لگتا ہے موسم فل خراب ہے۔'' اس کے مسکرانے پر وہ جی جان سے جلتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی تھی، تاہم عدنان نے مضبوطی سے اس کا آنچل تھام کر پھر سے اسے اپنے پہلو میں بیٹھ جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

''سوری انجو قسم سے یونہی تنگ کر رہا تھا تمہیں۔''

انجشاء کے دوبارہ بیٹھ جانے پر وہ بھی سنجیدہ ہو گیا تھا۔

''پلیز انجو' میں جانتا ہوں کہ شادی سے فقط تین روز قبل' میرے یوں اچانک فیصلہ بدل لینے سے تمہیں دلی تکلیف پہنچی ہے، مگر میرا یقین کرو، میں خود بھی نہیں جانتا تھا کہ ایسا کچھ ہوگا ابھی پرسوں ہی ڈاکٹر دانیال سے میری ملاقات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ اسپیشلسٹ فارنرز ڈاکٹرز ایک ایمپورٹنٹ میٹنگ کے سلسلے میں نیویارک پہنچ رہے ہیں، انہوں نے میرا کیس ان ڈاکٹرز سے ڈسکس کیا تو انہوں نے ڈاکٹر دانیال سے کہا کہ میں نیویارک جا کر ان سے ملاقات کروں، انہوں نے امید دلائی ہے انجو، کہ اگر میرا کیس زیادہ پیچیدہ نہ ہوا تو وہ میرا آپریشن کریں گے، جس میں کامیابی کے بعد میں، بہت جلد، پھر سے خود اپنے پاؤں پر چلنے کے قابل ہو جاؤں گا۔''

''اور اگر آپریشن کامیاب نہ ہوا تو......؟'' انجشاء کی متورم آنکھوں میں عجیب سی بے چینی ہلکورے لے رہی تھی۔ تبھی اس نے آہستہ سے رخ پھیرتے ہوئے کہا تھا۔

تو کیا آپریشن کامیاب نہ ہونے کی صورت میں، میں کبھی اپنی ٹانگوں پر نہیں چل سکوں گا۔'' اس کے لہجے میں عجیب سی کسک تھی۔ انجشاء نے بے ساختہ تڑپ کر اپنا ہاتھ اس کے مضبوط کندھے پر رکھا تھا۔

''تم بہت برے ہو عدنان، بہت زیادہ برے ہو تم۔'' اس کے الفاظ پر وہ پھر دھیمے سے مسکرایا تھا۔

''محبت میں جان دینے کا دعویٰ تو سبھی کرتے ہیں انجو، میں نے قدرے مختلف کیا ہے۔''

''بہت قابل فخر ہے، جو کیا ہے، ہے ناں۔'' وہ پھر تپی تھی، تبھی وہ کھلکھلا اٹھا تھا۔

''تمہارے لئے تو کچھ بھی کر سکتا ہوں ڈیئر وائف۔'' اس کا سر انجشاء کے کندھے پر آ ٹکا تھا۔ کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ آزردگی سے بولی تھی۔

''پتہ ہے عدنان، شعور سنبھالنے پر میری امی نے جب مجھے یہ بتایا کہ میں تمہارے نام سے منسوب ہوں تو خوشی سے میرے پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے تھے۔ تم اپنے کمرے میں بیٹھے پڑھ رہے ہوتے تھے اور میں چوری چوری، بھری دوپہر میں، تمہارے کمرے کی کھڑکی کے باہر کھڑی ہو کر، تمہیں دیکھا کرتی تھی۔ میرے پاؤں جل رہے ہوتے تھے، سرگرمی کی شدت سے گھوم جاتا تھا تمہیں نگاہ اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنے کی فرصت بھی نہیں ہوتی تھی مگر اس کے باوجود میں دل کے ہاتھوں بے بس ہو کر تمہاری طرف لپکتی رہتی تھی۔ پہروں تمہیں سوچنا اور تمہارے حوالے سے خوبصورت خواب دیکھنا، ان دنوں میری زندگی کا خوبصورت مشغلہ تھا، میری سکھیاں جب مجھے تمہارا نام لے کر چھیڑتی تھیں تو میرے اندر ڈھیروں گلاب کھل جاتے تھے ان دنوں میرا بس نہیں چلتا تھا کہ تم جہاں جہاں پیر دھرتے ہو میں وہاں وہاں اپنا دل بچھا دوں۔''

ماضی کے سنہری لمحوں میں کھوئی وہ اس پر سحر انگیز انکشاف کر رہی تھی اور عدنان دلچسپی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس کے ایک ایک نقش کو دل میں اتار رہا تھا۔

''پتہ ہے عدنان، جس روز تم اپنے امی ابو کے ساتھ حویلی سے رخصت ہوئے تھے، اس رات میں ایک لمحے کے لئے بھی نہیں سو سکی تھی، پوری رات کا ایک ایک لمحہ آنسوؤں کی نذر ہوا تھا۔ تمہاری جدائی پر بستر سے لگ کر رہ گئی تھی میں، ہر پل، ہر لمحے یہی ضد تھی میری کہ مجھے عدنان چاہیے، مجھے میرا کزن چاہیے، بڑی مشکل سے امی نے مجھے بہلایا تھا۔ مجھے کتابوں سے دلچسپی نہیں تھی عدنان، گاؤں کی دوسری لڑکیوں کی طرح مجھے بھی درختوں کی چھاؤں میں سہیلیوں کے ساتھ بیٹھ کر تمہاری باتیں ڈسکس کرنا اچھا لگتا تھا، مگر...... جب امی نے مجھے بتایا کہ تمہیں حاصل کرنے کے لئے تمہارے دل میں اپنا مقام بنانے کے لئے، میرا علم حاصل کرنا ضروری ہے تب میں نے پھر سے کتابوں سے دوستی کی تھی اور دل لگا کر پڑھنا شروع کر دیا تھا، تم جب بھی میری غیر موجودگی میں حویلی آتے، میرا دل تم سے نہ مل سکنے پر دیر تک کڑھتا رہتا۔ میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ تم میری تمام تر ریاضتوں کے باوجود یوں اتنی حقارت سے ٹھکرا دو گے مجھے۔''

اب کے اس کے لہجے میں عجیب سا دکھ تھا۔ تاہم عدنان کی دلچسپی ہنوز برقرار رہی تھی۔

''تمہارے ٹھکرا دینے کے بعد میرا کیا حال ہوا، یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تاہم مجھے ان دنوں ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اب میرے زندہ رہنے کا کوئی مقصد باقی نہ بچا ہو تنکے سے بھی ہلکی ہو گئی تھی میں، مگر اس ٹریجڈی کا مجھ سے بھی زیادہ صدمہ میرے ماں باپ نے لیا تھا۔ لہٰذا باری باری وہ میرے آنکھوں کے سامنے رخصت ہو گئے اور میں کچھ بھی نہ کر سکی، بہت بد دعائیں مانگی تھیں ان دنوں میں نے تمہارے لئے، میرے دل میں موجود تمہاری تمام تر محبت نفرت کا روپ اختیار کر گئی تھی۔ اگر دادا جی کا وجود نہ ہوتا تو شاید میں خودکشی کر چکی ہوتی، سب کچھ چھن چکا تھا مجھ سے، بہت زیادہ ٹوٹ گئی تھی میں، اسی لئے دادا جی مجھے گاؤں سے شہر میں لے آئے، انہوں نے ہی مجھے یہ ترغیب دلائی تھی کہ بجائے زندگی سے ہار ماننے کے میں کچھ ایسا کر کے دکھاؤں، جو قابل فخر ہو، جس سے یہ ثابت ہو جائے کہ گاؤں کے سادہ ماحول میں پرورش پانے والے بھی زندگی کا شعور رکھتے ہیں،

شاید میں ان کی ترغیب پر بھی دل سے کچھ نہ کر سکتی کہ اچانک ایک روز اسی شہر میں تم مجھے دکھائی دے گئے، تمہیں دیکھ کر میرے دل و روح پر لگے تمام پرانے زخم ادھڑتے چلے گئے۔ میرا شدت سے دل چاہا کہ میں تھپڑوں سے تمہارا چہرہ سرخ کر دوں مگر...... میں بے بس تھی۔ صرف تمہاری ضد میں تمہیں دکھانے کے لئے، میں نے اپنا آپ مٹا کر، مجتبیٰ اور رحمان صاحب کی نظروں میں بلند مقام حاصل کیا تھا، میں تمہیں کڑی سزا دینا چاہتی تھی، سسک سسک کر مرتے ہوئے دیکھنا چاہتی تھی، مگر...... میرا کھیل مکمل ہونے سے پہلے ہی، تم نے دادا جی کی موت کی صورت ایک اور زخم دے دیا مجھے۔ میں مانتی ہوں عدنان کہ میں نے تمہارے ساتھ جو کیا وہ درست نہیں تھا۔ مگر...... تم بتاؤ، تم نے میرے ساتھ جو کیا، کیا وہ درست تھا......؟ بے قصور جو گھاؤ تم نے میرے دل پر لگائے، کیا ان میں حق بجانب تھے تم......؟ میں نے تو پھر بھی نرمی ہی دکھائی۔ تمہارے غیر متوقع ایکسیڈنٹ کے بعد اپنا کیس بھی واپس لے لیا اور ہر طرح سے تمہارا خیال بھی رکھا، مگر تم نے میرے خلوص کو بھی شک کی نظروں سے دیکھا اور اسے خود پر احسان سمجھتے ہوئے تھرڈ پرسن کو درمیان میں گھسیٹ لائے۔''

وہ خاموش ہوئی تو عدنان نے اپنا سر اس کے کندھے سے اٹھا لیا۔

''بس...... یا اور بھی کچھ کہنا ہے تمہیں؟'' اسے انجشاء کا مکمل کر غبار نکالنا اچھا لگا تھا' تاہم وہ خود اس پر کچھ بھی ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ تبھی سرد آہ بھرتے ہوئے پوچھا، تو وہ اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''واپس کب تک آ جاؤ گے؟''

''جب بھی تم دل سے بلاؤ گی، اسی وقت دوڑا آؤں گا۔ آزما کر دیکھ لینا۔''

''دیکھ لوں گی، اب اندر چلو سردی بڑھ رہی ہے۔'' وہ اس کی نگاہوں سے چھلکتی وارفتگی سے کنفیوز ہو رہی تھی' تبھی اٹھ کھڑی ہوئی تو عدنان نے پھر سے اس کی کلائی تھام لی۔

''بیٹھ جاؤ انجو، پھر جانے وقت' ہمیں یہ قربت مہیا کرے نہ کرے۔'' بڑا عجیب سا لہجہ ہو رہا تھا اس کا' انجشاء کے دل کو یکلخت جیسے کچھ ہوا تھا۔

''فضول بکواس کرنی بہت آتی ہے تمہیں، چلو کمرے میں، تمہاری دوا کا وقت ہو رہا ہے۔''

''بیٹھو ناں انجو، پلیز۔'' اب کے اس کے لہجے میں التجا سمٹ آئی تھی۔ لہٰذا انجشاء کو پھر سے اس کے پہلو میں ٹکنا پڑا تھا۔

''انجو میں جانتا ہوں کہ میں بہت برا ہوں، زندگی میں بہت سی لڑکیوں کے دل دکھائے ہیں میں نے، میں چچا، چچی اور دادا جی کا بھی گنہگار ہوں، یقیناً تمہاری جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو کبھی میرا قصور معاف نہ کرتی، مگر...... میں سچ کہتا ہوں انجو، تم سے میری محبت بے لوث ہے، میری وجہ سے تمہاری آنکھ میں ایک آنسو بھی آئے، میں برداشت نہیں کر سکتا، ساری عمر دوسروں کو اپنے سامنے جھکانے والا عدنان رؤف، تمہاری محبت کے سحر میں الجھ کر، خود منہ کے بل آ گرا ہے، انجو دوست یار، موج مستی، سب ترک کر دیا میں نے یقین کرو، اب مجھ میں پہلے جیسا کچھ بھی نہیں رہا، پھر بھی ......پھر بھی میں تم سے ریکویسٹ کر رہا ہوں انجو، کہ پلیز مجھے معاف کر دینا، اگر میں لوٹ کر واپس پاکستان نہ آ سکوں تو......''

''یہی بکواس سنانے کے لئے روکا تھا تم نے مجھے......؟'' فوراً اس کی بات کاٹتے ہوئے وہ تپ اٹھی تھی۔ جواب میں عدنان، بھرپور نگاہ اس کے خوبصورت چہرے پر ڈالتے ہوئے مسکرا دیا۔

''اٹھو یہاں سے ٹھنڈ لگ جائے گی۔''

اگلے ہی پل اس نے غصہ تھوک کر عدنان کا بازو تھام لیا تھا۔

''آج لگ جانے دو ٹھنڈ دیکھا جائے گا۔''

ایک مدت کے بعد اس کے مزاج میں شوخی آئی تھی۔ انجشاء نے قدرے زچ ہو کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

''عدنان! تم اٹھتے ہو کہ نہیں۔''

''تم میں ہمت ہے تو اٹھا لو، میں خود سے اٹھنے والا نہیں ہوں۔'' اس وقت انجشاء کو ستا کر اسے مزہ آ رہا تھا۔ جواباً وہ روہانسی ہو گئی تھی۔

''عدنان پلیز، ساری زندگی تنگ کرتے آئے ہو، اب تو نہ کرو۔''

''او کے چلو۔'' اسے مزید تنگ کرنے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے اسی کے سہارے اپنے کمرے میں چلا آیا تھا۔ اس رات انجشاء دیر تک اس کے سرہانے بیٹھی اپنی ملائم انگلیاں اس کے گھنے بالوں میں پھیرتی رہی تھی۔ باتوں ہی باتوں میں رات گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلا، اور وہ وہیں عدنان کے بازو پر سر ٹکا کر بیٹھی بیٹھی سو گئی۔

اگلے روز اس نے آفس سے چھٹی کی تھی۔ دل ملول ہونے کے باوجود اس نے عدنان کی فرمائش پر اس کی فیورٹ ڈشز خود اپنے ہاتھوں سے تیار کر کے اسے کھلائی تھیں۔ احمد رؤف صاحب اور سیال بیگم بھی تمام وقت اس کے ساتھ ہی رہے تھے۔

شام چھ بجے کے قریب نورالعین اسے لینے کے لئے گھر چلی آئی تھی۔

وقت رخصت سب سے مل کر، وہ گیٹ کے قریب پہنچا، تو انجشاء نے آواز دے کر اسے پھر سے بلا لیا۔

نورالعین گاڑی میں بیٹھ چکی تھی۔ فلائٹ روانہ ہونے میں بہت کم وقت رہ گیا تھا جب وہ پلٹ کر واپس انجشاء کے پاس آیا تھا۔

''اپنا خیال رکھنا عدنان۔'' اس کی آنکھیں آنسو لٹا لٹا کر بے حال ہو رہی تھیں۔ عدنان نے اس کا خوبصورت چہرہ بے ساختہ ہاتھوں کے پیالے میں تھام کر وارفتہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

''تم بھی اپنا اور ماما پاپا کا بہت خیال رکھنا انجو، میں ہر پل تم سے رابطے میں رہوں گا۔''

وہ اس کے قدموں میں بیٹھی تھی اور عدنان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کے پریشان چہرے پر اپنے پیار کی برسات کر دے۔ بہت مشکل سے انجشاء نے اسے رخصت کیا تھا۔ کیونکہ فلائٹ کا ٹائم اوور ہو رہا تھا۔ اسے رخصت کرنے کے بعد وہ لٹا پٹا سا سراپا لئے عدنان کے کمرے میں واپس آئی تو اس کے بیڈ کی پٹی سے ٹیک لگا کر بے ساختہ رو پڑی۔

''یا اللہ...... میرے عدنان کو اپنی پناہ وامان میں رکھنا۔''

بہتے آنسوؤں سے بے نیاز دعا میں ہاتھ اٹھا کر صدق دل سے اس نے کہا تھا' پھر آنسو پونچھ کر عدنان کے کمرے سے باہر نکل آئی تھی کہ عدنان جاتے ہوئے سیال بیگم اور احمد رؤف صاحب کا خیال رکھنے کی ذمہ داری اس کے سپرد کر گیا تھا۔

☆☆☆

''تم نے ضد اور نفرت کا انجام دیکھ لیا ماہم......؟'' اس کے مقابل بیٹھا وہ اب بھی نرم لہجے میں کہہ رہا تھا' جواب میں ماہم شاہ کی آنکھیں پھر سے آنسوؤں سے بھر آئیں۔

''میرا ارادہ تمہیں ہرٹ کرنا نہیں ہے' میں اب بھی تم سے کچھ نہیں کہوں گا' سوائے اس بات کے کہ دل کی نگری زمین کا ٹکڑا نہیں ہوتی ماہم، جس پر ہم زور زبردستی قبضہ کر لیں، یہاں تو خود محبت کی آبیاری کرنی پڑتی ہے' دن رات اپنا لہو دے کر' محبت کے پودے کو پروان چڑھانا پڑتا ہے، دلوں کے عجیب و غریب معاملات ہیں، کبھی ضدی اور خودسر لوگوں کی جیت نہیں ہوئی، یہاں تو وہی مقام پاتا ہے جو خود کو گرا دیتا ہے، ہر نفع و نقصان سے بے نیاز ہو کر جھک جاتا ہے۔''

وہ اب بھی خاموش رہی تھی، تبھی وہ اس کے جھکے ہوئے سر پر نگاہیں جماتے ہوئے بولا تھا۔

''ہم کل شام کی فلائٹ سے نیویارک جا رہے ہیں، وہاں کے دو تین ڈاکٹرز سے بات ہوئی ہے میری، تمہارا کیس زیادہ سیریس نہیں ہے، لہٰذا معمولی آپریشن کے بعد تم پھر سے وہی پہلے جیسی ماہم ہو گی، پھر جی بھر کر مذاق اڑانا میری کم صورتی کا۔'' دھیمی سی مسکراہٹ ہونٹوں کے کناروں میں دبائے اس نے کہا تو ماہم تڑپ کر اسے دیکھنے لگی۔

''ایم سوری ازمیر' ایم رئیلی ویری سوری۔''

''آں ہاں، ازمیر نہیں، ازمیر بھائی کہو' پھر ہی تمہیں معاف کرنے کا سوچا جا سکتا ہے۔'' شگفتہ لہجے میں اس نے کہا تو ماہم نے شرمندہ ہوتے ہوئے چپ چاپ سر جھکا لیا۔

برائی کو اگر برائی سے ختم کرنا چاہیں تو وہ کبھی کم نہیں ہوتی مزید بڑھتی چلی جاتی ہے، اسی لئے سمجھدار لوگ اسے اچھائی سے ختم کرتے ہیں، ازمیر نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔

پورے دو ماہ تک وہ ماہم کے ساتھ نیویارک میں مقیم رہا تھا۔ دو ماہ کے بعد، ماہم اس کے ساتھ پاکستان واپس آئی تو اس کے چہرے کی بدصورتی غائب ہو چکی تھی۔ اس کا سانس سانس ازمیر شاہ کے خلوص کا مقروض تھا۔ کیونکہ اس نے نہ صرف اسے اس کا غرور واپس لوٹایا تھا بلکہ اس کے لئے اپنی پسند سے اپنے آفس میں ہی ایک بہترین لڑکا ڈھونڈ کر گھر والوں کی رضامندی کے بعد سمیہ شاہ کے ساتھ ہی اس کی بھی رخصتی کروا دی تھی۔

پورے شاہ ولاج میں اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا جا رہا تھا۔ فرزانہ بیگم تو اس سے نظر ملانے کے قابل بھی نہیں رہی تھیں۔ حائقہ بیگم اور احسن صاحب کے سر فخر سے بلند ہو گئے تھے۔ بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہونے کے بعد بیٹے کے سر پر سہرا سجانے کی خواہش میں انہوں نے جلد ہی اریشہ سے اس کی شادی کی ڈیٹ بھی فکس کروا دی تھی۔ ہر طرف جشن کا سامان تھا۔ ہر دل شاد تھا۔ اذہان اور اس کی شادی کی ایک ہی ڈیٹ رکھی گئی تھی۔ سبھی مسرور تھے۔

مگر ازمیر شاہ کا حال تو ان سب سے جدا تھا۔ شادی کی تمام تقریب میں اس کے چہرے سے پھوٹتے سچی خوشیوں کے رنگ واقعی دیکھنے کے لائق تھے۔ شہزرین خان نے دانیہ اور عدیلہ کے ساتھ مل کر با قاعدہ بھنگڑا ڈالا تھا، اور مشرقی رسومات کو خوب انجوائے کیا تھا۔

☆☆☆

عدنان کو نیویارک گئے دو تین ماہ ہو گئے تھے، مگر اس نے واپسی کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔ سلام دعا اور خیریت دریافت کرنے کے علاوہ وہ ادھر ادھر کی بات ذرا کم ہی کیا کرتا تھا۔

انجشاء اس کے اس بی ہیویئر کو لے کر بھی ٹینس ہو رہی تھی۔ وہ اریشہ اور تمکین سے بھی ملی تھی۔

اریشہ کی شادی میں شرکت کے دوران ہی تمکین سے مل کر خلوص دل سے معافی مانگی تھی اس نے، اور تینوں دوستوں میں پھر سے اتحاد ہو گیا تھا۔

عدنان کی غیر موجودگی میں اس نے پھر سے اپنی تمام تر توجہ اس کے بزنس پر مرکوز کر دی تھی۔ نتیجتاً بیتے ہوئے ان چند ماہ میں کمپنی کی ساکھ پھر سے بحال ہونے لگی اور اس کی زندگی میں خوشحالی در آئی۔

دن بھر آفس میں مصروف رہنے کے بعد شام میں وہ گھر واپس آتی تو پھر تمام تر وقت سیال بیگم اور احمد رؤف صاحب کے ساتھ ہی گزارتی تھی۔

بھرپور مصروف رہ کر بھی رات میں جب وہ اپنے بستر پر آ کر لیٹتی تو گزرا ہوا وقت اور عدنان دونوں ہی اسے شدت سے یاد آتے تھے۔

اکثر خواب میں وہ دیکھتی کہ اس کی اور عدنان کی شادی کی تقریب منعقد ہے اور اس کے دادا جی پاپا اور ماں سبھی بے حد مطمئن و شادمان اسے عدنان کے سنگ رخصت کر رہے ہیں۔ وہ اس خواب پر بے حد مسرور تھی، مگر عدنان پچھلے کئی روز سے اس سے لاتعلق تھا۔ اس کا نمبر سیل آف تھا اور پچھلے تین چار روز سے اس نے خود رابطہ کر کے، اپنی خیریت کی اطلاع دینا بھی گوارہ نہیں کی تھی، تبھی اس کا دل مضطرب تھا۔

اس وقت بھی وہ ملول سی آفس میں بیٹھی اپنی سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے سوچوں میں گم تھی جب اچانک اسکے پرسنل سیل پر ہونے والی بپ نے اس کا ارتکاز توڑ دیا ہے بے دلی سے سیل اٹھا کر اس نے نمبر دیکھا وہ نیویارک کا تھا۔ لہٰذا دھڑکتے دل کے ساتھ فوراً اس نے کال پک کی تھی۔

”ہیلو، مس انجشاء......؟“ دوسری طرف سے قطعی اجنبی آواز میں پوچھا گیا تھا۔

”یس۔“ بڑی مشکل سے اپنے حواس کنٹرول میں رکھتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ جب اسے اطلاع دی گئی۔

”آپ کے لئے بڑی افسوس کی خبر ہے مادام‘ آپ کے شوہر عدنان صاحب آپریشن کے دوران، اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں، ہم ان کی ڈیڈ باڈی آپ کے ایڈریس پر روانہ کر رہے ہیں، وصول کر لیجئے گا۔“

دوسری طرف سے پتہ نہیں کیا کیا کہا جا رہا تھا مگر وہ تو جیسے اپنے حواس ہی کھوتی چلی گئی تھی۔

☆☆☆

اریشہ کی مایوں تھی، مگر وہ اپنے کمرے میں اداس بیٹھی تمکین اور انجشاء کی آمد کا شدت سے انتظار کر رہی تھی۔ تمکین کی طرح اس نے بھی شیزا کو اپنی دوستی اور زندگی سے بے دخل کر دیا تھا۔

یونیورسٹی پریڈ میں ان چاروں کے قریب کوئی دکھ پھٹکتا بھی نہیں تھا۔ ان کے دیگر کلاس فیلوز اور استاد، رشک بھری نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا کرتے تھے، تب زندگی ان کی مٹھی میں رقص کرتی تھی۔ مگر اب وہ چاروں ہی حالات کے گرداب میں الجھ کر رہ گئی تھیں۔ زندگی نے کسی کی جھولی میں بھی خوشیوں کے پھول نہیں ڈالے تھے۔

انجشاء عدنان کی رخصتی کی وجہ سے مایوں میں اپنی آمد سے پہلے ہی معذرت کر چکی تھی، جبکہ تھوڑی دیر پہلے تمکین نے بھی عین ٹائم پر، اریج کی غیر حاضری کا عذر پیش کر کے اپنے نہ آنے کی اطلاع دے دی تھی۔

تبھی وہ ملول بیٹھی تھی۔

شہرین خان کچھ دیر تو ڈانس میں حصہ لیتی رہی تھی، پھر تھک گئی تو سب سے ایکسکیوز کر کے اکیلی بیٹھی اریشہ کے پاس چلی آئی۔ جس نے سب کے اصرار کے باوجود باہر لاؤنج میں چل کر بیٹھنا گوارہ نہیں کیا تھا۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد شہرین نے اس سے پوچھا تھا۔

''اریشہ! تمہارے ذہن میں میرے اور ازمیر کے تعلق کو لے کر کوئی مس انڈراسٹینڈنگ تو نہیں ہے ناں.....''

اریشہ نے اس کے سوال پر قدرے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ پھر دھیرے سے نفی میں سر ہلاتی ہوئی بولی تھی۔

''نہیں، پہلے میں ایسا سوچتی تھی کہ شاید آپ ازمیر کے اندر تک اتری ہوئی ہیں، مگر جب سے میں نے اس کے منہ سے اپنی محبت کا اعتراف سنا ہے، تب سے کوئی بھی غلط سوچ میرے دماغ میں نہیں آئی۔''

''تھینکس۔'' اریشہ کی صاف گوئی پر شہرین نے دل سے مسرور ہوتے ہوئے سکون کا سانس لیا تھا۔

''ازمیر بہت اچھا ہے اریشہ، بہت زیادہ پیار کرتا ہے وہ تم سے، اسے کبھی دکھ مت دینا۔ اس کی نصیحت پر اریشہ نے محض سر جھکانے پر اکتفا کیا تھا۔ کچھ لمحے جامد خاموشی کی نذر ہوئے تھے، جب اریشہ نے سرسری سی اک نظر اپنے مقابل بیٹھی شہرین خان کے چہرے پر ڈالتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔

''اک سوال پوچھوں آپ سے، سچ سچ جواب دیں گی؟''

''ہاں پوچھو۔'' وہ قدرے حیران ہوئی تھی۔

''شہرین' کیا واقعی آپ نے کبھی ازمیر سے پیار نہیں کیا؟''

ایک اور مشکل سوال۔

چند لمحوں تک وہ کچھ بھی بولنے کی ہمت نہیں کر پائی تھی۔ تاہم اریشہ کو مطمئن و سرخرو کرنے کے لئے اس کا بولنا ضروری تھا۔ تبھی اس نے لب کھولے تھے۔

''ازمیر واقعی بہت اچھا لڑکا ہے اریشہ، مگر ہر اچھی چیز سے محبت ہونا ضروری نہیں ہے، میں نے زندگی میں بہت سی نایاب چیزیں کھوئی ہیں، اپنا قیمتی وقت، انمول احساسات، سنہری خواب، اور......اور محبت بھی، کاش مجھے ازمیر سے محبت ہوگئی ہوتی، تو شاید میرے گالوں پر بھی زندگی کے حقیقی رنگ ہوتے، میری آنکھیں بھی روشن ہوتیں۔'' اس کی آنکھیں یاسیت میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ لہجہ بھی شکستگی کا شکار تھا۔ تاہم اریشہ کے اندر گہرا اطمینان پھیل گیا تھا۔

''پتہ ہے اریشہ، گھر بسانا اتنا مشکل نہیں ہوتا جتنا دل بسانا مشکل ہوتا ہے، گھر بسانے کے لئے رائٹ مین ملے نہ ملے، مگر دل آباد کرنے کے لئے رائٹ مین کا ملنا بے حد ضروری ہے۔ کیونکہ اگر ہمارے احساسات کسی رانگ مین سے وابستہ ہو جائیں، تو پھر اتنی کرچیاں بکھرتی ہیں اندر کہ انہیں کھینچ کر روح سے نکالتے نکالتے ساری عمر بیت جاتی ہے اور قرار نہیں ملتا۔'' اس کے لہجے میں اس کا اپنا تجربہ بول رہا تھا۔ اریشہ کو اس سے دلی ہمدردی تھی، تبھی شاید اس نے پوچھا تھا۔

''شہزین! آپ فرحان بھیا کے ساتھ خوش تو ہیں ناں؟''

''ہاں...... بہت خوش ہوں، آئی تھینک وہ ہر لحاظ سے رائٹ مین ہیں۔'' اس کا لہجہ واقعی خوشگوار ہو گیا تھا۔ لہٰذا اریشہ نے بھی سکون کی سانس بھری تھی۔

''اریشہ! تم نے ابھی تک ازمیر کو اپنے ناٹک کے متعلق نہیں بتایا، آئی تھنک اب تو تمہیں اس پر اپنی اس جھوٹ موٹ کی معذوری کا پول کھول ہی دینا چاہیے۔'' وہ شگفتہ لہجے میں مشورہ دیتی ہوئی بولی تھی۔

عین اسی لمحے ازمیر 'جو اسے ہی بلانے کے لئے اریشہ کے کمرے کی طرف آ رہا تھا' شہزین خان کے قطعی غیر متوقع الفاظ پر وہیں راہداری میں ٹھٹک کر رک گیا۔ اریشہ اب شہزین کی بات کا جواب دے رہی تھی۔

''نہیں شہزین، یہ پول تو اب شادی والی رات ہی کھلے گا' بہت ستایا ہے ازمیر نے مجھے، میں بھی اب اسے خوب ستاؤں گی، جناب کو پتہ چلے آخر پالا کس سے پڑا ہے۔''

اس کا ذہن اریشہ کے الفاظ پر مزید گھوم گیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ اتنا بڑا کھیل کھیل سکتی ہے ازمیر کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس لمحے اس سے اپنی ہی ٹانگوں پر کھڑا رہنا بہت دشوار ہو رہا تھا، لہٰذا کسی کو کچھ بھی بتائے بغیر وہ چپ چاپ گھر سے نکل آیا۔

☆☆☆

وہ سن سے گال پر ہاتھ رکھے اریج کے سامنے کھڑی سہمی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی، اور وہ شدید غصے میں دھاڑتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''بس...... بہت فضول بول چکی تم' اور بہت برداشت سے کام لے لیا میں نے، اس کے بعد ایک لفظ بھی مت کہنا تمکین، ورنہ میں کچھ کر بیٹھوں گا۔''

تمکین نے اس کا یہ روپ بہت کم دیکھا تھا۔ وہ فطری طور پر کم گو اور نرم مزاج رکھنے والا بندہ تھا۔ بڑی سے بڑی بات کو صبر سے برداشت کر لیتا تھا' مگر اس وقت ''لفظ رکھیل'' پر اس کا غصہ آسمان کو چھو رہا تھا۔

اسی لمحے لائٹ آ گئی تمکین نے دیکھا اس کی شرٹ خون سے سرخ ہو رہی تھی۔ ماتھے پر بھی سفید پٹی بندھی ہوئی تھی، مگر وہ بھی سرخی لئے ہوئے تھی۔ یقیناً اس کی ٹانگوں پر بھی زخم آئے تھے' کیونکہ گرے شلوار کئی جگہوں سے پھٹی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ یکلخت ہی اس کا دل دھڑ کا تھا۔ اپنی تکلیف بھول کر، وہ فوراً اس کی طرف لپکی تھی۔

''کیا ہوا ہے آپ کو.....؟''

''کچھ نہیں ہوا مجھے.....''

خفگی سے اسے سائیڈ پر دھکیل کر، وہ اس کے پہلو سے نکلتے ہوئے بیڈ روم کی طرف آ گیا تھا۔ تمکین اس کے پیچھے ہی لپکی تھی۔

''پلیز، بتایئے مجھے، کیا ہوا ہے آپ کو؟'' وہ بے چین تھی۔ اریج نے قدرے حیرانگی سے اس کے اس انداز کو دیکھا تھا۔ تبھی نرم پڑتے ہوئے بولا تھا۔

''تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے' گھر واپسی پر، خراب موسم اور فاسٹ ڈرائیونگ کی وجہ سے چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔''

''چھوٹا سا ایکسیڈنٹ.....؟ آپ کا پورا جسم زخمی ہے اور آپ اسے چھوٹا سا ایکسیڈنٹ کہہ رہے ہیں۔''

وہ لڑکی واقعی بہت عجیب تھی۔ اسے شاید یاد نہیں رہا تھا کہ ابھی کچھ دیر قبل اسی شخص نے اسے طمانچہ رسید کیا تھا۔

اریج کا دل دکھا تھا۔ اپنے عمل پر شرمندگی بھی محسوس ہوئی تھی۔ مگر اس کے الفاظ غلط تھے۔ تبھی وہ دل گرفتگی کے عالم میں سوچتا رہ گیا تھا۔

''میرے جسم پر لگے زخموں کو دیکھ کر بے چین ہو گئی ہو' کبھی روح کے زخم بھی دیکھو تمکین، میری گھائل روح نظر کیوں نہیں آتی تمہیں۔'' مگر وہ یہ بات اس سے کہہ نہیں سکا تھا۔ قدرے ندامت و خفگی کے ملے جلے احساسات لئے وہ پلکیں موند گیا تھا۔

اب تمکین کو اپنے طرز عمل پر شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ اسی شرمندگی کا ازالہ کرنے کے لئے وہ ایک باؤل میں تھوڑا سا پانی ڈال کر لے آئی تھی۔ پھر اریج سے اجازت لئے بغیر، اپنا دوپٹہ بھگو کر اس کے چہرے پر کہیں کہیں لگے خون کے نشانات کو صاف کرنے لگی۔

''سوری۔'' پلکیں کھول کر اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے وہ محض یہی کہہ سکا تھا۔ تمکین البتہ اس کی ''سوری'' پر بھی خاموش ہی رہی تھی۔

موسم اب بے حد اچھا ہو گیا تھا۔ سردی کا احساس بھی حد سے سوا ہو کر بڑھ گیا تھا۔ لہٰذا اس نے اٹھ کر پہلے تمام کھلی کھڑکیوں کو بند کیا، پھر اریج کے گرد اچھی طرح کمبل لپیٹتے ہوئے بولی۔

''مجھے طوفانی موسم سے بہت ڈر لگتا ہے، بچپن سے ہی گرجتے بادل اور چمکتی بجلی مجھے خوف زدہ کر دیتی ہے' میرے پاس سیل نہیں تھا، ورنہ آپ کو کال کر کے تمام صورت حال سے آشنا کر جاتی، پتہ نہیں کیوں، مجھے آپ کی لاپرواہی پر، بہت رنج اور غصہ رہا تھا' سوری اریج۔'' وہ ان لڑکیوں میں سے نہیں تھی جو غلطی کر کے بھی اس پر پردہ ڈالنے کے لئے فضول اکڑی رہتی ہوں۔

اریج کے دل میں اس کے لئے کوئی بدگمانی نہیں تھی۔ تاہم پھر اس نے کوئی وضاحت پیش کر کے اسے شرمندہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''سو جاؤ تمکین، مجھے نیند آرہی ہے۔'' پلکیں موند کر اس نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لئے تھے۔

''اریج..... کیا آپ اب بھی مجھ سے ناراض ہیں۔'' کن اکھیوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے سادہ لہجے میں پوچھا تھا۔ جواب میں وہ آنکھیں کھولے بغیر، اختصار سے بولا تھا۔

''نہیں..... لیکن یہ بات اپنے ذہن میں بٹھا لو کہ تم میری عزت ہو، جتنی محبت میں نے تم سے کی ہے، اپنی مما کے بعد اور کسی سے نہیں کی، میں آئندہ تمہاری زبان سے ایسا کوئی لفظ نہ سنوں، جو میری غیرت پر چوٹ کرے، اسے وارننگ سمجھو یا ریکویسٹ لیکن یہ بات تمہارے ذہن سے نکلنی نہیں چاہئے۔''

تمکین پہلی بار اس کے لہجے میں بے پناہ سختی محسوس کر رہی تھی۔ اسے رونا بھی آرہا تھا۔ تاہم وہ اس سے مزید کچھ بھی کہے بغیر رخ بدل کر لیٹ گئی تھی۔

اس رات وہ ایک لمحے کے لئے بھی نہیں سو سکی تھی۔

اگلی صبح دن کے اجالے میں اس نے اریج کو دیکھا تھا، جو سر تا پیر زخموں سے چور تھا۔ وہ حیران تھی کہ اریج اتنا گھائل ہونے کے باوجود، خود اپنے پیروں پر چل کر گھر کیسے آگیا تھا؟ کیسے ڈرائیونگ کی ہوگی اس نے؟ کیسے گیٹ کھول کر اندھیرے میں لاؤنج تک کا فاصلہ طے کیا ہوگا اس نے؟ وہ کیا کیا سوچ کر بدگمان ہو رہی تھی اور اریج کن مصیبتوں میں گھرا تھا۔ اسے دیکھ کر ایک مرتبہ پھر اس کے چڑیا سے دل کو کچھ ہوا تھا۔

وہ ابھی تک گہری نیند کے حصار میں لیٹا سو رہا تھا۔ لہٰذا وہ اس کے پہلو سے آہستگی سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔ خود کو فریش کرنے کے بعد سب سے پہلا کام اس نے حسن ولاج فون کر کے اپنی مما کو اریج کے ایکسیڈنٹ سے باخبر کرنے کا کیا تھا۔ اگلے پچیس تیس منٹ میں آسیہ بیگم، رضا صاحب، رخسانہ بیگم، سعید صاحب، فاروق صاحب سمیہ بیگم اور عاشر بھی احمر کاٹیج میں جمع تھے۔

اریج کو تمکین کا یہ اقدام بھی پسند نہیں آیا تھا۔ وہ اپنی وجہ سے کسی کو بھی پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا' تاہم اب ان سب کو تسلی دینے کے لئے انہی کے درمیان بیٹھا بول رہا تھا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں مما، بہت معمولی چوٹیں ہیں، ایک دو دن میں ٹھیک ہو جائیں گی' آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔''

''کیوں پریشان نہ ہوں' میرا دل تو کانپ گیا تھا یہ خبر سن کر، آخر یہ سب ہوا کیسے؟'' رخسانہ بیگم واقعی بے حد پریشان دکھائی دے رہی تھیں۔

اریج ان کے اس درجہ تفکر پر نہال ہو کر رہ گیا تھا۔ باقی سب لوگ بھی اس کے لئے متفکر دکھائی دے رہے تھے۔

''پلیز ڈونٹ وری مما..... کل موسم خراب تھا اور مجھے ارجنٹلی اپنے ایک دوست سے ملنے جانا تھا۔ لہٰذا تمکین کو ڈسٹرب نہ کرنے کے خیال سے میں چپ چاپ گھر سے نکل گیا۔ وہاں باتوں میں نہ تو موسم کی خرابی کا پتہ چلا نہ وقت گزرنے کا، رات دس بجے کے قریب میں وہاں سے نکلا' تو

شدید خراب موسم کی وجہ سے سیدھے راستے پر ڈرائیو نہ کر سکا' کیونکہ وہ درخت گرنے کی وجہ سے بلاک تھا، مجھے اپنی نہیں صرف تمکین کی فکر تھی، کیونکہ یہ گھر پر اکیلی تھی، اسی لئے الٹے سیدھے راستوں پر فاسٹ ڈرائیونگ کی وجہ سے گاڑی کب سڑک سے اتر کر کچے راستے پر بے قابو ہوگئی، مجھے کچھ خبر نہ ہوسکی، وہ تو بھلا ہو اس ٹیکسی ڈرائیور کا، جو میرے سامنے سے آ رہا تھا، اس نے مجھے زخمی حالت میں قریبی ہسپتال پہنچایا، اور ضروری میڈیکل ٹریٹ منٹ کے بعد میرے ہوش آتے ہی اصرار پر مجھے گھر تک چھوڑ کر گیا، وگرنہ تمکین سے کچھ بعید نہیں تھا کہ یہ مجھے جان سے مار ڈالتی۔''

تمکین خاموش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی روداد سن رہی تھی، اور وہ مسکرا رہا تھا۔

پورا دن رخسانہ بیگم کے ساتھ ساتھ' دیگر لوگ بھی وہیں رہے تھے۔ تاہم شام کی چائے کے بعد فاروق صاحب کے کہنے پر ان سب نے واپسی کا پروگرام بنایا تھا۔ رخسانہ بیگم کا ارادہ تمکین کے پاس ہی ٹھہرنے کا تھا، مگر وہ تمکین کو اریج کی تیمارداری اور خدمت کا موقع فراہم کر کے ان کے بیچ حائل فاصلوں کو کم کرنے کی غرض سے، ان دونوں کو ہی ڈھیر سارا پیار کر کے سعید صاحب کے ساتھ حسن ولاج واپس چلی آئی تھیں۔

☆☆☆

اشعر دیارِ غیر میں آ کر مزید بگڑ گیا تھا۔ گو یہاں اس کا اپنا بزنس تھا مگر پھر بھی اس کی ایک فیصد توجہ بھی کاروبار پر نہیں تھی وہ آفس میں ہوتا تب بھی لڑکیوں سے کھیلتا اور آفس میں نہ ہوتے ہوئے بھی لڑکیاں ہی اس کے قریب رہتی تھیں۔ رات دیر تک مختلف نائٹ کلبز میں اسے نہ تو پاکستان یاد آتا تھا، نہ پاکستان میں بسنے والے اپنے لوگ۔ وہ یہاں رہ کر، جیسے خود اپنے آپ کو بھی بھولتا جا رہا تھا۔ وہ یہاں رہ کر نشہ بھی کرنے لگا تھا جس کی وجہ سے روز بروز اس کی صحت تیزی کے ساتھ گرتی جا رہی تھی۔

سعید صاحب بزنس کے سلسلے میں اسے بناء اطلاع کئے اچانک نیویارک پہنچے تو اس کا حال دیکھ کر شاکڈ رہ گئے وہ اپنے آپ کو اس حد تک بھی تباہ کر سکتا ہے انہیں اندازہ نہیں تھا، تبھی انہوں نے کسی کو بھی کچھ بتائے بغیر فوراً پاکستان کال کر کے شیزا اور اس کے بچے کو وہیں بلوا لیا تھا۔

کسی بھی باپ کیلئے اپنے اکلوتے بیٹے کو اپنی آنکھوں کے سامنے مرتے ہوئے دیکھنا آسان نہیں ہوتا لہٰذا وہ بھی اندر سے ہل کر رہ گئے تھے۔ اشعر کے حال کے پیش نظر انہوں نے شیزا سے ریکویسٹ کی تھی کہ وہ جیسے بھی ہوسکتا ہے ان کے بیٹے کو زندگی کی طرف واپس لے آئے، اور شیزا نے ان کے ساتھ ساتھ خود سے بھی پرامس کر لیا تھا کہ وہ جیسے بھی ہو سکا، اشعر کو پھر سے زندگی کی طرف واپس لا کر رہے گی۔

☆☆☆

''اریج......کھانا کھا لیں، پھر آپ کو دوا کھلاتی ہوں۔'' مکمل گھریلو ذمہ دار عورت کے سراپے میں ڈھلی وہ اس سے پوچھ رہی تھی، اور اریج کے مزاج آسمان کو چھو رہے تھے۔

''مجھے بھوک نہیں ہے جب لگے گی تو بناء کہے کھا لوں گا۔'' اس کا لہجہ روکھا ہی تھا۔ تمکین کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر اسے اچانک ہو کیا گیا ہے۔ وہ تو کبھی اس سے اس لہجے میں بات نہیں کرتا تھا، وہ اس کے انداز پر ہرٹ ہو رہی تھی۔

''تھوڑا سا کھا لیں پلیز، میں نے بہت محنت سے بنایا ہے۔'' وہ رو دینے جیسی ہو گئی تھی۔ لہٰذا اریج نے ٹی وی سے توجہ ہٹا کر نگاہیں اس کے

معصوم سے سادہ چہرے پر جما دیں۔

''لے آؤ۔''

اس کا حکم ملتے ہی وہ دوڑ کر کچن میں گئی تھی، اور کچھ ہی دیر کے بعد کھانا ٹرے میں لگا کر لے آئی تھی۔ اریج کو قیمہ مٹر بہت پسند تھا، تمکین نے اس وقت اس کی یہی فیورٹ ڈش بڑی محنت سے بنائی ہوئی تھی۔ لہٰذا وہ رغبت سے کھانے میں مشغول ہو گیا تھا۔ جھوٹے منہ بھی اس نے تمکین کو ساتھ کھانا کھانے کی پیشکش نہیں کی تھی، جو کل صبح سے بھوکی تھی اور اریج کی فکر میں اس سے روٹی کا ایک نوالہ بھی حلق سے اتارا نہیں گیا تھا۔ وہ کھانا کھا چکا تو اس نے برتن سمیٹ کر رکھ دیئے پھر اس کی دوا لینے چلی آئی۔

''یہ لیں دوا کھا لیں۔''

''نہیں چاہیے۔'' بے رخی سے کہہ کر وہ بیڈ پر نیم دراز ہو گیا تھا، جواب میں تمکین محض بے چارگی سے اس کی طرف دیکھتی رہ گئی تھی۔ مکمل بلیک سوٹ میں ملبوس، اس وقت وہ بہت دلکش دکھائی دے رہا تھا۔

اریج کی ٹانگوں میں بہت تکلیف ہو رہی تھی، اس سے مکمل بے نیازی برتتے وہ اپنی تکلیف اس سے چھپا بھی نہیں رہا تھا، لہٰذا تمکین خود ہی یہ فریضہ بھی سرانجام دینے بیٹھ گئی تھی۔ نرم نرم ہاتھوں سے اس کی ٹانگیں دباتے ہوئے وہ ازحد رنجیدہ دکھائی دے رہی تھی۔ گھنیری پلکیں مسلسل جھکی ہوئی تھیں، تبھی وہ کن اکھیوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

''میں نے ڈائیورس پیپرز تیار کروا لیے ہیں، کسی سیاسی مسئلے کی وجہ سے دو تین روز کے لیے کورٹ بند ہے جیسے ہی وہ پیپرز مجھے ملے، میں سائن کر دوں گا، آئی تھنک اب تمہیں ملول رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' کل سے وہ اس کے زخموں پر مسلسل نمک پاشی کر رہا تھا، اس وقت بھی اس کے الفاظ پر تمکین کی آنکھیں لبالب آنسوؤں سے بھر آئی تھیں، جنہیں اس نے قطعی اریج سے چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''یہ آنسو..... خوشی کے ہیں، یا افسوس کے.....؟'' وہ کہاں اسے ہرٹ کرنے سے باز آ رہا تھا۔ تمکین کو اس لمحے اپنی جان سخت اذیت کے عالم میں پھنسی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اریج کو اس کا حال لطف دے رہا تھا۔ تبھی وہ اسے مزید تنگ کرتے ہوئے بولا تھا۔

''کوئی نیکی اگر کر ہی لی ہے تو دل سے کرو، آج کل کھاتی پیتی نہیں ہو کیا؟''

تمکین اس کے اس رویے کی عادی نہیں تھی۔ لہٰذا پرشکوہ انداز میں تڑپ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے سسک اٹھی۔

''کیا ہوا..... اشعر یاد آ رہا ہے؟'' وہ اتنا ظالم کب تھا۔ تمکین کی روح اندر سے بلبلا اٹھی تھی۔ آنسوؤں کے بہاؤ میں بھی مزید روانی آ گئی تھی۔ ضبط کے سارے بند جیسے ٹوٹ گئے تھے۔ وہ سسکیاں بھرتے ہوئے اس کے قریب سے اٹھی تھی۔ مگر اس سے پہلے کہ اریج سے دور جاتی، اریج نے مسکراتے ہوئے سرعت سے اس کی کلائی تھامی اور ایک جھٹکے سے خود پر گرا لیا۔ تمکین اس کے اس انداز پر بھی محض حیرانگی سے اس کی طرف دیکھتی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

اریشہ کی شادی کی تمام رسومات بخیر و عافیت انجام پا گئی تھیں۔

نورینہ بیگم شہریار صاحب کی سنگت میں بے حد مسرور، مطمئن تمام امور نمٹاتی دکھائی دے رہی تھیں۔ شہریار صاحب نے کل رات انہیں اریشہ کی معذوری کے بارے میں حقیقت بتائی تھی۔ چند لمحوں تک تو وہ اپنی بیٹی کے اتنے کامیاب ڈرامے پر حیرانی سے گنگ کھڑی، شہریار صاحب کا منہ دیکھتی رہی تھیں۔ بعد ازاں اذہان سے اس کی نسبت کے جبری فیصلے پر قدرے نادم ہوتے ہوئے، وہ بے ساختہ رو پڑی تھیں۔ واقعی اگر شہریار صاحب ان کی زندگی میں دوبارہ نہ آتے تو وہ کبھی بھی کچھ درست نہ کر پاتیں۔

اس وقت بھی شہریار صاحب نے انہیں روتے ہوئے دیکھا، تو فوراً اپنے ہاتھوں سے ان کے آنسو پونچھ کر انہیں خود میں سمو لیا۔

''رو مت پاگل عورت، یہ خوشی کا موقع ہے، یقیناً ہماری پیاری بیٹی کے لئے ازمیر سے بڑھ کر کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔''

''ازمیر کو بتایا اس نے کہ نہیں.....؟'' ان کے کندھے سے سر اٹھا کے، بھیگی ہوئی پلکوں سے فوراً انہوں نے پوچھا تھا۔ جواب میں شہریار صاحب مسکرا کر ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولے تھے۔

''پتہ نہیں، یہ خالصتاً بچوں کا آپس کا معاملہ ہے، فی الحال میری بیٹی نے صرف تمہیں باخبر کرنے کی اجازت دی ہے۔''

''جی ہاں، جیسا باپ، ویسی اولاد'' وہ چڑی تھیں، تبھی شہریار صاحب کھلکھلا دیئے تھے۔

''مانتی ہو ناں ہم باپ بیٹیوں کی عقل اور ذہانت کو۔''

''نہیں مانتی، میں کرتی ہوں جا کر اریشہ کی طبیعت صاف۔''

''اے خبردار..... جو بھرے ہجوم میں میری بیٹی کا پول کھولا تو'' وہ ان کے پیچھے ہی لپک کر کمرے سے باہر نکل آئے تھے۔

اریشہ اس وقت ماہم شاہ کے قریب بیٹھی تھی اور وہ اسے تمام حقیقتوں سے باخبر کرتے ہوئے، معافی مانگ رہی تھی۔ اریشہ کے لئے اس کا ازمیر سے محبت کا اعتراف کسی شاک سے کم نہیں تھا۔ ازمیر کی ذات سے اس کی جنوں خیز محبت مزید بڑھ گئی تھی۔

تمام مراحل سے فراغت کے بعد، اسے بالآخر ازمیر کے ڈیکوریٹڈ کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ ازمیر اس وقت صالحہ بھابھی اور حائقہ بیگم کے درمیان بیٹھا ان کی نصیحتیں سن رہا تھا۔

فرازانہ بیگم نے بھی اس موقع پر ان سے معافی مانگ لی تھی۔

''بے مثال کاٹیج'' کے برابر میں ان کا بنگلہ بھی تکمیل پا چکا تھا۔ ازمیر کی ضد اور اصرار پر اریشہ کی رخصتی ان کے نیو بنگلے پر ہی ہوئی تھی۔ کڑی ریاضتوں اور دعاؤں کے بعد بالآخر اس نے اپنے محبوب کو پا لیا تھا۔ اس لمحے خدا کی پاک ذات کا وہ جتنا بھی شکر ادا کرتی کم تھا۔ آنکھوں میں جانے کیسے کیسے ارمان و خواب سر اٹھا رہے تھے، گاؤ تکیے سے ایزی انداز میں ٹیک لگائے بیٹھی وہ ازمیر کا انتظار کر رہی تھی، جب تقریباً دو بجے کے قریب وہ کمرے میں داخل ہوا تھا۔ مارے تھکن اور نیند کے اریشہ کا حال بُرا تھا، تاہم ازمیر کی آمد پر وہ الرٹ ہو کر بیٹھ گئی تھی۔

''تم سوئی نہیں اب تک؟'' قطعی اجنبی لہجے میں، روڈ انداز کے ساتھ، دروازہ لاک کرتے ہی اس نے پوچھا تھا۔ جواب میں اریشہ نے ازحد حیران ہوتے ہوئے فوراً اپنا گھونگھٹ الٹ دیا۔

''اٹھو، اور جا کر اپنی اصلی شکل میں واپس آؤ، مجھے نیند آ رہی ہے، ڈسٹرب مت کرنا۔'' چہرے پر تناؤ لئے وہ بیڈ پر ٹک کر اپنی شیروانی اتار رہا تھا۔ جواب میں اریشہ بس حیرانی سے اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

''سنا نہیں تم نے، یوں پاگلوں کی طرح میرا منہ کیا دیکھ رہی ہو، جاؤ یہاں سے۔'' اتنی حقارت تھی اس کے لہجے میں کہ اریشہ سر سے پاؤں تک جل کر خاک ہو گئی۔

ایک جھٹکے سے اٹھ کر وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آ گئی اور نوچ نوچ کر اپنا تمام زیور اتار ڈالا۔

''بس...... خوش ہو اب، مجھے تو پہلے ہی شک تھا کہ تم مجھ سے محبت نہیں کرتے' فضول میں مما سے کی گئی تمہاری بکواس سن کر ہواؤں میں اڑنے لگی میں۔'' اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔ شدید اشتعال میں وہ اپنا ڈرامہ بھی بھول گئی تھی۔ ازمیر شاہ کی سلگتی نگاہیں، بڑے گہرے انداز میں اسے سرتاپیر تک گھور رہی تھیں۔

اس کی نگاہوں کے سوال پر ہی، اس نے بوکھلا کر، اپنی ٹانگوں کی طرف دیکھا تھا اور پھر یوں اچانک غیر متوقع طور پر اپنا پول کھل جانے، پر وہ شرمندگی سے زمین میں گڑھ کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

اشعر اپنے گھر میں شیزا کی موجودگی سے سخت خائف ہوا تھا۔ اسے اپنی نگاہوں کے سامنے دیکھ کر، پھر سے اس کے پرانے زخم ہرے ہونے لگے تھے۔ لہٰذا اس سے اپنے ''نقصان'' کا انتقام لینے کے لئے اس نے صبح و شام اسے مینٹلی ٹارچر کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے

سامنے، وہ ایک دن میں کئی لڑکیوں کو اپنے گھر لاتا، شیزا اگر لب کھولنے کی جسارت کرتی تو اسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیتا۔ روز بروز اس کی گرتی ہوئی صحت نے اندر سے شیزا کا جگر کاٹنا شروع کر دیا تھا۔ مسلسل کڑھ کڑھ کر، وہ خود نفسیاتی مریضہ بنتی جا رہی تھی۔ اب اسے پچھتاوا ہو رہا تھا کہ اس نے اشعر کو تمکین سے جدا کرنے کی سازش کیوں کی؟ کیوں ان دونوں کے ساتھ ساتھ خود اپنی زندگی بھی تباہ کر لی۔ گزرتے ہر لمحے کے ساتھ اس کا پچھتاوا بڑھ رہا تھا، اور وہ ہارتی جا رہی تھی۔ اب اس نے اشعر کی حرکتوں پر کڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کا زیادہ تر وقت عبادت کرنے میں یا پھر اپنے نصیب پر آنسو بہانے میں صرف ہوتا تھا۔

اشعر کو نہ تو اس کی پرواہ تھی نہ اپنے دو سالہ بیٹے سعد کی، جو بے حد پیارا تھا، اور بہت میٹھی میٹھی باتیں کرتا تھا۔ شیزا نے پاکستان میں سب کو یہی بتایا تھا کہ وہ خوش ہے اور اشعر اس کا خیال رکھتا ہے۔ مگر حقیقت اس کے برعکس تھی، اسے اشعر کی نگاہوں میں ذرا سی عزت بھی حاصل نہیں تھی۔ بوقت ضرورت نہایت حقارت سے وہ اس کو مخاطب کرتا تھا اور ضرورت پوری ہو جانے پر یوں پرے دھتکار دیتا جیسے وہ کوئی غلیظ چیز ہو، مگر اس کے باوجود وہ صبر سے اس کی خدمت کر رہی تھی۔ اس کا خیال رکھ رہی تھی۔ اکثر وہ شراب کے نشے میں دھت گھر واپس پہنچتا تو وہ اسے اپنی کمزور بانہوں کا سہارا دے کر اندر بیڈ روم تک لاتی، اس کے جوتے اور موزے اتارتی، کمبل دیتی، اس روز وہ گھر پر تھا اور اپنے بیڈ روم میں اندھیرا کیے ڈرنک کر رہا تھا۔ جب وہ روم صاف کرنے کی غرض سے وہاں چلی آئی۔

نشے کے باعث اسے شیزا کی نازک حالت کا اندازہ بھی نہ ہو سکا، لہٰذا اس کے بے ہوش ہونے تک وہ اسے پیٹتا ہی رہا۔

شیزا اس کی زیادتیوں پر جس قدر خاموش رہ کر اس کے ساتھ وفا نبھا رہی تھی، وہ اتنا ہی چڑ کر اس پر اپنے مظالم کے پہاڑ توڑ رہا تھا۔ بعض اوقات وہ غصے میں ہوتا تو ننھے سعد کو روتے دیکھ کر اسے بھی دو تین ہاتھ جڑ دیتا تھا۔ کتنا زیادہ بدل اور بکھر گیا تھا وہ کہ شیزا کے لئے اسے سمیٹنا جیسے ممکن ہی نہیں رہا تھا۔ وہ سرعام اس کا تمسخر اڑاتا تھا اور اپنے دوستوں میں ذلیل کرتا تھا، جواب میں وہ محض صبر کا گھونٹ پی کر رہ جاتی تھی۔

پچھلے دو تین دنوں سے وہ تیز بخار کی زد میں تھا اور شیزا کی جیسے جان پر بن آئی تھی۔ جن سے ٹوٹ کر محبت کی جاتی ہے پھر خواہ وہ دکھ اور اذیت کے سوا اور کچھ بھی نہ دیں، ان سے لاپرواہ ہو کر جیا نہیں جاتا۔ وہ بخار میں بے سدھ پڑا تھا، اور شیزا اس کا چیک اپ کروانے کے بعد اپنے آرام کی پرواہ کیے بغیر رات بھر اس کے ماتھے پر ٹھنڈی پٹیاں کرتی رہی تھی۔ یہی نہیں بلکہ رات بھر بے آرامی کے باوجود اگلے روز بھی وہ گھن چکر بنی، کبھی اس کے لئے سوپ بنا رہی تھی تو کبھی اصرار کر کے اسے دوا کھلا رہی تھی۔ اس کی اتنی ریاضتوں کے باوجود اشعر کا دل اس کی طرف مائل نہیں ہوا تھا۔ البتہ اس کے مظالم میں کمی ضرور آ گئی تھی۔ وہ صحت یاب ہوا تو شیزا اس کے چیک اپ کے سلسلے میں زبردستی اس کے ساتھ چلی آئی، اور یہیں اسے ڈاکٹر جوزف کی زبانی یہ معلوم ہوا تھا کہ کثرت شراب نوشی کے باعث اشعر اپنے گردوں کو شدید نقصان پہنچا چکا ہے، لہٰذا جب تک اس کے لئے ایک نئے گردے کا بندوبست نہیں ہوتا، اس کی زندگی کی بقاء کے بارے میں کچھ بھی کہنا درست نہ ہوگا۔ ڈاکٹر جوزف کے اس انکشاف پر وہ پتھرا کر رہ گئی تھی، جبکہ اشعر یوں لاتعلق بنا بیٹھا تھا جیسے اسے اس بات سے کوئی فرق نہ پڑتا ہو۔

شام کو وہ لاؤنج میں بیٹھا تھا۔

''فارگاڈ سیک اشعر، اب تو رحم کرلو خود پر، کیوں نہیں سمجھتے ہو تم یہ زہر ہے تمہارے لئے، میرا نہیں تو اپنے معصوم بچے کا خیال کرلو۔ پلیز......''

''شٹ اپ میں اپنی زندگی خود اپنی مرضی سے جینے کا مکمل حق رکھتا ہوں، تمہیں اگر کوئی تکلیف ہے تو دفع ہو جاؤ یہاں سے، مجھے تمہاری ہمدردیوں کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا، جب شیزا انتہائی شکستہ انداز میں اس کے قدموں سے لپٹتے ہوئے بولی۔

''آئی ایم سوری اشعر، ایم ریئلی ویری سوری، مجھے اعتراف ہے کہ میں نے تمہارے ساتھ برا کیا ہے، تم سے تمہاری خوشیاں چھینی ہیں مگر تمہیں رلا کر، میں خود کب مسکرا پائی ہوں، قصور میں نے کیا ہے، سزا بھی مجھے ہی ملنی چاہیے، تم خود کو کیوں موت کی طرف دھکیل رہے ہو۔ پلیز ایسا مت کرو اشعر، لمحے لمحے کی موت مت دو مجھے، پلیز......''

یہ شیزا اس شیزا سے کتنی مختلف تھی جس سے وہ نفرت کرتا تھا، تاہم پھر بھی اس کا غبار نہیں دھلا تھا۔ ایک ٹھوکر سے اسے پرے دھکیلتے ہوئے وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا گھر سے باہر نکل آیا تھا۔

☆☆☆

''آئی ایم سوری ازمیر۔''

اس کے سخت رویے کی اصل وجہ سامنے آتے ہی اریشہ کی تمام تر خفگی ندامت میں ڈھل گئی تھی۔ جواب میں وہ جیسے پھٹ پڑا۔

''شٹ اپ، تم سمجھتی کیا ہو اپنے آپ کو، بہت بڑی اداکارہ ہو تم، اور میں...... میں تمہیں پرلے درجے کا احمق دکھائی دیتا ہوں' جس کے جذبات سے تم اتنے دنوں تک کھیلتی رہیں۔ سب کی آنکھوں میں دھول جھونکتی رہیں۔ کیوں ایسا کیا؟ کیا افتاد آپڑی تھی تم پر......؟'' وہ اس سے سخت کبیدہ خاطر دکھائی دے رہا تھا۔

اریشہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس کا دل اپنی طرف سے کیسے صاف کرے۔

''ازمیر...... میں نے جو کچھ بھی کیا' تمہاری وجہ سے کیا۔'' کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد' بالآخر وہ سر جھکا کر انگلیاں چٹخاتے ہوئے بولی تھی، جواب میں وہ پھر بھڑک اٹھا۔

''نری بکواس ہے یہ۔'' کس قدر بدگمان ہو رہا تھا وہ اس کی طرف سے۔ اریشہ کی آنکھیں لمحے میں آنسوؤں سے بھر آئی تھیں۔

''میری محبت بکواس لگ رہی ہے تمہیں، کیا تم نہیں جانتے کہ مما نے میری نسبت اذہان سے طے کردی تھی۔ وہ جلد از جلد میری شادی بھی کرنا چاہ رہی تھیں، مگر...... میرا دل اذہان کی رفاقت کو نہیں مان رہا تھا۔ میں نے مما سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میں تم سے پیار کرتی ہوں' اذہان کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی' لیکن وہ تم سے بدظن تھیں، اسی لئے انہوں نے میری خوشی کی بھی پرواہ نہیں کی اور شادی کی ڈیٹ فکس کردی، تم مجھ سے دور تھے بار ہا میرے اقرار محبت کے باوجود تم نے میرے لئے کچھ نہیں کیا تھا، لیکن...... تمہاری آنکھیں مجھ سے کہتی تھی کہ تم بھی مجھ سے محبت کرتے ہو، اسی لئے میں قربان ہونا نہیں چاہتی تھی، لہٰذا اپنی دوستوں سے اپنا دکھ کہا تو انہوں نے ہی مجھے اس ناٹک کا مشورہ دیا جس سے ہمارا ملاپ ممکن ہوا، کیا کیا

نہیں کیا میں نے تمہارے لئے، اس فضول ڈرامے کے لئے کتنی مصیبتیں نہیں اٹھائیں، پھر بھی تم مجھ پر خفا ہو رہے ہو۔"

وہ جانتی تھی اگر اس لمحے اس نے وضاحت نہیں کی تو دونوں کے بیچ غلط فہمیاں بڑھتی جائیں گی، لہٰذا ساری بات صاف صاف کھول کر بیان کردی تو ازمیر قدرے چونک اٹھا۔

نم نم سی پلکوں کے ساتھ سر جھکائے سوں سوں کرتی، وہ سیدھی دل میں اتر رہی تھی۔ تبھی وہ خود چل کر اس تک آیا تھا، پھر اس کے دونوں کندھوں کو مضبوطی سے تھام کر، اس کا چہرہ اوپر کرتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔

"ریشی..... مجھ سے اتنا پیار کرتی ہو تم.....؟" اس کے اقرار محبت پر حیران ہوتے ہوئے نہال ہی تو ہو گیا تھا۔

"اب نہیں کرتی۔" خفگی سے کہہ کر رخ موڑتی وہ اپنے کندھوں پر دھرے اس کے ہاتھ جھٹک گئی تھی۔

"کیوں..... اب کیا ہو گیا؟" وہ پھر الجھا تھا۔ تاہم اریشہ نے کوئی بھی جواب دیئے بغیر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آ کر اپنا میک اپ صاف کرنا شروع کر دیا تھا۔

"ارشی..... آئی ایم سوری یار....."

"نو..... میں نہیں بولتی تم سے، تم نے مجھے ڈانٹنے ڈپٹنے کا سوچا بھی کیسے۔"

"غلطی ہو گئی یار، پلیز معاف کردو، آئی پرامس، آئندہ پوری زندگی میں کبھی ایسی گستاخی نہیں کروں گا۔" اس کا ہاتھ پکڑے وہ اسے میک اپ صاف کرنے سے باز رکھ رہا تھا۔

"ہرگز نہیں....." اب وہ اسے ستانے کا مزہ لے رہی تھی، اور ازمیر اس کی شرارت بھانپ گیا تھا، تبھی اس کے نازک سے وجود کو بانہوں میں بھر کر اٹھایا، تو وہ چیخ پڑی۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟"

"بدتمیزی نہیں، لاتوں کے بھوت کو باتوں سے منانے کی کوشش کر رہا ہوں۔" اسے بیڈ پر لٹا کر اس نے اپنا چہرہ اس کے کانوں کے قریب کیا تو اریشہ کی سانس جیسے اٹک کر رہ گئی۔ ازمیر کی اس درجہ قربت نے اسے بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔

"تم کیا سمجھتی ہو میں اتنی خوبصورت اور یادگار رات کو فلمی کہانیوں کی طرف فضول کے جھگڑے کی نذر کر دوں گا؟"

اریشہ کی گھبراہٹ اور گالوں کی سرخی اسے مزید لطف دے گئی تھی۔ تبھی وہ جان بوجھ کر مزید قریب ہوا تھا۔

"ازمیر..... پلیز..... میری سانس رک جائے گی۔"

اتھل پتھل ہوتی دھڑکنوں سے بے حال وہ اس کے سینے پر ہاتھ رکھے اسے فاصلے پر رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جواب میں وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"واہ..... میں تمہاری سانس رکنے دوں گا بھلا۔" من پسند ہمسفر کی قربت اسے پاگل کر رہی تھی۔ اریشہ کے لئے اس کا یہ نیا روپ بہت

دلچسپ تھا۔

''تھینکس گندی ارشی۔'' اگلے ہی پل وہ اس کے ہاتھ تھام کر چومتے ہوئے بھرپور سرشاری سے کہہ رہا تھا۔

''اب تھینکس کس لئے؟'' بمشکل نظریں اٹھا کر اس نے ازمیر کی طرف دیکھا تھا۔

جواب میں وہ اپنا بازو اس کے شانوں کے گرد حمائل کر کے اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے بولا۔

''اس ساری کوشش اور پلاننگ کے لئے جو تم نے میرے لئے کی' لو اب رونمائی کا تحفہ بھی قبول کرو۔'' کہنے کے ساتھ ہی اس نے اپنے لب اریشہ کی دمکتی پیشانی پر رکھ دیئے تو وہ بلش ہونے کے باوجود احتجاج کر گئی۔

''یہ فاؤل ہے ازمیر' صبح سب لوگ مجھ سے رونمائی گفٹ کا پوچھیں گے تو میں ان کو کیا دکھاؤں گی۔'' کتنی معصومیت سے وہ پوچھ رہی تھی، ازمیر سے اس لمحے اپنے دل پر قابو رکھنا محال ہو رہا تھا۔

''اپنی پیشانی دکھا دینا۔''

''میں نہیں بولتی۔'' کتنا پیارا تھا اس کا یہ انداز' وہ بے ساختہ کھلکھلا کر اسے خود میں سمو گیا تھا۔

''کیوں نہیں بولتی تم' اتنے پاپڑ بیل کر تو اپنے ازمیر کو ملی ہو۔''

اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کیا کر ڈالے...... کچھ لمحوں کی مدہوش کن خاموشی کے بعد وہ دوبارہ بولا تھا۔

''دیکھو اریشہ...... جذبے اگر سچے ہوں تو منزل بھی مل ہی جایا کرتی ہے شہرین خان کے ٹھکرانے کے بعد میں بہت بکھر گیا تھا' مجھے لگتا تھا جیسے میں کوئی فالتو شخص ہوں، جس سے کسی کو بھی محبت نہیں ہو سکتی' مگر...... تمہاری آنکھوں میں اپنے لئے پیار دیکھ کر' میں پھر سے زندگی کی طرف لوٹ آیا، میں نے کبھی تمہیں یہ نہیں بتایا اریشہ کہ میں تمہارے لئے کتنا تڑپا ہوں' ابتداء میں مجھے لگتا تھا کہ اگر میں تمہاری طرف بڑھا تو تم بھی شہرین کی طرح جھٹ میرے ظاہر کو دیکھتے ہوئے میری انسلٹ کر دو گی' لیکن بعد میں جیسے جیسے تمہاری محبت میرے دل میں بلند مقام بناتی گئی' میں نے خود کو چھوڑ کر تمہارے لئے سوچنا شروع کر دیا' تمہاری خوشی' تمہاری عزت' تمہارا مستقبل' یہی مطلوب تھا مجھے' میں خود بے حال ہو کر خون کے گھونٹ پی کر دل پر جبر کرتا رہا' خود کو یہی سمجھاتا رہا کہ تم صرف اذہان جیسے خوبصورت اور سلجھے ہوئے لڑکے کے ساتھ ہی خوش رہ سکتی ہو' لیکن دل نہیں مانتا تھا ارشی' رات کو نیند نہیں آتی تھی' اور پھر دیکھ لو قدرت کو میرے پرخلوص جذبات پر رحم آ ہی گیا۔''

اس کا چہرہ سچی خوشی کی غمازی کر رہا تھا۔ اریشہ اس کے منہ سے اپنے لئے محبت کا اعتراف سن کر پھر سے سرشار ہو گئی تھی۔

''ارشی۔'' کچھ دیر پھر سے اس کی قربت میں مدہوش ہوتے ہوئے اس نے سرگوشی کی تھی' جواب میں' اریشہ جی جان سے متوجہ ہو گئی۔

''ہوں......'' اپنا سنبھالنا جیسے اس کے لئے بھی ممکن نہیں رہا تھا۔

''مما کہتی ہیں انہیں اپنے اکلوتے بیٹے سے پورے بارہ پوتے اور پوتیاں چاہئیں۔''

''دھات......'' وہ جو اس کی قربت میں اپنے ہوش کھو رہی تھی' اس انوکھی فرمائش پر جھٹکا کھا کر سیدھی ہوئی تو ازمیر شرارت سے کھلکھلا کر

ہنس پڑا، تب وہ اس کی شرارت سمجھ کر خود بھی ہنستے ہوئے اس کے کشادہ سینے پر بے دریغ مکے برسانے لگی تھی۔

رونمائی میں ازمیراب اسے ڈائمنڈ نیکلس پہنا رہا تھا اور وہ دل ہی دل میں خدا کی پاک ذات کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے ہوئے اپنے من پسند ہمسفر کو دیکھ رہی تھی جس کے سنگ قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے اب اسے زندگی کی ہر بہار کو خلوص سے خوش آمدید کہنا تھا۔

☆☆☆

پورے دو روز غصے میں گھر سے باہر رہنے کے بعد تیسرے روز وہ گھر واپس آیا تو شیزا گھر میں نہیں تھی۔ پورا گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا' تب ایک لمحے کے لئے چونکتے ہوئے اس کا دل انجانے وسوسوں سے دھڑکا تھا۔ تاہم اگلے ہی پل یہ سوچ اس کے ذہن میں در آئی تھی کہ ضرور وہ اسے چھوڑ کر کسی اور کے ساتھ وقت گزارنے کے لئے چلی گئی ہوگی۔ گھر کا لاک وہ دونوں ہی کھول سکتے تھے' ضرور اس نے اشعر کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھایا تھا' ذہن میں اس سوچ کے آتے ہی اس کا شفاف دل پھر سے شیزا کے لئے میلا ہو گیا۔ حالانکہ دو روز گھر سے باہر رہ کر، اپنا احتساب کرنے کے بعد اس نے خود سے پرامس کیا تھا کہ اب وہ اس کے ساتھ جس قدر ممکن ہو سکا انصاف کرے گا' اور اسے بلاوجہ ذہنی اذیت نہیں دے گا' تاہم اس وقت اجنبی دیس اور اجنبی شہر میں اس کی گھر سے عدم موجودگی نے اس کا ذہن پھر سے پراگندہ کر دیا تھا۔ ابھی جانے وہ اس کے بارے میں مزید کیا کیا غلط سوچتا' کہ وہ ننھے سعد کے ساتھ' برابر والی ہمسائی مسز جانسن کے سہارے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی گھر میں داخل ہو گئی۔ اشعر کی نگاہ جونہی اس پر پڑی، وہ غصے سے لپک کر اس کی طرف بڑھا۔

''ذلیل عورت' بناء مجھے انفارم کیے کس کے ساتھ عیاشی کرنے گئی تھیں تم۔''

ایک طمانچہ اس کے دائیں گال پر رسید کرتے ہوئے مسز جانسن کے خیال سے وہ اردو میں ہی پھنکارہ تھا۔ جواب میں شیزا کی آنکھیں نم ہو گئیں' جبکہ سعد اس غیر متوقع سچویشن پر بے ساختہ رو پڑا تھا۔

تب مسز جانسن' حیرانی سے اس کی طرف دیکھتی ہوئی بلند آواز میں بولی تھیں۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے اشعر......؟''

''کوئی بدتمیزی نہیں ہے، یہ مکار عورت اسی سلوک کے قابل ہے، آپ جائیں پلیز یہاں سے۔'' خالص انگریزی میں کہتے ہوئے اس نے مسز جانسن کی بھی انسلٹ کر دی تھی۔ جواباً وہ چلاتے ہوئے بولی تھیں۔

''تم پاگل ہو گئے ہو' یہ عورت پچھلے دو روز سے ہسپتال میں ایڈمٹ تھی' مجھے ساتھ لے کر گئی تھی، جاننا چاہو گے کیوں......تمہارے لئے اپنے گردے کا عطیہ دینے' تمہیں کیا پتہ کتنی تکلیف سہی ہے اس نے اور تم......تم اسے مزید تکلیف دے رہے ہو' ترس آتا ہے مجھے ایشیائی عورتوں پر بڑی بے بس مخلوق۔''

جتنا کچھ وہ اس ایک لمحے میں کہہ سکتی تھیں' انہوں نے کہہ ڈالا تھا' پھر اس کے بعد وہ ایک سیکنڈ کے لئے بھی وہاں نہیں ٹھہری تھیں۔

اشعر اب پھٹی پھٹی نگاہوں سے' صوفے پر نڈھال بیٹھی شیزا کو دیکھ رہا تھا۔

''تم نے گردہ دیا ہے میرے لئے؟ کیوں......؟'' کس قدر بے یقینی سے وہ پوچھ رہا تھا۔ شیزا نے اس کے سوال پر بہتے آنسو رگڑ ڈالے تھے۔ پھر نم پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھتی ہوئی بولی تھی۔

''میں نے سعید انکل سے پرامس کیا تھا کہ تمہیں زندگی کی طرف واپس لا کر رہوں گی تمہاری وجہ سے پاکستان میں کسی کو بھی دکھ نہیں پہنچے گا' لیکن میں ہار گئی اشعر، جب گنہگار تھی تو کسی سے ہار نہیں مانی تھی، مگر توبہ کرنے کے بعد میں تمہاری نفرت سے ہار گئی اشعر' اگر تم زندہ نہیں رہو گے تو میں بھی یہاں سے زندہ پاکستان واپس نہیں جاؤں گی، اسی لئے یہ قدم اٹھایا ہے میں نے۔''

اشعر یک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور وہ آنسو پینے کی کوشش کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''میں نے ڈاکٹر جوزف سے تفصیلی بات کر لی ہے' وہ تمہارا آپریشن کرنے کو تیار ہیں، اس کے بعد ایک نئی زندگی تمہاری منتظر ہو گی اشعر، پھر دل چاہے تو اس خطا کار کو معاف کر دینا' نہ چاہو تو میں تمہارے کسی بھی فیصلے پر اف نہیں کروں گی۔''

محبت واقعی انسان کو کتنا بدل کر رکھ دیتی ہے۔ وہ جس کی محبت میں انسان سے حیوان ہو گیا تھا، اس نے اتنے دنوں میں ایک فون کر کے اس کی خیریت تک دریافت کرنا گوارہ نہیں کی تھی، اور اس کے سامنے بیٹھی یہ لڑکی جسے وہ اپنی نفرت کے قابل بھی نہیں سمجھتا تھا' اس کے لئے اس کی زندگی کے لئے اپنے وجود کا ایک حصہ نکال کر دان کر آئی تھی۔

ایک لمحے میں گھڑوں پانی پڑا تھا اس پر۔ اپنی غلیظ سوچ اور گھٹیا حرکتوں پر یکلخت ہی ڈھیروں پشیمانیاں محسوس ہوئی تھیں۔

اس نے تمکین سے محبت کی تھی مگر اسے دکھ اور ذلالت کے سوا کچھ نہ دے سکا تھا جبکہ شیزا نے اس سے محبت کر کے بھی تا حال دکھ ہی اٹھائے تھے۔ اس وقت لفظ "سوری" کس قدر چھوٹا، بے معنی اور بھونڈا محسوس ہو رہا تھا۔ تبھی وہ کچھ پل سوچ کر اپنائیت سے اس کے ہاتھ تھامتے ہوئے گھمبیر لہجے میں بولا تھا۔

"مسز جانسن درست کہتی ہیں، ایشیائی عورتیں کبھی کسی کی سمجھ میں آ ہی نہیں سکتیں کیوں کیا تم نے ایسا شیزا؟ قصوروار تو میں بھی ہوں، تمکین کو خود میں نے الگ کیا، جو کچھ بھی غلط ہوا اب میری وجہ سے ہوا پھر میں کیوں اتنے دنوں تک تم پر غصہ اتارتا رہا تھا اور تم بھی کیوں پتھر کی مورت بن کر سب کچھ سہتی رہیں؟ تم چاہتیں تو مجھے اریسٹ کروا سکتی تھیں پھر کیوں نہیں کیا تم نے ایسا.....؟ کیوں تم مشرقی عورتیں ہمیشہ صبر اور برداشت کا نمونہ بنی رہتی ہو؟"

اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی آئی تھی، تاہم اس سے پہلے کہ شیزا جواب میں کچھ کہتی وہ فوراً اٹھ کر تیز تیز چلتا لاؤنج سے باہر نکل گیا تھا۔ شیزا کے لئے اس کے جذبات اتنا احساس ہی کافی تھا۔ مارے خوشی کے اس کی آنکھیں پھر سے چھلک آئی تھیں۔

اگلے ہی روز اشعر کا کامیاب آپریشن ہو گیا تھا۔ اسے اپنا بال بال شیزا کے خلوص کے قرض میں جکڑا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہی تھی جو اس کی تمام بری عادتیں چھڑا کر اسے زندگی کی طرف واپس لائی تھی۔

"شیزا آئی ایم سوری یار! آئندہ کبھی تمہیں تنگ نہیں کروں گا۔ تم جیسے کہو گی ویسے ہی کروں گا۔ اپنا خیال بھی رکھوں گا۔ ڈیلی سوتے ہوئے دودھ بھی پیوں گا، سگریٹ بھی چھوڑ دوں گا، بس تم مجھے معاف کر دو، میں اب مزید بے سکون رہنا نہیں چاہتا۔"

اگر وہ پہلے جیسی نہیں رہی تھی تو اشعر بھی سرتاپا بدل گیا تھا۔ اسی لئے سعد کے ساتھ کھیلتے ہوئے اس نے شیزا کا ہاتھ تھاما تو وہ اس کے مضبوط کندھے سے ٹیک لگا کر مسکرا دی۔

"اوکے، جاؤ معاف کیا، تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کس دریا دل لڑکی سے واسطہ پڑا تھا۔" وہ دل سے مسکرا رہی تھی۔ بے شک ایک گردے کے بدلے زندگی بھر کی محبتوں کا یہ سودا ہرگز مہنگا نہیں تھا۔

☆☆☆

"بس..... یہیں تک برداشت تھی تمہاری۔" وہ حیرانی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی، جب وہ مزے سے اسے بانہوں میں بھرتے ہوئے مسکرا کر بولا۔ تمکین کی آنکھوں میں ابھی تک بے یقینی تھی۔

"آئی ایم سوری۔" اگلے ہی لمحے وہ پھر بولا تھا، جواب میں تمکین کسی ہارے ہوئے جواری کی مانند اس کے سینے پر سر ٹکا کر چپ چاپ رو پڑی۔

"اب بتاؤ اریج احمر کی محبت میں زیادہ پاور ہے یا تمکین اریج کی نفرت میں۔"

مزاج کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے کا رنگ بھی بدل گیا تھا۔ تمکین چپ چاپ روتی رہی تھی۔

''یار اب تو یہ رونا دھونا بند کر دو اب تو معذرت بھی کر لی۔'' تمکین کے آنسو اسے بے چین کر رہے تھے۔ تبھی وہ اس کے دراز بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا تھا۔ تاہم تمکین نے اب بھی اپنا مشغلہ ترک نہیں کیا تھا۔

''چپ ہو جاؤ پاگل لڑکی، تمہاری قسم کھا کر کہتا ہوں میں ہرگز تمہیں ڈائیورس دینے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا، میں نے پلان کیا تھا کہ پاکستان واپس آنے کی بجائے وہیں کسی روڈ ایکسیڈنٹ کا شکار ہو جاؤں گا تاکہ تم اور اشعر پھر سے مل جاؤ اور میں بھی لمحہ لمحہ سسک کر جینے سے بچ جاؤں، پچی تمکین، کچھ روز پہلے تک میری یہی سوچ تھی کہ تم خود پھر سے اشعر کی کسٹڈی میں جانا چاہتی ہو، اسی کے ساتھ خوش رہنا چاہتی ہو مگر...... میرے لئے تمہیں پا کر کھو دینا موت کے مترادف تھا، اسی لئے تم سے بھاگ رہا تھا، پر تم نے واپس بلا کر میری یہ کوشش بھی ناکام بنا دی، میں رئیلی تمہارے بغیر نہیں جی سکتا تمکین، جو چاہو قسم لے لو۔''

وہ جس اعتراف جس سرخروئی کی متمنی تھی، وہ اعتراف اس نے اب کیا تھا۔ تمکین کے اندر تک سکون کی لہر سرایت کر گئی تھی، اور وہ کہہ رہا تھا۔

''تم سوچ بھی نہیں سکتیں تمکین کہ تمہیں اپنے لئے پریشان دیکھ کر مجھے کتنا قرار ملا ہے۔ یہ تصور ہی میرے لئے فرحت بخش ہے کہ تمہیں میری فکر، میری پرواہ ہے، پرسوں جس طرح سے تم موسم سے خوف زدہ ہو کر، میرا ویٹ کرتی رہی تھیں اور پھر مجھ سے الجھی تھیں، یقین کرو، تمہارا وہ انداز دیکھ کر پوری رات میرے اندر ہلچل مچی رہی تھی۔'' پہلی بار محبت کے اعتراف کے مراحل طے کرتا وہ اس کے دل میں اندر تک اتر رہا تھا۔

''نمو! مجھے زندگی نے کبھی کچھ نہیں دیا، ہمیشہ محرومیاں ہی محرومیاں آئی ہیں میرے حصے میں، بہت رویا ہوں میں ذرا سی محبت کے لئے اس خواہش کے لئے کہ کوئی تو ہو جس سے میں اپنے دل کی بات شیئر کر سکوں، جو میرے دکھ کو محسوس کرے اور میرے لئے روئے میری خوشی پر خوش ہو، بولو نمو، کیا تم اپنی محبت سے میری تمام محرومیوں کا ازالہ کرو گی؟'' کس قدر تشنگی تھی اس کے لہجے میں، تمکین کی ہر کسک قرار پا گئی تھی۔

وہ اب بھی بس خاموشی سے سر ہلا کر عہد کر رہی تھی، تبھی اریج کو اچانک کچھ یاد آیا تھا اور وہ ایک جھٹکے سے تمکین کو علیحدہ کرتے ہوئے اٹھ بیٹھا تھا۔

''بے وفا، بدتمیز لڑکی، ایک بات کی باز پرس کرنا تو میں بھول ہی گیا۔'' اپنے ہر انداز سے وہ اسے حیران کر رہا تھا۔

تمکین کی سوالیہ نگاہیں اب اس کے وجیہہ سراپے پر تھیں۔

''تم نے مجھ سے چھپایا کیوں کہ میں...... پاپا بننے والا ہوں۔'' وہ زندگی میں پہلی بار اسے اس درجہ مسرور دیکھ رہی تھی تاہم اس کے سوال پر قدرے چونکتے ہوئے فوراً اس نے سر جھکا لیا تھا۔ کتنا گھنا تھا وہ، سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بننے کا ناٹک کر رہا تھا۔ تمکین کی لرزتی پلکیں اور سرخ رخسار اسے شرارت پر آمادہ کر رہے تھے مگر وہ اپنے احساسات کنٹرول میں رکھتے ہوئے بہت اپنائیت سے اس کے ہاتھ تھام کر بولا تھا۔

''نمو! تم مجھ سے ناراض تو نہیں ہو ناں، دیکھو جو بھی غصہ گلہ ہے ابھی دور کر لو، بعد کی ساری زندگی ہم بہاروں سے منسوب کریں گے۔''

''بالکل لیکن...... اب اگر آپ نے اشعر کے حوالے سے مجھے کوئی طعنہ دیا ناں تو بڑی ماں سے آپ کی شکایت کر دوں گی۔'' ایک طویل

عرصے کے بعد وہ اپنے پرانے روپ کی طرف لوٹی تھی۔ اریج نے اس کی دھمکی پر بے ساختہ قہقہہ لگایا تھا۔

''او کے منظور ہے۔ سارے حساب کتاب بعد میں، ابھی تو تم میری تیمارداری کرو ناں۔'' وہ پھر شرارت پر آمادہ ہوا تھا، لیکن تمکین اس کی چالاکی سمجھ کر، اپنا دوپٹہ سمیٹتے ہوئے فوراً بیڈ سے اتر گئی تھی۔

''اب آپ کی تیمارداری کرتی ہے میری جوتی۔'' دروازے کے پاس پہنچ کر اسے چڑانے کو کہتی ہوئی وہ مسکرائی تو اریج بھی فوراً بیڈ سے اٹھا۔ تاہم وہ اس سے پہلے ہی کمرے سے باہر نکل کر دروازہ لاک کر گئی تھی اور اب کھلی کھڑکی میں کھڑی اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ اریج بے چارگی سے اس کی طرف دیکھتا ہوا مسکرا رہا تھا۔ بے شک قدرت نے تمکین کی صورت اس کی تمام محرومیوں کا ازالہ کر دیا تھا۔

☆☆☆

سیل فون اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ ساکت بیٹھی، اسے آف کیے بغیر، جیسے فضاء میں تحلیل ہو رہی تھی۔

عدنان اس کے ساتھ اتنی بڑی بے وفائی بھی کر سکتا ہے وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس لمحے اس کا دل جیسے کسی نے سینے سے نکال کر مٹھی میں مسل ڈالا تھا۔ عدنان کے بغیر تو زندہ رہنے کا کوئی مقصد ہی نہیں تھا اس کے پاس، وہ اپنے ''نقصان'' پر بلک بلک کر رونا چاہتی تھی مگر اس کی آنکھیں جیسے پتھرا کر رہ گئی تھیں۔

اندر جیسے درد کا گھٹن آمیز دباؤ بڑھ گیا تھا۔

ابھی کچھ لمحوں کے بعد اسے ایک نہایت امپورٹنٹ میٹنگ اٹینڈ کرنی تھی۔ اسی سلسلے میں اس کی پرسنل سیکریٹری بلکے سے دروازہ ناک کر کے اس کے کیبن میں داخل ہوئی تھی۔

''میڈم! میٹنگ کا ٹائم ہو گیا ہے، سب آپ کا ہی ویٹ کر رہے ہیں۔''

اس نے سیکریٹری کی بات جیسے سنی ہی نہیں تھی۔ اپنی زمین بوس ہوتی ذات کے سانحے پر وہ آفس میں بین کرنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

تبھی گم حواس کے ساتھ، نڈھال سی اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''سب کچھ ختم ہو گیا، سب کچھ......''

اپنا پرس اور سیل اس نے ٹیبل پر ہی چھوڑ دیا تھا، سیکرٹری اس کے انداز پر جی بھر کر حیران ہوئی تھی۔

''میڈم، آر یو او کے؟''

جونہی کیبن کا دروازہ کھول کر باہر نکلی، سیکرٹری اس کے پیچھے لپکی تھی۔ مگر وہ اپنے حواس میں ہی کہاں تھی، جو اس کے سوال کا جواب دیتی، اس کے تصور میں تو محض عدنان کا ہنستا مسکراتا چہرہ ہی گھوم رہا تھا۔

پل میں پورے آفس اسٹاف کی توجہ اس کے لٹے پٹے سراپے کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔

کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان کی سخت گیر باس آخر کس صدمے کے تحت یوں ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گئی ہیں۔ آفس سے گھر تک کا

فاصلہ اس نے جیسے پل صراط پر چلتے ہوئے طے کیا تھا۔

اس وقت جو درد اسے اپنے حصار میں لئے ہوئے تھا، وہ درد تو اس نے دادا جی کی وفات پر بھی محسوس نہیں کیا تھا، کیا تھا عدنان رؤف اس کے لئے......؟

اس کی سانس، دھڑکن، یا پھر جینے کا واحد مقصد......؟

بلک بلک کر رونے کی خواہش میں جونہی وہ گھر کے اندر داخل ہوئی لڑکھڑا کر دہلیز پر گر پڑی۔

ٹانگوں میں جیسے اس کا بوجھ مزید سہارنے کی طاقت ہی نہیں رہی تھی۔ کس مشکل سے وہ خود کو گھسیٹتی صحن تک آئی تھی، اسے سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا کہ وہ یہ منحوس خبر سیال بیگم یا احمد رؤف صاحب کو کن الفاظ میں سنائے، پورا گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ سیال بیگم اور احمد رؤف دونوں ہی گھر پر نہیں تھے۔

زندہ لاش کی طرح بے حال، دوپٹے سے بے نیاز، وہ اپنے کمرے میں آکر بیڈ پر گرتے ہی بلک بلک کر رو پڑی۔

''نہیں......تم ایسا نہیں کر سکتے عدنان، تم مجھے اس طرح سے چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔'' آنسوؤں کو جونہی تنہائی میں بکھرنے کا موقع ملا وہ بہتے چلے گئے۔

انجشاء اپنے ہوش وحواس میں نہیں رہی تھی۔ شدت غم سے حلق سوکھ کر زخمی ہو رہا تھا۔

''تم مجھ سے یوں بے وفائی نہیں کر سکتے، پرامس کیا تھا تم نے مجھ سے کہ تم واپس آؤ گے، میرے ساتھ، اتنا بڑا دھوکا مت کرو عدنان، مر جاؤں گی میں، پلیز لوٹ آؤ۔''

''ٹھیک ہے اور کوئی حکم......؟''

وہ درد سے چلا رہی تھی جب مکمل بلیک جینز شرٹ میں ملبوس دونوں ہاتھ سینے پر باندھے، زندہ جاوید عدنان رؤف خود اپنے پاؤں پر چل کر اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

ایک مرتبہ پھر انجشاء کی بصارتیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔

''تت......تم زندہ ہو؟''

''الحمد للہ......اتنی جلدی تمہاری جان کیسے چھوڑ سکتا ہوں میں۔'' فریش چہرے کے ساتھ مسکرا کر کہتا ہوا وہ اس کے قریب ہی آبیٹھا تھا۔

''کہو......کیسا لگا ہمارا سرپرائز......'' کتنا خوش تھا وہ انجشاء کو اپنے لئے روتے ہوئے دیکھ کر۔ انجشاء کے آنسو پلکوں پر ہی اٹک گئے تھے۔

''تمہارا مطلب ہے، وہ فون تم نے کروایا تھا۔؟''

''نہیں، قسم لے لو میں نے نہیں کروایا، یہ شاہد کی شرارت تھی، اسی نے مجھے ایئرپورٹ سے پک کیا تھا، امی ابو کو وہ پہلے ہی گھر لے جا چکا ہے۔ میں نے اس سے تمہارا پوچھا تو وہ شرارت سے ہنس دیا، پھر اسی نے بتایا کہ وہ نیویارک سے تمہیں میرے لئے افسوسناک فون کروا چکا ہے، قسم لے لو انجو جیسے ہی مجھے اس کی اس شرارت کا پتہ چلا میں مما کو بتا کر فوراً وہاں سے نکل کھڑا ہوا، پہلے آفس پہنچا تو پتہ چلا کہ تم وہاں سے اٹھ چکی ہو، تب

بھاگم بھاگ گھر آیا اور یہاں، کیا زبردست سین ملا دیکھنے کو واہ......تم نے تو بین میں پنجابی فلموں کی ہیروئنوں کو بھی مات دے دی۔''

وہ اس کی حالت کا مذاق اڑا رہا تھا۔ جبکہ انجشاء شدید خفگی میں اس کے بازو پر مکے برسا رہی تھی۔

''یو چیٹر......تمہیں اور تمہارے دوستوں کو شرم نہیں آئی ایک معصوم سی لڑکی کے جذبات سے کھیلتے ہوئے۔''

''نہیں، ہم سبھی دوستوں نے بچپن میں شرم بیچ کر اس کے چنے کھالئے تھے۔''

''مرو تم، اگر میرا ہارٹ فیل ہو جاتا تو۔''

''ارے واہ، ایسے کیسے ہارٹ فیل ہو جاتا، جب تک عدنان زندہ ہے، اس کی انجشاء کو موت کا تصور بھی نہیں چھو سکتا۔''

اپنے پاؤں پر کھڑا خالص محبت سے کہتے ہوئے وہ کتنا پیارا لگ رہا تھا۔ انجشاء اس کی طرف خفگی سے گھورتے ہوئے بالآخر مسکرا دی تھی۔

''انجو......دیکھو میرا آپریشن کامیاب ہو گیا ہے، اب کوئی تمہیں میرے حوالے سے طعنہ نہیں دے سکتا' میں تم سے معذرت خواہ بھی ہوں کہ پچھلے تین چار روز سے میں تمہیں اپنی خیریت کی اطلاع بھی نہیں دے سکا، اصل میں واپسی کی تیاری کرنی تھی، اس لئے بہت زیادہ بزی تھا۔ پھر سرپرائز بھی تو دینا چاہ رہا تھا تمہیں۔'' اگلے ہی پل اسے اپنی مضبوط بانہوں کے حصار میں لیتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ جواب میں انجشاء نے مکمل اطمینان سے اپنا سر اس کے کندھے پر ٹکا دیا۔

''اب تو جھگڑا نہیں کیا کرو گی ناں مجھ سے؟''

''کروں گی۔'' مزے سے کہہ کر وہ اس کے بال بکھیر گئی تو عدنان اسے گھورتے ہوئے کھلکھلا دیا۔

''بہت گندی ہو تم۔''

''اب تو جیسی بھی ہوں قبول کرنی ہی پڑے گی، وہ کیا کہتے ہیں سیانے، کہ گلے پڑا ڈھول بجانا ہی پڑتا ہے۔'' اس کے لہجے میں بھی کھنک تھی، عدنان اس کے الفاظ پر پھر سے کھلکھلا اٹھا تھا۔

دونوں ہی خدا کی پاک ذات کے حضور اس کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے ہوئے محبت کے حصار میں مقید آئندہ زندگی کو پلان کر رہے تھے اور تقدیر ان کے ملاپ پر خود بھی مسکرا رہی تھی۔

اگلے ہی روز وہ سب اریشہ کے ولیمے پر اکٹھے ہوئے اپنی اپنی خوشی ایک دوسرے سے شیئر کر رہے تھے۔ تمکین سی گرین کرتا شلوار میں خوب نفاست سے تیار ہوئی اریج کے پہلو میں کھڑی تھی، جس نے گرے تھری پیس سوٹ زیب تن کر کے محفل کا حسن لوٹ لیا تھا۔

انجشاء بلیو چوڑی دار پاجامے پر سرخ شرٹ پہنے، عدنان کے ہوش اُڑا رہی تھی، جو خود سفید کرتا شلوار میں کسی ریاست کے شہزادے سے کم نہیں لگ رہا تھا۔

شیزا اشعر کے ساتھ کل رات ہی پاکستان واپس پہنچی تھی، تمکین اور اریشہ سے معافی مانگنے کے بعد اب وہ بھی پرپل کلر کی دلکش ساڑھی میں ملبوس انہی کے درمیان کھڑی دل سے مسکرا رہی تھی، جبکہ اشعر اریج سے گلے مل کر ایکسکیوز کرنے کے بعد عدنان اور ازمیر سے مصافحہ کر رہا تھا۔

اریشہ ڈارک پرپل کلر کے راجستھانی سوٹ میں ملبوس، آف وائٹ سلک کا دیدہ زیب لباس پہنے ازمیر شاہ کے پہلو میں بیٹھی اپنی تمام

دوستوں کے ہونٹوں پر رقص کرتی ہوئی سچی مسکراہٹ دیکھ کر دل سے مسرور ہو رہی تھی۔

اور ازمیر کی وارفتگیوں پر شرمیلے انداز میں مسکراتے ہوئے دل ہی دل میں اپنی اور اپنی دوستوں کی دائمی خوشیوں کے لئے اللہ سے دعا کر رہی تھی۔

بے شک کڑی آزمائشوں کو جھیلنے کے بعد وہ چاروں سہیلیاں ہی محبت کی تتلی کو قابو کرنے میں کامیاب ہو گئی تھیں۔